بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰۳ جلد ۱۸ یکم جنوری ۱۹۱۸ء

ہواؤں کا چلنا

جب سے ہوا کرۂ ارض کا غلاف بنی ہے جانتی ہی نہیں کہ قرار و آرام کس کا نام ہے۔ اور جب تک زمین قائم ہے کبھی سکون کرنے والی نہیں - ہوا کا ہر ذرہ ہر وقت و ہر مقام میں گویا اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ تمام روے زمین پر یکساں حرارت، یکساں کثافت، یکساں وزن ہوا میں قائم رہے. مگر ہزاروں سبب ایک دوسرے کے ضد اس کوشش کی مخالفت پر موجود ہوتے رہتے ہیں - کہیں ذرا سا خلل توازن میں واقع ہوا اور ہر طرف سے ہوائیں رخنہ بندی کے واسطے چلیں - اس نقل و حرکت سے نئے نئے خلل پیدا ہوے - جنکے انسداد کے واسطے تازہ حرکتیں ہوا میں شروع ہوئیں - غرض اس طور سے ایک سلسلۂ ناتناہی ہواؤں کے چلنے کا قائم ہو گیا ہے - جس کا انقطاع نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ ہوا پرکا ہی جہاں گرد ہے - کوئی ذرہ ہوا کا ایسا نہیں جس نے امتداد زمانہ میں کروڑوں جگہیں نہ بدلی ہوں - جو ذرہ آج پانی میں جذب ہو کر قعر سمندر میں ہے کل شاید اتنی بلندی پر ہوگا جہاں سے ہمالیہ کی برف سے چھپی ہوئی چوٹیاں بھی پست نظر آئیں اور عقاب بلند پرواز کی رسائی بھی وہاں تک نہ ہو

یہ ہوا اس وقت نسیم وصبا ہوکر باغ و بُستاں کی سیر کرتی، پھولوں کی بلائیں لیتی، اور اُنکی خوشبو سے بسی ہوئی نکلکر ہر طرف دماغوں کو معطر کرتی پھرتی ہے عجب نہیں کہ وہی ہوا دوسرے وقت متعفن مقامات میں پہونچکر وہاں کی عفونت اطراف میں پھیلاکر انواع و اقسام کے امراض کی باعث ہو۔ ہوا کی سیر کسی جگہ کے واسطے بند نہیں۔ اگر آج غریبوں اور مفلسوں کے تاریک و تنگ جھونپڑوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے تو دوسرے روز بادشاہوں و امیروں کے رفیع و پر فضا محلوں و قصروں میں اٹکھیلیاں کرتی ہوگی۔ ہوا اپنی سیر و گشت میں نئے نئے روپ بھرتی ہے۔ ریگستان عرب و صحراے افریقہ میں پہونچکر باد سموم بنتی ہے۔ اور اس صورت میں جس طرف سے گذر جاتی ہے حیوان و انسان کو خاک فنا میں ملا دیتی ہے۔ بڑے بڑے سمندروں پر طوفان کی ہولناک صورت اختیار کرکے ایک عالم کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہوا کی حرکت ہی برکت ہے۔ اگر ہوا کی حرکت بند ہو جائے تو دنیا کے سب کام بھی بند ہو جائیں۔

اصل میں ہواؤں کے چلنے کا باعث آفتاب کی حرارت ہے۔ گرم ہوکر ہوا پھیلتی ہے۔ پھیلنے سے ہلکی ہوکر اوپر کا رُخ کرتی ہے۔ اسی طرح سرد ہونے سے ہوا سمٹتی ہے۔ سمٹنے سے بھاری ہوکر نیچے آتی ہے۔ یہ خاص اصول ہے جو ہواؤں کے چلنے کا سبب ہے۔ اسی اصول کی رو سے چراغ کی لَو اور آگ کا شعلہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔

دوسرا بڑا سبب ہواؤں کے چلنے کا اختلافِ وزن ہے۔ بخار آمیز ہوا ہلکی اور سخت ہوا وزنی ہوتی ہے۔ جب کسی مقام کی ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے تو دوسرے مقام سے جہاں ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے ہوا اُس طرف بڑھتی ہے تاکہ دباؤ مساوی ہو جائے۔

آفتاب کی شعاعیں جو زمین پر پڑتی ہیں اُن سے سطح زمین گرم ہو جاتی ہے۔ اور جو سمندر پر پڑتی ہیں اُنکی وجہ سے سمندر سے بخارات پیدا ہوتے ہیں۔ سطحِ زمین کی اشاعت سے ہوائے ملاصقِ سطح گرم ہو جاتی ہے اور گرم ہونے سے ہلکی ہوکر اوپر اُٹھتی ہے۔ سمندر سے جو بخارات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ہلکے ہوتے ہیں۔ اس لیے بخار آمیز ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے۔ زمین کی سطح

انواع و اقسام کے اجزا سے مرکب ہے۔ اور یہ سب اجزا آفتاب کی حرارت سے بدرجہ ساوی گرم نہیں ہوتے۔ فرضاً آفتاب کی حرارت ہرچیز پر برابر بھی پہونچے تاہم اختلاف رہے گا۔ کیونکہ بعض اشیا میں بمقابلہ دوسری چیزوں کے بسہولت جذب حرارت کی صلاحیت ہے۔ لہذا مختلف اجزا سے مختلف درجے کی حرارت ہوا کے ملاصق سطح کو حاصل ہوگی۔ دن کو درختوں کے سایہ میں، گھروں کے اندر، قطعاتِ آب پر، گھنے جنگلوں، سبزہ زاروں میں آفتاب کی شعاعات کا اثر بمقابلہ مکانوں کی چھتوں، چٹانوں، ریگستانوں وغیرہ کے بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی قطعۂ زمین آفتاب کی حرارت سے گرم ہوتا ہے اور اُسی وقت اوسکے متصل مقام میں خنکی رہتی ہو تو گرم شدہ مقام سے ہوا ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر جاتی ہے۔ اور اس مقام کے واسطے اُسی قدر ہوا کی ضرورت پڑتی ہے جتنی یہاں سے اوپر گئی ہے۔ لامحالہ اطراف سے ہوا اس مقام کا رخ کرتی ہے۔ اس طور سے دو حرکتیں ہوا میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایک تو نیچے سے اوپر کی طرف۔ دوسری اطراف سے متوازی سطح۔ خلاصۃً ہواؤں کے چلنے کے دو سبب ہیں ایک تو اختلافِ حرارت، دوسرا اختلافِ وزن۔ یعنی ہوا کے دباؤ کا مختلف ہونا۔ ہوا کے واسطے بجاے وزن کے لفظ دباؤ کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ وزن صرف اُس دباؤ کا نام ہے جو اُوپر سے نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ ہوا کا دباؤ ہرطرف یکساں ہوتا ہے، خواہ اوپر سے ہو یا نیچے سے ہو۔ یا اطراف سے ہو۔

ہم سب سے پہلے اُن ہواؤں کا بیان کرتے ہیں جو باختصاص مقام بالالتزام تمام سال ایک ہی سمت کو چلا کرتی ہیں اور ٹریڈ ونڈز Trade Winds کے نام سے موسوم ہیں

(ٹریڈ ونڈز = ریاح التجارۃ)

ہم ٹریڈ ونڈز کا لفظی ترجمہ ریاح التجارۃ کرتے ہیں۔ وجہ تسمیہ اسکی یہ ہے کہ یہ ہوائیں اُس منطقہ میں جو خط استوا کے دونوں جانب قریباً ۳۰ عرض شمالی و ۳۰ عرض جنوبی کے درمیان واقع ہے۔ براً و بحراً تمام سال بالالتزام ایک ہی سمت چلتی ہیں۔ ان ہواؤں کی اس خصوصیت کے

دریافت ہونے سے جہازرانی میں بہت مدد ملی اور جہازرانی کی آسانی سے ترقی تجارت ہوئی۔ لہذا ان ہواؤں کو یہ لقب دیا گیا۔ جہاں جہاں منطقۂ حارہ میں آفتاب وسط السماء میں پہونچتا ہے اور زمین پر سیدھی شعاعیں پڑتی ہیں اُن مقامات کی ہوا شدتِ حرارت سے لطیف ہو کر پھیلتی ہے، اور پھیلنے سے ہلکی ہو کر اوپر جاتی ہے۔ اُسکی جگہ لینے کے واسطے منطقۂ باردہ کی ہوا اُس طرف بڑھتی ہے۔ اگر زمین متحرک نہ ہوتی تو اوپر چڑھی ہوئی ہوا خط استوا سے بحیثیت بادِ جنوب قطب شمال کی طرف، و بحیثیت بادِ شمال قطب جنوب کی طرف، جایا کرتی۔ اور قطب شمال سے بادِ شمال اور قطب جنوب سے بادِ جنوب سطح زمین سے ملی ہوئی خط استوا کی طرف آیا کرتی لیکن زمین اپنے محور کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے اور اس گردش کی وجہ سے ہواؤں کی رفتار میں کامل انحراف پیدا ہو جاتا ہے جسکی صورت ہم عنقریب بیان کریں گے۔

جب کوئی جسم (جس میں آزادی کے ساتھ حرکت کی صلاحیت ہو) بالائے سطح ارض کسی سمت میں متحرک ہو تو زمین کی گردش کے سبب سے اُسکی رفتار میں انحراف پیدا ہوگا۔ اس طور سے کہ نصف کرۂ شمالی میں یہ انحراف دائیں جانب ہوگا اور نصف کرہ جنوبی میں بائیں جانب۔ جب ہوا قطبِ شمال کی طرف سے بحیثیت بادِ شمال خط استوا کی طرف بڑھتی ہے تو از روے قاعدۂ مذکورۂ بالا زمین کی گردش کی وجہ سے بجانب راست منحرف ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی وجہ اس انحراف کی مانع نہ ہو تو مڑتے مڑتے مڑتے اُسکی رفتار دائرہ کی صورت اختیار کرتی۔ مگر اس انحراف کے باعث سے دائیں جانب ہوا کی کثافت زیادہ اور بائیں طرف کم ہو جاتی ہے۔ جب کثافت کم ہوئی تو دباؤ بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس لیے دباؤ کے مساوی کرنے کے واسطے پھر ہوا بائیں جانب مڑنے کا رُخ کرتی ہے۔ غرض اس انحراف در انحراف سے نہ تو ہوا کی رفتار شمالاً جنوباً رہتی ہے اور نہ دوری ہونے پاتی ہے۔ دونوں حالتوں کے بین بین ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہوا جو اوّل بادِ شمال ہو کر چلی تھی، بادِ شمال و مشرق ہو کر رواں ہوتی ہے۔ اور منطقۂ حارہ تک پہونچتے پہونچتے قریب قریب بادِ مشرق یعنی پُروا ہوا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نصف کرۂ جنوبی میں ابتدا میں ہوا

قطب جنوب کی طرف سے بادِ جنوب ہوکر خط استوا کی طرف بڑھتی ہے - پھر اَندروے قاعدۂ مذکورہ بائیں طرف منحرف ہوتی ہے - بعد ازاں بوجوہِ مذکورۂ بالا مُڑکر بحیثیت بادِ جنوب و مشرق رواں ہوتی ہے - اور منطقۂ حارّہ تک پہونچتے پہونچتے یہ بھی قریب قریب بادِ مشرق یعنی پُروا ہوا ہو جاتی ہے۔ انھیں ہواؤں کو ٹریڈ ونڈز یعنی "ریاح التجارۃ" کہتے ہیں - یہ ہوائیں تمام سال بالالتزام ایک ہی سمت یعنی شرقاً غرباً بحرِ اٹلانٹک و بحرِ پاسفک کے حصۂ عظیم و صحرائے افریقہ و برازیل وغیرہ میں چلا کرتی ہیں -

شمالی اٹلانٹک میں جاڑے کے موسم میں ۲۲ درجہ عرض شمالی تک اور گرمی کے موسم میں ۳۵ درجہ عرض شمالی تک چلتی ہیں - جنوب میں بحرِ مذکور میں جاڑے کے موسم میں ۱۸ درجے عرض جنوبی تک اور گرمی کے موسم میں ۲۸ درجے عرض جنوبی تک چلتی ہیں - بحرِ پاسفک میں شمال میں ۲۱ درجے تک جاڑے میں اور ۳۱ درجے تک گرمی میں چلتی ہیں - اور جنوب میں بحرِ مذکور میں جاڑے میں ۲۳ درجے تک اور گرمی میں ۳۰ درجے تک چلتی ہیں -

خاص صفت ٹریڈ ونڈز کی یہ ہے کہ معتدل رفتار سے ہمیشہ معین سمت میں چلا کرتی ہیں - صبح کو تیز ہوتی ہیں - دوپہر کو آہستہ چلتی ہیں اور شام کو پھر تیز ہو جاتی ہیں - سواحل کے قرب میں انکا زور بہت کم ہو جاتا ہے اور سمندر سے پندرہ بیس میل زمین کی طرف چل کر ٹریڈ ونڈز باقی نہیں رہتیں -

دونوں ٹریڈ ونڈز یعنی شمالی و جنوبی باہم مل کر ایک ہوکے نہیں چلتیں - دونوں کے درمیان ایک منطقہ سکون کا رہتا ہے - یہاں ہَوا نیچے سے اوپر کو جاتی ہے - یہ منطقہ بہ تبدیلِ موسم منتقل ہوتا رہتا ہے - ہمیشہ ایک ہی عرض بلد پر قائم نہیں رہتا - لیکن خط استوا سے کبھی تجاوز نہیں کرتا یعنی کبھی خط استوا کے جنوب کی طرف نہیں جاتا - اس منطقۂ سکون کا عرض بحرِ اٹلانٹک میں ۱۵۰ میل اور بحرِ پاسفک میں ۲۰۰ میل ہوتا ہے مگر عرض ہمیشہ کیساں نہیں رہتا - ۱۵۰ میل و ۲۰۰ میل کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے -

اسی عرض بلد پر ہوا کا دباؤ تمام روے زمین سے زیادہ رہتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ قطب اور خط استوا دونوں طرف کی ہوائیں تقریباً اس عرض پر پہونچکر اپنی اپنی سمت بدلتی ہیں۔ اس سبب سے یہاں ہوا کی کثافت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جب کثافت زیادہ ہوئی تو دباؤ خواہ مخواہ بڑھ جائے گا۔

خط استوا پر و نیز دونوں جانب یعنی شمال میں ۳۵ عرض بلد پر اور جنوب میں ۳۰ عرض بلد پر ہوا ساکن رہتی ہے۔

ماحصل کُل بیان کا یہ ہے کہ ہوا کے دو بڑے چکر ہیں۔ اور ہر ایک کا مرکز قطب ہے۔ ایک کا مرکز قطب شمالی اور دوسرے کا قطب جنوبی۔ ان دونوں چکروں میں ہوا کی رفتار اُس سمت ہوتی ہے جس سمت میں زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ خط استوا کے قرب میں دونوں جانب ایک ایک منطقہ ہے جس میں ہوا کی رفتار زمین کی گردش کے مخالف سمت میں ہے۔ ان دونوں منطقوں میں جو ہوائیں چلتی ہیں انھیں کا نام ٹریڈ ونڈز ہے۔ منطقۂ ٹریڈ ونڈز و قطبی چکر کے درمیان جو منطقہ ہے وہاں پر ہوا کی کثافت اور دباؤ بہت زیادہ ہے۔ یہ منطقہ شمال میں ۳۵ درجے پر اور جنوب میں ۳۰ درجے پر واقع ہے۔ قطب جنوبی کے گرد ہوا کا دباؤ بہت ہی کم ہے۔ اور اسی سبب سے ہمیشہ تیز بادِ شمال و مغرب چلا کرتی ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اُس سے واضح ہے کہ منطقۂ حارہ اور اُسکے قرب میں خاص خاص صورتوں کو چھوڑکر ہوائیں معین سمت میں چلتی ہیں۔ بخلاف اسکے ہر دو منطقہ معتدلہ میں کوئی سمت مقرر نہیں۔ یہاں ہر طرف ہوا چلتی ہے۔ کبھی قطب کی طرف کی ہوا غالب ہوتی ہے اور کبھی خطِ استوا کی سمت کی۔ اور بالعموم منطقہ حارہ کی نسبت منطقہ معتدلہ میں ہوا تیز چلا کرتی ہے۔ جو مقامات کہ سواحل بحر پر واقع ہیں (خصوصاً منطقۂ حارہ میں) وہاں قریب ۹۔۱۰ بجے صبح سے لیکر ۴۔۵ بجے شام تک ہوا سمندر سے زمین کی طرف چلتی ہے۔ اور غروب آفتاب سے صبح تک زمین سے سمندر کی جانب۔ وجہ اسکی ظاہر ہے۔ دن کو زمین آفتاب کی حرارت سے

بہت جلد گرم ہوتی ہے اس لیے ہوا سے ملاصق سطح زمین گرم ہوکر پھیلتی ہے اور پھیلنے سے ہلکی ہوکر اوپر جاتی ہے - اسکی جگہ سمندر سے خنک ہوا زمین کی طرف آتی ہے - بعد غروب آفتاب زمین سے حرارت بسرعت خارج ہوتی ہے - کیونکہ زمین میں بمقابلہ پانی کے اخراج واشاعت حرارت کی صلاحیت زیادہ ہے - اسلیے زمین کی طرف سے خنک ہوا تمام رات سمندر کی طرف جاتی ہے - یہی سبب ہے کہ منطقہ حارہ میں بھی سواحل کے مقامات اور جزائر کی آب وہوا زیادہ گرم نہیں ہوتی - ہمیشہ قریب اعتدال کے رہتی ہے -

ہوا کے تیز و آہستہ چلنے کے متعدد اسباب ہیں - عام طور پر قطبین کے گرد اور خط استوا پر ہوا کی حرکت نہایت ہی ضعیف قریب بہ سکون رہتی ہے - جتنا ان دونوں مقامات سے دُور ہوتے جایئے ہوا کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے - ۴۵ - ۵۰ عرض بلد پر ہوا عموماً بہت ہی تیز چلتی ہے ایک ہی عرض پر خشکی کی بہ نسبت سمندر پر ہوا بہت زیادہ تیز چلتی ہے - خشکی پر بھی ہموار میدانوں میں ہوا تیز چلتی ہے - اور گھنے جنگلوں اور ناہموار مقاموں میں آہستہ - ہمارے ملک ہند میں تو ہوا کی رفتار کا یہ حال ہے کہ اگر بمبئی و کراچی میں ہوا کی رفتار چار سو میل فی یوم ہے تو پانسو میل وسط ملک میں چل کر یعنی الہ آباد تک پہونچتے پہونچتے اسکی چوتھائی یعنی سو میل فی یوم بھی نہیں رہتی - سطح زمین کی نسبت طبقات بالا میں ہوا کی رفتار بہت سریع ہوتی ہے - بادلوں کی رفتار کے ملاحظہ سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۲۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر جو رفتار بادلوں کی ہوتی ہے اُس سے چار چند اُس بادل کی ہوتی ہے جو ۲۹۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہوتا ہے -

بارش کا دار و مدار ہوا کی حالت پر ہے - اسی ہوا کی گردش سے جو اوپر بیان ہوئی اور تبدیل فصول سے جسکو ہوا کی گردش میں خاص دخل ہے - تمام روے زمین کی بارش وابستہ ہے - خط استوا پر نہ ہوا کسی معین سمت میں چلتی ہے اور نہ کبھی فصل بدلتی ہے - اس لیے یہاں بارش موسم کی پابند نہیں - ہمیشہ آفتاب کی شعاعیں سیدھی پڑتی ہیں - جن سے بخارات ہر روز سمندر سے متصاعد ہوتے ہیں - ہوا ان بخارات سے لدی ہوئی سیدھی اوپر جاتی ہے - اوپر کی سردی

سے بخارات میں تکثیف پیدا ہوتی ہے۔ تکثیفِ بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ اور تری پاکر برس پڑتے ہیں۔ روزانہ سالہا سال یہی صورت پیش آیا کرتی ہے۔

جب آفتاب تقاطعِ ربیعی سے گذر کر برج سرطان کی طرف بڑھتا ہے تو منطقۂ بارش (جسکو ہم اوپر منطقۂ سکون کہہ آئے ہیں) بھی ساتھ ساتھ شمال کی طرف بڑھتا ہے۔ جہاں جہاں اس کا گذر ہوتا ہے وہاں برسات کا موسم پہنچ جاتا ہے۔ جولائی میں آفتاب برج سرطان میں ہوتا ہے۔ اُس وقت منطقہ مذکورہ ملک چین و برہما و ہند و حبش وغیرہ میں ہوتا ہے۔ لہذا ان سب مقامات میں اس زمانہ میں برسات کا موسم ہوتا ہے۔ جب آفتاب تقاطعِ خریفی سے گذر کر برج جدی کا رخ کرتا ہے تو منطقۂ بارش بھی اُسکے ساتھ جنوب کی طرف جاتا ہے۔ منطقۂ بارش کا جولانگاہ ۲۰ عرض شمالی سے لیکر ۲۰ عرض جنوبی تک ہے۔ چنانچہ ٹھیک ٹھیک برسات کا موسم اسی منطقہ میں ہوتا ہے۔

(از مسودات عطا کردہ مرحوم) حافظ علی سندیلوی (مرحوم)

عاشق کا سفر

صدیقیِ ناشاد کو کل دیکھ کے گریاں | کہتا میں کہ غم ہو نہ جدائی کا بشر کو
پوچھا کہ یہ کیا رنگ ہے روتے ہو لہو کیوں | کیا آئے ہو دل دیکے کسی رشکِ قمر کو
ڈوبے نہ کہیں آبروئے ضبط حدیث | طوفان اٹھانے نہ دو اس دیدۂ تر کو
بولا کہ نہ عاشق ہوں نہ فرقت کے ہیں صدمے | روتا ہوں نہ الفت کو نہ الفت کے اثر کو
اشکوں پہ نہ قابو ہے نہ آنکھیں مرے بس ہیں | وہ بحر رواں ساتھ ہیں جاتا ہوں جدھر کو
حیران ہوں دو ہاتھوں سے کس کس کو سنبھالوں | سینے میں سکوں دل کو نہ پہلو میں جگر کو
کیا جانے میں ہوں کون کہاں جاتا ہوں افسوس | ہوں بے سر و پا ہوش نہیں پانوں کا سر کو
کیوں آیا تھا اس منزلِ ہستی میں عدم سے | ناحق کو میں گھر چھوڑ کے نکلا تھا سفر کو

محمد یوسف صدیقی (دکن)

لانگفیلو

(۱۸۰۷ - ۱۸۸۲)

ہنری واڈ سوتھ لانگفیلو، امریکہ کا سب سے بڑا اور مشہور شاعر تھا - انگریزی شاعری (جو فطری شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے) میں لانگفیلو کا رنگ تمام شاعروں سے جداگانہ ہے۔ وہ ہمیشہ درد اور سادگی کا شیدائی ہے اور تصنع اور آورد سے انتہائی نفرت رکھتا ہے۔ زبان اور ترکیبیں سادی، تشبیہ پاکیزہ، خیالات بلند اور سب اپنے ہیں۔ لانگفیلو کی شاعری لفاظی سے خالی ہے - جو مضامین نظم کیے ہیں اُن میں چیزوں کی حقیقت دل پر نقش کر دینا چاہتا ہے اور اُنکے اخلاقی پہلو پر بہت غائر نظر ڈالتا ہے۔ اُسکی رائے میں ایک اجتہاد کی شان ہے۔ اور عام خیال سے جہاں کہیں اُسکو نفرت پیدا ہوئی ہے وہ بیباکی سے دلکش اور بلیغ استعارات کے ذریعہ سے یا سنجیدگی کے ساتھ اپنے مفہوم کو ثابت کرنے گیا ہے۔

مثلاً اُسکو ایسے خیالات سے نفرت ہے جو زندگی کا خاکہ ایک محض مایوس کُن پیرایہ میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے خیالات سے وہ یوں اختلاف کرے گا :

بیشک عرصہ حیات تکالیف اور آلام سے پُر ہے۔ اور ہر شے جسپر نظر پڑتی ہے وہ متغیر اور آخر کار فانی نظر آتی ہے۔ زندگی چند روزہ ہے اور ہر لحظہ تکلیف دینے والا۔

اب اسکے آگے اس قسم کے چند الفاظ بڑھا دینا نہایت ضروری بلکہ فرض ہے :

گر مصائب سے نامردوں کی طرح کیوں ڈرتے ہو؟ بہادروں کی طرح مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے یا بزدلوں کی طرح اُنکے آگے ہتھیار ڈالدینا چاہیے؟ اگر زندگی صرف چار دن کی ہے تو دنیا کے کاموں میں اور بھی مستعدی دکھانا چاہیئے۔ تاکہ پانچویں دن کی تمنا نہ کرنا پڑے اور کام ادھورا نہ رہ جائے - نہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور تکالیف کو سوچتے رہنا!

مستعد ہو! کیونکہ زندگی محض خواب وخیال ہی نہیں ہے۔ اور نہ موت اُس کا مقصد ہے۔

بلکہ اگر صحیح معنوں میں بیان کیا جائے تو زندگی کو 'سرگرمی' اور شدت سے تعبیر کرنا چاہیے۔"

اسی طرح وہ شعروشاعری کے ایک لغو مشغلہ ہونے کا سخت مخالف ہے۔ کہتا ہے:۔

"دُنیا میں کوئی شے بیکار نہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بےمثل، قابلِ قدر، اور نہایت ضروری ہو

پھر شاعروں کے وجود کو کیوں بےضرورت کہتے ہو؟"

افلاطون نے اپنے طبعزاد اصولِ سیاسی کی بناپر جس جمہوریت کا خاکہ کھینچا تھا اُس میں سوائے شاعروں کے ہر پیشے کی ضرورت تسلیم کی تھی۔ یہاں غالباً اِس خیال کی تردید مقصود ہو۔

لانگفیلو اپنی ایک دلکش نظم "دن ڈھلا"[1] میں بیان کرتا ہے کہ جب آدمی غم اور فکر میں مبتلا ہو اور مشقت اور کثرتِ کار سے تھک کر بیٹھا ہو، اُس وقت اُسکے دل کو راحت پہونچانے والی اور تسکین دینے والی کون سی چیز ہے۔ کہ اُسکے دماغ کو تازگی پہونچائے اور فکروغم کو بھلا دے؟

ذیل کے قطعات میں اسی نظم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ ترجمہ میں شاعر کی تخئیل پورے طور پر اور ہر شعر میں باقی ہے۔ اور حتی الوسع اُن الفاظ کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے جو شاعر نے استعمال کیے ہیں۔ تشبیہ و استعارات وغیرہ میں بھی کسی جگہ تغیر نہیں کیا گیا (البتہ پہلے قطعہ کے پہلے شعر میں چونکہ استعارہ مشرقی شاعری کے رنگ سے بہت علیحدہ تھا اس لیے استعارے کی پوری ترجمانی نہ ہوسکی۔ فرق اتنا ہوگیا ہے کہ شاعر نے 'شب' کو طائر فرض کیا ہے جو اپنے بازوؤں سے دنیا کو ڈھانپے ہوئے ہے) غالباً اب ان قطعات کے پڑھنے سے لانگفیلو کی شاعری کا کافی اندازہ ہوسکے گا:۔

دن ڈھلا

ڈھلا دن، لیلیٔ شب نے سرِ رُخ بال بکھرائے، ۔ سیاہی چھا گئی عالم پہ، بڑھکر اُسکے گیسو سے
بے سقفِ چرخ سے باراں ظلمت اس طرح جیسے ۔ گریں پَر ٹوٹ کر اُڑتے ہوئے طائر کے بازو سے۔

---

[1] The Day is Done

۲ چراغ ان ساتھ کی بتیوں کے دیکھتا ہوں جب، شعاعیں چھن رہی ہیں جنکی اس کُہرے کی چادر سے،
تو دل پر چھانے لگتا ہے غبارِ اندوہ کی صورت، تحمل ہو نہیں سکتا ہے جس کا قلبِ مضطر سے:
۳ غبارِ اِس یاس و کلفت کا نہیں ہم رتبہ کلفت، مگر پھر بھی مشابہ ہے بہت کچھ رنج و حرماں سے۔
غبارِ یاس کو ہے رنج اور حرماں سے وہ رشتہ جو رشتہ قطرہائے آبِ شبنم کو ہے باراں سے۔
۴ سُنا سادی سی اک نظم، اے مرے ہمدم، ترے صدقے کہ اشعار اُسمیں چھننے والے ہوں ہر دلمیں نشتر سے
کریں جو رفع میرے دردِ دل کے دردِ پیہم کو نکالیں سارے دن کی فکرِ وحشت جو مرے سر سے۔
۵ نہیں میں چاہتا اشعار اُستادانِ سابق کے، نہ سُننا چاہتا ہوں ماہرانِ فن کے دیواں سے،
کہ آوازِ قدم اِن رہرووں کی گونج اُٹھی ہے اُلٹ دی ہے زمیں کرا کے جسنے چرخِ گرداں سے۔
۶ تو ہی تخییل اُنکی مثلِ طبلِ جنگ کہتی ہے، ہزاروں زندگی میں معرکے سر ہونگے کوشش سے،
مگر میں چاہتا ہوں آج میٹھی نیند سو جاؤں۔ (لهذا سارے جھگڑے ہیں یہ خارج میری خواہش سے)
۷ کلام، القصہ پڑھ دے بس کسی کم رتبہ شاعر کا جو نکلا ہو کلیجہ چیر کر یوں قلبِ مضطر سے:
برسنے لگتا ہے جس طرح پانی ابرِ نیساں کا رواں ہوتے ہیں یا جس طرح آنسو دیدۂ تر سے
۸ اُسی شاعر کو چُن جو اپنے ایامِ مشقت میں اور اُن راتوں کو بھی جنمیں نہیں سو پاؤ راحت سے،
سنا کرتا تھا اپنے سازِ دل کے بے صدا نغمے ترنم میں تھی حیرت آفرینی جنکے شدت سے۔
۹ بس ایسے شاعروں کا راگ اک تسکین دیتا ہے ہر اُس دل کو تڑپتا ہو جو رنج و بیقراری سے،
تسلی جس طرح سے بعد توبہ دل کو ہوتی ہے۔ (گنہ کے عفو کی اُمید اگر ہو فضلِ باری سے)
۱۰ اک اچھا انتخابِ نظم کر لے اور پڑھ اُسکو سنا دے آج کچھ اپنی بیاضِ پُر جواہر سے،
بڑھا دے اور بھی، ہاں، لذتِ ہر شعرِ تر ہمدم، ترنم اپنے الحاں کا ملا کر سازِ شاعر سے۔
۱۱ مری رات آج اُس نغمہ کی محویت میں کٹ جائے، پریشانی و فکر اس طرح رخصت ہو مرے دل سے
کہ جیسے صبح اُٹھ کر خامشی سے قافلے والے اُٹھا لیتے ہیں بستر اور چل بستے ہیں منزل سے۔

محمد معین الدین (لکھنوی)

فلسفۂ خواب

بشنو از شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   کہ غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

طلسمات عنصری میں جس طرح انسان ایک عجیب غریب مخلوق ہے اُسی طرح اس طلسمی دنیا کے حوادث میں خواب ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے۔

خ ایک ایسی انوکھی چیز ہے جو ایک قلیل مدت کو عبرت خیز یا مسرت انگیز بنا کر دنیا کی بے ثباتی کا واقعی نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ کبھی انسان کو دشت و بیابان کی سیر کراتی ہے اور کبھی دربار شاہی کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اگر کبھی شادی کا ترانہ اُسکے کانوں تک پہونچاتی ہے تو کبھی نوحۂ غم سُناتی ہے۔ کبھی اعزاز شاہی سے مسرور کرتی ہے تو کبھی کاسۂ گدائی ہاتھ میں دیکر در در پھراتی ہے کبھی اُسے برسوں کے بچھڑوں سے ملاتی ہے تو کبھی اُسکے تمام عزیز و اقارب، دوست واحباب کی موت سے سوگوار بنا دیتی ہے۔ کبھی اُسے مسجد میں لے جاتی ہے کبھی بتکدے میں۔ کبھی حرم میں پہونچاتی ہے کبھی تبکدے میں۔ کبھی انبیا، اور اولیا، حتیٰ کہ عرش تک کی سیر کراتی ہے تو کبھی تحت الثریٰ میں لے جا کر ابلیس اور دوسرے شیاطین سے ملاتی ہے۔ اس دار فانی کا ایک بوریا نشین کبھی اپنے کو تخت شاہی پر جلوہ افروز پاتا ہے، امرائے دربار کو آداب شاہی بجا لاتے دیکھکر پھولا نہیں سماتا کبھی دربار سے اُٹھ کر خواصوں کے جھگھٹے میں گلگشت چمن کرتے دیکھتا ہے، اُن سے چہلیں کرتا اور اُنکی میٹھی میٹھی پیاری اور دلکش باتوں سے دل بہلاتا ہے۔ کبھی نغمہ سرائی ہوتی ہے کبھی شراب کا دَور چلتا ہے۔ کہ یکایک کروٹ بدلنے سے قلب پر کچھ دباؤ پڑتا ہے جس سے یہ حالت بھی بدل جاتی ہے اور یہی دلچسپ خیال ایک بھیانک خواب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور وہ دفعتہً عرصۂ کارزار میں اپنے کو نبرد آزما پاتا ہے، توپوں کی دھمک اور گولیوں کی بوچھار سے خائف ہوتا ہے کہ ناگاہ ایک گولی اسکے پہلو میں بھی لگجاتی ہے اور وہ چونک پڑتا ہے اور متحیر ہوتا ہے۔ بیدار ہوکر بزبان حال

کہتا ہے :- ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کبھی وہ یہ دیکھتا ہے کہ مجھے دشمن نے چڑھائی کر کے شکست دے دی ہے، میرا تمام ملک اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ مجھے اسیر کر کے حرم شاہی کی توہین کر رہا ہے۔ یہ سمان دیکھکر وہ اس درجہ گھبراتا ہے کہ اُسی حالت میں وہ گا ہے یہ بھی کہہ اُٹھتا ہے کہ ع

ایں چہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

آنکھ کھل جاتی ہے تو اپنی دولت و ثروت کو اُسی طرح پاکر مسرور ہوتا ہے مگر اسکے ساتھ ہی معبّر کی بھی جستجو کرتا ہے۔ کبھی کسی سوداگر کا تجارتی جہاز سمندر برد ہو جاتا ہے اور وہ اُسکے صدمہ سے چونک پڑتا ہے۔ کبھی کسی کے نام ڈربی کا ٹکٹ نکل آتا ہے اور وہ ایک فرضی مدت کے لیے کھیتی بنجاتا ہے۔ خوب دل کھول کے اپنی تمنائیں پوری کرتا ہے۔ مکان بنواتا ہے جو اس قدر بلند ہوتا ہے کہ چڑھتے چڑھتے دم پھولتا ہے اور پاؤں لغزش کرنے لگتے ہیں یہ بے قابو ہو کر نیچے اُترتا ہے۔ دہشت کی وجہ سے اُچھل پڑتا ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ اسے فال نیک سمجھ کے کروٹ بدل کر پھر سو جاتا ہے۔ کبھی وہ وادی وحشت میں اپنے کو بیاباں نورد پاتا ہے، لق و دق میدان اور سر بفلک چوٹیوں کو دیکھکر گھبراتا ہے، گھاٹیاں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ جنکی تھاہ تک نظر نہیں آتی۔ وہ راستہ بھول کر سرگردان پریشان اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا ہے، راہ کی جستجو کرتا ہے وہ ملتی نہیں بجاے اسکے خضر مل جاتے ہیں یہ اُن سے اپنی قسمت کے آنے والے واقعات کے متعلق سوال کرتا ہے وہ کسی قدر سکوت کے بعد جواب دینے ہی کو ہوتے ہیں کہ کسی چلنے والے کے پاؤں کی چاپ یا کسی بچے کے رونے کی آواز یا کسی جانور کے کودنے کے دھماکے سے اسکی آنکھ کھل جاتی ہے اور یہ کفِ افسوس ملکے رہجاتا ہے۔

کوئی حق تعالیٰ کو عرش پر جلوہ افروز دیکھتا ہے اور سجدۂ شکر بجا لاتا ہے۔ سجدہ سے اسکا سر اُٹھنے نہیں پاتا کہ جناب باری سے اسے جنت میں داخل کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ فرشتے جوق جوق آتے ہیں اور اسے جنت میں داخل کرنے کے لیے لے چلتے ہیں۔ یہ دروازۂ بہشت پر پہونچا ہی ہے کہ مؤذن کی

بانگِ سحر ہوشیار کر دیتی ہے۔

کسی کو عرصۂ محشر نظر آتا ہے۔ آفتاب سوا نیزے پر اور زمین تانبے کی دکھائی دیتی ہے۔ گرمی اور پیاس کی شدت ہوتی ہے۔ فرشتے اسے کشاں کشاں لیجا کر جہنم میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ یہ اُچھل پڑتا ہے آنکھ کھُلتی ہے تو ایک ٹھنڈی سانس بھرکر بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے ؏

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کوئی اپنے اُن عزیزوں سے ملتا ہے جنھیں مرے ہوئے زمانۂ دراز گذر چکا ہے۔ یہ اُن سے خوش ہو ہوکے باتیں کرتا اور اپنی آتشِ شوق کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ پھر خود بخود یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں عالمِ خواب میں ہوں اور یہ اُن عزیزوں کی روحیں ہیں۔ اس خیال کے گذرتے ہی وہ اُن سے حشر و نشر اور حالاتِ قبر کے متعلق سوال کر بیٹھتا ہے۔ بسا اوقات تسلی بخش اور صاف جواب نہ ملنے سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے کہ اتنے میں کسی وجہ سے آنکھ کھُل جاتی ہے۔

الغرض جو شخص جس طبیعت اور جن اخلاق کا ہوتا ہے اُسکو اُسی کے مناسب اور اُسی طرز و انداز کے خواب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کوئی تو انکو خیالاتِ پریشاں سمجھ کے بالکل پروا نہیں کرتا اور کوئی انھیں اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ حیات و شاہدات سے زیادہ باوقعت تصور کرنے لگتا ہے۔ گر مقدم الذکر افراط اور مؤخر الذکر تفریط ہے۔ اعتدال سے دونوں متجاوز ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مقدم الذکر کے مؤیّدات زیادہ ہیں اور اسی لیے میں بھی گونہ اس رائے سے متفق ہوں۔ مگر کبھی مؤخر الذکر کے لیے بھی ایسے بدیہی شواہد مل جاتے ہیں کہ مقدم الذکر اشخاص کے لیے مجالِ دم زدن نہیں رہتی۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ خلیفۂ مامون الرشید جو عباسی خلافت میں سب سے زیادہ ذی علم اور علم دوست خلیفہ تھا۔ اسکے مزاج میں فلسفہ نے اس قدر دخل پا لیا تھا کہ وہ سُنّت کی شاہراہ سے تجاوز کرکے اعتزال کی کجروی میں مبتلا ہوگیا تھا اور پھر اپنے ان باطل خیالات میں اس قدر تعصب رکھتا تھا کہ جو اُسکے مخالف تھے اُنپر تشدد کو جائز سمجھتا تھا۔ اسی ناجائز غلو نے اُسے خواب کی حقیقت کا بھی منکر بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنے مقبوضات میں کسی مقام پر بغاوت

فرو کرنے کے لیے اپنے فرزند کو بھیجا - جس عرصے میں خیریت کا خط آ جانا چاہیے تھا اُس مدت میں نہ آنے سے بہت متردد اور متفکر تھا - ایک دن اسی پریشانی اور خلفشار میں سو گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُسکے بیٹے کے پاس سے قاصد کے آنے کی اطلاع دی گئی ہے - اُس نے نہایت بےچینی اور بڑے اشتیاق سے اُسے ایوان خلافت میں طلب کیا ہے - وہ ایک معمر سفید ریش آدمی ہے سر مُنڈا ہوا ہے - اُس نے مراسم شاہی ادا کر کے ایک خط دیا ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ بخیریت پہونچا فتنۂ بغاوت رفع ہو گیا اب ممالک محروسہ میں امن ہے - اتفاقاً اُسکی آنکھ کھُلی تو اُسے فرزند کے قاصد کی اطلاع دی گئی - بُلایا تو وہی قاصد اور وہی خط ہے جو ابھی خواب میں دکھا تھا - یہ ماجرا دیکھکر وہ نہایت متحیر ہوا - اور اُس روز سے وہ منکرین خواب کے زمرے سے نکل کر ماننے والوں کے گروہ میں شامل ہو گیا - اسی قسم کے اور بھی صدہا خواب ہیں جو ہو بہو واقعہ کی صورت میں پیش آئے ہیں جنکے باعث کلیۃً خواب کی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا - میں نے اس مسئلے پر تین سال تک غور کیا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے میں نے اس کا فلسفہ دریافت کر لیا ہے لیکن اُسکے سمجھنے کے لیے ایک تمہید کی ضرورت ہے جس میں کسی قدر دماغ کی تشریح ہوگی -

فلسفۂ قدیم نے طے کر دیا ہے کہ ہر انسان بلکہ ہر حیوان میں دس دس حواس ہیں جن میں پانچ ظاہری ہیں اور پانچ باطنی -

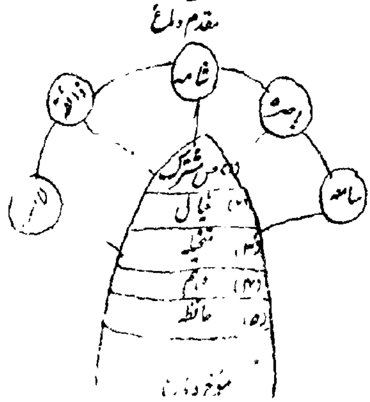
حواس ظاہری باصرہ - شامّہ - ذائقہ - سامعہ اور لامسہ جو دیکھنے، سونگھنے، چکھنے، سننے اور چھونے کی قوت کہلاتے ہیں - ان میں سے ہر ایک کا ایک ایک محل ہے جس میں یہ قوٰی ودیعت رکھی گئی ہیں چنانچہ قوتِ باصرہ کا آنکھ، شامّہ کا ناک، ذائقہ کا زبان، سامعہ کا کان اور لامسہ کا خصوصاً ہاتھ اور عموماً تمام بدن محل ہے -

قوتِ باصرہ سے ہر شے کا رنگ، شامہ سے بُو، ذائقہ سے مزہ، سامعہ سے آواز اور لامسہ سے سختی، نرمی، سردی، گرمی، کھُرکھُراہٹ اور چکناہٹ محسوس ہوتی ہے - انکے مقابلہ میں حواس باطنی حسِ مشترک، خیال، متخیلہ، وہم اور حافظہ ہیں -

تفہیم کے لیے دماغ میں پانچ تجویفیں (خانہ۔خول) فرض کی گئی ہیں۔ اُن میں سے علی الترتیب ایک ایک تجویف ایک ایک قوت کا محل ہے۔

نقشہ حاشیہ سے معلوم ہوگا کہ پہلی تجویف حس مشترک کی۔ دوسری خیال کی۔ تیسری متخیلہ کی۔ چوتھی وہم کی اور پانچویں حافظہ کی محل ہے۔

شکل دماغ



حواس ظاہری کے محل یعنی آنکھ۔ناک۔ کان۔ زبان اور ہاتھ خود اُن کیفیات کا ادراک نہیں کرتے جن کا تعلق اُن سے ظاہر کیا گیا ہے بلکہ وہ بطور مخبر و جاسوس اُن کیفیات کو حس مشترک تک پہونچا دیتے ہیں اور وہ اُنکا ادراک کرتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ واسطۂ ادراک ہیں خود مُدرِک نہیں ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ نہ آنکھ دیکھتی ہے، نہ کان سُنتے ہیں، نہ ناک سونگھتی ہے، نہ زبان مزہ معلوم کرتی ہے اور نہ جسم کا کوئی حصہ سردی گرمی یا سختی نرمی محسوس کرتا ہے۔ بلکہ دیکھنے، سُننے، سونگھنے، مزہ معلوم کرنے اور سردی گرمی وغیرہ محسوس کرنے والی حس مشترک ہے اور یہ سب اُسکے ادراک کے لیے واسطہ ادراک ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حس مشترک حواس ظاہری کا مستقر ہے۔ اور اس کا فعل یہ ہے کہ حواس ظاہری کے مخبر یا جاسوس اسے جو خبر دیں یہ بلا اختلاف اُسے قبول کرے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جن اشیا کی کیفیات بواسطۂ باصرہ کے حاصل ہوں وہ مُبصَرات۔ جنکی بواسطہ شامہ کے حاصل ہوں وہ مشمومات۔ جن کی بواسطہ ذائقہ کے حاصل ہوں وہ مذوقات جن کی بواسطہ سامعہ کے حاصل ہوں وہ مسموعات اور جن کی بواسطہ لامسہ کے حاصل ہوں وہ ملموسات کہلاتی ہیں۔

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ حس مشترک کسی کیفیت کا ادراک اُسی وقت تک کرتی ہے جب تک

وہ اشیا جن کی یہ کیفیت ہے، حواس ظاہری کے مقابلہ میں، یعنی شمومات شامہ یا ناک کے،
مذوقات ذائقہ یا زبان کے، مبصرات باصرہ یا آنکھ کے، ملموسات لامسہ یا ہاتھ کے اور مسموعات
سامعہ یا کان کے مقابلہ میں رہیں۔ اور جب یہ اشیاء حواس پنجگانہ کے مقابلہ سے جدا ہو جاتی ہیں
توحس مشترک کا ادراک بھی معطل ہو جاتا ہے۔ لیکن حس مشترک ان تمام کیفیات کی تصویریں خزانۂ
خیال میں جو اسکے بعد کی تجویف میں ہے جمع کر دیتی ہے اور خیال میں وہ سب صورتیں محفوظ رہتی
ہیں۔ قوتِ خیال کا کام یہ ہے کہ جب حس مشترک کو اُس شے سے سابقہ پڑے جسکی تصویر خیال
میں محفوظ ہے تو یہ اُسے پہلے کا تعلق یاد دلادے۔

اسکی مزید تفصیل یہ ہے کہ حس مشترک مثلاً سیب کے رنگ کا اُس وقت تک ادراک کرتی ہے
جس وقت تک وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب وہ آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے توحس مشترک
کا ادراک بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اُسکی ایک تصویر خزانۂ خیال میں آجاتی ہے۔ خیال اُس تصویر
کو محفوظ رکھتا ہے۔ اور جب پھر سیب آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یہ پہلے کا دیکھنا یاد دلا دیتا ہے۔
اسی طرح سیب کے مزہ کا ادراک حس مشترک کو اُس وقت تک ہوتا ہے جب تک سیب کا ٹکڑا
زبان پر ہے۔ مگر جب وہ زبان سے حلق کے نیچے اتر جاتا ہے توحس مشترک کو اُسکے مزہ کے دریافت
کرنے سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور اُسکے مزہ کی تصویر حس مشترک سے خزانۂ خیال میں آجاتی ہے۔
اور خیال دوبارہ سیب کھانے کے وقت یاد دلاتا ہے کہ یہ مزہ پہلے کا چکھا ہوا ہے۔ اسی طرح
سیب کی بو کا ادراک بھی حس مشترک اُسی وقت تک کرسکتی ہے جب تک وہ ناک کے پاس ہے۔
جب وہ ناک کے پاس سے ہٹ جاتا ہے توحس مشترک اُسکی بُو کی تصویر کو خزانۂ خیال میں داخل
کر دیتی ہے۔ اور خیال پھر اُسکے سونگھنے کے وقت پہلا تعارف یاد دلا دیتا ہے۔ اسی طرح جب تک
سیب ہاتھ میں ہے حس مشترک اُسکی سختی اور چکناہٹ کا ادراک کرتی ہے۔ مگر جب وہ ہاتھ سے
جدا ہو جاتا ہے توحس مشترک کا ادراک ختم ہو کر اُسکی سختی اور چکناہٹ کی تصویر حس مشترک سے
خزانۂ خیال میں آجاتی ہے۔ اسی طرح کسی کی آواز کا ادراک بھی حس مشترک اُسی وقت تک

کرتی ہے جب تک آواز کان میں آتی ہے - جب آواز رُک جاتی ہے تو حس مشترک اُسکے ادراک سے معطل ہو جاتی ہے - اور اُس آواز کو خزانۂ خیال میں داخل کر دیتی ہے - وغیر ذالک من المدرکات۔

قوت تخیلہ کو متصرفہ مفکرہ اور مصورہ بھی کہتے ہیں - اسکے فرض منصبی اچھی طرح اُسی وقت سمجھ میں آئیں گے جب وہم اور حافظہ کے تصرفات سمجھ میں آ جائیں -

قوتِ وہم جسے واہمہ بھی کہتے ہیں اسکا کام محسوسات سے معانی کا استنباط کرنا ہے - یہ بالکل حس مشترک کی ضد ہے - حس مشترک صُوَرِ محسوسات کا ادراک کرتی ہے اور یہ اُنکے معانیِ جزئیہ کا - حس مشترک کسی چیز کا ظاہر دریافت کرتی ہے اور یہ باطن -

عقل بھی معانی کا ادراک کرتی ہے ، مگر وہ معانیِ مدرکۂ وہم سے کلیات اخذ کر لیتی ہے - وہم عموماً عقل کو مغالطہ دیتا ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ وہم کے مُدرکات اکثر غلط ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز غلط معلومات سے اخذ کی جائے گی وہ بھی غلط ہوگی - بسا اوقات وہم عقل کا مقابلہ کرتا اور اُسپر غالب آ جاتا ہے - ایسے مواقع پر وہم کا حکم ہمیشہ غلط ہوتا ہے - مثلاً عقل بتاتی ہے کہ زندہ تو کسی قدر اضرار و ایذا کی قدرت بھی رکھتا ہے مگر مردہ کچھ نہیں کر سکتا - یہ ایک ایسی ظاہر اور بدیہی بات ہے کہ ہر شخص بلا تردد اسے تسلیم کرلے گا - مگر کسی کو تنہا مکان میں رات کے وقت مُردے کے ساتھ بند کر دیا جائے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ بھی اسے ڈر کے مُردے کے ساتھ صبح کو مُردہ ملے - خدا جانے وہم نے کیا پٹی پڑھا دی کہ عقل کی پیش نہ چل سکی -

اسی طرح راستہ چلنے کے لیے بالشت دو بالشت زمین کافی ہے - اگر اسی مقدار کا ایک پُل ندی پر بنا دیا جائے اور کسی کو اُسپر چلایا جائے تو ضرور لڑکھڑا کے ندی میں جا رہیگا - یہاں بھی عقل کا حکم وہم کی رائے کے بالکل خلاف ہے مگر وہم باوجود ہٹ دھرمی کے عقل پر غالب آ گیا -

ایک شخص اپنے بیٹے کو دیکھتا ہے تو اُسے اُسپر پیار آتا ہے - ماں باپ کو دیکھتا ہے تو اُنکی طرف کشش ہوتی ہے - سانپ اور شیر وغیرہ کو دیکھتا ہے تو اُن سے خوف اور دہشت

پیدا ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہم ہی نے کام کیا ہے۔ اُس نے فرزند سے معنی محبوبیت اور ماں باپ سے دوستی اور سانپ اور شیر سے دہشت اور نفرت کا انتزاع کیا اور نہایت صحیح کیا۔

حس مشترک کی طرح وہم بھی محسوسات سے معنی کا انتزاع اُسی وقت تک کرتا ہے جبتک وہ حواس کے مقابلہ میں رہیں۔ جب وہ حواس کے مقابلہ سے غائب ہو جاتے ہیں تو وہم اپنے مُدرکات کو خزانۂ خیال میں جمع کر دیتا ہے اور خود اور معانی کے انتزاع کے لیے فارغ ہو جاتا ہے۔ الحاصل، حس مشترک، خیال، وہم اور حافظہ کے سمجھ لینے کے بعد اب قوت متخیلہ کے افعال کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ یہ قوت حقیقت میں عجیب و غریب سیرزمین یا جام جہاں نما ہے کہ آناً فاناً تحت الثریٰ سے عرش تک یا ماہ سے ماہی تک کی سیر کرا دیتی ہے۔ آدمی اپنی خوابگاہ میں بےخبر سوتا رہتا ہے اور یہ اُسکے سامنے نئے نئے نقشے، نرالی تصویریں اور انوکھی شکلیں پیش کر کے اُسکی زندگی کے تھوڑے سے عرصہ کو دلچسپ کر دیتی ہے۔

یہ قوت خزانۂ صورت و خزانۂ معنی یعنی خیال اور حافظہ کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اسکا کام صورِ مخزونۂ خیال اور معانی مجتمعۂ حافظہ میں ترکیب دینا یا صرف صورِ خیالیہ و معانی موہومہ میں تصرف کرنا ہے یا بالفاظ دیگر خزانۂ خیال سے مبتدا اور خزانۂ حافظہ سے خبر اخذ کر کے دونوں کا جملہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً وہ خیال سے فرزند کی تصویر اور حافظہ سے معنیِ محبوبیت اخذ کر کے دونوں کو ملاتی ہے جس سے یہ جملہ پیدا ہو جاتا ہے کہ فرزند محبوب ہے۔

کبھی صرف صورِ خیالیہ میں تصرف کرتی ہے۔ مثلاً کسی کا دھڑ اور کسی کا سر ملا دیتی ہے۔ دانت کسی کے تو آنکھیں کسی کی۔ الغرض بالکل نئی نئی شکل کے پُتلے بنا دیتی ہے۔ مثلاً بھوت کا تصور کریں تو یہاں قوت متصرفہ کا کام یہ ہے کہ جانداروں کے معیب اعضا لیکے سب کا ایک پُتلا بنا کر بھوت کی شکل تیار کر دے۔

کبھی صرف معانی میں تصرف کرتی ہے۔ مثلاً محبت سرمایۂ زندگی ہے۔ یہاں قوتِ متصرفہ نے صورِ محسوسات سے کام نہیں لیا صرف معانی سے کام لیا ہے۔

الغرض یہ دو خزانے ہر وقت اسکے قبضۂ تصرف میں رہتے ہیں اور وہ روز ولادت سے یوم وفات تک برابر ان میں تصرف کرتی رہتی ہے۔ اگرچہ یہ ضرور نہیں کہ اسکا تصرف ہمیشہ صحیح ہو۔ بلکہ اکثر غلط ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی صحیح بھی ہوتا ہے۔ مثلاً خدا کی صفات سنکے قوت متصرفہ ایک خاص نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کردیتی ہے۔ مگر وہ کسی طرح خدا کی تصویر نہیں ہوسکتی کیونکہ فلسفہ اور علم کلام میں ثابت ہوچکا ہے کہ خدا کا تصور محال ہے۔

یہ صحت و بیماری، خواب و بیداری، خوشی و شادی، رنج و غم ہر حالت میں نہایت ستعدی سے اپنے فرائض انجام دیتی رہتی ہے اور کبھی اسے فرصت نہیں ملتی۔ یہاں چند حالتیں ہیں۔ کبھی تو انسان کو اسکے تصرفات کی طرف التفات ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ پھر تصرفات کے وقت انسان کبھی حالت خواب میں ہوتا ہے کبھی بیداری میں۔ پھر یہ تصرفات کبھی صادق ہوتے ہیں کبھی کاذب۔ یہ چھہ صورتیں ہوئیں:۔

(۱) اگر یہ تصرفات بحالتِ بیداری ہوں اور انکی طرف التفات نہ ہو تو ان کا کوئی خاص نام نہیں۔

(۲) اگر یہ تصرفات بحالتِ بیداری ہوں اور انکی طرف توجہ ہو اور یہ صادق بھی ہوں تو کشف و الہام کہلاتے ہیں۔

(۳) اگر یہ تصرفات بحالتِ بیداری ہوں اور انکی طرف توجہ ہو اور یہ کاذب ہوں تو وساوس کہلاتے ہیں۔

(۴) اگر یہ تصرفات بحالتِ خواب ہوں اور انکی طرف التفات نہ ہو تو انکا بھی کوئی خاص نام نہیں۔

(۵) اگر یہ تصرفات بحالتِ خواب ہوں اور انکی طرف توجہ ہو اور صادق بھی ہوں تو رؤیاے صالحہ یا وحیِ منامی کہلاتے ہیں۔

(۶) اگر یہ تصرفات بحالتِ خواب ہوں اور اُن کی طرف توجہ بھی ہو اور وہ کاذب ہوں تو اضغاثِ احلام کہلاتے ہیں۔

یہاں یہ بحث رہ گئی کہ کن لوگوں کی قوت متصرفہ کے تصرفات صحیح وصادق ہوتے ہیں اور کن کے غلط و کاذب - وہ لوگ جنھوں نے قوائے ملکی کو ریاضت و مجاہدہ سے قوی و توانا کر لیا ہے بالعموم اُنکے تمام قوٰے اعتدال اور راستی کی حد میں رہ کر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں - اُنکی قوتِ متخیلہ بھی کبھی غلط ترکیب نہیں دیتی - یہی وہ لوگ ہیں جن کے خواب رویاے صالحہ اور بیداری کے تصرفات کشف و الہام کہلاتے ہیں -

وہ لوگ جنکی روحانی تربیت نہیں ہوئی ہے نہ ملکاتِ ذمیلہ سے اُنکا نفس پاک ہے عموماً اُنکے افعال ظاہری و باطنی دونوں دیانت سے دور ہوتے ہیں - اُنکے خواب بھی عموماً اضغاث احلام اور بیداری کے تصرفات وساوس و خیالات پریشان ہوتے ہیں - میرا یہ مطلب نہیں کہ انکے خواب کبھی سچے نہیں ہوتے - مقصود یہ ہے کہ کبھی سچے بھی ہو جائیں تو وہ اس اہتمام کے قابل نہیں ہیں جو اُنکے ساتھ عوام الناس کی طرف سے کیا جاتا ہے -

اگر اس سے تسلی نہ ہوئی ہو تو یہ اصول ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ جو خیالات بحالت بیداری ذہن میں گذرتے ہیں عوام الناس بھی اُنھیں قابل التفات نہیں سمجھتے نہ اُنکے ساتھ اعتنا کرتے ہیں - حالانکہ بیداری کی حالت میں عقل بہت کچھ مدد دیتی رہتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اُن سے تصویر کی طرح کسی شئی کی جھلک نظر آتی ہے کوئی اصلی اور واقعی صورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ عقل بتاتی ہے کہ ان میں واقعیت بالکل نہیں ہے - یہ قوت متخیلہ کی مخترعہ صورتیں ہیں -

تو وہ خیالات جو بحالت خواب ذہن میں آتے ہیں اور جن میں عقل بوجہ معطل ہونے کے کسی قسم کی مدد بھی نہیں دے سکتی کب قابل التفات ہو سکتے ہیں - چونکہ خواب کے خیالات میں عقل کی مدد نہیں ہوتی اسی لیے وہ اصلی واقعات معلوم ہوتے ہیں اور آنکھ کھلنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا - بیان مذکورۂ بالا سے میرے خیال کے موافق خواب کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی - اور کسی مزید تفصیل کی حاجت نہیں رہی -

احمد عبد الحلیم کان اللہ لہٗ (مولوی فاضل و کامل) سنگا ریڈی ضلع میدک (دکن)

غزلیات

شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی (از انگلستان)

شگفتہ دیکھتے ہی گُل کو بُلبُل یہ پکار آئی
مشیرِ عشق پرور اُٹھ چمن میں پھر بہار آئی

نگاہِ ناز نے تیری یہ سیکھی کس سے نقاشی
کہ میرے شیشۂ دل میں تری تصویر اُتار آئی

اُجاڑا آشیاں میرا۔ اُکھاڑے بال و پر میرے
اور اب آ کر یہ کہتے ہو۔ بہار آئی بہار آئی

ہمیں خار اور ثمر اَوروں کو اس گلشن سے نسبت
جو ہم آئے خزاں آئی۔ جو غیر آئے بہار آئی

وہ رہزن ہیں چلے ہیں قافلہ سالار جو بن کر
صدائے ہاتفِ غیبی یہ مجھکو بار بار آئی

قفس میں تو ہے بلبل۔ میں ہوں گُل سے دُور اُفتادہ
تجھے کیا گُل اگر پھولے۔ مجھے کیا گر بہار آئی

نسیم صبح لائی کچھ بشارت کیا مدینے سے
کہ لب پر آج میرے مسکراہٹ بار بار آئی

وہ سنکر نغمۂ دلسوز خود بھی ہو گئے مضطر
مقابل میں مشیرِ خستہ جاں کے جب ہزار آئی

(مزے میں وہ ہیں جو جنگل کے لیے ہیں ۔ چمن میں تو ہوں اسیر رنج یاں بار بار آئی)

آتشِ گُل نے مرے دلکو جلا رکھا ہے
پھر بھی میں نے اُسے سینے سے لگا رکھا ہے

دل تھا مطلوب تو کیوں آگ لگائی تم نے
اب جلے تن میں سوا خاک کے کیا رکھا ہے

چشمِ تر ہی نے کیا عالمِ امکاں غرقاب
دل کے طوفاں کو ابھی ہم نے دبا رکھا ہے

دل پہ قدرت نہ تھی وہ ہو گیا مائل بُت پر
اے خدا سر کو ترے آگے جھکا رکھا ہے

شوقِ آزادگی و ہمتِ پرواز کے ساتھ
ہمنے کچھ اور بھی اس دل میں چھپا رکھا ہے

ہاں خبردار کہ ممکن نہیں اب ضبطِ فغاں
تو نے اے چرخ بہت مجھکو ستا رکھا ہے

مُلکِ الفت میں جو ہے شامِ پشیمانے فراق
نام لوگوں نے اُسی کا تو قضا رکھا ہے

وہ جو پیغام محمدؐ نے سنایا تھا تجھے
تو نے اے قوم اُسے آج بھلا رکھا ہے

یاد آئے نہ مجھے کیوں مرا گلزار[1] حبیب
لندن آخر ترے گلزاروں میں کیا رکھا ہے

ہر نفس موکو مرے شوقِ شہادت ہے مشیر
موت سے کیا۔ مجھے ظالم نے ڈرا رکھا ہے

[1] شاعر کا ایک باغ

خمیازہ

(۱)

سلطان کیقباد : میں نے سنا ہے کہ یہ ترک غلام کچھ سر اُٹھانا چاہتے ہیں؟

وزیر نظام الدین : بالکل صحیح ہے بندگان عالی! یہ لوگ بہت ہی بے لگام ہوتے جاتے ہیں۔ اگر انکا انتظام جلد نہ کیا گیا تو پھر اس فتنہ کا دبایا جانا مشکل ہے! لیکن اس سے زیادہ خطرناک ایک اور امر ہے۔

کیقباد : (گھبرا کر) وہ کیا؟ جلد بیان کرو!

وزیر : اگر جان کی امان پاؤں، تو زبان پر لاؤں!

کیقباد : جو کچھ کہنا ہے بے اندیشہ کہو۔ مگر جلد!

وزیر : مجھے خسرو کی طرف سے سخت اندیشہ ہے۔

کیقباد : یعنی؟

وزیر : بندگانِ عالی واقف ہیں کہ سلطان خلد مکاں (بلبن) نے اُسی کو ولیعہد سلطنت مقرر کیا تھا پس اب بھی وہ اپنے آپ کو حکومت کا مستحق اور اعلیحضرت کو غاصب سمجھتا ہے۔ غضب کی بات تو یہ ہے کہ اکثر نادان اور خود غرض امراء و ملوک اُسکے حامی و طرفدار اور اُسکے دعوے کے موید ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ موقع کی تاک میں ہے اور حضور کے دشمنوں کی جان ......

کیقباد : (چونک کر) ہیں! کیا یہ سچ ہے؟

وزیر : بالکل سچ! حرف حرف صحیح۔ میں کامل تحقیقات کر چکا ہوں۔ شک کی گنجایش بالکل نہیں۔ میں نے کئی معتمد جاسوس ملتان روانہ کیے تھے۔ وہ عرصے تک وہاں رہے۔ اور اُسکے عزائم و منصوبے خود اُسکی زبان سے سُنتے۔ اب اس سے زیادہ معتبر شہادت اور کامل ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

کیقباد : اچھا تو اب کیا کیا جائے؟ تمھیں کوئی تدبیر سوچو!

وزیر : (بعد تامل) ہزار تدبیروں کی ایک تدبیر یہ ہے کہ قبل اسکے کہ وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ

پہنائے خود اُسی کا قلع قمع کر دیا جائے۔ میرے خیال میں آپ حکمنامہ بھیجکر اُسے ملتان سے یہاں طلب فرمائیں۔ مگر دہلی پہونچنے سے قبل ہی اُسے تہ تیغ کرا دیں۔

کیقباد :(جھوم کر) یہ سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہوگا! تم میری طرف سے اُسکے نام طلبی کا حکم لکھو! میں دستخط کیے دیتا ہوں۔

وزیر (فوراً کاغذ لکھکر) لیجیے! جہاں پناہ حاضر ہے!

کیقباد : ہاں کیا؟ —— دستخط! —— لو ہو گئے۔

وزیر : غالباً حضور کو مغلوں کے منصوبوں کی تو اطلاع ہو گی؟

کیقباد :(ہوشیار ہو کر) نہیں مجھے کچھ نہیں معلوم! کیوں! اُنکو کیا ہوا؟

وزیر : کیا عرض کروں! یہ کمبخت مغل تو غدر اور انقلابِ حکومت کی کھچڑی پکا رہے ہیں! حضور کو معلوم ہے کہ انکی جمعیت ہزاروں کی ہے۔ اگر انھیں ذرا بھی مہلت ملی تو جو کچھ اُنکے دل میں ہے وہ کر ہی گذریں گے!

کیقباد : یہ تو بڑی خطرناک بات ہے! —— اچھا میں تمھیں کامل اختیار دیتا ہوں کہ جس طرح بھی بن پڑے اس فتنہ کو دباؤ۔ اگر ضرورت ہو تو انکا قتل عام کرا سکتے ہو مگر جو کچھ کرنا ہو جلد کرو!

یہ کہتے کہتے وہ مدہوش ہو کر تخت پر چاروں شانے چت آ رہا۔ —— وزیر اپنی کامیابی پر خوش خوش اپنے مکان کو گیا۔

(۲)

شہنشاہ بلبن نے ہندوستان میں جس شان و شوکت اور طمطراق کے ساتھ حکومت کی تاریخ اُسکی شاہد عادل ہے۔ لیکن افسوس کہ اُسے قابل جانشین نہ ملا۔ اُسکا ایک لائق اور شجاع فرزند شہزادہ سلطان محمد خاں عین عنفوان شباب میں مغلوں کے ہاتھ سے نماز پڑھتے ہوے شہید ہوا جو تاریخ میں خان شہید کے نام سے زندۂ جاوید ہے۔ دوسرا فرزند بغرا خاں ریاست و سیاست کا اہل نہ نکلا اور باپ کی اجازت کے بغیر ہی بنگالہ چلا گیا۔ شہنشاہ بلبن کے لیے آخر عمر میں یہ غم

نا قابل برداشت ہوگیا۔ ع۔ دشمن کو بھی اللہ نہ دے داغ پسر کا۔ اولاد نہ ہونے کا صبر تا ہم لیکن نا اہلیت کا ناسور بھرنے ہی نہیں آتا۔ حتیٰ کہ بلبن مرض الموت میں مبتلا ہوگیا اور قبل وفات اس نے وصیت کی کہ میرے بعد شہزادہ کے خسرو (ابن خان شہید) تخت نشیں کیا جاوے! اس واقعہ کے تیسرے روز بلبن عازم ملک بقا ہوا (انا للہ) یہ حادثہ جانکاہ ۶۸۵ھ میں واقع ہوا۔ جس نے تمام ہندوستان خصوصاً دار السلطنت دہلی کو مہینوں تک ماتمکدہ بنائے رکھا۔ خاص و عام نے سلطان کے ماتم میں بغیر سرکاری اثر کے حصہ لیا۔ اس لیے کہ بلبن کی حکومت کی ہر دلعزیزی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔

حسب وصیت سلطانی۔ تخت نشیں خسرو کو کرنا چاہیے تھا! مگر بلبن کی آنکھیں بند ہوتے ہی درباری امرا خود غرضی کے بندے بن گئے۔ ان لوگوں نے محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھا۔ امیر الامرا فخر الدین دربار میں خاص اثر اور رسوخ رکھتا تھا۔ گویا فی الحال عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسے خان شہید کے ساتھ ذاتی عناد تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہزادہ کیخسرو اور بلبن کی وصیت کو نظر انداز کر کے ۶۸۶ھ میں اٹھارہ سالہ کیقباد (ابن بغرا خاں ابن بلبن) کو دہلی میں تخت نشیں کر لیا۔ یہ موقع اس وجہ سے اور بھی آسانی سے مل گیا کہ اس وقت شہزادہ کیخسرو دہلی میں موجود نہ تھا، بلکہ ملتان میں سپہ سالاری کے عہدے پر مامور تھا۔

کیقباد کا تخت پر قدم رکھنا تھا کہ دربار کا رنگ ہی بدل گیا۔ ہر طرف آتش لباسی کے شعلے بھڑکتے نظر آنے لگے۔ جسکو شعلہ رویوں کی آتش رخی نے اور بھی بھڑکا دیا۔ بلبن کا وہ شاندار اور متین دربار جو کبھی علما و فضلا اور اہل دل کا مرجع و مرکز بن رہا تھا، یکایک اندر کا دربار بن گیا۔ خام کار نوجوان کیقباد کھل کھیلا۔ جسے عیش و نشاط سے فرصت ہو وہ کاروبار سلطنت کا دردسر مول لے۔

کل انسان علیٰ دین ملوکہم۔ اس وقت شاہی دربار ہی نہیں، بلکہ تمام دار السلطنت

عیش خانہ بن گیا، خاص و عام پر یہی رنگ چڑھ گیا۔ چند روز بعد کیقباد نے دہلی چھوڑ کر کیلوکھری میں "عیش محل" تعمیر کرایا اور اسکی تکمیل پر وہیں اُٹھ گیا۔ امیرزادوں اور وابستگانِ دامانِ دولت نے بھی اُسکی تقلید کی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن کاروبار سلطنت میں ہنوز کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوا۔ کام بدستور چلتا رہا۔ عالمگیر امن و امان قائم رہا۔ امیرالامرا فخرالدین اور وزیر نظام الدین، ہزار خودغرض ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم اور مدبر تھے۔ ایک مورخ کا قول ہے کہ اگر نظام الدین کا دامن بیوفائی اور نمک حرامی کی نجاست سے آلودہ نہ ہوتا تو بلاشبہ وہ برخیا ثانی تھا۔

امیرالامرا اور وزیر کی کوشش سے کیقباد کو تخت نصیب ہوا۔ یہ لوگ اس شہزادے کی طبیعت سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ اب ہمارے ہاتھ رنگنے کا خوب موقع ہے۔ اس وقت وزیر نظام الدین (دامادِ امیرالامرا) تمام کاروبار سلطنت پر قابض اور سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے کیقباد کی حالت درست کرنے اور اُسکو سنبھالنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ اسکی بیوی (دختر امیرالامرا) کیقباد کی مُنھ بولی ماں بنی ہوئی تھی۔ مگر افسوس کہ کبھی کوئی کلمۂ خیر اس ماں کے منھ سے بھی نہ نکلا۔ اور کبھی اس نے بھولے سے بھی نام نہاد فرزند (کیقباد) کو ہوشیار نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی طرز عمل کے اندر ان لوگوں کا ذاتی فائدہ مضمر تھا۔ نظام الدین خود اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور جن لوگوں کو اپنا سدِراہ سمجھتا تھا اُنکے استیصال پر اس نے کمر باندھ لی تھی!

نظام الدین نے خطرہ دکھا کر کیقباد کو آمادہ کیا کہ کیخسرو کا قصہ پاک کیا جائے۔ اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوا۔ کیقباد نے بحالتِ نشہ اُسکے محضر قتل پر دستخط کر دیے۔ کیخسرو ملتان سے طلب کیا گیا۔ مگر جو لوگ نظام الدین نے اُسکے قتل پر مامور کیے تھے اُنھوں نے راستہ ہی میں اُسکا کام تمام کر دیا۔

سلطان شمس الدین التمش نے ترک غلاموں کی تربیت پر خاص توجہ کی۔ اسکے عہد میں چالیس غلام گورنری اور سپہ سالاری کے درجے تک پہونچے، جو ہندوستان کے مختلف صوبجات پر حکمراں

رہے۔ ان "چہل گانی" ترکوں میں سے سلطان بلبن نے اکثر کو بخیال رقابت ٹھکانے لگایا۔ مگر باقیماندہ عہدِ بلبن میں طاقتور اور معزز امرا کی حیثیت رکھتے اور ترکی نسل کے حامی و مددگار تھے۔ نظام الدین نے کیقباد کو سمجھایا کہ یہ لوگ بھی اسکی حکومت کے لیے کم خطرناک نہیں۔

اس وقت کئی ہزار نو مسلم مغل دہلی میں موجود اور خاص طاقت رکھتے تھے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہی وہ طاقت تھی جو آڑے وقت سلطنت کے کام آسکتی تھی! لیکن ہوشیار مگر خود غرض نظام الدین نے غافل اور خام کار کیقباد کے کان بھرے کہ وہ غدر پر آمادہ ہیں۔ اور اس طرح اُس نے (وزیر نے) حکومت سے اُنکے استیصال کی اجازت لی۔ اس فسانے کا حلقۂ اول اسی تفصیل کا مجمل مکالمہ ہے!

نظام الدین نے ایک روز مغل سرداروں کو کوشکِ سلطانی میں مدعو کرکے دھوکے سے قتل کرایا۔ ان کا گھربار لٹوایا۔ بال بچے گرفتار کیے۔ پھر انکے عزیزوں کو گرفتار کرا کے دور دراز قلعوں میں نظربند کرایا۔ ملک شاہک گورنر ملتان، اور ملک توزکی وزیر جنگ کو جو امرائے بلبن میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، فریب سے تہِ تیغ کرایا۔ اور اب میدان صاف تھا۔

یہ واقعات ایسے نہ تھے کہ باقی امرا مرعوب اور دہلی بلی نہ بنجاتے! تاہم بعض حقیقی خیرخواہان دولت نے موقع پایا تو کیقباد کو نظام الدین کا منصوبہ سمجھا کر اُسے ہوشیار کرنا چاہا۔ مگر اُسکی سادگی یہاں کو پہنچ گئی تھی۔ کہ وہ نادان سب کچھ نظام الدین سے کہہ دیتا تھا۔ اور اسکی پاداش میں وہ لوگ تہِ تیغ کیے جاتے تھے۔ اس طرح کیقباد کی خیرخواہی کا دروازہ بالکل بند ہوگیا۔

(۳)

کیقباد کو تخت نشین ہوے تین سال گذر گئے ہیں، مگر رنگ اب بھی وہی ہے۔ ہنوز روزِ اول! اس وقت کیقباد قلعہ دہلی کے ایک کمرے میں کسی قدر متفکر بیٹھا ہے۔ دو مہ جبین پیش خدمتیں دست بستہ حاضر ہیں۔ وہ ایک کاغذ کو نہایت غور سے پڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ضروری مراسلہ ہے جو اُسکے باپ بغرا خاں نے اُسے لکھنوتی (بنگال) سے بھیجا ہے۔ کیقباد اسے دیر تک غور و خوض سے

دیکھتا رہا۔ پھر یکایک چونک کر اُس نے حیرت و استعجاب کے لہجے میں کہا۔
کیا یہ سچ ہے، جو پیر بزرگوار نے لکھا ہے؟ کیا نظام الدین سے واقعی مجھے خطرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطنت کی انتظامی عنان ایک شخص (نظام الدین) کے ہاتھ میں نہ دو۔ بلکہ اُنکی رائے ہے کہ نظام الدین اور قوام الدین کے ساتھ دو اور امیر شریک کر کے انتظامی کونسل بنائی جائے! اور ان میں سے ہر ایک رکن کے سپرد علٰحدہ علٰحدہ وزارت، فوج، دفتر، اور مال کا محکمہ کیا جائے۔ مگر ہر امر کا فیصلہ ان چاروں کی رائے سے بعد بحث و مباحثہ ہو۔ اور میں اس کونسل کے اصول کار کا نگراں رہوں۔"
فی الحقیقت یہ سچ ہے۔ میں نظام الدین کے تیور پہلے ہی سے بدلے ہوئے پاتا ہوں۔ افسوس مجھ سے غفلت ہوئی۔ کئی اُمرا نے مجھے ازراہ خیر خواہی اسکی اطلاع بھی دی، مگر مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن اب کیا کرنا چاہیے؟ ——— اچھا میں اُسے یہاں سے نکالے دیتا ہوں! ملتان اس کا چلا جانا مناسب! لیکن اگر اُس نے چون و چرا کی تو پھر؟ ——— پھر بغیر اسکا قصہ پاک کیے میری جان، اور اس سلطنت کی خیر نہیں! خیر دیکھا جائے گا۔ اب میں نے اُسے اصلی حالت میں دیکھ لیا ہے، اس سے ہوشیار رہوں گا۔ فی الحال وہ کچھ نقصان نہیں پہونچا سکتا ———

* * * * * * * * *

نظام الدین نے فی الحقیقت ملتان جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اسکے بعد وہ دنیا میں زیادہ عرصے نہ رہا۔ ایک شب وہ ناگہاں مردہ پایا گیا۔ کوئی زخم وغیرہ اُسکے جسم پر نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ نظام الدین کے خاص طرز عمل سے اُسکے بیشمار دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے شراب کے اندر اُسے زہر دے دیا۔ ممکن ہے کہ یہ کارروائی کیقباد کے اشارہ سے عمل میں آئی ہو۔ بہر حال فی الحال سلطنت کو نظام الدین کے ہتھکنڈوں سے نجات مل گئی۔ اور کیقباد اس جانب سے مطمئن ہو گیا۔ لیکن اسکے بعد خلاف توقع جدید قسم کے واقعات پیش آئے۔
نظام الدین دنیا میں نہ رہا۔ لیکن یہ صورت بھی نقصان سے خالی نہ تھی۔ اب اُس دل

وداغ اور رعب داب کا کوئی امیر دہلی بھر میں باقی نہ رہا جو سلطنت کو سنبھال سکتا۔ بلبنی امرا پیشتر ہی تلوار کے گھاٹ اُتارے جا چکے تھے۔ لہذا کاروبار سلطنت میں ابتری پیدا ہو جانی یقینی تھی!

کیقباد اپنی عیش پسندی کی بدولت روز بروز لاغر و نحیف ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اُم الخبائث کے آخری نتائج لقوہ و فالج نے اُسے محصور کر لیا۔ زندگی سے مایوسی ہوئی۔ لہذا امرائے دربار نے اسکے سہ سالہ فرزند شہزادہ کیومرث کو بخطاب شمس الدین تخت نشین کیا۔ ایک ترک وزیر، اور جلال الدین خلجی سپہ سالار مقرر ہوا۔

(۴)

امیر خاں: اگرچہ اب نظام الدین زندہ نہیں، لیکن ہم لوگوں کے لیے خطرہ اب بھی باقی ہے۔

وزیر: میں آپکا مطلب نہیں سمجھا۔ صاف صاف کہیے!

امیر خاں: آپ خلجیوں کی حالت دیکھ رہے ہیں!

وزیر: ہاں! اُنکا زور، روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ مگر پھر؟

امیر خاں: بس یہی خطرہ ہے۔ اگر اسکو دفع نہ کیا گیا تو ایک دن ہم لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔

وزیر: پھر کیا کیا جائے؟

امیر خاں: خلجیوں کا استیصال! اور بس!

وزیر: مگر یہ آسانی ممکن نہیں!

امیر خاں: مشکلے نیست کہ آساں نہ شود!

وزیر: کہ دنیا آسان ہے مگر عمل مشکل! اچھا کوئی عملی تدبیر و تجویز پیش کرو کہ رخنہ بندی کیجائے۔

امیر خاں: سب سے پہلے جلال الدین کا انتظام کرنا چاہیے!

وزیر: اور یہی سب سے مشکل کام ہے!

امیر خاں: میں نے کہا کہ دنیا میں کوئی ایسی مشکل نہیں کہ آسان نہ ہو!

وزیر: پھر وہی! میں نے بھی تو کہا کہ کوئی عملی تجویز پیش کرو۔

امیر خاں (بعد تامل) ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ آپ حکم بھیجکر جلال الدین کو سمانیو سے یہاں طلب کریں۔ لیکن اُسکے لینے کے واسطے کوئی ایسا ہوشیار آدمی جائے کہ اُسے آتے ہی بنے! اُسکے دہلی آجانے پر اُسکا قصہ پاک کرا دینا میرا کام ہوگا۔ وہ یہاں آیا نہیں اور عدم آباد کو سدھارا نہیں۔

وزیر: ہاں یہ تجویز معقول ہے اور کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جلال الدین وہاں فوج جمع کر رہا ہے۔

امیر خاں: اسی واسطے تو میں کہتا ہوں کہ قوم خلجی، بالخصوص جلال الدین، ہمارے حق میں خطرناک ہے۔ اور میں تو یہاں تک سن چکا ہوں کہ جلال الدین تخت پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے۔ ورنہ اس قدر فوج جمع کرنے کی کون ضرورت تھی۔ گویا جو کچھ کور نمک نظام الدین کے دل میں تھا وہی اسکے دل میں ہے۔

وزیر: خیر کیا مضائقہ! اُسکا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

امیر خاں: انشاء اللہ تعالیٰ! مگر آپ کی کوشش کی ضرورت ہے!

وزیر: میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھونگا۔ یہ تو اپنا قومی کام ہے۔

امیر خاں: تو پھر کام بنا بنایا رکھا ہے۔ اچھا تخفیف تصدیعہ۔ السلام علیکم۔

وزیر: وعلیکم السلام ——— فی امانِ اللہ!

(۵)

کیقباد کے عہد میں اکثر ترک امرا برسر امارت رہے۔ وزیر نظام الدین نے انکا زور توڑا۔ مگر چند ترک امیر پھر بھی باقی رہے۔ ان لوگوں نے پھر اپنی طاقت بڑھانے کا منصوبہ کیا اور دوسری قوم کے دفعیہ کی تدابیر سوچنے لگے۔ انکی مد مقابل اور حریف قوم خلجی تھی۔ اور کچھ شک نہیں کہ جلال الدین خلجی ایک اولوالعزم شخص تھا۔ وہ کیقباد کے عہد حکومت میں سمانہ

(پٹیالہ پنجاب) کی چھاؤنی کا سپہ سالار۔ پھر شاہزادہ کیومرث کے عہد میں سپہ سالار اعظم مقرر ہوا۔

اب جلال الدین نے سہارن پور میں قدیم فوج کو درست کرنے کے علاوہ بہت سی جدید فوج بھرتی کی۔ ترک اسکے طرز عمل سے چونک پڑے۔ اور بالآخر وہ قوم خلجی کے استیصال خصوصاً جلال الدین کی جان کے خواہاں ہوگئے۔ خلجی امرا کی ایک فہرست مرتب کی گئی۔ اور ان سب کے قتل کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میں جلال الدین کا نام بھی درج تھا۔ چنانچہ وزیر سلطنت نے ایک امیر سے مشورہ کرکے طے کیا کہ جلال الدین کو دہلی طلب کرکے تہ تیغ کیا جائے۔ جیسا کہ باب گذشتہ میں مذکور ہوا۔

ایک مستعد اور ہوشیار امیر خوب سکھا پڑھا کر سہارن پور بھیجا گیا کہ جس طرح بن پڑے جلال الدین کو اپنے ہمراہ دہلی لے آئے۔ چنانچہ وہ کوچ کرتا ہوا منزل مقصود تک جا پہونچا۔ لیکن وہ جوں ہی جلال الدین کے خیمہ کے دروازے پر پہونچا اور گھوڑے سے اُتر کر اندر داخل ہوا چاہتا تھا کہ دفعتاً خلاف توقع اسپر کئی آدمیوں نے خطرناک حملہ کیا۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے شکار قضا ہوگیا۔ یہ حملہ آور جلال الدین کے شجاع فرزند تھے جنکو کسی نہ کسی طرح ترکوں کا منصوبہ معلوم ہوگیا تھا۔ جلال الدین کے فرزندوں نے لگے ہاتھوں ایک اور کام کیا۔ انھوں نے فوراً پانچ سو سوار اپنے ساتھ لیکر دہلی کا کوچ بول دیا۔ اور منزل مقصود پر پہونچکر کمر کھولی۔ وہ دزدانہ قلعہ میں داخل ہوگئے۔ کمسن بادشاہ شمس الدین کو اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھا لیا اور لیکر اُڑے۔ واپسی کا کوچ بول دیا۔ ان لوگوں نے ایک اور بھی کام کیا۔ ملک الامرا فخرالدین کوتوال کے بیٹوں کو بھی قید کرکے لے گئے۔ ایک امیر نے ان لوگوں کا تعاقب کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ کھیت رہا۔ فرزندان جلال الدین سہارن پور پہونچے۔

اہل دہلی (عوام الناس) شمس الدین کی حمایت کے لیے اُٹھے۔ اور اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہوکر شہر سے باہر نکلے۔ مگر امیر الامرا نے انہیں باز رکھا۔ بڑی مشکل سے جوش فرو ہوا۔

امیر الامرا کا خیال تھا کہ اگر جلال الدین کے خلاف اس وقت کوئی کارروائی عمل میں آئی تو اُسکے بیٹوں کی جان کی خیر نہیں۔۔ جو اُسکی قید میں ہیں! ـــــــ چند روز بعد دہلی خبر آئی کہ شہزادہ شمس الدین کو کسی بے رحم نے شہید کر دیا ـــــــ انا للہ۔

جلال الدین خلجی کیلوگڑھی پہونچکر تخت نشیں ہوا۔ لوگ ابتداءً اسکی حکومت سے متوحش رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ مانوس ہو گئے۔ لیکن جلال الدین کو بڑی حکمت عملی سے کام لینا پڑا۔

کیقباد کا انجام نہایت نامبارک اور حیرتناک ہوا۔ وہ قصرِ شاہی میں پڑا دَم توڑ رہا تھا کہ دفعتاً وہاں ایک شخص پہونچا۔ کیقباد کے دو تین لاتیں ماریں۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اسکا کام تمام تھا۔ اسکی نعش کو کمل میں لپیٹ کر دریاے جمنا میں اسی شخص نے بہا دیا۔

اس طرح کیقباد نے "دختر رز" سے دل لگا کر اور بندۂ عیش بنکر صرف اپنے آبا و اجداد کی سلطنت کھوئی، بلکہ اپنی صحت اور بالآخر قیمتی جان بھی گنوائی۔ اور موت بھی کیسی ذلت، اور کیسی گمنامی کی پائی! وہ ۶۸۹ھ میں بعمر بیس سال فوت ہوا۔

یہ کیقباد کا قاتل کون تھا؟ یہ وہ شخص تھا کہ جسکے باپ کو کیقباد نے تہ تیغ کرایا تھا۔ اسلیے اب اس شخص نے ایسی سنگدلی سے اپنے مقتول باپ کا انتقام لیا۔

زمامِ حکومتِ ہند، خاندانِ بلبن کے تصرف سے نکل کر خلجیوں کے قبضہ میں آئی۔ جلال الدین خلجی اور اُسکے جانشینوں نے عرصے تک ہندوستان میں نہایت قابلیت کے ساتھ حکومت کی۔

(حکیم) مظفر حسین اظہر (دہلوی)

روز و شب ذکرِ این و آں ہے عبث
فکرِ سود و غمِ زیاں ہے عبث

عیشِ دنیا سے دوں دو روزہ ہے
اسپہ سنم تو شادماں ہے عبث

ہر خزاں کے ہے بعد فصلِ بہار
بلبلِ زار نوحہ خواں ہے عبث

غیر پورا کبھی نہ اُترے گا
جان من یا اُسکا امتحاں ہے عبث

راہ عشق و وفا میں اے حافظ
شکوۂ جور، وخوفِ جاں ہے عبث

[illegible]

نظرے خوش گزرے

گذشتہ دو سال کے اندر کاغذ کی گرانی کے سبب دوسرے صحائف کی طرح رسالہ الناظر کو بھی نقصان کثیر برداشت کرنا پڑا۔ تاہم اس خیال سے کہ ہمارے ناظرین بادامی یا اور نسبتاً ارزاں قسم کے کاغذوں سے مکدر ہوں گے، اب تک اسکی جسارت نہیں کی گئی۔ مگر اب کاغذ کا نرخ تقریباً چوگنا ہوگیا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ سفید کاغذ کی فکر کہیں خود الناظر کی ہستی کو نہ مٹادے۔ اس لیے بادلِ ناخواستہ بادامی کاغذ پر الناظر کو چھاپنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ کاغذ سب بادامی کاغذوں میں بلحاظ رنگ روپ کے عمدہ ہے۔ اور باوجودیکہ اس سے ارزاں کاغذ بھی ملتا ہے مگر جب تک ہوسکے گا ہم اسی پر الناظر کو چھاپتے رہیں گے ہمیں یقین ہے کہ مجبوراً جو تغیر اس وقت گوارا کیا گیا ہے اُسے ناظرین کرام بطیب خاطر قبول فرمائیں گے۔

الناظر کی ترتیب اور اُسکے مضامین کی نوعیت پر بھی گذشتہ سالوں میں بہت کچھ اثر پڑا ہے جسکے دو بڑے سبب تھے۔ ایک یہ کہ ۱۹۱۳ء میں کسی قدر اور ۱۹۱۴ء سے تمامتر اسکی مالی ذمہ داری ایڈیٹر الناظر کے سر آپڑی۔ اس وجہ سے ہماری توجہ کا حصۂ وافر بجائے اسکے کہ الناظر کی ترتیب پر صرف ہوتا، مالی مشکلات سے مقابلہ کرنے پر رائگان ہوا۔ دوسرا یہ کہ جسمانی عوارض خصوصاً ۱۹۱۵ء کی علالت نے ہمیں ایک بڑی حد تک اُس محنت شاقہ کے ناقابل بنا دیا جسکی اب ذمہ داریاں اور مشکلات بڑھ گئی تھیں پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔

مالی مشکلات، الناظر بک ایجنسی اور الناظر پریس کی توسیع سے رفع ہو جاتیں اگر یورپ کی عظیم الشان جنگ نے کاغذ کو اس قدر گراں قدر نہ بنا دیا ہوتا۔ اور حق یہ ہے کہ اگر قبل از وقت اور قوت سے زیادہ دماغی محنت نہ اُٹھانا پڑتی تو شاید جسمانی صحت بھی نسبتاً اطمینان بخش حالت میں رہتی۔

بہر صورت، ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے۔ انسان اپنی بساط بھر مصائب و مشکلات، عوارض و آلام کا مقابلہ کرتا ہے لیکن خدا سے قادر و توانا کی مرضی مختار کے سامنے کچھ بس نہیں چلتا۔ ہمنے بھی بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے۔ طرح طرح کی فکریں اور کوششیں کیں۔ مگر تجربے کے بعد بالیقین یہ معلوم ہوگیا کہ جب تک مرضی الٰہی نہ ہوگی ہماری کوئی کوشش بارور نہ ہوگی۔ اور ہماری سب فکریں ضایع جائیں گی تو قلب کا اضطراب دور ہوگیا اور مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود اب ایک طرح کا امن

سکون حاصل ہو گیا ہے - الحمد بید علی کل احسانہ

خدا کے فضل و کرم سے جو اطمینان قلبی اس وقت حاصل ہے اُسکے باعث امید ہے کہ ہم الناظر کی ترتیب اور باقاعدہ اشاعت پر زیادہ توجہ کر سکیں گے اور اگر خدائے کریم کی مرضی ہو گی تو الناظر کی حالت جلد سدھر جائے گی - ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر۔

ہم اُردو خوان پبلک یا قدر دانان الناظر کی شکایت نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ جو چیز ہم پیش کرتے رہے ہیں اُسکی قیمت بھی فی الاصل اس سے زائد نہیں جو ہمیں مل رہی ہے۔ تاہم ہماری آرزو اور التماس ضرور ہے کہ الناظر کے قائم رکھنے اور اُسکو ترقی دینے کی تمام ذمہ داریاں ہمارے ہی سر نہ چھوڑ دی جائیں بلکہ وہ احباب کرام بھی جو الناظر جیسے رسالے کے وجود کو ضروری جانتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ اُنکا پرچہ اب سے بہت بہتر حالت میں رہے تا امکان ان کوششوں میں ہمارے شریک کار رہیں اور ہر قسم کی مدد فرمانے سے دریغ نہ کریں۔

احباب کے شریک کار ہونے اور الناظر کی ترقی میں اعانت فرمانے کی بہترین سبیل یہ ہے کہ سب صاحب اپنے حلقۂ اثر میں الناظر کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں - جملہ خریداران الناظر سے تو ہم اسکی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہماری اس استدعا پر فوراً توجہ کریں گے - لیکن جو صاحبانِ ذوق الناظر کے قدردان اور ہواخواہ ہیں اُن سے ہمیں ضرور امید ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہ کریں گے - اگر ان میں سے ہر صاحب کم سے کم پانچ خریداروں کا اضافہ کر دیں تو الناظر کی حالت میں نمایاں ترقی ہو سکتی ہے۔

الناظر کے مہربانان قدیم محسوس کرتے ہوں گے کہ سالہائے ماسبق میں جو قیمتی مضامین الناظر شایع کرتا رہا ہے، اب اُسکا دامن اُن سے یکسر تہی نظر آتا ہے - مگر غالباً یہ کم اصحاب کو معلوم ہو گا کہ ان مضامین کی فراہمی کے لیے قطع نظر ذاتی کوششوں کے بسا اوقات کافی مقدار میں زرِ نقد بھی صرف کرنا ہوتا تھا - اور جس وقت سے اسکی استطاعت نہیں رہی الناظر اُن اعلیٰ درجہ کے مضامین سے بھی محروم ہو گیا ہے۔

بہرحال ہماری کوششوں کے نتائج تو انشاء اللہ ظاہر ہی ہوں گے - لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جو اصحاب الناظر سے بڑی بڑی توقعات رکھتے ہیں وہ کس حد تک ہمارا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں!

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۱۲ء کا آخری ہفتہ کلکتے میں ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کی محفلوں کے نذر ہوا۔ کانفرنس، مدت ہوئی کہ قوم کے تعلیم یافتہ فرقے کی منظورِ نظر نہیں رہی۔ چنانچہ اب سال بسال اُسکی محفل سونی ہوتی جاتی ہے۔ اس دفعہ صدرِ کانفرنس مسٹر حیدری کی شخصیت کے باعث جلسۂ اولیں میں تو ضرور مجمع تھا، بعد کے دو دن نسبتاً بہت پھیکے رہے۔ بلکہ ہماری نظر میں تو جلسہ ہائے شبانہ جس میں ایک شب کو مولانا سلیمان اشرف صاحب کا وعظ تھا اور دوسری رات شعبۂ نسواں کی کارروائی کے لیے رکھی گئی تھی، کانفرنس کے دن کے اجلاسوں سے زیادہ بارونق رہے۔

مسٹر حیدری کا خطبہ افتتاحیہ جسے ہم تمام و کمال آئندہ نمبر میں شائع کر سکیں گے ہر طور قابلِ قدر اور توقعات کے عین مطابق ہے ــــــ خصوصاً اُردو زبان کے متعلق جو خیالات صاحب ممدوح نے ظاہر کیے ہیں وہ نہایت توجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

مگر جلسہ کی کامیابی کا تمام تر انحصار خطبہ صدارت پر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا دارومدار تھا حقیقتاً اُس دلچسپی پر جو مجلس استقبالیہ اور مرکز کانفرنس دونوں کی متحدہ کوششوں سے عامۃ المسلمین کے دلوں میں پیدا ہونا چاہیے تھی۔

مجلس استقبالیہ تو در اصل ایک عارضی جماعت ہوتی ہے۔ اگرچہ اُسکے جوش و احساس اور مستعدی و کوشش سے بہت بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اور اصلی ذمہ داری خود اُس مجلس کے مرکزی منتظمین پر عائد ہوتی ہے جس نے مسلمانانِ ہندوستان کی تعلیمی رہبری کا بیڑا اُٹھایا ہے اور جو سالہا سال سے اسی مقصد کے لیے مسلمانوں کا بے حساب روپیہ صرف کر رہی ہے۔

افسوس ہے کہ جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی موجودہ جوائنٹ سکرٹری کے عنانِ اختیار میں کانفرنس کی باگ ایسے وقت میں دی گئی ہے جبکہ کانفرنس کی طرف سے لوگ عام طور پر مایوس و نا امید ہو چکے ہیں۔ اور اس وجہ سے اجلاس کلکتہ کی بے رونقی کا الزام اُنھیں نہیں دیا جا سکتا ہے، تاہم یہ توقع ضرور تھی کہ اُنکے عہد کے سالِ اول میں اگر کانفرنس کا نظام اساسی عمدہ اصولوں پر قائم ہو جائے گا تو آئندہ سالوں میں مفید نتائج مرتب ہو سکیں گے۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مسودۂ دستور العمل جسکے مطبوعہ نسخے تمام حاضرینِ جلسہ کو تقسیم کر دیے گئے تھے اور جس کے متعلق "پروگرام" میں درج تھا کہ منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا محض اس اندیشہ سے کہ شرکائے کانفرنس میں سے بعض نے اُس سے پر زور اختلاف کرنے کا ارادہ کر لیا تھا معرضِ التوا میں ڈالدیا گیا۔

کانفرنس کا قانون اس بارے میں جو کچھ بھی ہو مگر دنیا کی دوسری آئینی مجالس کا دستور عام یہ ہے کہ سبجکٹ کمیٹی جن امور کو جلسے کے پروگرام میں داخل کر دیتی ہے اُس کا اخراج جلسے کی منظوری کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ مگر ناخدایان کانفرنس کے لیے غالباً کسی ضابطہ کی پابندی ضروری نہیں۔ اُنھوں نے بغیر جلسے سے استصواب کیے اپنے خود مختارانہ اختیار سے مسودۂ دستور العمل کو منظوری کے لیے پیش نہیں ہونے دیا۔ اور جب اسکے خلاف ایک کمزور و نحیف صدا بلند کی گئی تو جوائنٹ سکرٹری صاحب اگرچہ اسکے لیے آمادہ نظر آتے تھے کہ مسودۂ دستور العمل ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن جناب صدر نے (جنکے وسیع اختیارات کے آگے ہمیں بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا) کسی نہج سے اس مسئلے کو چھیڑنے کی اجازت نہ دی۔ جلسے کے آداب کے لحاظ سے اگرچہ ہم اُس وقت چُپ رہ گئے تھے، مگر اب ہم مسٹر حیدری سے یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُنکی اس خواہش نے کہ جلسہ بغیر کسی اختلاف کے پورے سکون کے ساتھ ختم ہو جائے، کانفرنس کے مقاصد کو نقصانِ عظیم پہونچا دیا ——— اور اس معاملے میں اُنکی خلاف آئین روش اُنکے حیدرآبادی تعلقات کی وجہ سے کتنی ہی حق بجانب کیوں نہ ہو مگر اُن جیسے ضابطہ داں اور تعلیم یافتہ لیڈر کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتی۔

مسودہ دستور العمل اب سال آیندہ کے جلسہ کے لیے اُٹھ رہا۔ اور جو اصلاحات اس سال طے پا جا سکتی تھیں اُنکی راہ میں پورے سال کے ۳۶۵ دن حائل ہو گئے۔ قانونِ سابقہ کی خرابی کا اس سے بڑھکر کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ خود کارفرمایانِ کانفرنس (جو ہر تحریکِ اصلاح کے آج ویسے ہی دشمن نظر آتے ہیں جیسے کبھی عام مسلمان انگریزی تعلیم اور اجتہاد فی المذہب کے رہ چکے ہیں) اپنے دستور العمل کی خرابیوں کو محسوس کر کے ترمیم کے خواہاں تھے اگر اُس گروہ کے نقطۂ نظر سے دیکھیے جو تمام اجتماعی مجلسوں کو جمہوری اصولوں کے ماتحت کام کرتے دیکھنا چاہتا ہے تو اس دستور العمل کی بنیاد ہی سراسر غلط ہے۔

ہمارے دل میں مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب اور مسٹر حیدری دونوں بزرگوں کی بہت قدر و منزلت ہے۔ مگر ان ہر دو اصحاب کی کمزوری نے قوم کے مفادِ عامہ کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچا دیا ہے اُسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے ہم مجبور ہیں۔

انجمن ترقی اُردو کا جلسہ اب کے رات کے بجائے دن کو منعقد کیا گیا۔ شیخ عبد القادر بی اے سابق ایڈیٹر مخزن جو عرصہ ہوا کہ منظر عام سے الگ ہو کر اپنی سرکاری خدمات کے لیے وقف تھے اس شعبے کے صدر قرار پائے تھے۔ مگر صاحب موصوف نے کوئی خطبۂ صدارت تیار نہیں کیا تھا۔

اور صرف سکرٹری صاحب کی رپورٹوں کی مدد سے مختصراً جلسہ کو خطاب کرنے پر اکتفا کیا۔ ہمارے محترم دوست مولوی عبدالحق صاحب کی رپورٹ مثل سابقہ سالوں کے اب کے بھی کافی دلچسپ تھی۔ اگرچہ اس دفعہ اُنکی ادبیت میں ایک قسم کی کمی پائی جاتی تھی —— غالباً رپورٹ طبع ہونے کے بعد جب پڑھی جائے گی تو یہ نقص رفع ہوجائے گا —— اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ بھی انشاء اللہ کیا جائے گا۔

شعبۂ نسواں کا جلسہ ہمارے مکرم دوست مفتی انوارالحق ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ہم اپنے دوست منشی محمد امین صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنکی دیرینہ آرزو برآئی —— مفتی صاحب کا خطبۂ صدارت ہمیں افسوس ہے کہ کسی قدر تاخیر میں پہونچنے کی وجہ سے سنائی نہیں دیا۔ مگر شیخ عبداللہ صاحب نے جنکی رپورٹ اس دفعہ اتفاق سے ضایع نہیں ہونے پائی۔ صاحب صدر کے بیانات کی اصلاح و تردید میں جو کچھ کہا اُس سے مترشح ہوتا تھا کہ صاحب صدر نے اپنا حق صدارت پوری طرح ادا فرمایا —— یہ جو ہمارے ہاں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کی وبا پھیل گئی ہے اسکی اصلاح کا یہ سب سے مؤثر طریقہ ہو سکتا ہے کہ مجالس قومی کے صدر بجائے اسکے کہ کرسیٔ صدارت کی قیمت خاموشی اور قصیدہ خوانی کے رائج الوقت سکوں میں ادا کریں اُس مجلس کے کام کے متعلق پوری آزادی اور صاف بیانی کے ساتھ اظہارِ رائے کیا کریں۔

اس دفعہ شعبۂ نسواں کے اجلاس کی قابلِ یادگار خصوصیت یہ تھی کہ مشہور شاعرہ مسز سروجنی نیڈو نے آکر تعلیم نسواں پر لکچر دیا - اور فسوں ساز مقررہ کے لکچر نے نوجوانانِ قوم سے لیکر بزرگانِ علیگڈھ تک کو ایسا مسحور و مدہوش کر دیا کہ مفتی صاحب نے اُسکے بعد کسی کا۔ رونائی کی اجازت نہ دی اور یہ کہکر جلسہ برخاست کر دیا کہ سامعین پر جو عالمِ محویت اس وقت طاری ہے اُس کے لطف و سرور کو زائل کرنا جائز نہیں ہو سکتا —— اس فتوے کے خلاف ایک حرف بھی کوئی کہے تو خدائے مسلماناں کا گنہگار رہا ہے نہ ہو گر معبودانِ طلسمی کے مرتدوں میں تو اُسکا شمار ضرور ہوگا۔ پھر بھی ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کرینگے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اگر مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی قابلیت نہیں رکھتی تو کم سے کم قوم کے اخلاق کی بربادی کے لیے تو سامان فراہم نہ کرے -

مسز نائڈو ملک کے لیے باعث فخر اور طبقۂ نسواں کے لیے مایۂ ناز ہیں۔ ہمارے نوجوان احباب تو یہ سمجھتے ہیں کہ اُنکے لیے لائق پرستش ہیں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اسلامی مجالس میں اُنکی جو تقریریں

گزشتہ سالوں میں ہم نے سُنی ہیں اُنکی وجہ سے جہاں مسز موصوفہ کی قابلیت و کمال کا بے اختیار اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے، وہیں اس بات کے اظہار میں باک نہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہ نظارے یقیناً دردجہ افسوسناک اور اُنکی تقریریں لاریب سخت عبرتناک ہیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ حمیت اور غیرت کی تعریف ہمارے دوستوں کے نزدیک بالکل اُسی طرح بدل گئی ہو جس طرح کہ آج خود دین و ملت کے منشا و احکام اُنکی رائے میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

نومبر نمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ کرمی قاضی عبدالغفار صاحب کلکتہ سے ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔ یہ اخبار دسمبر کے آخری دنوں میں نکل آیا اور اب روزانہ وصول ہو رہا ہے۔ قاضی صاحب کا آزاد قلم ارباب حکومت اور صاحبان شہرت کی روش پر جس بیباکانہ انداز سے نکتہ چینی کرتا ہے اُسکے لحاظ سے عامۃ الناس میں بے حد مقبول ہے۔ اور اسی وجہ سے اُنکے اخبار کا نام "جمہور" نہایت موزوں ہے۔ کیونکہ وہ عامۃ الناس کے جذبات و خیالات کی ترجمانی میں نظرات سے بے پروا نظر آتے ہیں۔ مگر ایک چیز، جسکی کمی آج عام انگریزی دانوں میں نظر آتی ہے قاضی صاحب میں بھی ہے حالانکہ عامۃ الناس سے قربت حقیقی حاصل ہونے کے لیے یہی جنس سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یہاں ہماری مراد ٹھیٹ اسلامیت سے ہے۔ جسکے بغیر ہمارا ایمان ہے کہ مسلمان کبھی نہیں پنپ سکتے۔

"جمہور" سردست گرانی کاغذ کے باعث چار صفحوں پر اور بادامی کاغذ پر شائع ہوتا ہے۔
قیمت عـہ سالانہ ہے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر "جمہور" ۱۲ کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔

مسٹر محمد علی کے کامریڈ کا جانشین نیو ایرا لکھنؤ میں پیدا ہوا اور یہیں اپنے بانی کی وفات کے چند ماہ بعد پریس ایکٹ کی عشوہ گریوں کا شہید ہوا۔ نیو ایرا کے بند ہونے سے کچھ ہی دن قبل نیو ایرا کمیٹی کی طرف سے ایک اُردو اخبار دورِ جدید نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ مگر اس تازہ کشمکش کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ دورِ جدید کی اشاعت کا انتظام جلد نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ نیو ایرا کی جگہ دوسرا انگریزی اخبار نکالنے کی بھی فکر پڑ گئی ہے۔ میری ذاتی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ انگریزی اخبار کے مقابلہ میں اُردو اخبار نیو ایرا کمیٹی کے ہاتھوں بہتر طریقے پر سرانجام پا سکتا ہے۔ اس لیے انگریزی اخبار کی تجویز کو ملتوی کر کے پہلے دورِ جدید نکال دیا جائے۔ تا کہ مسلمانوں میں جو احساس و بیداری پیدا کرنا منظور ہے اُسکی تحریک قائم رہے اور جوشِ عمل سرد نہ ہونے پائے۔

مطبوعاتِ الناظر پریس

ازواج الانبیا - انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خاص خاص حالات کے سوا اُنکی خانگی زندگی اور اُنکی ازواج مطہرات کے متعلق ہمارا سرمایۂ واقفیت نہایت محدود ہے اور جو حالات کتابوں میں ملتے ہیں وہ اسقدر منتشر و متفرق ہیں کہ سوائے مخصوص لوگوں کے جنہوں نے ان حالات کو دریافت کرنے کیلیے حدیث و تفسیر تاریخ و سیر کی کثرت کتابوں کی ورق گردانی کی ہو کوئی عام طور پر استفادہ نہیں کرسکتا۔ غریب اردو کی تو ابھی عمر ہی کتنی ہے، عربی و فارسی وغیرہ میں بھی اس بحث پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی لیکن مقام شکر و امتنان ہے کہ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کے شوق و توجہ نے اس بڑی کمی کو رفع کر دیا اور منشی محمد امین صاحب محوی سابق سب ایڈیٹر الناظر نے حسب فرمان بیگم صاحبہ ممدوحہ یہ مجموعہ سوانح مرتب کیا ہے جسمیں حضور رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے سوا جسقدر پیغمبروں کی بیبیوں کے حالات تفحص و تلاش سے دستیاب ہو سکے ہیں سب کو ایک سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

تاریخ ہند کی کہانیاں (حصہ اول) نجمۃ سلطانہ بیگم صاحبہ ابنت نصیر الدین حیدر تیموریہ کا نام نامی طبقہ نسواں میں غالباً کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کیلیے لکھی گئی ہے جسمیں ہندوستان کی تاریخ کو قصہ کے پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ عبارت ایسی پاکیزہ ہے کہ شاید اردو میں چند ہی کتابیں اسکے مقابلہ کی ہوں گی قیمت چار آنے

خوان دعوت - اردو زبان میں کھانا پکانے کی ترکیبوں کے متعدد رسالے اور کتابیں ہیں مگر یہ کتاب کئی خصوصیات کے لحاظ سے سب میں بہتر ہے۔ اول تو اسکی مصنفہ لکھنؤ کی ایک شریف خاتون ہیں جنہوں نے تمام ترکیبیں ذاتی تجربے کے بعد لکھی ہیں۔ پھر کتاب کو دلچسپ بنانے کیلیے قصہ کا دلکش اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو پڑھنے والیوں کیلیے دوگونہ لطف و دلچسپی کا باعث ہے۔ عبارت کی خوبی و سلاست کے لیے یہ کافی ہے کہ لکھنؤ کی ایک خاتون نے یہ کتاب لکھی ہے۔ قیمت ایک روپیہ

مثنوی صبح امید - مولانا شبلی مرحوم کی حسب ہدایت اردو نظم ہے۔ اگرچہ مرزا غالب کی طرح مولانا بھی اپنے اردو کلام کو بمقابلہ فارسی کے حقیر جانتے تھے تاہم ارباب ذوق واقف ہیں کہ مولانا کے اردو کلام میں کیا لطف ہے۔ قیمت چار آنے۔

المشتہر منیجر الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

قوم قوط کا پچھلا شخص

جس وقت سکندرِ اعظم کی فوجیں مشرق کی قدیم سلطنتوں کو پامال کر رہی تھیں اُس وقت ایک ہی مُلک ایسا تھا جو امن و عافیت میں تھا اور بالکل بے کھٹکے تھا۔ اہلِ عرب نے کوئی عاجزانہ سفارت اس زبردست فاتح کی خدمت میں نہیں بھیجی۔ سکندر منصوبہ کر چکا تھا کہ گستاخ عربوں کے سر اپنے سامنے جھکوائے۔ وہ اُنکے مُلک پر چڑھائی کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دستِ بیدادِ اجل نے اُسکا کام تمام کر دیا۔ اور عرب غیر مفتوح کے غیر مفتوح ہی رہے ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

یہ تذکرہ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے تین سو برس سے بھی کچھ پیشتر کا ہے۔ اُس زمانے میں بھی عرب اپنے وسیع صحرائی جزیرہ نما میں مدت ہائے دراز سے خود مختاری کا جھنڈا گاڑے ہوئے تھے۔ اور تقریباً ہزار برس بعد تک بھی وہ اسی عجیب و غریب تنہائی میں بے تعلقی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اُنکے چاروں طرف بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ سکندر کے

سکندر کے جانشینوں نے ملکِ شام کی سیلیوسائڈ سلطنت کی اور مصر کے خاندان بطلیموسی کی بنیادیں قائم کیں۔ اگسٹس کو روم میں امپراطور کا تاج پہنایا گیا۔ قسطنطین بائی زنیتم (قسطنطنیہ) میں پہلا عیسائی شہنشاہ بنا۔ اور وحشیوں کی جماعتوں نے قیصر کے دور تک پھیلے ہوے علاقوں کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا مگر عربوں سے کسی نے نہ کچھ تعرض کیا نہ اُنکے آرام و چین میں خلل ڈالا۔ نہ اُنکی حالت دریافت کی نہ اُنکو مفتوح کیا۔ ممکن ہے کہ اُنکے سرحدی شہروں نے خسرو و قیصر کی اطاعت کا دم بھرا ہو اور روم کے جرار لشکر نے اُنکے پہاڑی میدانوں میں کبھی کبھی اپنی چمک دمک دکھلائی ہو لیکن یہ نقش کچھ گہرا اور دیرپا نہ تھا۔ عرب جس طرح تھے اُسی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔

چونکہ وہ چاروں طرف اُن زمینوں سے گھرے ہوے تھے جنپر قدیم تاریخی خاندان حکمراں تھے لہذا اُنکے چٹیل میدان اور اُنکی بہادری ہمیشہ حملہ آوروں کو دور باش کہا کرتی تھی۔ اور نہایت ہی قدیم زمانے سے ساتویں صدی عیسوی تک ان گوشہ گیر لوگوں کا کچھ حال بجز اسکے نہ معلوم ہوا کہ انکا وجود ہے اور کسی نے کامیابی کے ساتھ انپر چڑھائی نہیں کی۔

اسکے بعد دفعتًہ عربوں کی رفتار میں ایک تغیر پیدا ہوا جسکے ساتھ ہی وہ گوشہ گیری کو خیرباد کہکے دنیا کے سامنے آموجود ہوے۔ اور بڑی متانت و استقلال سے اُسکو فتح کرنا شروع کر دیا۔ یہ تغیر صرف ایک شخص کا پیدا کیا ہوا تھا۔ جس سے مراد محمد صلعم ہیں۔ عرب کے پیغمبر محمد صلعم نے ساتویں صدی کی ابتدا میں مذہب اسلام کی تبلیغ شروع کی اور اُنکے قوانین نے ایک ایسی قوم میں پہونچکر جو تیز جنبشوں کے لیے تیار اور گہرا اثر قبول کرنے کے لیے مستعد تھی ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اُنکی تعلیم بالکل سادی تھی۔ اُنھوں نے عبرانیوں کے پُرانے عقائد لیے جنکے ماننے والے ملکِ عرب میں موجود تھے اور اُن میں ایسا اضافہ و ترمیم کرکے جسکی اُنھیں ضرورت معلوم ہوئی ایک تازہ الہام کی حیثیت سے بت پرستوں کی قوم میں خدا ے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کی منادی کی۔ وہ بے روک جنبش جو محمد صلعم کے سیدھے سادے اور

سے بے جوش مذہب نے ملکِ عرب کے کل قبائل میں پیدا کر دی تھی اُسکانی الحال ہمارے قیاس میں آنا مشکل ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ ایسے مذہبی انقلاب اکثر ہوتے رہے ہیں۔ اور ایک سچے پیغمبر کے ذاتی رسوخ میں ہمیشہ ایک مخفی و قوی دلربائی ہوا کرتی ہے۔ بہرحال محمد صلعم اس حد تک تو ضرور صادق تھے کہ جن عقائد کی نسبت اُنکو یقین تھا کہ صرف یہی صحیح ہیں اُنکی تعلیم وہ دیانت و دل سوزی سے کرتے تھے اور اس مذہب میں اس قدر کافی اولوالعزمی اور پیغمبر اور اُنکے سامعین میں ایسا مذہبی نشہ تھا کہ وہ بے روک عام جوش بخوبی پیدا ہو سکتا جسے لوگ حرارتِ دینی کہتے ہیں۔ محمد صلعم کے زمانے سے پہلے عرب کی قومیں ایسے قبیلوں اور جرگوں کا مجموعہ تھیں جنہیں باہم وحشیانہ نیکیوں یعنی بہادری و مہماں نوازی و شہسواری میں بڑھے چڑھے رہنے کی رقابتیں اور جنگی لوٹ کھسوٹ کی عادتیں تھیں۔ پیغمبر صلعم نے موجودہ غرض کے لیے اُنھیں مسلمان بنا دیا اور اُنکے دلوں کو شہادت کے شوق سے معمور کر دیا۔ اور اُنکی مال غنیمت کی حرص میں زیادہ تر شریفانہ حوصلہ اس بات کا اضافہ کر دیا کہ کل بنی نوع انسان کے کانوں میں سچائی کی آواز پہونچائیں۔

محمد صلعم اپنی وفات سے پہلے ملک عرب کے سردار ہو گئے اور وہ متفرق قبیلے جنھوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا تھا اُسی وقت آس پاس کی زمینوں میں پھیل رہے اور حیرت زدہ قوموں کو محکوم بنا رہے تھے۔ اُنکے جانشین خلفاء کے زمانے میں مسلمانوں کی فوجوں نے فارس و مصر و شمالی افریقہ کو ہرقل کے ستونوں تک تابع فرمان کر لیا۔ اور موذنوں کی اذانیں وسطِ ایشیا کے دریاے عماں (آکسس) سے لیکر بحر اعظم مغرب کے کناروں تک گونجنے لگیں۔

مسلمانوں یعنی شرقیوں کو ایشیاے کوچک میں تو شہنشاہِ یونان کی فوجوں نے روک دیا اور پندرھویں صدی کے گذرتے ہی یہ نوبت پہونچی کہ قسطنطنیہ جسپر زمانے سے دانت تھا ارکانِ عثمانی کی شجاعت سے فتح ہوا۔ یہی حال بحر روم کی دوسری حد پر ہوا کہ شہنشاہِ یونان کے ایک افسر نے ایک عرصے تک عربوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا۔ ان فاتحوں نے شمالی افریقہ

کے اضلاع کو قبضے میں کرلیا اور اک ممتد کشاکش کے بعد بربر کے فساد انگیز قبیلوں کو ایک عرصے کے لیے تابع فرمان بنالیا یہاں تک کہ صرف سبتہ کا قلعہ اُنکے مقابلے میں ڈٹا رہا سبتہ بھی بحر روم کے اُور جنوبی حصوں کی طرح شہنشاہ یونان کی حکومت میں تھا مگر یہ مقام قسطنطنیہ سے اس قدر فاصلے پر واقع تھا کہ اپنے پاس کی سلطنت ہسپانیہ کی تائید کا محتاج تھا۔ اور گو وہ برائے نام شہنشاہ کے تحت میں تھا لیکن واقع میں طلیطلہ کے بادشاہ کی معاونت و حفاظت پر اُسکا دارومدار تھا۔ یہ تو قیاس میں نہیں آتا ہے کہ وہ ساری کمک جو ہسپانیہ دے سکتا تھا شرقیوں کے حملے کے موج افزا طوفان کو روک دینے کے لیے کارگر ہوتی لیکن جو اتفاق کہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ اُس زمانے میں سبتہ کے حاکم یولیان (جولین) اور ہسپانیہ کے بادشاہ رزریق (راڈرک) سے نزاع تھی جسنے عربوں کے لیے دروازہ کھول دیا۔

ہسپانیہ اُس زمانے میں مغربی قوم قوط (گاتھ) کی حکومت میں تھا جو وحشیوں کی ایک قوم تھی اور اُن دیگر وحشیوں کے مشابہ تھی جو سلطنت روم کے تنزل کے زمانے میں اُنکے اضلاع کو زیر حکومت کرکے پھیل گئے تھے۔ آسترو قوط نے اطالیہ پر قبضہ کرلیا تھا اور اُنکے رشتہ دار مغربی قوطوں نے صابین اور جرمن کے دوسرے سیدھے سادے قبیلوں کو محکوم یا خارج کرکے پانچویں صدی عیسوی میں روم کے علاقہ آئی بیریا (ہسپانیہ) میں اپنے قدم جمالیے تھے۔ ان لوگوں نے اس ملک کو اُسی زنانہ بنانے والی عشرت و ذلت میں پایا جو اُس سلطنت کے دوسرے حصوں کی تباہی کا باعث ہوئی تھی۔ اکثر جنگجو قوموں کی طرح رومیوں نے بھی جب اپنا کام پورا کرلیا اور دنیا اُنکی مطیع ہوگئی تو اُن ترقیوں پر قناعت کرکے محنت و مشقت کو چھوڑ بیٹھے اور اُسی عیش و عشرت میں مبتلا ہوگئے جسکی طرف ہمیشہ مال و دولت اور امن و عافیت انسان کو متوجہ کردیا کرتے ہیں۔ رومی اب گویا وہ اگلے بہادر وجفاکش آدمی ہی نہ تھے جو سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ اب تو یہ حال تھا کہ سی پیو یا قیصر کا ایسا کوئی سپہ سالار اپنے ملک کے بچانے یا کسی بر اعظم کے فتح کرنے کے لیے بُلاتا تو اپنی لبا ہل ملانے والوں کے سر ہلا دیتے تھے۔

ہسپانیہ میں زیادہ تر مالدار فرقے عیش پسندی و شہوت پرستی کے بندے ہو رہے تھے۔ انکی زندگی کھانے پینے جوا کھیلنے اور ہر قسم کے محرکات نفسانیہ کیلیے وقف تھی۔ انکے عوام الناس یا تو غلام تھے یا وہ لوگ جو غلاموں کے مماثل تھے۔ یعنی مزدور سے، زمینوں کے بندے جو اُن زمینوں سے جنھیں وہ کاشت کرتے تھے علحدہ نہیں کیے جا سکتے تھے بلکہ اُنھیں اراضی کے ساتھ ساتھ ایک آقا سے دوسرے آقا کے پاس جاتے تھے۔ دولتمندوں اور غلاموں کے بیچ میں ایک درمیانی جماعت آزاد لوگوں کی تھی جنکی حالت شاید اور بھی بدتر تھی اس لیے کہ انھیں کی گردنوں پر سلطنت کے سنبھالنے کا سارا بوجھ تھا۔ یہی محصول ادا کرتے تھے، یہی دیوانی و میونسپل خدمتیں انجام دیتے تھے، اور یہی وہ روپیہ بہم پہونچاتے جنکو امرا اپنی عیش و عشرت میں اُڑایا کرتے تھے۔ ایسی بگڑی ہوئی قوم میں کوئی عنصر اسکا نہ تھا کہ ایک ثابت قدم حملہ آور کا مقابلہ کر سکے۔ مالدار امرا اپنی عیش و عشرت میں ایسی گہری نیندیں لے رہے تھے کہ کسی دشمن کی آمد کی افواہیں اُنھیں آسانی سے بیدار نہیں کر سکتی تھیں۔ اُنکی تلواروں میں بہت دنوں پڑے رہنے سے زنگ لگ گیا تھا۔ غلاموں کو آقاؤں کی تبدیلی سے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس لیے کہ اُنکی حالت جیسی تھی اُس سے بدتر اور کیا ہو سکتی تھی۔ اور درمیانی آزاد لوگ بار سلطنت کے انتظام سے ناراض تھے جسکی وجہ سے اکثر مصارف اُنھیں اُٹھانے پڑتے تھے۔ اور اُنکے فوائد اُنکو مطلقاً حاصل نہ تھے۔

ایسے لوگوں سے کوئی قوی و ثابت قدم فوج قائم نہیں کی جا سکتی تھی اور یہی وجہ ہوئی کہ قوط (گاتھ) تھوڑی ہی دشواری کے ساتھ ہسپانیہ میں داخل ہو گئے۔ شہروں نے خوشی سے اپنے پھاٹک کھول دیے۔ اور رومی ہسپانیہ کے مریض تہذیب نے بغیر اسکے کہ ایک وار بھی کرے اطاعت قبول کر لی۔ اور سچ پوچھو تو وحشیوں کی اگلی جماعتوں (یعنی الان اور وندل۔۔۔ اور سویوی) نے اُنکا راستہ اس قدر صاف کر دیا تھا کہ اُنکے لیے زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت باقی نہ تھی۔ رومی نا اسپینرڈ (اندلسی) بخوبی سیکھ چکے تھے کہ وحشیوں کے

حملے اپنے ساتھ کیا لاتے ہیں۔ وہ اپنے شہروں کو جلتے، اپنی بیویوں اور بچوں کو قیدی ہو کر جاتے، اور اپنے اُن چند معدودے سرغناؤں کو جنھوں نے کچھ بھی مردانہ مزاحمت کی تہ تیغ ہوتے دیکھ چکے تھے۔ اُنکو وحشیوں کے تازیانے کے نتیجے معلوم تھے۔ یعنی وبا، قحط، کھیتوں کا اُجڑنا، باشندوں کا بھوکوں مرنا، اور عموماً ہر جگہ وحشیانہ طوائف الملوکی پھیل جانا۔ وہ سبق تو پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ پس نرمی سے اُن لوگوں نے قوطوں کو آنے دیا اور کسی نے مزاحمت نہ کی۔

آٹھویں صدی کی ابتدا میں جبکہ شرقیین (مسلمانانِ عرب) بحرِ اعظم مغرب کے افریقی کنارے پر پہونچکر آبنائے ہرقل سے اندلس کے چمکتے دمکتے اضلاع پر نظر دوڑا رہے تھے قوطوں کو ہسپانیہ پر قبضہ کیے ہوے دو سو برس گذر چکے تھے۔ اس سلطنت کی تباہ حالت کو درست کرنے اور جوانی کی ایسی تازہ اُمنگوں سے بھرنے کے لیے جو پیرانہ سال تہذیب بعض اوقات وحشی مگر مردانہ قوموں کے آجانے سے حاصل کر لیا کرتی ہے کافی مہلت مل چکی تھی۔ اسکی بھی خاص وجہیں تھیں کہ کیوں قوط لوگوں کو ہسپانیہ کی حالت درست کرنی لازم تھی۔ وہ جری، مضبوط، اور با عافیت زندگی کے خراب اثر سے محفوظ ہی نہ تھے بلکہ وہ نو عیسائی تھے۔ اور عیسائی بھی کیسے کہ اپنے طریقے میں با اخلاص۔ اُنکی آمد کے وقت ہسپانیہ نے صرف برائے نام عیسائیت قبول کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قسطنطین نے عیسائیت کی اشاعت اس حیثیت سے کی تھی کہ سلطنت روم کا مذہب ہے۔ لیکن مغربی اضلاع میں اُس نے بہت کم جڑ پکڑی تھی۔ گمان غالب تھا کہ قوطوں کی ایسی ایک جاہل مگر پابند مذہب قوم کی آمد اُس نئے مذہب میں جو سلطنت کی بوسیدہ بت پرستی کے بیچ میں تھا ایک تازہ روح پھونکے گی۔ اور کیتھلک پادریوں کے دلوں میں اپنے مذہب کی آئندہ بہتری کی امیدیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن کسی طور سے نتیجے نے امید کی مساعدت نہ کی۔ قوط تو بلاشبہہ مذہب کے پابند رہے مگر وہ اپنے مذہبی افعال کو خاصکر اپنے پادریوں

کی تلافی سمجھتے تھے۔ وہ غیر معمولی سخت گناہوں کا معاوضہ بھاری توبہ سے کرتے تھے۔ اور پھر دوبارہ بے کھٹکے گناہوں کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ یہ بالکل ویسے ہی بگڑے ہوئے اور بد اطوار تھے جیسے رومی امرا جو اُن سے پہلے تھے اور اُنکے طرز عیسائیت نے انھیں اسکی ہدایت نہیں کی کہ اپنی رعایا کی حالت درست کریں۔ غلام پہلے سے بھی زیادہ قابلِ رحم حالت میں مبتلا تھے۔ وہ نہ صرف اراضی یا آقا کے پابند تھے بلکہ وہ بغیر اُسکی رضامندی کے شادی بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور اگر پاس پڑوس کی زمینداریوں کے غلام آپس میں شادی بیاہ کر لیتے تھے تو اُنکی اولاد اُن زمینداریوں کے مالکوں کے درمیان تقسیم ہوتی تھی۔ درمیانی جماعتیں رومیوں کے زمانے کی طرح اب بھی محصولوں کا بار اُٹھاتی تھیں۔ جس کے سبب سے وہ دیوالیہ اور تباہ تھیں۔ اراضی ابھی تک معدودے چند لوگوں کے قبضے میں تھی اور بڑی زمینداریوں میں ایسے بدحال غلاموں کے گروہ کاشت کرتے تھے جنکی تیرہ و تار زندگی میں نہ امید اصلاح کی شعاعیں پہونچتی تھیں اور نہ موت سے پہلے رہائی کی کرنیں۔ خود پادری جو اخوتِ عیسوی کے وعظ کہتے پھرتے تھے، اب جو مالدار اور بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک ہو گئے تو پرانی مصلحتِ ملکی کے گیت گانے لگے اور اپنے غلاموں اور مزدوروں کے ساتھ ویسے ہی بُرے ناگوار برتاؤ کرنے لگے جیسے کوئی رومی امیر کرتا تھا۔ امرا شہوت پرستی کی اُسی دلدل میں پھنس گئے جو رومیوں کی تباہی کا باعث ہوئی تھی۔ اور عیسائی قوطوں کی بدکاریاں، مجوسیوں کی قلعی کی ہوئی بدکرداریوں پر اگر سبقت نہیں لے گئیں تو اُنکے برابر تو ضرور ہو گئیں۔ وہاں کے وقائع نگار کا بیان ہے کہ شاہ غیطشہ (وٹیزا) کو چونکہ دل سے یہ منظور تھا کہ عیسائیوں کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوئی نہ ترکیب ہاتھ آئے اُس نے سارے ہسپانیہ کو گناہ کرنا سکھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہسپانیہ کو پہلے ہی سے گناہ کرنے میں خوب دستگاہ حاصل تھی۔ اور شاید غیطشہ اپنے اسلاف سے کچھ زیادہ بُرا نہ ہوگا۔ لیکن قوطوں نے عام بدکرداری کی جدید سند دے دی۔ اکثر وحشیوں کی بدفعلیاں بھی سیدۂ تہذیب کی بدفعلیوں سے بہت ہی مشابہ ہوا کرتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے حکمرانوں کی تبدیلی سے

اخلاق کی حالت درست نہ ہوئی۔

جس وقت مسلمان ہسپانیہ کی سرحدوں کے قریب پہونچ گئے تھے ہسپانیہ والوں کی یہ حالت تھی، بگڑے ہوئے امرانے اراضی کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ بڑی بڑی زمینداریاں بیحال و مایوس غلاموں کے ذریعے سے بوئی جوتی جاتی تھیں اور درمیانی جماعتیں تباہ و ویران تھیں۔ اور آبنائے جبل الطارق کے دوسری جانب مجاہدان اسلام تھے۔ سب کے سب جیالے سپاہی نئے ایمان کے جوش میں مشتعل۔ بچپن سے ہتھیاروں کے گود میں پلے ہوئے۔ سادے اور اپنی زندگی میں بے تکلف۔ اور کافروں کی زرخیز زمینوں کے لوٹنے کے مشتاق۔ ایسی قوموں کے درمیان کی جنگ کے نتیجے کی نسبت کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن شبہے کے امکان کو بھی مٹانے کے لیے دغابازی حملہ آوروں کی مدد کو پہونچی۔

غیطشہ کو رذریق نے تخت سے اُتار دیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اس نے اپنی حکمرانی شروع تو عمدہ طور سے کی مگر دولت و اقتدار کی ترغیبوں کا شکار بن گیا۔ اُسکے خود غرضانہ و عیش دوست مزاج نے اُن بھڑک اُٹھنے والے مادوں میں آگ لگا دی جو اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور مشتعل ہو جانے اور اسکی سلطنت کو خاک سیاہ کر دینے کے لیے صرف ایک چنگاری کے محتاج تھے۔ اُن دنوں سلطنت کے امرا میں یہ رسم تھی کہ اپنے بچوں کو آداب و تہذیب سیکھنے کے لیے شاہی محل میں بھیجا کرتے تھے۔ منجملہ اوروں کے یولیان (جولین) سبتہ کے حاکم نے اپنی دختر فلورنڈا کو رذریق کے محل واقع طلیطلہ میں ملکہ کی خواصوں میں تعلیم پانے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ دوشیزہ لڑکی بہت خوبصورت تھی اور بادشاہ نے اپنی عزت کو جس کا تقاضا یہ تھا کہ اُسکی بھی اپنی بیٹی کی طرح حفاظت کرے طاق نسیاں پر رکھکر اس لڑکی کی آبرو ریزی کی۔ یہ بے حرمتی زیادہ تر سخت اس وجہ سے تھی کہ یولیان کی بی بی غیطشہ کی بیٹی تھی۔ اسلیے فلورنڈا کی ذات کے ساتھ شاہی خون کی ہتک کی گئی۔ اس لڑکی نے اپنی مصیبت کی حالت میں اپنے باپ کو ایک خط لکھا اور ایک معتبر شاگردپیشہ کو بلا کے کہا کہ اگر تم الیکسنائٹ کی عزت حاصل

کرنا اور ایک خاتون کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے ہو تو حتی الامکان تیزی کے ساتھ رات دن خشکی و تری میں سفر کرکے جاؤ اور یہ خط یولیان کے ہاتھ میں دے دو۔

یولیان کو کوئی وجہ نہ تھی کہ شاہ رذریق کو دوست رکھتا۔ خود اُس کا ذاتی تعلق جو سلطنت سے معزول اور غالباً مقتول شاہ غطیشہ کے ساتھ تھا وہ اس امر کا مانع تھا کہ اُس غاصب کے ساتھ ہمدل و ہمزباں بنے۔ اور اُسکی بیٹی کی بیحرمتی کی عداوت نے اس دبی ہوئی آگ کو بھڑکا کر انتقام گیر شعلہ بنا دیا۔ اس وقت تک تو اُس نے کامیابی کے ساتھ عربوں کے حملوں کا مقابلہ کیا تھا لیکن اب اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنی دختر کی عزت کو خاک میں ملانے والے کی سلطنت کی حفاظت نہیں کرے گا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ شرقیین اگر ہسپانیہ لینا چاہتے ہیں تو لے لیں، میں اُنھیں راہ دکھانے کو آمادہ ہوں۔ یولیان انتقام کے جوش میں بھرا ہوا مستعجلانہ رذریق کے دربار میں پہونچا۔ یہاں اُس نے ایسی ہشیاری سے اپنے اصلی جذبہ پر پردہ ڈالا کہ بادشاہ نے جسکو کچھ تاسف معلوم ہوتا تھا اور یہ اعتماد ہوتا تھا کہ فلورنڈا نے اُس راز کو پوشیدہ رکھا ہے اعزاز سے اُسکو مالامال کر دیا۔ اور اپنی سلطنت کی حفاظت کے متعلق ہر چیز میں اُس سے مشورہ لینے لگا اور تیز اُسی کی پُر دغا صلاح سے ہسپانیہ میں جو عمدہ ترین گھوڑے اور اسلحہ تھے اُنھیں یولیان کی سرکردگی میں جنوب کی طرف اس غرض سے روانہ کیا کہ مسلمان حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔ یولیان طلیطلہ سے بادشاہ کا سب سے زیادہ مورد عنایات ہو کر اپنی بیٹی کو ہمراہ لیکر روانہ ہوا۔ رذریق نے اُس کو نٹ سے الوداع کے وقت یہ خواہش ظاہر کی کہ شکار کے لیے مجھے خاص قسم کے بازوں کی ضرورت ہے تم مجھے ضرور بھیجنا۔ یولیان نے جواب دیا کہ میں آپ کے لیے ایسے باز لیتا آؤں گا کہ آپ نے عمر بھر نہ دیکھے ہونگے۔ عربوں کے آنے کے اس ذو معنین اشارے کے ساتھ اُس نے سبتہ کی جانب مراجعت کی۔

اُس نے وہاں پہونچتے کے ساتھ ہی موسٰی بن نصیر سے ملاقات کی، جو شمالی افریقیہ کا

حاکم تھا اور جسکے مقابلہ میں اُسکے سپاہیوں نے بارہا اپنی تلواروں کے جوہر دکھائے تھے۔ اور اس سے کہا کہ اب ہمارے تمہارے درمیان لڑائی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب سے ہم تم باہم دوست ہیں۔ اسکے بعد اُس نے ہسپانیہ کی خوبصورتی، زرخیزی، اُسکی ندیوں اور سبزہ زاروں انگوروں اور زیتونوں، اُسکے شاندار شہروں اور محلوں اور اہل قوط کے خزانوں کے قصوں سے عربوں کے کان بھرنے شروع کیے۔ اُس نے کہا یہ وہ زمین ہے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، اور موسیٰ کو صرف یہی کرنا پڑے گا کہ جائے اور جا کر اُسپر قبضہ کرلے۔ میں خود تمہیں راستہ دکھاؤں گا اور تمکو اپنے جہاز بھی مستعار دوں گا۔ لیکن یہ عرب ایک ہوشیار سپہ سالار تھا، اس نے خیال کیا کہ شاید اس بلانے کی تحریک میں کوئی پُردغا کمینگاہ ہو اس لیے اُس نے اپنے آقا دمشق کے خلیفہ کے پاس قاصد بھیجے۔ اور ہدایتیں طلب کیں۔ اور اس اثنا میں اسی پر قناعت کی کہ ایک چھوٹی سی جماعت پانچ سو آدمیوں کی ۷۱۰ئہ میں طریف کی ماتحتی میں چھیڑ چھاڑ شروع کردینے کے لیے یولیان کے چار جہازوں پر ساحل اندلس کی طرف روانہ کی۔ اسوقت تک عرب بحر روم میں جہازرانی کے عادی نہیں ہوے تھے اور موسیٰ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی فوج میں سے ایک ناچیز جزو سے زیادہ کو گہرے پانی کے خطرے میں ڈالے۔

طریف کامیابی کے ساتھ اپنا کام انجام دے کے جولائی میں واپس آگیا۔ وہ اُسی مقام پر اُترا تھا جو اس وقت تک اُسکا نام تبلاتا ہے۔ طریف نے الجسیرہ کو لُوٹا۔ اور اسقدر کافی طور پر اس ملک کو دیکھ لیا کہ اُسے یولیان کا بیان ہسپانیہ کے بے دست وپا ہونے کی نسبت سچ معلوم ہوا۔ اور وہ سمجھا کہ حملہ آوروں کو اُسکی وفاداری پر بھروسا کرنا چاہیے۔ تاہم موسیٰ اسپر مائل نہ ہوا کہ اس نئی فتح پر زیادہ اعتماد کرے۔ دمشق کے خلیفہ نے اُسکو حکم بھیجا تھا کہ کسی طرح ساری اسلامی فوج کو غیر معلوم خطروں کا نشانہ نہ بنائے۔ اور صرف چھوٹی چھوٹی حملہ آوریوں کی اجازت دی تھی۔ باایں ہمہ طریف کی کامیابی سے قوی دل ہو کر موسیٰ نے کسی قدر بڑی

فوج بھیجنے کی ٹھان لی۔

۷۱۱ء میں موسیٰ کو جب یہ خبر لگی کہ رزریق اپنی سلطنت کے شمال میں اہل بشکنس کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہے تو اپنے سپہ سالاروں میں سے طارق مراکشی کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ جن میں سے اکثر مراکشی تھے اندلس میں ایکسا ورتاخت کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ حملہ اُسے اُسکی امید سے زیادہ دور لیگیا۔ طارق شیر کی چٹان کے پاس خشکی میں اُترا۔ جو اُس زمانے سے آج تک اُسی کے نام سے جبل الطارق یا جبرالٹر کہلاتی ہے۔ اور قارطیہ کو لے لینے کے بعد خشکی میں آگے بڑھا۔ وہ بہت دور نہیں گیا تھا کہ قوم قوط کی ساری فوج کو اپنے مقابلے کے لیے رزریق کی ماتحتی میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ دونوں فوجیں اِک چھوٹے سے دریا کے کنارے پر جسے شرقیین وادی لکہ (گاڈلک) کہتے تھے اور جو راس (ٹریفل گار) اطراف الغار کے پاس آبنائے میں گرتا ہے مقابل ہوئیں۔

روایت چلی آتی ہے کہ اس واقعہ سے چند روز پہلے ایک دن شاہ رزریق قدیم شہر طلیطلہ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ دو سن رسیدہ آدمی دیوان عام میں داخل ہوے۔ یہ اگلے دنوں کی بنی ہوئی سفید قبائیں پہنے تھے اور انکے پٹکے جن میں بارھوں برجوں کی صورتیں بنی ہوئی تھیں اُن میں بے شمار کنجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ اُن بوڑھوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت سنیے قدیم زمانے میں جسوقت ہرقل نے اپنے ستون سمندر کی اس آبنائے پر قائم کیے تھے اُس نے اس پرانے شہر طلیطلہ کے قریب ایک مستحکم برج کی بنیاد ڈالی اور اُسکے اندر ایک طلسمی جادو بند کیا جسکو بڑے وزنی آہنی پھاٹکوں سے جن میں فولادی قفل لگے ہوے ہیں محفوظ کیا۔ اور وصیت کی کہ ہر نئے بادشاہ کو لازم ہے کہ ایک نیا قفل دروازے میں لگا دے۔ اور پیشینگوئی کی کہ جو شخص اس برج کا راز افشا کرنا چاہے گا اُسکی شامت آجائے گی۔ اور ہمنے اور ہمارے آبا و اجداد نے ہرقل کے زمانے سے اسوقت تک اُس برج کے دروازے کی دربانی کی ہے اور اگرچہ ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جنھوں نے اس راز کو دریافت کرنا چاہا لیکن ہمیشہ اُنکا

انجام موت یا ایذا دہ حیرت ہی ہوا ہے۔ کوئی شخص کبھی چوکھٹ سے آگے نہ جا سکا۔ اسے بادشاہ۔ اس وقت ہم تجھسے یہ عرض کرنے کو آئے ہیں کہ تو بھی اس طلسمی برج میں اپنا قفل ڈالدے۔ جیسا کہ تجھسے پہلے سارے بادشاہوں نے کیا ہے۔ یہ کہکر وہ دونوں سن رسیدہ آدمی چلے گئے۔

لیکن جو کچھ ان بوڑھوں نے کہا تھا رزریق نے جب اسکو سوچا تو اُسکے دل میں ناقابل ضبط خواہش اس بات کی پیدا ہوئی کہ اُس طلسمی برج میں داخل ہونا چاہیے۔ اور ہر چند اُسکے پادریوں اور صلاح کاروں نے منع کیا اور اُس سے دوبارہ کہا کہ کوئی شخص کبھی اس برج میں زندہ داخل نہیں ہوا اور قیصر اعظم نے بھی اس میں جانے کی جرأت نہیں کی تھی

ناصحاے پاستاں گو یدکہ نکشا ید ہمی جز ازاں شاہے کہ تبود غیرازو در خانداں

مملکت آں گاہ باشد در شکست و ریختن بے وفا نیہا کند قعرے و چاہے بہر آں

واتش قہر الٰہی از فلک شعلہ فشاں

مگر اسپر بھی ایک دن وہ اپنے مصاحبوں کو ساتھ لیکر گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس برج کے قریب جا ہی پہونچا۔ وہ برج ایک بلند چٹان کے اوپر بنا ہوا تھا جسے چاروں طرف سے بطور حاشیہ کے نشیب و فراز ٹیلے اور ٹیکرے گھیرے ہوئے تھے۔ اُسکی دیواریں زبرجد و سنگ مرمر کی تھیں جن میں بڑی صناعی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور آفتاب کی کرنوں میں چمکتے تھے۔ اُس میں جانے کی راہ ایک راستہ میں سے تھی جو پتھر میں کاٹا گیا تھا اور اک بڑا آہنی پھاٹک اُس میں لگا تھا جو ہرقل کے زمانہ سے وٹیزا کے وقت تک کئی صدیوں کے زنگ آلود قفلوں سے ڈھنکا ہوا تھا اور داہنے بائیں وہ دونوں بوڑھے آدمی کھڑے تھے جو دیوان عام میں حاضر ہوے تھے۔ تمام دن دونوں بوڑھے دربانوں نے باوجود اسکے کہ فال بد سمجھ رہے تھے رزریق (راڈرک) کے ضعدار مصاحبوں کی مدد سے زنگ خوردہ کنجیوں کے گھمانے میں محنت کی اور جب آفتاب غروب ہونے کو آیا تو پھاٹک کھلا اور

بادشاہ معہ اپنے مصاحبین کے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھاٹک پیچھے پھر گیا اور سب لوگ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوے جسکے دوسری جانب اک دوسرے دروازے کو روکے ہوے ہیبت ناک صورت کی ایک برنجی مورت کھڑی تھی جو ایک بڑا سا گرز لگاتار چلا رہی اور بڑے زور سے آس پاس کی زمین پر مار رہی تھی۔

جب رزریق نے اس مورت کی صورت دیکھی تھوڑی دیر تک سناٹے میں رہا۔ لیکن اسکے سینے پر یہ الفاظ کہ "میں اپنا فرض انجام دیتا ہوں" دیکھکر اُس نے ہمت باندھی اور اُس سے بالحاح وزاری کہا کہ مجھے بخطر اُدھر جانے دو کیونکہ میں کسی طرح کی بے ادبی کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس برج کا راز دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اسپر وہ مورت اپنے گرز کو اوپر اُٹھائے چُپ چاپ کھڑی ہوگئی اور بادشاہ اور اُسکے مصاحب اُسکے نیچے سے دوسرے کمرے کو چلے گئے۔ اس کمرے کی گچ میں جواہرات جڑے ہوے تھے اور اُسکے بیچ میں ایک میز رکھی ہوئی تھی جسکو ہرقل نے اُس مقام پر نصب کیا تھا اور اسپر ایک صندوقچہ تھا جسپر یہ الفاظ کندہ تھے "اسی درج میں اس برج کا راز ہے"۔ بادشاہ کے سوا کسی کا ہاتھ اسکو کھول نہیں سکتا مگر اُسکو بھی آگاہ ہونا چاہیے کہ عجیب وغریب چیزیں اُسپر ظاہر ہونگی جنکا اُسکی موت سے پہلے وقوع میں آنا ضرور ہے۔

جب بادشاہ نے اُس صندوقچے کو کھولا تو اُس میں ایک چرمی کاغذ کے سوا جو دو مستی پتروں کے درمیان موڑا ہوا تھا کچھ بھی نہ تھا۔ اُسکے اوپر آدمیوں کی صورتیں بنی ہوئی تھیں جو گھوڑوں پر سوار، مہیب صورت کمانوں اور خنجروں سے مسلح تھے اور اُنکے اوپر کی طرف یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔ "او بے لحاظ۔ دیکھ لے اُن لوگوں کو جو تجھے تیرے تخت سے نیچے پٹک دینگے اور تیری مملکت کو اپنے زیرِ فرمان کرلیں گے"۔ اور جوں ہی ان لوگوں نے ان تصویروں کو نظر گڑا کر دیکھا یکبارگی جنگ کی آواز سنائی دی اور آنکھوں سے دُھندلا سا یہ دکھائی دیا کہ اُن اجنبی سواروں کی تصویروں نے حرکت کرنا شروع کیا اور وہ تصویریں جنگ کا مرقع بنگئیں۔

خیالی صورتوں کا آنکھ میں رذریق غمگیں کی	پیاپے آتے جانا بھی عجب طرفہ تماشا تھا
آل جنگ انجام حوادث نا شد ظاہر	مگر کوئی نہ مردہ تھا نہ زخموں سے تڑپتا تھا

اُن لوگوں کو آنکھوں کے سامنے ایک بڑا میدان جنگ دکھائی دیا جہاں عیسائی و مراکشی جاں کاہ لڑائی میں مشغول تھے۔ اُنکے کانوں میں گھوڑوں کے دوڑتے پھرنے۔ قرنے و بوق کے بجنے۔ جلاجل کے جھنجھنانے اور ہزاروں طبل پر زور زور سے تھاپ پڑنے کی صدائیں آئیں۔ شمشیر و گرز و تیر کی چمک بھی تھی اور تیروں کی سنسناہٹ اور بھالوں اور برچھیوں کی کھٹاکھٹ بھی۔ عیسائی اپنے حریف کے سامنے لرزاں و ترساں تھے اور مسلمان اُنپر پل پڑے اور اُنکو بالکل منتشر کر دیا۔ صلیبی جھنڈا سرنگوں تھا اور ہسپانیہ کا علم قدموں کے نیچے پامال۔ ہوا میں خوشی کے نعرے۔ غیظ کی چیخیں اور دم توڑنے والوں کی آہیں گونج رہی تھیں۔ شاہ رذریق نے دیکھا کہ بھاگنے والے دستوں کے بیچ میں ایک سپاہی تاج شاہی پہنے ہوے ہے جسکی پشت اسکی طرف ہے مگر اُسکے اسلحہ و سامان خود اُسی کے ہیں اور وہ ایک نقرہ گھوڑے پر سوار ہے جو خود اُسی کے لڑائی کے گھوڑے اوریلیا نام کے مشابہ ہے۔ لڑائی کی گھبراہٹ میں وہ سوار گھوڑے کی پیٹھ سے جدا ہو گیا اور پھر نہیں معلوم وہ کہاں گیا اور کیا ہو گیا۔ اور اوریلیا میدان جنگ میں بے سوار ہو کر بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔

جب بادشاہ اور اُسکے مصاحب اُس طلسمی بُرج سے ہراساں ہو کر بھاگے تو وہ بڑی برنجی مورت غائب تھی۔ دونوں سن رسیدہ دربان دروازے پر مرے پڑے تھے اور قدرت کی مختلف طوفان افزا بدشگونیوں کے درمیان وہ برج مشتعل اور اُسکا ایک ایک پتھر جل کر خاک سیاہ و برباد ہو رہا تھا۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ جہاں کہیں اُسکی خاک زمین پر گری وہاں خون کا ایک قطرہ دیکھنے میں آیا۔

عہد متوسط کے، عیسائی و عرب مورخ دونوں ہی کو اس قسم کی بدفالیوں کے بیان کرنے میں خوشی حاصل ہوتی تھی۔

داستان وہم ملا متہا و خواب فالہا — طرفہ تصویر خیالی را بہ بازار آورند
پیکر تخئیل قوطی بالباس نقش و رنگ — عاریت کردہ زاد ہام عرب بار آورند

اور ہم کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ کیونکر اُس آنے والی جنگ کے بارے میں دونوں فریق مختلف قسم کے شگونوں سے شاداں و ہراساں تھے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بیان ہے کہ طارق کے پاس خواب میں تشریف لائے اور اُس سے فرمایا کہ ہمت کرکے لڑو اور فتح حاصل کرو۔ اور بہت سی اسی قسم کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن جو قومیں کہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں دریائے وادی لک پر اور اُس کے قریب خیمہ زن تھیں اُنکے خواب و خیال چاہے کچھ ہی رہے ہوں اس جنگ کا نتیجہ بھی مشتبہ نہ رہا۔ گو طارق کے پاس بلاشبہ پانچ ہزار بربروں کی کمک پہونچی تھی تاہم اُسکے تحت میں ایک چھوٹی سی فوج بارہ ہزار سپاہیوں کی تھی اور رزریق کے پاس اسکے چھ گنے آدمی پشت پر موجود تھے۔ لیکن حملہ آور تو بہادر و پختہ کار، لڑائی کے عادی اور ایک جری سردار کے ماتحت تھے اور اُندلسی بدحال غلاموں کے غول تھے جنکے سپہ سالاروں میں دغاباز اُمرا شامل تھے۔ شاہ وٹیزا کے اقربا بھی رزریق کی طلبی پر آموجود ہوئے تھے مگر اُنکا ارادہ یہ تھا کہ عین جنگ میں انھیں چھوڑ کر دشمنوں کے ساتھ جا ملیں اور شرقیین کو لڑائی جتا دیں۔ انھیں اسکا کچھ خیال نہ تھا کہ وہ ہسپانیہ کے ساتھ بیوفائی کرتے ہیں۔ یہ سمجھے تھے کہ حملہ آور صرف مالِ غنیمت کی تلاش میں ہیں اور جب یہ ڈھیر تمام ہو جائے گی اور مال و متاع اُنکے ہاتھ لگ جائیگا تو وہ افریقہ واپس چلے جائیں گے۔ اور غیطشہ کے خاندان کو اُسکا قدیم تخت واپس مل جائیگا یہ وجہ ہوئی کہ اُن لوگوں نے اُس فتح میں حملہ آوروں کی مدد کی۔ جس نے ہسپانیہ کے عمدہ ترین اضلاع کو آٹھ صدیوں کے لیے مسلمانوں کی حکومت میں دے دیا۔

جب مسلمانوں نے اُس جرار فوج پر نظر ڈالی جو رزریق اُنکے مقابلے کے لیے لایا تھا اور بادشاہ کو اُسکے پُرشکوہ اسلحہ سے مسلح ایک زرق برق شامیانے کے نیچے دیکھا تو ایک لمحہ کے لیے

اُنکے اوسان خطا ہوگئے۔ مگر طارق نے زور سے نعرہ مارا۔ اے لوگو۔ دشمن تو تمہارے سامنے ہیں اور سمندر تمہاری پشت پر۔ بجز اکوئی صورت تمہارے مفر کی نہیں ہے بجز اسکے کہ بہادری کے جوہر دکھاؤ اور استقلال سے کام لو۔ سب نے ہمتیں باندھیں اور چلا اُٹھے کہ اے طارق۔ ہم تیرا اتباع کریں گے۔ اور اپنے سپہ سالار کے پیچھے جان توڑکر ہولیے۔ یہ جنگ پورے ہفتہ بھر قائم رہی اور دونوں جانب بہادری کے بعید از قیاس واقعات قلمبند ہوے ہیں۔ رزریق نے باربار اپنی فوج کو سنبھالا۔ مگر جانبداران وٹیزا کے ادھر ملجانے نے میدانِ جنگ کی تقدیر پلٹ دی اور اُسکو مصیبت انگیز شکست کی تماشہ گاہ بنا دیا۔

ہوئی تھی رزریق کی جماعت بہت ہی ابتر بصد خرابی
جو ہارا دہ آٹھویں لڑائی تھی دل میں قوت نہ آس باقی
جو دیکھا اُس نے کہ رن میں ہارا نہیں ہے باقی کوئی سہارا
تو بھاگنے والوں سے کنارے چلا اکیلا ستم کا مارا
وہ خون آلود خاک بر سر تھا نکلا جنگل سے مثل اژدر
بہت ہی بے چین و سخت مضطر لیے ہوے ہاتھ میں تھا خنجر
مگر تھی دھار اُسکی مثل ارہ جو رنگ پوچھو تو سرخ و تیرہ
زرہ مرصع تھی پرزے پرزے ہوا تھا خود اُس کا پارہ پارہ
تھی اک پہاڑی کی اونچی چوٹی اُسی کو اُسنے بنایا مامن
وہیں سے ہر سو نگاہ ڈالی کہ پھر نہ ہوں گے نصیب روشن
نظر پڑے اُسکو شاہی جھنڈے پھٹے ہوے اور خوں میں لتھڑے
سُنے وہیں سے ظفر کے نعرے عرب کا طنطنہ کہ لو وہ ہارے
نگہ نے ڈھونڈا بہادروں کو لڑاتے تھے جو مبارزوں کو
تو پایا سب جلد بے گھروں کو نہیں کوئی جو گنے سروں کو

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد عہ
- البرامکہ " ۱ے

مولوی چراغ علی مرحوم
- مقالات تہذیب الاخلاق عہ
- تحقیق الجہاد مجلد ۱ے
- اعظم الکلام ۲ جلد ۱ے
- اسلام کی دنیوی برکتیں ۸ر
- حضرت سلیمان ۴ر
- حضرت ہاجرہ ۳ر
- حقیقۃ السحر ۳ر
- یورپ پر قرآن ۳ر
- احسان عام ۱ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق ۱۲ر
- کتاب الشفعہ ۱۲ر
- لکچر ۸ر
- شرح قانون شہادت ۱ے

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل ۱ے
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد ۱ے
- تاریخ پٹیالہ ۱۲ر

مسٹر ظفر عمر
- مستقبل اسلام ۱۲
- پولیس میں ۸ر
- نیلی چھتری ۱۲ر

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند ...
- سیل الکل جو برج دو پنس ۱ے
- عروج کا فن تعمیر ۴ر
- سفرنامہ موسیو تھیونو عہ

حاجی اسمٰعیل خاں
- فلاح دارین ۴ر
- حالات زمین ۸ر
- تربیت الدجاج ۸ر
- غذا نعما عہ
- نظم نعت ۴ر

مولوی حبیب الرحمن خاں
- علمائے سلف ۱۲ر
- اسلامی اخلاق ۶ر
- ذکر الحبیب ۲ر
- ذکر جمیل ۵ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز عہ
- کرم اردوی عہ

منشی سید احمد ماہروی
- آثار اکبری ۱۲ر
- حیات خسرو ۱۲
- حیات صالح ۱۲ر
- نساء السلاطین ۱۲ر
- آثار خیر ۲ر
- امرائے ہنود ۱۲ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا ۴ر
- شمع و شاعر ۴ر
- بلال ۱ر
- شکوہ ۱ر
- جواب شکوہ ۲ر
- نالۂ یتیم ۴ر
- فریاد امت ۴ر
- تصویر درد ۴ر
- مکمل ترانہ ۱ر

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابوالبشر عہ
- حقائق اسلام ۱۲ر
- اثبات واجب الوجود ۸ر
- قوت خیال ۴ر
- صوفیانہ داری ۲ حصہ عہ

سید راحت حسین
- الفقر ۸ر
- التحمل ۱۰ر

مسٹر ظفر علی خاں
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد صہ
- خیابان فارس ۸ر
- جنگل میں منگل ۸ر
- سیر ظلمات ۱۲ر
- ڈراما جنگ روس و جاپان ۲ر
- فلسفہ ابن سینا ۲ر
- معاشرت ۶ر

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل عہ
- روزنامہ بالتصویر ۱ے
- بالتصویر عہ
- روزنامچہ ۸ر
- تسخیر مہر و قمر ۲ر
- رسول کی عیدی ۲ر
- پیاری تنکڑی ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۸ر
- گاما خاتون ۸ر
- اسلام کا انجام ۴ر
- بیوی کی تعلیم ۱۲ر
- انتخاب توحید عہ
- میلاد نامہ عہ
- کرشن بیتی ۱۲ر
- اردو دعائیں ۲ر
- فلسفہ شہادت ۲ر
- غدر دہلی کے افسانے ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۸ر
- جگ بیتی ۳ر
- بچوں کی کہانیاں ۴ر
- اسرار ۴ر
- کم تو موت عہ
- سیر دہلی عہ

مولانا راشد الخیری
- منازل السائرہ ۱۲ر
- شام زندگی عہ
- الزہرا ۲ر
- سات روحوں کے اعمال نامے ۶ر

مولانا اشرف علی
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب عہ
- تعلیم الدین ۱ے
- تکسیر فی اثبات التقدیر عہ
- الانتباہات المفیدہ ۲ر
- اصلاح الرسوم ۴ر
- کلید مثنوی ۲ حصہ ۱۲ر
- مناجات مقبول ۱ر
- اوراد و وظائف ۱ے
- فتاوی اشرفیہ ۸ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے ۴ر
- بہشتی گوہر ۲ر
- جزاء الاعمال ۱ر
- فروع الایمان ۲ر
- التکشف ۵ حصے ۱۲ر
- اصلاح ترجمہ دہلویہ ۲ر

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ عہ
- الصدیق عہ
- المرتضیٰ عہ
- سیاحت ہند مجلد ۱۲ر
- عربی بول چال ۲ حصہ عہ
- کتاب الصرف ۸ر
- کتاب النحو ۵ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت کامل ۱ے
- حسن سرور ۲ر
- دیول دیوی ۹ر
- گورا ۱۲ر
- نیل کا سانپ ۴ر
- حقیقت عباسہ ۲ حصہ
- حمزہ حسینہ کامل ۱۲ر

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد ۳ے
- نشاط عمر عہ
- عصائے پیری ۱۱ر
- بنات دولھن عہ
- حسن معاشرت عہ

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام ۱۰ر
- عائشہ صدیقہ ۱۲ر
- جذبات بھاشا ۱۱ر

سیماب اکبرآبادی
- بنت الرسول ۵ر
- جام کوثر ۸ر
- بہشتی جھومر ۱۲ر

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن ۱۲ر
- لغات جدیدہ عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد ۱ے

مولوی مصباح الدین احمد
- الہارون عہ
- محاربۂ فرانس و پرشیا عہ
- مصباح الادب ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبد الحلیم شرر

جنید بغدادی	عہ
ابوبکر شبلی	عہ
خواجہ معین الدین	۶ر
عصر قدیم	۴ر
دولت ہسپانیہ عرب	عہ
حروب صلیبیہ	۸ر
تاریخ سندھ	۱۲ر
قرۃ العین	۴ر
تاریخ یہود	۱۰ر
مسیح اور مسیحیت	۴ر
ملکہ زنوبیہ	۴ر
الحکم الرفاعیہ	۴ر
آغائی صاحب	عہ
سکینہ بنت حسین	۴ر
مذررات مجلد	۸ر
تذکرہ مشاہیر عالم	۴ر
درویش نندنی	۱۰ر
حسن بن صباح	۶ر
افسانۂ قیس	۴ر
مقدس نازنین	عہ
قیس و لبنیٰ	۴ر
ایام عرب	۸ر
حسن انجلینا	۴ر
میوۂ تلخ	۴ر
شہید وفا	۸ر
بکٹس	۸ر
عجیب کاول	۴ر
میوۂ تلخ	۴ر
ماہ ملک	۸ر
شوقین ملکہ	۴ر
ملک العزیز ورجنا	۴ر
یوسف و نجمہ	۴ر
زیاد و حلاوہ	۸ر
رومۃ الکبریٰ	۴ر
فلورا فلورنڈا	۸ر
زمانہ اور اسلام	۳ر
فردوس بریں	عہ
آغا صادق کی شادی	۱۰ر
بدر النساء کی مصیبت	۲ر
حسن کا ڈاکو	۴ر
دربار حرام پور	۱۰ر
خوفناک محبت	۴ر
الفانسو	۱۲ر
فلپانا	۴ر
فاتح مفتوح	۴ر
ہندوستان کی موسیقی	۴ر
سرسہ کی نئی کتابیں	۲ر
جویائے حق	۴ر
بابک خرمی	۱۲ر
فتح اندلس	۵ر
اردو کا تعلق ہندو دو سے	۴ر

مرزا محمد ہادی رسوا

امراؤ جان ادا	۱۲ر
لیلیٰ مجنوں	۸ر
نوبہار	۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذین	۶ر
حاجی بغلول	۸ر
پیاری دنیا	۱۰ر
طلسمی فانوس	۸ر
طرحدار لونڈی	۸ر
میٹھی چھری	۴ر
کایا پلٹ	۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ہشو	۴ر
بچھڑی دلہن	۸ر
کڑم دھم	۶ر
پی کہاں	۶ر
کامنی	۴ر
جام سرشار	عہ
خدائی فوجدار	۸ر
فسانۂ آزاد	۱۲ر
سیر کہسار	عہ

منشی جوالا پرشاد برق

مرنا لنی	۱۰ر
مار آستین	۱۰ر
بنگالی دلہن	۱۲ر
پرتاپ	۶ر
معشوقۂ عرب	۲ر
بروگ	۵ر
آتھیلو	۴ر

جلال مرحوم

مضمونہائے دلکش	عہ
نظم نگارین	عہ
افادۂ تاریخ	۸ر
رسالۂ تذکیر و تانیث	۶ر

منشی احمد علی شوق

ترانۂ شوق	۸ر
قاسم و زہرہ	۱۲ر
عالم خیال	۸ر
سیکفرڈ لوسی	۲ر

منشی احمد علی مرحوم

تاریخ تمدن	۴ر
شباب لکھنؤ	۴ر
مرقع اودھ	۸ر

مسٹر عبد الماجد

تاریخ اخلاق یورپ مجلد	سے
فلسفہ جذبات	۴ر
فلسفہ اجتماع	۴ر
غذائے انسانی	۳ر
فلسفہ کی تعلیم	۲ر
ہم دو پیشیاں (ڈراما)	۸ر

مسٹر انیس احمد عباسی

راجہ کی کامیابی	۶ر
بحری جنگ	۶ر

مولانا عبد الشکور

اسد الغابہ ۸ جلد	عہ
علم الفقہ ۲ حصے	للعہ

علامہ سید احمد

حمایت الاسلام حصہ اول	عہ
״ حصہ دوم	۱۲
فن ہیئت	۸ر
فن کیمسٹری	۲ر

خواجہ عشرت

زبان دانی	۴ر
اصلاح زبان اردو	۴ر

منشی عاشق حسین

مشتاق و زہرہ	۴ر
افشائے راز	۴ر
مظفر و رامابائی	۱۲ر
سلطانہ نادرک دو حصے	عہ
شادی و غم	۴ر
تارا ۲ حصے	۸ر

وحشی نگرامی

مجوس کنشت	عہ
خون آرزو	۴ر
خواب عبرت	۲ر
معشوقۂ عرب	عہ
جفائے ناز	۵ر

مسٹر حسین قدوائی

ذکر طیب محمد عربی	۱۰ر
مشیر	۸ر
عرض حال	۱ر
جذب دل	۸ر
حاکم و محکوم	۴ر

منشی سعید احمد ناطق

خواب عاشق	۵ر
انجمن آرا	عہ
مسافر دمشق	۶ر
اسمٰعیل و زہرہ	۹ر
ہر فرعونے را موسیٰ	۱۲ر
محبوبۂ فرانس	۸ر
شہر آشوب لندن	۱۴ر

شیخ احمد علی کامل

رادھا رانی	۳ر
پاربتی	۳ر
کلثوم	۳ر
دو پھول	۳ر

متفرق کتابیں

واقعات انیس	۸ر
جمیلہ کی ناکامیاں	۵ر
جواہر التفاسیر	۵ر
خیالات آلیان	۴ر
خواب شگفتہ	۴ر
نشتر عشق	۵ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر لے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰ | ماہ [illegible] سنہ ۱۹۱۸ء | جلد ۱۸

فہرست مضامین

الناظر پریس چوک لکھنؤ

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اُردوی معلّی — ؏
- عود ہندی — ۱۰ر
- دیوان غالب قسم اعلیٰ — [illegible]
- مع شرح نظم طباطبائی — ؏ر
- مع شرح حسرت موہانی — عہ ر

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید (مجلد) — للعہ ر
- یادگار غالب — ؏ر
- حیات سعدی — ؏ر
- مضامین حالی — ؏
- ضمیمہ کلیات حالی — ۱۲ر
- مجموعہ نظم حالی — ۱۲ر
- مسدس حالی — [illegible]
- شکوۂ ہند — ۲ر
- مثنوی حقوق اولاد — ۲ر
- رباعیات حالی — ۲ر
- قطعات حالی — ۸ر
- مرثیہ مرزا غالب — ار
- بیوہ کی مناجات — ۲ر
- الدین یسر — ۳ر
- تحفۃ الاخوان — ۵ر
- رحم و انصاف — ار
- چپ کی داد — ار
- ننگ خدمت — ار
- پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ — ار
- محب وطن — ار
- تعصب و انصاف — ار

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد — بے ر
- تفسیر القرآن (۷ جلد) — [illegible]
- تبیین الکلام (۳ جلد) — للعہ
- آثار الصنادید — ے ر
- خطبات احمدیہ — ؏
- مکمل مجموعہ لکچر (مجلد) — بے
- سیرۃ فریدیہ — ۱۰ر
- اسباب بغاوت ہند — ۶ر
- مقالات سرسید — عہ ر
- آخری مضامین سرسید — ؏ر
- النظر فی بعض مسائل — ۱۲ر
- تحریر فی اصول التفسیر — ۸ر
- احکام طعام اہل الکتاب — ۲ر
- ترقیم فی قصہ اصحاب کہف — ۶ر
- ابطال غلامی — عہ ر
- ازالۃ الغین — ۵ر
- تفسیر السمٰوات — ۸ر
- جواب امہات المومنین — ۴ر
- الدعاء والاستجابۃ — ۳ر
- [illegible] — ار
- ایک نادان خدا پرست — ار
- انشاء اللہ — ا
- لکچر اسلام — ۲ر
- خلق الانسان — ۲ر
- الجن والجان — ۵ر
- سفرنامہ پنجاب — عہ ر
- ....
- ....

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد — بیہ ر
- " خفی — معہ
- ترجمۃ القرآن متوسط — للعہ
- ترجمہ حمائل شریف — بے ۱۲ر
- ادعیۃ القرآن — ۲ر
- دو سورہ — ار
- مطالب القرآن — عہ ر
- الحقوق والفرائض — للعہ ۱۲ر
- اجتہاد — عہ ر
- امہات الامہ — ۱۲ر
- مرآۃ العروس — ۸ر
- بنات النعش — ۷ر
- توبۃ النصوح — ۷ر
- چند پند — ۴ر
- منتخب الحکایات — ۴ر
- مبادی الحکمہ — ۸ر
- موعظہ حسنہ — ۱۰ر
- ابن الوقت — عہ ر
- ایامیٰ — ۱۴ر
- فسانۂ مبتلا — عہ ر
- لکچروں کا مجموعہ — عہ ر
- لکچر نمبر ۲۳ ۲۴۰۲۳ — ۳ر
- لکچر نمبر ۳۶ مدرسہ [illegible] — ۴ر
- لکچر تنبیہ — ۴ر
- لکچر تعلیم — ۲ر
- مجموعہ نظم بےنظیر — عہ

مولانا آزاد مرحوم

- آبحیات — ؏ر
- دربار اکبری — ار
- سخندان فارس — ے ر
- نیرنگ خیال — ۹
- نظم آزاد — ۱۰ر
- قند پارسی — ۱۰ر
- قصص ہند — ۶ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — للعہ
- تاریخ عہد سلطنت ملکہ معظمہ — ے ر
- سوانحعمری ملکہ معظمہ — ؏ر
- کرزن نامہ — عہ ر
- فلسفہ امثال — ۸ر
- محاسن الاخلاق — ؏ر
- تہذیب الاخلاق — ار
- صحیفہ نظرت — ؏ر
- تقویم اللسان — ۴ر
- تعلیم النظام — ۴ر
- جغرافیہ ریاضیہ — ۸ر
- رسالہ علم ساحت — ۳ر
- معاون الحساب — ۸ر
- ساحت خرد — ۶ر
- ناربات عظیم — ۴ر
- عجائب الحساب — ۸ر
- رسالہ علم مناسب — ۳ر

مولانا شبلی مرحوم

- موازنہ انیس و دبیر — للعہ ر
- الفاروق — ؏
- الغزالی — ؏
- المامون — ؏ر
- سیرۃ النعمان — ؏ر
- سوانحعمری مولانا روم — ؏
- حیات خسرو — ۱۰ر
- علم الکلام — ؏ر
- الکلام — ؏
- سفرنامہ مصر و روم و شام — ؏ر
- رسائل شبلی — عہ ر
- مقالات شبلی — ؏
- مضامین عالمگیر — ۱۰ر
- شعر العجم جلد اول — بے
- " جلد دوم — ؏
- " سوم — ۱۲ر
- " چہارم — ؏
- مثنوی صبح امید — ۴ر
- آغاز اسلام — ۱۲ر
- کتب خانہ اسکندریہ — ۵ر
- اسلامی حکومت — ۲ر
- زیب النسا — ار
- جہانگیر — ۲ر
- مجموعہ نظم اردو — ۸ر
- دیوان شبلی فارسی — ۸ر
- بوئے گل — ۴ر
- دستہ گل — ۴ر
- برگ گل — ۴ر

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — بے ر
- مسلمانوں کی تہذیب — ۴ر
- مکاتبات [illegible] — ؏ر
- تقلید و عمل بالحدیث — ۸ر
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب — ۸ر
- کتاب المحبت والشوق — ۸ر
- فطرت اللہ قانون فطرت — ۳ر
- اسلام — ۲ر
- آیات بینات جلد — عسہ ر
- مجموعہ لکچر مجلد — بے

مولانا اشہری مرحوم

- حیات انیس — ؏
- ایشیائی شاعری — عہ ر
- ادیب — ار
- دُرِ شاہوار — ۸ر
- نور جہاں — ۸ر
- ٹیپو سلطان — ۸ر
- حیدر علی سلطان — ۱۲ر
- اُردو کا گلدستہ — ۴ر
- اُردو کی ڈالی — ۳ر
- قومی نظم — ۴ر
- مرقع تاجپوشی — عہ ر
- رہنمائے حیدرآباد دکن — ۱ر
- مکالمہ مرد و عورت — ۳ر
- [illegible] — ۸ر
- سوانح نظام حیدرآباد — ۱۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

تیار ہیں، منگا لیجیے

اساس التعلیم (از منشی محمد عبد الحق بی اے ایل ایل بی منصف لکھنؤ) اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت کس طریقہ پر کرنا چاہیے اور اُن ممالک میں جن کی طاقت و ترقی پر ایک عالم کو رشک ہے بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہے تو اس لاجواب کتاب کو ضرور پڑھیے۔ کتاب کا حجم ۱۸ جزو مختلف آبہائے تعلیم کی ۵ عکسی تصویریں مزید براں جلد خوشنما۔ قیمت عہ

شعر العجم (جلد اول) اس کا پہلا ایڈیشن مولوی شبلی کی زندگی ہی میں ختم ہو چکا تھا اور کئی برس سے شائقین متقاضی تھے۔ لہذا اب الناظر پریس نے اسے پھر چھاپا ہے مگر گرانی کاغذ کے باعث جلد ونکی تعداد کم؟ دہر قیمت ہے عہر

مثنوی صبح امید۔ مولانا شبلی کی سب سے پہلی اردو نظم۔ الناظر پریس نے بڑی صفائی سے چھاپی ہے قیمت ۴ر

اصول نسخ۔ عربی زبان سے مسلمانوں کا تعلق ظاہر ہے اور خط نسخ بھی اسکا لباس ہونے کی وجہ سے ہمیشہ انکو مرغوب رہا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور خوشنویس منشی حامد علی مرصع رقم نے اپنی ساری عمر کے مشق و تجربہ کی بنا پر یہ کتاب لکھی ہے تاکہ نوشقوں کو خط نسخ حاصل کرنے اور اسمیں مہارت پیدا کرنے میں مدد ملے۔ یہ کتاب صوتاً اور معناً ہر طرح اس فن کی ایک جامع اور مستند کتاب ہے اور اردو میں چونکہ ایسا کوئی رسالہ موجود نہ تھا اس وجہ سے خاص قدردانی کی سزاوار ہے۔ قیمت ۱ر

مساوات۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ افسانہ ہے جو عرصہ ہوا سلطان حیدر صاحب جوش نے الناظر میں لکھا تھا۔ اب اُسے علیحدہ چھاپ دیا ہے قیمت ۸ر

کیوپڈ اور سائیکی۔ مولانا نیاز فتح پوری کی جدید کتاب۔ قیمت ۱ر

سراب مغرب۔ مولانا راشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف۔ قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا۔ مولانا راشد الخیری کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن۔ حال ہی میں چھپا ہے قیمت ۸ر

لسان الغیب (جلد چہارم) میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل کی شرح دیوان حافظ قیمت عہ (مکمل شرح کی چاروں جلدوں کی قیمت ۴ ۔ ۱)

کلیات اکبر (حصہ اول) لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ حصہ اول عرصہ سے نہیں ملتا تھا۔ اب پھر چھپا ہے۔ قیمت ۴ر

صبح وطن۔ یعنی پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کے کلام کا مجموعہ جسمیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیات دونوں شامل ہیں۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحہ۔ قیمت عہ

منیجر الناظر ایجنسی لکھنؤ

اصلی عرق کافور | **وقت پر صلاح** | اصلی عرق کافور

جو دوست ہوتے ہین وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہین۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے اس موسم مین کھانے پینے یا رہنے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف رہتا ہے۔ اس سے بچنے کیلیے پہلے ہی ایک شیشی اصل عرق کافور منگوا کر گھر مین ڈال رکھیں جس سے اپنی یا پڑوسیونکی وقت پر حفاظت ہوسکے۔ یہ اصلی عرق کافور عرصہ چونتیس ۳۴ سال سے تمام ہندوستان مین مشہور ہو رہی ہے۔ یہ عرق گرمی کے دست پیٹ کے درد متلی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت ایک شیشی ۱۰؍ محصولڈاک ایک سے چار تک ۵؍

ادویات ہر جگہ دوکانداروں اور دوا فروشوں سے مل سکتی ہین ورنہ کارخانہ سے طلب کیجیے

طاعونکی مجرب دوا | **پلیگ سے کیون ڈرتے ہو** | طاعونکی مجرب دوا

سولہ سال سے سب بیماریونکے اس سے ڈرنیکا سبب یہ ہے کہ آجتک لاکھوں انسان اس موذی عارضہ کے پنجہ ظلم سے ہلاک ہوچکے ہین گانوٴن کے گانوٴن اُجاڑ ہوگئے شہر کے شہر تباہ ہوگئے اسوجہ سے اسکے نام ہی سے دہشت ہوتی ہے۔ پلیگ مین مبتلا ہونیکے بعد پھر کوئی علاج نہین ہے۔ لیکن بنظر حفظ ما تقدم ڈاکٹر ایس کے برمن کی پلیگ روکنے والی گولیاں منگوا کر ضرور رکھیں ان گولیوں کے استعمال سے جسم کے خون مین کچھ ایسا اثر ہوتا ہے جس سے پلیگ کے کیڑے نہ ٹھہر سکتے ہین اور نہ زہر اثر کرسکتا ہے وقت پر اس کے استعمال سے ہزاروں انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہین آپ بھی غافل نہین رہین ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل جانا چاہیے بچونکو نصف یا چوتھائی قیمت ۳۶ گولیون کی ڈبیہ ۸؍ ۷۰ گولیون کی ڈبیہ ۱۲؍

محصولڈاک ایک سے ۶ ڈبیہ تک پانچ آنہ ۵؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

جناب دیوان مہاراجہ بنارس بابو بابیشر پرشاد رام نگر سے لکھتے ہین آپ کا عرق کافور واقعی آبحیات ہے۔

دیکھیے مہاراجہ بہادر ... نرائن سنگھ دیو ضلع گیا سے تحریر فرماتے ہین۔ آپکی دوا ہیضہ کو بہت جلد دور کرتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰ جلد ۱۸ یکم مارچ سنہ ۱۹۱۸ء

حیاتِ اسلام

اسلام کی ترقی کا راز صرف قومی خودداری، اخوت و مساوات میں ہے۔ خودداری کے لیے قومیت کی حفاظت و نگہداشت اور قومی افراد میں اخوت و مساوات کے گہرے اصول اسلامی زندگی میں قائم کیے گئے ہیں، قومی نمائش کے اصول اسلام میں تمام اقوام سے جدا قائم کیے گئے ہیں اور دیگر اقوام میں خلط نہیں ہونے دیا ہے تاکہ قومیت نمایاں و ممتاز رہے۔ اور انھیں اصول کی پابندی حیاتِ اسلام ہے۔

طفلِ اسلام

اسلامی بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے اُسی وقت سے اصولِ خودداری برتے جاتے ہیں۔ اسلامی نشانیاں ڈال کر قومیت قائم کی جاتی ہے۔ ولادت ہوتے ہی کان میں اذان دے کر لوگوں کو فردِ اسلامی کی افزونی کی اطلاع دی جاتی ہے۔ پھر ساتویں روز ولادت سے سر مونڈنے اور ختنہ کی دو نشانیاں بچہ کے لگائی جاتی ہیں۔ قربانی کرکے لوگوں کو گوشت کھلاتے ہیں جس میں علاوہ ایثار و احسان کے قومیت کا اعلان مقصود ہے۔ ذبح حیوانی کے وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے: یا قوم انی بری مما تشرکون انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا مسلما وما انا من المشرکین ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ وبذلک امرت وانا من المسلمین اللہم منک ولک بسم اللہ وباللہ واللہ اکبر اللہم صل علی محمد وآل محمد وتقبل" حضرت [illegible]

خلیلؑ کی سنت انھیں کے قول سے شروع ہوتی ہے اور ملت خلیل کی تاسی اُسی دین حنیف پر باقی رہنے کی شہادت، مسلمان ہونے کا اظہار، شرک سے بیزاری، موت و حیات ہر کار و بار زندگی کا خدا کی طاعت میں ہونا، اُسی وحدہٗ لاشریک کی بزرگواری اور نبی وآل کی شرافت کا اظہار کرکے خدا سے قبولیت کی دعا مانگنا اور یہ دکھانا ہے کہ یہ مولود اسی فطرت اسلامی پر پیدا ہوا ہے اور قوم کا ایک مذہبی نمایندہ ہے۔

اسلامی نام

ہر بچہ کے نام رکھنے میں بھی یہی خصوصیت ملحوظ ہے۔ ایسا نام رکھو جس میں معبود برحق کی عبدیت ظاہر ہو یا وہ شان خدا انبیاؑ و اولیاؑ کا نام رکھو۔ دوسرے ناموں کی ممانعت ہے تاکہ قومیت میں فرق نہ آئے، غیر اقوام سے اختلاط رسمی بھی نہ ہو۔ جس لڑکے کا نام محمدؐ یا علیؑ رکھا جائے اُسکا نام لیکر برا بھلا نہ کہو۔ اس میں دین کی عظمت کا نمایاں پہلو ہے۔ مذہبی وقار کا قائم ہونا قوی وقار کی بنیاد، بچہ کی عظمت اور نام رکھتے ہی بچہ کی عظمت کی عادت ڈالنا ہے۔

اسلامی بچہ قوم کی ایک ضروری فرد سمجھی جاتی ہے۔ بچوں کو کھیلتا دیکھکر رسولؐ خاک پر بیٹھ جاتے تھے اور بچہ کو گود میں اُٹھا کر پیار فرماتے تھے۔ دوسروں کو حکم تھا "دو بچے جسکی گود میں ہوں ایک کو پیار کرے اور دوسرے کو نہ کرے تو اُس نے مواسات نہیں کی اور جفا کی"۔ اس قدر مساوات کا لحاظ ہے کہ دوسرے بچہ کو پیار نہ کرنا آپ کی عدالت پسند طبیعت کو ناگوار تھا۔

پھر فرماتے ہیں "بچہ کو پیار کرنے میں خدا ایک حسنہ لکھتا ہے جو بچہ کو خوش کرے اُسکو قیامت میں خدا خوش کرتا ہے۔ اور جو بچہ کو قرآن تعلیم دے اُسکے ماں باپ کو خدا دو حلّے نور کے قیامت میں پہنائے گا جنکے نور سے اہل جنت کے مُنہ روشن نظر آئیں گے"۔

اسلامی بچوں کی تعلیم و توقیر اور اُن سے محبت اور پیار قوم کی عزت و خودداری ہے۔ بچوں کے وجود کی حفاظت اور اُنکی نگہداشت یہاں تک کی گئی ہے کہ رسولؐ کا ارشاد ہے "بچوں کو احمق عورتوں کا دودھ نہ پلاؤ، انّا کی حماقت دودھ کے ذریعہ بچہ میں سرایت نہ کرے اور اُسکی کج فہمی و بےعقلی مولود کی طبیعت پر اثر نہ کرے"۔ صاف بتایا ہے کہ بچے دایہ کا رنگ اُتارتے ہیں۔ ہر وقت گود میں رہنا، کمزور و خراب دودھ پینا موجب ضعف جسمانی اور باعث کمزوری اخلاق ہے۔ بیشک بچہ ماں اور دایہ کے حرکات و افعال و اقوال کو سیکھتا ہے اور ابتدائی تعلیم انھیں کی گودوں میں حاصل کرتا ہے۔ اگر ماں اور دایہ بداخلاق

یا طبیعت کی کمزوری ہی تو بچہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ اسلام میں بچوں کے اخلاق و اطوار کی درستی کا لحاظ پیدا ہونے ہی کیا گیا ہے۔ انکی ابتدائی تعلیم ماں اور دودھ پلانے والی کی گود ہی سے شروع ہوتی ہے۔ انکی زندگی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ آج یہ لڑکے ہیں کل یہی قوموں کے باپ ہونگے۔

تعلیم

جیسے بچہ کی زبان کھلنا شروع ہو پہلے کلمۂ شہادت تعلیم کرنا، پھر سجدہ کی عادت ڈالنا رکوع و سجود بتانا وضو و نماز سکھانا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ بچہ زبان کھلتے ہی درستی سے اسلامی قومیت کا اظہار کرتا ہے۔ مسلمان ماں باپ بچہ کی بھولی بھولی دل لبھا لینے والی اسلامی باتوں کو دیکھکر خوشدل ہوتے ہیں اور بغیر کسی کے بتائے اپنی قومیت کو خود بچہ آشکار کرتا ہے۔ چھٹے سال کی عمر سے قرآن مجید و احکام اسلامی کی تعلیم شروع کر دینے کا حکم ہے تاکہ اسلامی قواعد کی پابندی کی عادت صغرسنی سے پڑ جائے اور بڑھنے پر بچہ بے پروائی نہ کرے۔

محض دینی تعلیم پر اکتفا نہیں فرمائی ہے مسلمانوں کو کسب معیشت کی عادت اور کمائی کی تعلیم بھی اسی وقت سے شروع کر دینے کا حکم ہے۔ مانگنے اور سوال کرنے کو شریعت میں حرام کیا ہے اور اسکو اسلامی خودداری اور عزت و وقار کے بالکل خلاف سمجھا ہے۔

رسولؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ عرض کی میں فرزند کو تعلیم کتابت ختم کر چکا اب کس پیشہ کی تعلیم دوں؟ فرمایا ہر پیشہ اچھا ہے، پانچ پیشے نہ سکھا۔ ایک کفن کی تجارت، کیونکہ کفن فروش ہر وقت میری امت کی موت کی تمنا رکھتا ہے، حالانکہ میری امت کا ایک بچہ میری نظر میں تمام اُن اشیاء سے محبوب ہے جنپر سورج اپنی روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے سُناری نہ سکھا، کیونکہ سُنار میری امت کو کھوٹا بنا کر دیگا اور ضرر پہنچائے گا۔ تیسرے قصابی، جسکی وجہ سے رحم دل سے جاتا رہیگا۔ چوتھے بقالی، کہ جہاں غلہ کو روکیگا اور میری امت کو غلہ کی کمی سے پریشانی ہوگی۔ خدا کی قسم چور میرے نزدیک اُس شخص سے بہتر ہے جو چالیس روز تک غلہ کو روکے رکھے۔ پانچویں بردہ فروشی نہ سکھانا۔ ایک روز جبرئیل نے مجھ سے کہا آپ کی امت میں وہ سب سے زیادہ شریر ہے جو بردہ فروشی کرے۔"

اللہ اللہ اسلام میں کس قدر رحم و مروت و انصاف کی تعلیم ہے۔ جن پیشوں میں سخت دلی یا ناانصافی اور دھوکا دہی ہو انکو اچھا نہیں سمجھا ہے۔ حرام نہیں کہا ہے بلکہ حدیث میں ان پیشوں کی اس صورت میں

ممانعت ہے کہ وہ سخت دلی اور ناانصافی اور دھوکا دہی کا موجب ہوں۔ ان خاص باتوں کے لحاظ سے حرام و ممنوع کیا ہے۔ پس ایسے حلال پیشوں میں جب جہت فساد کی پائی جائے تو حرام ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ وہ پیشے جو بادی النظر اور ہمدردی قومی و مذہبی بے اعتنائی کا سبب ہوں وہ تو ہرگز اسلام میں جائز نہیں جیسے شراب کی تجارت، لہو ولعب بیکاری پیدا کرنے والے پیشے، بت تراشی وغیرہ۔ یہ تو شرع میں سخت مذمت کی چیزیں ہیں۔ باقی ہر پیشہ کی تعلیم کی اجازت وحکم ہے تاکہ اسلامی خودداری اور قومی و مذہبی وقار کے خلاف نہ ہو۔ حرام کاری سے بداخلاقی نہ پھیلے۔

دنیاوی ترقی اور کسب و کاسبی اور حلال جاہ و حشمت کی شرع میں کمال مدح و توصیف ہے۔ رسولؐ کا ارشاد ہے "دنیا کو برا بھلا نہ کہو مومن کے لیے وہ ایک اچھی چیز ہے۔ دنیا سے مومن کو خیر ملتا ہے اور شر سے نجات ہوتی ہے۔ جب بندہ دنیا پر نفرین کرتا ہے تو دنیا بھی اس شخص پر نفرین کرتی ہے جس نے خدا کی نافرمانی میں اسکو حاصل کرنا چاہا ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "بہت اچھا ہے وہ مال کہ جو نیک کمائی کا ہو اور نیک اولاد نیک بندوں کے واسطے بہتر ہے نیک کمائی سے ثواب صدقوں کا اور محتاجوں کی اعانت اور مظلوموں کی قضائے حاجت ہوتی ہے"۔

ایک اور حدیث میں رسولؐ نے فرمایا ہے کہ "دنیا کو اس طرح سے آراستہ کر گویا تو ہمیشہ اس میں رہنے کو آیا ہے اور آخرت کا اس طرح سے خیال رکھ گویا کل سویرے تیرا کوچ ہے"۔ غرضکہ کسب دنیا اور پیشہ وری محض خودداری، قومی منفعت اسلامی عزت و قومی مواسات کی غرض سے نہایت ممدوح و مستحسن ہے اور قومی خودداری اور عزت اسی میں ہے کہ پیشہ وری کرے۔ انبیاء و اولیاء کو دیکھو جنھوں نے نوکری کو غلامی اور مذہب کی توہین اور خودداری کے خلاف سمجھکر کبھی نہیں اختیار کیا۔ ہمیشہ پیشہ وری سے زندگی بسر کی سردار انبیاء جناب ام المومنین خدیجہؓ کے مال کو شہروں شہروں بیچکر منفعت اٹھاتے تھے۔ سیدۂ عالم، فخر کائنات کی بیٹی اجرت پر سوت کاتا کرتی تھیں! غرضکہ پیشہ انبیاء کی سیرت، اولیاء کی عادت تھی۔ نوکری عیب و بےعزتی سمجھی جاتی تھی۔ پیشہ اسلام کا قومی نشان تھا۔

زبان

مسلمان کسی ملک کا باشندہ کسی زبان کا بولنے والا ہو لیکن اسکو کم از کم اتنی عربی زبان کی تعلیم واجب ہو

جس میں نماز پڑھ سکے، قرآن مجید کی تلاوت کر سکے۔ دنیا کے ہر گوشہ کا مسلمان نبیِ عربی کی زبان سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتا ہے اور اُس زبان کو مذہبی نشانی اور اسلامی توقیر سمجھتا ہے اور تمام خیر و برکت کا سرچشمہ عربی کو جانتا ہے جس سے حبِ ایمانی میں قوت اور نبیِ عربی کی عظمت ہوتی ہے۔ اسلامی مذہبی زبان عربی ہے۔

اسلامی لباس

لباس میں بھی قومیت کا لحاظ رکھا گیا ہے کوئی لباس اسلام کے لیے تقویٰ سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے "والبسوا لباس التقویٰ" پرہیزگاری کا لباس پہنو۔ وہ لباس اختیار نہ کرو جس میں تمہاری قومی خصوصیت نمایاں نہ رہے۔ لوگ تمکو غیروں کا لباس پہنے دیکھکر اسلامی خصوصیات میں شتبہ نہ ہوں۔ قومیت کی حفاظت کرو۔ خودداری کو ہاتھ سے نہ دو۔ غیر اسلام کا لباس پہنوگے تو وہ خصوصیت و نمایش نہ رہے گی۔ صورتِ ظاہری اسلام کی دوسری قوموں میں مختلط ہو جائے گی۔ تمہاری اسلامیت جو صورت دیکھتے ہی دوسری اقوام کی سمجھ میں آسکتی تھی وہ بیان و شہادت کی محتاج ہو جائے گی۔ اسلامی وردی اور خدائی فوجی لباس ایک ہی طرح کا ہونا چاہیئے تاکہ اسلام کی شان و شوکت و عزت و حرمت و عظمت اور اُسکے افراد کی کثرت و ہیبت دوسری اقوام کی نظروں میں قائم ہو، اسلامی شان و رعب برقرار رہے۔ فوجی لباس کے خصوصیات دشمن پر عظمت کا قائم رکھنا، اپنی کثرت و نمایش سے طرف مقابل کو مرعوب کرنا ہے۔ ورنہ فوجی لباس کی خصوصیت کیا تھی۔ اسلام نے لباس تقویٰ سے یہ سبق دیا ہے کہ ہر گوشہ میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہوں ایک صورت اور ایک لباس کا ہو۔ تاکہ اسلامی خصوصیت و خودداری برقرار رہے۔ اور جہاں کہیں بھی ہوں تمام مذاہب و اقوام میں ممتاز ہو۔ دوسری قوموں میں غلط ملط ہو کر پوشیدہ و مستہلک نہ ہو جائے۔ یکساں لباس ہونے میں تمام مسلمانوں کی عظمت و رعب قائم کرنے کے علاوہ اُنکی یکجہتی و اخوت و مساوات کا بھی پتہ ملتا ہے۔ اسلام کا ہر شاہ و فقیر مذہب و قومیت میں ایک ہے۔ دوسروں کا لباس پہنکر قومیت کی تحقیر اور مذہب کی بےعزتی نہ کرنا چاہیے۔ لباس پہننے کے وقت کی دعا "اللّٰھم البسنی لباس التقویٰ وجنبنی الردیٰ" (خداوندا ہمکو پرہیزگاری کا لباس پہنا اور پستی سے نکال) ہر قسم کی قومی و مذہبی پستی سے بچنے کا سبق دیتی ہے۔

عام زندگی

مسلمانوں کو ہر ایسے فعل و عمل سے روکا ہے جو خودداری کے خلاف ہو۔ کھانے پینے، لباس پہننے، [illegible] چلنے، اُٹھنے بیٹھنے میں کوئی ایسی بات نہ کرے جو خلافِ شان و نامناسب ہو۔ عزتِ اسلامی کے خلاف ہرگز

نہ ہونے پائے۔ پست قوموں کی سی زندگی بسر نہ کرے اور اسکو خلافِ مروت لکھکر عدالت میں ایک بدنما دھبا کہا گیا ہے۔ پست قوموں کی وہ حلال چیزیں جن میں عقاب نہیں ہے اُنکو اختیار کرنے کی بھی ممانعت ہے۔

اتحادِ عمل

قومیت کی حفاظت، یکجہتی و اتحادِ عمل سے قائم کی گئی ہے۔ ہر ماہ و ہر روز و ہر ساعت کے لیے تمام مسلمانوں کے واسطے اعمالِ ضروریہ کی تعیین کی ہے۔ دین و دنیا کا ہر کام دنیا کے ہر گوشہ میں مسلمان ایک ہی وقت پر بجالائے تاکہ غیر قوم ایک مسلمان کو کسی کام میں مشغول دیکھکر سمجھ لے کہ اسلامی دنیا کی ہر فرد اسوقت اسی کام میں مشغول ہے۔ ہیئتِ اجتماعی و یکجہتی و اتحادِ مذہبی و قومی سے کام لیا گیا ہے۔ ماہِ رمضان کے تیس روزے دنیا کے ہر گوشہ کے تمام مسلمان ایک ہی وقت میں رکھتے ہیں۔ عید کا تہوار ایک ہی وقت ہوتا ہے۔ پنجگانہ نماز کا وقت دنیا بھر میں ایک ہی ہے۔ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر حج بیت اللہ کا سفر عالم بھر کے مسلمانوں کے واسطے ایک ہی وقت میں ہے۔

دنیاوی امور کے بھی ایک ہی وقت میں ہونے کا حکم ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے ہر کام کا زمانہ ایک ہی رکھا گیا ہے اور پابندی وقت کا عمدہ سبق دیا گیا ہے۔ فصد لینا، حجامت بنوانا، ناخون کاٹنا، نیا لباس قطع کرنا، نیا لباس پہننا، عمارت بنانا، تزویج و نکاح کرنا، جانور خریدنا، طلبِ علم، مریض کی عیادت، حکام و سلاطین کی ملاقات، اسی طرح سے ہر پیشہ غرضکہ دنیاوی کاروبار کے واسطے بھی سال میں مہینہ اور مہینوں میں دن اور دنوں میں ساعتیں معین کر دی ہیں اور سعادت و نحوست بتاکر برکاتِ اسلامی کا امیدوار کیا ہے تاکہ دنیا کے ہر گوشہ کا مسلمان پابندیِ وقت سے یکجہتی و اتفاق سے دنیاوی کاروبار میں بھی ایک ہی وقت میں مشغول ہو۔ جیسے مشین کا ہر پرزہ ایک ہی وقت اور ٹھیک ایک ہی وقت میں اپنے اپنے کام کرتا ہے۔ نہیں نہیں یہ تشبیہ غلط ہے۔ ہر پرزہ کے کاروبار بھی علٰحدہ ہوتے ہیں۔ اسلامی دنیا وہ مشین ہے جسکا ہر پرزہ، دنیا کے کسی حصہ میں ہو ایک ہی وقت میں ایک ہی کام کرتا نظر آئیگا۔ یہ پابندی اوقات اسلامی دنیا کے لیے کوئی معمولی اور نظرانداز ہونے والی بات نہیں ہے۔ غور سے دیکھو تو پھر فوائد کے راز منکشف ہوں۔ لقمۃ الصباح صبح کا ناشتہ اور عشا کا کھانا مستحب ہے۔ کھانے کے بعد قیلولہ و استراحت کا حکم ہے۔ اگر تمام دنیا کے مسلمان آج جزئیات کے پابند ہو جائیں تو ہر شخص اپنے ہر عمل کے وقت سمجھ سکتا ہے کہ اسوقت تمام دنیا کے مسلمان اسی کام میں مشغول ہیں۔ دنیا میں کس قوم کو اسکا فخر ہے کہ وہ اپنی ہر فرد شاہ و گدا، عالم و جاہل کی زندگی اور ہر ساعت کے ہر عمل سے مطلع ہو۔ لیکن اسلامی زندگی کا پروگرام بانیِ اسلام نے ہر مسلمان کے واسطے ایسا مضبوط بنا دیا ہے کہ اگر

اسکی پابندی کی جائے تو بغیر ٹیلیفون اور ٹیلیگرام کے ہر فقیر و گدا اور بادشاہ و امیر کی زندگی کا حال ایک دوسرے کو معلوم رہے۔

ملاقات

مسلمانوں کو خانہ نشینی و عزلت کی ممانعت ہے۔ باہمی میل جول، ملاقات، برادرانِ اسلامی کے کاروبار میں شرکت کا حکم ہے۔ کسی فردِ اسلامی کا معطل و بیکار رہنا شارعِ اسلام کو منظور نہیں۔ اور قومیت خودداری و مساوات و اخوت پر احباب سے ملاقات میں بہت زور دیا گیا ہے۔

سلام

سب سے پہلے سلام کا طریقہ معین کیا ہے اور تاکید کی گئی ہے۔ شاہ ہو یا وزیر و فقیر بلا تفریق ایک دوسرے کو دیکھتے ہی اخلاص مندانہ سلامتی کی دعا کرتا ہے، سلام علیکم کہکر اپنے بھائی سے تعارف و شناسائی پیدا کرتا ہے۔ جوابِ سلام کے لیے حکم ہے "فاذا حُییتم بتحیة فردوا باحسن منہا" جو تم پر محبت سے سلام کرے اُس سے بہتر جواب دیکر اپنی خوش اخلاقی و محبت کا اُس سے اظہار کرو۔ علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہکر جواب دو۔ تم سلامت رہو تمکو سلامتی کی دعا دینے والے خدا کی تم پر ہمیشہ نظرِ لطف و مرحمت رہے اور تمہارے کاموں میں برکت ہو۔ صورت دیکھتے ہی اتحاد کا جذبہ یکجہتی کا جوش طرفین سے ہوتا ہے دونوں بھائی آپس میں مصافحہ کرنے کے لیے جب ہاتھ بڑھاتے ہیں تو بموجب حدیثِ صحیح میں تیسرا ہاتھ خدا کی محبت و الفت کا ہوتا ہے۔ ہاتھ ملتے ہی جوشِ الفت میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتا ہے۔ اُس وقت کا اسلامی جوش و محبت اور قابلِ دید اخلاص مندی دوسروں کے دلوں پر بے اثر کیسے نہ رہے گی۔ سلام کے آداب معین کرکے اسلامی خودداری اور قومی اعزاز کو جیسا نباہا ہے کسی مذہب میں اُسکی نظیر نہیں ہے۔ سوار پیادہ کو سلام کرے، راہ گیر اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ سوار اپنے مرکب پر مغرور نہ ہو، پیادہ کو ذلیل و حقیر نہ سمجھے۔ راہ گیر بیٹھے ہوئے کو سلام کرکے اُسکی عزت کرے اور بیکار و کاہل یا عاجز سمجھکر غرور نہ کرے۔ چھوٹوں کو بڑوں کی بزرگداشت کا حکم ہے۔ بتایا گیا ہے کہ بڑوں نے زیادہ عرصہ تک زندگی بسر کی ہے اور چھوٹوں سے خدا کی زیادہ بندگی کی ہے لہذا وہ واجب التعظیم ہیں۔ چھوٹوں کا انکا وقار و عزت لازم ہے۔ پھر بڑوں کو چھوٹوں کی توقیر کا حکم ہے۔ یہ سمجھایا گیا ہے کہ چھوٹوں نے بڑوں سے کم عمر بسر کی ہے، لہذا خدا کی نافرمانی اور گناہ کا اُنکو کم موقع ملا ہے پس وہ بڑوں سے عمل میں

کہ صالح تر ہوں لہذا بڑے بھی چھوٹوں کی تعظیم کریں اور ایک دوسرے پر تکبر و نخوت سے بڑائی نہ جتائے۔ اس طرح سے ایک کو دوسرے کی توقیر کا حکم ہے۔ قوم کی عزت و خودداری کی نگہداشت کی گئی ہے پھر اسلام کی ابتدا کرنے والے کے لیے ستّر اجر اور جواب دینے والے کے لیے ایک ہی اجر، کہا گیا ہے جس سے ہر مسلمان شوقِ اجر میں سلام کی سبقت پر تعجیل کرتا ہے اور دونوں کی خودداری برقرار رہتی ہے کبر و نخوت کی بیخکنی ہوتی ہے۔

تخاطب

ہمکلام ہونے میں ایک دوسرے کی عزت و توقیر کا لحاظ فرض ہے۔ فحش و بدگوئی و غیبت کی سخت ممانعت ہے "وقولوا للناس حسنا" اپنے بھائی کی نیکی کے سوا زبان پر بدی جاری نہ ہو۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے جسکو گوشت میتہ اور مردہ بھائی کا گوشت کھانا بتایا ہے۔

میہمانی و ضیافت و ہدیہ دینے کی سخت تاکید ہے تاکہ اخوت و برادری میں استحکام ہو ایکدوسرے سے ہمدردی کا عادی ہو۔ رسولؐ برحق نے تین شخصوں پر نفریں فرمائی ہے۔ تنہا خور، تنہا گھر میں سونے والا، تنہا سفر کرنے والا۔ اللہ اللہ اسلام میں کسقدر ہمدردی، قومی وقار، اتحاد و خودداری و ہیئتِ اجتماعی مقصود ہے۔ تنہا خوری میں ہمدردی کا خون، بخل، اور تنہائی سے بیزاری ہے۔ گھر میں تنہا سونا اور بے رفیق اور ساتھیوں کے راحت و آرام اٹھانا عیب قرار دیا ہے۔ سفر کی تنہائی میں انفراد و وحدت ہے۔ تجمع اسلامی اور قومی خودداری کے خلاف ہے۔ سفر کرنے والے کی مشایعت اور سفر سے مراجعت پر اپنے بھائی کا استقبال جسقدر اسلام میں اسکی ترغیب ہے اُس سے اسلامی اخوت و ہمدردی و وقار کی اہمیت ٹپکتی ہے۔ جس میں اظہار ہے کہ مسافرت میں بھی ہمارا اسلامی بھائی تنہا نہیں ہے۔ ہم اُس سے بچھڑ نہیں ہیں، سفر کرنے کے وقت رخصت کرنے جاتے اور جب تک سفر میں رہے اُسکے آنے کے منتظر رہتے ہیں، دل سے اُسکو نہیں بھلاتے۔ سفر کی حالت میں بھی تمام اسلامی مسافر تنہا نہیں ہوتے ایکدوسرے کا رفیق و مصاحب ہوتا ہے۔ ساتھ کھانے، ساتھ سفر کرنے، ساتھ سونے کا حکم ہے۔ ایک کو دوسرے سے حسنِ خلق و مروت سے پیش آنے کا حکم ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے "تیرا رفیق و مصاحب جس طرح سے تیری رفاقت کرے تو بھی ویسا ہی برتاؤ رکھ، کمی میں تیرے بھائی کی ذلت ہے"۔

بیماروں سے سلوک

عیادت و تیمارداری کا بیحد ثواب مقرر ہے۔ یہ بتایا ہے کہ اسلامی رشتہ اتحاد ایسا محکم و مضبوط ہے جو کسی وقت ٹوٹ نہیں سکتا۔ روز کے ملنے جُلنے والے بیماری و مرض سے اگر نہ آ جا سکیں تو انکو دل سے نہ بھلا دینے والی فرد سمجھکر خود عیادت کو جاؤ۔ قومی وقار و یکجہتی میں فرق نہ آنے۔ امیر و فقیر ایک دوسرے کی عیادت کریں۔ رئیس فقیر کی عیادت میں اپنی ہتکی نہ سمجھے، غریب رئیس کی ڈیوڑھی پر جانے میں بے عزتی نہ سمجھے۔ مرجانے پر غسل و دفن کفن و نماز جنازہ اور مشایعت اورکا دعا دینا ہر ایک کے لیے فرض کفائی ہے کوئی امتیاز شاہ و گدا میں نہیں ہے۔ ایک طرح کا کفن ہوتا ہے، ایک ہی پانی سے غسل دیا جاتا ہے، ایک ہی زمین میں بے فرش و آرائش پہلو بہ پہلو دفن ہوتے ہیں۔ ایک حالت ایک ہیئت برابری و برابری کی ہے۔ اس مساوات میں بھی خودداری و قومی حفاظت ہر پہلو سے ملحوظ ہے۔ سب کے غسل کا ایک طریقہ کفن و دفن کا ایک آئین ہے۔ جس طرح سے ایک فقیر دوسروں کی شہادتِ ایمانی کا محتاج ہے اور اُسکی قومیت و مذہبیت کا مرتے وقت اعلان و اظہار کیا جاتا ہے اُسی طرح سے رئیس و حکام کے لیے بھی ضرورت ہے" اللھم ان ہذہ عبدک وابن عبدک وابن امتک نزل بک وانت خیر منزول بہ اللھم انا لانعلم منہ الاخیرا وانت اعلم بسریرۃ منا اللھم ان کان محسنا فزد فی احسانہ وان کان مسیئا فتجاوز عنہ " اخوتِ اسلامی سے میت کو بھی خارج نہیں کرتے اُسکی قومیت و مذہبیت کا اعلان کرتے ہیں اپنی ہمدردی و ترحم سے اُسکے لیے بھی دعاے خیر و احسان کرتے ہیں۔ اللہ اکبر اسلامی میت کی کتنی عزت ہوتی ہے۔ اُسکی قبر بناکر اُسکی یادگار قائم کرتے ہیں۔ اسلام کی ایک فراموش ہونے والی زندگی سے میت کو بھی خارج نہیں ہونے دیتے۔ مرنے کے بعد بھی اپنے بھائی کو نہیں بھلاتے۔ قبروں پر جاکر فاتحہ پڑھنا، قبروں کی زیارت کو جانا، اُنکے لیے خیر و خیرات کرنا۔ یہ سب باتیں ایک نہ بھلا دینے والی زندگی کے لیے ہیں۔ گھر پر بیٹھکر بھی مُردوں کو یاد کرنے کے طریقے تعلیم ہوے ہیں جو خیر و خیرات و فاتحہ و استغفار کے ذریعہ یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ ہر شب نمازِ شب میں جالس میتوں کا اسم باسم نام لیکر دعا کرنا بتایا ہے تاکہ زندے مُردوں کے اچھے اخلاق سے سبق لیں اور اپنے پایدار و مضبوط اتحاد و یکجہتی کے اصول مرجانے کے بعد بھی نہ قطع ہونے دیں، جو مسلمانوں کی عزت و خودداری اور قومی حفاظت کا پکا اصول ہے۔ غیروں میں اپنے وقار کا قائم کرنا اور اپنے زندہ اور مردہ کی عزت برقرار رکھنا ہے۔ اُنکے اخلاق و تاریخی

حالات کو یاد رکھنا اور اپنے تئیں اسلاف کی اعلیٰ زندگی کا سچا نمونہ اور اُنکے کمالاتِ نفسانی کی زندہ مثال بنا کر اُس کمی کو پورا کرنا ہے۔

اسلامی عورت

عورتوں کی عزت اور اُنکی عظمت بھی جس قدر اسلام میں ہے اُسکی نظیر دوسری جگہ دشوار ہے۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں سے کہیں زائد عزت دی ہے۔ عورتوں کو ذریعۂ خودداری قرار دیا ہے مردوں کی عزت اسلامی عورتوں سے ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" وسعتِ رزق کی خواہش نکاح کرکے حاصل کرو۔ جو شخص بخوفِ عیال داری ترکِ نکاح کرے اُسنے اپنے خدا پر سوءِ ظن کیا کیونکہ خدا فرماتا ہے " اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ " (اگر تم فقیر و محتاج ہو تو خدا اپنے فضل و کرم سے تمکو مستغنی کر دے گا) بیشک گھر داری اور عورت کی سلیقہ شعاری مرد کو گھر کے کاروبار سے اور مطمئن کرکے کمائی میں اطمینان سے مصروف رکھتی ہے۔ گھر سے مطمئن ہو کر پیشہ و کاسبی کو دلجمعی سے کرنا ایک بڑی نعمت اور خدا کا تفضل ہے۔ مرد کی تونگری اور استغنا ایک ایسی ہی سچی ہمدرد و منتظم سلیقہ شعار عورت کی محتاج ہے۔ مسلمان مرد کے لیے عورت سے زائد مفید کوئی شے نہیں ہے۔ جناب امیرؑ فرماتے ہیں" اسلامی فوائد کے لیے سب سے زائد فائدہ پہونچانے والی زنِ مسلمہ ہے چہرہ پر نظر کرنے میں مسرت ہوتی ہے۔ کسی فرمائش وخواہش کے وقت فوراً عورت مرد کی فرمائش کو پورا کرتی ہے۔ مرد جب اُسکی آنکھ سے اوجھل ہو تو وہ اُسکے مال و اولاد کی ہمہ تن محافظ ہوتی ہے "

عورت اسلامی قومیت کی حفاظت اور اجتماع و قومی کثرت کا آلہ ہے۔ رسولؐ کا ارشاد ہے کہ "تزویج و نکاح کرو۔ اس لیے کہ میں اپنی امت کی کثرت پر قیامت میں سب پر فخر کرونگا۔ یہاں تک کہ ساقط شدہ حملوں پر" اسلام کی ترقی و افزائش اسلامی نسل پر موقوف ہے جسکا پورا ذریعہ عورت ہے۔ اسلامی خودداری اور اُسکی عزت عورت ہی سے ہے۔ جناب امیرؑ فرماتے ہیں" حیا کے دس درجے ہیں نو درجے خدا نے عورت کو عطا کیے ہیں صرف ایک درجہ مرد کو ملا ہے" عورت کی حیا و خودداری اسلام کی عزت ہے۔ عورت کا وقار و عزت پردہ میں رہنا اُسکی عظمت و شان و بردباری اور اسلامی مملکت کی ایک خود مختار ملکہ ہونے کی دلیل ہے۔ مرد عورت کا کارندہ ہے جو باہر نکل ٹھیکر تمام امورِ زندگانی کو درست کرتا ہے اور گھر کی اُس ملکہ و حاکمہ کی خدمت میں تمام امور کو پیش کرتا ہے، جو کما کر لایا ہے وہ

حاضر و موجود کر دیتا ہے۔ عورت اپنی رائے و اختیار پر اُسکا صحیح مصرف اور گھر کا انتظام اپنے مشیر و کارگذار رفیق شوہر کے مشورہ سے کرتی ہے۔ کس قدر اس میں اسلامی خودداری ہے!

مسلمان عورت گھر میں کھانے پکانے اور خدمتگاری کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ گھر کی ملکہ عور کی عزت۔ اسلام کا وقار ہے۔ عورت جب گھر میں کاروبار اور اپنی مملکت کا انتظام کرے تو مرد کو اُسکے ساتھ ہاتھ بٹانا چاہیے۔ جناب امیرؓ ایک روز گھر میں مسور کی دال چُن رہے ہیں۔ سردار انبیاؐ تشریف لا کر علیؓ کو مشغول دیکھکر فرماتے ہیں" جو مرد اپنی عورت کے گھر کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے اُسکے ہر موئے بدن کے بقدر ایک سال کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ یا علیؓ ایک ساعت خدمت عیال کی گناہوں کا کفارہ ہے اور خدمت عیال کی سیرت ہے صدیقوں اور شہیدوں کی اور ان لوگوں کی جو دنیا و آخرت کی بہتری چاہتے ہیں"۔

عورت کی عزت اسلام میں یہ ہے کہ نیکبخت عورت کو بدکار سے بیاہنے میں قطع رحم فرمایا ہے اور رسولؐ کا ارشاد ہے کہ عورت کا نکاح کفو کے ساتھ کرو۔ اور نطفہ کو برابر دار عورت کے سپرد کرو"۔ یہ ایسی عورت کی عزت کی نگہداشت ہے جس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ برابر داروں سے نکاح اُسکی اخلاقی عزت نسبی حرمت اور اُسکی آزادی کا احترام ہے۔

رسولؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھا اُسکو لوگوں نے خبر دی کہ تیرے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ سنکر اُسکے چہرہ کا رنگ غم و غصہ سے سرخ ہو گیا۔ حضرتؐ نے فرمایا کیا لڑکی سے زمین بھاری ہو گئی؟ اور کیا آسمان اُسپر سایہ نہ کریگا؟ کیا اُسکو خدا رزق نہ دے گا؟ آگاہ ہو لڑکی ایک پھول ہے جس کی خوشبو سے دماغ معطر کرتے ہیں"۔ جس زمانہ میں کہ جنگلی عرب لڑکی کو حیوانِ خونخوار سمجھتے تھے اور زندہ دفن کر دیتے تھے اُس حال میں نبیؐ اسلام نے عورت کی ہستی قائم کرکے اسلام کا وقار قائم کیا ہے اور اسلامیت کا ایک جزو بزرگ اُسکو ٹھیرایا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ "اولاد میں لڑکی عجب نیکی ہے جسکے ایک لڑکی ہو، وہ ایک ہے، وہ ہے جہنم میں انسان کے ایمن۔ جسکے دو لڑکیاں ہوں وہ اپنے باپ کو بہشت میں لے جائیں گی۔ بیشک نیکبخت لڑکی مرد کے لیے نجاتِ دارین ہے۔ باپ کی انیس، ماں کی رفیق، شوہر کے گھر کی رکھوالی ہوتی ہے۔

عبادات

اسلامی عبادات بھی اخوت و ساوات اور حفاظت قومی و خودداری کے لیے معین کیے گئے ہیں :۔

اذان

ایک موذن کا اذان دینا اور ہر امیر و فقیر کا اُس آواز کو سنتے ہی کاروبار دنیاوی چھوڑ کر گھر سے چل کھڑا ہونا مسجد میں جمع ہو جانا انسان کو عادی کرتا ہے کہ حق کی پیروی میں ہر ایک کا ساتھ دینے پر مستعد رہو۔ خدا کی طاعت کو تمام دنیاوی کاموں پر مقدم سمجھو۔ ایک صدا پر سب کا متحدہ لبیک کہنا اور داعی الی اللہ کی طاعت و پیروی کرنا اس بات کا اظہار ہے کہ بُلانے والا کسی طبقہ کا ہو امیر و غریب سب برابر ہیں خدا کی طاعت میں ہم ایک شخص کے مطیع ہیں اور ایک صدا پر فوراً دوڑ پڑنے کے عادی ہیں۔

نمازِ جماعت

پھر فی الفور ایک مقتدا کی پشت پر صف بستہ ہو کر ایک دوسرے کے دوش بدوش کس انکسار و تذلل سے ایک عبد مطیع کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں ہوتا سب ایک حالت اور ایک عالم میں اپنے مقتدا کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اُسکو اپنا دینی سردار سمجھتے ہیں۔ رکوع و سجود، قیام و قعود میں مقتدا کی طاعت کرتے ہیں اور بغیر کسی طمع جاہ و حشمت کے اور بدون کبر و نخوت پیشنماز کی سرداری کو دل سے قبول کر لیتے ہیں۔ جس میں اظہار اس امر کا ہے کہ مسلمان کی ہر فرد حاکم ہے۔ اور سب کو حکومت و اقتدار میں مساوات ہے۔ اسلامی وقار و خودداری کا اعلیٰ نمونہ اور اسلامی اخوت و مساوات کا سچا نشان نمازِ جماعت ہے۔

روزہ

انسان بھوک پیاس کا عادی ہو، روزہ رکھکر جفاکشی و محنت و صبر استقلال سیکھے۔ مجاہدۂ نفس کر کے مجاہدین اسلام کو جہاد کی حالت میں بھوک پیاس اور تکلیف اُٹھانے کی عادت ڈالے۔ اگر لشکرِ اسلام اتفاقاً کہیں محصور ہو جائے اور رسد ممکن نہ ہو تو بھوک پیاس سے گھبرا نہ جائے۔ خودداری کرے۔ یا اختلافِ لیل و نہار سے کسی متمول کا مال و زر تلف ہو جائے اور فقر و محتاجی سے فاقہ کی نوبت آئے تو روزوں کی عادت اُسکو صبر و استقلال کا عادی رکھے۔ خودداری کے

خلاف نہ ہونے پائے اور وہ سوال وگداگری کرکے اسلامی عزت کو ہاتھ سے نہ دے۔ پھر روزہ دار کو بھوک پیاس سے اپنے ایک محتاج بھائی کی بھوک پیاس کی قدر ہو اور مواسات ورحم کی عادت پڑے۔

حج وزیارت

سال میں ایک دفعہ تمام دنیا کے مسلمان گھر بار چھوڑ کر باہم میل جول، ملاقات واتحاد وارتباط قائم کرنے کی غرض سے سفر کرکے ایک مقام پر جمع ہوں۔ ایک دوسرے کے اخلاق وآداب طرز زندگی سے واقف ہوں تمام عالم کے مسلمانوں میں میل جول ہو۔ سفر کی عادت پڑے۔ تبدیل آب وہوا سے جسمانی صحت ہو۔ دوسروں کے اچھے اخلاق سیکھکر روح کو قوت ہو۔ ایک شہر کے مصنوعات دوسرے شہر میں پہونچیں۔ اس طرح سے مالی منفعت بھی ہو۔

پھر ان عبادات میں خودداری اور قومیت کی حفاظت وباہمی اتحاد ویکجہتی کے بھی محکم اصول ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زیارت تمام اُن افعال واعمال کا مجموعہ ہیں جو ہادیان برحق وانبیا وخاصان خدا سے وقتاً فوقتاً ظہور میں آئے تھے۔ حضرت آدمؑ کا بہشت میں وہ پھل کھانا جس سے دنیا آباد ہوئی جنت سے آپ دنیا پر تشریف لائے۔ تیس روز اُس پھل کا اثر جسم حضرت آدم میں رہا۔ یہ یادگار تیس روزوں سے قائم کی گئی۔ آدم وحوا کی مسافرت کی یادگار اور دنیا کی آبادی کی تاریخ رمضان مبارک کے تیس روزوں سے سال بسال یاد رہتی ہے۔ بہشت سے نکلنے کی یاد میں حضرت آدمؑ کو نماز پڑھائی گئی جن اوقات میں اُنھوں نے نماز پڑھی ہر روز مسلمان اُسی وقت نماز پڑھکر اس تاریخی واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔

حج بیت اللہ یادگار حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسمٰعیلؑ ہے۔ مجلس اجتماعی وہیئت اجتماعی کا اصول خلیل اللہ نے قائم کیا۔ اُنکے اس کارآمد ومفید طرز عمل کی یاد ہر مسلمان کے عمل سے قائم ہے۔

قربانی اُس صبر واستقلال وہمت مردانہ کی یادگار میں قائم ہے جس میں حضرت ابراہیم ثابت قدم نکلے۔ خدا کی محبت میں اپنے عزیز فرزند کے ذبح پر بلا پس وپیش آمادہ ہوگئے، مسلمان کو ذبح وقربانی کے وقت یہ واقعہ یاد آجاتا ہے فوراً نظر میں دنیا ہیچ ہوجاتی ہے۔ پیروی حضرت ابراہیمؑ میں دل مسلمان کا محبت الٰہی سے لبریز ہوجاتا ہے۔ خدا کی طاعت ومحبت میں جان ومال بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ اور جو لوگ ناداری وافلاس سے قربانی پر قدرت نہیں رکھتے اُن کے دوسرے بھائی کم ازکم سال میں ایک مرتبہ گوشت کا ہدیہ بھیجکر تعارف ومحبت

کا اظہار کرتے ہیں اور اُس گوشت کے ہدیہ سے اُسکو بھی یہ تاریخی واقعہ یاد دلاکر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ پس جملہ عبادات سے متعلق باخلاقِ انبیاء ہوتا ہے۔ اور عبادت کی صورتِ ظاہری سے قوتِ باطنی کی تقویت ہے اور اظہارِ قومیت ہے۔ مسلمان وہی قوم ہے جو آبادیِ عالم سے اس وقت تک ایسی ہی قوم رہی ہے اب بھی ہر مسلمان کے افعال و اعمالِ انبیاء و اولیاء کے افعال و اخلاق کا نمونہ ہیں اور ایک قوم ہونے کا پتہ دیتے ہیں "ہذہ امتکم امۃ واحدۃ" لے نبیؐ آپ کی یہ امت وہی ایک امت ہے جو آدمؑ کے عہد سے ہے۔

مسلمان کے اعضا

اسلامی معلموں نے مسلمانوں کے دست و پا، اعضاء و جوارح سب کے فرائض و حقوق بتاکر اسلامی مشین کے ہر پرزہ کا کام بتا دیا ہے تاکہ ہر عضو معینہ خدمت میں لگا رہے اور اُسکا خلاف کرکے اسلامی خودداری کے خلاف نہ ہونے پاوے۔ تمام اعضا بے تعطل ہیئتِ اجتماعی میں کام سے لگے رہیں۔

نفس

امام زین العابدینؓ فرماتے ہیں "تیرے نفس کا تجھپر یہ حق ہے کہ نفس کسی ایسے کام کی خواہش نہ کرنے پائے جو خلافِ مرضیِ الٰہی کے ہو۔ نفس ہمیشہ خدا کی طاعت کا طالب رہے۔"

قلب

جنابِ امیرؓ اپنے فرزند محمد بن حنفیہؓ سے فرماتے ہیں "دل تمام اعضاء پر حاکم ہے۔ ہر شے کا تعقل و تفہم دل سے ہوتا ہے۔ دل ہی کے حکم و رسلے سے ہر کام انجام پاتا ہے۔ لہذا تیرے قلب کو خدا پر بھروسا چاہیے۔ اطمینان و استقلال ہونا چاہیے۔ جو دل میں ہو وہی زبان سے نکلے زبان دل کی ترجمان ہو۔

زبان

امام زین العابدینؓ فرماتے ہیں "زبان کا تجھپر یہ حق ہے کہ اُسکی بزرگداشت کر۔ اور زبان کی عزت یہ ہے کہ اُس سے فحش جاری نہ ہو۔ عادت زبان کو بھلائی کی ہو۔ بے فائدہ اور فضول کوئی بات زبان سے نہ نکلے۔ لوگوں کے حق میں بھلائی اور احسان کے سوا کوئی کلمۂ بد جاری نہ ہو۔ اور

جناب امیرؑ فرماتے ہیں "زبان کا یہ فریضہ ہے کہ جو دل میں ہو وہی زبان سے نکلے۔

کان

کان کا تجھ پر یہ حق ہے کہ کسی کی بدی نہ سُنے جن آوازوں کا سُننا حرام ہے وہ تیرے کانوں تک نہ پہونچیں۔ اچھی باتوں کو کان لگا کر سُن اور پیروی کر۔

آنکھ

آنکھ کا تجھ پر یہ حق ہے کہ حرام بات سے آنکھ کی حفاظت کر۔ تیری ہر نظر عبرت کی ہو۔ جس چیز پہ نظر پڑے اُس میں غور و فکر کر سرسری نظر نہ ہو۔

ہاتھ

ہاتھوں کا تجھ پر یہ حق ہے کہ جو چیز تیرے واسطے حلال نہیں اُس طرف تیرے ہاتھ نہ بڑھیں۔

پَیر

پَیروں کا یہ حق ہے کہ جو کام حلال نہیں اُس طرف تیرے پَیر نہ بڑھیں اور خدا کی طاعت میں جلد قدم بڑھے۔ زمین پر قدم مار کر نخوت سے نہ چل، تیرے قدم مار کر چلنے سے نہ زمین پھٹ جائے گی، نہ تیرے اکڑ کر چلنے سے پہاڑ کی چوٹی سے تو جا لگے گا۔ ہر ایک ایسی بات بدی اور خدا کی نفرت کی بات ہے۔

شکم

تیرے پیٹ کا یہ حق ہے کہ اُسے حرام کا ظرف نہ بنا اور جتنے میں سیر ہو اُس سے زائد پیٹ میں نہ بھرلے۔ اس ہدایت میں اقتصاد و کفایت شعاری کی ہدایت ہے۔ پیٹ سے زائد نہ کھانے میں کفایت شعاری کو بتایا ہے۔ اسراف کی مذمت ہے۔ خدا فرماتا ہے" لا یحب المسرفین" فضول خرچ کو خدا دوست نہیں رکھتا۔ پھر ارشاد ہے" ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین" اسراف کرنے والے بھائی ہیں شیطانوں کے۔ بیشک استحقاق سے زائد کھانا پینا صرف کرنا شیطنت ہے۔ حدیث میں ہے کہ نہر سے پانی لیکر پینا اور بقیہ زمین پر پھینکدینا اسراف ہے" پانی کی فراوانی جب اُس سے بے اعتنائی کا سبب ہوگی تو مال و دولت کی فراوانی بھی اُس کے ضایع کرنے کی ضربت و عادت کا موجب ہوگی۔

شرمگاہ

شرمگاہ کا یہ حق ہے کہ حرام سے بچے یعنی ہر دم سے حفاظت کرے ۔ غرضکہ اعضا کے کام اور اُنکے فرائض بتا کر انسان کو بتایا ہے کہ اُسکا ہر عضو آلہی مشین ہے جسکی خدمات معیّن ہیں ۔ انکے سوا مصرف اُنکا غلط ہے ۔ جب ہر عضو کا فریضہ معلوم ہے تو ہر کام کے وقت اعضا کو عادت پڑ جانے سے ڈھب ہو جائیگا اور ملکہ سے ہر وقت ہر عضو سے وہی صادر ہوگا جس کی اُسکو عادت ہے ۔ جیسے زینہ پر چڑھنے کے عادی پیر اُسی بلندی سے خود بخود اُٹھتے ہیں جسکے وہ عادی ہیں ۔ چھوٹے دروازہ سے ہمیشہ آمد و رفت کرنے والا اُتنا ہی خود بخود جھک جاتا ہے جتنا دروازہ چھوٹا ہوتا ہے اور کبھی ٹکر اور ٹھوکر نہیں کھاتا ۔ اسی طرح سے اچھے کاموں کی اعضا کو عادت ہمیشہ بھلائی کرائیگی اور بھولے سے بھی بدی اور خلافِ فریضہ نہوگا ۔ یہی عصمت کی فلاسفی ہے ۔ عصمت کوئی عجوبہ شے نہیں ہے ۔ معصوم کے تمام اعضا بھلائی اور عصمت کے عادی ہوتے ہیں ۔ بھول چوک بھی نہیں ہوتی ۔ پس تمام مجموعۂ انسانی ایک بھلائی کا مجموعہ اور احکامِ الٰہی کا دفتر ہو جائے گا ۔ اور یہی اعضا کی خودداری ہے کہ وہ اپنے فرائض کو درست طور پر بجا لائیں ورنہ قابلِ ملامت و ناقص کہلائیں گے ۔

اسلام کی فوقیت اور اُسکی ترقی کا راز یہی ہے کہ قومیت کی نگہداشت ، خودداری و امتیاز اور باہمی اتحاد و مساوات ہو ۔ ایک پختہ مسلمان کا کوئی فعل جو امتیاز و فوقیت و مساوات و اتحاد سے خالی ہو نہ ملے گا ۔ یہی حیاتِ اسلامی ہے اور انھیں اصول پر مضبوطی سے قیامِ اسلام کی پایندہ زندگی کا سبب ہوگا ۔

مسلمانو ! یقین جانو جب تک اسلام کے ٹھیک اصول پر چلنا نہ اختیار کروگے ہرگز اسلامی زندگی نہیں بسر کر سکتے ۔ اور بے اعتنائی و تساہل سے اسلام کا جنازہ خود تمھارے دوش پر ہوگا ۔ پابندِ اسلام بنو اور اسلام کا اپنے ہاتھوں خون نہ کرو ۔ واللہ الہادی

سیّد احمد (علامۂ ہندی)

مضمون بالا میں جملہ جزئیات مذہب شیعی کی بنا پر لکھے گئے ہیں ۔ گرچونکہ تخاطب دراصل اُن اصحاب سے ہے جو جمعیتِ اسلام سے باہر ہیں یا جو مغربی تمدن کے مادی اثرات کے بدولت نامسلمان ہوتے جاتے ہیں اس وجہ سے جزئی مسائل کا اختلاف ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ایڈیٹر

حیاتِ نسلی

حیوانات

(۱)

چونکہ ہم نوعِ انسان پر عالمِ کائنات سے ایک جداگانہ ہستی کی حیثیت سے نظر ڈالنے کے عادی ہو رہے ہیں اور انسان کو کرۂ ارض کا ایک ملزوم نہیں سمجھتے اس لیے اس حیوانِ ناطق کے امتیازات کا تطابق حیوان مطلق سے کرنا ایک شرف و محترم ہستی کی سراسر تحقیر سمجھی جاتی ہے۔ "علم الانسان" انھیں انکار باطل کا نتیجہ ہے مگر "علم الحیات" کے کامل مطالعہ نے اس طفلانہ گھمنڈ کی نسبت ہمارے تصورات کو بالکل بدل دیا۔ اور ہم اس امر کی تحقیق پر آمادہ ہوئے کہ روے زمین پر بنی نوعِ انسان کا حقیقی درجہ کیا ہے؟

باوجودیکہ یہ حیوان باقی جنسِ حیوانات میں سب سے زیادہ فہیم و فطین مانا گیا ہے مگر اسکے عضلات کی ترکیب و ترتیب اور اعضاء و جوارح کے اعمال و افعال میں حیوانی خصوصیات بہ کمل وجوہ جلوہ گر ہیں اور انسان کہلانے کے باوجود نوعِ حیوانات میں اُس کا بے تکلف شمار کیا جا سکتا ہے۔ جانوروں کی طرح وہ بھی دو پنجے رکھتا ہے، دو پستان اُسکے بھی ہوتے ہیں، علیٰ ہذا اعصاب و مفاصل میں اُسکو حیوانات سے مماثلتِ تام حاصل ہے۔ انسان اپنی نوع کے دانشمندوں (یعنی عقلاء) کو پیش کرنے کے باوجود اپنے عصبات یعنی ذواتُ الثدیا[عسه] کے طبقہ سے بالاتر نہیں تصور کیا جا سکتا بلکہ اپنے نوع کی ناقص ہستیوں (یعنی حمقاء) کی بدولت حیوان مطلق کی بعض اسفل جنسوں سے بھی کمتر درجہ میں آجاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ "حمقاء" مستثنیات عامہ میں شمار کرنے کے لایق ہیں، تو یہی کلیہ "عقلاء" پر بھی منطبق ہو سکے گا۔ مختصر یہ ہے کہ نوعِ بشری کی ادنیٰ اور ابتدائی صنف جس کی معاشرت اور نفسیات حیوانات کی مختصات کا علم تحقیقاتِ جدیدہ کی بدولت ہو چکا ہے ہمکو مجبور کرنے کے لیے کافی ہے۔ انھیں معلومات سے "علم انساب البشر" کے مطالعہ کی تحریک ہوئی اور یہی علم ہمارے تمدنی تصورات میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

عسه جس طرح انسان نوعِ حیوانِ ناطق کا مکمل نمونہ خیال کیا جاتا ہے اسی طرح پستاندار جانور (ذوات الثدایا Mammals) جملہ حیوانات میں اشرف و اکمل سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۲

جبکہ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بھی ذات الثدی کی ایک صنف ہے اور اپنی نوع کے حیوانات پر صرف دماغی اکتسابات کی وجہ سے تفوق رکھتا ہے تو اصولاً یہ لازم آتا ہے کہ معاشرت انسانی کے متعلقات پر غور کرنے سے پہلے معاشرت حیوانی کے مختلف پہلوؤں کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا جائے اور چونکہ مدنیت کی سرحد علم الحیات پر ختم ہوتی ہے اس لیے خود علم الموجودات میں ہمکو عظیم حقائق اور تمدنی اکتشافات کا سراغ لگانا چاہیے۔ دنیا میں سوسائٹی اور قبیلہ کی ضرورت اس وجہ سے تسلیم کی گئی ہے کہ اُس سے افراد کی قوتِ اجتماعیہ کو پایندگی اور دوام حاصل ہوتا ہے اور اس خصوصیت کا پیدا ہونا اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ شرائط اساسی کا پوری طرح ایفا ہوتا ہو۔ اس لیے کہ بقاے نوع کا مسئلہ خود ان شرائط کی تکمیل پر منحصر ہے اور تمدنی تاسیسات کا ضبط و انتظام انھیں کی بدولت ظہور میں آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان بالطبع مدنی ہے تو یہ تفوق کچھ اُسی کے لیے مخصوص نہیں۔ دنیا میں اور بہت سی انواع میں جمعیت و مدنیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً زنبورِ عسل، مورچہ اور دیمک حقیقی جمہوریت کی زندہ نظیریں ہیں اور ہم انکے طرز ماند و بود سے اکثر مفید اور پند آموز نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ قانونِ ازدواج کا مقصد اسکے سواے اور کچھ نہیں ہے کہ تاہل کے وسیلہ سے جو دو ہمجنسوں کا اجتماع ہوتا ہے اُس میں تنظیم اور باقاعدگی پیدا ہو جائے اور غایتِ ازدواج ایک ایسے وظیفہ کی بجاآوری ہے جو لازمۂ حیات کہا جا سکتا ہے اور جسکی کیفیات زیادہ تر وجدانی ہوتی ہیں یا بقول "ہائین" وہ ایسا "دام" ہے جس میں آنے کے بعد انسان اور حیوان دونوں کو اپنی بقاے نوع یا "موروثی دین" کی ادائی کا نہایت شدت کے ساتھ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

قبل اسکے کہ ہم ازدواجی تعلقات اور جمعیتِ بشریہ کے متعلقات پر بحث کریں بے محل نہ ہوگا اگر تناسل اور اُسکے متعلقہ وظائف کے تذکرہ سے ہم اپنے مضمون کی ابتدا کریں اس لیے کہ حسِ حیوانی جسکی علت وظیفۂ طبعی کی بجاآوری ہے سرکش انسان کو کس قدر لاچار کر دینے والی شے ہے؟ اس کا ادنیٰ کرشمہ یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ وحشی سے وحشی اور خونخوار سے خونخوار جانور بھی اسکے آگے رام و منقاد ہو جاتے ہیں۔

تناسل ۱ تولد و تناسل غذائیت کا نتیجہ ہے۔ حیوانات کے ادنیٰ طبقوں میں بھی عمل تولید غذا کے ازدیاد فاضل سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی غذا اسکے اجزاے لطیف اعضاے متعلقہ کو سبب

ضرورت سے ملنے کے بعد مادہ کا نخل سے دوسرے اجزاء حیات کی ترکیب شروع ہوجاتی ہے۔ درخت اپنے نوع کی بقا کے لیے بذریعہ جڑ و زمین سے غذا کھینچتے ہیں اور پتوں کی راہ سے ہوا پاتے ہیں۔ پھولوں کا بھی یہی حال ہے کہ غبار طلع جو پھولوں میں منی کے بجائے ہوتا ہے، عضو تانیث میں داخل ہوکر تخم کے حصول اور اُسکے نشو و نما کو کامل کرتا ہے۔ اسی عنوان سے چھوٹے چھوٹے جانوروں میں اعضائے تذکیر بھی تانیث سے باہم تماس کرتے ہیں جسکے بعد مادہ بیچ میں سے شق ہوکر اپنی ہی شکل کی ایک نئی مخلوق پیدا کرکے ختم ہوجاتی ہے۔

بدن میں بعض اعضاء نہایت چھوٹے چھوٹے گول یا پہلو دار اجزاء سے مرکب ہوتے ہیں۔ ان خوردبینی اجزاء کو "حجرہ" یا "خلیہ" Cell کہتے ہیں۔ مادہ نر کے خلیات سے متصل ہوکر مادہ کو جذب کرتی ہے۔ اسی طرح مرد کے حوینات منویہ Spermatic Cell عورت کے بیض Ovulary Cell میں داخل ہوتے ہیں۔ مادہ کا خلیہ یا عورت کا بیض اپنی ہیئت اصلی کو قائم رکھکر نر کے خلیہ کو جذب کر لیتا ہے یا مرد کے حوینات منویہ سے ملقح ہوجاتا ہے اور جو جوہر نر یا مرد سے اس طرح حاصل کیا جاتا ہے وہ مادہ یا عورت کے اعضائے تانیث میں منجذب ہوکر ایک نئی زندگی کا دور شروع کردیتا ہے۔ صرف عمل تولید دنیا میں اکثر ذی روح مخلوق کے وجود کی علت غائی ہے۔ بہت سے جانور نباتات اور حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) اس اہم فرض کی بجا آوری کے بعد زندہ نہیں رہتے اور اُنکی زندگی کا زمانہ بذات خود نہایت مختصر ہوتا ہے۔ بسا اوقات نر مادہ سے جدا ہونے کے قبل ہی مرجاتا ہے اُسکے بعد مادہ بھی صرف انڈے دینے کے لیے زندہ رہتی ہے۔ کرم دانہ Cochineal میں حد سے زیادہ انڈوں کے بھر جانے سے مادہ بھی مرجاتی ہے۔ اُسکے جسم کا غلاف Tegument قدرتی طور پر انڈوں کی حفاظت کے کام آتا ہے۔

ادنیٰ طبقہ کے حیوانات میں عمل تولید بلا ارادہ و خیال کے ہوتا ہے۔ چنانچہ Paramaecium بالدار حشرات آبی کی نظیر اس موقع پر پیش کی جاتی ہے وہ گراں باری اولاد میں عدیم النظیر ہیں۔ بیالیس دن میں ایک مادہ (۱۳۰۴۲۱۱۲) بچے دیتی ہے اور اُسکو مطلق اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ اس قدر کثیر تعداد کیونکر پیدا ہوگئی۔ ملک نوریا میں عام ٹروٹ اور قوس قزح کے رنگ کی ٹروٹ مچھلی کے انڈوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے تجربات کیے گئے تو پرانی اور بھاری مچھلیوں میں بالاوسط تین ہزار فی مچھلی انڈے نکلے اور چھوٹی عمر کی مچھلیوں میں بمقابلہ اپنے وزن کے انڈوں کی مقدار نسبتاً زیادہ پائی گئی۔ لیکن اعلیٰ طبقہ کے حیوانات میں توالد و تناسل کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے [illegible] والی [illegible]

کے اجتماع اور ترتیب کے ظہور پذیر ہونے کے لیے مختلف مدارج طے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جن میں ارادہ اور
قوت یا روحانی وجسمانی موثرات کو پورا دخل ہے ۔ انسانی زندگی میں عشق ومحبت کے اثرات عجیب غریب
طریقوں سے ظاہر ہوئے ہیں۔ لیکن ان تمام موثرات میں سب سے زیادہ قوی اثر بعض اور روحانیات متوجہ
کی مواصلت یا دو روحوں کے ایک دوسرے کے رگ وپے میں سرایت کر جانے کا ہے ۔ انسان کے دل
میں جس قدر جذبات ودیعت ہیں شرکت تاثیر میں کوئی جذبہ وہ زور واثر نہیں رکھتا جو عشق ومحبت کو حاصل
ہے جن سے جذبات وحسیات وجدانی میں توجہ اور عقل وشعور میں شگفتگی کے دوگونہ اثرات رونما ہوتے
ہیں۔ محبت کرنے اور چاہے جانے کے بعد فنون لطیفہ وظریفہ کے اکتسابات خصوصاً شاعری وموسیقی کے
ملکات جس حسن ولطافت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں انکی کیفیت دیدنی ہوتی ہے ۔ الفت ومحبت، نیت
اور حب وطن کا ایک زبردست وسیلہ ہے وہ اتحاد اقوام اور جمعیت وانتظام کے ساتھ زندگی بسر کرنے
کا نہایت قوی ذریعہ ثابت ہوتی ہے ۔ مگر یہ جذبہ ایک دوسری کیفیت بھی رکھتا ہے ۔ اکثر یہ ایک
شعلۂ جانسوز ثابت ہوا ہے انکی بدولت بہت سی زندگیاں تباہ وبرباد ہو چکی ہیں۔ اسکی کرشمہ سازی نے
معصیت فسق وفجور اور جرائم کا اکثر ہستیوں کو شکار بھی بنا دیا ہے۔

مستی اور محبت

موروثی خصائص اور طبعی رجحانات عادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے
افعال متواتر واقع ہوتے رہنے سے خلیات عصبی میں انکے اثرات جاگیر ہو جاتے
ہیں چنانچہ خواہش تولید اور شوق وصل اسی اثر کا نتیجہ ہے ۔ حیوانات اپنے نوع میں مختلف حالتوں میں
بحالت خود فراموشی ان افعال کے عادی رہتے ہیں جن سے ان کے نوع کی وفرت اور حفاظت مقصود
ہے ۔ عصبی نقاط پر ان حرکات وافعال کے اثر کرنے کے بعد موثرات وخواہشات طبعی میں بیداری
کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور جس نسبتاً زیادہ قوی ہوگی اس پر تاثیر بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ وظائف
حیات میں تزاید نسل اور وفرت نوع سے قوی تر کوئی عمل نہیں ہے اس لیے کہ حفاظت ذات اور
بقائے نوع اسی پر منحصر ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے جانور جب مست ہوتے ہیں تو انکی یہ حالت دیوانگی
کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے ۔ جب یہ خواہش حد سے متجاوز ہو جاتی ہے تو جنگلوں کے وحشی اور
خونخوار جانور بھی تنہائی اور تجرد کی زندگی بسر نہیں کر سکتے ۔ نر اور مادہ ایک دوسرے کی تلاش میں اپنے
تنہا خلوت سے باہر آتے ہیں۔ بعض وقت دونوں اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر نکلتے ہیں۔ اور مستی کا زمانہ

گذر جانے کے بعد پھر نیستاؤں میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔ ایام مستی میں ہر مرتبہ جوشِ شباب اُن میں از سرِ نو عود کر آتا ہے اس زمانہ میں اُنکے بال، کلغی اور پروں پر جو خوشنمائی اور رونق پیدا ہو جاتی ہے وہ اُس موسم کے گذر جانے کے بعد باقی نہیں رہتی۔ مادہ کو اپنی طرف مائل کرنے یا حریف سے مقابلہ کے واسطے نر کے لیے بعض چیزیں مادرِ فطرت خود مہیا کرتی ہے۔ بعض انواع اس درجہ جوش اور بدمستی کے ساتھ ملتے ہیں کہ مادہ نر کی بدفعلیوں کی تاب نہ لاکر اکثر جان سے گذر جاتی ہے۔ عـــہ مینڈک اور غوکِ زہردار کی ٹانگ ایک مرتبہ حالتِ جفتی میں قلم کردی گئی لیکن وہ اپنے فعل میں بدستور منہمک رہا۔

صنفِ ذات الثدی کو بھی اگرچہ دوسرے جانوروں کی طرح مستی آتی ہے لیکن ان میں جبر و تشدد کی وہ حالت نہیں پائی جاتی اس لیے یہ کیفیت ہم انسانوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے عجیب ہوتی ہے۔ ان میں محبت باہمی ازدیادِ نسل کا وسیلہ ہوتی ہے اور نسل کی زیادتی کا تعلق نر اور مادہ کے اعضائے تولید سے ہے جو متعلق ہو کر مادہ میں انڈے دینے کی قابلیت کا باعث ہوتی ہیں۔ ذوات الثدیا کے خصائص سے مشابہ ہونے کی وجہ سے انسان بھی اسی قانون کا تابع ہے۔ چنانچہ عورتوں کو طمث کا آنا ذوات الثدی کی مادہ کی مستی سے قطعی طور پر ملتا جلتا ہے۔ علیٰ ہذا عورت کا انڈے دینا اور اعضائے تناسلیہ نساء میں انڈے کا نشوونما پانا اور بیضۂ بشر کا حویصل Vesticule سے نکل کر نفیر کی راہ سے رحم میں داخل ہونا اُن افعال کا بالکل عکس ہے جو ذوات الثدی کی مادہ پر گذرتے ہیں۔ ہم علل و اسباب کے کوچہ کی راہ اختیار کریں تو واضح ہوگا کہ اُنس و محبتِ انسانی حیوانات کی مستی کی ایک سنجیدہ صورت ہے جس سے انسانوں میں وظائف تناسل کے ایفا کی ترغیب و تشویق اور حیوانات کی حسِ شہوانی میں ہیجان و اضطرار پیدا ہو جاتا ہے۔ باہمی فرق اگر کچھ ہے تو انسانیت و بہیمیت کا ہے۔ البتہ جن روحانی و وجدانی لذات و محسوسات سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے اُن سے حیوانات قاطبۃً محروم ہیں۔ اس ضمن میں یہ مشاہدہ نہایت دلچسپ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے حیوانات اپنی خواہش کے غلبہ کے وقت کن وسائل و اطوار کو اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں اور نوعِ انسانی میں جو عادتیں بھی قدرِ مشترک کے پائی جاتی ہیں اُن سے آئندہ ہم کو بعض اہم نتائج اخذ کرنا ہیں۔ ہم آگے چل کر یہ بھی ثابت کرنے والے ہیں کہ جوڑوں کے باہمی ملاپ اور نر و مادہ کے نسلی تعلقات کی بنیاد اور انسان

عـــہ ڈارون۔ ڈیسنٹ آف مین صفحہ ۳۹۲

اور حیوان کے درمیان مماثلت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ حیوانات کی روشِ زندگی پر غور کرنے سے انسانی طرزِ معاشرت پر حیرت انگیز روشنی پڑتی ہے اور معاشرتِ انسانی کے مبادیات کا سراغ ہم کو عالمِ حیوانات کے مطالعہ سے بطریقِ احسن مل سکتا ہے۔

حیوانات کا جذبۂ محبت

کہا جاتا ہے کہ محبت موت کی طرح قوی ہے بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت موت سے زیادہ تر قوی ہے اس لیے کہ محبت کے عالم میں موت کی کوئی وقعت ہماری نظروں میں باقی نہیں رہتی اور ہم اُسے حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کُلیہ انسان کے بجائے حیوانات پر زیادہ صحت کے ساتھ منطبق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ادراک و شعور کی کمزوری جسقدر زیادہ ہوگی اُسی قدر یہ جذبہ قوی پایا جائیگا۔ کیڑے پتنگوں کے بارے میں یہ کہنا بالعموم درست ہے کہ انکی محبت اور موت میں ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ باوجود اسکے وہ اپنے جوشِ محبت کو روکنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے۔ اُنکے میل ملاپ کا زمانہ خواہ کتنا ہی کم ہو لیکن جوبات اکثریت کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے اور اپنی تعمیم کی وجہ سے اس جنس میں قانون کا حکم رکھتی ہے وہ اُنکا باہمی عشوہ و ناز ہے۔ اُن جانداروں کی مادہ جو معمولی طور پر ذی شعور ہیں نر کی چاپلوسی پر پہلے پہل بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے اس مفید عادت کی ابتداء غالباً طبعی انتخاب سے ہوئی ہے۔ اس کم التفاتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نر کی خواہشات کو تحریک ہو کر اُسکے خوابیدہ جذبات میں ایک قسم کا اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ تتلیوں کی عمر اگرچہ بہت قلیل ہوتی ہے لیکن اُنکے جوڑوں کا ملاپ "مراتبِ ابتدائی" کے بغیر نہیں ہوتا۔ نر مادہ کے پیچھے گھنٹوں خوشامد و چاپلوسی کیا کرتا ہے حالانکہ اس ننھی سی جان کے لیے گھنٹے سالوں کے برابر ہیں۔

یہی کیفیت مچھلیوں میں بھی مشاہدہ میں آئی ہے۔ جب انکی بہار کا موسم آتا ہے اور مشاطۂ قدرت نر مچھلیوں کو نہایت خوشنما رنگوں سے آراستہ کرتی ہے تو وہ جوشِ مسرت میں اپنے حسنِ مستعار کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے مادہ پر ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی تو وہ اپنے پروں کو پھیلا دیتی ہیں اور کبھی مادہ کے گرد ڈبکتی، بھاگتی اور خوش فعلیاں کرتی ہیں۔ مچھلیوں میں قانون عشوہ و ناز کی طرح ایک اور قانون بھی رائج ہے جسکو ڈارون نے قانون مجادلہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں مادہ کے لیے نروں میں جنگ و جدال ہوتی ہے اور مادہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو زیر کرے۔ اس صنف میں مادہ خاموش اور صلح پسند ہونے کے باوجود نر صدرمہ کا مجسمہ پایا جاتا ہے۔

مقابلہ کے وقت اپنی عزت کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ جوش و غضب کے ساتھ جنگ آزمائی کرتے ہیں۔ نر سامن Salmon جسکے نیچے کے کلپھڑے تناسل کے زمانہ میں لانبے اور خمدار ہوجاتے ہیں آپس میں ہمیشہ لڑتے رہنے کا عادی ہوتا ہے۔[عـــہ]

حیوانات کے اعلیٰ اقسام میں بالعموم دو خواہشیں نہایت شدت کے ساتھ پائی گئی ہیں (۱) طرحدار نظر آنے کی خواہش (۲) حریف کو زیر کرنے یا بھگا دینے کی خواہش۔ جنوبی امریکہ میں چھپکلی کے تناسل کے ایام میں خوب لڑتے جھگڑتے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغلوب بے دُم رہ جاتا ہے اس لیے کہ غالب اُسکی دُم کاٹ ڈالتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں خوب پھول جاتا ہے اور سر و دُم کو اٹھا کر سطح آب پر چکر مارتا رہتا ہے اور اُسکی حرکات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ امریکہ کے وحشیوں کا ایک سردار اپنی نبرد آزمائیوں کے قصے فخریہ بیان کر رہا ہے۔

پرندوں کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے اُنکے شوق و محبت کا جذبہ حقیقی زور و اثر رکھتا ہے اور اس میں موسیقی کی شان پائی جاتی ہے۔ انتخاب طبعی کے متعلق ڈاروِن کی مشہور تھیوری بھی ٹھیک طور سے پرندوں ہی پر صادق آتی ہے۔ قمری کے عشق کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نر خاص شان کے ساتھ دُم ہلاتا ہوا خراماں خراماں بڑھتا ہے۔ کبھی اُسکو چوڑا کرتا ہے اور کبھی بالکل سمیٹ لیتا ہے۔ اُسکی خوش نوائیاں کانوں کو نہایت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصًا درخت کی کسی اونچی ٹہنی یا جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے اُسکی حقیقی خود فراموشی کی صدائیں دل و دماغ پر اثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ اس عالم بیخودی میں کوئی حریف مخل ہو یا کوئی نر نظر آ جائے تو اُسپر فی الفور حملہ کر کے حدود معینہ سے اُسکا یکسر اخراج کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کئی پرندے اس قسم کے مقابلوں میں مصروف پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسکا دوران دو یا تین منٹ سے زائد نہیں رہتا۔ اس اثنا میں دفعتًا کوئی مادہ نظر آ جائے تو بس ان معرکہ آرائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور سب کے سب اُسکے پیچھے اُڑ جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر مادہ اپنی فطری متانت کو قائم رکھتی ہے (جو حقیقتًا نر کے قابو میں لانے کا عمدہ نسخہ ہے)۔ جس وقت نر دلکش نغمے الاپتا ہوا مادہ کے قریب پہونچتا ہے تو وہ اپنے عاشق زار کی وارفتگیوں پر اس انداز سے پیچھے سرک جاتی ہے کہ وہ دِل باختہ اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ جواب صاف دیا گیا ہے یا امتحان وفا منظور ہے۔

عـــہ ڈاروِن۔ ڈیسنٹ آف مین صفحہ ۳۶۵

بھورا اور سیاہ رنگ کے مرغ منجلے، جری اور لڑاکو ہوتے ہیں۔ انکی مادہ پیچھے تو خاموشی کے ساتھ اس سنجیدہ لڑائی کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور بالآخر فتحمند مرغ کو کامیابی کے انعام سے خوش کرتی ہے۔ متمدن اور وحشی انسانوں میں بھی تقریبًا یہی کیفیت مشاہدہ میں آتی ہے۔ ایک مرغی ایسی بھی ہوتی ہے جو بڑے مرغ کو حریف سے مقابلہ میں ہٹتے پاکر بچوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہے؎۔

یہ باہمی مجادلے کسی دیرینہ مخالفت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ انکا مقصود یہ ہوتا ہے کہ مادہ کو اپنی خوبصورتی اور بہادری کی شان دکھا کر مسخر کیا جائے۔

حیوانوں اور انسانوں کی طرح پرندوں میں بھی محبت پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ مادہ کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے وہ بھی عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ بعض سر کی کلغی اور جسم کے پروں کو خوشنما بنا کر رفتار کرتے ہیں اور بعض اُس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اپنی وہبی خوش گلوئی کو وسیلہ تسخیر قرار دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں انکی جسمانی قوت اور بہادری بالکل معطل ہو جاتی ہے بلکہ مادہ کی صرف آنکھ اور کان پر جادو چلایا جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ کبوتر اور فاختہ کس طرح اپنی مادہ کی سلامی اُتارتے ہیں۔ بگلے، اگدہ اور سرخاب مادہ کے سامنے اکڑتے اور اتراتے ہوئے اپنی دُم کو زمین پر گھسیٹتے اور رقص کرتے ہیں۔ تاجدار بعض سر اُٹھا کر اپنے ریشمی طرہ کو سیدھا یا خمدار بنا لیتا ہے۔ اور اپنی مادہ کے سامنے حلق کو خوب پھلا کر اُس میں سے خاص قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔

چیانقش نامی گانے والی چڑیا اپنی مادہ کے سامنے اس لیے آکر کھڑی ہوتی ہے کہ وہ اُسکے سرخ گلو اور نیلے سر کو قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ بعض پرندے خوبصورتی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح یہ بھی اپنی قدرتی زیبائش پر قانع نہیں ہوتے بلکہ اُسکو ناکافی سمجھکر اپنے گھونسلوں کو رنگا رنگ پروں، خوشنما پھول پتیوں، سیپیوں اور ہڈیوں سے نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ آراستہ کرتے ہیں۔ اکثر پرندے اپنے راز و نیاز کی باتوں کو دوسروں سے مخفی رکھنے کے لیے کنج اور سائبان بناتے ہیں۔ شہر نیوگنی کا ایک پرندہ مخروطی وضع کی ایک کُٹی یا جھونپڑی بناتا ہے جسکے آگے سبزہ اور کائی جمع کی جاتی ہے اور اُس پر خوشنما پھول، بلور کے ٹکڑے، اور سیپیاں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ کملائے ہوئے پھولوں کے بجائے تازہ پھول بدلے جاتے ہیں تاکہ ان ایام میں فرحت بخش

؎ ڈارون۔ ڈیسنٹ آف مین صفحہ ۳۹۹۔

سامنا ہر وقت پیش نظر ہے لطف و محبت کے یہ عجیب و غریب کاشانے اسقدر مستحکم ہوتے ہیں کہ کئی برس تک قائم رہتے ہیں اور کئی جوڑوں کے کام آتے ہیں۔ اسوقت تک نوع حیوانات کے قانون ازدواج کے متعلق جو کچھ ہمارے معلومات ہوے ہیں اُن سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسلی زندگی کی حد تک پرندوں کا طرز معیشت کسقدر بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ سب سے زیادہ لائق غور یہ امر ہے کہ اس بارے میں اُنکے مساعی جبر و تشدد کے بجائے صنف نازک کو با سالیب مختلفہ اپنی جانب مائل کرنے پر محدود ہوتے ہیں اور وہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے اپنی سمجھ اور بساط کے موافق ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے ہیں۔ مینا چونکہ بلبل کی طرح خوش الحان نہیں ہوتی اس لیے کسی خشک گر پُر صدا ٹہنی کی آڑ میں ہو کر وہ اپنی مادہ کو آواز دیتی ہے۔ کنیڈا کے ہنس کے بارے میں مسٹر آڈوبن کا مشاہدہ نوع انسانی پر بالکلیہ منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہنس جس قدر زیادہ عمر والے ہونگے اُسی مناسبت سے "مراتب تمہیدی" میں بھی کمی پائی جائے گی چونکہ بتقاضائے سن ان میں اگلا سا شوق و ولولہ باقی نہیں رہتا اس لیے تملق و خوشامد کے بغیر یہ اپنی مادہ کا رُخ کرتے ہیں۔

پرندوں اور رینگنے والے جانوروں کے نر مادہ کے مقابلہ میں زیادہ پُر جوش ہوتے ہیں اسلیے اس خواہش کے غلبہ کے وقت اُنکو کسی مادہ کے قبول کر لینے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا لیکن پرندے اپنے جوڑوں کے انتخاب کے معاملہ میں قانون مجادلہ کے بڑی حد تک پابند ہوتے ہیں اور یہ قانون آبی و ارضی دونوں قسم کے جانوروں میں بالاشتراک پایا جاتا ہے مگر صنف ذات الثدی کی یہ حالت نہیں ہے۔ اُن میں جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہی سب پر غالب رہتا ہے۔ مستی کے زمانہ میں بارہ سنگھوں کے مجادلے مشہور ہیں بعض وقت اُنکی شاخیں آپس میں اس قدر اُلجھ جاتی ہیں کہ وہ اُسی حالت میں موت یا کسی شکاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سیل (دریائی بچھڑا) اور گرین لینڈ کے جبل بھی خشمناکی سے آپس میں مجادلے کرتے ہیں۔

انسان، ذات الثدیا اور پرندوں میں شوق وصل تمامی قوتوں پر محیط ہوتا ہے اور اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی معمولی حیثیت سے ترقی کر کے ایک ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہو گئے ہیں۔ جانور مستی کے عالم میں زیادہ جری اور خونخوار نظر آتے ہیں۔ ہاتھی جو اپنی خاموشی اور صلابت کے لیے مشہور ہے مست ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ صنف حیوانات کے متعلق یہ ایک پرانا مقولہ ہے

کو، شعور و ادراک کی قوتوں سے معرا ہیں اور اُنکے اغراض و ضروریاتِ زندگی ایک خودرو دان مشین کی طرح بلا حس و ادراک کے پوری ہوتی ہیں۔ اور ساری عقل و ادراک حضرتِ انسان ہی کے حصہ میں آئی ہے نیز امتیاز، تخیل اور انتخاب کی قوتیں انسان ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ لیکن بقاے نوع جو لوازمات زندگی کا ایک اہم لزوم ہے اُسی میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جانوروں میں حد درجہ کا انضباط اور باقاعدگی پائی جاتی ہے اور اسی ضابطہ کے تحت اُنکے مقاصدِ زندگی نشو و نما پاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اور حیوان روش و خصوصیات میں ایک دوسرے سے مطابقت و مناسبت رکھتے ہیں اس لیے کہ عادات و اطوار میں یہ ایک دوسرے کے نقال ہوتے ہیں۔ مہذب انسانوں کی طرح حیوان بھی قوتِ امتیاز و انتخاب رکھتے ہیں چنانچہ وہ اپنے ہم جنس کی محبت میں اندھے نہیں ہو جاتے۔ جن لوگوں نے فطرتِ مخلوقات کے مسئلہ پر غائر نظر ڈالی ہے اُنکی رائے میں مادہ نر کے مقابلہ میں طبعاً کمزور ہوا کرتی ہے اور وہ اپنے ہم جنس کے انتخاب میں زیادہ غیر محتاط اور جلد باز پائی گئی ہے لیکن کبوتر کی مادہ بعض کبوتروں سے سخت متنفر دیکھی گئی ہے اور باوجود چاپلوسی کے رام نہیں ہوتی۔ یہی مادہ بعض اوقات اپنے پرانے نر کو چھوڑ کر دفعتاً دوسرے کبوتر سے مل جاتی ہے۔ اسی طرح مادۂ طاؤس کسی دوسرے مور کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ اچھی نسل کی کُتیاں حسِ شہوانی سے مغلوب ہو کر اپنی نسل کی خوبیوں کو معمولی اور کم ذات کتوں سے ملوث ہو کر برباد کر لیتی ہیں۔ بعض کُتیاں ہفتوں اسی شغل میں مصروف پائی گئی ہیں اور اس زمانہ میں وہ اپنی ذات کے عمدہ کتوں سے بھی نفرت کرنے لگتی ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور یا زخمی کبوتر کو اُسکی مادہ نے چھوڑ دیا ہے۔ المختصر جانوروں کا اتحاد، محبت و اتحادِ انسانی سے کچھ زیادہ مغائر نہیں ہے نہ اُنکے نسلی تعلقات قیام و استحکام کی صفت سے خالی ہوتے ہیں۔ البتہ اُنس و محبت کی پابندگی اور شرافت و نجابت کی خوبیوں میں انسان کو حیوانات پر فضلیت حاصل ہے۔

سید علی اصغر بلگرامی

جب سے ایک بلگرامی عزیز نے حیدرآباد سے ایک ہوا ریاچہ جاری کیا ہے شفیقی علی اصغر صاحب کی توجہ سے الناظر محروم ہو گیا تھا۔ جنوری نمبر میں جو کچھ لکھا گیا تھا اُسنے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دوست کو پھر قلمی اعانت پر آمادہ کر دیا ہے اور ہمیں یقین ہے اور ہم خود بھی انشاء اللہ اسکی خاص کوشش کرینگے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔ سید صاحب! حیاتِ شبلی کا دوسرا نمبر جلد ارسال ہو۔ ایڈیٹر

ترجمۂ رُباعیاتِ خیّام

(سلسلۂ اشاعتِ گذشتہ)

(۱۰)

گر گوہرِ طاعت نہ سُفتم ہرگز گردِ گنہ از چہرہ نہ رُفتم ہرگز
نومید نیم ز بارگاہِ کرمت زانرو کہ یکے را دو نگفتم ہرگز
گو، گوہرِ طاعت کی پروئی نہ لڑی (ترجمہ) گو، گردِ گنہ نہ اپنے چہرے سے جھڑی
پھر بھی نہیں مایوس کرم سے ہوں ترے جز تیرے نظر غیر پہ ہرگز نہ پڑی

(۱۱)

چوں عہد نمی کند کسے فردا را تو حالیا خوش کن دلِ شیدا را
مے نوش بہ نورِ ماہ لے ماہ کہ ماہ بسیار بتابد و نیابد ما را
فردا کا کسے آہ! بھروسا ہے یہاں (ترجمہ) کرلے تو ابھی بیٹھ کے دل کو شاداں
مے پی لے شبِ ماہ میں اے رشکِ ماہ پھر چاندنی راتیں یہ کہاں ہم ہیں کہاں

(۱۲)

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد وز بہرِ نشست آشیانے دارد
نے خادمِ کس بود نہ مخدومِ کسے گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد
بھرنے کے لیے پیٹ میسر ہو اگر (ترجمہ) رہنے کو بھی اک پھوس کا ہووے چھپّر
خادم نہ بنیں نہ ہوں کسی کے مخدوم کس چین سے دُنیا میں ہو اوقات بسر

(۱۳)

ایں چرخ جفا پیشہ و ناسے بنیاد ہرگز گرہِ بستۂ خود را نکشاد
ہر جا کہ یکے دید کہ داغے دارد داغِ دگرش بر سرِ آں داغ نہاد
او چرخ دغاباز، ستمگر، عیّار (ترجمہ) ڈالی جو گرہ پھر وہ نہ کھولی زنہار
ہاں داغ نظر پڑا جہاں پہ کوئی اک داغ کیا اور بھی اس پر تیار

(باقی آئندہ)

رباعیات مختلفہ

وحدت

دنیا کا ہر ایک ذرہ ذرہ دیکھا عالم کا تمام چپہ چپہ دیکھا
ہر شے میں مگر تجھی کو پایا موجود ہر جا غرض ترا ہی جلوہ دیکھا

شکوۂ چرخ

او چرخ دغا باز ستمگر تو نے کیا کیا نہ ستم ڈھائے ہیں ہمپر تو نے
دیتا ہی رہا داغ نیا ایک نہ ایک رہنے نہ دیا چین سے دم بھر تو نے

غفلت

دیتا ہے ندا دیر سے مرغ سحری کیا وقت ہے اب اُٹھئے یہ دیکھو تو ذری
پہونچی ہے کہاں روشنیٔ صبح رحیل اے بیخبر وا نیند یہ غفلت کی بھری

انتباہ

ہے دل میں ابھی امنگ جودت باقی اعضا میں توانائی وطاقت باقی
اسوقت جو کرنا ہے، وہ کرلے ورنہ کیاں نہیں رہنے کی یہ حالت باقی

موجودہ حالت

اگلی سی نہ جرأت ہے نہ ہمت باقی صنعت ہے نہ حرفت نہ تجارت باقی
نظروں میں زمانہ کے ہیں ہم خوار وذلیل دولت ہے نہ ثروت ہے نہ عزت باقی

انقلاب

ہر چیز نئی، نئی ہے دُنیا اگلی وہ نہیں رہی ہے دُنیا
کچھ ہم ہی بدل گئے جہاں میں یا یہ کہ بدل گئی ہے دُنیا

یاد ایام

کتنی تھی بڑے مزے سے دنیا کچھ اور تھی اس سے پہلے دنیا
تھی فکر کوئی نہ تھا کوئی غم کیا ہوگئی اب وہ ہائے دنیا

سید لطف علی تالگرامی

مشاطۂ ٹیلیفون

(جدید انکشافات)

"آہ! چلے ہیں اُس نے مجھ سے ٹیلیفون میں ہی بات کی تھی۔ اُف! کیا جادو تھا کہ ہم فوراً ملے۔ چار آنکھیں ہوتے ہی جذبات میں ہیجان پیدا ہوا۔ آخر اُس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔"

ٹیلیفون پر کام کرنے والی ایک لڑکی نے عہد شکنی کے مقدمہ کے دوران میں مندرجۂ بالا الفاظ اپنے بیانات میں رو رو کے کہے۔ اس مقدمہ نے بیحد دلچسپی پیدا کردی تھی۔

یورپ نے جو ترقی کی اظہر من الشمس ہے۔ موجودہ تہذیب کے کرشمے حیرت خیز اور ہوشربا ہیں۔ ٹیلیفون کے ذریعہ عشقبازی اور مواصلت جدید انکشافات ہیں جو یقیناً تفنن طبع کا باعث ہونگے اس لیے چند پرلطف واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ حالات انگلستان کے ایک اقامت نویس نے مختلف کارخانوں کے مالکوں اور کارکنوں سے معلوم کیے ہیں۔ جب اُن سے پہلی مرتبہ اسکے متعلق دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے وفور خجالت سے جواب دینے میں ذرا تامل کیا۔ لیکن انتہائی اصرار پر اُنھوں نے چند واقعات بیان کیے کہ کس طرح کئی آدمی جو ٹیلیفون والے کارخانوں میں کام کرتے تھے دوسرے کارخانہ کی کارکن لڑکیوں کی باریک اور سُریلی آواز پر عاشق ہوگئے۔ اور پھر محض ٹیلیفون پر چستی و دلفریبی سے کام کرنے کی خوبی پر فریفتہ ہو کے اُنکو اپنے عقد ازدواج میں لائے۔ ان مالکوں نے یہ بھی کہا کہ یہی وجہ ہے کہ ٹیلیفون پر جواب دیر سے ملتے ہیں کیونکہ طرفین ایک دوسرے سے تار پر فضول نوک جھوک اور محبت آمیز چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔

ایک تجارتی کوٹھی کا مزے دار کارنامہ

بڑے بڑے تجارتی کارخانوں میں لڑکیوں پر کارخانہ کے کام کا اسقدر بوجھ ہوتا ہے کہ اُنکو تاجروں اور معاملہ داروں سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل سکتا اور گفتگو کرنے کی اُنھیں ممانعت بھی ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی اطلاع فوراً مالکان کو ہوجاتی ہے جو اُنکو سرزنش کرتے ہیں۔ با ایں ہمہ

بڑے کارخانوں میں ٹیلیفون پر کام کرنے والی لڑکیاں اس شغلہ سے باز نہیں آتیں۔ وہ خریداروں وغیرہ سے ناز و عشوہ کرنے میں وقت کا کثیر حصہ ضائع کرتی ہیں گو اُنکے خیال میں وقت ضائع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس طرح بہت سے جدید تعلقاتِ تاہل پیدا ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر وہ لڑکیاں جو اپنے کام میں ہوشیار اور مشاق ہوتی ہیں کسی عاشقِ جانباز کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے ہیں جنہیں کا ایک واقعہ سطور بالا کی تصدیق و ثبوت کے لیے کافی ہے۔

جس لڑکی کا اب ذکر کیا جا رہا ہے وہ اپنے کام میں ایک خاص شہرت رکھتی تھی اور اُسکو اپنے فرائض تیزی و ہوشیاری سے انجام دینے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ یہ لڑکی لندن کے ایک بڑے تجارتی کارخانہ میں ملازم تھی۔ اسکی اس پھرتی اور ہوشیاری نے لندن کی ایک تجارتی کوٹھی کے ایک شریک کے طائر دل کو اسکے دام میں گرفتار کر دیا۔ اس الفت کے نئے جذبہ کا یہ اثر ہوا کہ اُس گرفتار محبت نے اپنے ایک دوست کی مدد سے جو اُسی کارخانہ میں کام کرتا تھا لڑکی سے تعارف پیدا کیا۔ آہ! اُس نے دیکھا کہ لڑکی اپنے کام میں ہی بےنظیر نہیں بلکہ حسن و ناز آفرینی میں بھی لاجواب ہے۔ پھر تو بالکل لٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے لڑکی سے شادی کی درخواست کی جو فوراً منظور کی گئی۔ اور اب وہ دونوں لندن کے ایک کوچہ میں ایک مکان میں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔

برباد کن غمزے

میں نے شروع میں مقدمہ عہد شکنی کا ذکر کیا ہے۔ میرے خبردار دوست نے کہا کہ گو مجھے اس خاص مقدمہ کا حال تو معلوم نہیں ہے لیکن ہاں! اتنا میں جانتا ہوں کہ ٹیلیفون پر غمزہ و عشوہ کے ذریعہ جو شادیاں ہوئی ہیں اُن میں سے اکثر بربادکن اور مصیبت ناک ثابت ہوئی ہیں اور یہ عہد شکنی کا مقدمہ نرالا نہیں ہے ایسی مثالیں اس سلسلہ میں عام ہیں۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ٹیلیفون کے ذریعہ جو شادیاں ہوتی ہیں اُن میں عموماً بہجت و شادمانی کمیاب ہوتی ہے اور ٹیلیفون کی نوک جھوک طرفین کو دنیاوی مصائب و آلام کے بحر زخار نا پیدا کنار میں غرق کر دیتی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک تجارتی کوٹھی میں ایک لڑکی ٹیلیفون پر کام کرتی تھی۔ ایک دن دوسری طرف کے کلرک نے اُسے ٹیلیفون پر بلایا۔ لیکن صدائے برنخاست! بار بار وہ گھنٹی بجاتا تھا اور آواز دیتا تھا۔ اس سے اُن میں چھیڑ خانی ہوئی ہو گی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک دوسرے سے بخوبی آشنا ہو گئے

اور مختلف مواقع پر ملے ۔ اس شخص نے شادی کی درخواست کی ۔ لڑکی نے حامی بھر کے اپنے آپ کو شادی کی زنجیر میں مقید کردیا ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد لڑکی کو اتفاقیہ اصلیت معلوم ہوئی ۔ وہ آدمی متاہل تھا ۔ اس انکشاف نے لڑکی کے نازک دل کو ایسا صدمہ پہونچایا کہ وہ صاحب فراش ہوگئی ۔ اور صحت میں ایسا فرق آیا کہ ایک عرصہ کے لیے ٹیلیفون کے کارخانہ میں کام کرنے کے قابل نہ رہی ۔ بخلاف اسکے تجارتی کارخانوں کی چند لڑکیوں سے گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ ٹیلیفون پر اتفاقیہ گفتگو کرنے اور بعد ازاں دل لگی تک نوبت پہونچنے کی ایک ایسی مسرتناک شادیاں بھی ہوئی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ۔ ایک لڑکی نے مجھ سے اپنی دو ہمجولیوں کے واقعے بیان کیے جنکی جادو بھری آوازوں نے دو آدمیوں کے خرمنِ دل پر صاعقہ کا کام کیا ۔ دونوں آدمی بہت مرفع الحال تھے جنکو ایک دن اس تجارتی کوٹھی سے جسمیں یہ لڑکیاں تھیں کئی مرتبہ گفتگو کرنی پڑی ۔ انکی شیریں آواز اور کام کے دلکش انداز نے یہ کیا کہ وہ دل دے بیٹھے ۔ اُنھوں نے دیدارِ جاناں کے بعد اُن بتانِ سیمین سے اظہارِ حال کیا جسکے بعد ہی گرجے سے شادی کے گھنٹہ کی آواز کانوں میں آرہی تھی !

بدمزاج معاملہ دار

جب ایک تجارتی کوٹھی کی لڑکیوں کو دوسری متعلقہ کوٹھی کے مردوں سے روزمرہ کام پڑیگا تو یہ لازمی بات ہے کہ اُن میں واقفیت اور بے تکلفی بڑھے ۔ اور بعض دفعہ یہ واقفیت بڑھ کے خاص نتائج پیدا کرے ۔ بعض اوقات بدمزاج معاملہ داروں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ معتدل مزاج لڑکیاں ساعی ہوتی ہیں کہ حتے الامکان معاملہ داروں سے خوش مزاجی اور تلطف سے پیش آئیں ۔ ایک لڑکی نے مجھ سے ہنس کے کہا کہ اُن بدمزاج اور بےصبر، جلدباز معاملہ داروں سے ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آنا ہنسی کھیل نہیں ہے جو یہی سمجھتے ہیں کہ کارخانوں میں اور کام تو ہیں نہیں ، ایک صرف اُن کا ہی کام ہے جسپر فوراً توجہ لازم ہے ۔ اس نے مجھ سے ایک لڑکی کا ذکر کیا ۔ جسکی خوش مزاجی اور حلیم الطبعی نے ایک امیر آدمی کو گرویدہ کرکے اپنا بنا لیا ۔ اس بت طناز کی دائمی خوش طبعی ، سریلی اور دلکش آواز ۔ اور دلستاں ہنسی نے اسکو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا ۔ یہاں تک کہ اسکے ان بے مثل اوصاف نے ایک تلخ مزاج معاملہ دار سے جو ایک مالدار تاجر تھا تعریف و توصیف کا قابلِ رشک تمغہ حاصل کرلیا ۔ اس تاجر نے بعد میں ظاہر کیا کہ اُس نے بارہا لڑکی سے گفتگو کرتے ہوئے دیدہ و دانستہ منہ سے سیٹیاں بجائی ہیں کہ شاید اسی طرح اسکے معتدل مزاج پر تازیانہ لگے اور وہ غضبناک ہوجائے اور اسی لطف آشفتگی حاصل ہو ۔ لیکن جو جو وہ چھیڑتا تھا اس لڑکی

کی آواز شیریں اور دلکش ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ تاجر کے دل میں خیال آنے لگا کہ جس لڑکی کا مزاج ایسا اخلاق اتنا عمدہ اور لطیف ہو وہ ضرور ایک چیز ہوگی۔ ہجوم اشتیاق نے اسکے دل میں گدگداہٹ پیدا کر دی۔ وہ ہمہ تن شوق ہو کے اس سے ملا اور دل میں جو اسکے متعلق خیال تھا اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے پایا۔ سچ کیا تھا ؎ من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ٭ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

آواز ایک نعمت غیر مترقبہ ہے

دریائے ہڈسن والی تجارتی کوٹھی میں مس میری ہوگارڈس نامے ایک لڑکی کام کرتی تھی جسکی ایک دلچسپ داستان ہے۔ وہ نازک کلامی و شیریں سخنی میں مشہور تھی اور آواز تو آہ! اُسکی کی آنکھیں جادو تری زبان میں ہے ایک لوہے کے کارخانہ دار مسٹر البرٹ ٹادر لکھپتی کو ایک بار اس سے دو تین دفعہ ٹیلیفون پر کسی کام کے لیے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس گفتگو نے اسکے دل میں ایک خیال پیدا کر دیا۔ لکھپتی نے کئی دفعہ اس سے ٹیلیفون پر گفتگو کی۔ اسکا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ فرصت کے لمحے عموماً اس نوجوان لڑکی سے گفتگو کرنے میں صرف کرنے لگا۔ اسے اس لڑکی سے باتیں کرنے میں ایک خاص لطف و مسرت حاصل ہوتی تھی گو کبھی اُس نے اس لڑکی کو دیکھا نہ تھا۔ آخر کار اُس نے مس سے ملنے کی ٹھہرائی۔ اسکی بے نظیر حسن آفرینی اور کافرما جرائی کو دیکھ اسکی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تعشق و تعلق خاطر کا دوسری طرف سے گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ آخر وہ اسکو گرجے میں لے گیا اور پادری شادی کا وعظ کہہ رہا تھا سچ ہے ؎ نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد۔

لکھپتیوں اور ٹیلیفون پر کام کرنے والی لڑکیوں کی شادیاں گو عام نہیں لیکن ایسی چند مثالیں موجود ہیں کہ لڑکیوں نے ٹیلیفون کے ذریعہ دولتمند خاوند حاصل کیے۔ ایک لچسپ تذکرہ اسکے متعلق مجھ سے کیا گیا۔

ایک دلدار دولہا

ایک مشہور دولتمند اہل شہر نے ایک دن کسی کارخانہ میں اپنے دوست سے خانگی امور کے متعلق گفتگو کرنی چاہی۔ اُس نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی۔ کسی لیڈی نے جواب دیا کہ وہ دوست اس وقت موجود نہیں ہے۔ یہ عورت بھی مس ہوگارڈس کی طرح بڑی خوش آواز تھی۔ چنانچہ اس دولتمند کو اس آواز سے ایک خاص اُنس ہو گیا اور اس آواز پر ایسا لوٹ ہوا کہ اپنے دوست سے گفتگو کرنے کے بہانے ڈھونڈھا کرتا۔ اس طرح اس لیڈی کی آواز اُس دوست کے بجائے اُس دولتمند کے کانوں

پہونچ کے دل کے اندرونی حصص میں اُترتی اور اُسکو وجد میں لے آتی تھی۔ اُسکا عشق اس قدر بڑھا کہ اُس نے اپنے دوست سے ملنے کا بہانہ نکالا اور اُس کارخانہ میں گیا۔ اس نے اس پری پیکر کو بھی دیکھ لیا جسکے حسن خداداد نے اسکے رہے سہے حواس بالکل زائل کر دیے۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لیڈی کسی معزز خاندان کا گوہر شب چراغ ہے لیکن رفتار زمانہ نے اسکو ایسی جگہ کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ دولتمند کئی دفعہ اس کارخانہ میں گیا۔ اور ایک دن اپنے دوست کو اس نوید جانفزا سے حیرت میں ڈال دیا کہ مس ـــــ نے اسکی زوجیت میں آنا قبول کیا ہے اور یہ وعدہ چند ہفتوں کے بعد اُس مس مہ طلعت نے بحسن و خوبی پورا کر دیا۔

ـــــــــــ محمد ظفر (ایم اے) از گرگانوہ

تا چند دریں دور پرستاری زر شد　　گر نقل زر شس ہست تحیات بہ زر شد
گویم کہ خدا اشرف خلایق بشر داد　　بینم کہ خر مزیلہ اشرف ز بشر شد
اکنوں نتواں یافت پدر را بہ بزرگی　　عاجز شد و مفلس شد و ملوک پسر شد
مردے کہ عزیزست بدل مین عندست　　لازم ز عزیزان زماں بُعد و حذر شد
تعمیل فریضہ ز مسلمان ہمیں بس　　باشد کہ اگر کردم و شاید کہ گر شد
سائل بہ منعم شد و بسیار ثنا خواند　　تاثیر دعا خوانی او سنگ بسر شد
شاعر سجداوند حشم مدح سرائید　　نیکو صلۂ یافت کہ از شہر بدر شد
در ماہ دو سہ روز ستم کمش نیست　　یک قرص جویں پیش گدا قرص قمر شد
گلگشت چمن خواہم و مہ پارۂ مے کش　　ہر عیب کہ سلطاں بپسندید ہنر شد
ایں کشور تیرہ کہ ہنر را شمرد عیب　　دیں خطۂ خیرہ کہ در و عیب ہنر شد
از شعر تر و بذلۂ رنگیں چہ کشاید　　چوں واقف ایں راز بہ کلکتہ گہر شد
آن مرد مسلماں کہ ز توحید سراید　　شخصیت زرہ ماندۂ از خانہ بدر شد
منافقت بعھد الاھض نمایاں شدہ ہر سو　　محذوش نہاں خانہ و مسدود ظفر شد
از راہ سلامت نتواں جست نشانے　　گرداب بلا حلقۂ اقصاے بصر شد
عذرست تجسس راز فتالتش فجرو شید　　فریاد ضرورست چو بر شیشہ حجر شد

منظرِ عبرت

زباں پہ آئے کہاں تک یہ شکوۂ بیداد — یہی وہ دل ہے جو لُٹ کر ہوا نہ پھر آباد
نہ دل میں خوفِ خدا ہے نہ شرم آنکھوں میں — یہ کس کے قتل پہ خنجر اُٹھائے ہے جلّاد
نگاہِ یاس سے دیکھا ہے کس نے سوئے فلک — کیا ہے کس نے اشاروں میں شکوۂ بیداد
یہ آج نالوں نے توڑی ہے کس کی مُہرِ سکوت — جو کھُل گئے دہنِ زخم ساں لبِ فریاد
یہ رنگ لایا ہے کس کشتۂ جفا کا لہو — شفق سے چرخ بنا ہے جو دامنِ جلّاد
یہ جوشِ اشک سے دریا بہا دیے کس نے — یہ کس کی آنکھوں میں طوفانِ نوح کا ہے سواد
یہ کس نے سینہ زنی کی ہے جوششِ غم سے — اثر سے جس کے ہلے ہیں جبال اور اوتاد
چمن میں جا کے یہ چھیڑا ہے سازِ غم کس نے — جو صرفِ نالہ و شیون ہے بلبلِ ناشاد
زمیں سے تا بفلک جا رہے ہیں کچھ ذرّے — ہے آج خاک بسر کون خانماں برباد
اُلجھ رہا ہے یہ دم تنگنائے ہستی میں — قفس میں جیسے پھڑکتا ہو طائرِ ناشاد
کسے یہ گردشِ گردوں نے پیس ڈالا ہے — کہ جس کی خاک بھی اب ہو رہی ہے یوں برباد
شبِ مزار یہ کہتی ہے کس کی بیتابی — طلوع ہو کہیں جلد آفتابِ روزِ معاد
یہ آج کون ہے خلوت سرائے ہستی میں — حزین و بیکس و بیتاب و مضطر و ناشاد
ہے فرشِ خاک پہ غلطاں دُرِ یتیم کی طرح — جو یاد آیا ہے آغوشِ مادرِ ناشاد
پدر کے اُٹھتے ہی دل بیکسوں کا بیٹھ گیا — لحد سے آئی ندا۔ مرگِ تو مبارک باد
نگاہ کی تو یہ منظر مجھے نظر آیا — کہ اک یتیم یہ کہتا ہے پیشِ ربِّ عباد

خبیر تو ہے کہ میرا کوئی نہیں حامی
بصیر تو ہے کہ بندہ ہے بیکس و ناشاد

قدسی جائسی

پہلا گن

چاروں طرف عالم ہو تھا۔ شجر و حجر سے بد مذاقی فطرت عیاں تھی۔ قدرتِ عریاں تمام عالم میں جلوہ گر تھی۔ ہوا بلا روک ٹوک سپاٹے بھرتی تھی، جوش و طیش میں سائیں سائیں کرتی تھی، دیوانہ وار بال کھولے ہوئے پریشان پھرتی تھی مگر اسکو کوئی دم بھرنے والا نہیں ملتا تھا۔ خاک اپنا سر دھنتی تھی۔ ہوا خاک کو منتشر کرتی تھی۔ اونچے اونچے پہاڑ "وحدہٗ لاشریک" کہہ کر ہوا کو روکتے تھے۔ گہری گہری وادیاں ہوا کو مقید کرنا چاہتی تھیں۔ سمندر اپنی روانی کی داد نہ پاکر پہاڑیوں سے سر ٹکراتا تھا۔ پانی میں ایک بے مصرف دورہ تھا۔ تمازتِ آفتاب سے گھبرا کر آہیں بھرتا تھا۔ عرشِ معلّٰی کے پائے ہلاتا تھا۔ اپنی ناکامی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا اور پانی پانی ہوکر سمندر میں ڈوب جاتا تھا۔ زمین اس حماقت پر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ سورج اپنے مرکز پر قہر خداوندی کی وجہ سے مرتعش تھا اور سرگرداں۔ زمین دم بخود تھی اور ساکت۔ درندے اور اژدہے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوکر اپنی حکومت قائم کر رہے تھے۔ وحوش و طیور کا دور دورہ تھا۔ لیکن ہستی چرند و پرند تھے۔

صبح ہوتی تھی مگر لہلہانے والی دلفریب کھیتیاں نہ تھیں۔ اس لق و دق میدان میں نظارۂ صبح سے محظوظ ہونے والی محض ایک خود نما ذات تھی۔ حسن خود بیں اپنے جلوہ پر آپ ہی نازاں تھا۔ دوپہر کی لُوں! الامان والحفیظ! لبِ دریا خشک تھا، زمین العطش پکار رہی تھی۔ خود رو درخت جل جاتے تھے۔ نظارۂ شام پھولوں کو مست کرتا تھا۔ درختوں کی کیفیت وجدانی ہوتی تھی۔ پانی میں لہریں اٹھتی تھیں۔ سورج اپنی یاوہ گردی پر چاند کو تعینات کرکے اپنے چکر لئے ہوئے دماغ کو آرام پہونچانے کے لیے گوشۂ عافیت میں چلا جاتا تھا۔ چاند ایسا ہی کھلنڈرا تھا جیسا کہ اب ہے۔ سمندر و دریا کو لوریاں دینے کے لیے سرِ شام ہی آجاتا تھا اور بھاگ جاتا تھا۔ کبھی رات بھر "چادر چھپوا" کھیلتا رہتا تھا اور کبھی آخر شب میں چھپ چھپ کر زمین کو اپنا روئے زیبا دکھایا کرتا تھا۔ چاندنی اپنا کھیت کرتی تھی تاریکی اپنا رنگ جماتی تھی۔ نہ شمع تھی نہ چراغ تھا۔ پتھر سے نکلنے والی آگ ضرور تھی اور اس میں کشش بھی تھی مگر پروانہ جلتا تھا۔ پروانہ بھی تھا، پروانہ کے دل میں ذوقِ سوز بھی تھا۔ شاید وہ اس زمانہ میں اپنے

سوز میں آپ ہی جل مرتا ہو۔ فرشتے اس عالم کو دیکھتے تھے اور حق حق کہکر خاموش ہو رہتے تھے۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ابلیس منکر ہو کر معتوب ہو چکا تھا اور آدم نے واقعات و جذبات سے متاثر ہو کر ایک خاص حالتِ بیخودی میں، حوا کا کہنا مانکر ممنوع پھل کھا لیا تھا۔ ممنوع پھل کیا واقعی گیہوں تھا؟ بابا آدم کی ذرا سی غلطی کے بعد ایک فطرتی حکم عدولی کے بعد یہ عالم وجود عالم اسباب ثابت ہو چکا تھا۔ قدرت نے وجود اور سبب دونوں پیدا کر دیے تھے۔ عقل بھی دیدی تھی مگر نتیجہ پیدا کرنے کی ممانعت کردی تھی۔ نتیجہ پیدا ہوا لیکن خود بخود اور بے ارادہ۔ نتیجہ کا مشاہدہ سبق آموز تھا۔ دنیا میں آکر آدم و حوا منفعل اور نادم تھے۔ اگر یہ رنج مشغلہ نہ ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کی صحبت سے اکتا جاتے۔ دونوں کی زندگی وبال ہو جاتی۔ خیالِ جنت و رنجِ آسائش جب گلدستۂ طاقِ نسیاں بنگئے تو دونوں کے دونوں مشغلۂ توریث میں منہمک تھے۔ دونوں کو این و آں کی فرصت نہ تھی۔ پھر پرورشِ اولاد وقت کاٹنے کا بہترین آلہ تھی۔ قدرت بھی اُس زمانہ میں آزاد تھی اور نہایت فیاضی سے آبادیِ دنیا کو ترقی دینا چاہتی تھی۔ اسی طرح جس طرح موجودہ جنگ کے ذریعہ سے آبادیِ دنیا کو کم کرنے کی فکر میں ہے۔ فیاضیِ قدرت سے مستفیض ہو کر حسبِ ضرورت آدم نے اپنی اولاد کی زندگی کے لیے قانون بنا لیا تھا۔ یہ قوانین احکام ناطق تھے۔ ان سے انحراف کرنا دماغ انسانی سے باہر تھا۔ جب ازل میں قدرت نے کسی کی دراندازی پسند نہ کی تو آدم تقلیدِ قدرت کیوں کرتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہندوستان کو "ہوم رول" ملنا معلوم۔ کالا پانی دراصل مقرر ہے جو مذکور نہیں۔ غرض دنیا میں آدم کو مشغلہ ملتا چلا گیا اور دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی گئی! انسان بیابان میں ایک ہیجان پڑگیا۔ انسان فرشتہ صفت تھا۔ ایمانداری اور سادگی کا زور شور تھا۔ جسقدر عریانی تھی اور جسقدر تصنع کم تھا اُسیقدر برائیاں لاپتہ تھیں۔ قیود و پابندیاں ہمیشہ محرکِ آزادی و گمراہی ہوا کرتی ہیں۔ اُس زمانہ میں نہ پابندیاں تھیں نہ گناہ تھے۔ موجودہ پردہ محض تصنع اور گمراہی کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ گنتی کے چند آدمی درندوں اور پرندوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ جدھر سینگ سمانا تھا نکل جاتے تھے۔ درختوں کی چھال اور پتے ہی اُنکے لیے لباس و خوراک سب کچھ تھے۔ اماں حوا اور بابا آدم اگرچہ خود خدا کے نافرمان بندے تھے مگر اس دنیا کے لف و نشرِ غیر مرتب کو جنت بنانا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ نافرمانی کا ردعمل ہو۔ وہ اس کوشش میں کامیاب تھے مگر صرف ایک کسر تھی۔ خانۂ اول اُسی غلطی پر مبنی تھا جس کر آغاز دنیا کی بنا ہے۔ جنت میں ایک

گناہ کیا گیا تھا مگر اس دنیوی جنت میں گناہ عنقا تھا۔ یہاں صرف ایک گناہ کا۔ گناہ نافرمانی کا علم تھا۔ جس سے کہ آدم اور اولادِ آدم خائف اور محترز تھی۔ جنت میں پھل کھانے کی مانعت تھی اور یہاں پھل کھانے کے لیے قانون مقرر تھا۔ یعنی پہلے روز کے لڑکے کی دوسرے روز کی لڑکی سے شادی کر دیجاتی تھی۔ معاملۂ شادی میں کسی فریق کو آزادیٔ رائے حاصل نہ تھی۔ بابا آدم کے وقت کا یہ قانونِ شادی ہندوستانی اولادِ رشید اور خلف الصدق میں اب تک مروج ہے۔ جذبۂ عشق قدرت نے ہر طبیعت میں ودیعت کیا تھا مگر آزادی حاصل نہ تھی۔ اس لیے چار و ناچار اُسکا مُنہ بلاے مبرم جوڑے کی طرف پھیرنا پڑتا تھا اور زبان سے ایک حرف نہیں کہا جاتا تھا۔ چون و چرا کی قطعی گنجایش نہ تھی حالانکہ اس وقت نہ رائج الوقت پریس ایکٹ تھا اور نہ ڈیفنس ایکٹ۔ عالم ہو میں شمعِ خاکی فروزاں تھی جس نے ہر دانگِ عالم میں آگ لگا دی تھی اور اپنی ہستی کا شور مچا دیا تھا۔ اب رنگِ عالم جدا تھا۔ نظارہای قدرت سے لطف اُٹھانے کے لیے دو آنکھیں موجود تھیں۔ دماغ میں تصرف و اختراع کی قابلیت بھی تھی اور تنقید کر کے محفوظ کرنے کے لیے پہلو میں ایک دل بھی تھا...... انسان کی صورت دیکھکر وحوش و طیور بھاگ جاتے تھے اور شجر و حجر پناہ مانگتے تھے۔ سورج کی روشنی بیکار نہ جاتی تھی اور رات کی تاریکی خیالات کو معبودِ حقیقی کی طرف منعطف کرتی تھی۔ صحرا نوردی گلگشت تھی اور بادہ پیمائی میں بادہ نوشی کے معنی پنہاں تھے۔ جھومنے والی ہوائیں۔ دماغ میں ہوائیں بھر کر اتراتی ہوئی پھرتی تھیں۔ زمین کا دماغ آسمان پر تھا۔ عجیب و غریب زندگی تھی اور معصوم دنیا اسی ایک ڈھرّے پر چل رہی تھی۔

ایک روز سہانی صبح تھی۔ چاند اپنا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ تاروں کا مُنہ فق ہو گیا تھا۔ سورج کی آمد تھی۔ تمام میں شادیانے بج رہے تھے۔ چوپائے کلیلیں کر رہے تھے۔ ہرن چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ پرند گیت گا رہے تھے۔ ہر طرف ایک نغمۂ عریاں موجزن تھا۔ ایک آبشار کے قریب طرح طرح کے خوشنما پھول کھلکھلا کھلکھلا کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو تمام میں پھیلی ہوئی تھی۔ پتّے تالیاں بجا رہے تھے۔ نسیم پھولوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ پانی کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی اور پتوں میں سے گزر کر ایک رسیلا نغمہ چھیڑ رہی تھی۔ آبشار میں موجوں کا تلاطم تھا۔ پانی کی مسلسل چادر ایک چٹان پر گر رہی تھی اور عاشقانہ الاپ رہی تھی۔ اس فضائی تماشہ میں موسیقی خود جلوہ گر تھی۔ فضا کی ایک سحر خیز دیوی پر ایک کیفیت طاری تھی اور بیخودی میں ہر قطرہ صبح کی نقل کر رہی تھی

بے اختیار کود رہی تھی، ناچ رہی تھی اور تالیاں بجاتی ہوئی محشر خیز رفتار سے۔ مستانہ ادا سے چل رہی تھی۔ اور خدا جانے کیا۔ کچھ گنگنا رہی تھی۔ آبشار کے قریب پہونچکر۔ پھولوں کی حدود میں سبزۂ خوابیدہ کو بیدار کرتے کرتے تھک گئی اور فرش مخملیں پر گر پڑی۔ موسیقی آبشار نے اُسے اور بھی مدہوش کر دیا۔ اسکے دل میں ایک گیت پیدا ہوا اور کچھ نہ سمجھکر۔ پھولوں سے گویا متنفر تھی۔ پھولوں کو۔ پھولوں کے درختوں کو وحشت کے ساتھ توڑ توڑ کر پھینکنے لگی۔ اور پھر اُسی دیوانہ پن میں اپنے آپ کو پھولوں کے ڈھیر میں دفن کر دیا۔ پھولوں کے سمندر میں غوطہ کھانے کے بعد جان بچانے کے لیے گویا وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور آخر۔ آخر وہ ڈوب گئی۔ پھولوں کی خوشبو نے رہے سہے حواس چھین کر اُسے اور بھی دیوانہ بنا دیا۔ وہ قطعی پاگل تھی۔ پھولوں کو بیخودانہ اپنے آغوش میں بھینچنے لگی۔ دانتوں سے کاٹنے لگی اور ہاتھوں سے مسل مسل کر اپنی آنکھوں اور پیشانی سے ملنے لگی۔ اپنے سر پر اچھالنے لگی۔

بلندی پر، پہاڑی کے اوپر آدم کا ایک بیٹا سہانی صبح اور اِن نادان جنوں افزائیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ تماشائے پیش نظر سے مبہوت ہو کر اُسکے دماغ نے جواب دیدیا اور انبارِ گل کے قریب کود پڑا۔ چوٹ لگی اور ضرور لگی مگر وہ بے حس تھا اور اپنی اس حرکت پر متحیر۔ جادوئے حسن سے بیخبر لڑکی اُچھل پڑی۔ سہم کر رہ گئی۔ اور پھولوں میں مُنہ چھپا کر خاموش ہو گئی۔

حیرت و خوف نے دونوں کو ہوشیار کیا دونوں نے ایک دوسرے کو نیم وا آنکھوں سے پہچانا۔ تحیر نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ گھورتے گھورتے نگاہ ترچھی ہو گئی۔ ترچھی نگاہ کا ملنا تھا کہ سیلاب جنوں پھر اُمنڈ آیا۔

اس آدمی نے اس حسنِ دلفریب کا ہاتھ پکڑ کے اُسی طرح ترچھی نگاہ سے گھورتے ہوئے اپنی طرف کھینچا۔ وہ تسلیم مجسم مقناطیسی کشش سے یا محض لطافتِ جذبات کے اثر سے ہاتھ کے ساتھ لپٹتی ہوئی چلی آئی اور سینہ سے پیوست ہو گئی۔ عقل نے اجازت رخصت مانگتے مانگتے قانون کی یاد دہانی کی مگر عریانی نے نہیں۔ کیونکہ معمولی تماشانے خوبیِ نظارہ کو زائل کر دیا تھا۔ بلکہ جسم پر لپٹے ہوئے پھولوں نے بالوں میں اُلجھے ہوئے پھولوں نے جنھوں نے حسن میں امتیاز پیدا کر دیا تھا اور جنکو وہ چھپا چھپا کر پھر ظاہر کر رہا تھا۔ ایک نہ سننے دی۔ عقل کو ڈرا دیا، بھگا دیا۔

آغوش میں لیکر اپنے دونوں بازووں سے پورے زور کے ساتھ وہ بھینچ رہا تھا اور وہ پوری قوت کے ساتھ اُسکے سینہ سے چپکی چلی جا رہی تھی۔ اُسکے بازو پر اور بازو کی سخت بلیوں پر بوسوں کی بوچھار کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک شخص۔ اسکا شوہر آ گیا۔ آنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ زبان جواب دے چکی تھی اور کل جسم آگ بھبوکا بنا ہوا تھا۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چھوٹتے ہی حملہ کر دیا۔ حسن محجوب ہو کر علیحدہ تھا۔ نتیجہ حملہ یہ تھا کہ ایک لاش زمین پر تڑپ رہی تھی۔ محجوب حسن ڈاڑھیں مار مار کر کہہ رہا تھا "ظالم قابیل" اور قابیل ششدر ہو کر پکار رہا تھا "ہائے ہابیل"۔

ہابیل دنیا کو سب سے پہلے دار فانی ثابت کر گیا۔ آدم کی بنائی ہوئی جنت۔ اور جنۃ الفردوس میں اتنی ہی کسر تھی وہ دور ہو گئی۔ یہ پہلی موت تھی جو دنیا میں واقع ہوئی۔ یہ پہلا جرم تھا جو عالم اسباب میں سرزد ہوا۔ یہ پہلا گناہ تھا جو وجود میں آیا۔ وہ بھی مسلسل۔

"الوداد"

(شیخوپور۔ بداؤں)

بحیثیت شاعر

(ایک قصیدہ کی فرمائش پر اظہار خیالات)

رفعتِ طبع پر اپنی ؛ ہوں کیونکر نازاں
میں کہ ہوتا نہیں منت کشِ اربابِ جہاں

فیض قدرت سے ہے وہ فطرت عالی میری
بے نیازی ہے نہاں جسمیں حمیت پنہاں

اپنے سینہ میں وہ رکھتا ہوں دل پاک وغیور
جو ہے مستغنی آلودگی سود و زیاں

سرنگوں ہو نہیں سکتا میں کسی کے آگے
میری گردن پہ کسی کا نہیں بار احساں

۲ خدا کا کبھی ممنون ؛ ہوں گا ہرگز
ڈال دے لاکھ بھنور میں مری کشتی طوفاں

جزو مد ہے مجھے یہ رفعت و پستی میری
زندگانی مری اک بحر ہے اور بے پایاں

رنج راحت سے بدلے کوئی منظور نہیں
وہ بھی میرا نہیں ہوتا رہین احساں

میری غیرت کو گوارا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ بھریں غیر کے ہاتھوں مرے جیب و داماں
خود ہی اک پیکرِ ایثار ہے ہستی میری باعثِ رونق آبادیِ بزمِ امکاں
عام ہے لطف و کرم میرا زمانے بھر پر ہر جگہ جیسے برس جاتا ہے ابرِ باراں
چور ہو جاتے ہیں جب کشمکشِ دہر سے لوگ فکرِ دنیا انہیں کر دیتی ہے بیتاب و تواں
ڈوبنے لگتا ہے دل یاس کی تاریکی میں جلوہ اُمید کا ہو جاتا ہے نظروں سے نہاں
تب ہوا کرتی ہے تسکینِ حقیقی مطلوب زندگی تا انھیں ہو جائے نہ دشوار و گراں
ایسی حالت میں تشفی انھیں میں دیتا ہوں مشکلیں اُنکی ہوا کرتی ہیں مجھ سے آساں
میرے اشعار سے ہوتی ہے تسلی اُنکی میرے افکار کیا کرتے ہیں اُن کو شاداں
میرے ہر لفظ میں ہے اُنکے لیے قوتِ دل میرے ہر حرف میں ہے اُنکے لیے راحتِ جاں
مایۂ نازِ سخن ہے یہی اندازِ سخن رونقِ نطق ہے میرا یہی اسلوبِ بیاں
میں اسی طرز میں ہوں مالکِ اقلیمِ سخن وسعتِ عالمِ تخئیل ہے زیرِ فرماں
ننگ ہے میرے لیے اہلِ دول کی تعریف عار ہے میرے لیے ڈھونڈنا اپنا عنواں
میرا مقصود ہے اصلاح و درستیِ نفوس میرا موضوع ہے ہمدردیِ نوعِ انساں
دل میں جو کچھ ہے زباں سے بھی نکلتا ہے وہی ہے بہر حال مرا ظاہر و باطن یکساں
غیر ممکن ہے کہ ہو دحشت بجا مجھ سے مصلحت سے مرے جذبات ہیں بالکل عریاں
خواہشِ جاہ سے آسودۂ خاطر ہوں میں نہ زر و مال ہے مطلوب نہ ساز و ساماں
نہ ہے شہرت کی تمنا نہ ہوس دولت کی نہ غرض نام سے رکھتا ہوں نہ پرواے نشاں
متاثر کسی ترغیب سے ہونا میرا اک ہے بیہودگی شائبۂ وہم و گماں
منحرف حق و صداقت سے ہوں ممکن ہی نہیں متزلزل مرا ہو سکتا نہیں ہے ایماں

ہے گوارا اپنا میرا ضمیرا سے ارشد
وہی کرتا ہوں۔ جو ہے شانِ کے میری شایاں

ارشد۔ تھانوی

تازہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو

مشاہیر یونان و روما یعنی حکیم پلوٹارک یونانی کی شہرۂ آفاق و لاجواب کتاب "پیرلل لائیوز" کا اُردو ترجمہ (حصہ اول) جس میں یونان و روما کے اولوالعزم مدبرین کے سوانحی حالات اور اُنکے بیش بہا خیالات درج کر کے از راہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ یورپ میں یہ کتاب اس درجہ عظمت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے کہ بڑے بڑے فلسفی، شاعر اور مدبرین سلطنت اس سے استفادہ کرنے پر فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جس شخص نے اسکا ترجمہ کیا اُسے برٹش گورنمنٹ نے اسکے صلے میں "سر" کا خطاب عطا کیا اور حقیقت میں یہ کتاب ہے بھی اسی قابل کہ اسکی عزت و عظمت کی جائے۔ کیونکہ یہ "منجملہ اُن چند کتابوں کے ہے جنھوں نے مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔" آپ اس کتاب میں حب وطن، ایثار کامل، بے نفسی و جاں نثاری اور اولوالعزمی کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ "انکو پڑھ کر انسان بیخود ہو جاتا ہے اور اُسکا دل بے اختیار سچے جذبات سے اُبلنے لگتا ہے۔" اور خواہ کیسا ہی آدمی ہو یہ ممکن نہیں کہ اسکے پڑھنے کے بعد وہ متاثر نہ ہو۔ اور ان انسانی اعلیٰ خوبیوں کا دائمی اثر اُسکے دل پر باقی نہ رہے۔ "دنیا میں سیکڑوں آدمی ایسے گزرے ہیں کہ اس کتاب نے اُنپر جادو کا سا اثر کیا ہے اور اسکی بدولت انھیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوئی ہے۔" لائق مترجم سید ہاشمی صاحب نے کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے جو گویا یونان و روما کی قدیم تاریخ کا خلاصہ ہے اور یونان و روما کی قدیم سلطنتوں کے رنگین نقشوں سے بھی یہ کتاب مزین کی گئی ہے۔ قیمت لعہ مجلد ے

دریائے لطافت۔ یہ لاجواب کتاب مشہور استادانِ فن سید انشاء اللہ خاں انشا اور مرزا قتیل کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ایک دفعہ پہلے بھی مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد میں طبع ہوئی تھی مگر اب نہیں ملتی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے اب مناسب ترمیمات و اختصار کے بعد اسے پھر شایع فرمایا ہے اور شروع میں ایک دلچسپ اور لطیف دیباچہ خاص اپنے قلم سے اضافہ کیا ہے۔ اُن تمام اصحاب کیلیے جنکو اُردو زبان کے متعلق تحقیقات یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہو یہ نہایت عمدہ رہنما ہوگی۔ اُردو کے کسی کتبخانے کو اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ مصنفوں اور عام اہل قلم کیلیے یہ کتاب خصوصیت کے لحاظ سے حد درجہ کار آمد ہوگی قیمت عہ مجلد عہ ۱۲

طبقات الارض۔ مولفہ جناب مرزا مہدی خاں کوکب صاحب موصوف کی کتاب مقدمات الطبیعات کی طرح یہ کتاب بھی علم طبقات الارض میں اُردو کی پہلی کتاب ہے جسمیں نہایت وضاحت کے ساتھ اس علم کے تمام اصول و قوانین تازہ تحقیقات کے بموجب لکھے گئے ہیں اور آخر میں نہایت قیمتی فرہنگیں اصطلاحات علمیہ اور اسامی مخلوقات کے اسما کی دی گئی ہیں۔ یہ اصطلاحات اکثر و بیشتر مولف کتاب کی وضع کردہ ہیں قیمت عہ مجلد عاہ

علم المعیشت۔ یعنی اصول اکنامکس یا پولیٹیکل اکانومی

(اقتصادیات) پر اُردو میں سب سے پہلی اور مستند کتاب مصنفہ مسٹر محمد الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) پروفیسر اکنامکس علیگڈھ کالج۔ اقتصادیات کی واقفیت یوں تو ہر صورت میں نہایت ضروری اور کارآمد ہے، اگر مفلس و درماندہ قوم وملک کے باشندوں کے واسطے دنیا کے علوم سے زیادہ اسی کا مطالعہ لازمی اور سودمند ہوگا۔ کیونکہ وقت فکر اور روپے کا مصرف صحیح بتانے کے سوا موجودہ دورِ مسابقت میں اس بات کا مناسب معیار قائم کرنے میں بھی اسی سے مدد ملتی ہے کہ دنیا کے مختلف شعبہ جات میں کم سے کم صرف سے زیادہ سے زیادہ آمدنی کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔ اور نیز یہ سکھاتی ہے کہ دولت مندی کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ حجم زائد از ۵۰۰ صفحے۔ خوشنما جلد۔ قیمت ہے

اردو کا نیا قاعدہ۔ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک کمیٹی اس غرض سے منعقد ہوئی تھی کہ موجودہ قاعدوں میں جو نقائص ہیں اُنکو رفع کرکے ایک ایسا قاعدہ ترتیب دیا جائے جس کا پڑھانا ہر طرح طلبا کی ذہنی و دماغی ترقی و تعلیم کے لیے مفید ہو۔ چنانچہ کئی سال کی محنت اور بہت سے اصحاب کی منفردہ و متحدہ مساعی کا اب نتیجہ ظاہر ہوا ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ تمام بہی خواہان ملک و قوم کو چاہیے کہ رائج الوقت قاعدوں کے بجائے اس قاعدہ کو اپنے یہاں ذریعہ تعلیم بنائیں جس کے بیش بہا منافع سے اُن کی آئندہ نسلیں متمتع ہوسکیں گی۔ قیمت ۲ر

کلید قاعدہ - انجمن کا جدید قاعدہ جن اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے اُن کی توضیح کے لیے اور نیز معلمین کی اس بارے میں رہنمائی کرنے کی غرض سے کہ اس قاعدے کے پڑھانے میں کن کن باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے یہ کلید مدوّن کی گئی ہے جو انجمن کا قاعدہ پڑھانے والوں کے لیے نہایت کارآمد ہوگی۔ قیمت ۴ر

خلافت اندلس

یعنی عربوں کی ہشت صد سالہ حکومت اندلسی کی تاریخ مولفہٗ عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹر ایٹ لا سابق جج ہائی کورٹ ریاست حیدرآباد دکن۔ اس کی تین جلدیں ہیں اور ہر جلد میں نہایت خوشنما عکسی تصاویر ہیں۔ قیمت ہر سہ جلد للعہ مجلد صہ

ڈومیسٹک اکانومی

اسکی چھوٹی چھوٹی چار جلدوں میں مفتی انوار الحق صاحب ایم اے منشی فاضل ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم ریاست بھوپال نے وہ سب اصول زندگی اور متعلقہ ضروریات بیان کردی ہیں جو لڑکیوں کو ابتدائے زمانہ تعلیم میں اگر پڑھادی جائیں تو ہنرمند بیٹی، سلیقہ شعار بیوی اور شفیق ماں بننے کی اُن میں پوری پوری قابلیت پیدا ہو جائے گی۔ ہر گھر میں اس کتاب کا پڑھانا ضروری ہے قیمت ۱۲ر

دیوان رضا

یعنی جناب مولوی برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محلی کا اردو دیوان - جس کے کچھ نسخے انجمن کو ہدیۃً ملے ہیں

(محصول ڈاک ہر صورت میں ذمۂ خریدار)

المشتہر:- مہتمم دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو۔ کٹرہ سید حسین خاں - چوک لکھنؤ

نظرے خوش گزرے

قومی اخبارات میں آئے دن یہ بحث ہوتی رہتی ہے کہ مسلمانوں کا فلاں کام کیوں ابتر پڑا ہے یا اُنکی فلاں مجلس کس لیے بُری حالت میں ہے؟ اور ان باتوں کا ایک ہی جواب سب طرف سے دیا جاتا ہے یعنی یہ کہ ہمارے لیڈر اپنے فرائض سے غافل اور عامۂ مسلمین کی فلاح وبہبود کے افکار سے قطعًا نا آشنا ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مرض قومی کی تشخیص میں اس درجہ ہم آہنگی کے باوجود آج تک اس وبا کا کوئی علاج نہیں بن پڑا ہے۔ بعض لیڈر اگر قوم کی نظروں سے گر گئے ہیں تو اُنکی جگہ دوسرے لیڈروں نے حاصل کرلی ہے اور حکومت کی بارگاہ میں اور قومی وملکی مجالس کے اندر غرضکہ ہر موقع پر یہی لیڈر ہماری رہنمائی اور نمائندگی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ تنہا عامۃ الناس اگر اس بیماری میں مبتلا ہوتے تو مضائقہ نہ تھا مگر مرض کی عمومیت اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ ملک کے روشن خیال تعلیمیافتہ اصحاب مجالس قومی میں بیٹھکر یہی دُکھڑا روتے ہیں۔ چنانچہ محترم معاصر وکیل کا بیان ہے کہ مولوی نیاز علی صاحب بی اے وکیل لاہور نے انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرتسر کے گذشتہ اجلاس میں "مسلمانوں کے مجامع ملی کی ناکامی کے وجوہ" کی تفصیل کرتے ہوے یہ خیال ظاہر کیا کہ

> "ہماری انجمنوں اور درسگاہوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ کارکنوں کی روز افزوں خواہش نمود اور خود غرضی ہے۔ یہ امراض قریبًا تمام انجمنوں کے کارکنوں میں سرایت کیے ہوے ہیں۔ اور یہ ہر روز کے مشاہدہ کی بات ہے کہ ارباب غرض انجمنوں میں عہدے بڑی کوشش وکاوش سے حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ اُنکا مطمع نظر کام نہیں بلکہ نام ہوتا ہے اس لیے اگر اُنکو عہدہ نملے تو وہ کام کا نام نہیں لیتے اور اگر عہدہ ملجائے تو اُسے ذاتی نمود اور خاندانی اعزاز کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔"

اس مرض مہلک کے لیے مولوی صاحب موصوف نے حسب ذیل نسخہ تجویز فرمایا ہے:۔

> "اگر تم جانتے ہو کہ کام بددیانتی سے ہو رہا ہے اور اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے تو تمہیں اس سے ناراضمندی کا اظہار علی الاعلان کرنا چاہیے۔ اور اظہار ناراضی کی کئی صورتیں ہیں۔ اگر اس کام کے لیے روپے کی ضرورت ہو تو روپیہ نہ دو۔ اور ہر قسم کی اعانت کا دروازہ اُسپر بند کردو۔ لیکن ایسا

کرنے میں ہاز سازی اور لطائف الحیل سے کام لینا مضر ہے - جو کچھ کرتے ہو کھلم کھلا کرو - اور اُنکے دل پر اچھی طرح نقش کردو کہ محض اُنکی غلط روی اور خود غرضی سے مجبور ہو کر یہ طریق عمل اختیار کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے اہل نہوں اور محض اکثریت کے بل پر یا دوسرے حیلوں سے اسپر قابض ہوں تو تمہیں اُنکی نااہلی کا اعلان کردینا چاہیے اور اُنھیں ہٹا دینا چاہیے کہ اگر وہ نااہل ہیں کم لیاقت ہیں تو ساری دنیا نااہل وکم لیاقت نہیں "۔

نسخہ کے معقول ہونے میں کچھ شبہہ نہیں - اجزا سب مناسب ہیں، وزن بھی کامل ہے۔۔۔ لیکن دشواری صرف اس قدر ہے کہ بعض دوائیں یا تو ملتی نہیں ہیں یا ملتی ہیں تو ایسی ناقص کہ خود اصل مرض سے زیادہ مہلک اثر رکھتی ہیں ۔

مثال کے طور پر قوم کی سب سے بڑی اور نامور انجمنوں کو لیجیے - آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلما اور آل انڈیا مسلم لیگ کے حالات پر نظر دوڑائیے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ جو نسخہ لائق طبیب قومی نے تجویز کیا ہے وہ کس حد تک کارگر ہو سکتا ہے ۔

کانفرنس کے کام سے قوم راضی نہیں - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے عام طور پر شکایت تھی کہ وہ ضدی اور خودرائے ہیں اور جذباتِ قومی کا لحاظ نہیں کرتے - اُنکو ہٹانے کا قوم نے کبھی خیال نہیں کیا مگر بخت واتفاق سے وہ خود کانفرنس سے جدا ہو گئے - گو یہ جدائی عارضی تھی لیکن اصلاح پسندوں کے لیے اس سے بہتر موقعہ نہیں ہو سکتا تھا - پھر نتیجہ کیا ہوا؟ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی اُنکی جگہ پر متمکن ہوتے ہیں اور کانفرنس کا نظم ونسق پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہو جاتا ہے - یعنے چند تنخواہ یاب عہدہ داران دفتر کے زیر اقتدار چھوڑ دیا جاتا ہے - مولوی صاحب ایک نہایت ہی ذی علم، نیک باطن اور با مروت بزرگ ہیں لیکن عملی قوت کا یکسر فقدان ہے - کلکتہ میں کانفرنس ہوئی، اور سب صاحبوں نے دیکھا کہ معمولی پروگرام کے مطابق بھی کارروائی نہیں کیجا سکی - جدید اصلاحات کا تو ذکر ہی کیا ہے - مسودۂ دستور العمل جسے صاحبزادہ صاحب اپنے سامنے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی سے منظور کرا گئے تھے کلکتہ میں اُسے اجلاس عام کی منظوری کے لیے پیش ہونا چاہیے تھا لیکن محض اس بنا پر کہ بعض اصحاب اُس کی دفعات میں ترمیم کرنا چاہتے تھے پروگرام میں داخل ہونے کے باوجود دستور العمل منظوری کے لیے نہیں پیش کیا گیا - ہمارے دوست منشی محمد امین صاحب ایڈیٹر ظل السلطان جو سالہای

نا سبق ہیں کانفرنس کی بدنظمیوں کے خلاف بڑے زور شور سے پمفلٹ لکھتے رہے ہیں جب کلکتہ میں اُن سے گفتگو کی گئی تو صاحب موصوف کی ہمت اصلاح طلبی قطعاً قاصر نظر آئی اور اُنھوں نے حسرت کے لہجہ میں کہا کہ اب تو حالت پہلے سے بھی بدتر ہے۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ کسی اسلامی اخبار نے حتیٰ کہ معاصرین کلکتہ صداقت و جمہور اور خود وکیل نے بھی مسودۂ دستور العمل کے پیش نہ ہونے پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

"ندوہ" تو اب خود اصلاح طلب جماعت کے ہاتھ میں ہے اور اُسکے سالانہ جلسے بھی باقاعدگی کے ساتھ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن کیا اصلاح کی منزل مقصود یہی تھی۔ دار العلوم کی عمارت، خود دار العلوم کی انتظامی حالت اور ندوہ کے دیگر اغراض و مقاصد کس حد تک تکمیل پذیر ہوتے نظر آ رہے ہیں اسکا جواب ہمارے کرم دوست مولانا سید سلیمان صاحب سے پوچھنا چاہیے۔ حالات ظاہر کو دیکھکر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع ہمچناں دیدۂ حسرت نگران است کہ بود۔

"آل انڈیا مسلم لیگ" کو خواب ناز سے بیدار کرنے کے لیے سال گذشتہ کتنا کچھ غل مچایا گیا۔ راجہ غلام حسین مرحوم نے 'نیو ایرا' میں (جو اب اُنھیں کی طرح مرحوم کہا جاتا ہے) جو زبردست مضامین لکھے تھے اُنھوں نے ایک طرف بزم احرار میں اگر اصلاح طلبی کی روح پھونک دی تو دوسری طرف خود ہمارے جہانبانان سیاست کو بھی چوکنا بنا دیا۔ چنانچہ سنتے ہیں کہ آنریبل سکرٹری صاحب نے آنریبل پریسیڈنٹ صاحب کی خدمت میں اپنا استعفا بھی پیش کر دیا تھا۔ اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ لیگ کے قانون اساسی میں اصلاح کا وعدہ کیا گیا۔ لکھنؤ میں ایک موقع پر جب احرار کی ایک جماعت تشریف فرما تھی تو ان میں سے فرداً فرداً جملہ اصحاب نے خود ہم سے وعدہ کیا تھا کہ مسٹر مانٹیگو کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد کارکنان لیگ بدل دیے جائیں گے۔ کلکتہ میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک صاحب سے لیگ کا سکرٹری بننے کا وعدہ بھی لے لیا گیا ہے۔ مگر جب وقت عمل آیا تو سب صاحب بغلیں جھانکنے اور ایک دوسرے کی آڑ پکڑنے لگے۔

لیگ کا قانون اساسی ہر چند کہ اصلاح طلب ہے مگر قانون کی کتنی ہی اصلاح کی جائے جب تک کام کرنے والے مخلص، پُرجوش، اور باہمت نہ ہونگے سب جانتے ہیں کہ کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ اور یہی چیز عنقا ہے۔ گروہ احرار میں سے سب صاحب موجودہ عہدہ داران لیگ کے کارناموں سے واقف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لوگ کام کرنے کی فرصت نہیں رکھتے۔ مگر وہ جانتے ہیں کہ خود اُنکے درمیان بھی

کام کرنے والے نہیں ہیں - اس لیے سب خاموش بیٹھے ہیں۔ متعدد احباب نے بارہا یہ فرمایا ہے کہ سید وزیر حسن صاحب کی جگہ پر کوئی لائق اور کام کرنے والا سکرٹری مل سکے تو ہم سید صاحب سے استعفا حاصل کریں۔ مگر ہندوستان کے وسیع عرض و طول میں اور مسلمانوں کے سات کرور نفوس میں ایک شخص بھی نہیں ملتا جو اس مرض کی دوا بن سکے - ابھی تو صرف اس قیمتی دوا کی تلاش ہے ——— اور یہ تو آیندہ تجربہ ہی بتائے گا کہ اس دوا میں وہ تاثیر بھی ہے یا نہیں جو نبض شناسان قوم تشخیص کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قومی امراض اور مجلسی خرابیاں اب ایسی پائدار اور مستحکم ہوگئی ہیں کہ محض زبانی شور و غوغا سے کچھ کام نہیں نکل سکتا - جن صاحب کو اصلاح کا سودا ہو اور جو حضرات مجامع ملکی و ملی کو قابو یافتگان کے حیطۂ اقتدار سے نکالنا چاہتے ہوں اُنھیں تجاویز پیش کرنے اور صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے اب چاہیے کہ ہمہ تن وقف کار ہو جائیں اور خود اُنکی کوشش سے جس قدر اصلاح ممکن ہو اُسکے نفاذ پر ساری قوت صرف فرمائیں۔ وما علینا الا البلاغ -

---

انجمن اعانت نظربندان اسلام نے، جس کا ذکر گذشتہ نمبر میں کیا جاچکا ہے، شوکت علی اور محمد علی صاحبان کی نظربندی کے متعلق "چند اہم خطوط" کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شایع کیا ہے۔ یہ سب خطوط وقتاً فوقتاً ہندوستان کے تمام اُن موقت الشیوع پرچوں میں چھپ چکے تھے جو اس انجمن کے قائم ہونے سے پہلے سے مسلمان نظربندوں کی وکالت کا حق ادا کر رہے تھے - ایسی صورت میں ہم نہیں سمجھتے کہ اس مجموعہ کی دو ہزار کاپیاں کس حد تک نظربندوں کے مفید مطلب ہو سکتی ہیں -

احباب ہمیں معاف فرمائیں اگر ہم اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں - انجمن اعانت نظربندان اول تو قائم ہی بہت دیر میں ہوئی - اور اب جو خدا خدا کر کے قائم ہوئی ہے تو اسکو تضیع اوقات کرنے کے سوا کیا اور کچھ نہیں آتا؟

وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم بڑے زور سے ایجیٹیشن کریں گے - بنگالیوں کے ایجیٹیشن سے تنگ آکر حکومت کا صدر مقام کلکتہ سے دہلی منتقل کیا گیا تھا مسلمانوں کا ایجیٹیشن چاہیے تھا کہ حکومت کو لاہور پہنچادے جہاں آج کل سب سے زیادہ سکون کے سامان فراہم ہیں - مگر "جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں" دہلی کی جدید انجمن کی روش بھی یہی بتا رہی ہے - افسوس ہے کہ ہم لوگ نئی بات پیدا کرنا تو درکنار دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کی قابلیت نہیں رکھتے -

مسٹر محمد علی اور دیگر مسلمان نظر بندوں کے ساتھ جو تغافل ایک سال تک برتا گیا وہ اس درجہ تکلیف دہ اور ذلت آفریں نہیں تھا جتنا کہ آج ہارا ایجیٹیشن ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو تو انسان کئی کئی دن صبر کے ساتھ فاقہ کی مصیبت برداشت کر سکتا ہے مگر جنس کوٹھریوں میں بھری ہو اور کوئی پکا کر دینے والا نہ ہو تو اندازہ کیجیے کہ ایسی حالت میں غم و غصہ کی کیا کیفیت قلب پر طاری ہوگی۔

بعض مشہور و معروف لیڈروں (کیا نام بنام نشان دہی کی ضرورت ہے ؟) کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ مسٹر محمد علی آزاد ہوں، ہمیں تو اب یہ خیال ہو چلا ہے کہ خود مسٹر محمد علی کی امت بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور یہ جو کچھ سامان نمود و نمائش فراہم کیا گیا ہے اس سے بجز طفل تسلی کے اور کچھ مقصد نہیں۔

کلامِ خسرو۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت کے لیے نواب عماد الملک بلگرامی کی تحریک اور خسرو دکن کی فیاضی سے علیگڈھ میں جو محکمہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب کی نگرانی میں کئی سال گذرے قائم ہوا تھا اُسکی کوششوں کا پہلا نتیجہ "مثنوی مجنون لیلیٰ" ہے جسے انسٹی ٹیوٹ پریس نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔ ہمارے پاس قسم سوم کی کتاب ہے جسکی قیمت ۱۲ ہے۔ قسم اول قیمتی ۵ اور قسم دوم قیمتی ۳ یقیناً کاغذ کی عمدگی، سرورق کی خوشنمائی اور جلد کی نفاست میں اس سے بڑھ چڑھ کر ہونگی لیکن قیمت حجم وغیرہ کے لحاظ سے زائد ہے۔ غالباً مختلف مسودات کو تلاش کر کے حاصل کرنے اور پھر اُن سے مقابلہ کے بعد ایک صحیح مسودہ تیار کرنے کے مصارف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے یا یہ خیال کیا گیا ہو کہ ابھی بہت سی اور کتابیں شایع کرنا ہیں، شاید امداد و عطایا انکی تکمیل کے لیے کافی نہ ہوں۔ بہرصورت یہ جواہر بیش بہا جن دھوں ہی ہاتھ آجائیں سستے ہیں۔ گو فارسی زبان کا مذاق اُٹھ گیا ہے اور توقع کم ہے کہ اس سلسلہ کی حسب ضرورت عام قدر افزائی ہو تاہم صاحبانِ ذوق کی جو قلیل تعداد ملک میں ہے یقین ہے کہ وہ ان مساعی کی پوری داد دیگی اور اگر ہندوستان کی یونیورسٹیاں قدر شناسی کر کے اس لاجواب مثنوی کو داخل نصاب کریں تو منتظمین کی کوشش آسانی ٹھکانے لگ جائیں اور کتاب سے کثیر التعداد لوگ روشناس ہو جائیں۔

مثنوی کے شروع میں جناب مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا ایک بسیط مقدمہ ہے جسکے مطالعہ سے کتاب کی اہمیت و عظمت کا نقش دل پر بیٹھ جائیگا اور اس میں کلام خسرو کی خوبیاں دکھانے اور مثنوی کے خاص خاص قابل دید مقامات نقل کرنے کے علاوہ نظامی گنجوی، ملا مکتبی شیرازی

اور ملا ہاتفی ہروی کی ہمنام مثنویوں کے اشعار کا مقابلہ بھی کیا ہے۔ مولانا کی رائے میں اگرچہ مجموعی طور پر نظامی کا رتبہ مثنوی کے میدان میں امیر خسرو سے بلند ہے لیکن مجنوں لیلیٰ کو لیلیٰ مجنوں سے وہ بہتر قرار دیتے ہیں۔ اور جب نظامی کی مثنوی کا یہ حال ہے تو مکتبی اور ہاتفی کی مثنویاں کب مقابلہ میں ٹھہر سکتی ہیں۔ مولانا شبلی نے شعر العجم میں امیر کی دیگر مثنویوں کو ہر چند کہ نظامی کے آس پاس بھی نہیں آنے دیا تاہم مجنوں لیلیٰ کے متعلق وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ

"ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اسقدر نازک ہے کہ خود وہی اسکو سمجھ سکتے ہیں"

لیکن نیرنگیِ زمانہ دیکھیے کہ نظامی کی لیلیٰ مجنوں کو اس وقت تک لاکھوں آدمیوں نے پڑھا مگر خسرو کی مثنوی کو خاص خاص اصحاب کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں تھا تاہم اب جو یہ لاجواب مثنوی معرضِ طبع میں آگئی تو یہ امید غالباً بیجا نہ ہوگی کہ فارسی علم ادب کے جملہ شائقین اس سے دل کھول کر بہرہ اندوز ہونگے۔

ملنے کا پتہ:۔ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علیگڈھ

تعطیلات کرسمس کی طرح ایسٹر کی تعطیل کا مختصر زمانہ بھی قومی مجالس کے اجتماع کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ لاہور میں۔ ندوۃ العلما کا ناگپور میں۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا علیگڈھ میں۔ اور اسکے سوا اور بہت سے جلسے مختلف شہروں میں منعقد ہونگے۔ کراچی کے بعض اصحاب نے انھیں ایام میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی ہے۔ لکھنؤ میں جب اردو کانفرنس ہوئی تھی تو خیال تھا کہ اس موقعہ پر ایک مستقل اردو کانفرنس کی بنیاد ڈالی جائے گی مگر مختلف اسباب کی بنا پر یہ امید بر نہ آئی۔ اس سے قبل بدایوں اور پونہ وغیرہ میں اس قسم کی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں لیکن کہیں کوئی مستقل نظام قائم نہ ہو سکا۔ کراچی جیسے دور دراز مقام پر اردو کی حمایت کا جوش ہر چند کہ قابل تعریف ہے مگر جس چیز کی ضرورت ہے اُسکا انتظام وہاں بھی شاید ہی ہو سکے۔ اس سال دسمبر میں کانگریس اور لیگ اور غالباً کانفرنس کے جلسے دہلی میں ہوں۔ کیا اچھا ہو اگر بزرگانِ دہلی جن پر اردو زبان کی خدمت کا سب سے زیادہ حق ہے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ایک مستقل اردو کانفرنس کی طرح ڈالیں۔ اردو کی علمی و ادبی خدمت کا کام انجمن ترقی اردو اور دار المصنفین کے زیر اہتمام انجام پا رہا ہے لیکن اردو زبان کے حدودِ حکومت اسقدر وسیع اور اسکی خدمت کے شعبے اتنے متنوع ہیں کہ ایک مرکزی کانفرنس کا وجود

ناگزیر ہے۔ گو اسکے قیام کی فی الحال چنداں ضرورت نہیں محسوس کی جاتی اور نہ کوئی سبیل ہی نظر آتی ہے تاہم ہی خواہان اُردو کو اُس سے غافل نہیں رہنا چاہیے جو ملک میں ایک زبان اور ایک رسم الخط پھیلانے والوں کی کوششوں کا مطمح نظر ہے۔

اُردو کانفرنس کو علمی و ادبی خدمات سے قطع نظر کرکے اُردو کی عام ترویج و اشاعت، خاص اُردو زبان کے مدارس کے قیام اور اصلاح و تحفظ زبان کے مسئلہ پر توجہ کرنا چاہیے اور اُسے ملک کی مشترکہ زبان بنانے میں خاص سعی کرنا چاہیے۔

کیا آپکو الناظر کی پُرانی جلدیں مطلوب ہیں؟

جولائی سنہ ۱۹۰۹ء سے دسمبر سنہ ۱۹۱۷ء تک کی سترہ ششماہی جلدیں شایع ہوئیں جنمیں سے کم و بیش اکثر موجود ہیں۔ کپڑے کی صاف جلدیں بنی ہوئی ہیں اور حسب ذیل قیمتوں پر دی جائینگی:—

جلد اول	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء)	عہ ر	جلد نہم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء)	عہ ر
جلد دوم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۰ء)	عا ر	جلد دہم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۴ء)	عمہ
جلد سوم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء)	عہ ر	جلد یازدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء)	عمہ
جلد چہارم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۱ء)	۱۲ ر	جلد دوازدہم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۵ء)	عمہ
جلد پنجم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء)	۱۲ ر	جلد سیزدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء)	عمہ
جلد ششم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۲ء)	عمہ	جلد چہاردہم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۶ء)	عمہ
جلد ہفتم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء)	عہ ر	جلد پانزدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء)	عمہ
جلد ہشتم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۳ء)	عہ ر	جلد شانزدہم	(جنوری لغایۃ جون سنہ ۱۹۱۷ء)	عمہ

جلد ہفدہم (جولائی لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۱۷ء) عمہ

(نوٹ) مکمل سٹ تھوڑے ہی ہیں لہٰذا جو صاحب خواہاں ہوں جلد منگالیں۔ مکمل سٹ لینے والوں سے مجلد سترہ جلدوں کی قیمت ستر روپیہ لی جائے گی۔

منیجر الناظر لکھنؤ

جہاں تک اُسکی نگاہ پہونچی تو خون ہی خون دیا دکھائی
گھٹا مصیبت کی اُسپہ چھائی تو آنکھوں نے اک ندی بہائی
میں کل کی شب کو تھا یاں کا سلطاں ہوں آجکے دن مگر پریشاں
تھے رات رہنے کو قصروایواں ۔ آج پڑ رہنے کو ہوں حیراں
ابھی تھے خدمتگزار صد ہا جو میرے آگے تھے کرتے سجدہ
۔ آج کوئی نہیں ہے اپنا الٰہی یہ ماجرا ہے کیا ۔
بہت بُرا تھا وہ روز وساعت ہوئی تھی جسدم مری ولادت
کہ جب بڑا ہوں میں پہ نشامت کروں میں اس ملک پر حکومت
میں نحس طالع ہوں موت آئے نہ دیکھوں سورج غروب ہوتے
کہاں چھپی ہائے موت مجھسے لگائی کیوں دیر آج تونے

ہسپانیہ کے قدیم آسطے تو اسی طرز پر ہیں۔ لیکن آج تک سراغ نہ لگا کہ رزریق کا کیا حشر ہوا۔ اُسکا گھوڑا اور اُسکے جوتے اس لڑائی کے دوسرے دن دریا کے کنارے پر ملے۔ مگر اُسکی لاش وہاں نہ تھی۔ بلاشبہہ وہ ڈوب مرا اور اُسکی لاش بہکر سمندر میں چلی گئی۔ لوگوں نے اس مردہ بادشاہ کو ایسے پُرتقدس راز کا لباس پہنایا جو اُسکی زندگی میں بھی اُسے نصیب نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے قوم قوط کے آخری بادشاہ کو قصہ کہانی کے ذریعے سے ویسا ہی نجات دینے والا بنایا جس طرح شاہ آرتھر کو (انگلستان والوں نے) اور اُنکا اعتقاد یہ تھا کہ وہ سمندر کے کسی جزیرے میں ٹھیرا ہوا ہے جہاں سے وہ اپنے زخموں کے اچھا ہو جانے کے بعد آئے گا۔ اور کافروں (مسلمانوں) کے مقابلے میں عیسائیوں کا سردار بنے گا۔ ہسپانیہ کی کہانیوں میں یہ ہے کہ رزریق نے اپنی بقیہ زندگی کفارے کے باتقا افعال میں بسر کی اور جو گناہ اُس نے کیے تھے اُنکی سزا میں آہستہ آہستہ اُسکو سانپ کھا گئے۔ یہاں تک کہ آخرکار اُسکے گناہ دُھل گئے۔ جسمانی اذیت نے

روحانی تکلیف سے اُسے نجات دی اور رزریق کو پرامن جزیرے میں جانے دیا گیا۔ جہاں سے اُسکے واپس آنے کا اُسکے اہلِ وطن زمانۂ دراز تک انتظار کرتے رہے۔

دوسرا باب

موجِ فتوحات

"اے امیرالمومنین ۔ یہ عام طور کے فتوحات نہیں ہیں یہ قیامت کے دن قوموں کے باہم ملنے سے مشابہ ہیں" موسیٰ حاکم افریقہ نے خلیفہ ولید کو فتح وادی لک کی کیفیت میں یہ مضمون لکھا تھا۔ کچھ ایسے تعجب کا مقام نہیں ہے کہ عرب اپنی فتح کے مکمل ہونے سے تحیر ہوے۔ اُن خیالی باتوں سے درگذر کرکے جن سے ہسپانیہ کے مورخوں نے رزریق کے زوال کو ہر طرف سے گھیر دیا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ تاریخی واقعہ ہے کہ فتح وادی لک نے سارا ہسپانیہ مراکشیوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ طارق اور اُسکے بارہ ہزار بربریوں نے صرف ایک جنگ کے ذریعے سے اس پورے جزیرہ نما کو جیت لیا اور جو ضعیف مزاحمتیں کہ بعض شہروں میں ابھی تک پیش آنے والی تھیں اُنکے فرو کرنے کے لیے صرف معمولی مستعدی و محلیت کی ضرورت تھی۔ اُس فاتح نے اپنی کامیابی کی تکمیل میں ذرا بھی سستی نہیں کی علی الرغم اُس حکنامے کے جو موسیٰ نے جسکو اپنے بربری ماتحت کی غیر مترقب نام آوری پر سخت حسد ہوا تھا اُسے آگے بڑھنے کی ممانعت میں لکھا تھا وہ خوش نصیب سپہ سالار بلا توقف آگے بڑھتا چلا گیا اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کرکے اُس نے جزیرہ نما میں پھیلا دیا اور تھوڑی وقت کے ساتھ شہروں کو یکے بعد دیگرے تابع کر لیا۔ اُسکے افسروں میں سے ایک شخص مغیث نامے سات سو سواروں کے ساتھ قرطبہ پر قبضہ کرنے کو بھیجا گیا۔ یہ سب چھپے رہے جب اندھیرا ہوا مغیث چپ چاپ شہر کے قریب پہونچا۔ اُولے کے طوفان نے جسکو

مسلمانوں نے قادر مطلق کی خاص مہربانی خیال کیا اُنکے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازوں کو دبا دیا۔ ایک چرواہے نے وہ جگہ بتا دی جہاں دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں اور مسلمانوں نے اُسی مقام سے حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ان میں کا ایک آدمی جو سب سے منچلا تھا انجیر کی ایک درخت پر چڑھ گیا جو دیوار کے شگاف کے نیچے اُگا ہوا تھا اور اُسپر سے دیوار پر کود گیا۔ اور وہاں سے اپنی لانبی دستار لٹکائی اور اپنے ساتھیوں کو اوپر کھینچتا گیا۔ ان لوگوں نے فوراً بے سان بے گمان محافظوں پر حملہ کر دیا۔ اور حملہ آوروں کی بڑی جماعت کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے اور ایک دو وار بھی نہ چلنے پائے کہ شہر ہاتھ آگیا۔ حاکم شہر و قلعہ دار نے ایک عیسائی خانقاہ میں پناہ لی جہاں مہینوں وہ سخت محاصرے میں رہے جب مجبور ہو کر ان لوگوں نے اطاعت قبول کی تو قرطبہ یہودیوں کی سپردگی میں دیا گیا اسلیے کہ ان لوگوں نے اثنائے جنگ میں اپنے آپ کو مسلمانوں کا جاں نثار دوست ثابت کیا تھا اور اسکے بعد سے ہمیشہ فاتحوں نے ان لوگوں کا بہت خیال رکھا مسلمانوں نے یہودیوں کو اپنا خالص دوست بنا لیا اور بہت اخیر زمانے تک اُنکو کبھی آزار نہیں دیا۔ جس طرح کہ قوطی پیشوایان مذہب اُنھیں ستایا کرتے تھے۔ جہاں کہیں شرقیوں کے اسلحہ پہونچے وہاں اُنکے پیچھے پیچھے یہودی بھی آموجود ہوے۔ جب تک عرب لڑتے رہتے تھے یہودی خرید و فروخت کرتے تھے اور جب لڑائی ختم ہو جاتی تھی تو یہودی و مراکشی و ایرانی باہم ملکر تعلیم و فلسفہ و علوم و فنون کی اُس ترقی میں مصروف ہو جاتے تھے جس نے متوسط زمانے میں شرقیین کی حکومت کو سب سے بڑھکر ممتاز بنایا تھا۔

یہودیوں کی معاونت اور ہسپانیہ والوں کی دہشت سے طارق کی ملک گیری بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ ارشید ونا بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے قبضہ میں آگیا۔ کل باشندے پہاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ ملاغہ نے خود اطاعت قبول کر لی اور البیرا (جسکے قریب اب غرناطہ قائم ہے) پر ہلہ کیا گیا۔ مرشیا کے پہاڑی دروں کی تھوڑے عرصہ تک

تھیوڈے میر نے بڑی بہادری و ہشیاری سے حفاظت کی۔ لیکن آخر کار جب وہ میدان میں نکلکر کھلی لڑائی لڑنے کے لیے حد سے زیادہ سمجھا گیا تو عیسائی فوج بالکل تہ تیغ ہو گئی۔ اور تھیوڈے میر صرف ایک شاگرد پیشہ کو ساتھ لیکر شہر اوری ہوئی لا کو بھاگ گیا۔ وہاں اُس نے اپنے تعاقب کرنے والوں کو بڑی ذہانت سے دھوکا دیا۔ چونکہ شہر میں کوئی مرد نہیں بچا تھا اسلیے کہ جوانان مرشیا میدان میں کام آ چکے تھے۔ اُسنے عورتوں کو اسپر آمادہ کیا کہ مردانہ لباس پہنیں اور خود اور نیزوں کی سی لانبی لاٹھیوں سے مسلح ہوں اور اپنے لٹکے بالوں کو ٹھوڑیوں کے نیچے لے آئیں تاکہ داڑھیاں دکھائی دیں۔ اسکے بعد اُس نے ان عجیب قلعہ داروں کا پرا فصیلوں پر جما دیا۔ اور جب دشمن شام کے سایہ میں قریب پہونچے تو فصیلوں کی ایسی عمدہ حفاظت دیکھکر بد دل ہو گئے۔ پھر تو تھیوڈے میر نے صلح کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں اور شاگرد پیشہ کو ایلچی کا چوغہ پہنا کر ساتھ میں لیا۔ اور دونوں آدمی صلح کی شرطیں طے کرنے کو دشمن کے لشکر میں پہونچے۔ مسلمان سپہ سالار مہربانی کے ساتھ ان سے ملا اور اُس نے شہزادے کو نہیں پہچانا۔ تھیوڈے میر نے کہا کہ میں اس شہر کے سپہ سالار کے پاس سے آتا ہوں تاکہ اس وضع کی شرطیں طے کروں جو آپ کی اولوالعزمی اور اُسکی عزت کے لائق ہوں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ شہر اس لائق ہے کہ آپ کے مقد محاصرے کو سنبھال سکے مگر اُسکی خواہش یہ ہے کہ اپنے سپاہیوں کی جانیں ضایع نہ کرے۔ آپ وعدہ کیجیے کہ باشندوں کو اس بات کی آزادی رہیگی کہ بلا تعرض مع اپنے اسباب کے چلے جائیں اور کل صبح کو بغیر لڑے ہوے یہ شہر آپ کے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک ایک آدمی بھی باقی رہے گا ہم آپ سے لڑیں گے۔ اُسی وقت صلح کے شرائط لکھے گئے اور جب اُس مرکشتی نے اپنی مُہر اُسپر ثبت کر دی تھیوڈے میر نے قلم لیکر اپنا دستخط کر دیا۔ اور کہا کہ۔ مجھی کو دیکھو میں ہی اس شہر کا سپہ سالار ہوں۔ صبح کو پھاٹک پھٹتے ہی کھول دیے گئے اور مسلمان سمجھے کہ ایک بڑی فوج اب باہر نکلے گی۔ مگر صرف تھیوڈے میر

اور اُسکے شاگرد پیشہ کو ٹوٹے پھوٹے اسلحہ سے مسلح نکلتے دیکھا - اور اُنکے پیچھے غول کے غول بوڑھے مرد - عورتیں - اور بچے تھے - مراکشی نے پوچھا کہ وہ سپاہی کہاں ہیں جنکو میں نے کل فصیلوں پر صف بستہ دیکھا تھا - تھیوڈے میر نے کہا کہ سپاہی تو میرے پاس ایک بھی نہیں ہے رہے میرے قلعہ دار اُنھیں اپنے سامنے دیکھ لو - انھیں عورتوں سے میں نے اپنی فصیلوں پر مورچہ بندی کی تھی اور یہ شاگرد پیشہ میرا ایلچی - محافظ - اور مصاحب ہے - مراکشی سالار فوج اس چال کی دلیری و پرذہانت ہونے سے جو اُس سے کی گئی ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے تھیوڈے میر کو علاقہ مرشیا کا حاکم مقرر کیا جو اسکے بعد ہمیشہ عربی میں ارض تھیوڈے میر کے نام سے مشہور رہا۔ اس ابتدائی زمانے میں بھی مراکشی سچی بہادری کے اصول کو جانتے اور برتتے تھے - ان لوگوں نے اسی وقت وہ استحقاق بہادر ہونے کا حاصل کر لیا تھا جس نے بعد کی کئی صدیوں تک فتحمند اہل ہسپانیہ کو اسپر مجبور کیا کہ انھیں بہادرانِ غرناطہ و شرفاء کے نام سے پکاریں -

اسی اثنا میں طارق طلیطلہ تک جو قوم قوط کا دارالسلطنت تھا بڑھتا چلا گیا - وہ قوطی امرا کی تلاش میں تھا - اُسے امید تھی کہ وہ قرطبہ میں ملیں گے - مگر وہاں سے وہ بھاگ نکلے تھے - طلیطلہ میں بھی جسکو یہودیوں نے انکے سپرد کر دیا وہ نہ ملے وہ بھاگ کر آگے چلے گئے اور استوریا کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے تھے - صرف ملکی نمکحرام خاندان وٹیزا و کونٹ یولیان کی طرح کے لوگ رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو انعام میں حکومت کے عہدے عنایت ہوئے - بقیہ امرا غائب ہو گئے اور ملک مراکشیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا - فی الحقیقت ہسپانیہ خلفاء عرب کی وسیع مملکت کا جنکا دارالخلافہ دمشق تھا اور جنکے قبضہ اقتدار میں ایسی مملکت تھی جو ہندوستان کے پہاڑوں سے لیکر ہرقل کے ستونوں تک پھیلی ہوئی تھی ایک حصہ ہو گیا - ہسپانیہ کو سکون و اطمینان کی حالت پر لانے کے لیے جو تدبیر باقی رہ گئی تھی اُسکو آکر موسیٰ نے تمام کیا اس لیے کہ جب اسکو طارق کی مسلسل کامیابیوں کی خبر ملی تو نہایت عجلت کے ساتھ اپنے عربوں کو ہمراہ لیکر آبنایوں کے پار اس غرض میں پورا حصہ لینے کے لیے

جہازوں پر روانہ ہوا۔ وہ ۷۱۲ء کے موسم گرما میں اٹھارہ ہزار آدمیوں کے ساتھ اس طرف پہونچا۔ اور کارمونا۔ سیوائل۔ دمیریڈا کو قبضے میں کرلینے کے بعد طلیطلہ میں طارق سے آملا۔ اُس فاتح اور اُسکے افسر بالادست کی ملاقات دوستانہ نہ تھی۔ طارق بڑے تزک و احتشام کے ساتھ حاکم مغرب کے استقبال کو باہر نکلا۔ لیکن موسیٰ نے اُسکو تازیانہ مارا اور اپنی ہدایتوں سے تجاوز کرنے کی علت میں اُسکی سخت زجر و توبیخ کی اور یہ کہکر کہ یہ امر محال ہے کہ ایسے بے احتیاط و تندمزاج افسر کے ہاتھ میں مسلمانوں کی جانیں دی جائیں۔ اُسکو قیدخانے میں ڈال دیا۔ جب اس حاسدانہ ظلم کی کیفیت خلیفہ ولید کے کانوں میں پہونچی اُسنے موسیٰ کو دمشق طلب کرلیا اور طارق کو پھر ہسپانیہ کی سپہ سالاری پر بحال کیا۔

مُلک شام واپس جانے سے پہلے موسیٰ نے پی رینیز پہاڑ پر کھڑے ہوکر یورپ کے فتح کرنے کا خیال دوڑایا تھا۔ اُسکے واپس بُلائے جانے نے اُسکی سبقت میں خلل ڈالدیا۔ مگر اور لوگ فوراً آگے کی طرف بڑھ چلے۔ ایک عرب حاکم نے بہت ہی ابتدا یعنی ۷۱۹ء میں قدیم فرانس کے جنوبی حصہ پر جو سپٹی مینیا کہلاتا تھا اور جس میں شہر کارکے سون و شہر ناربون شامل تھے قبضہ کرلیا۔ اور انھیں مرکزوں سے اُس نے برگنڈی اور آکوی ٹینیا میں لوٹ مچانا شروع کیا۔ یوڈس آکوی ٹینیا کے ڈیوک نے عربوں کو ۷۲۱ء میں ٹولوس کی دیواروں کے اندر کامل شکست دی۔ مگر اس سے صرف یہ ہوا کہ اُنکا رُخ اور آگے کی طرف ہوگیا۔ ان لوگوں نے شہر یون کو لوٹا۔ قوم سین سے خراج لیا۔ ۷۳۰ء میں اوگنن پر قبضہ کرلیا اور آس پاس کے اضلاع پر متعدد حملے کیے۔ شہر ناربون کے نئے حاکم عبدالرحمن نے منصوبہ باندھا کہ سارے گال (قدیم فرانس) کو فتح کرلے۔ اس نے یوڈس کی کارروائیوں کو پہلے ہی روک دیا۔ جس نے ٹولوس کی فتحیابی کے بعد یہ خیال خام کیا تھا کہ شرقیوں کے ملک میں جاکر لڑائیاں لڑوں گا اور اب اُس نے قوم بیٹرو کونے پر حملہ کیا اور دلیری کے ساتھ اکوی ٹین پر چڑھائی کی۔ دریائے گیرون کے کنارے پر یوڈس کو شکست دی۔ بورڈون کو تہ کرکے لیلیا۔ اور ۷۳۲ء میں فتمندی کے ساتھ ٹورس

کی طرف بڑھا جہاں کی نسبت اُس نے سنا تھا کہ سینٹ مارٹن کی ایبی (خانقاہ) میں خزانے ہیں۔ پوئی ٹیرس اور ٹورس کے درمیان چارلس سے مقابلہ ہوا۔ چارلس پے پن دتی بے اسٹل کا بیٹا تھا جو اُس وقت میں گویا فرانس کا بادشاہ تھا اس لیے کہ کمزور بادشاہ لوتھر میں اس قدر قوت نہ تھی کہ مجلسرا کے با اقتدار منتظم کا مقابلہ کر سکے۔ شرقیین خوشی کے ساتھ لڑنے کو گئے۔ انھیں توقع ہوئی کہ یہ دوسرا اگاڈیلیٹ (وادی لک کا میدان ثابت ہوگا اور سمجھے کہ کیلے سے لیکر مارسلس تک خوبصورت فرانس ہمارے قبضے میں آ جائے گا۔ اس لڑائی میں ایک ایسے مسئلے کا فیصلہ ہونے والا تھا جو یورپ کے لیے نہایت ہی مہتم بالشان تھا۔ اس جنگ کو جن لوگوں نے دنیا کی اُن پندرہ لڑائیوں میں سے شمار کیا ہے جن سے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا ہے اُنھوں نے بہت ٹھیک کیا ہے۔ جس مسئلے کا فیصلہ اسلحے کے زور سے ہونے والا تھا وہ یہ تھا کہ آیا یورپ عیسائی رہے گا یا مسلمان ہو جائیگا۔ یعنی آیندہ کے لیے آیا فرانس کی قومی عبادت گاہ مسجد ہوگی یا گرجا۔ اور شاید یہ بھی کہ انگلستان میں سینٹ پال (پولوس مقدس) کے گرجا میں جب وہ بنجائے عیسیٰ مسیح کے گیت کی آواز گونجے یا اسلام کی نماز پڑھی جائے۔ اگر شرقیین ٹورس میں روکے نہ جاتے تو کوئی وجہ یہ قیاس کرنے کی نہیں ہے کہ وہ انگلش چینل کے پاس ٹھیر جاتے۔ لیکن جیسا کہ قسمت نے فیصلہ کر دیا تھا اسلامی حملے کا طوفان اپنے انتہائی حد تک پہونچ چکا تھا۔ عنقریب اُس میں جزر آنے والا تھا۔ چارلس اور اُسکے فرنگی رومی نما اہل اسپین اور قوط کی طرح کوئی نامرد قوم نہ تھے۔ بدرجۂ اقل وہ ویسے ہی مضبوط و بہادر تھے جیسے خود مراکشی۔ اور اُنکے شاندار قد و قامت سے اُنھیں ایسی فوقیت حاصل تھی جو اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چھ دن جزوی لڑائیوں میں بسر ہوئے اور ساتویں دن عام جنگ کی نوبت آئی۔ چارلس بے روک قوت کے ساتھ مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا دائیں بائیں ایسے بھاری ہاتھ لگاتا چلا گیا کہ اُسی دن سے اُسکا نام چارلس مارٹل (یعنی ہتوڑے کی ضربت) پڑ گیا۔ اُسکے فرنگی سپاہیوں نے جو اپنے سردار کی ایسی بہادری

دیکھی تو جوش میں بھر گئے اور پامال کردینے والی قوت کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور مسلمانوں کی پوری صف نہایت ابتری سے بھاگ گئی۔ اس جگہ کا عرصہ دراز تک اُندلس میں ہیبت و خوف کے ساتھ "فرشِ شہدا" نام مشہور رہا۔

مغربی یورپ کا خطرہ تو ٹل گیا۔ یہ مصیبت ایسی مغلوب کرنے والی تھی کہ اُندلس کے مسلمانوں نے اُن تمام صدیوں کے اندر جن میں وہ جنوب پر حکمراں رہے پھر کبھی فرانس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ کچھ زیادہ عرصے تک (یعنی ۹۷۵ء تک) نوربون اور اُن اضلاع پر جو کوہ پیرینیز کے شمالی دامن کے کنارے واقع ہیں ان لوگوں نے قبضہ باقی رکھا۔ اور نیز یہ بھی جرأت کی کہ پڑوسیوں پر لوٹ کھسوٹ کے حملے کیے۔ مگر اُنکے حوصلے یہیں تک تھمے رہے۔ ٹورس کی لڑائی نے ہمیشہ کے لیے فرانس کی خود مختاری کو سنبھال لیا اور فتوحاتِ اسلامیہ کی حدبندی کردی۔ سمندر کے اُونچے اُٹھنے والے جوار بھاٹے کی طرح مسلمان خشکی میں چل نکلے تھے اور اب فرنگیوں کے ہتوڑے کے ذریعہ سے یہ صدا بلند ہوئی کہ "یہاں تک تو تو آئے گا مگر آگے نہیں۔ اور یہیں تیری مغرور موجیں ٹھیر جائیں گی"۔

اِدھر کا تو یہ حال ہوا اور اُدھر بادشاہانِ فرانس کے قلب پر اپنے مسلمان پڑوسیوں کی جرأت کا ایسا سکّہ بیٹھا کہ گو وہ بھی وقتاً فوقتاً غارت گری کے حملوں سے دل بہلایا کیے، لیکن صرف ایک ہی مرتبہ اُندلس کو تابعِ فرمان کرنے کی کوشش کی۔ شارلیمن سکندرِ ثانی بھی اطمینان کے ساتھ یہ خیال دل میں نہ لا سکا کہ پیرینیز کے دوسری جانب کو مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار سے باہر نکال لے۔ نیکو کار عیسائی ہونے کی حیثیت سے اُس پر واجب تھا کہ کافروں (مسلمانوں) کی بیخ کنی کرے اور شہنشاہ ہونے کے اعتبار سے اندلس کی خود مختار سلطنت کا وجود اُسکی توہین کا باعث تھا۔ لیکن آخر کو اُسے موقعہ ہاتھ آیا۔ وہ موقعہ یہ تھا کہ خاندان بنی اُمیہ میں سے اوّل اُندلسی شہزادہ کی تخت نشینی نے اُن گروہوں کی آتشِ عداوت

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد
- البرامکہ

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- تمدن عرب (ترجمہ)
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ سیو تھیونو

ڈاکٹر اقبال
- لمعات بیضا
- شمع و شاعر
- بلال
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالۂ یتیم
- فریاد امت
- تصویر درد
- مکمل ترانہ

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد مجلد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- اسلام کی دنیوی برکتیں
- حضرت سلیمان
- حضرت ہاجرہ
- حقیقۃ السحر
- ریڈیٹ قرآن
- احسان عام

حاجی اسمٰعیل خاں
- فلاح دارین
- حالات زمین
- تربیت الدجاج
- غذا و صفا
- نظم نعت

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابوالبشر
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- قوت خیال
- اصول نانا داری ۳ حصہ

مولوی حبیب الرحمن خاں
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- ذکر الحبیب
- ذکر جمیل

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب تعدد
- لکچر
- شرح قانون شہادت

سید راحت حسین
- الثمر
- النحل

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- و کرم اردو سی

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد
- تاریخ پٹیالہ

مسٹر ظفر علی خاں
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد
- خیابان فارس
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- فداجگ روس و جاپان
- فلسفہ ابن سینا
- معاشرت

منشی سید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- حیات صالح
- نساء المسلمین
- آثار خیر
- امرائے ہنود

مسٹر ظفر عمر
- مستقبل اسلام
- پولیس مین
- نیلی چھتری

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ بالتصویر
- [illegible] بالتصویر
- روزنامچہ
- تسخیر مہر و قمر
- رسول کی عیدی
- پیاری تنکڑی
- اتالیق خطوط نویسی
- گاما خاتون
- اسلام کا انجام
- بیوی کی تعلیم
- انتخاب توحید
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں
- فلسفۂ شہادت
- غدر دہلی کے افسانے
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- جگ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- اسرار
- کم ٹو موت
- سیر دہلی

مولانا راشد الخیری
- طوفان حیات
- سراب مغرب
- الزہرا
- ستارۂ صبح [illegible]

مولانا اشرف علی
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب
- تعلیم الدین
- اکسیر فی اثبات التقدیر
- الانتباہات المفیدہ
- اصلاح الرسوم
- کلید مثنوی ۲ حصہ
- مناجات مقبول
- امداد الفتاویٰ ۲
- فتاویٰ اشرفیہ
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- جزاء الاعمال
- فروع الایمان
- التکشف ۵ حصے
- اصلاح ترجمۂ دہلویہ

حکیم محمد علی خاں
- [illegible] دل
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] کا سانپ
- [illegible]
- [illegible] کال

مولوی بشیر الدین احمد
- [illegible]
- [illegible] جلد
- نشاط عمر
- [illegible] پری
- [illegible] دلہن
- حسن معاشرت

نیاز فتح پوری

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- ایک شہر کا انجام
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- عائشہ صدیقہ
- والصدیق
- بنات بھاشا
- المرتضیٰ

سیماب اکبرآبادی
- سیاحت ہند مجلد
- عربی بول چال ۲ حصہ
- کتاب الصرف
- کتاب النحو
- ثبت الرسول
- جام کوثر
- بہشتی جھومر

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- لغات جدیدہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد

مولوی مصباح الدین احمد
- الہارون
- فردوس و [illegible]
- مصباح الادب

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین
- عصر قدیم
- دولت ہسپانیہ اسلامیہ
- حروب صلیبیہ
- تاریخ سندھ
- قرۃ العین
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- ملکہ زنوبیہ
- الحکم الرفامیہ
- آغائی صاحب
- سکینہ بنت حسین
- مقدمات مجلد
- تذکرہ مشاہیر عالم
- درگیش نندنی
- حسن بن صباح
- افسانہ قیس
- مقدس نازنین
- قیس و لبنیٰ
- ایام عرب
- حسن انجلینا
- میوۂ تلخ
- خمیدہ فا
- دلکشن
- دلچسپ کامل
- شوقین ملکہ
- فتنہ عذرا و رضیا
- ...انجمہ
- زبادہ و حلاوہ
- روبینہ ہلکری
- فلورا فلورنڈا
- زمانہ اور اسلام
- دس برس
- آغاصادق کی شادی
- ... الفانسو کی مصیبت
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- خوفناک محبت
- الفانسو
- فلپانا
- فاتح مفتوح
- ہندوستانی موسیقی
- سرسمرکی زنی بریٹیں
- جویائے حق
- بابک خرمی
- فتح اندلس
- اردو کا کلاسیکی ...
- میوۂ تلخ

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین — ۶ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- کایا پلٹ — ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو
- پچھڑی دلہن
- سیرکہسار
- کرم دھم
- پی کہاں
- کامنی
- جام سرشار
- خدائی فوجدار
- فسانۂ آزاد
- سیر کہسار

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنالنی
- مارا تیما
- بنگالی دولہن
- پرتاب
- معشوق غرب
- بروگ
- آنتیلو

مرزا محمد ہادی رسوا
- امراؤ جان ادا — ۱۲ر
- لیلے مجنوں
- نوبہار

جلال مرحوم
- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۶ر

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق — ۸ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- عالم خیال — ۸ر
- سیکفرد لوسی

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ
- مرقع اودھ

مسٹر عبدالماجد
- تاریخ اخلاق یورپ مجلد
- فلسفہ جذبات
- فلسفہ اجتماع
- مغذائے انسانی
- فلسفہ کی تعلیم
- اردو وشیاں (ڈرامہ)

مسٹر انیس احمد عباسی
- اجرہ کی کامیابی
- بحری جنگ

مولانا عبدالشکور
- اسدالغابہ ۵ جلد
- علم الفقہ ۲ حصے

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام حصہ اول
- ایضاً حصہ دوم — ۱۲
- فن ہیئت — ۸ر
- فن کیمسٹری — ۶ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو

منشی عاشق حسین
- مشتاق و زہرہ
- افشائے راز
- مظفر و رابابائی
- سلطنت ... کا دام حصہ
- شادی و غم
- تارا ۲ حصے

وحشی نگرامی
- محبوب کشت
- خون آرزو
- خواب عبرت
- معشوق عرب
- جفائے ناز

مسٹر حسین قدوائی
- ذکر طیب محمد عربی
- مشیر
- عرض حال
- جذب دل
- حاکم و محکوم

منشی سعید احمد ناطق
- خون عاشق
- انجمن آرا
- مسافر و مشفق
- اسمٰعیل و زہرہ
- امرفر ... زاہوکی
- مجموعۂ ...
- شہرت شاہ لیلیٰ

شیخ احمد علی کامل
- ...
- بابی
- گلشن
- دو پھول

متفرق کتابیں
- واقعات ...
- جمیلہ کی ناکامیابی
- جواہر التفاسیر
- خیالات آلیان
- خواب گلکنہ
- نشتر عشق شعر

انڈین بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۸ ۷ ۴

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰	یکم اپریل سنہ ۱۹۱۸ ع	جلد ۱۸

الناظر پریس، چوک، لکھنؤ

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اُردوی معلّٰی — [illegible]
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلیٰ — [illegible]
- مع شرح نظم طباطبائی — [illegible]
- مع شرح حسرت موہانی — عہ

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید مجلد — [illegible]
- یادگار غالب — [illegible]
- حیات سعدی — [illegible]
- مضامین حالی — [illegible]
- ضمیمۂ کلیات حالی — ۱۲ر
- مجموعہ نظم حالی — ۱۲ر
- مسدس حالی — [illegible]
- شکوۂ ہند — ۰۲ر
- مثنوی حقوق اولاد — ۲ر
- رباعیات حالی — ۲ر
- قطعات حالی — ۸ر
- مرثیۂ مرزا غالب — ار
- بیوہ کی مناجات — ۲ر
- الدین یسیر — ۳ر
- تحفۃ الاخوان — ۵ر
- رحم و انصاف — ار
- چپ کی داد — ار
- ننگ خدمت — ار
- شیخ و بلیک (؟) کا مناظرہ — ار
- حب وطن — ار
- تعصب و انصاف — ار

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد — [illegible]
- تفسیر القرآن (۷ جلد) — ۱۰ر
- تبیین الکلام (۲ جلد) — [illegible]
- آثار الصنادید — [illegible]
- خطبات احمدیہ — عہ
- کل مجموعہ لکچر (مجلد) — [illegible]
- سیرۃ فریدیہ — ۱۰ر
- اسباب بغاوت ہند — ۲ر
- مقالات سرسید — عہ
- آخری مضامین سرسید — [illegible]
- النظر فی بعض مسائل — ۱۲ر
- تحریر فی اصول التفسیر — ۸ر
- احکام طعام اہل الکتاب — ۲ر
- ترقیم فی قصہ اصحاب کہف — ۲ر
- ابطال غلامی — عہ
- ازالۃ الغین — ۵ر
- تفسیر السمٰوات — ۸ر
- جواب امہات المومنین — ۴ر
- الدعا والاستجابۃ — ۳ر
- کاشنش — ار
- ایک نادان خدا پرست — ار
- انشاء اللہ — ا
- لکچر اسلام — ۲ر
- خلق الانسان — ۲ر
- الجن والجان — ۵ر
- سفرنامہ پنجاب — عہ
- ....
- ....

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد — [illegible]
- ” ” خفی — [illegible]
- ترجمۃ القرآن متوسط ” — [illegible]
- ترجمہ حمائل بغیر متن ” — [illegible]
- ادعیۃ القرآن — ۲ر
- ۲۰ سورہ — ۸ر
- مطالب القرآن — عہ
- الحقوق والفرائض — [illegible]
- اجتہاد — عہ
- امہات الامہ — ۱۲ر
- مرأۃ العروس — ۹ر
- بنات النعش — ۷ر
- توبۃ النصوح — ۷ر
- چند پند — ۴ر
- منتخب الحکایات — ۴ر
- مبادی الحکمہ — ۸ر
- موعظہ حسنہ — ۱۰ر
- ابن الوقت — عہ
- ایامیٰ — ۲۴ر
- فسانۂ مبتلا — عہ
- لکچروں کا مجموعہ — عہ
- لکچر نمبر ۲۳ و ۲۴ — ۳ر
- لکچر نمبر ۲۶ معہ تقریر سید — ۴ر
- لکچر تنبیہ — ۴ر
- لکچر تعلیم — ۰۲ر
- مجموعہ نظم بے نظیر — عہ

مولانا آزاد مرحوم

- آبحیات — [illegible]
- دربار اکبری — [illegible]
- سخندان فارس — [illegible]
- نیرنگ خیال — ۵
- نظم آزاد — ۱۰ر
- قند پارسی — ۱۰ر
- قصص ہند — ۶ر

مولانا ذکاءاللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — [illegible]
- تاریخ عہد سلطنت ملکہ معظمہ — [illegible]
- سوانحعمری ملکہ معظمہ — [illegible]
- کرزن نامہ — عہ
- فلسفۂ اشال — ۸ر
- محاسن الاخلاق — [illegible]
- تہذیب الاخلاق — ۱۰ر
- صحیفۂ فطرت — [illegible]
- تقویم اللسان — ۴ر
- تعلیم الانتظام — ۴ر
- جغرافیہ ریاضیہ — عہ
- رسالہ علم ساحت — ۱۳ر
- معاون الحساب — عہ
- ساحت خرد — ۶ر
- محاربات عظیم — عہ
- عجائب الحساب — ۸ر
- رسالہ علم مناسب — ۳ر

مولانا شبلی مرحوم

- موازنۂ انیس و دبیر — [illegible]
- الفاروق — [illegible]
- الغزالی — [illegible]
- المامون — [illegible]
- سیرۃ النعمان — [illegible]
- سوانحعمری مولانا روم — [illegible]
- بیان خسرو — ۱۰ر
- علم الکلام — [illegible]
- الکلام — [illegible]
- سفرنامہ مصر و روم و شام — [illegible]
- رسائل شبلی — عہ
- مقالات شبلی — [illegible]
- مضامین عالمگیر — ۱۰ر
- شعرالعجم جلد اول — [illegible]
- ” جلد دوم — [illegible]
- ” ” سوم — [illegible]
- ” ” چہارم — [illegible]
- مثنوی صبح امید — ۴ر
- آغاز اسلام — ۱۲ر
- کتبخانہ اسکندریہ — ۵ر
- اسلامی حکومت — ۲ر
- زیب النسا — ار
- جہانگیر — ۲ر
- مجموعہ نظم اُردو — ۸ر
- دیوان شبلی فارسی — ۸ر
- بوئے گل — ۴ر
- دستۂ گل — ۴ر
- برگ گل — ۴ر

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — [illegible]
- مسلمانوں کی تہذیب — ۴ر
- مکاتبات الخلان — [illegible]
- تقلید و عمل بالحدیث — ۸ر
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب — ۸ر
- کتاب المحبت والشوق — ۸ر
- فطرت اور قانون فطرت — ۳ر
- اسلام — ۲ر
- آیات بینات جلد — [illegible]
- مجموعہ لکچر مجلد — [illegible]

مولانا شہری مرحوم

- حیات انیس — [illegible]
- ایشیائی شاعری — عہ
- ادیب — ۸ر
- دُرِّ شاہوار — ۸ر
- نورجہاں — ۸ر
- ٹیپو سلطان — ۸ر
- حیدر علی سلطان — ۱۲ر
- اُردو کا گلدستہ — ۴ر
- اُردو کی ڈالی — ۳ر
- قومی نظم — ۴ر
- مرقع تاجپوشی — عہ
- رہنمائے حیدرآباد دکن — ۸ر
- مکالمہ مرد و عورت — ۳ر
- حیات جاودانی — ۸ر
- سوانحعمری نظام حیدرآباد — ۱۴ر

النّاظر ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

رموزِ بیخودی

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی دو سال ہوئے چھپی تھی اور گو فارسی زبان کا مذاق کم ہو گیا ہے تاہم اسے پبلک سے خلعت قبول حاصل ہوا۔ رموزِ بیخودی اُسکا دوسرا حصہ اب تیار ہوا ہے جسے احیاے ملت اسلامیہ کے لیے بمنزلہ اکسیر نسخۂ کیمیا کے سمجھنا چاہیے زبان فارسی میں قلم ہندی کی روانی کا تماشا دیکھنا ہو یا جذبات قومی و حیاتِ ملی کے بحرِ ذخار میں تخیل کی طغیانی کا نظارہ کرنا ہو تو رموزِ بیخودی مطالعہ فرمائیے۔

اقبال کی شاعری کا تعارف کرانا اسی طرح شیوا ہے جس طرح لطف شراب سے کسی کو آگاہ کرنا۔ جسے شوق و ولولہ ہو یا ہمت و حوصلہ آئے اور اپنے کام و دہن کو اس مئے ارغوانی سے لذت آشنا کرے۔ قیمت (اس کلام کی نہیں بلکہ کاغذ اور چھپائی کی) ۸ آنہ

اکبری اقبال

یہ اشعار نہیں بلکہ اقبال کے خوان دل کی پکوڑیاں ہیں جو انجمن حمایت الاسلام کے گزشتہ اجلاس میں حاضرین کی ضیافت طبع کے لیے حضرت اقبال نے پیش کی تھیں۔ چونکہ یہ جملہ اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں ہیں اس وجہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے جنہوں نے اسپر تمہید لکھی ہے اس کا نام اکبری اقبال رکھا ہے۔ آخر میں قبول اقبال ایک "ترانہ" بھی ہے جو عام طور پر مسلمان نوجوانوں اور خاص [illegible]

صبح زندگی

مولانا راشد الخیری کا جواب افسانہ جسکے لیے ایک عرصہ سے شائقین چشم براہ تھے اب دوبارہ چھپکر آگیا ہے۔ جن لوگوں نے شام زندگی کا مطالعہ کیا ہے اُنکے لیے اسکا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ قیمت ۱۲

مجموعۂ کلام شبلی

مولانا شبلی کے اردو کلام کے بعض مختصر مجموعے پیشتر چھپکر مقبول ہو چکے ہیں۔ اب الناظر کمپنی نے ایک مجموعہ چھاپا ہے جو نہ صرف سابقہ مجموعوں سے نظموں کی تعداد اور حجم کے لحاظ سے افضل ہے بلکہ جملہ اصنافِ کلام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک حد تک مکمل مجموعہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ قیمت ۱۰

شعر العجم

جلد دوم بھی خدا خدا کرکے اب تیار ہے۔ شائقین منگائیں۔ قیمت ۲

موجِ زمزم

جناب آغا حشر صاحب مشہور ڈراما نویس کی نعتیہ نظم۔ جو گذشتہ اجلاس انجمن حمایت الاسلام میں پڑھی گئی تھی۔ قیمت ۳

دیوان حسرت موہانی حصہ چہارم

یہ انجمن ترقی اردو [illegible] کا [illegible] ہیں۔ قیمت [illegible]

قابل دید کتابیں

ترکوں کی معاشرت

یہ لاجواب کتاب خان صاحب منشی محمد حسن خاں صاحب مترجم ترک عبد الرحاق نے ہز ایکسلنسی خالد خلیل ایم اے جو جنگ سے پہلے بمبئی میں ترکی قنصل تھے کی کتاب "سوسہ ویلی آئی آف دی ٹرک" سے ترجمہ کی ہے اور متعدد حواشی اور ایک قابل قدر دیباچہ اضافہ کرکے کتاب کی قدر و قیمت دوبالا کردی ہے خصوصاً دیباچہ میں مسئلہ تعلیم و آزادی نسواں کا اثبات بیدہ عقلی و نقلی دلائل سے نہایت مشرح و مدلل بحث کی ہے قیمت عہ

شعر العجم

(از شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم)

فارسی شاعری کی تاریخ، جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور انکی خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ تمام مشہور شعرا کا مفصل تذکرہ اور انکی شاعری پر تقریظ و تنقید ہے۔

حصہ اول - عباس مروزی سے نظامی تک عہ

حصہ دوم - خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک عہ

حصہ سوم - فغانی سے ابوطالب کلیم تک عہ

حصہ چہارم - اس حصہ میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا، اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا اور کیا کیا تغیرات پیدا کیے۔ اسکے ساتھ ہر دور کی خصوصیات کی تشریح اور شاعری کے تمام انواع پر مفصل تقریظ اور تنقید ہے۔ - - - - عہ

جلد پنجم ایڈیشن عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا صرف حصہ سوم سنہ ۱۹ء میں دوبارہ شایع ہوا تھا۔ اب خاص اہتمام کرکے جدید حصص تیار کیے گئے ہیں (حصہ اول و دوم الناظر پریس میں چھپے ہیں) ارباب ذوق جو مکمل کتاب کے دیرینہ خواہشمند تھے جلد سے جلد منگائیں۔

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

ہاجرہ

یہ ناول ایک نوجوان ترکی خاتون نے "عدالت" کے فرضی نام سے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ منشی محمد حسن خاں صاحب نے اسے بڑی قابلیت کے ساتھ اردو کا لباس پہنایا ہے - جب یہ کتاب چھپی ہے تو مولانا حالی مرحوم نے حسب ذیل الفاظ میں اظہار رائے فرمایا تھا

"میں سید صاحب مرحوم کی لائف لکھ رہا ہوں اور وہ قریب الاختتام ہے اسلیئے مجھے بالکل ہاجرہ کے دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ اسکے سوا ناول دیکھنے کا مجھے شوق بہت کم ہے - باوجود اسکے جس روز یہ کتاب میرے پاس پہونچی اسی روز ایک ہی نشست میں میں نے سب کام چھوڑکر اسکے ۸۰ صفحے دیکھے پھر اور کاموں میں مصروف ہوگیا کل اسکے دیکھنے کا پھر موقع ملا یہاں تک کہ جبتک اسکو ختم نہیں کرلیا دوسرا کام نہیں کیا۔ فی الواقع وہ ایسا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد اسکے چھوڑنے کو ہرگز نہیں جی چاہتا - اور چونکہ آپ نے ترجمہ بھی بہت صاف اور عمدہ کیا ہے اسلئے اسکے پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی اس سے بڑھکر کسی کتاب کی نسبت کیا کہا جا سکتا ہے - قیمت عہ

خوشخبری ترکوں کی معاشرت اور ہاجرہ دونوں کے صرف [illegible] مل سکتے ہیں - شائقین جلد منگالیں۔

فن شاعری

۱۲۸ صفحے ۔ قیمت عہ

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے رشحات قلم کا غلغلہ اخبار اور رسالوں کے ناظرین کے لیے اس قدر عام ہے کہ یہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ یہ کتاب صاحب موصوف کی تصنیف ہے جسمیں شاعری پر باعتبار فن اور اپنے خیالات کے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۔ کتاب ۱۹۰۵ء میں چھپی تھی اب صرف چند ہی نسخے رہگئے ہیں لہذا شائقین جلد منگالیں۔

خیالات

۱۸۸ صفحے قیمت عہ

یعنی مرزا سلطان احمد صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور رسائل مخزن۔ دکن ریویو زمانہ۔ اردوئے معلی علیگڈھ منتھلی۔ تہذیب۔ عصر جدید وغیرہ میں شایع ہوتے تھے۔ مطبوعہ ۱۹۰۸ء تھوڑے ہی نسخے مل سکتے ہیں۔

اشتال

۳۱۴ صفحے قیمت عہ

اس کتاب میں مرزا صاحب نے ضرب الامثال پر فلسفیانہ رنگ میں

بحث کی ہے اور پنجابی اور اردو زبان میں جو نسبت ہے اسے بھی واضح کردیا ہے ۔ اور آخر میں سو صفحے پر پنجابی مثلیں مع اردو ترجمہ کے درج کی ہیں ۔ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے خاصکر قابل قدر ہے جو علم اللسان کا ذوق رکھتے ہیں اور اردو زبان کو اس ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کرانے کی آرزو رکھتے ہیں ۔

فنون لطیفہ

۲۳۲ صفحے ۔ قیمت عہ

مرزا صاحب کی یہ تصنیف اُردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جسمیں فنون لطیفہ کی ماہیت حسن یا خوبصورتی کا فلسفہ ۔ حُسن کے مدارج و اقسام ۔ شاعری ۔ اُسکی حقیقت ۔ اُسکی تاریخ اور اُسکے ماخذات و محرکات ۔ موسیقی ۔ اُسکے اثرات اور اُسکا فلسفہ اور مختلف اقوام میں اسکے رواج فن تعمیر ۔ سنگ تراشی اور مصوری وغیرہ پر بتفصیل بحث کی گئی ہے ۔ اور تمام قدر دانان فنون لطیفہ کیلئے خاص طور پر ملاحظہ کے لائق ہے ۔

زود پشیماں ۔ مسٹر عبدالماجد بی اے کا قابل دید ڈراما جسکا حصہ نظم بھی تمامتر صاحب موصوف کی فکر رسا کا نتیجہ ہے ۔ قیمت ۸

بادشاہ بنا چاہتے ہو یا ولی

یہ لاجواب کتاب ترجمہ ہے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر تصنیف **سرمکنون** کا۔ حضرت حجۃ الاسلام نے اس میں وہ تمام وسائل رقم فرمائے ہیں جنکے ذریعے سے ایک ناتوان و پراگندہ دل شخص ظاہری و باطنی ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہونچ جائے ۔ امام صاحب نے ہمت و جرأت ، عزم و استقلال ۔ شجاعت و حوصلہ مندی کے واقعات تاریخی و حکایات لطیفہ سے اس کتاب کو ایسے اسلوب سے مزین کیا ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے پڑھنے والے کے دل میں امید و اُمنگ کی موج دوڑ جاتی ہے ۔ پھر بادشاہ سے لیکر علما ۔ افسران فوج ۔ مزارعین صناع اور رعایا کے دوسرے کُل طبقوں تک کے فرائض و تعلقات پر بحث کرکے علم کیمیا و موسیقی کے حقائق ۔ طب کے نادر نسخہ جات اور بعض ادویہ کے خواص ۔ سحر اور طلسم کی حقیقت ۔ روح کی ماہیت اور دیگر روحانی کیفیات کو بیان فرماکر آداب مجلس ۔ تہذیب نفس ۔ موت ۔ حشر ۔ احوال باطنی کی اصلاح اور مدارج نبوت و سعادت لکھکر مجاہدات و زہد و تقویٰ و مکاشفات و اسرار الٰہی پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور آخر میں رسالت و کہانت ۔ سحر و کرامات ۔ معجزات و نیرنجات میں فرق کرنے کے طریقے بتائے ہیں غرضکہ ساری کتاب علوم و معارف کا ایک گنجینہ ہے ۔ قیمت عہ

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

تذکرۃ الاصفیا

یعنی حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی لاجواب کتاب تذکرۃ الاولیا کا اُردو ترجمہ۔ حضرت امام جعفر صادق۔ حضرت اویس قرنی۔ حضرت حسن بصری حضرت ابراہیم ادہمؒ۔ حضرت ذوالنون مصری۔ حضرت بایزید بسطامیؒ۔ حضرت سفیان ثوریؒ حضرت معروف کرخیؒ۔ حضرت سری سقطیؒ حضرت جنید بغدادی۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ وغیرہ جملہ ۹۶ اولیائے کرام کے تذکرے درج ہیں حجم ۵۰۰ صفحے۔ قیمت ۵ر

سبیل النجات

یہ ابن قیم علیہ الرحمہ کی کتاب الصلوٰۃ کا ترجمہ ہے جس میں امور ذیل پر بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے۔ (۱) جو شخص دانستہ نماز کو چھوڑ دے اُسکا قتل واجب ہے یا نہیں۔ (۲) اگر قتل کیا جائے تو اسپر مرتد کا حکم لگایا جائے اور اسکی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں۔ (۳) کیا بے نماز کے سب اعمال ضائع ہو جاتے ہیں (۴) کیا دن کی نمازوں کو قبول ہوتی ہے یا نہیں (۵) کیا جماعت پر قادر شخص کی نماز بے جماعت جائز ہے (۶) کیا ترک جماعت سے گناہ لازم آتا ہے (۷) کیا نماز کے لیے مسجد میں حاضری شرط ہے (۸) جو نماز کے رکوع و سجود اچھی طرح ادا کرے اسکے لیے کیا حکم ہے (۹) حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی تھی (۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کل نمازوں کی کیفیت اور تحقیقیں۔ اسکے علاوہ اس بارہ میں بھی نہایت لطیف بحث کی گئی ہے کہ صرف کلمۂ طیبہ پڑھنے سے انسان مسلمان

مدینہ کانفرنس

دسویں صدی ہجری کے آخر میں مختلف بلاد و امصار کے تیس علمائے کرام نے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل پر غور و بحث کرنے اور انکی فلاح و بہبود کی تدابیر سوچنے کی غرض سے مدینہ منورہ میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی تھی جسکی روداد کا ایک نسخہ بزبان عربی خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے ہاتھ لگا۔ صاحب مشہور نے علم دوستی اور محبت قومی کی وجہ سے اُس کا ترجمہ مدینہ کانفرنس کے نام سے اُردو میں ہو گیا ہے۔ جس کے شروع میں صاحب موصوف نے ایک تبصرہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب جملہ درد مندان و بہی خواہان اسلام کے ملاحظہ کے قابل ہے۔ کیونکہ چند ایرانی علمائے عظام نے بتائی ہیں اگر انپر آج بھی مسلمان عمل کرنے لگیں تو دنیائے اسلام کی کایا پلٹ جائے اور موجودہ دورِ تنزل کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ قیمت عہ ر

ہو سکتا ہے یا اور اعمال کی بھی ضرورت ہے قیمت ۹ر

آیات اللہ الکاملہ

کتاب حجۃ اللہ البالغہ عربی زبان میں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی مشہور تصنیف ہے۔ جسمیں اسلامی شریعت کے مسائل مدلل طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں اس طرز تصنیف کے بانی حضرت امام غزالی اور خاتم شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی پروفیسر عربی علیگڈھ کالج نے اسکا ترجمہ نہایت خوبی اور اعتنا سے کیا ہے اور دیباچہ میں مصنف علیہ الرحمہ کے حالات اضافہ کر دیے ہیں۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۶۲۰ صفحہ پر نہایت صفائی کے ساتھ چھپی ہے قیمت مجلد ہے ۴ر

کارنامۂ ترک

شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے دولت عثمانیہ کی تاریخ موسومہ آقوم ترک کو علیگڈھ کے بعض تعلیم یافتہ نوجوانوں کی امداد سے اُردو کا لباس پہنایا ہے حصہ اول میں امیر عثمان سے سلیمان اعظم تک کے عہد کی تاریخ آگئی ہے۔ اور فاضل مترجم نے ہر عہد کا ایک نقشہ مرتب کر کے اضافہ فرمایا ہے۔ جس سے مقامات کی توضیح اور سلطنت کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے قیمت عہ ر

میلاد ابن جوزیؒ

مع ترجمہ اُردو۔ جسمیں ولادت و حالات از روئے حدیث و معتبر کتب سیر لکھے گئے ہیں۔ قیمت ۴ر

سفرنامہ شاہ ایران

ناصرالدین شاہ ایران نے اپنی سیاحت یورپ کے حالات قلمبند کیے تھے جو اس قدر دلچسپ اور پر از معلومات ہیں کہ مختلف زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ اردو کا ترجمہ مولوی فرخی صاحب اُستاد نواب رامپور نے کیا ہے جو قابل دید ہے قیمت مجلد ۱۲ر

چین اور چینی

اس رسالہ میں ملک چین کے حالات اور چینی باشندوں کے معاشرتی رسوم وغیرہ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مولفہ منشی محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس قیمت ۸ر

یادگار شرر

منشی ارتضا علی علوی شرر کاکوروی کا مجموعہ نظم جسمیں حسب ذیل نظمیں ہیں مسدس قومی۔ خواب عبرت پیاری بہاریں جیسے نگلوں۔ سہانی شام خصت بہار امید۔ اظہار محبت۔ عشق و فرض شناسی۔ ستاروں کی روشنی دوشیزگی نغمہ عشق وغیرہ۔ قیمت ۵ر

اخلاق محمدی

یہ کتاب اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہے جس سے تمام مسلمان اپنی زندگی کو سنت نبوی اور اسوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے دوسرے نام تاریخ تقویم الاخلاق کے لحاظ سے بھی اہم ثابت ہے۔ روزانہ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ صحیحہ جمع کی گئی ہیں کھانا پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا پہننا اوڑھنا۔ ملاقات۔ حقوق و فرائض۔ غرض جملہ امور کے متعلق قرآن و حدیث کی ہدایت موجود ہے۔ اسکو پڑھکر ہر انسان راہ ہدایت پا سکتا اور ہر مسلمان اپنی زندگی طریق سنت پر لا سکتا ہے۔ کتاب کی اصلی خوبیوں کا تصور صرف اسکے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ قیمت (حصہ اول و دوم) ہر

مختارات الصوفیہ

مذکورہ بالا کتاب (جو عربی زبان میں ہے) اُسی کا یہ کتاب اُردو ترجمہ ہے۔ مسلمان ہر پیر بنجانے والے شخص کے نہایت آسانی سے گرویدہ اور اُسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسلیے اس کتاب کا ہر مسلمان کے مطالعہ سے ایکبار گذر جانا ضروری ہے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ اس لباس میں آدم رو بہت سے ابلیس پھرتے ہیں باید داد دست۔ کتاب کی زبان نہایت عام فہم ہے جس سے معمولی استعداد کے لوگ بھی بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتاب واقعی اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اسے خود پڑھے اور دوسروں کو سنائے اور سمجھائے۔ قیمت ۱۲ر

ازواج الانبیا

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جملہ انبیائے کرام کی ازواج مطہرات کے حالات۔ اردو کیا معنی فارسی عربی میں بھی اس سے قبل کوئی تذکرہ اس نوعیت کا موجود نہ تھا۔

قیمت ۱۲ر

الدر النظیم فی خواص القرآن العظیم

خداوند کریم جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں جو عجیب و غریب برکتیں ودیعت کی ہیں منکرین اور متشککین انکا اقرار نہیں کرتے لیکن جملہ دیندار مسلمانوں کو اس پر یقین واثق ہے۔ پھر انہیں افسوس ہے کہ اس دور ضلالت میں عام مسلمان جھوٹے اور مصنوعی تعویذوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اصل کلام الٰہی کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

اس رسالہ میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے خواص القرآن والسعد اور قاضی ابوبکر داغستانی کے برق اللامع والغیث الہامع کو یکجا کردیا ہے اور دونوں مسلمہ طور پر خواص و اسرار قرآن شریف میں بے مثل ہیں۔ حاجتمندوں کو اور نیز انکو جو دوسروں کی خدمت پر مامور ہیں اس قابل قدر رسالہ کو حرز جان بنانا چاہیے۔ قیمت ۱۲ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۱۰ | یکم اپریل سنہ ۱۹۱۸ء

سوانح انیس

سینٹ جانس کالج آگرہ کے طلبا نے زبان اُردو کی ترقی میں سعی کرنے کے لیے ایک انجمن قائم کر رکھی ہے۔ یہ مجلس ہماری انجمن ترقی اُردو کی شاخ قرار دی گئی ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ایک مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں حسب ذیل عنوانات پر مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی تھی:

۱ - زبان اُردو

(الف) اُسکی ابتدا

(ب) اُسکی ترقی کے مختلف دور، ان اسباب کے جو اُسکے باعث ہوے۔

(ج) زبان اُردو کو ایک ادبی زبان بننے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

۲ - مذہب و فلسفہ کا تعلق۔

۳ - عہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم۔

۴ - مسئلۂ ارتقا (theory of evolution) علم حیوانات و نباتات پر اُسکا اثر۔

۵ - مختصر سوانح انیس اور اُنکے کلام پر تبصرہ۔

دعوت مقابلہ الہ آباد یونیورسٹی کے ملحقہ تمام کالجوں کے جملہ طلبہ کے لیے عام تھی۔ اس دعوت کے جواب میں کل سولہ مضامین حسب ذیل اصحاب نے لکھے:-

(۱) سید محمود رضوی آگرہ کالج

(۲) سید امیر محسن نقوی متعلم ایم سی کالج الہ آباد۔

(۳) ابرار حسین قادری۔ آگرہ کالج۔

(۴) حبیب احمد "

(۵) رائزادہ گوبند پرشاد مدن کیننگ کالج لکھنؤ

(۶) بشیر حسین خاں بشیر ہلکر کالج اندور

(۷) کرشن شنکر گورنمنٹ کالج اجمیر

(۸) حامد اللہ افسر میرٹھ کالج

(۹) مسز بیاری گنگا پرشاد ایزابیلا تھابرن کالج لکھنؤ
(۱۰) عبد الجلیل بدایونی گورنمنٹ کالج اجمیر
(۱۱) عزیز الرحمن انصاری " "
(۱۲) حبیب اصغر کیننگ کالج لکھنؤ
(۱۳) سید سرفراز حسین ایم اے او کالج علیگڈھ
(۱۴) شہنشاہ حسین کرسچین کالج لکھنؤ
(۱۵) علی اوسط آگرہ کالج
(۱۶) احمد حسین خاں کیننگ کالج لکھنؤ

مندرجہ ذیل اصحاب نے ان مضامین کی جانچ کی :-

(۱) مولوی ابو محمد صاحب ایم اے ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ
(۲) مولوی سید محفوظ علی صاحب بی اے ... بدایوں
(۳) مسٹر عبد الولی بی اے ایڈیٹر معلومات لکھنؤ
(۴) مسٹر عبد الماجد بی اے لکھنؤ

اور سید محمد محمود رضوی کو طلائی تمغہ (عطا کردہ جناب آنریبل خان بہادر سید آل نبی صاحب بی اے ایل ایل بی، رئیس آگرہ) اور سید امیر الحسن نقوی کو نقرئی تمغہ (عطا کردہ مولوی ابو محمد صاحب ایم اے) حسب اعلان انجمن کی طرف سے دیا گیا۔ اور طلباء نمبر ۳ - ۴ و ۵ کے مضامین

" خاص طور پر قابلِ تعریف "

قرار دیے گئے۔

مذکورہ بالا پانچوں مضامین کے متعلق سکرٹری انجمن ترقی اردو آگرہ نے خواہش کی ہے کہ الناظر میں انکو شایع کرکے صاحبانِ مضمون کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اسکے بعد انجمن مذکور کی طرف سے یہ سب مضامین کتابی صورت میں شایع ہوں گے۔ چنانچہ اس پرچہ میں ہم سید امیر الحسن نقوی کا مضمون ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ صاحب موصوف نے الحمد للہ کہ گذشتہ سال بی اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی ہے اس لیے ہمیں امید ہے کہ آیندہ وہ زیادہ توجہ اپنی مادری زبان کی خدمت پر کر سکیں گے۔

بقیہ مضامین انشاء اللہ آیندہ نمبروں میں شایع ہوں گے۔

۱۹۳۱ء کے لیے انجمن کی طرف سے عنوانِ ذیل پر مضمون طلب کیے گئے تھے :-

" علم ادب کیا ہے؟ نظم و نثر کی نسبت اور انکا تعلق کسی زبان کے علم ادب میں کیا ہونا چاہیے؟ اس معیار کو پیش نظر رکھکر اردو کے قدیم و جدید علم ادب پر تنقید کرو "

لیکن مضامین تاریخ معینہ (۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء) تک کافی تعداد میں وصول نہ ہوئے اس وجہ سے دوبارہ یہ عنوان مشتہر کیا گیا :-

مولانا حالی یا مرزا غالب کے حالاتِ زندگی، اور انکی تصنیفات پر تبصرہ۔

امید ہے کہ ذوقِ شاعری رکھنے والے طلبا نے اس دلچسپ عنوان پر ضرور پوری توجہ کی ہوگی۔

ایڈیٹر

میر ببر علی متخلص بہ انیس

میر انیس کے جد اعلیٰ میر امامی موسوی کہ فاضل تبحر اور فقیہ بے مثل تھے۔ عہد شاہجہاں میں دہلی آئے اور منصب ہزاری پر ممتاز ہوئے۔ بوقت فرصت فکر شعر بھی فرماتے تھے۔ چار پشتوں تک یہ معزز خاندان دہلی میں بحشمت گذران کرتا رہا لیکن زمانے نے رُخ پلٹا اور سلطنتِ دہلی چراغِ سحری کی طرح بادِ پریشاں سے خاموش ہونے لگی اہلِ علم و ہنر دوسرا ماویٰ تلاش کرنے لگے۔ میر غلام حسین ضاحک کہ امامی موسوی کے پرپوتے اور ہمارے ہیرو کے پردادا ہیں ترک وطن پر مجبور ہوئے اور فیض آباد آکر محلہ گلاب باڑی میں قیام فرمایا۔ عہد آصفی میں لکھنؤ دار السلطنت قرار پایا تو میر ضاحک اور اُنکے نامور صاحبزادے میر غلام حسن متخلص حسن کی آمد و رفت لکھنؤ سے ہو گئی مگر وطن کا شرف فیض آباد ہی کو رہا۔ میر ضاحک پایہ کے شاعر تھے اور ہجو خوب فرماتے تھے غالباً تخلص بھی اسی مناسبت سے اختیار کیا ہوگا۔ میر حسن کا تعارف پبلک سے کرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مرحوم اپنی مثنوی سحر البیان کی بدولت عالم شہرت کے تاجدار ہیں اور جاہل و عالم بچے اور بوڑھے سبھی اس نامور سے واقف ہیں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ "شہ شاعراں" میر تقی میر اور ملک گو مرزا سودا نے بھی متعدد مثنویاں لکھیں مگر بدر منیر نے ہر ایک کا چراغ گل کر دیا۔ میر حسن کے صاحبزادے میر مستحسن خلیق نے باپ سے بھی زیادہ عزت اور شہرت حاصل کی۔ ابتداءً غزل کہتے تھے خواجہ آتش نے فیض آباد میں بسر مشاعرہ خلیق کی غزل سنکر اپنی غزل چاک کر ڈالی اور فرمایا کہ جب یہاں ایسا شخص موجود ہے تو میری کیا ضرورت۔ امام فن شیخ ناسخ اپنے شاگردوں کو حکم دیتے تھے کہ زبان خلیق سے سیکھو۔ مگر میر خلیق نے غزل گوئی ترک کر کے مرثیہ گوئی اختیار کی اور اس فن کی ترقی کی بنیاد ڈالی جس پر نامور بیٹے نے عالیشان اور عدیم النظیر عمارت قائم کر دی۔

ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ہمارے ہیرو کو شاعری میراث میں ملی تھی اور اُسکے بے مثال کلام کے اکثر محاسن میراث ہی کے جوہر ہیں اُس نے دنیائے شاعری ہی میں آنکھ کھولی اور شاعری ہی کی آغوش میں نشو و نما پائی

میر ببر علی انیس سنہ ۱۲۱۶ھ میں محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ زمانہ امجد علی شاہ میں جب میر خلیق نے مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کی تو میر انیس صاحب اُستاد ہو چکے تھے۔ چنانچہ اُنکے لائق جانشین میر خورشید علی نفیس کے بھی مقام پیدائش ہونے کا فخر فیض آباد ہی کو ہے۔

میر انیس خود فرماتے تھے کہ جب میں نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اسوقت یہاں اس فن میں بڑے صاحب

نامی گرامی تھے۔ ایک تو میر نواب علی صاحب جو یار میں رہتے تھے اور دوسرے مرزا سلامت علی صاحب دبیر مرزا دبیر تو میر انیس کے پہلو بہ پہلو آسمانِ شہرت پر جلوہ گر ہیں مگر افسوس آج لکھنؤ والے بھی میر نواب علی صاحب کا پتہ نہیں بتا سکتے۔ ہاے قوم کی غفلت نے کیسے کیسے جواہر ہاتھ سے کھو دیے۔

میر انیس کے کلام اور کمال نے لکھنؤ میں شہرت پائی مگر میر صاحب فیض آباد میں بھی ضرور مرثیہ کہتے ہوں گے۔ پہلے تخلص حزیں تھا۔ شاید حزیں اس لیے تخلص کیا ہو کہ ضاحک مرحوم اور شیخ علی حزیں میں ارتباط تھا۔ اور شیخ موصوف نے میر ضاحک سے میر حسن کی ذیل کی رباعی اور شعر شکر دعاے ترقی کلام دی تھی۔

جاناں ز تو امیدِ نگاہے دارم — امید نگاہے ز تو گاہے دارم
اکشتۂ چشم سرمہ سایت ہستم — نے نالہ و نے فغاں نہ آہے دارم
اے شمع بسر رسیدہ گشتم — خاموش کہ من ز سر گذشتم

لکھنؤ آکر انیس تخلص کیا۔ یہ تخلص شیخ ناسخ کا عطیہ ہے ایک روز اپنے پدر بزرگوار کے ہمراہ ناسخ مرحوم کے پاس گئے شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ میاں صاحبزادے کچھ اپنا کلام سناؤ۔ آپ نے اپنے پدر بزرگوار کے اصرار سے یہ شعر پڑھا

کھلا باعث یہ اس بیدرد کے آنسو نکلنے کا — دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

یہ مطلع سنکر شیخ ناسخ جھومنے لگے اور میر خلیق سے فرمایا کہ یاد رکھیے صاحبزادے بلند اقبال یادگار خاندان ہونگے اور ایک نہ ایک دن ایسا آئیگا کہ انکی زبان اور شاعری کی چاردانگ عالم میں شہرت ہوگی۔ بہتر ہوتا کہ یہ حزیں کی جگہ کچھ اور تخلص کرتے۔ میر خلیق نے فرمایا کہ پھر آپ ہی کوئی دوسرا تخلص انکے لیے تجویز کر دیجیے۔ امام فن نے کچھ دیر سکوت کیا اور پھر فرمایا کہ مجھے تو انیس بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اُسی روز سے میر انیس انیس ہو گئے اور نباض شاعر بڈھے کی پیشینگوئی حرف بحرف سچی ثابت ہوئی۔

انیس کے کلام کی ایسی قدر ہوئی کہ جو آج تک اُردو کے کسی شاعر کو نہ نصیب ہوئی تھی اور جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا انیس کی شہرت کا قلمرو وسیع ہوتا جائیگا۔ انگریزی تعلیم نے ملک کا مذاق کیسر بدل دیا ہے۔ آنکھیں اُردو میں بھی شکسپیر کو تلاش کرتی ہیں اُردو فخریہ انیس کو پیش کرتی ہے اور شکسپیر سے توازن چاہتی ہے اور اس توازن میں سرمو سبک نہیں ہوتی۔ کیا عجب ہے کہ اس مقابلہ میں میدان اُردو ہی کے ہاتھ رہے۔

انیس کی زبان تمام ملک میں مستند اور مسلم ہے۔ اس امر کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے

کہ دلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں نے دعویٰ کیا کہ انیس کی زبان ہماری زبان ہے۔ آزاد مرحوم آبِ حیات میں اس طرح ذکر فرماتے ہیں کہ انکی تحریر سے فخر کی خوشبو آتی ہے۔ مگر یہ دلی والوں کی زبردستی ہے اور لکھنؤ والوں کے متعلق تو میر صاحب خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ "صاحبو! یہ ارباب لکھنؤ یوں نہیں بولتے یہ ہماری اپنی زبان ہے"۔ اپنی زبان سے میر صاحب کی یہ مراد نہ تھی کہ دلی کی زبان ہے۔ آزاد مرحوم اس معمہ کو نہ سمجھے جسکی تفصیل یوں ہے۔ میر انیس کے بزرگوں کا تعلق سلسلۂ ملازمت خاندان بہو بیگم صاحبہ سے مدتوں رہا ہے اور اسی خاندان کی زبان لکھنؤ میں اردو کا معیار مانی جاتی ہے۔ فیض آباد میں محاورۂ زبان اصطلاحات و ضرب المثل وغیرہ کا ایک دفتر تھا جسکے منشی میر حسن اور میر خلیق رہے ہیں۔ جب محلات سے اردو کے نئے محاورے تراش کر نکالے جاتے تو اسی دفتر میں قلمبند ہوتے تھے۔ شیخ ناسخ کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ علاوہ دلی والوں کی زبان کیوں مستند مانتے جبکہ وہ اکثر محاورات کو ترک کر چکے تھے جو دلی کے مہاجرین شعرا اب بھی وطن کی یادگار تصور کر کے استعمال کرتے تھے۔ یہ نکتہ آزاد مرحوم کی نگاہ سے سہو ہو گیا ہوگا۔ ورنہ میر انیس کی زبان اور محاورات کو دلی سے نہ منسوب کرتے۔

میر انیس کی قدر انکی حیات میں ہی بہت ہوئی اور مرنے کے بعد تو انکی شہرت دن بدن بڑھتی گئی مگر پھر بھی انکا کلام جس شہرت کا مستحق ہے اور جو پایہ انکی شاعری کا قوم میں ہونا چاہیے وہ ابھی نہیں نصیب ہوا۔ مولوی شبلی نے اس امر پر بڑا پیچ و تاب کھایا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دیے گئے اور اس امر کو وہ قوم کی بدمذاقی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسکا سبب قوم کی بدمذاقی ہو یا نہ ہو مگر اصل تو یہ ہے کہ قوم بدمذاقی کے سنگین الزام سے کسی طرح نہیں بچ سکتی ہے۔ اور انیس کے بارے میں تو اسکے اکثر افراد ممتاز نے قابلِ گرفت بدمذاقی کو دخل دیا ہے۔ عوام سے کیا شکایت ہو سکتی ہے انکا تو ذکر ہی فضول ہے مگر خواص سے البتہ جو اپنے علم پر فخر کرتے ہیں اور قوم بھی انھیں اپنا طرۂ دستار تصور کرتی ہے، محض شکایت ہی نہ ہونی چاہیے بلکہ انکی سخت گرفت کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ ان حضرات کا اثر تمام طبقہ پر پڑتا ہے اور اس طرح بدمذاقی کی مہلک اور مضر ہوا تمام سوسائٹی میں پھیل جاتی ہے۔ قوم کی بدمذاقی کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا کہ مولوی سید احمد صاحب مصنف "فرہنگ آصفیہ" جو انکی علمیت اور مذاق کی بین دلیل ہے۔ زبان اردو کی تاریخ لکھتے ہوئے بسلسلۂ "تذکرہ" "مجلس" فرماتے ہیں کہ پرانی زبان ہونے کی وجہ سے اب لوگ کم پڑھتے ہیں علاوہ اسکے میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے نظم امام مظلوم تک جا رانسو ڈھلنے کو کافی و وافی ہیں۔

افسوس اُردو پر احسان کرنے والوں میں تو عارف دہلوی اور آتش کا نام تفاخر سے لیا جائے اور میر انیس جنکا احسان اُردو پر ہزار گونہ بلکہ صد ہزار گونہ ہے اس طرح نظر انداز کر دیے جائیں۔ اگر قوم کے مذاق کا یہی حال ہے تو خدا حافظ۔

میر انیس نے لکھنؤ میں بہت جلد شہرت پائی۔ اور اُنکی طبع خداداد مجلسوں میں اپنی جولانیاں دکھانے لگی۔ میر خلیق کی پیری زبان حال سے اُنکی گوشہ نشینی کی سفارش کر رہی تھی۔ ہونہار اور سعید بیٹے نے تمام بوجھ اپنے کندھے پر لیلیا اور بڈھے باپ کو گوشۂ عافیت میں بٹھلا دیا۔ میر خلیق کے حریف مقابل میر ضمیر بھی کنج عزلت اختیار کر چکے تھے مگر اُنکے شاگرد رشید اور مایۂ ناز مرزا دبیر جو میر انیس کے لکھنؤ آنے سے پہلے شہرت پا چکے تھے اُستاد کی بجاے مجلسوں میں اپنی عقل فلک سیر کے جلوے دکھا رہے تھے۔ جب ان دونوں نوجوانوں نے میدان مجالس میں طبع آزمائی شروع کی تو قدرۃً جانبین سے مقابلے شروع ہو گئے۔ لکھنؤ کے بیفکروں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا اور دن رات لڑانے کی فکر رہنے لگی۔ یہاں تک نوبت پہونچی کہ قدردانوں کے دو جتھے ہو گئے اور ایک کے لیے دوسرے کی تعریف کرنا گناہِ عظیم ہو گیا۔ اس فرقہ بندی کا اثر اب تک باقی ہے۔ بہرحال باوجود ان باتوں کے دونوں کی پاک روحیں ایک دوسرے سے صاف دل رہتی تھیں اور رشتۂ تہذیب اخلاق ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ میر انیس کا مشہور سلام ہے

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس سلام میں جسکا مطلع اوپر درج ہو چکا دو تین شعر فخریہ ہیں وہ یہ ہیں

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس سلام کو میر مونس ایک مجلس میں پڑھتے وہاں مرزا صاحب کے شاگرد قدیرالدولہ قدیر بھی جو تھے اُنکو خیال گذرا کہ یہ تو اُستاد پر چوٹ ہے۔ اُنھوں نے دوسرے اُستاد بھائیوں کو اطلاع کی۔ تشیر مرحوم نے جو شاگردان مرزا مرحوم میں بہت تیز اور طرار تھے اسی زمین میں جواب لکھا گر جوں ہی میر اور مرزا کو خبر ہوئی یہ آگ فرو کر دی گئی۔ ادھر میر انیس میر مونس پر ناراض ہوے اور مرزا صاحب کے پاس معذرت کی خاطر بھیجا۔ اُدھر تشیر بحد عتاب سے اُن کے حکم اُستاد میر صاحب سے طالب معافی ہوے۔

میر صاحب کم گو اور کم سخن تھے۔ جس طرح کلام لاجواب ہے گفتگو میں بھی اُسی طرح تمثیل فقرے منہ سے

نکلتے تھے۔ کم گوئی کا باعث یہ ہے کہ لفظ لفظ پر اور فقرہ فقرہ پر بار بار غور فرماتے تھے اور جب تک حسبِ منشا مصرعہ نہ ہو جاتا آگے نہ بڑھتے۔ طرز خوانندگی بھی کلام کی طرح بےمثال تھی۔ آئینہ رکھکر خلوت میں مشق کیا کرتے تھے۔ پڑھنے میں تصنع اور بناوٹ مطلق نہ ہوتی تھی بالکل فطری ہوتا تھا۔ مرثیہ کے مختلف مقامات کو محض طرز ادا سے واضح اور صاف کر دیتے تھے۔ اکثر باریکیاں پڑھنے ہی کی بدولت سمجھ میں آ جاتی تھیں۔ جس طرح کلام اور طریقہ خوانندگی سب سے علیحدہ تھا طرز تصنیف بھی نرالا تھا۔ اکثر بستر پر لیٹ جاتے اور سر سے پیر تک ایک چادر تان لیتے ایک ہاتھ خم کر کے کلائی آنکھوں پر رکھ لیتے اور فکر شعر میں ڈوب جاتے۔ اس حالت میں ایک کاتب سامنے حاضر رہتا تھا۔ یہ شرف میر نفیس کو اکثر ملتا تھا۔

میر صاحب صاحب استغنا تھے اور کبھی دولتِ دنیا کی پرواہ نہیں کی۔ اپنے کلام کو دولت لازوال تصور کرتے تھے اور اُسی پر فخر تھا۔ کسی رئیس کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے　　　فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

میر انیس نے کبھی کسی رئیس کی جس نے ذرا بھی نخوت کی اور شان کی لی، پرواہ نہیں کی۔ اور اکثر پوری فہمایش کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد میں ایک نواب اعظم کو یہ ناگوار گزرا کہ میر انیس نے مجلس میں اُٹھکر انکی تعظیم نہیں کی۔ اُنھوں نے مصاحبین کو روک دیا کہ میر صاحب کی تعریف نہ کریں۔ یہ فطرت در معاشرتِ انسانی کا رازداں اسے تاڑ گیا اور ممبر پر پہونچکر ایک سلام شروع کیا۔ مطلع پڑھکر نواب صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا سنیے یہ شعر آپ کے سننے کا ہے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں　　　خاک تک چھانی نہ قبر سے نشاں پیدا ہوے

اور پھر یہ شعر پڑھا

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں　　　اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوے

نواب صاحب مطلع ہی پر کچھ ہلے تھے جب دوسرے شعر نے تازیانۂ عبرت کا کام دیا اور تیسرے نے ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی سبق دیا تو پھر نواب نہ خاموش رہ سکے اور چلا اُٹھے سبحان اللہ واہ وا ماشاءاللہ۔ پھر کیا تھا حاشیہ نشینانِ بساطِ دولت تو دیر سے بھرے بیٹھے تھے برس پڑے اور خوب برسے۔

جب کبھی لکھنؤ سے باہر جانے کا تذکرہ ہوتا تو فرماتے کہ "باہر والے اس کمال کو کیا سمجھینگے"۔ بے شک میر صاحب کا خیال صحیح اور درست تھا اس خیال کو مرثیوں میں بھی نظم کیا ہے فرماتے ہیں

سچ ہے کہ اس زباں کو کوئی جانتا نہیں جو جانتا ہے غیر کو وہ مانتا نہیں

مگر انیس کا یہ خیال ناواقفوں کو کھٹکے گا اس لیے انکی تائید میں میر تقی میر کی سند پیش کی جاتی ہے۔ میر تقی کے پاس لکھنؤ کے چند عمائد آئے اور اشعار کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے ٹالا مگر مزید تقاضہ پر فرمایا کہ قبلہ آپ میری زبان اور میرا کلام نہ سمجھینگے۔ رؤسا نے با ادب عرض کیا کہ حضرت خاقانی و انوری کو سمجھتے ہیں حضور کا ارشاد نہ سمجھینگے۔ اُس بادشاہ ملک قناعت اور شہنشاہ اقلیم سخن نے فرمایا کہ اُنکی شرحیں اور مصطلحات موجود ہیں میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہل اُردو اور دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں ہیں اور اُن سے آپ محروم۔ پھر یہ شعر ارشاد کیا۔

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا کہ کتابوں کے بموجب آپ کہیں گے کہ خیال کی 'ی' ظاہر نہیں ہے تقطیع میں گر جاتی ہے۔ مگر یہاں سب کا صرف ایک جواب ہے کہ "محاورہ یہی ہے"۔ کاش مولوی شبلی صاحب بقید ہوتے اور اُنکی توجہ اس قصہ کی طرف منعطف کرائی جا سکتی۔ جب میر انیس کا خیال یہ تھا کہ غیر جگہ والے اُنکی زبان کیا سمجھیں گے تو لکھنؤ سے کیونکر باہر جاتے۔ مگر قسمت سے کس کا بس چلتا ہے۔ سموم مخالفت نے باغ لکھنؤ کو تباہ و برباد کر دیا اور غدر کے بعد لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا کہ میر انیس اگر چاہتے بھی تو قدم باہر نہ نکال سکتے۔ اول اول ۱۸۵۹ء اور پھر سنہ میں پٹنہ و عظیم آباد گئے وہاں سے واپسی میں بنارس میں پڑھے۔ اُس مجلس میں میر انیس، نفیس، اوج، وحید مرحومین بھی پڑھے تھے۔ اللہ اللہ کیا سماں ہوگا جبکہ یہ پانچوں بزرگ ایک ہی مجلس میں پڑھے ہونگے۔ پھر سنہ [illegible] میں میر صاحب حیدرآباد گئے وہاں تو میر انیس کی امید سے زیادہ قدر ہوئی نواب تہور جنگ نے نعلین نفش میں اپنے ہاتھوں سے رکھی۔ اللہ ری قدر و منزلت۔ حیدرآباد سے پھرے تو الہ آباد میں اُترے۔ ایک مجلس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں شمس العلماء پروفیسر ذکاء اللہ صاحب موجود تھے اُنکی زبانی مولانا آزاد آب حیات میں تحریر کرتے ہیں "کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان ہو۔ محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص ممبر پر پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔ مقطع کی

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

پڑھتے تھے اور مزے لیتے تھے"۔ اس بیت کا مزا کوئی انیس کے دل سے پوچھے اور لوگ اسکی کیا قدر کرینگے۔ انہیں اس بیت پر جس قدر ناز کرتے بجا تھا۔

میر صاحب لکھنؤ سے نکلے تو مگر اسکا افسوس ضرور تھا۔ دوسا ے لکھنؤ نے پٹنہ جانیسے اسلیئے نہیں روکا کہ شہرت ہو اور دوسرے لوگ بھی فیضیاب ہوں۔ میر صاحب نے اس امر کو کم ہمتی اور نا قدری تصور فرمایا اور وہاں کی واپسی کے بعد عرصہ دراز تک مرثیہ نہیں پڑھا۔ مگر لکھنؤ والوں نے اپنی حرفتوں سے اور مجتہدین سے سفارش کرا کے آخر کار چھ سات برس کے بعد پڑھوا ہی کر چھوڑا۔ پھر تو میر صاحب تادم آخر پڑھتے رہے۔

میر انیس کے سوانح میں ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ مفتی میر عباس صاحب قبلہ جس پایہ کے ادیب اور فاضل تھے اہل علم خوب جانتے ہیں۔ میر صاحب اور مفتی صاحب میں بہت ارتباط اور اتحاد تھا اور میر صاحب کو قدر و عزت کی نگاہوں سے مفتی صاحب دیکھتے تھے۔ کسی بات پر کچھ بدمزگی ہوگئی اسی عالم میں مفتی صاحب کا رقعہ آیا۔ میر صاحب نے سرنامہ پر یہ شعر لکھکر واپس کر دیا۔

"مرنجاں دلم راکہ ایں مرغ وحشی زبامے کہ برخاست مشکل نشیند"

مفتی صاحب نے اسی زمین میں ایک بہت بڑا قطعہ لکھا ہے اس قطعہ سے جو محبت ٹپکتی ہے اسکا کسی قدر اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہو جائیگا۔

توگفتی میازار دل راکہ ایں مرغ زبامیکہ برخاست مشکل نشیند
تو فرزند شکلکشائی ہیں ایں مرغ ہم آساں نشیند نہ مشکل نشیند
توگفتی میازار دل راکہ ایں مرغ زبامیکہ برخاست مشکل نشیند
سرت گردم آزار عاشق چہ باشد بجز آنکہ بر درچو سائل نشیند
وگر از در خود چو ابش نشانی بجز کوے تو مائل نشیند
علیؑ راانگہ کن کہ از ابن ملجم پس از آنکہ بر دیدہ بسمل نشیند
توآخر جگر گوشہ مرتضائی نباید محب تو بیدل نشیند

میر انیس ۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ کو درد سر اور تپ میں مبتلا ہوئے اور باوجود بہترین معالجہ اور قابل ترین اطبا کی ان تھک اور جان توڑ کوششوں کے مرض بڑھتا گیا۔ اور آخر کار ۲۹ شوال یوم دوشنبہ کو قریب شام اپنے مکان واقع چوبداری محلہ میں انتقال فرمایا۔ غفرانمآب کے امام باڑہ میں قبلہ وکعبہ سید بندہ حسن صاحب نے نماز پڑھائی اور اپنے باغ واقع سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔

لکھنؤ میں انقلاب عظیم ہوگیا۔ مہینوں اخبارات میں رسم تعزیت ادا ہوتی رہی۔ ہزاروں تاریخیں کہی گئیں۔ عشق مرحوم فرماتے ہیں " بوداانیس عشق حسین اندریں مزار"۔ مرزا دبیر نے جو تاریخ کہی ملاحظہ ہو۔

"آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں طور سینا بے کلیم اللہ [illegible] انیس"

مادۂ تاریخ موافق صنعت زبر و بینہ نکلتا ہے۔ پورا قطعہ کلیات مرزا صاحب میں چھپا ہے محبت اور قدر و منزلت سے لبریز ہے۔ ناواقفین جو ان حضرات کی شاعرانہ تعلیوں کو ایک دوسرے پر چوٹ تصور کرتے ہیں وہ اُس قطعہ کو ملاحظہ کریں۔ افسوس مولوی شبلی صاحب کی نظر سے یہ قطعہ نہ گذرا۔

انیس کے کلام پر تبصرہ کرنا کسی طفل مکتب کا کام نہیں ہے۔ ایک بحر زخار موجزن ہے جو جسقدر گہرائی میں جائیگا ویسے ہی دُر شہوار پائیگا۔ عقل کام نہیں کرتی۔ فکر نہیں پاتی۔ زبان کو ترسے دعویٰ ہوئی ہے۔ ایک مصرعہ پڑھیے اور مزے اُٹھائیے۔ آگے بڑھنے کا دل نہیں چاہتا۔

صفائی بندش۔ حسن بیان۔ برجستگی تراکیب۔ سلاست کلام۔ روانیِ الفاظ۔ لطف محاورہ۔ غرض سرتاسر ایک جال بچھا ہے جس میں عقل پھنس کر چکر کھانے لگتی ہے اور در معانی تک نہیں پہونچنے پاتی۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ انسان کا کلام ہے یا کسی طاقت ما فوق بشری کا۔

حالی کہ دریائے عمیق میں نہاں ہیں بڑی بڑی باریک ہیں اور نکتہ رس نگاہوں سے بھی بچ رہتے ہیں۔ فصاحت انیس نثار۔ بلاغت انیس قربان۔ اوروں کو فصاحت پر ناز ہوگا، فصاحت کے لیے انیس مایۂ نازش ہیں۔ بلاغت دوسروں کو باعث فخر ہوگی انیس خود بلاغت کے لیے موجب تفاخر ہیں۔

یہ جملہ تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے کہ "میر انیس میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا دبیر میں بلاغت"۔ مگر اس ضرب المثل میں بلاغت اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں استعمال ہوئی ہے بلکہ بلاغت سے مراد دقتِ کلام ہے۔ اس لیے کہ صورتِ اولیٰ میں اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے اس لیے کہ کوئی کلام جبتک فصیح نہ ہو بلیغ نہیں ہو سکتا اس لیے فصاحت اور بلاغت حریف نہیں ہو سکتیں۔ چونکہ میر صاحب کا کلام سلیس اور آسان ہوتا ہے اور مرزا صاحب کا ادق۔ اس لیے قوم نے یہ فیصلہ کیا۔ حالانکہ میر صاحب کے سلیس اور سادہ کلام کے محاسن کو سمجھنا مشکل ہے۔ دقیق کلام تو تھوڑی سی فکر سے سمجھ میں آجاتا ہے اور ادق کلام جلد فکر کو باریکیوں پر متوجہ کر دیتا ہے مگر سادہ اور سلیس کلام جو باریکیوں سے بھرا ہو جلد نہیں سمجھ میں آتا۔ اسکی وہی مثال ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کی اشیاء سے بوجہ اسکے کہ انھیں روز دیکھتا ہے غافل رہتا ہے۔ جب کوئی یاد دلا دیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے محاسن جلد سمجھ میں نہیں آتے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا ۔ برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

یعنی باوجودیکہ میرا کلام آسان اور سادہ ہے اور ادق الفاظ نہیں آتے مگر اسکا جواب نہیں ہو سکتا۔ جواب ہونا تو درکنار لوگ اسکے محاسن بھی جابجا نہیں سمجھ سکتے۔ اور یہ میرے کلام کی خاص صفت ہے کہ اسقدر محاسن سے بھرا ہوتا ہے کہ فکر جلد کام نہیں کرتی۔

بیت مذکورۂ بالا پر مرزا غالب نے ایراد صادر فرمایا ہے۔ ادق کو مغلق کے معنوں میں لے گئے ہیں۔ حضرتِ غالب سے باریک بین اور نکتہ رس سے تعجب ہے۔ چنانچہ اسی طرح مولوی شبلی نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ وہ بلاغت کو اصطلاحی معنی میں لے گئے ہیں اور ضرب المثل متذکرۃ الصدر کے یہ معنی سمجھے کہ میر صاحب میں بہ نسبت مرزا صاحب کے بلاغت کم ہے۔ اس لیے مولوی صاحب نے تمام قوم کو بدمذاق بنا دیا۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ اہل علم کا مقتدبہ حصہ میر صاحب کو بلاغت کا بھی بادشاہ اسی طرح مانتا ہے جس طرح فصاحت کا۔ فصاحت کو کلمہ۔ کلام اور متکلم تینوں سے تعلق ہوتا ہے اور بلاغت کو صرف کلام اور متکلم ہی سے۔ یہ مولوی شبلی کی سہو ہے کہ موازنہ میں لفظ بلیغ فرمایا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں کوئی لفظ فصیح ہوتا ہے کوئی فصیح تر اور کوئی اس سے بھی زیادہ فصیح۔ کسی کلام کے فصیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جملہ الفاظ فصیح ہوں اور اس طرح ترکیب دیے جائیں کہ مصرعہ زبان پر بآسانی جاری ہو جائے کہیں ثقل یا بھدا پن نہ آنے پائے۔ شبنم اور اوس دونوں ہم معنی ہیں مگر ذیل کے دونوں مصرعوں میں ایک کو دوسرے کی جگہ رکھ دیجیے تو فصاحت خاک میں ملجائے گی۔

"کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا"۔ اور۔ "شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے"

بندش اور نشست الفاظ کا جو اثر فصاحت پر ہوتا ہے امثلۂ ذیل سے ملاحظہ ہو۔

میر انیس۔ "روحی فداک لے قمرِ برجِ ہل اتیٰ"

میر مونس۔ "روحی فداک لے قمر لا فتا لقب"

دونوں مصرعوں میں صرف دو تین لفظوں کا فرق ہے۔ "لا فتا لقب" اس آسانی سے نہیں زبان پر رواں ہوتا جس آسانی سے "برجِ ہل اتیٰ"۔ اسی لیے میر انیس کا مصرعہ بہ نسبت میر مونس کے مصرعہ کے زیادہ فصیح ہے۔ یہ فرق مدارجِ فصاحت خود انیس کے کلام سے دکھایا جا سکتا ہے۔ جب یہ طے ہوگیا کہ علمدارِ لشکرِ حسینؑ ابو الفضل عباس ہونگے تو حضرت علی اکبر جوشِ مسرت میں عم بزرگوار کو بلاتے ہیں۔

(۱) "جلد آئیے یاد آپ کو فرماتے ہیں سرور" اور (۲) "چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو"

دوسرا مصرعہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ فصیح ہے۔ اب بلاغت بھی دونوں مصرعوں کی ملاحظہ ہو۔ دوسرا مصرعہ یہ بتلاتا ہے کہ حضرت اکبر اپنے چچا کے پاس جا کر بادب عرض کرتے ہیں کہ حضور کو پھوپھی نے یاد کیا ہے تشریف لے چلیے۔ پہلے مصرعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دور سے آواز دیتے ہیں۔ یہ کسی قدر سوء ادبی ہے۔ علاوہ بریں پہلے میں "آپ" ہے اور دوسرے مصرعہ میں "حضور" جس سے زیادہ ادب ظاہر ہوتا ہے۔

میر انیس کا بیشتر کلام ایسا ہے کہ نثر کرنا چاہیں تو نہیں ہو سکتا۔ بجنسہ یا قریب قریب نثر کی ترکیب نظم میں بھی قائم رہتی ہے یہ انتہا ہے قادر الکلامی کی دلیل ہے اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ اسی کا نام فصاحت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کیوں[۱] روتے ہوئے لال جگا کے ہمیں سر کو — دیکھو تو ادھر اتنا نہ روکو گے پدر کو
ماں کی بھی[۲] مرضی یہی بابا کی خوشی ہے — زینب کی خوشی حضرت زہرا کی خوشی ہے
کیا بات[۳] بھائی انکے بھلا بول چال کی — گویا زباں ہے مصحف ناطق کے لال کی
سنتی تھی[۴] میں کہ رن سے علمدار آتے ہیں — لو اب تو گھر سے نور کے بیٹے بھی جاتے ہیں
سر کی[۵] نہ کچھ خبر ہے نہ چادر کا ہوش ہے — واری یہ پالنے کی محبت کا جوش ہے
دی بڑھ کے[۶] صدا فوج کو عباس علی نے — کیوں کیا ہوا اس وار کو روکا نہ کسی نے
کیسے[۷] پھوپھی بھتیجے میں کیا فیصلہ ہوا — پوچھو[۸] لو حر تو ہے موجود عیاں راچہ بیاں
بھاگے ہوئے بوڑھے[۹] کہ چلا مت ہیں اجل کے — سچ کہتے ہیں[۱۱] تلوار کی بھی آنچ بری ہے
مشہور[۱۰] ہے دنیا میں کہ یک پیری و صد عیب — سچ کہتے ہیں[۱۲] شادی و غم خلق ہیں توام

نمبر ۱ و ۱۱ و ۱۲ قریب قریب نثر کی ترکیب ہے۔ نمبر ۲ لغایۃ نمبر ۱۰ بجنسہ نثر کی ترکیب ہے۔ صرف ایک دو لفظ کہیں ہٹا ہو تو ہو۔

میر انیس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روزمرہ نظم کر جاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

مرغان خوش الحان چمن بولیں کیا — مرجاتے ہیں سنکے روزمرہ میرا

نمبر ۱ کا دوسرا مصرعہ نمبر ۲۔ نمبر ۳۔ ۴۔ دوسرا مصرعہ ۵۔ ۶۔ دوسرا مصرعہ۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ان سب میں روزمرہ جس خوبی سے نظم کیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہی باتیں انیس کو ممتاز کرتی ہیں۔ میر صاحب کی یہ بھی خوبی ہے کہ ضرب المثل بھی برجستہ نظم کر دیا کرتے ہیں۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ مندرجہ بالا ملاحظہ ہوں۔

بلاغت کے متعلق اوپر فصاحت کے سلسلہ میں بتلایا جا چکا ہے کہ ایک ہی مضمون دو طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے ایک بلیغ ہوتا ہے اور دوسرا بلیغ تر - یہاں مضمون کی نوعیت سے بلاغت ملاحظہ ہو - ایک ہی حالت کو میر صاحب نے نظم کیا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ ایک موقع پر ایک نادان بچہ سے سابقہ ہے اور دوسرے موقعہ پر ایک سن رسیدہ بزرگ سے - اتنا عرض کرنا اور ضروری ہے کہ ہر قسم کے مضمون کی بلاغت جداگانہ ہے - وہی مضمون جب بچہ کے منہ سے ادا کیا جائیگا تو دوسرا طریقہ ہوگا اور جب جوان یا سن رسیدہ کے منہ سے تب دوسرا - میر انیس کی یہ بہت بڑی صفت ہے کہ کلام ہمیشہ حسب موقعہ اور موافق اقتضائے وقت ہوتا ہے - امثلۂ ذیل اس نکتہ کو واضح کرینگی -

(۱) امام مظلوم خیمۂ حرم محترم میں رخصت کے لیے آتے ہیں - آپکی چہیتی بیٹی حضرت سکینہ جنکا سن چار برس کا ہے آپ سے کہتی ہیں کہ یہاں کوئی بی بی بین کرتی اور روتی ہیں - میں نے سنا ہے وہ کہتی تھیں ..... " ڈھلجائے دوپہر تو سکینہ یتیم ہو " آپ فرماتی ہیں کہ میرا دل دھڑکتا ہے - " اٹھواو جلد خیمہ یہاں سے کرو سفر " اور پوچھتی ہیں " کسکو یتیم کہتے ہیں یا شاہ دیں پناہ " پھر مصائب اور تکالیف کا ذکر فرما کر کہتی ہیں -

فاقہ تو وارث ہے ہمیں سکا گلا نہیں　　　گذرے ہیں تین روز کہ پانی ملا نہیں

فاضل شاعر نے بیت متذکرۂ بالا میں حسن بلاغت کا اظہار کیا ہے اُسکا اندازہ صرف مذاقِ سلیم ہی کر سکتا ہے بیان نہیں ہو سکتی - بہرحال جہانتک بیان میں آ سکتی ہے ملاحظہ ہو -

پہلے تو متکلم کا بچپن ثابت کر دیا جو نہیں جانتی یتیم کس کو کہتے ہیں اور نہیں سمجھتی کہ بین کیا ہے اور کیوں بین کرتے ہیں - پیاری بیٹی اپنے باپ سے فاقہ کی شکایت نہیں کرتی - اسکی تو آنکھ کھولنے ہی کے وقت سے عادت ہے - حالتِ فاقہ میں جو قبل واقعۂ کربلا گذرے ہونگے ماں باپ نے تسکین دینے کے لیے کہا ہوگا کہ تمھارے باپ دادا - تمامی خاندان حتیٰ کہ محمد صلعم جو جد امجد ہیں ان سب پر یہی حالت گذری ہے - یہ تمھارا فخر ہے - فاضل شاعر نے اس نادان بچی کے منہ سے اہلبیت کی فاقہ کشی از محمدؐ تا واقعۂ کربلا بیان کر دی - حسنین کا تین دن بھوکا رہنا اور پھر روزہ رکھنا یاد دلایا - آنکھوں میں حلقے پڑ جانا - ماں کا گھبرانا - نانا کا اضطراب - پھر آبدیدہ ہوکر درگاہ احدیت میں دعا کرنا - جبریل کا طعام بہشت اور تاج ہل اتیٰ لانا یہ سب سماں آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے - پھر خیال ہو کہ

آج محمدؐ کہاں ہیں کہ اطفال حسینؑ کو آکر دیکھیں کس حال میں ہیں۔ یہ بھی ثابت کردیا کہ اہلبیت کا بچہ بچہ کسقدر صابروشاکر ہے۔ مگر یہ لحوظ رہے کہ حسینؑ صرف تین دن بھوکے رہے ہیں پیاسے نہیں رہے۔ پانی نصیب ہوتا تھا۔ حضرت سکینہ بھوک کی نہیں شکایت کرتی ہیں بلکہ پیاس کی۔ یہ بھی اسلیے کہ نئی واردات ہے۔ نہ کبھی خود پہ گذری نہ خاندان کے کسی بزرگ پر۔ ورنہ جس طرح فاقہ کو سُنا تھا پیاس کو بھی والدین سے سنتیں گو کہ کربلا سے پہلے اسکی نوبت اُنپر خود نہیں آئی تھی۔ اس بیت کی بلاغت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب چوتھے مصرعہ کے ساتھ جس سے تسلسل ہے پڑھیے مصرعہ "کیا خوب میہمانیِ آل نبی ہے واہ"۔ مہمان میزبان سے عمدہ ورطرح طرح کے کھانوں کی امید رکھتا ہے گرباوجود مہمان ہونے کے بھی فاقہ کی شکایت نہیں۔ کھانا نہ دیتے گر پانی تو دیتے۔ اسلیے کہ پانی تو گھر پر بھی ملتا تھا۔ کیا میزبان وہ بھی نہ دے سکا۔ علاوہ بلاغت کے بلحاظ مرثیت ایک فقرہ ماتم ہے۔ یہی رمز وکنائے انیس کو ممتاز کرکے ایک عظیم الشان بلندی پر بٹھا دیتے ہیں۔ انکا ایک ایک لفظ نشتر غم او خنجر الم ہے۔ مگر افسوس کم لوگ سمجھتے ہیں۔

تسلسل بھی قابل غور ہے۔ ایک مصرعہ اپنی شرح کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ میر انیس ایسی لڑی پروتی ہیں کہ ایک موتی علیحدہ ہو تو پوری لڑی کو نقصان پہونچتا ہے اور وہ موتی خود کم قدر ہو جاتا ہے۔ خود کہتے ہیں۔

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

جبکہ ایک مضمون میں تسلسل کلام کی یہ حالت ہے تو جب ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف رجوع کرتے ہونگے تو کس خوبصورتی سے تسلسل کو قائم رکھتے ہونگے۔ تسلسل کا کوئی جداگانہ عنوان نہ قائم کیا جائیگا مگر بلاغت وغیرہ کی جو مثالیں پیش ہونگی اُسی میں تسلسل بھی دکھایا جائے گا۔

(۲) جس روز کربلا میں یہ ہولناک واقعہ درپیش تھا۔ امامؑ کا ایک غائبانہ دلدادہ جو آپکی قدمبوسی اور نجف اشرف کی زیارت سے مشرف ہونے کو گھر سے چلا تھا وہاں اُسوقت پہونچا جب حسینؑ تن تنہا زخموں سے چور کھڑے تھے۔ یہ عبرتناک منظر دیکھکر رُک گیا اور امام مظلوم کو بارادت سلام کیا۔ ایسے وقت میں جبکہ سایہ بھی نہ ساتھ دیتا تھا تمام یار و مددگار، اعزا و اقربا پاؤں پھیلائے گرم ریت پر آنکھوں کے سامنے آرام کر رہے تھے اُسکا آکر سلام کرنا تعجب کا باعث ہوا۔ آپ

اُس سے مفسر حالات ہوئے تو معلوم ہوا کہ آپ کا عاشق زار ہے اور آپ ہی کے لیے اس قدر مصائب جھیل کر یہاں تک پہونچا ہے۔ درد رسیدہ کو درد رسیدہ سے اُنس ہوتا ہے۔ امامؑ نے اُسے گلے سے لگا لیا اور اپنے مصائب کا ذکر فرمانے لگے تاکہ اُسے تسکین ہو۔ فرماتے ہیں......

ہاں مدتوں سے ہے یہی نیرنگِ روزگار ہر گُل پہ ایک دن ہے خزاں ایک دن بہار

امام علیہ السلام فرماتے ہیں.... "کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلا نہیں ۔ دن تیسرا ہے آج کہ پانی ملا نہیں"
امام مظلوم اپنے مصائب تو اُسکے قلب کی تسکین کے خاطر بیان فرماتے ہیں مگر اس طرح کہ شکوہ نہ ثابت ہو کہ استقلال اور صبر میں تنک گذرے۔ امام علیہ السلام پیاس کی بھی شکایت نہیں کرتے۔ دریا سامنے لہرا رہا ہے۔ چرند پرند سیراب ہوتے ہیں۔ وہ مرد مسافر دیکھ رہا ہے کہ امام دریا سے کسقدر قریب ہیں۔ امام محض واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں مگر گمان ہوتا ہے مبادا اس بیان کو سامع شکایت پر محمول کرے۔ لہذا فرماتے ہیں "کہنے میں بات آتی ہے"۔ مگر بلاغت ملاحظہ ہو۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ مزید تصریح کر دی "یہ کچھ گلا نہیں"۔ یعنی واقعات لوگ بنظر واقعات بیان کرتے ہی ہیں۔ جس طرح ایک تیسرا اور غیر متعلق شخص بیان کرتا اُسی طرح امام نے بیان کردیا۔ یہ گلہ ہرگز نہیں۔

اس بیت کی مرثیت صرف اہل دل جان سکتے ہیں۔ یہ گوشے اور کنائے انیس ہی کے حصہ میں آئے ہیں۔ اس بیت میں فطرت اور معاشرت انسانی کو جس طرح انیس نے ظاہر کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ حقیقی اور فطری شاعری اسی کا نام ہے۔ جو فرق مراتب امام اور دوسرے لوگوں میں ہونا چاہیے اُسے کس خوبی سے دکھلایا ہے۔ صبر و استقلال۔ عالی ہمتی۔ بلند حوصلگی۔ ہمدردی وغیرہ بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے۔ کہاں تک شرح ہو۔ انیس۔ بیشک ماننا پڑتا ہے کہ تو اقلیم سخن کا خدائے واحد ہے۔

بلاغت کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جب ابوالفضل عباس کو جہاد کی رخصت مل چکی تو حرم میں شور و اویلا برپا ہوا۔ اور یہ تذکرہ ہونے لگا کہ اب امام مظلوم اور بھی بے آس ہوگئے۔ حضرت سکینہ نازکپن سے کہتی ہیں کہ میرے ہوتے ہوئے عباسؑ کس طرح جائیںگے مجمع کو ہٹاتی اُنکے پاس اسوقت پہونچیں جب وہ چلنے کو تیار تھے۔ چونکہ حضرت سکینہ حضرت عباس سے بہت مانوس تھیں اسلیے وہ چھپا کر جانا چاہتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ ہٹ کریں اور نہ جانے دیں۔ وہ دہشت

دیکھ کر حضرت سکینہ کہتی ہیں ؎

چلا ئی کہ سمجھی ہیں جہاں چھپ کے چلے تھے آتی ہوں بھلا مجھ سے کہاں چھپ کے چلے تھے

بچپن کا ناز ۔ پیار کی تقریر ۔ بچوں کی فطرت ۔ طفلانہ ہٹ ۔ غرضکہ سب کچھ دکھلا دیا ہے ۔ اس سے بہتر بچوں کی فطرت کی تصویر نہیں ہو سکتی ہے ۔

ابوالفضل عباس اپنی زوجہ کو سمجھا رہے ہیں کہ مجھے میدان میں جانے دو ۔ وہ رو رہی ہیں ۔ سکینہ وہیں موجود ہیں ۔ یہ بھی رونے لگتی ہیں ۔ عباسؑ سمجھاتے ہیں کہ ہم تمھارے لیے پانی لانے کو جاتے ہیں روؤ نہیں مگر یہاں کا حال امام سے نہ کہنا ۔ حضرت سکینہ وہاں سے باپ کے پاس آتی ہیں ۔ یہاں حضرت زینبؑ امام کو مضطر دیکھکر فرماتی ہیں کہ ابوالفضل عباس کو بلاؤ کہاں ہیں ۔ بھائی کو کیوں رُلاتے ہیں کیا یہی پیار ہے ۔ اب سکینہ وہاں کا پورا حال بیان کر دیتی ہیں ؎

بولی یہ سکینہ کہ سنو مجھ سے پھوپھی جان میں تھی وہیں کرتے ہیں چچا کوچ کا سامان ......

...... اب مفصل حالت بیان کر کے فرماتی ہیں (حضرت عباس کی زبانی)

... "پر حال یہاں کا مرے آقا سے نہ کہنا روتی ہیں چچی یہ شہ والا سے نہ کہنا"

ابوالفضل عباس نے حال کہنے کو منع کیا تھا کہ رونے کا حال سنکر امام کو رخصت میں تامل ہو گا ۔ مگر یہی نہیں کیا کہ سب حال بیان کر دیا یہ بھی کہہ دیا کہ حال بیان کرنے کو منع کیا تھا ۔ کیا بچوں کی فطرت اس سے بہتر الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں ۔ حسنرت یہ سنکر آبدیدہ ہوئے تو سکینہؑ کو کچھ خیال ہوا اور کس ناز سے کہا ......

عاشق ہیں مرے مجھکو رُلا سکتے ہیں عباس تم روؤ نہ بابا کہیں جا سکتے ہیں عباس

حضرت علی اکبر بشبیہ پیغمبر جب میدان میں آئے تو فوج کے سپاہی یہ سمجھے کہ خود رسول آئے ہیں اور عمر سعد سے کہتے ہیں ۔

"دُنیا میں دوسرا کوئی تجھ سا شقی نہیں بتلا یہ کون ہے جو ہمارا نبی نہیں ...

"تیرے ہمارے بیچ میں پردہ ہے مصطفےٰ کھا تو قسم نہیں ہے یہ گیسوے مصطفےٰ

قامت ہے ساف قامت دلجوے مصطفےٰ ایسے نہ تھے ملے ہوئے گیسوے مصطفےٰ"

دبیر نے یہاں بلاغت کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ لشکریان یزید کی حالت کو کس بلیغ پیرایہ سے دکھایا ہے

کبھی رسول عربیؐ کو دیکھا ہوگا۔ چونکہ حسن رسول بے مثال تھا لہذا اشتباہ حسن کا جوان دیکھکر سمجھے کہ رسول ہی ہیں یہ نہیں معلوم رسول کی وفات ہوگئی۔ صرف نبی کا نام جانتے ہیں اور قرآن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ غضب یہ کہ تمام جزئیات انھیں کے منہ سے بیان کراکے شاعر نے ہم شباہت رسول ثابت کردی۔ طرہ یہ کہ روئے مصطفیٰ کو سپاہی اپنے اور عمر سعد کے درمیان میں دیتے ہیں یعنی ایک طرح کی قسم کھاتے ہیں کہ روئے مصطفیٰ کاذب کو سزا دے۔ اب عمر سعد کا جواب سنیے۔ وہ جاہل نہیں ہے سب کچھ جانتا ہے۔ رسول اور ہمشبیہ رسول میں امتیاز کرتا ہے لیکن درحقیقت جاہل سپاہیوں سے بھی زیادہ جاہل ہے "ختم اللہ علی قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم غشاوہ" عمر سعد ہی کے لیے آیا تھا۔

"ہوتا نہ تھا کسی کا تنِ پاک پر گذر — سایہ کبھی نہ جسم کا پڑتا تھا خاک پر
ہوتا تھا دھوپ میں جو گذر اُس جناب کا — رہتا تھا فرقِ پاک پہ سایا سحاب کا"
"محبوب کبریا نہیں کوئی ملک نہیں — بصورتِ رسولؐ ہے کچھ اسمیں شک نہیں"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فضائل نبوی سے آگاہ تھا۔ چونکہ وہ ایک صحابی کا بیٹا ہے اسلیے گمان ہوتا ہے کہ رسول کی زیارت کی ہوگی یا باپ سے فضائل محمدؐ و آل محمدؐ سنے ہونگے۔ حسینؑ کے مرتبے سے آگاہ ہوگا۔ رسول نے اُنکے باپ میں جو کچھ کہا تھا وہ عمر سعد نے سنا ہوگا۔ مگر پھر بھی قتل حسینؑ پر تُلا ہوا ہے۔ عمر سعد آگے چلکر کہتا ہے "بالفرض نبی بھی ہیں تو کیا" اکثر بہادروں نے رسولوں سے کی وغا ؛ پتھر سے توڑے گوہر دندانِ مصطفیٰ"۔ رسول سے لڑنے والے عمر سعد کے نزدیک بہادر ہیں۔ اور فوج کو بہادری کا بھرّا دیکر ہمشبیہ رسول کے قتل پر آمادہ کرتا ہے۔ آخر شعر نے ظاہر کردیا کہ خود رسول بھی آج حسینؑ کی مدد کو آئیں تو عمر سعد نہ مانے گا۔ کفر و ارتداد کی حد ہو چکی۔

ابوالفضل عباس سقائے سکینہ بنکر فوج اعدا میں آئے ہیں۔ قبل اسکے کہ صفیں توڑکر دریا میں جائیں اتمام حجت کے لیے طالبِ آب ہوے اور فرمایا کہ سکینہ تا دان تین برس کا بچہ پیاس سے جاں بلب ہے۔ شمر کہتا ہے " خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئیگا ؛ جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائیگا"۔ اصغر کا سن چھ مہینے کا ہے۔ وہ بے زبان بچہ ابھی گھٹنیوں نہیں چل سکتا۔ اسی لیے شمر کہتا ہے کہ اگر یہ بچہ ہو کہ اصغر گھٹنیوں آئے تب بھی ہم بجز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ دینگے۔ مگر سامعین جانتے ہیں کہ اصغر گھٹنیوں تو نہیں آئے مگر میدان جنگ میں آئے ضرور۔ اور شمر نے بجائے آب دریا آبِ تیر سے سیراب بھی کیا۔

کیا شمر کی سنگدلی اس سے بڑھا کر دکھائی جا سکتی ہے۔ مرثیت ملاحظہ ہو۔ یہ ایک شعر ایک مرثیہ ہے۔ یہ بلاغت اور مرثیت بجز انیس کہیں نہیں ملتی۔ اسی لیے تو انیس پر لوگ جان دیتے ہیں۔

ناظرین بلاغت ملاحظہ کر چکے اب انیس کے کلام کے اور محاسن ملاحظہ کریں۔

مناظر قدرت ۔ اردو کیا فارسی میں بھی مناظر قدرت کی تصویر انیس کی طرح کسی مصور قلم نے نہیں کھینچی۔ شام غریباں ہے تو اسکی اداسی اور تاریکی، صبح غم ہے تو اسکی چاک گریبانی اور پریشانی۔ نور کا تڑکا ۔ سیاہی کا پھٹنا ۔ آفتاب کا نکلنا ۔ کواکب کا گم ہونا۔ نسیم و صبا کی پھولوں سے اٹکھیلیاں۔ سبزۂ صحرا کی لہک ۔ شبنم کے قطروں کی دمک ۔ گلوں کا جوش ۔ بلبل کا خروش ۔ دریا کا لہریں مارنا ۔ درختوں کا جھومنا ۔ طیور کا نغمہ سنجی کرنا ۔ غرض کوئی چیز انیس کی نظر سے بچ نہیں سکتی ہے ۔ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اسکا سماں باندھ دیتے ہیں ۔ ہمیشہ گرد و پیش کی اشیا سے کام لیتے ہیں جب کوئی سماں باندھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کے دل میں یہ بات تھی انیس نے اُسے یاد دلا دیا دل بیساختہ پھڑک جاتا ہے اور حالت اضطراب طاری ہوتی ہے ۔ عجیب عالم محویت ہوتا ہے ۔ انیس کی قدر اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب انسان کسی صحرا یا باغ میں جائے اور جن مناظر کی تصویر انیس نے کھینچی ہے اُنھیں بہ امعان نظر مطالعہ کرے اور مقابلہ کرے کہ کہاں تک تصویر اصل سے مشابہت رکھتی ہے ۔ صبح کا سماں ملاحظہ ہو۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

لفظ 'وہ' کی تکرار نے مصرعہ کی شوکت بڑھا دی ۔ صبح اس قدر نورانی ہے کہ کوہ طور کا سماں دکھائی دیتا ہے ۔ نورِ سحر نور قدرت ہے ۔ ستاروں کی چھاؤں بتلاتی ہے کہ نور چھن چھن کر آ رہا ہے ۔ عبادت کا وقت ہے ۔ صرف طیور ہی نہیں اپنی زمزمہ سنجی سے عبادت کرتے ہیں بلکہ اشیائے بے زبان بھی مثل گل اپنی لطافت اور رنگینی سے قدرتِ الٰہی کو ظاہر کرتی ہیں ۔ گویا بزبان حال ثنائے صانع میں مشغول ہیں باوجود ان مناظر اور دلفریبیوں کے یہ سب ایک جنگل کا سماں ہے جو باغ نہیں مگر رشکِ باغ فردوس ہے۔

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلس زنگاریِ فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

نسیم صبح کا چلنا سبزہ کا لہکنا عجب دلفریب منظر ہے۔ ایک دوسرے مقام پر میر صاحب نے اس حالت کو خوب نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں مصرعہ" لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر" صبح کو سبزہ کا رنگ خوب ہرا ہوتا ہے کچھ تو اوس کھانے سے اور کچھ ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی ہونے کی وجہ سے۔ دھوپ سے تازگی جاتی رہتی ہے۔ صبح کو سبزہ کا رنگ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی جھوم رہی ہیں۔ گویا سرد ہوا نے مست کر دیا ہے۔ اور پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے وہ بھی جھوم رہی ہیں۔ بوئے گل تمام پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ اللہ عجب منظر دلکش ہے سبز سبز پتوں پر شبنم کے صاف صاف اور براق قطرے موتی کی طرح جھلک رہے ہیں جنکے سامنے ہیرے کی سبزی اور موتی کی آب و تاب ماند ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پتوں پر تمام موتی بکھرے ہوئے تھے۔

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے تھالے بھی نخل کے سبدِ گلفروش تھے

ود کی تکرار عجب مزا دیتی ہے۔ نور سحر کو اوپر کے بندوں میں دکھلا چکے ہیں۔ اب دشت کی دلفریبی اور دلاویزی ملاحظہ ہو " سہانا سا" اس لفظ نے دشت کا جو سماں پیش کیا ہے دل اُسکے مزے لیتا ہے دماغ اُسکا تصور کرتا ہے مگر الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ صبح کو فضائے صحرا عموماً بھلی لگتی ہے چہ جائیکہ اس سازوسامان کے ساتھ۔ طاؤس صبح کو عالم وجد میں خوب رقص کرتا ہے۔ دراج اور کبک وغیرہ کی نغمہ سنجی فضائے ہوا میں گونج رہی ہے۔ دل خود بخود لوٹا جاتا ہے۔ عجب دلکش تصویر ہے۔ پھولوں کا جوش ہے کہ معلوم ہوتا ہے خون ٹپکنے کو ہے۔ طائران خوش الحان کی ترانہ سنجی غضب کرتی ہے۔ صبح کی خنکی جگر کو فرحت اور قلب کو تازگی بخشتی ہے اور زخم جگر دھو دیتی ہے۔ عجب سرور کا وقت ہے سبز سبز پتوں میں سرخ سرخ پھول کیا ہی بھلے لگتے ہیں۔ گلوں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ہر نخل کے تھالے گرے ہوئے پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں اور سبدِ گلفروش معلوم ہوتے ہیں۔

جذباتِ انسانی - چونکہ میر انیس فطرت اور معاشرتِ انسانی کے بہت بڑے رازداں ہیں اور

اسی کے ساتھ زبان پر پوری قدرت ہے وہ تمام جذبات کو پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں اور موبہو ادا کر دیتے ہیں اور یہ انیس کے کلام کی خاص صفت ہے۔ سچ پوچھیے تو ترجمانی جذبات شاعری کی جان ہے اور "دل" تو اسی کو شاعری کہتا ہے۔ مادی اشیا کی تصویر کشی مصور کر لیتا ہے اور شاعر کو بھی آسانی ہوتی ہے کہ اشیاے خارجی کا نقشہ اپنے زور قلم سے کھینچ دے۔ مگر قلب انسانی کی بوقلمونی کیفیات، ہزارہا مختلف جذبات، اور پھر ہر ایک جذبہ اور کیفیت حسب موقعہ افراط وتفریط کے ساتھ ادا کیا جانا بہت مشکل ہے۔ مگر انیس کا کلام ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل کی ترجمانی کی ہے اور یہی انکے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ جذبات انسانی مختلف النوع اور مختلف الکیفیت ہیں لذت والم۔ درد وغم۔ رنج وخوشی۔ جوش ومسرت۔ غیظ وغضب۔ محبت۔ مروت۔ الفت۔ رشک حسد۔ حوصلہ وہمت۔ خوف وہراس۔ غرضکہ انیس نے جس چیز کو لیا ہے اعلیٰ درجہ پر اور بکمال بلاغت نظم کیا ہے۔ جذبات کے مدارج مثلاً باپ بیٹے کی محبت۔ ماں بیٹے کی محبت۔ بھائی بھائی کی محبت۔ دوست واحباب کی محبت۔ غرض انیس کی نگاہ باریک بیں اور نکتہ رس تمام مدارج دکھلا دیتی ہے۔ اب جذبات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کنار نہر خیمہ نصب ہو رہا ہے۔ سید الشہداء کرسی پر جلوہ فگن ہیں۔ ابوالفضل عباس مصروف اہتمام ہیں اہل حرم ہودج و محمل میں ابھی تشریف فرما ہیں۔ اتنے میں فوج یزید پہونچکر مانع ہوتی ہے۔ کنار نہر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اہل حرم محملوں میں مضطرب الحال اور پریشان ہیں۔ مگر انیس کے قلم سے جن مخدرہ کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے وہ حضرت زینب ہیں۔ یہیں جذبات کے مدارج کا پتہ چل گیا۔ سب سے پہلے وہ مخدرہ فضہ سے فرماتی ہیں کہ دیکھو تو یہ کیسا شور و غل ہے۔ وہ پردہ سے تاک کر عرض کرتی ہیں...." بلوہ کنار نہر ہے اے بنت مرتضیٰ"۔ اور یہ بھی بتلاتی ہیں کہ ابوالفضل عباس برہم ہیں۔ حضرت زینب کے اضطراب کی حد نہیں رہتی اور ایسی حالت میں فرماتی ہیں۔

۳۴۳ "ہمشیر کو نثار امام امم کرو لوگو دعائیں اکبر مہرو پہ دم کرو"

تمام اعزا و اقربا کنار نہر ہیں حتیٰ کہ آپ کے دونوں صاحبزادے بھی جو کہ خورد سال ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کا خیال زیادہ ہونا چاہیے کہ کہیں بلوہ میں آکر دب نہ جائیں مگر محبت جسکی زیادہ ہوتی ہے اسی کا نام اضطراب میں زبان پر آتا ہے۔ پھر ملاحظہ ہو کہ اکبر پر جنھیں خود اٹھارہ برس تک بڑی شفقت

اور مصیبت سے پالا ہے اور بیٹیوں سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں صرف دعا دم کرنے کو کہتی ہیں گر بھائی پر نثار ہونے کی خواہش ہے تاکہ سبطِ رسولؐ کی بلا رد ہو۔

جب زیادہ ہلچل مچی تو امامؑ نے اُٹھکر بھائی کو روکا اور سمجھایا کہ چلے آؤ جانے دو۔ حکمِ امامؑ سے ابوالفضل عباس ہٹے تو ضرور مگر فرمایا۔

"ہاں یہ ملال ہے کہ سر انکے کٹے نہیں تیغوں کے سامنے سے کبھی ہم ہٹے نہیں" - اور
"کہتے تھے راہ میں کہ نہ وار اپنا چل گیا افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا"

حضرت کی شجاعانہ حسرت اور دریا کے نکل جانے کے افسوس کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

حضرت علی اکبر خیمہ میں طلبِ رخصت کو آئے ہیں۔ پہلے ماں سے رخصت طلب کی تاکہ پھوپھی سے رخصت طلب کرنے کی سند ہاتھ لگے کیونکہ اُن کا پیار مشہور تھا۔ حضرت زینب کو یہ خیال ہوا کہ مجھے بھلا دیا اور محبت سے بیقرار ہو گئیں۔ اسی غم و غصہ کی حالت میں بیہوش ہو گئیں۔

"زانو پہ سر لیے ہوئے کبرٰی ہے بے حواس اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلامِ یاس
اب تابِ طاقت جسد و روح و دل گئی کیوں صاحبو رضا علی اکبر کو مل گئی"

بیہوش ہیں مگر بیہوشی میں بھی علی اکبر ہی کا نام وردِ زباں ہے اور اُنہیں میں دھیان ہے۔ حضرت اکبر آکر قدم پر گر پڑتے ہیں۔ "بس ہو گئیں محبتِ قلبی سے بیقرار ۔ پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھیں بحالِ زار شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار" ۔ ابھی تو یہ حالت تھی کہ غصہ سے بیتاب تھیں یا نثار ہونے لگیں۔ جذبۂ محبت سب جذبوں پر غالب آگیا۔ پیارے کے پیار میں سب بھول گئیں۔

حضرت زینب کے صاحبزادے عون و محمد میں آپس میں تکرار ہے کہ پہلے کون میدان کو جائے جب یہ قصہ آپس میں نہ فیصل ہوا تو ماں کے پاس آئے اور عون نے کہا مجھے یہ اکیلے جانے دیں۔ چھوٹے صاحبزادے کا حال ملاحظہ ہو اور انیس کی جذبات کی تصویر کشی کی داد دی جائے۔

یہ کہہ کے چپ خاموش ہوا عون خوش اطوار صدمہ سے نہ چھوٹے کو رہی طاقتِ گفتار
بس آنکھوں کو مَل مَل کے وہ رونے لگا یکبار کی عرض سنا آپ نے اے مادرِ غمخوار

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باپ کی جا ہیں کیا جانیے کس بات پہ ہم سے یہ خفا ہیں
ٹھہرا کے جدائی کا سخن دل مرا توڑا شاید ہیں یہ جنگ کے قابل نہیں سمجھے

چھوٹے ہیں جواب اسکا بڑے بھائی کو کیا دیں ۔۔۔ اچھا ہمیں لاکھوں سے یہ لڑنے کی رضا دیں

اک حملہ میں گر ہم نہ اُلٹ دیں صف لشکر ۔۔۔ پھر دودھ نہ اپنا ہمیں تم بخشیو مادر

شہ کے قدم پاک پہ سر دیکے پھرینگے ۔۔۔ یا رن سے سر شمر و عمرو لیکے پھرینگے

آخری شعر میں جس جوش شجاعت کا اظہار ہے یہ تخصیص قابلِ غور ہے۔

حضرت اکبر باپ سے رخصت طلب کرتے ہیں۔ وہ پھوپھی اور ماں کے پاس بھیجتے ہیں۔ حضرت اکبر خیمہ میں آئے تو حضرت زینب انھیں لپٹا کر پوچھتی ہیں۔ "روکر کہا کہو مرے بھائی کی کچھ خبر" اب علی اکبر اس طرح حالت بیان کرتے ہیں کہ سب لوگ بیقرار ہو کر اجازت دیدیں۔ کہتے ہیں۔

"رونے کی جا ہے قبلہ و کعبہ کے حال پر ۔۔۔ سب فوج کی چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

اتنا کوئی نہیں ہے کہ سینہ سپر کرے ۔۔۔ تیروں کی اب ہم ہے خدا اسکو سر کرے"

اہل حرم یہ سنکر بیتاب ہوگئے اور خصوصاً حضرت زینب۔

"یہ سنکے پیٹنے لگی زینب جگر فگار ۔۔۔ رانڈوں میں وا حسین کی ہر سو ہوئی پکار"

اب حضرت شہربانو کے جذبات غم و غصہ۔ ندامت۔ شرم وغیرہ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ ہاں اتنا اور بھی ملحوظ رہے کہ اب کسی کے پاس اولاد یا کوئی دولت نہیں ہے کہ امام حسین پر نثار کرے۔ تمام بیبیوں نے اپنی اپنی کمائی لٹا دی اب صرف بانو کی دولت باقی ہے۔ بیبیوں کو روتے دیکھکر حضرت بانو کو شرم اور ندامت ہوتی ہے اور فرماتی ہیں " تم رن سے ایسے وقت میں کیوں آئے میں نثار کس نے طلب کیا تھا جو گھبرا کے آئے ہو"۔ "میں مرگئی تھی کیا جو چلے آئے بیحواس ؛ کیا کہتے ہونگے دل میں شہنشاہِ حق شناس"۔ "سیدتری مدد کو یہ لونڈی کسے بلائے" "کیا وقت ہے نثار شہ مشرقین کے ؛ کاٹے مرا گلا کوئی بدلے حسین کے"۔ پھر صاحبزادے سے استفسار فرماتی ہیں "چھوڑ آئے کسکو تیغوں میں سبطِ نبی کے پاس ؛ بتلا دو پاس سب ہیں رفیقان پر جگر ؛ بھائی سے دو۔ تو نہیں عباس نامور ؛ قاسم کیے ہیں سینہ کو تلواروں میں سپر ؛ زینب کے دونوں چاند ہیں پہلو میں جلوہ گر ؛ تم گھر میں آئے گر تو مجھے کچھ گلا نہیں ؛ تنہا تو نور چشم رسول خدا نہیں ؛"

جس خوبی سے مختلف جذبات کو ادا کیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ حضرت اکبر تیار ہوتے ہیں اور میدان کو جا رہے ہیں تو۔۔۔ "ماں کو یقیں ہوا کہ چلا اب جوان پسر ؛ پھیلا کے دونوں ہاتھ پکاری وہ نوحہ گر ؛ اتنا تو منہ سے کہدو کہ رن سے کب آؤگے ؛ واری مرے گلے سے نہ کیا مل کے جاؤگے"۔

حُسن آرا

اک زنِ خوبرو تھی حور ادا — نام تھا اُس پری کا حُسن آرا
اُسکی عصمت سے تھا منور گھر — شوہر اُسکا گیا تھا بہرِ سفر
مولوی اک قریب رہتے تھے — گھر میں اک روز آئے خط لکھنے
پردے کی آڑ میں تھی حُسن آرا — گر پڑا اتفاق سے پردا
مولوی سے نظر جو اُسکی لڑی — ایک برچھی دل و جگر پہ پڑی
عَلَمِ عشق گر گیا دل پر — عشق کا تیر پڑ گیا دل پر
برق تھی یا تجلیِ ایمن — طورِ دل جل کے ہوگیا گلخن
وہ لگا جانے کیا ہے کیا کہنے — "کیا لکھوں" "کیا لکھوں" لگا بکنے
نیک بی بی کو سخت رنج ہوا — مولوی کو گھر اُس کے بھجوایا
ہوا دیوانہ عاشقِ ناشاد — "کیا لکھوں" کے سوا نہ تھا کچھ یاد
کچھ ضرورت سے کرکے ترکِ سفر — حسن آرا کا آگیا شوہر
سُن چکی جب میاں کا افسانہ — مولوی کا سنایا افسانہ
پھر کہا تم ابھی ابھی جاؤ — مولوی کو مکان میں لاؤ
کم ہو دیوانگی کا اُس کی جوش — دیکھکر مجھکو شاید آئے ہوش
شوہرِ نیک دل گیا۔ آیا — مولوی کو مکان میں لایا
دیکھکر ایک دوسرے کو خوب — مرگئے دونوں طالب و مطلوب
جان لینے پہ عشق ہے مجبور — اسکی سرکار کا ہے یہ دستور
ایک خوش ہوکے جان لیتا ہے — ایک خوش ہوکے جان دیتا ہے

حکیم جگر۔ صدیقی۔ بسوانی

مترادفات

تقریباً ہر زبان میں چند مترادفات تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہر زبان والے یہ کہتے ہیں کہ زبان میں کچھ مرادفات بھی ہوتے ہیں۔ وہ زبانیں جنکا سرمایہ کم ہو شاید مرادفات سے خالی سمجھی جاتی ہوں ورنہ ہر زبان میں مترادفات کی ہستی تسلیم کی جاتی ہے۔

جب کسی مترادف کا اطلاق ہوتا ہے تو اُس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ بعض الفاظ ہم معنی اور ہم مفہوم ہوتے ہیں۔ یا جو الفاظ ایسے ہوں اُنھیں مرادف کہا جاتا ہے۔

جہاں بہت سے لوگ یا بہت سی زبان واں مترادفات کے قائل ہیں بعض لوگ صیغۂ ترادف کے مخالف بھی ہیں۔ اُنکی رائے میں ایک زبان میں مترادفات نہیں ہوسکتے۔ جو لوگ مترادفات کے معترف ہیں اُنکی رائے میں کسی ایک زبان کے اندر بہت سے ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی رکھتے ہیں، یا یہ کہ اُنکا اطلاق ایک ہی مفہوم پر ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک ہی سکہ کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں اسی طرح ایک ہی معنی اور ایک ہی مفہوم کے بہت سے الفاظ بھی ہوسکتے ہیں۔ جس طرح ایک کمہار بہت سے برتن ایک ہی شکل اور ایک ہی قد و پیمانہ کے بنا لیتا ہے اسی طرح اکثر الفاظ بھی ایک ہی معنی اور ایک ہی شکل کے ہوتے ہیں۔

بظاہر یہ توجیہ اور یہ تاویل بہت کچھ یقین افزا ثابت ہوتی ہے اور کمہار کی تمثیل سے دل قبول بھی کرتا ہے لیکن جب ہم تکوینِ زبان کے فلسفہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ مذبذب ہونا پڑتا ہے۔ میری رائے میں کمہار کی مثال درست نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کمہار بھی مختلف ہوتے ہیں اور اُنکی ساختیں بھی مختلف ہوتی ہیں مگر تکوینِ الفاظ اور توضیعِ الفاظ کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ اس بحث میں سوالاتِ ذیل قابلِ غور ہیں:—

(الف) کیا زبان ایک ہی دفعہ بنی ہے؟

(ب) کیا الفاظ کی توضیع ایک ہی دفعہ ہوئی ہے؟

(ج) کیا توضیعِ الفاظ کی علت ضروریات نہیں ہیں؟

(د) کیا ہر انسان کا مذاق جداگانہ نہیں ہے ؟

(ہ) اور کیا توضیع الفاظ میں مذاق انسانی کو دخل نہیں ؟

یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ انسان اُنپر غور کیے ہوئے بغیر مرادفات کی بحث پر کوئی سلیم رائے دے سکے۔

بمصداق آیۂ کریمہ "وعلم آدم الاسمآء کلہا" خدا نے ہر انسان کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ رکھ دیا ہے جسکے زور سے وہ تکوین الفاظ پر قادر ہے۔ یہ جتنی زبانیں اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہیں سب اسی ملکۂ تکوین کے تحت نشوونما پا چکی ہیں۔ فقرۂ بالا میں اسماء کی قید اس واسطے لگائی گئی ہے کہ ہر زبان اسماء ہی سے شروع ہوتی ہے اور اسماء ہی اُسکا ذخیرۂ ادبیں ہیں۔

اس کائنات میں جس قدر زبانیں پائی جاتی ہیں اُنکی تکوین ایک ہی دفعہ نہیں ہوئی۔ اگرچہ ابتدائی زبان ایک ہی تھی مگر رفتہ رفتہ اُسکی شاخیں ہوتی گئیں۔ اور اُسکی فرعیں مختلف رنگوں میں تغیر پاتی رہیں۔ اگرچہ جملہ زبانیں ایرین اور سامیٹک میں تقسیم کردی گئی ہیں مگر میری رائے میں یہ دونوں صورتیں ایک ہی ہیں۔ یا ایک ہی زبان سے انکی بنیاد پڑی ہے اور ایک ہی ان کی اصل ہے۔ اگرچہ پہلی زبان ایک ہی ہے مگر وہ بھی ایک ہی دفعہ نہیں بنی ہے رفتہ رفتہ اُس نے بھی نشوونما پائی ہے۔ اور اُسکے نقش قدم پر اور جس قدر زبانیں رفتہ رفتہ بنتی گئیں وہ بھی کسی ایک زمانہ یا ایک شخص کا اندوختہ نہیں ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف اشخاص اُنکے بانی ہوئے ہیں۔ چار لفظ کسی نے بنائے یا کسی کے منہ سے نکلے اور دس کسی کے مُنہ سے۔ جیسے جیسے ضرورتیں پیش آتی گئیں ویسے ویسے اضطراری اور اجتہادی رنگ میں الفاظ وضع ہوتے گئے۔ ابتک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اب بھی زبانوں میں جدید الفاظ داخل ہوتے ہیں اگرچہ اُنکا علم مشکل ہوتا ہے مگر اُنکی ہستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

الفاظ کی توضیع ایک ہی دفعہ نہیں ہوتی ہے سب الفاظ مختلف زبانوں میں مختلف اغراض کے تحت ہستی پذیر ہوتے رہے ہیں۔ پہلے ایک مفہوم ذہن نشین ہوا اور اُسکے بعد وضع الفاظ کی نوبت آئی۔ مثلاً ایک شخص نے خیال کیا کہ پانی کس طرح ایک جگہ پر ضرورت کے واسطے جمع کیا جائے جو وقت پر کام آسکے۔ اُس نے اس ضرورت کے واسطے ایک برتن بنایا جسکا نام اُس نے ظرف رکھا یا برتن گھڑا۔ آبخورہ۔ لوٹا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو ایک غرض سب سے اول وجود پذیر ہوئی

اور اُسکے واسطے لفظ کی توضیع بعد میں عمل پذیر ہوئی۔

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب ضرورتیں ایک ہی دفعہ ہستی پذیر ہوتی ہیں۔ مختلف اوقات میں ہی نہیں بلکہ مختلف لوگوں کو بھی اُنکا احساس ہوتا ہے اور حسب مذاقہائے مختلف۔ مثلاً لوہار کو جو ضرورتیں پیش نظر ہوتی ہیں ترکھان (بڑھئی) کی ضرورتیں اُس سے سوا ہوتی ہیں۔ نائی کی ضرورتیں نانبائی کی ضرورتوں سے متغائر ہوتی ہیں۔ معلم کی ضرورتیں شاگرد کی ضرورتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی ضروریات کے تحت معانی و مطالب مختلفہ کے تابع الفاظ وضع کرتا ہے اور اُنکا زمانہ ایک نہیں ہوتا اور نہ اُن کے بنانے والے ہی ایک ہوتے ہیں۔ ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

یہ ثابت ہے کہ توضیع الفاظ کی علت اولیں ضروریات ہیں۔ اور چونکہ ضروریات متفرد ہیں اس واسطے مذاق بھی مختلف ہیں۔ اختلافِ مذاق ہی کی وجہ سے ضروریات جدا جدا ہیں اور توضیع الفاظ میں مذاقِ انسانی کو ایسا ہی دخل ہے جیسے ضرورت کی وابستگی انسان سے ہے۔ انسان بغیر ضروریات کے زندگی بسر ہی نہیں کر سکتا اور نہ اُنکے بغیر اُسکی زندگی خوبی کے ساتھ گذر سکتی ہے۔ ضروریات اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ جب الفاظ اور السنہ مختلف لوگوں اور مختلف ازمنہ کی کمائی اور اندوختہ ہیں تو پھر اس امر کا ماننا کسی حد تک مشکل ہے کہ اُنکا بہت سا حصہ مترادف ہے۔ یہ کہنا تو ایسا ہی ہے جیسے کہ تمام انسان باوجود اختلاف اشکال و ہیئات کے ایک ہی مذاق رکھتے ہیں اور اُنکے اغراض زندگانی بھی ایک ہی ہوتے ہیں۔

بے شک انسان انسانیت اور بعض دیگر امور میں ایک ہی ہیں لیکن اغراض اور مذاق میں ایک نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک زبان باعتبار زبان اور الفاظ بلحاظ تلفظ ایک ہی ہیں لیکن باعتبار مفاہیم اور معانی اور اغراض کے ضرور اُن میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے اور ایسا تباین لازمی ہے۔

یہ کہنا کہ تحقیق۔ تفتیش۔ تعلیم۔ تربیت وغیرہ وغیرہ مرادفات میں سے ہیں ایک فریب خیال ہے مترادفات کی دو قسمیں ہیں۔ (الف) مترادفات لفظی (ب) مترادفات معنوی۔ پہلی قسم تو شاید ہو بھی دوسری قسم بہت ہی کم ہے۔ ممکن ہے کہ نذیر اور نظیر۔ تابع اور طابع۔ تبع اور طبع وغیرہ ایسے بہت سے الفاظ ہوں لیکن معنوی مرادفات ایک ہی زبان میں ہونے مشکل ہیں۔ ہاں ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے الفاظ سے معنوی رنگ میں ہم ردیف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

پدر - فادر - ابو، مدر - مادر - ام، گو - جاؤ، کم - آؤ وغیرہ وغیرہ دو زبانوں کے مرادفات ہیں - جب پدر بولیں گے تو اُس سے فادر اور ابو ہی مراد ہوگا اور جب مدر کہیں گے تو اُس سے مادر اور ام ہی مراد ہوگی -

الفاظ کی پانچ قسمیں ہیں - (۱) کاروباری (۲) علمی (۳) مذہبی (۴) رواجی (۵) رسمی - ممکن ہے کہ الفاظ نمبر ۱ - ۴ - اور ۵ میں کچھ مرادفات ہوں بھی لیکن نمبر ۲، اور نمبر ۳ میں شاذ و نادر ہی مرادفات ہوتے ہیں - مثلاً ہمیشہ بعض لوگ "تحقیق" "اور تفتیش" کو ترادف کے معنوں میں بول دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں فرق ہے - تحقیق سے وہ عمل مراد ہے جس میں ایک محقق ناقدانہ اجابت کے تحت ایک واقعہ کو دریافت کرتا ہے اور اُسپر ایک تجویزی حکم لگاتا ہے - تفتیش ایک ابتدائی مرحلہ کا نام ہے جس میں ایک سرسری اور سطحی رنگ اختیار کیا جاتا ہے اور کوئی ناقدانہ حکم نہیں دیا جا سکتا - دیکھو اسی واسطے سرکاری قوانین میں تفتیش سے مراد دریافت پولیس ہے اور تحقیق سے مراد مجسٹریٹ کا عمل - کیونکہ پہلے عمل میں ناقدانہ حکم نہیں دیا جاتا اور دوسرے میں ایک ناقدانہ تجویز ہوتی ہے -

اسی طرح "الزام" اور "جُرم" کو لے لو الزام صرف ایک سرسری رائے ہوتی ہے - جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ملزم ہے تو اُسکا منشا یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر یا سرسری طور پر فلاں شخص کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے - اور جب کسی کو مجرم کہا جاتا ہے تو اُسکی نسبت عموماً یہ قیاس ہوتا ہے دلائل کے ساتھ کہ ایک حد تک اُسپر فلاں ارتکاب یا فلاں اقدام ثابت ہے - انگریزی عدالتوں میں بھی ان دونوں الفاظ اور انکے معانی اور اغراض میں فرق کیا جاتا ہے -

تکریم اور تعظیم میں فرق ہے - تکریم سے مراد ایک شخص کا باعتبار اُسکی ذاتی بکرمت کے ادب کرنا ہے جو ثابت ہے - اور تعظیم سے مراد ایسا ادب بھی ہے جو محض ایک نمائشی اور خود غرضانہ رنگ میں کیا جاتا ہے -

فعل اور عمل میں بھی فرق ہے - فعل سے مراد محض ایک کام ہے - عمل سے مراد اُس کام کے ہیں، جو ایک قانون اور مقررہ طریقہ کے تحت کیا جاتا ہے -

محبت اور الفت میں بھی فرق ہے - محبت عموماً خود غرضی ناجائز سے مبرا ہوتی ہے اور الفت میں صرف ایک تألف ہوتا ہے جو عموماً ایک قسم کی خود غرضی رکھتا ہے - یہ کہسکتے ہیں کہ فلاں

فلاں کا محبوب ہے مگر نہیں کہتے کہ فلاں فلاں کا مالوف ہے۔ محبت دل سے اُٹھتی ہے اور الفت بعض دیگر بیرونی ذرایع کی بھی تابع ہوتی ہے۔ تالف کے معنی جوڑ دینے یا ملا دینے کے ہیں۔ جو بعض وقت عارضی بھی ہوتا ہے۔ محبت خود بخود راہ نکالتی اور خود بخود دلوں میں جگہ کرتی اور اپنا مرکز بناتی ہے۔

تصنیف اور تالیف میں فرق ہے۔ مصنف وہ ہے جو اپنے دلی اجتہاد کے تحت کوئی ؎ ..... لکھتا ہے اور مؤلف وہ ہوتا ہے جو اوروں کے خیالات کا ایک خاص یا اپنے رنگ میں اظہار کرتا ہے۔

ظاہر اور عیاں میں فرق ہے۔ ظاہر سے مراد ایک ایسی کیفیت ہے جو عام طور پر سرسری رنگ میں مشہود ہو۔ عیاں سے مراد ایک ایسی کیفیت ہے جو علمی اور عملی رنگ میں بداہت رکھتی ہے۔ ظاہر تابع دلیل کے ہے اور عیاں میں کسی دلیل کے لانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تاباں اور درخشاں میں فرق ہے۔ تاباں سے مراد وہ حالت اور وہ کیفیت ہے جس میں کوئی شبہہ نہ رہے بذاتہ وہ ایک دلیل کا رنگ رکھتی ہو اور اُسکا نور بجائے خود مستقیم ہو۔ درخشاں سے مراد وہ کیفیت ہے جو کسی نور کے تابع ہو اور کم مستنیر ہو۔ تاباں کی کیفیت کیفیتِ درخشاں کو محتوی ہے اور درخشاں کی کیفیت کیفیت تاباں کی محتوی نہیں ہے۔ آفتاب تاباں ہے اور ستارہ درخشاں۔

غم اور الم میں فرق ہے۔ غم کی کیفیت عارضی بھی ہوتی ہے لیکن الم کی کیفیت عارضی نہیں ہے۔ الم کی زد دل و دماغ پر پڑتی ہے اور غم کی تاثیرات اس سے کم ہوتی ہیں۔

فرحت، مسرت اور بہجت میں فرق ہے۔ مسرت ایک معمولی کیفیت خوشی کا نام ہے اور وہ معمولی وسائل سے بھی ہو جاتی ہے۔ پھول کے سونگھنے سے مسرت ہوتی ہے۔ فرحت اور بہجت نہیں ہوتی۔ فرحت اُن باتوں سے حاصل ہوتی ہے جو ایک امید کے تحت ہوتی ہیں۔ مسرت ناگہانی اور بلا کسی امید کے بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن فرحت کے واسطے امید اور چند وسائل کی ضرورت ہے۔ بہجت ان دونوں (فرحت اور مسرت) سے کچھ اور ہی کیفیت رکھتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ فرحت کا ایک آخری درجہ ہے۔ وہ خاص طور پر دل و دماغ پر موثر ہوتی ہے اور اُسکے فقدان سے دل و دماغ پر ایک زد پڑتی ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ تفریح کی ضرورت ہے تو اُسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چاہے کوئی معمولی اور ناچیز سماں ہی کیا ہو۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ بہجت نہیں تو اسکا منشا یہ ہوتا ہے کہ حقیقی خوشی مفقود ہے۔

تحریر، ترقیم اور تسوید میں فرق ہے۔ تحریر سے ایک عام تحریر مراد ہوتی ہے خواہ وہ کوئی سے رنگ اور قیمت رکھتی ہو۔ لیکن ترقیم سے مراد وہ تحریر ہے جس میں ایک خصوصیت ہو۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ رقمزدۂ فلاں ابن فلاں ہے تو اُس سے مراد ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ تسوید سے مراد صرف تحریر ہی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریر ہے جو ایک خاص مضمون رکھتی ہو اور جسکی تنقید بعد میں ہوتی ہو۔

ذکا اور فہم میں فرق ہے۔ فہم ایک عام قوت کا نام ہے جس میں صرف طبایع کے اعتبار سے خصوصیت اور عمومیت ہوتی ہے لیکن ذکا کا درجہ فہم سے زیادہ ہے۔ ذکا میں فہم شامل ہے اور فہم میں ذکا شامل نہیں یا اُسکو محتوی نہیں۔ فہیم اور ذکی میں بہت کچھ فرق ہے۔ فہیم تو ہر شخص ہوسکتا ہے لیکن ذکی کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ذکاوت ایک ایسی قوت ہے جو فہم پر غالب ہے۔

نظر اور تنقید میں فرق ہے۔ اگرچہ ان دونوں کا درجہ برابر بھی قیاس ہوسکتا ہے مگر پھر بھی فرق ہے۔ نظر سے ایک ایسا مشاہدہ و مطالعہ مراد ہے جو چند دلائل کے تابع ہو اور جس میں مختلف باب بحث کیے جائیں اور جو ایک علمی رنگ رکھتا ہو۔ تنقید نظر کو بھی محتوی ہے اُس سے مراد ایک ایسی نظر ہے جو ناقدانہ رنگ رکھتی ہو۔ جو ضعیف و مضبوط صورتیں الگ کرے اور ایک ناقدانہ نظر سے اُنکی قیمتوں کا فیصلہ کرے۔ یہ تو کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ کے واسطے ایک ناقدانہ نظر کی ضرورت ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ ایک ناظرانہ نظر کی ضرورت ہے۔ جب ایک شخص چند امور کی کیفیت اور حقیقت سے آگاہ ہوتا اور اُنھیں ایک غور سے دیکھتا، اور اُنکے مختلف وسائل پر روشنی ڈالتا ہے تو ایک نظر سے کام لیتا ہے لیکن جب کوئی اُن وسائل، اُن واقعات اور اُن دلائل کی تنقید کرتا اور اُن میں فرق بتاتا ہے تو وہ ایک تنقید کرتا ہے۔ نظر تنقید کو محتوی نہیں لیکن تنقید نظر کی محتوی ہے۔

تعلیم اور تربیت میں فرق ہے۔ تعلیم میں بہت سے وہ امور بھی ہوتے ہیں جو تربیت میں نہیں ہوتے۔ تربیت سے مراد تزکیۂ اخلاق و آداب، روشِ عمل ہے اور تعلیم سے مراد مختلف علوم ہیں۔

منظور اور قبول میں فرق ہے۔ منظور میں ایک ایسا اشارہ ہوتا ہے جو کوئی دوسرا شخص کسی دوسرے شخص سے رکھتا ہے۔ اور قبول کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ قبول صورت کہتے ہیں منظور صورت نہیں کہتے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اسے قبول کیا تو منشاء ہوتا ہے کہ ایک بات کسی نے اپنی مرضی سے تسلیم کرلی یا اُسکا خیر مقدم کیا۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ منظور کیا تو اُسکا منشاء یہ ہوگا

کہ کوئی دوسرا شخص جو ایک خواہش یا ایک امید کسی سے رکھتا تھا اُسے اُس نے منظور کر لیا۔ دیکھو یہ تو کہتے ہیں کہ نگرانی منظور ہو گئی، اپیل منظور ہو گیا، یہ نہیں کہتے کہ نگرانی یا اپیل قبول ہو گیا۔

تمثیل اور نظیر میں فرق ہے۔ تمثیل کسی شے کا صرف ایک وضاحتی یا مشرحانہ ذکر ہوتا ہے۔ جیسے تعزیراتِ ہند اور دیگر کتب میں بعض دقائق کے واضح کرنے کے لیے تماثیل دی جاتی ہیں۔ نظیر سے مراد ایک تائیدی ثبوت ہوتا ہے جو اُسی رنگ میں ہو جسکی بحث ہو رہی ہے۔ جیسے کہ عدالتوں میں مقدمات کے اندر قانون داں نظائر پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے مقدمہ میں چیف کورٹ نے یہ کیا اور ہائی کورٹ نے یہ۔

تسلیم اور رضا میں فرق ہے۔ تسلیم کا اطلاق عموماً انسانی افعال پر ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں۔ اور رضا کا اُن انسانی افعال پر جو قادرِ مطلق کے مقابلہ میں ہوں۔ یہ تو کہتے ہیں "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"۔ سرِ رضا نہیں کہتے۔ تسلیم میں عموماً مجبوری نہیں ہوتی لیکن رضا میں ایک مجبوری کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی واسطے رضینا بالقضاء کہتے ہیں۔

گلستاں اور بوستاں میں فرق ہے۔ جیسے حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی ان دونوں کتابوں میں فرق ہے۔ اگر الفاظ گلستاں اور بوستاں ایک ہی معنی رکھتے تو حضرت شیخ سعدی دونوں کتابوں کے دو نام نہ رکھتے۔ گلستاں لکھکر پھر اُنھیں معنوں میں بوستاں نام رکھنا تحصیل حاصل تھا چونکہ دونوں ناموں میں گونہ اختلاف تھا اس واسطے ایک کتاب کا نام گلستاں رکھا اور دوسری کا بوستاں۔ گلستاں اور بوستاں یا گلستاں اور بستان مترادف نہیں ہیں۔ گلستاں کے معنی جائے گلہا یا مرکز گلہا ہیں اور بوستاں کے معنی جائے خوشبوئے گلہا یا جائے پیدائش گلہا ہیں۔ دونوں لفظ بعض دفعہ ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں حالانکہ مترادف نہیں ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں۔ فتدبر۔

سلطان احمد (گوجرانوالہ)

کیوں آہ نہ ہو چرخِ کہن سے باہر — غربت میں ہوں آوارہ وطن سے باہر
گلچیں نے مجھے خار سمجھکر پھینکا — افسوس بیاباں میں چمن سے باہر

پنجاب میں اک اہلِ سخن آیا ہے (۲) — با خاطرِ پُر رنج و محن آیا ہے
دلی سا چمن چھوڑ کے اک بلبل زار — کس وحشت میں آوارہ وطن آیا ہے

رام نرچپال سنگھ شیدا دہلوی

فلسفۂ کاہلی

آتی ہیں چار سُو سے ٹھنڈی ہوائیں کیا کیا
اور چھیڑتی ہیں سازِ آہستگی سے دل کا
اوراقِ گل پہ شبنم جس طرح ہو گہر بار
یا مارتی ہو پلکیں آہستہ چشمِ بیمار
یہ دلفریب منظر ہے کیا خواب آور!
چاروں طرف بچھی ہے کیا سبز سبز چادر!

پھیلی ہیں اسپہ بیلیں یا سو رہے ہیں بچے؟
ہلتے نہیں ہوا سے یا اُونگھتے ہیں پودے؟

خیر آج کی سناؤ۔ کل کا سوال کیا؟
فکرِ مآل کیسی؟ غم کا خیال کیا؟
ہے جد و جہد سے ہر شے اس جہاں کی آزاد
پر اشرفِ خلائق ہے وقفِ آہ و فریاد
یہ کس خطا کے بدلے جھیلے عذابِ محنت
کیوں آدمی پہ ٹوٹے روز اک نئی مصیبت
دستِ عمل نہیں کیوں لیتا قرار اک دم
پائے طلب رہیں کیوں جنباں ہمارے پیہم

نغمہ سنا رہا ہے یوں سازِ زندگانی
"امن و سکوں میں مضمر ہے رازِ زندگانی"

دیکھو تو کیا تماشا دکھلا رہا ہے جنگل!
دیکھو تو پھوٹتی ہے پیڑوں پہ کیسی کونپل
کیا ہونہار بروے کی باڑھ کا ہے کہنا!
کونپل سے ایک دن یہ رہتا ہے نکلے ٹہنا
بے رنج و سعی و محنت بے فکر و غصہ و غم
کھا کھا کے دھوپ دن کو پی پی کے شب کو شبنم
پروان ہے یہ چڑھتا مثلِ مہ دو ہفتہ
ملتا ہے خاک میں جب ملتا ہے رفتہ رفتہ
آہستہ وہ شگوفوں کا ڈوہوں سے نکلنا
آہستہ پھولنا اور آہستہ اُنکا پھلنا
آہستگی سے بڑھنا، آہستگی سے پکنا
پھر فرشِ مخملیں پر آہستہ سے ٹپکنا،

القصہ سارے قصوں کا صرف ہے یہ حاصل
کہتے ہیں سعی جسکو ہے ایک حرفِ باطل

معلوم ہے کہ ہے موت انجامِ زندگانی
ہم اور ہماری دنیا، جو کچھ ہے سب ہے فانی

ایک ایک کرکے رشتے جب ہم سے چھن رہے ہوں　　تحصیلِ غیر حاصل اور کارِ ابلہی ہے
ہر آں بن رہا ہے مٹ مٹ کے جزوِ ماضی　　اصلاحِ حال پر پھر انسان کیوں ہو راضی

لطفِ سکوں نہ آئے گر زیست میں میسر
اس کشمکش کے جینے سے خوابِ مرگ بہتر

ہر وقت دھیمی دھیمی آوازِ آب جاری　　اک کیفِ نیم خوابی رکھتی ہے ہم پہ طاری
تھپکیاں صبا کی۔ سبزے کا یہ بچھونا　　پھیلا کے پاؤں سیرِ راحت کی نیند سونا
دن کو مئے تصور کا دورِ جام رہنا　　اور شب کو خوابِ شیریں سے شادکام رہنا
پھرنا نگاہ میں وہ گزرا ہوا زمانہ　　بچھڑے ہوئے عزیزوں کا وہ گلے لگانا
پھرنا نگاہ میں وہ رفتارِ پیاری پیاری　　کانوں میں گونجنا وہ گفتارِ پیاری پیاری
اس عیشِ جانفزا کو ہم دیکھیے کیوں خریدیں　　ارمانِ حسرت انجام اور جانگزا امیدیں
پروا ہے کب فغاں کی کب دہر کا گلہ ہے　　یہ وہ سکوں ہے جس کا موت ایک تکملہ ہے

جب یوں فنا بقا میں تمییز ہو نہ قائم
ہے عمر عمرِ جاوید اور عیش عیشِ دائم

محمد مسلم عظیم آبادی

مشرق میں ہیں غروب مجسم جناب صدر　　ظلمت میں ڈھونڈھتا ہوں انھیں کہاں ہیں یہ
قربان کرکے ریش بنے ہیں شہیدِ قوم　　فی الجملہ اپنے صدقِ عمل کے نشاں ہیں یہ
اسلام کے شعار کو زندہ کریں گے آج　　اس عہد میں مجددِ آخر زماں ہیں یہ
خطبے کے حرف حرف سے ٹپکے ہے انگبیں　　معلوم ہو گیا کہ بڑے خوش بیاں ہیں یہ
ذکرِ سلف ہے مطلع و مقطع جناب کا　　پوچھو نہ انکا حال کہ ابنِ فلاں ہیں یہ

ہیں مصلحانِ ملتِ بیضا ادھر ادھر　　اور درمیاں میں محرمِ ہندستاں ہیں یہ
حکمِ خدا ہے غضِ بصر جنکے واسطے　　عبرت سے دیکھیے وہی پیر و جواں ہیں یہ

شکرِ عیش کی دستیابی ہوا یہ مسلم　　انکو نکالدو کہ بڑے بدزباں ہیں یہ

لسان الغیب

یعنی شرح دیوان حافظ مع سوانحعمری خواجہ حافظؒ۔ از میر ولی اسد صاحب بی اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل۔ زبان اردو میں دیوان حافظ کی یہ جامع شرح چار ضخیم جلدوں میں ۲۰ + ۲۶ / ۴ سائز کے ۱۶۴۴ صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ جو نکات تصوف کا ایک بے بہا گنجینہ ہے۔ ابتدا میں حضرت خواجہ صاحب کے مفصل حالات زندگی درج کیے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کے ادبی محاسن پر بھی پوری روشنی ڈالی گئی ہے لغات کی تحقیق۔ دوسرے شعرا کے بیشمار نقلی اشعار قرآن حمید اور احادیث نبوی کے جا بجا اشارے اس شرح کا ممتاز پہلو ہیں خواجہ صاحب نے اگر ایک ہی مضمون کو اپنے کلام میں مختلف شعروں میں ادا کیا ہے تو ہر ایک شعر کے ساتھ تمام ہم مضمون اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بہرحال صوفیانہ رنگ بھی موجود ہے اور ادبی پہلو بھی ملحوظ۔ ملک کے تمام اہل الرائے بزرگوں کا اتفاق ہے کہ یہ شرح درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے غرضکہ ہر حیثیت سے قابل ملاحظہ کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے۔ قیمت جلد اول ۱۲ؔ۔ دوم ۱۲ؔ۔ سوم ۱۲ؔ جلد چہارم ۱۲ؔ

قواعد اردو

(از جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے مہتمم تعلیمات اورنگ آباد دکن وسکرٹری انجمن ترقی اردو۔)

اردو کے قواعد پر جتنی کتابیں اس سے قبل لکھی گئیں تھیں ان میں علی العموم فارسی قواعد کا تتبع کیا گیا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ بعض جگہ یا تو قواعد کو غلط ماننا پڑتا ہے یا زبان کو قواعد سے آزاد سمجھنا پڑتا ہے۔ اس بڑے نقص کو رفع کرنے کی ضرورت اکثر ارباب ذوق محسوس کرتے تھے مگر کوئی ہمت نہیں کرتا تھا کہ ذاتی اجتہاد کو دخل دے۔ اور اس تقلید بیجا کی قید سے آزاد ہو بالآخر جناب مولوی عبدالحق صاحب نے میدان عمل میں قدم بڑھایا اور زبان اردو کی ایک مبسوط اور جامع قواعد ایسے اصولوں پر مرتب کی ہے جو اس زبان پر پوری طرح حاوی ہوسکے جیسے ہم گھروں میں بولتے اور کتابوں میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ کتاب اپنے ادبی محاسن کے لحاظ سے بھی قابل دید ہے۔ قیمت ۱۲ؔ

کیا آپ صاحب اولاد ہیں؟

اگر نہیں ہیں تو یقیناً آپ کو ۔۔۔ اور اگر ہیں تو آپ کے بچوں کی فلاح وبہبود تو ضرور ہی مدنظر ہوگی۔ اور اس بنا پر یہ کہنا غالباً بیجا نہیں کہ آپ کو بچوں کی تعلیم وتربیت کے مسئلے سے کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور ہوگی۔ کیونکہ تعلیم وتربیت کی جلا بغیر بچوں کے جوہر اصلی نمودار نہیں ہوتے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہوں کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کس طریقہ پر کرنا چاہیئے، اور ان ممالک میں جو آجکل اپنی طاقت وترقی سے ایک عالم کو حیران بنائے ہوئے ہیں بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہے تو ایک دفعہ اساس التعلیم کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ یہ لاجواب کتاب جناب منشی محمد عبدالحق صاحب بی اے، ایل ایل بی، ایف ٹی ایس نے بڑی محنت وجانفشانی کے ساتھ تیار کی ہے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کا عمدہ اصولوں کے مطابق انتظام کرنے میں بہت مدد دیگی۔ کتاب کا حجم ۱۸ جزو ہے۔ پانچ عکسی تصویریں بھی شامل ہیں اور جلد نہایت خوشنما بنائی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ؔ

ترقی زبان بذریعہ تراجم

یہ مضمون پروفیسر گھوش ایم اے ناظم کتبخانہ جات سرکار بھوپال نے اردو کانفرنس میں پڑھا تھا۔ قیمت ۴ؔ

محاربات صلیبی

یورپ کی مسیحی قوموں کا بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کی لگاتار کوشش کرنا۔ نہایت خونریز لڑائیاں اور پھر بالآخر ناکامی۔ انھیں واقعات کے متعلق یہ کتاب ایک مسیحی جماعت کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اسمیں مسلمان سلاطین اور افواج اسلامی کے ساتھ عموماً انصاف برتا گیا ہے اور اُنکے اعلیٰ اخلاق کی جگہ جگہ مدح سرائی اور اُنکے حریفوں کی بدکرداریوں پر حرفگیری کی گئی ہے" جادو وہ جو سر پہ چڑھکے بولے" اسی کو کہتے ہیں۔ کتاب میں دو تاریخی نقشے بھی ہیں (مترجمہ مولوی مشوق حسین خاں بی اے) قیمت عہ

کلیات نعت

تمام ارباب ذوق اس بارہ میں متفق الرائے ہیں کہ حضرت محسن کاکوروی کا نعتیہ کلام اپنی صنف میں لاجواب ہے چنانچہ مختلف قصائد اور مثنویاں بار بار چھپ کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ یہ کلیات بھی اب دوسری بار طبع ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ تمام عاشقان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے زیر مطالعہ رکھیں۔ قیمت عہ

واقعات کربلا

اُردو زبان پہ انگریزی خواں طبقے کے اکثر اصحاب اعتراض کیا کرتے تھے کہ اسکا "ادب" رزمیہ داستان سے بے بہرہ محروم ہے۔ چنانچہ اس اعتراض کے جواب میں تقریباً تیرہ چودہ سال گذرے جب رسالہ اُردوے معلیٰ علیگڈھ میں منشی امیر احمد علوی بی اے رئیس کاکوری نے ایک بسیط مضمون لکھا تھا اور اُس میں یہ دکھایا تھا کہ میر انیس مرحوم کے مرثیوں کو اگر خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دیا جائے تو ایک نہیں متعدد رزمیہ داستانیں تیار ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے نمونۃً بعض مراثی کا انتخاب بھی اپنے مضمون کے آخر میں درج کیا تھا افسوس ہے کہ صاحب موصوف اپنی سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے خود اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔ بہرحال جو خاکہ اُنھوں نے تیار کیا تھا اُسکے بموجب اُنکے ایک ہم وطن اور عزیز نے یہ کتاب مرتب کی ہے جس میں نہایت عرقریزی سے میر انیس کے ایک ہی بحر کے مرثیوں کے بند اس خوبی سے ترتیب دیے ہیں کہ شروع سے آخر تک سارے واقعات کربلا کی ایک مسلسل داستان تیار ہو گئی ہے۔ جو لوگ میر انیس صاحب کے کثیر التعداد مرثیوں کو مطالعہ نہیں کر سکتے اُنکے لیے یہ انتخاب نہایت ہی دلچسپ ہوگا۔ اور مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے تو اس سے بہتر مرثیوں کی کوئی کتاب ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے سے جو اثر سامعین پر پڑ سکتا ہے وہ متفرق مرثیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ قیمت عہ

محفل نامہ گیارہویں شریف

حضور غوث پاکؓ کی گیارہوں میں پڑھنے کی نہایت معتبر موثر اور نظم و نثر سے آراستہ کتاب۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی بالکل تازہ تصنیف۔ قیمت ۸ر

تسخیر فرانس

یعنی ملک الشعرائے انگلستان ولیم شیکسپیر کے لاجواب ڈرامے "ہنری دی ففتھ" کا ترجمہ۔ ادبی کتابوں کا ترجمہ بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ایک زبان کی خصوصیات دوسری زبان کا لباس پہننے میں بہت تامل کرتی ہیں۔ مگر مولوی تفضل حسین صاحب ناظر مترجم محکمہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن نے جس خوبی سے یہ ترجمہ کیا ہے اُسکا اندازہ اسکے ملاحظہ ہی سے ہو سکے گا۔ اُردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ اگر دیکھنا ہو تو اسے ضرور پڑھیے۔ قیمت ۸ر

سیکفرن اور لوسی

منشی احمد علی شوق قدوائی کا ایک پُر لطف ڈراما قیمت ۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

لسان الغیب (شرح دیوان حافظ) کی تنقید

رسالہ مخزن لاہور نمبر ۲ بابتہ اگست میری نظر سے گذرا جس میں ایک ریویو میرے دوست مولوی محمد ابو الحسن صاحب صدیقی کا نظر آیا جو لسان الغیب شرح دیوان خواجہ حافظ علیہ الرحمہ پر تھا۔ میں نے اس کتاب کی تین[1] مطبوعہ جلدیں منگوا کر بالاستیعاب مطالعہ کیں۔ مولوی ولی اللہ صاحب شارح نے فی الحقیقت بڑی محنت اُٹھائی ہے اور عمدہ شرح لکھی ہے لیکن بعض مقامات میں اُن سے لغزش ہو گئی ہے جو غیر اہل زبان کے لیے کوئی جائے تعجب نہیں۔ مجھے خواجہ علیہ الرحمہ کی سوانحمری سے کوئی بحث نہیں میں صرف شرح کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ و باللہ التوفیق۔

غزل الف (۱) شعر (۲) یہ ہے

بوے نافہ کاخر صبازاں طرہ بکشاید ز تاب جعدِ مشکینش چہ خوں اُفتاد در دلہا

شارح صاحب نے اسکا ترجمہ یوں کیا ہے۔ اس نافہ کی بو کی قسم (یا اس نافہ کی امید میں) جو آخر کار صبا اس طرّہ سے کھولے گی۔ کہ اُسکی زلفِ خوشبودار کے خم سے کتنے دلوں کا خون ہوا۔ معنی یوں ہونی چاہیے۔ اُس طرہ کی نافہ کی امید میں جسے صبا کبھی کھولیگی (بالفعل تو اُسکے جعدِ مشکیں کے تاب سے) (یعنی پیچیدگی سے) کیا کچھ خون دل میں پڑا ہے۔ طرہ کو نافہ سے تشبیہ دی ہے اور بوے میں بامعنے قسم بھی ہو سکتا ہے کہ قسم ہے اُس طرہ کے نافہ کی۔ الخ۔

غزل الف (۲) شعر (۴) یعنے

کس بدور نرگست طرفے نبست از عافیت بہ کہ نفروشند مستوری بمستان شما

نفروشند صیغہ نفی چاہیے۔ جیسا کہ مولوی محمد ابو الحسن صاحب صدیقی نے لکھا ہے۔

غزل الف (۲) شعر (۸) ایران کے نسخہ میں بادِ دوام کی جگہ بادِ مدام ہے۔ یعنی شعر یوں لکھا ہے:۔

عمر تاں باد و مدام اے ساقیان بزم جم گرچہ جام ما نشد پُر مے بدوران شما

لفظ مدام بلحاظ ساقی و جام بہت زیادہ مناسب ہے بہ نسبت لفظ دوام کے۔ کیونکہ یہ یعنی شراب کے بھی ہے

[1] اب چوتھی جلد بھی چھپ گئی ہے۔ ایڈیٹر

غزل الف (۲) شعر (۱۱) کا مصرعہ ثانی یہ ہے ۔ کاندریں رہ کشتہ بسیارند قربان شما۔ اسکا ترجمہ شارح صاحب نے یوں لکھا ہے۔کیونکہ اس راہ میں بہت تیرے قربان ہو چکے ہیں۔ حالانکہ ترجمہ یوں چاہیے ۔کیونکہ میں تیرے قربان، اس راہ میں مقتول بہت سے ہیں ۔ قربان شما، جملۂ دعائیہ ہے۔

غزل الف (۳) شعر (۳) کو اس طرح پر لکھا ہے ۔ باشد کہ باز بینم آن یار آشنا را ۔ ایران کے نسخہ میں 'دیدار آشنا را' ہے جو بہتر ہے۔

غزل الف (۳) شعر (۴) کا مصرعۂ ثانی اکثر نسخوں میں 'ہات الصبوح ہبوا یا ایہا السکارا' لکھا ہے۔ یہاں شروع ہی سے غلطی ہوئی ہے ۔ لفظ ہبوا ۔ ہائے ہوز و بائے ابجد چاہیے جو ہب کا امر جمع ہے یعنی جاگو۔ پس معنی یہ ہوں گے (صبوحی لاؤ اور جاگو لے مستو) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کاتب نے ہائے ہوز کو غلط سمجھکر ہائے حطی لکھدیا۔ اور جب معنی ٹھیک نہ ہوئے تو شارحین نے بائے ابجد کو یائے حطی سے بدلدیا۔ ہبوا نہایت صحیح لفظ ہے کیونکہ صبوحی کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے کہ رات بھر کے مخمور سوتے رہتے ہیں انھیں جگایا جاتا ہے کہ اُٹھو اور صبوحی لے آؤ۔

غزل الف (۳) شعر (۵) اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت ۔ روزے تفقدے کن درویش بینوا را ۔ اسکی شرح میں شارح صاحب دو وجوہ شکرانۂ سلامت کی بیان فرماتے ہیں۔ایک شکرانہ اپنی سلامت (یعنی سلامتی کا) اور یہی صحیح ہے نہ یہ کہ تعبیر سلام یعنی سلامت کو معنی سلام تو لیا ہے جو درست نہیں۔

غزل الف (۳) شعر (۷) کا مصرعۂ ثانی یہ ہے ۔ گر تو نمی پسندی تغییر دہ قضا را ۔ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ تغییر بروزن تشریف ۔ عام فارسی استعمال میں ایک (ی) تخفیف کرکے تغیر کہتے ہیں۔ اسکی کوئی مثال خاکسار کی نظر سے نہیں گذری چہ جائیکہ عام فارسی استعمال میں ایسا ہو۔ تغییر باب تفعیل سے ہے اور تغیّر باب تفعّل سے ۔ جس سے معنوں میں بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن ہندوستان میں اکثر اوقات سنا گیا ہے کہ تغییر کو غلطی سے اس طرح پر پڑھتے ہیں کہ گویا تغیر ہے یعنی کم علم لوگ جو عربیت سے عاری ہیں ۔

غزل الف (۳) شعر (۸) آئینۂ سکندر جام جم است بنگر ۔ تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا ۔ ترجمہ اسکا یہ ہوگا کہ آئینۂ سکندر ہی جام جم ہے اسے دیکھ تا کہ ملک دارا کا حال تجھپر مکشوف کردے ۔

محققین نے لکھا ہے کہ جام جم، آئینہ سکندر، جام کیخسرو، جام جہاں نما یہ سب جغرافیائے معلوم الوقت کے نقشے تھے۔ پس جب اس بات کو مان لیا جائے تو زیادہ تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

غزل الف (۳) شعر (۱۱) خوبان پارسی گو بخشندگان عمراند؛ ساقی بدہ بشارت پیران پارسا را۔
مولوی محمد ابو الحسن صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ لفظ پارسی گو یعنی پارسی زبان ہونا چاہیے: پارسی گو (ذکر او)

غزل الف (۴) شعر (۳) چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں؛ کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما۔
مولوی محمد ابو الحسن صاحب نے صنوبر خرام پر اعتراض کیا ہے کہ صنوبر کے ساتھ لفظ خرام مناسب نہیں غلام یا اور کوئی ہم وزن قافیہ چاہیے۔ لیکن دوسرے شعرا نے بھی صنوبر کے ساتھ خرام کو باندھا ہے۔ چنانچہ ملا شانی کا شعر ہے۔ شانی تسلی زدل خویشتن نگر؛ کارت نیاز کان صنوبر خرام نیست۔ مرزا صائب کا شعر ہے زجلوہ ہائے صنوبر قداں زراہ مرو؛ نگاہداری دل کن بپاس نگاہ مرو۔ اس شعر میں جلوہ صنوبر کے لیے آیا ہے۔ اور جلوہ کے معنی خرام نازکے بھی ہیں۔ پس صنوبر خرام صحیح ہے۔ سب جانے دیجیے جب خود خواجہ شیراز نے اسے باندھا ہے تو یہ خود سند ہے۔

غزل الف (۵) شعر (۳) دلم زصومعہ بگرفت و خرقۂ سالوس؛ کجاست دیر مغان و شراب ناب کجا۔
افسوس ہے کہ شارح صاحب نے اسکا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے دل نے صومعہ سے خرقہ کر حاصل کیا ہے۔ یعنی گرفت کو لینے اور حاصل کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ حالانکہ دل گرفتن بمعنے دلتنگ شدن ہے۔ پس معنی یہ ہیں کہ میں صومعہ اور سالوس (دونوں) سے دلتنگ ہوگیا ہوں الخ اور خرقۂ سالوس صومعہ پر عطف ہے۔ یہ عام محاورہ ہے۔ چنانچہ شیخ جامی علیہ الرحمہ کا مصرعہ ہے۔
دل گرفت از خانقاہ و مدرسہ۔

غزل الف (۵) شعر (۴) میں بھی غلطی ہے۔ اول تو شعر ہی کو غلط لکھا ہے کہ الفاظ یاد و باد کو ہر دو جگہ یاد بیائے حطی لکھا ہے اور ترجمہ یوں کیا ہے۔ روزگار وصال یادش بخیر۔ یاد سے بھول گیا۔ الخ۔ خواجہ صاحب کا مصرعہ اس طرح پر ہے۔ بشد کہ یاد خوشش باد روزگار وصال۔ پہلا لفظ یاد بیائے حطی اور دوسرا باد ہے۔ پس معنی یہ ہونگے کہ روزگار وصال یادش بخیر یا یادش خوش باد (بباے موحدہ) گذر چکا۔ اس مصرعہ کو دوسری طرح بھی پڑھ سکتے ہیں یعنی باضافت یاد، جسکی نثر یوں ہوگی۔ روزگار وصال بشد (برفت) کہ یاد او خوش باد (یادش بخیر و یادش خوش)۔ دوسرے بلا اضافت

یعنی یاد خوش باد اورا - اگر ب زیاد کی جگہ بشد الخ پڑھتے تو شارح صاحب کو تاویل کی اسقدر تکلیف نہ اٹھانی پڑتی

غزل الف (۶) شعر (۱) کا مصرعہ ثانی - بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را کا ترجمہ - تو اسکے خال سیاہ کو سمرقند و بخارا بخشدوں' کیا ہے جو صحیح نہیں - بلکہ ترجمہ یہ ہونا چاہیے - اُسکے خال سیاہ پر سمرقند و بخارا کو بخش دوں - یعنی تصدق کردوں -

غزل الف (۶) شعر (۵) من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم - دانستم کا کا ترجمہ جانتا تھا کیا ہے جو صحیح نہیں - بلکہ میں نے جان لیا، یا سمجھ گیا - یعنی اُس روز افزوں حُسن سے میں سمجھ گیا کہ عشق زلیخا کو پردہ عصمت سے باہر نکال لائے گا -

غزل الف (۷) شعر (۲) ایران کے اور تیز قلمی نسخوں میں اس طرح پر ہے

در خرابات مغاں مانیز ہمدستاں شویم کاینچنیں رفتہ است از روز ازل تقدیر ما

معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر میں تقدیر کی جگہ لفظ تدبیر غلط ہے - اور محاسنات غزل کے خلاف قافیہ کرر واقعہ ہوا ہے اور پہلے شعر کے بعد میں ہی - روز ازل اور تقدیر میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے - شارح صاحب کے متن میں ہم منزل لکھا ہے ایران کے نسخہ میں ہمدستاں ہے -

غزل الف (۷) شعر (۸) کے مصرعہ ثانی میں لفظ توفیر ہے نہ توقیر - مصرعہ یہ ہے - نیست از سودائے الفت بیش ازیں توفیر ما - سود اسکے لیے توفیر بمعنی فائدہ مناسب ہے -

غزل الف (۷) شعر (۱۰) کا مصرعہ ثانی اس طرح پر ہے - چوں خراباتی شد آں یار طریقت پیر ما یہاں یار طریقت کی تمیز پیر ہے - نہ اس طرح پر جو شارح نے لکھا ہے - چوں خراباتی شد اے یار طریقت پیر ما -

غزل الف (۸) شعر (۲) کا پہلا مصرعہ ایران کے نسخہ میں (چناں در سوز من سازش اثر کرد) ہے جو بمناسبت شعر اوّل نہایت موزوں ہے - شارح صاحب کے نسخہ میں چناں در جانِ من سوزش اثر کرد ہے - اب ارباب انصاف خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ کونسا نسخہ بہتر ہے -

غزل الف (۸) شعر (۳) کا مصرعہ ثانی ز زلف و رخ نمودی شمس و دی را - لکھا ہے شمس و دی کیا معنی، شمس و فی ہونا چاہیے - فی بمعنی سایہ - ترجمہ شعر میں بھی صرف لفظ دی لکھکر تشریح نہیں کی ہے کہ دی سے کیا مناسبت ہے -

غزل الف (۹) شعر (۲) مدعی خواست کہ آید بتماشا گہ راز ... آدم بہشت روضۂ دار السلام را

اسکی تشریح میں شارح صاحب فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ عیش نقد کی کوشش کرو صرف وعدوں پر نہ رہو۔ اور اپنے خیال کی تائید میں حضرت آدم کا واقعہ پیش کیا ہے کہ جب اُنکو عیش نقد سے منع کیا گیا تو بہشت جیسی چیز کو چھوڑ کر چلے آئے۔ حالانکہ معنی یہ ہیں کہ عیش نقد میں مشغول رہ۔ کیونکہ جب آب ودانہ اُٹھ گیا تو آدم کو بھی روضۂ دارالسلام چھوڑنا پڑا۔

غزل الف (۹) شعر (۸) کا مصرعہ ثانی اس طرح پر ایران کے نسخہ میں ہے۔ پیرانہ سر مکن ہوس تنگ نام را۔ اور شارح صاحب کے نسخہ میں ہوس کی جگہ ہنر ہے۔ ہوسِ پیری ظاہر ہے کہ پیری میں ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ لفظ ہنر بے ربط سا ہے۔

غزل الف (۱۰) شعر (۲) یہ ہے اے صبا گر بجوانانِ چمن بازرسی ؛ خدمتِ از ما برسان سرو وگل وریحاں را۔ شارح صاحب کے نسخہ میں خدمتِ ما برساں ہے جو خلافِ محاورہ ہے اور بازرسی کا ترجمہ واپس جانے کیا ہے حالانکہ پہونچ جانے چاہیے۔

غزل الف (۱۰) شعر (۱۴) ترسم آں قوم کہ بر دُردکشاں می خندند ؛ بر سرِ کارِ خرابات کنند ایماں را۔ شارح صاحب کے نسخہ میں ازسرِ کار لکھا ہے حالانکہ محاورہ برسرِ کار ہے جیسا کہ ایران کے نسخہ میں ہے۔ اسکا ترجمہ صرف کر دینگے نہیں ہے بلکہ کھو بیٹھینگے ہونا چاہیے یعنی خرابات کے امور میں اپنے ایمان کو کھو بیٹھینگے۔

غزل الف (۱۰) شعر (۷) ایران کے نسخہ میں اس طرح پر ہے۔ نشوی واقفِ یک نکتہ ز اسرارِ وجود ؛ تا نہ سرگشتہ شوی دائرۂ امکاں را۔ شرح کے نسخہ میں گر تو سرگشتہ شوی ہے اس لیے شارح صاحب نے اسکا ترجمہ اگرچہ تو دائرۂ امکان میں سرگشتہ ہو جائے کیا ہے۔ تا نہ سرگشتہ شوی میں اور بات ہے۔ یہ تائے تنبیہ ہے۔ اور شعر کے معنی یہ ہونگے تو اسرارِ وجود کے ایک نکتہ سے واقف نہ ہوسکے گا۔ ہاں ہوشیار ایسا نہ ہو کہ تو دائرۂ امکان میں سرگشتہ ہو جائے۔

غزل الف (۱۰) شعر (۹) کا مصرعہ ثانی دہر کہ را خوانگہ آخر زدو مشتے خاک است' ہے بدو مشتے خاک خلافِ محاورہ ہے۔ زدو مشتے خاک چاہیے۔ یعنی دو مٹھی خاک سے۔

غزل الف (۱۱) شعر (۲) چہ قیامت است جاناں کہ بعاشقاں نمودی ؛ رخ ہمچو ماہ تاباں دل ہمچو سنگِ خارا۔ اسکے ترجمہ میں شارح صاحب نے تقدیم وتاخیر الفاظ سے اپنی

طرف نکالا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کیا قیامت ہے جو تونے عاشقوں کو دکھلائی۔ چہرہ ماہتاباں کی طرح اور دل سنگ سخت کی طرح۔ حالانکہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تو نے رخ مثل ماہتاباں اور دل مثل سنگ سخت دکھلا کر یہ کیا قیامت عاشقوں پر ڈھائی ہے۔ یہاں مقام تعجب ہے اور اکثر اہل زبان کے زباں زد ہے۔ چہ قیامت کردہ است۔ یا۔ چہ قیامت است۔

غزل الف (۱۱) شعر (۳) ایران کے نسخہ میں اس طرح پر ہے۔

زر قیب دیو سیرت بخدا ہمی پناہم مگر آں شہاب ثاقب مددے کند سُہا را

شرح کے نسخہ میں سُہا را کی جگہ خدا را ہے۔ اس شعر میں شاعر اپنے آپ کو سُہا سے تشبیہ دیتا ہے جو ایک بہت ہی چھوٹا ستارہ ہے۔ اور مگر بھی بمعنی تاکہ نہیں بلکہ مرادف شاید یا کاش کے ہے بمعنی تمنی۔ پس معنی مصرعہ کے یہ ہیں۔ امید کہ وہ شہاب ثاقب اس سُہا یعنی شاعر کی مدد کرے۔ لفظ دیو سے ہمیشہ ایک بڑی چیز کا خیال پیدا ہوتا ہے اور سُہا ایک بہت چھوٹا ستارہ ہے لہذا رقیب کے مقابلہ میں اپنی کم حیثیتی کا اظہار کرتا ہے۔ شہاب اور سُہا میں تجنیس بھی ہے۔ اور دیو اور شہاب ثاقب کی مناسبت ظاہر۔

غزل الف (۱۱) شعر (۵) مژہ سیاہت ار کرد بخون ما اشارت ؛ ز فریب او بیندیش و غلط مکن نگارا۔ اس شعر کے ترجمہ میں ہمارے خون کا اشارہ صحیح نہیں۔ بلکہ ہمارے خون کی طرف اشارہ چاہیے۔ شارح صاحب نے اپنے نسخہ میں پہلا مصرعہ اس طرح پر لکھا ہے۔ مژہ سیاہت ار کرد برخون ما اشارت۔ جس سے وزن ساقط ہو جاتا ہے۔ بخون چاہیے۔ طرفہ تر یہ کہ تشریح میں لکھتے ہیں کہ "عام نسخوں میں پہلے مصرعہ میں بجائے برخون کے بخون لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ اور غلطی موزون طبیعت پر عیاں" حالانکہ اگر وہ مصرعہ مذکور کی تقطیع کی تکلیف گوارا فرماتے تو خود اس غلطی میں نہ پڑتے اور صحیح کو غلط نہ بتاتے۔ اگر برخون پڑھیں تو کرد کی دال گر جاتی ہے اور سکتہ بھی عارض ہوتا ہے جس سے خواجہ صاحب کا کلام من اولہ الی آخرہ پاک ہے۔ علاوہ بریں مصرعہ ثانی میں میندیش نفی چاہیے نہ کہ بیندیش جس سے یہ معنی ہونگے کہ اُس (مژہ) کے فریب کی پروا نکر اور غلطی میں نہ پڑ۔

غزل الف (۱۱) شعر (۶) کے مصرعہ ثانی۔ بہ پیام آشنائی بنواز دآشنا را۔ میں لفظ اول آشنا بمعنی مانوس و مناسب کے ہے جو پیام کی صفت ہے۔ اور دوسرا آشنا بمعنی دوست یا

عاشق کے ہے۔ یعنی افسوس پیغام سے دوست کی نوازش کرے۔

غزل الف (۱۱) شعر (۷) کا مصرعۂ ثانی یہ ہے "کہ دعائے سحرگاہی اثرے کند شما را"۔ اس کی تشریح آخر صفحہ (۹۵) پر لکھتے ہیں کہ "اگر معشوق حقیقی کو مخاطب کیا جائے تو دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہوگا کہ دعائے صبحگاہی تیری درگاہ میں مؤثر اور قبول ہوتی ہے"۔ لیکن اس مصرعہ سے وہ مطلب کیونکر نکل سکتا ہے۔ معنی صاف ہیں کہ خدا کے لیے حافظ کو ایک جرعہ دے (کہ وہ تیرے حق میں دعا کرے) کیونکہ دعائے صبحگاہی تیرے حق میں موثر ہوگی۔

غزل الف (۱۳) شعر (۲) ساغرے بر کفم نہ تا زسر بر کشم ایں دلق ازرق فام را۔ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر دلق ازرق فام سے آسمان مراد لی جائے الخ۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ شراب کے نشہ سے مجھ میں اتنی اولوالعزمی پیدا ہو جائے کہ آسمان سے بھی اوپر نکل جاؤں اور تاثراتِ گردوں سے بچ جاؤں۔ شعر صاف ہے ازرق فام سے مراد ازرق آگیں ہے۔ یعنی شراب پینے سے زرق و ریاکاری کے دلق سے سبکدوش ہو جاؤں۔

غزل الف (۱۳) شعر (۴) میں ایران کے نسخہ میں بہ فرجام ہے جو نافرجام سے بہتر ہے۔

غزل الف (۱۳) شعر (۵) میں افسردہ کا ترجمہ پژمردہ کیا ہے۔ شعر یہ ہے۔ دُود آہِ سینۂ سوزانِ من ۔ سوخت ایں افسردگانِ خام را۔ یعنی وہ جو ٹھنڈے ہوگئے یا بجھ گئے ہیں۔

غزل الف (۱۳) شعر (۶) محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود ۔ کس نمی بینم ز خاص و عام را۔ ایران کے نسخہ میں شیدائے خود با محاورہ ہے۔ شرح کے نسخہ میں شیدائے من میں وہ لطف نہیں جو شیدائے خود میں ہے۔

غزل الف (۱۳) شعر (۷) با دلارامے مرا خاطر خوش است ۔ کز دلم یکبارہ برد آرام را۔ با دلارامے کا ترجمہ اُس معشوق کے ساتھ کیا ہے۔ حالانکہ با دلارامے کے معنی یہ ہیں کہ ایسے دلارام کے ساتھ میرا دل خوش ہے۔ پھر یکبار لکھتے ہیں۔ حالانکہ یکبارہ کے معنی ایکدم سے یا بالکل کے ہے۔ شرح میں اور غضب ڈھاتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں "اگرچہ عشق نے میرے دل سے صبر و آرام بالکل دُور کر دیا ہے پھر بھی میں اپنے محبوب کے ساتھ خوش رہتا ہوں"۔ یہ بات شعر سے کہاں نکلتی ہے کیونکہ آرام و صبر کا لیجانے والا معشوق (دلارام) ہے۔ نہ عشق۔

غزل الف (۱۳) شعر (۹) از سر دنیا گذشتی غم مخور :: خوش بخور ہم خوش بدار ایام را
یہ شعر الحاقی ہے۔ خود کلام کہے دیتا ہے کہ خواجہ صاحب کا کلام نہیں ہے۔ (باقی آیندہ)

"کوکب"

کاسنی

لاتہ ہے اُس عیسیِ دوراں کے ملک کا سنی
ہوگئی آبِ بقا سے مجکو بہتر کاسنی

تجکو خوش آیا جو رنگ اے ماہ پیکر کاسنی
چرخ آیا لیکے بہر نذر چادر کاسنی

اُنکی چوٹی میں جو ہے موباف پُر زر کاسنی
میں یہ سمجھا پھول لایا سنبلِ تر کاسنی

تونے اے خورشید رو اوڑھی جو چادر کاسنی
ہوگیا پر تو سے اُسکے چرخ اخضر کاسنی

بوسۂ عناب لب میری دوا تھی اے طبیب
لکھدیا نسخے میں کیوں تو نے مقطر کاسنی

تھی جو نسلے میں رقم کچھ سبزۂ خط کی صفت
ہوگیا عنقا زمانے میں کبوتر کاسنی

کہتی ہے اُنکے لبِ دنداں کی مسی ناز سے
دیکھلو دیکھے نہوں گر لعل و گوہر کاسنی

چمپئی رنگ اُس پری کا اُڑ چلا کچھ اور بھی
سیر کو نکلا جو وہ جوڑا اپہنکر کاسنی

بعد مرنے کے بھی دودِ آہ کا یہ ہے اثر
گھاس کے بدلے اُگی میری لحد پہ کاسنی

لطف دینگے دو ہی رنگ اس گورے گورے ہاتھ میں
کالی کالی چوڑیاں ہوں یا ہوں دلبر کاسنی

ہوگیا تپ میں افاقہ کچھ مریضِ ہجر کی
آیا بالیں پر جو وہ جوڑا پہن کر کاسنی

کشتہ ہوں میں اک مسی آلودہ لب کا دوستو
یاد رکھنا ہو کفن کی میرے چادر کاسنی

ہے زمیں سے چرخ تک چھایا ہمارا دودِ آہ
آسماں کے سر پہ بھی رہتی ہے چادر کاسنی

پوچھا جوڑا آپ کو کس رنگ کا مرغوب ہے
کہدیا اُس لالہ رو نے مسکرا کر کاسنی

بس یہی دو چار رنگ اُس شوخ کو مرغوب ہیں
زعفرانی چمپئی گلنار، احمر کاسنی

اُس مسی آلودہ لب کی دل میں رہتی ہے جو یاد
مجکو آتا ہے نظر ہر سُو مرا گھر کاسنی

لکھ چکے ہیں اس طرح میں حضرت ثاقبؔ غزل
کیا کوئی باندھے گا آفاقؔ اُس سے بہتر کاسنی

آفاق بنارسی

ملکش اور شودر

تاریخِ عالم محض اُن اوراقِ پریشاں کی جزو بندی کا نام ہے جن پر حضرتِ انسان کا اعمالنامہ ماضی، مختلف اوقات، مختلف مقامات، اور مختلف حالات کے زیرِ اثر ثبت ہوتا رہا اور ہوتا رہیگا! مطالعۂ تاریخ اُن اوراقِ پریشاں کی مجموعی صورت کی سیر ہے۔ جس سے مستفید ہو کر دماغِ انسانی استنباط و استقراء کرنے پر مجبور ہے: "نتائج کا اظہار دیگر افراد پر کرنا اُس افادہ کا فیضِ عام کہا جا سکتا ہے۔ مگر ہر کس و ناکس کو اپنا ہمخیال و ہمزبان تسلیم کر لینا دیدہ دلیری سمجھی جاتی ہے! "ہم کہیں اور سنا کرے کوئی" ۹۰ فیصدی قائل کا منتہائے خیال ہوتا ہے۔ ایسا خیال غلط ہو یا صحیح مگر اس میں شک نہیں کہ کہنے کا دارومدار زیادہ تر۔ بلکہ بعض کی رائے میں تمام تر سننے پر منحصر ہے! لیکن سننے اور کہنے کے بالکل برخلاف دیکھنا ایک فعل ناگزیر ہے بشرطیکہ آلاتِ بینائی قدرت سے عطا ہوئے ہوں! دیکھنا اکثر بلا ارادہ ہوتا ہے اور نسبتاً کمتر ارادہ کے ساتھ: ارادہ سے میرا مطلب وہ ارادہ ہے جس سے کوئی خاص مشاہدہ مقصود ہو! دیکھنے سے جو اثر دماغ پر مرتب ہوتا ہے اُسکا مرتب ہونا بھی ناگزیر ہے۔ نقاد کی نظر منظر کے نقوش کی کیفیت و کمیت کو دیکھتی ہے اور اُسی کو دوسروں کو دکھانا بھی چاہتی ہے: سمجھنے والا اور کچھ سمجھے تو وہ خود ہی اپنی سمجھ کا ذمہ دار ہے۔ نقاد کو اس سے نہ کچھ فائدہ نہ نقصان!!

* * * * * * * * *

نقاد کی نظر تاریخ ہند کے نظارہ میں بڑے بڑے نقش و نگار کا مشاہدہ کرتی ہے۔ کبھی در و دیوارِ شکستہ کے نقش و نگار۔ بقولِ شخصے۔ صنادیدِ عجم کی یاد تازہ کر جاتے ہیں اور کبھی تصویر کا دوسرا رُخ ہندوستان کی فریاد کا نقشہ اُتار دیتا ہے! تاج بیوی کا روضہ، دہلی کی جامع مسجد، کشمیر کی شکارگاہ، قطب مینار۔ اور خدا جانے کیا کیا۔ تصویر کا ایک رُخ ہے تو سومنات کا قتل و غارت، معبودانِ سنگیں کی بے حرمتی، اصنامِ مقدس کی جناب میں دست درازی، راجپوت خون کا بہایا جانا، اور مفتوحین پر خود مختار حکومت تصویر کا دوسرا رُخ! اس تصویر کو فاتحین "فتوحاتِ اسلام" کہتے ہیں اور مفتوحین "ملکش کا عمل"!

فاتحین کی عینک سے نظر آتا ہے کہ فتوحات کے وقت ایسا انقلاب ناگزیر تھا۔ مفتوحین کے نقطۂ نظر سے وہ قتل وغارت معلوم ہوتا ہے! فاتحین مدعی ہیں کہ وہ انصاف پسند تھے اور جو کچھ ہوا شخصی سلطنت کا رنگ تھا، مفتوحین کو اس رنگ سے ظلم کی بو آتی ہے! فاتحین سب کو اکبر اعظم بتاتے ہیں اور مفتوحین سب کو محمود غزنوی! زمانۂ زیر بحث ایک طویل مدت ہے جس کے ہر معقول جزو کو صدی کہہ سکتے ہیں۔ اس طوالت کی وجہ سے ہر فریق کو اپنے دعوے کے لیے بیشمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ اور ہر مثال بذاتِ خود ایک حجت ہے! اس تصویر کے ہر دو رخ میں بعض نقوش یکساں بھی ہیں۔ ان کو نقوش مشترک کہیے یا امورِ متفقہ۔ بہرحال وہ دونوں صورتوں میں مختلف نہیں! سلطنتِ اسلام یا ملکش راج میں حکمتِ عملی یہ تھی۔ اندرونی و بیرونی حالت وہی ایک تھی۔ ظلم ہو یا انصاف۔ ظاہر و باطن یکساں تھا! مفتوحین کو ہر جگہ بزور بازو۔ یا بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا: فاتح و مفتوح کا فرق۔ باغی و سرکش عنصر کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو برائے نام تھا یا مطلق نہ تھا۔ ملک مفتوحہ کا مال و متاع اُسکے حدود اربعہ کے اندر ہی۔ نعیش کے یا تعمیر کے۔ نذر ہوتا تھا: مفتوحین پر حکومتِ شخصی کا دباؤ رہا مگر اُن کو کبھی پامال نہیں کیا گیا: سخت گیری ہو یا انصاف، قومیت کو فنا نہیں کیا گیا! مفتوحین کی تعداد کو نہ اصولِ تفریق سے چھانٹا گیا نہ انکی شخصیت کو کسی معدوم کردینے والے عمل سے کاٹا گیا! سلطنت متعصب ہو یا ظالم مگر برہمن کو برہمن رہنے دیا اور راجپوت کو راجپوت!!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اسی سرزمین میں ناظرین کو وہ منظر بھی نظر آتا ہے جب مقدس آریا کے قدوم میمنت لزوم اس ملک میں آئے! مگر اس تصویر کے دو رخ۔ اُس وقت ہوں تو ہوں لیکن اب۔ مطلق نہیں! فاتحین کا نقطۂ نگاہ باقی ہے اور مفتوحین کا غائب: در اصل زبان ہے تو فاتحین کی، واقعات ہیں تو اُنہی کے الفاظ میں تاریخ۔ اگرچہ وہ بھی دھندلی۔ ہے تو اُن کی اپنی رام کہانی۔ مفتوحین کی زبان کاٹ دی گئی، اُنکا منہ بند کر دیا گیا، اُنکا دفتر بے معنی گاؤخورد ہوگیا، لہذا دوسرا رخ آئے تو کہاں سے آئے! تاہم اسی رُخ کا مشاہدہ بلا تحقیق بتاتا ہے کہ فاتحین نے مفتوحین کو ہر لحاظ سے روند ڈالا۔ اُنکو ہندوستان کے شاداب قطعات سے نکال دیا، اُنکی زمین ہمیشہ کے لیے اُن سے چھین لی، اُنکی زبان معدوم کر دی، اُنکی ہستی نیستی بنا دی! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُنکو شودر قرار دیا، ہندوستان کی بہترین غذائیں اُن پر حرام کر دیں، اچھا لباس اُن سے چھین لیا، عیش و آرام اُنکے لیے عنقا بنا دیا، مردار خواری پر اُنھیں مجبور کیا، زمین پر بیٹھنے اور اُسی پر کھانے

لے لیے انکو دبایا، اور اس درجہ اُنکے حقوق پامال کیے کہ اب تا قیامت اُنکی فلاح کی کوئی صورت نہیں! مردار اُنکی غذا قرار پائی، اور بیگار اُنکا فرض: فاقہ اُنکی علامت ٹھیرائی گئی اور ہر قسم کی ذلت و خواری اُنکی تقدیر! یہ وہ رُخ ہے جو فاتحین کی عینک سے نظر آتا ہے۔ اگر کوئی شودر سماج ہوتا تو معلوم ہوتا کہ وہ خود کیا کہتے ہیں اور کیا فریاد کرتے ہیں! کم از کم ملکش نے مفتوحین کی ہستی کو اس ظالمانہ اور وحشیانہ طریقہ سے تو پامال نہیں کیا!

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

نتیجہ صرف اس قدر نکلتا ہے کہ مقدس آریا کے مفتوحین بیچارے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ در گور ہوکر شودر بن گئے۔ اور اُن کے فاتحین ملکش قرار پائے! یہ مقدس عنصر فاتحانہ صورت میں بھی مقدس رہا اور مفتوحانہ حالت میں بھی متبرک!

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس تحریر کو کوئی پولیٹکل مضمون نہ سمجھیے۔ احرار، استبداد، سواراج، اور ایسے الفاظ آپ کو کہیں نہ ملینگے پھر بھلا یہ پولیٹکل کیونکر ہو سکتا ہے۔ مقصدِ تحریر صرف یہ کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!
کسے باشد"

تضمین

یاد ایامے کہ جشنِ جم محفل داشتم　　یاد ایامے کہ داغِ ماہِ کامل داشتم
یاد ایامے کہ عشقِ چشم در دل داشتم　　یاد ایامے کہ در صحرا نہ منزل داشتم
جامِ مے بر دستِ ساقی در مقابل داشتم

نغمہائے جانفزا آمد بگوشِ عقل و ہوش　　لطف اندوختم من از نواہائے سروش
تا کجا باسط خیالِ شرحِ لطفِ نائے و نوش　　قصہ کوتہ کز حصولِ فیضِ پیرِ مے فروش
بود حاصل ہر تمنائے کہ در دل داشتم

باسط بسوانی

الہلال

نظر انداز منظر

اے میرے بچے! اس چھوٹی عبا کو کس نے رنگا۔ اور تیرے اعضائے شیریں کو چھوٹی سی قبائے احمر سے کس نے دھانکا۔ صبح کو تو گرتا پڑتا جیسی کہ تیری چال ہے صحن میں کھیلنے آیا لیکن میرے بچے بتا وہ کون تھا جس نے اس چھوٹی عبا کو رنگا؟ اے میرے ننھے غنچۂ حیات بتا تو کیوں مسکراتا ہے؟

ماں دروازے پر کھڑی تجھے تکتی ہے، وہ تالیاں بجاتی ہے، اُسکی چوڑیاں بجتی ہیں۔ اور تو اپنے ہاتھ میں بانس کی چھڑی لیے ننھے سے لڑکے کی طرح ناچتا ہے۔

لیکن ہاں۔ اے میرے ننھے غنچۂ حیات بتا تو کیوں مسکراتا ہے؟

اے فقیر جب تو اپنے دونوں ہاتھ ماں کی گردن میں حمائل کرکے مچلتا ہے تو تیری کیا خواہش ہوتی ہے؟ اے بوالہوس کیا میں دنیا کو آسمان سے پھل کی طرح توڑوں اور تیری برگ گل کی سی ننھی منی ہتھیلی میں لاکر رکھ دوں؟ اے بھکاری تو کیا مانگتا ہے؟

سورج تیری حقیر جاں نشانیوں کو دیکھتا ہے، جب تو اپنی ماں کی گود میں سوتا ہے تو آسمان تجھے تاکتا ہے۔ اور صبح آہستہ آہستہ تیرے بستر کے قریب آتی ہے اور تیری آنکھوں کو پیار کرتی ہے۔ ہوا مسرت میں تیرے (پیر کے) گھنگھرو کی آواز کو اُڑا لے جاتی ہے۔ خواب کی حسین دیوی شفق میں اُڑتی ہوئی تیرے پاس آتی ہے۔

مادرِ دنیا تیری ماں کے دل میں تیری ہم جلیس ہوتی ہے۔ چاندنی میں زمزمہ سنج کرنے والا بانسلی لیے تیرے دریچہ پر کھڑا ہے۔

ابتدا

بچے نے اپنی ماں سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا اور تم نے مجھے کہاں پڑا پایا؟

ماں کچھ چلا کر، کچھ ہنس کر، اور بچے کو سینے سے لگا کر جواب میں یوں بولی کہ "پیارے بچے! تو دل کی خواہش تھا اس لیے اُس میں مخفی تھا۔ تو میرے بچپن کے کھیلوں کے کھلونوں میں سے ایک تھا۔ اور جب میں ہر صبح کو اپنے دیوتا کی مورت بناتی تھی تو مُورت میں تجھکو بناتی اور بگاڑتی تھی۔ ہمارے گھرانے کے دیوتا کے ساتھ تیری عزت کی جاتی تھی اور اُن کی پرستش میں مَیں تیری پوجا کرتی تھی۔ میری تمام آرزوؤں اور تمناؤں اور میری محبت اور میری ماں کی زندگی میں تو موجود تھا۔ غیر فانی روح کی آغوش میں جو ہمارے گھرانوں پر حکمراں ہے تو ایک عرصہ سے تربیت پاتا رہا۔ لڑکپن میں جب میرا غنچۂ دل مسرت کی پنکھڑیوں سے کھِل رہا تھا تو تو خوشبو کے شکل سے ہر طرف موجود تھا۔ جس طرح روشنی طلوعِ آفتاب سے قبل آسمان میں رونما ہوتی ہے اسی طرح تیری نازک ملائمت میرے اعضائے جوانی میں شگفتہ تھی۔

قدرت کا سب سے بڑا پیارا جو صبح کی ضیا کے ساتھ توام مخلوق ہوا تو دنیاوی حیات کے چشمے میں بہا اور آخر کار میرے دل کے ساحل پر آ لگا۔ جب میں تیرے چہرے پر نظر ڈالتی ہوں تو اسرار کا ایک دریا مجھ میں اُمنڈ آتا ہے۔ تو جو سب کا تھا صرف میرا ہو گیا۔ اس خوف سے کہ مبادا تو مجھسے جدا ہو جائے، میں تجھے سینے سے چمٹائے ہوئے ہوں۔ الٰہی! وہ کونسا طلسم تھا جس نے دنیا کے خزانے کو میرے ان نازک ہاتھوں کے سپرد کر دیا!!

پھولوں کا مکتب

جب طوفانی بادل آسمان میں گھڑگھڑاتے ہیں، بادیوں کی بوچھاڑیں پڑتی ہیں، اور نم پُر ہوا ویرانے سے ہوتی ہوئی بانسوں کے درمیان اپنی شہنائی بجانے آتی ہے تب یکایک پھول نامعلوم مقام سے نمودار ہوتے ہیں اور مجنونانہ مسرت میں سبزہ پر رقص کرتے ہیں۔

ماں! میرا یہ خیال ہے کہ بیشک وہ زمین کے نیچے مکتب جاتے ہیں۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنا سبق یاد کرتے ہیں اور اگر قبل از وقت وہ باہر کھیلنے آنا چاہتے ہیں تو اُنکا اُستاد اُن کو ایک گوشہ میں کھڑا کر دیتا ہے۔ جب پانی برستا ہے تو اُنکی تعطیل ہوتی ہے۔

صحرائیں شانیں (ایک دوسرے سے) ٹکراتی ہیں، پتیاں تیز و تند ہوا میں سرسراتی ہیں۔ گرجنے والے بادل اپنے وسیع ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں، اور کلیاں سفید و شہابی و زعفرانی پوشاکیں پہن کر نکل آتی ہیں۔

ماں کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کا مکان آسمان میں ہے جہاں ستارے چمکتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ وہاں جانے کے لیے کیسے مشتاق ہیں؟

کیا تم جانتی ہو کہ وہ اتنی عجلت کیوں کرتے ہیں؟ بیشک میں خیال کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھ کس کی طرف بڑھاتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی ماں رکھتے ہیں!

انتقام

اماں اب میرے جانے کا وقت ہے۔ میں جاتا ہوں۔ سنسان صبح کی مہیب تاریکی میں جس وقت تم اپنے ہاتھ بستر پر اپنے بچے کے لیے پھیلاؤ گی تو میں کہوں گا "بچہ وہاں نہیں ہے۔ اماں میں جاتا ہوں۔"

میں ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا ہو جاؤں گا اور تمہیں تھپک تھپک دوں گا۔ اور جب تم غسل کر رہی ہو گی میں پانی میں لہر بن جاؤں گا اور تمہیں بار بار پیار کروں گا۔ طوفانی رات میں جبکہ پانی پتیوں پر گر کر آواز پیدا کرتا ہو گا تم اپنے بستر پر میری سرگوشی سنو گی اور میری کھلکھلاہٹ برق کے ساتھ کھلی کھڑکی میں ہو کر تمہارے کمرہ میں ظاہر ہو گی۔

اگر رات میں زیادہ دیر تک اپنے بچے کا خیال کر کے جاگتی ہو گی تو میں ستاروں سے تم کو لوری دوں گا۔ سو جا۔ اماں۔ سو جا۔ پھیلی ہوئی چاندنی میں تمہارے بستر پر آہستہ آ جاؤں گا۔ اور جب تم مست خواب ہو گی میں تمہارے سینے پر پڑا رہوں گا۔ میں ایک خواب ہو جاؤں گا اور تمہاری آنکھوں کے پردے سے تمہارے عمق خواب تک کھسک کر پہونچ جاؤں گا۔ اور جب تم جاگ کر جلد جگنو کی طرح پریشانی کے عالم میں ہر طرف نظر کرو گی، میں نکل کر تاریکی میں چمکنے لگوں گا۔ اور جب پوجا کے جشن کے دن پڑوسیوں کے لڑکے مکان کے

اردگرد کھیلیں گے میں گیند کر بانسری کے نغمے میں تبدیل ہو جاؤں گا اور دن بھر تمہارے دل میں بھیڑ کا کروں گا۔

پیاری چھوٹی خالہ اماں پوجا کے تبرکات لیکر آئیں گی اور پوچھیں گی بہن ہارا بچہ کہاں ہے؟ ماں اُن سے آہستگی سے کہیں گی وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہے۔ وہ میرے جسم میں ہے وہ میری روح میں ہے۔

ترجمۂ دشیم

اُن سے مل کر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں
تنا ورہ اے دل کہ لطفِ جدائی پھر کہاں

اب بھی ہیں اہلِ ہوس ناقدردانِ شانِ حسن
لیجا ہے اُنکو شوقِ خود نمائی پھر کہاں

سب ہاری زندگی ہی تک ہیں اُنکے حوصلے
ورنہ یہ ناز و غرورِ دلربائی پھر کہاں

شوقِ ہو کامل تو کیا جورِ خوباں کا گلہ
با وفا ہم ہوں تو رنجِ بیوفائی پھر کہاں

تم ہو کیسے۔ کوئی دنیا میں اگر اپنا نہیں
بنتی جب یہ ہی تو فکر بینوائی پھر کہاں

شرط ہے اک بار پڑ جانا تمہارے عشق میں
اس طلسمِ غم سے اُمید رہائی پھر کہاں

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آغازِ عشق
حسن والوں کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

قدموں پہ آپ کے جو مرا سر فدا ہوا
خوش ہوں کہ آج فرض سے اپنے ادا ہوا

کس کس کو سرفرازِ شہادت کریں گے آپ
نکلے ہیں آج لیکے جو خنجر کھلا ہوا

کی جسپہ اک نظر اُسے مسحور کر دیا
شاید ہے چشمِ یار میں جادو بھرا ہوا

بے رحم! تیرے ناوکِ مژگاں کو کیا کہوں؟
سینے کے ساتھ دل بھی گیا چھیدتا ہوا

افسوس طفلِ اشک نے رسوا کیا مجھے
تھا مدتوں سے رازِ محبت چھپا ہوا

یارانِ بادہ خوار! یہ کیا سکون ہے؟
پینے کا لطف ہے کہ رہے جھومتا ہوا

اُس طائرِ اسیر کی حسرت پہ رودیئے
جو فصلِ گل میں بھی نہ قفس سے رہا ہوا

حافظ۔ اٹھائے یار کو جاتے تو ہو مگر
معلوم ہے کلیمؑ کا انجام کیا ہوا؟

حافظ۔ رام نگری

عـه یعنی بے اعتنائی یار کی شکوہ و شکایت کا مزا زمانِ فراق ہی تک محدود ہے۔

نظرے خوش گزرے

۲۰ مارچ کو لکھنؤ میں انجمن تعلیم المسلمین کی طرف سے ایک اودھ پراونشیل ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تھی جسکے صدر نشین عالیجناب مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی جوائنٹ سکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بنائے گئے تھے۔ مگر دیگر شرکا سے زیادہ تو ہمارے محترم صدر نشین کو رفاہ عام ہال کی خالی کرسیاں دیکھکر رنج ہوا ہوگا۔ اس جلسہ میں لکھنؤ کے دو درجن معززین اور چند درجن طالب علم مدارس و کالج کے سوا اضلاع اودھ کے صرف چند اصحاب تشریف لائے تھے۔

یہ نظارہ اس درجہ دردانگیز اور شرم آگیں تھا کہ تو منتظمین کانفرنس بھی خاموشی کے لمحوں میں اس واقعہ پر انتہائی افسوس کیے بغیر نہ رہے ہونگے۔ مثل مشہور ہے کہ چراغ تلے اندھیرا۔ یہاں بعینہ یہی کیفیت تھی۔ وہ جلیل القدر اور نامور اصحاب جو ہندوستان بھر میں بلکہ بیرون تک اشاعت تعلیم یا تحریک سیاسی کی نشو و نما کی غرض سے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، اگرچہ لکھنؤ انکی جائے سکونت اور اودھ انکا وطن ہے لیکن آنکھیں ہر دفعہ انکی تلاش میں نیچی اونچی کرسیوں کی طرف جاتی اور ناکام واپس آتی تھیں۔ جلسہ کا یہ رنگ دیکھکر منتظمین و شرکائے جلسہ نے کانفرنس کو آئندہ کسی اچھے موسم میں منعقد کرنے کا تصفیہ کرکے ایک ہی نشست پر اکتفا کی۔

ہم اس حادثہ دل خراش پر کوئی طولانی مرثیہ نہیں لکھنا چاہتے۔ اس لیے کہ ہم سے کہا گیا ہے کہ ایسے کاموں میں اسی قسم کے ناامید کن واقعات پیش آتے ہیں۔ اور ہم اپنے غمزدہ دل کو شیکسپیر کے ان الفاظ سے تسلی دینے پر آمادہ اگر نہیں تو مجبور ضرور ہیں کہ "مایوسیوں میں نہاں ہے راز کامیابی"

یہ تو مسلمانوں کی حالت تھی۔ اب ہندو بھائیوں کا حال سنیے۔ کہ انھیں ایام میں انھوں نے لکھنؤ میں پراونشیل ہندو سبھا منعقد کی تھی۔ ہمعصر ہندوستانی کا بیان ہے کہ اس جلسہ میں صرف چالیس اصحاب تشریف لائے تھے لہذا منتظمین نے جلسہ ملتوی کر دیا۔ اودھ کے ہندو مسلمان دونوں ان حالات پر غور فرمائیں اور اگر ان میں ذرہ برابر بھی خودداری اور قومی غیرت ہو تو انکو چاہیے کہ آئندہ موسم سرما میں ان مجالس کا انعقاد پوری قوت، توجہ اور مستعدی سے انتظام کریں اور انکی روشن خیالی۔ عالی حوصلگی اور قومی ہمدردی کے دامن پر اس وقت جو بدنما اور تاریک دھبہ ہے اُسے ہمیشہ کے لیے محو کر دیں۔

ابن مسلم

یعنی الناظر کے مایۂ ناز مضمون نویس مسٹر سلطان حیدر صاحب جوش کا دلچسپ ناول۔ جسکے ہر باب میں فطری جذبات اور تاریخی واقعات کی جیتی جاگتی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ سلطان حیدر صاحب کا قلم فسانہ نگاری کے میدان میں جو کرشمہ سازیاں کر سکتا ہے وہ الناظر کے اوراق سے ظاہر ہے۔ قیمت ۱۲؍

پاتال کی سیر (مجلد)

فرانس کے مشہور سائنسدان اور فسانہ نویس جولیس ورن نے علم طبقات الارض (جیالوجی) کے مشکل اصول کو ناول کے پیرایہ میں اسطرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحہ کیلیے بھی نہیں اکتا سکتا۔ اور جب تک کتاب ختم نہ کر لے اپنے ہاتھ سے نہیں رکھ سکتا۔ قیمت ۸؍

سمندر کی سیر (دو حصہ)

ورن کے ایک دوسرے ناول کا ترجمہ جسمیں اُس نے نہایت دلکش پیرایہ میں تہ سمندر کے عجائب غرائب کو بیان کیا ہے۔ کتاب میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں جو معلومات اور دلچسپی سے خالی ہو۔ قیمت ۸؍

دو جہان کی سیر

ہمارے زمانے کے ناول نویسوں میں میری کوریلی کی شہرت چار دانگ عالم کو مسخر کیے ہوے ہے۔ یہ عالی دماغ عورت روحانیت کے اونچے مسائل کو فسانہ نگاری کے پردے میں اس خوبی کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر جاتا ہے۔ دو جہان کی سیر میں اپنے فلسفہ کو جسکی بنیاد مذہب اور روحانیت پر مبنی کی گئی ہے، بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگرچہ کوریلی عیسویت کی پیرو اور حامی ہے لیکن فلسفہ مذہب کے اساسی اصول جو موضوع بحث میں آتے ہیں وہ کسی مذہب کے منافی نہیں ہیں۔ قیمت ۱۲؍

روح لیلیٰ

میری کوریلی کا ایک دوسرا ناول ہے جسمیں دو جہان کی سیر کی طرح روحانی مسائل کی عقدہ کشائی اور لامذہبی و تشکک کی بیخکنی کی گئی ہے۔ ایک شخص ایک مردہ لڑکی کی روح کو اُسکے مرنے کے بعد محبوس کر کے اُسکے جسم سے وابستہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے زندہ کر کے روحانی مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ قیمت ۱۲؍

زینونی

لارڈ لٹن انگلستان کا ایک نہایت سحر نگار ناول نویس تھا۔ اس نے یورپ کی دہریت و مادہ پرستی دیکھکر اخلاق و خیالات کی اصلاح اور روحانیت کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی فسانہ نگاری کو حصول مقصد کا آلہ قرار دیا ہے۔ اپنے تمام ناولوں میں اسے زینونی پر بڑا ناز تھا اور اسے اپنی سب سے اچھی تصنیف خیال کرتا تھا۔ قیمت ۸؍

کرہ مریخ کا سیاح

ہماری دنیا میں آیا تھا اور یہاں کا سب حال لکھکر لیگیا

اسکے سفرنامے میں سے جس قدر حصہ ہندوستان کے متعلق تھا اپنی زبان میں لے کر چھاپ دیا گیا۔ ایسی مزیدار اور پرلطف کتاب ڈھونڈھیے گا تو نہ پایئے گا۔ قیمت صرف ۸؍

پریم پچیسی

یعنے پریم چند صاحب کے دلچسپ اور سبق آموز افسانوں کا مجموعہ۔ جسے ڈاکٹر اقبال، مولوی عبد الحق، اور ملک کے تمام انشا پردازوں نے بہترین ادبی مجموعہ تسلیم کیا ہے۔ سیرت نگاری جو افسانہ کی جان ہے پریم چند صاحب کا حصہ ہے۔ قیمت ۱۲؍

قواعد ریلوے

اس زمانہ میں ہر شخص ریل پر سفر کرتا یا اُسکے ذریعہ سے مال منگاتا اور بھیجتا ہے مگر مختلف ریلوں نے جو قاعدے اور دستور مقرر کر رکھے ہیں اُن سے غیر انگریزی داں اصحاب کو پوری واقفیت نہیں ہو پاتی کیونکہ جملہ ریلوے قواعد انگریزی میں چھپتے ہیں۔ اس کتاب نے اس دقت کو رفع کر دیا۔ ہر شخص کو جسے ریل سے کچھ بھی تعلق ہو ایک جلد اپنے پاس رکھنا چاہیے تاکہ نقصان، تکلیف اور ہرج سے نجات ملے۔ قیمت مع نقشہ ہندوستان ۸؍

قوت مردی کیلئے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہارون سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ آ گئے
ہون تو آخر مین اب ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائین ور ہماری
فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ آتنگ نگرہ گولیون کا استعمال
فرمائین اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کرین۔ گئی ہوئی اور
ہاتھون سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتین از سر نو عود نہ کر آئین تو
ہمارا ذمہ۔ صاحبو! اسکے باب مین زمانہ کے معزز صحاب تعریفین
فرما رہے ہین لاکھون کی تعداد مین سرٹیفکیٹ موجود ہین مرد و
اور عورتون کو یکسا مفید ہین اور نباتات سے مرکب۔ قیمت بھی
بہت کم فی بکس تیس ۳۰ گولیون کا صرف ایک روپیہ عہ
آزمائش شرط ہے یکشت چار روپیہ کے خریدار کو ایک
روپیہ کی دوا زیادہ ملے گی :-

پتہ

ویدشاستری جام نگر کاٹھیاوار

کو بھڑکایا جو ہمیشہ اُندلس میں فساد برپا کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ شارلے مین کو ان لوگوں نے اس معاملے میں دخل دینے اور غاصب کو نکالنے کے لیے بلا بھیجا۔ ہسپانیہ والے وقائع نگار کہتے ہیں کہ آسچوریا کے بادشاہ اور پلے جیس کے وارث الفونسو نامی نے شہنشاہ فرانس کو اپنی مدد کے لیے بُلا بھیجا۔ مگر یقین کرنے کی زیادہ تر وجہیں ہیں کہ یہ بُلاوا بعض نارمن مسلمان سرداروں کی طرف سے گیا تھا اس لیے کہ یہ سردار عبدالرحمٰن اموی کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس نئے فرمانروا کو بادشاہ مان لینے سے اسکو بہتر سمجھتے تھے کہ اسلام کے مسلم الثبوت دشمن کی اطاعت قبول کرلیں ان لوگوں کی درخواست کا وقت بھی حسبِ دلخواہ تھا۔ کیونکہ شارلے مین نے اپنے خیال کے موافق فوراً سیکسن لوگوں کو مطیع کرنے کا کام تکمیل کو پہونچا یا تھا۔ اُنکا سردار ویٹے کنڈ نامے جلاوطن ہو چکا تھا اور اُسکے پیرووں میں سے ہزاروں آدمی پیڈر بارن کے پاس اطباع لینے کو چلے آرہے تھے۔ اس وجہ سے اس فاتح کو اس قدر فرصت تھی کہ ملک گیری کی اور تدبیروں کی طرف متوجہ ہو۔ یہ امر طے پا گیا کہ وہ اُندلس پر حملہ کرے اور اس اثنا میں مفسد سرداران اسلام نے مختلف مقاموں میں لوگوں کو اصلی حملے سے بیخبر رکھنے کے لیے اُبھار رکھیں۔ مگر قرطبہ کے نئے خاندانِ شاہی کی خوش قسمتی تھی کہ یہ مہیب سازش کالعدم ہوگئی۔ اُندلسی رفقا نے وقت کے شمار میں غلطی کی وہ آپس ہی میں لڑ پڑے اور جب شارلے مین ۷۷۸ء میں کوہِ پی رنیز کے اسطرف اُترکر آیا تو دیکھا کہ کوئی شخص مدد دینے والا نہیں ہے۔ اُس نے سرقسطہ کا محاصرہ شروع ہی کیا تھا کہ اُسکے پاس خبر پہونچی کہ ویٹے کنڈ لوٹ آیا اور سیکسن لوگوں کو اُس نے پھر بھڑکایا۔ وہ سب پھر آمادۂ جنگ ہیں اور کولون تک بڑھ آئے ہیں۔ اس سبب سے شارلے مین نے بجز اس کے کوئی چارہ نہ دیکھا کہ عجلت کے ساتھ واپس جائے اور اپنی سلطنت کو بچائے۔ چنانچہ وہ تیزی کے ساتھ واپس ہوا اور اُسکی فوج کا بڑا حصہ پہاڑ کو قطع کر چکا تھا۔ اُس وقت رانسیس ولیس کے درے میں فوج کے پچھلے حصے پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ قوم باسک نے جسکو فرنگیوں سے ہمیشہ سے نفرت تھی کوہِ پی رنیز کے سنگلاخ تنگ دروں میں بہت ہی ہشیاری سے کمینگاہیں

تیار رکھی تھیں۔ ان لوگوں نے لشکر کے اگلے حصے کو تو اِن راستوں میں سے چُپ چاپ گذر جانے دیا اور اُس وقت تک انتظار کرتے رہے جب پچھلے دستے نے جو اسباب سے لدا ہوا تھا آہستہ آہستہ اُس درّے کی پیچ دپیچ راہ کو قطع کرنا شروع کیا۔ اُس وقت وہ سب کے سب ہمہ تن لشکریوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں تک کہ ایک فرنگی بھی نہ بچا۔ عیسائی وقائع نگار اُس دن کی خوں ریزی کی ہیبت ناک داستانیں بیان کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے بیان کے موافق جن لوگوں نے اُس دن لیون کے ناٹئوں کے ساتھ کھوے سے کھوا ملا کر شاہ چارلس کی فوج کو بالکل نیست و نابود کر دیا وہ مسلمان ہی تھے۔ ہسپانیہ کے آلھے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر کہانیوں والا سورما برناڈ فرنگیوں کی فوج کو تہ تیغ بیدریغ کرنے کے لیے لیون کے بہادروں کو اپنی تبعیت میں لے گیا تھا۔

چلا ہے برناڈ لیون سے اب سپہ تیں سو ساتھ کی جماعت
کرے وہ اُندلس کی حفاظت۔ بڑھیں فرنگی نہ اپنی حد سے
وہ چاہتا ہے کہ شہر اسکا جو بیچ میں ہے سمت رود کے
سے ٹے نہ پلیو کا نام اُس سے۔ رہے وہ محفوظ روز بد سے

یہی وہ چلا کے کہ رہے ہیں۔ ہوئے ہیں آزاد ہم تو پیدا
اگرچہ تابع ہیں اپنے شہ کے ستارے ہیں اُس ہلال کے ہم
خدائے قادر کی ہے وہ مرضی۔ مگر کریں گے نہ ہم غلامی
نہ حق میں نسلوں کی اپنی ہوں گے۔ کبھی سبب ابتذال کے ہم

نہ ہم دلوں کے ہیں ایسے بودے۔ نہ بازوؤں میں ہیں سست ایسے
نہ ان رگوں کے ہیں سست ریشے کہ توڑ دیں اپنے قول و عدے

خدا نے پیدا کیا ہمیں حُر۔ اگرچہ ہو شاہ یا بہادر
کبھی نہ چھوڑیں گے حرّیت ہم۔ جو کوئی چاہے تو خوں بہائے

اگر خدا ہی نے لکھ دیا ہے۔ کہ مالکِ اُندلس کا چارلس ہو
تو وہ بھی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ لیون والوں کا اُٹھنا کیا تھا
وہ ہو گا شاید ہمارا مرنا۔ سلف کے جینے کا آئینہ ہے
سُنا؟ تھا نیومیں ٹی ام کا قصہ۔ اسے زمانے نے آنکھوں دیکھا

وہ شیر دھوئے جنھوں نے پنجے۔ بُحیرۂ لِڈیا کے بہتے خوں میں
وہ اُن سے کیا اب نہیں لڑیں گے۔ قدیم قانون و حرّیت کو
جو چکنی صورت کے بُزدلے ہیں۔ وہ سیم و زر دیں جسکو چاہیں
مگر نہ بدلے گا کوئی انساں۔ ہمارے شیروں کی ماہیت کو

لیون کے ان سُورما سپاہیوں کے پہلو بہ پہلو جنھوں نے اسچوریا کے شہزادے کے شریک ہوکر تارلے مین کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا تھا (جیسا کہ قصے کہانیوں میں ہے) بہادران عرب کا ایک غول تھا جو کتارہ کش فرنگیوں پر حملہ کرنے میں شریک حال ہو گیا تھا۔ سیوڈ ورین نے چارلس اور اُدلینڈ کی جو فسانہ کی سی تاریخ لکھی ہے اُس میں ہے کہ "تیس ہزار مسلمانوں کی ایک تازہ جماعت عیسائیوں پر خونخواری کے ساتھ ٹوٹ پڑی۔ اور عیسائی چونکہ اس قدر عرصے تک لڑنے کی ماندگی سے ناتوان دخستہ و کوفتہ ہو رہے تھے اسلیے مسلمانوں نے پست و بلند سب کو خاک کے برابر کر دیا۔ ایک شخص بھی باقی نہ بچا۔ کچھ برچھیاں وار پار کر کے مارے گئے۔ کوئی لاٹھیوں سے۔ کسی کا سر اُتارا گیا۔ کوئی جلایا گیا۔ بعض کی زندہ کھال اُتاری گئی۔ بعض درختوں میں لٹکائے گئے۔ یہ قتل عام بہت ہی ہیبت انگیز تھا اور

اُس دن کی یاد اُس علاقے کے کاشتکاروں کے خیال سے کبھی بُھلائے نہ بھولی۔ جس زمانے میں انگریزی فوج نے ورڈ زران سس ولیس میں ہوکر نپولین کے سپہ سالاروں کا تعاقب کیا تھا تو سپاہیوں نے وہاں کے لوگوں کو اس قیامت خیز میدان جنگ کا الھا گاتے سُنا تھا۔ اور ہسپانیہ کے کلاؤنتوں نے اس جنگ کے بہت سے جھوٹے سچے واقعات موزوں کیے ہیں۔ ان میں سے سب سے مشہور امیر البحر غارنیس کا الھا ہے جسکو ڈان کوئی زوٹ اور سینکو پینزا نے ٹوباسو میں گاتے سنا تھا۔ جیسا کہ کروٹیز کی سچی تاریخ میں مذکور ہے :۔ بھاٹوں

تمہارے حق میں فرانس والو! بُرا تھا دن ران سس ویلس کا
ہوا تھا دو ٹکڑے جبکہ نیزہ۔ تمہارے سغرور چارلس کا
بجا ہے لعنت کرو جو اُن پر۔ مَرے تمہارے بہت تونگر
بہت سے سردار تھے جو تو ہمسر۔ سدھارے دُنیا سے خاک بر سر
وہ چارلس کا امیر بحری۔ تھا غارنیس جس کا نام نامی
تھا سات سُلم شہون کا قیدی۔ نصیب میں اُسکے تھی غلامی

اسی آلھے میں آگے چلکر غارنیس کے قید میں رہنے اور نیزہ بازی کی مشق میں اپنے گرفتار کرنے والے سے انتقام لینے اور گھوڑے پر سوار ہوکر فرانس بھاگ جانے کا حال مذکور ہے۔

اس دن کے مقتولوں میں سے نامور بہادر رولنڈ بھی تھا جو برٹینی کی سرحد کا حکمران تھا۔ شارلےمین کی کہانیوں میں اسی شخص کا نام سرلون سے لاٹ ہے اور جو بہادرانہ کام اسکی طرف منسوب ہیں اُنکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کہانیاں کہتی ہیں کہ یہ شخص بہت ہی گھنے غول میں دن بھر لڑا۔ اور اپنی عمدہ تلوار سے جسکا نام ڈیورنڈا تھا برابر وہ ہیبت انگیز وار کرتا رہا۔ لیکن اسکی یہ سب قوتیں کچھ کام نہ آئیں۔ اور جنگ کا میدان جیت نہ سکا۔ آخر کار سر سے پا تک زخموں میں بھرا ہوا اور ہر طرف سے اپنے دوستوں کی لاشوں سے گھرا ہوا زمین پر پڑ گیا اور جان نذر کر دینے کو مستعد ہو بیٹھا۔ مگر پہلے اُس نے اپنی وفادار تلوار گھسیٹی اسلیے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کے قبضے میں

جا سکے اور اُسکی طرف خطاب کرکے کہا" اے تلوار! تیری چمک دمک بے نظیر۔ تیرا طول و عرض مناسب
تیری اصالت بے مثل ہے۔ تیرا قبضہ نہایت بُراق نیل دنداں کا سونے کی شاندار صلیب سے مرصع ہے
اور اسکے سرے پر پکھراج کا سیب کا سا دانہ لگا ہوا ہے جسپر خدا کا نام پاک کندہ ہے۔ تجکو خدا نے
تیزی اور ہر طرح کے جوہر عطا کیے ہیں۔ اب لڑائی میں تو کس کے ہاتھ میں رہے گی اور کس کو اپنا
آقا سمجھیگی۔ وہ شخص جسکے قبضے میں تو تھی کسی نے اُسپر فتح نہیں پائی اور نہ کبھی دشمن سے خائف ہوا۔
نہ خیالاتِ باطلہ سے کبھی ہراساں ہوا۔ خدا کی مدد سے تیرے ہی ذریعے سے اُس نے عربوں کو
خاک میں ملایا اور عیسیٰ کے دین کو آسمان تک پہونچایا اور کامل شہرت حاصل کی۔ اے خوش نصیب
اور تیز سے تیز تلوار۔ کوئی تلوار تیرے مثل کبھی نہ ہوئی۔ جس نے تجھے بنایا تھا اُس نے تیرا مثل نہیں
بنایا تھا! ایک آدمی بھی تیری ضرب سے جان بر نہ ہوا" اور اس خیال سے کہ مبادا ڈیورنڈا
کسی بُزدل یا کسی بے دین کے قبضے میں چلی جائے رولینڈ نے اُسے پتھر پر دے مارا اور دو ٹکڑے
کر ڈالا۔ اسکے بعد اُس نے اپنا سنکھا پھونکا جسکی آواز اس قدر گونجتی تھی کہ سارے سنکھوں کی صدائیں
دھیمی پڑ جاتی تھیں۔ اور اُس وقت تو اُسنے اُسکو اپنی پوری قوت سے پھونکا تھا۔ یہاں تک کہ اُسکی
گردن کی رگیں پھٹ گئیں۔ اس مہیب سنکھے کی آواز گونجتی ہوئی شاہ چارلس کے کانوں میں
پہونچی جو اس مصیبت سے بیخبر جو اُسکی فوج کے اخیر دستہ پر پڑی تھی آٹھ میل کے فاصلے پر خیمہ زن تھا۔
بادشاہ اس دردناک آواز پر جو کسی غم انگیز سانحے کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ضرور پہونچتا لیکن
ایک نمک حرام نے اُس سے کہا کہ رولینڈ تو شکار کو گیا ہے۔ اور شارلے مین سمجھا بجھا کر اپنے وفادار
جانباز سپاہی کی فریاد رسی کرنے سے باز رکھا گیا۔ آخر اُس جانباز نے دعا و توبہ کرکے داعی اجل کو
لبیک کہا۔ اسکے بعد فرانس کا ایک امیر بالڈون نامے دوڑا ہوا بادشاہ کے پاس پہونچا اور
ساری سرگذشت اُسکی فوج کے آخری دستے کی تباہی اور رولینڈ اور آلیور کی جانبازی کی کہ سُنائی
اسکا سننا تھا کہ بادشاہ اور اُسکی ساری فوج اُلٹے پاؤں پھری اور رانسس ویلس کو واپس آئی جہاں
ساری زمین میں کشتوں کے پشتے لگے ہوے تھے۔ اور سب سے پہلے چارلس ہی کی نظر اُس نامور

بہادر کی لاش پر پڑی۔ وہ صلیب کی صورت میں پڑی تھی۔ اور اُسکا سنگھا اور ٹوٹی ہوئی تلوار اُسکے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔ اسکے دیکھتے ہی چارلس اعظم نے ڈاڑھیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ وہ ہاتھوں کو ملتا۔ اپنی داڑھی کھسوٹتا اور نالہ وشیون کی حالت میں یہ بھی کہتا تھا کہ "او جسمِ بادشاہ کے دستِ راست۔ فرنگیوں کی عزت۔ تیغِ معدلت۔ نہ جھکنے والے نیزے۔ نہ ٹوٹنے والے چار آئینے۔ سپرِ سلامت۔ حامیِ عیسائیاں۔ تازیانۂ مسلماناں۔ دیوارِ رہباناں۔ محبِ بیوگان و یتیماں۔ نصفت شعار و ایماں دار حاکم! اِ او فرنگیوں کے مشہور کونٹ۔ ہماری فوجوں کے نامی سردار۔ میں نے تجکو یہاں مرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا؟ کیونکر میں تجھے مُردہ دیکھوں اور تیرے ساتھ جان نہ دوں؟ تو مجھے غمگین اور تنہا اک قابلِ رحم ذلیل بادشاہ چھوڑ کر چل بسا۔ لیکن تو آسمانی سلطنت میں جا پہونچا اور ملائکہ و شہداء کی صحبت سے مستفیض ہو رہا ہے۔" اسی طرح سے چارلس اپنی زندگی کے اخیر دن تک رولینڈ کو روتا رہا۔ اُسی مقام پر جہاں وہ مرا تھا فوج نے آرام لیا اور اُسکی لاش لبان وعود و مُر سے پُر کر کے رکھی گئی۔ فرنگیوں کا سارا لشکر اُس رات کو دعاؤں اور گیتوں کے ذریعے سے صلیب کی تعظیم اور آس پاس کے پہاڑوں پر آگ روشن کر کے اُسکے نزدیک پہرا دیتا رہا۔ دن کو اُس لاش کو ساتھ لے گئے اور بالکل شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ دفن کیا۔ اس طرح وہ خونخوار دن تمام ہوا۔

جبکہ رولینڈ اور آلی ور ہر بہادر۔ جری و نام آور

مر گیا ران سیس ولیس کے پاس دے گیا اقربا کو داغِ جگر

کوئی ایسی کم نتیجہ جنگ کبھی بہادری کے اتنے افسانوں اور گیتوں کا موضوع نہیں ہوئی۔ اسکو پی رنیز کی تھرماپولی کہنا چاہیے۔ لیکن اس میں نہ اُسکی سی عظمت ہے نہ اُسکا سا نتیجہ لیکن سارا رنگ و روغن دہی ہے۔

تیسرا باب

اہل اندلس

سنہ ۷۳۳ء میں جو چارلس مارٹل نے فتح پائی اُسنے یورپ پر مسلمانوں کی حملہ آوری کی حدبندی کر دی۔ اُنھوں نے اور زیادہ فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ بلکہ جو سلطنت اُنھوں نے حاصل کی تھی اُسکے نظم ونسق کی طرف متوجہ ہوئے۔ تارلے مین کے مختصر و بے سبب حملے کے بعد مسلمان قریب قریب محض بے خرخشہ تین سو سال کی مدت تک قابض رہنے دیے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ خارج السلطنۃ قوط کی اولاد ابھی تک شمال کے کوہی اضلاع میں اصرار کے ساتھ اپنی خودمختاری پر قائم تھی اور وقتاً فوقتاً اپنی قدیم سلطنت کے کسی جزو پر قبضہ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ تاخت وتاراج گو کچھ تکلیف تو ضرور دیتے تھے مگر ان سے گیارہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی سطوت وجبروت کو جو ہسپانیہ کے بہت بڑے حصے پر تھی کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہونچا۔ ان فاتحوں نے امرنا گزیر کے طور پر شمالی اضلاع کی خودمختاری کو قبول کر لیا۔ اس لیے کہ اسکے مٹانے میں جس قدر خوں ریزیاں ہوتیں اُس قدر منفعت نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اور جلیقیہ۔ لیون۔ قشتالہ۔ اور خلیج بسکے کے قریب کے اضلاع عیسائیوں کے قبضے میں چھوڑ کر وہ اُس ملک کے عمدہ تر حصوں ہی پر قانع ہو بیٹھے۔ عیسائی شمال کے سنگلاخ میدانوں اور کوہی دروں سے متمتع ہونے کو اس شرط پر چھوڑ دیے گئے تھے کہ جنوب مشرق کے سرحاصل اضلاع سے مسلمانوں کے مستفید ہونے میں خلل انداز نہ ہوں۔ آٹھویں صدی کے اخیر سے جبکہ اسلامی سرحدیں ایک طرح سے قطعی طور پر متمائز شکل میں ہو گئی تھی اُس زمانے تک کہ گیارہویں صدی میں عیسائی علاقہ جنوب کے درمیان حدِ فاصل تقریباً اُس کوہی سلسلے کو کہنا چاہیے جو [illegible] وادی الرمہ کہلاتا ہے۔ یہ سلسلہ مقام کوامبرا واقع ملک پرتگال سے شمال ومشرق رویہ سرقسطہ تک چلا گیا ہے

اور سرقسطہ سے دریائے ابرو کو تقریبی حد فاصل سمجھنا چاہیے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دریائے ٹیگس و وادیانہ و وادی الکبیر کے زرخیز مرغزار مسلمانوں کے قبضے میں تھے (خود وادی الکبیر کا نام ہی شہادت دے رہا ہے کہ ہمارے مالک عرب تھے۔ اس لیے کہ وادی عربی میں دریا کو کہتے ہیں اور کبیر کے معنی بڑے کے ہیں) اور اندلس کے مشہور شہروں پر قابض ہونے کے علاوہ دولت اور تجارت وعمدہ آب و ہوا بھی جنکے لیے یہ جگہیں رومیوں کے زمانے سے شہرۂ آفاق ہیں مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی تھی۔ یہ تقسیم قدرتی تھی۔ یہ دونوں حصے قدیم الایام سے جغرافیۃً اپنی آب و ہوا کی تفریق کے باعث ممتاز تھے۔ شمالی حصہ تو سوتا۔ سرد تھا جہاں جاڑا آندھیوں کے طوفان آیا کرتے۔ موسلا دھار مینھ برستا اور حد سے زیادہ سردی ہوتی تھی۔ گو عمدہ مرغزار کا ملک تھا مگر اُسکے اکثر حصے زراعت کے لیے مناسب نہ تھے۔ اور جنوبی حصہ میں اگرچہ افریقیہ کی جانب سے لُو چلتی تھی مگر خوش سواد خوب سیراب اور عمدہ زراعت کے قابل تھا۔ اک بڑی ہی چوڑی چپٹی پہاڑی ان دونوں حصوں کو تقسیم کرتی ہے اور اگرچہ یہ پہاڑی خاصکر مسلمانوں کے حصے میں پڑی تھی مگر اک حد تک یہ زمین متنازع فیہ رہا کرتی تھی اور غیر محفوظ طور پر قبضے میں تھی۔ اسکی بہت ہی سرد بلندیاں عرب جیسے لوگوں کے جو دھوپ کے دلدادہ ہیں کب مذاق کے موافق ہوسکتی تھیں اس لیے وہ اس زمین کو زیادہ تر بربری قبیلوں کے سپرد کر دیتے تھے جو پہلے پہل طارق کے ساتھ آئے اور جنکو عرب جو اس فتح کے ثمرات اُٹھاتے تھے ہمیشہ کم وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس جزیرے کے دو تہائی میں جسکو قدرت ہی نے گویا عربوں کی سکونت کے لیے ممتاز کر دیا تھا اور جسکو عرب ہمیشہ "اندلس" کہتے تھے۔ ان لوگوں نے قرطبہ کی وہ حیرت افزا سلطنت قائم کی جو متوسط زمانے میں ایک اعجوبہ چیز تھی اور جو ایسے زمانے میں کہ سارا یورپ وحشیانہ جہالت ومخاصمت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا صرف تن تنہا علم وتہذیب کی جگمگاتی مشعل مغربی دنیا کو دکھا رہی تھی۔ ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ عرب بھی اُن وحشی غولوں کی طرح جو اُن سے پہلے آئے تھے ظلم وتعدی لیتے آئے تھے بلکہ برعکس اسکے جیسی نرمی۔ نصفت شعاری اور دانائی

الناظر کی پرانی جلدین

جولائی ۱۹۰۹ء سے دسمبر ۱۹۱۷ء تک کی سترہ ششماہی جلدین شائع ہوئین جنمین سے کم و بیش اکثر موجود ہین۔ کپڑے کی مضبوط جلدین بنی ہوئی ہین اور حسب ذیل قیمتون پر دی جائینگی۔

جلد اول	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۰۹ء)	عمر
جلد دوم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۰ء)	عہ
جلد سوم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۰ء)	عمر
جلد چہارم	(جنوری لغایت جون ۱۹۱۱ء)	۱۲ر
جلد پنجم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۱ء)	۱۲ر
جلد ششم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۲ء)	عمر
جلد ہفتم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۲ء)	عہ ر
جلد ہشتم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۳ء)	عہ ر
جلد نہم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۳ء)	عہ ر
جلد دہم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۴ء)	عہ ر
جلد یازدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۴ء)	عہ ر
جلد دوازدہم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۵ء)	عہ ر
جلد سیزدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۵ء)	عہ ر
جلد چہاردہم	(جنوری لغایت جون ۱۹۱۶ء)	عہ ر
جلد پانزدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۶ء)	عہ ر
جلد شانزدہم	(جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۷ء)	عمر
جلد ہفدہم	(جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۷ء)	عمر

(نوٹ) مکمل سٹ تھوڑے ہی ہین لہذا جو صاحب خواہان ہون جلد منگالین۔ مکمل سٹ لینے والون سے جملہ سترہ جلدون کی قیمت سترہ روپیہ لی جائے گی۔ منیجر الناظر لکھنؤ

فہرست مضامین

رسالہ زمانہ بابت جنوری ۱۹۱۸ء

اس نمبر سے زمانہ کی تیسوین جلد شروع ہوتی ہے ابھی نمبر سے آپ بھی اس کی خریداری شروع کیجئے۔ قیمت سالانہ (للعہ)

المشتہر۔ منیجر زمانہ (کانپور)

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد
- البرامکہ

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- میڈیکل جورس پروڈنس
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ موسیو تھیونو

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا
- شمع و شاعر
- بلال
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالۂ یتیم
- فریاد امت
- تصویر درد
- مکمل ترانہ

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامچہ بالتصویر
- " بلاتصویر
- روزنامچہ
- تسخیر مہر و قمر
- رسول کی عیدی
- پیاری ہتکڑی
- اتالیق خطوط نویسی
- گاما خاتون
- اسلام کا انجام
- بیوی کی تعلیم
- انتخاب توحید
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں
- فلسفۂ شہادت
- غدر دہلی کے افسانے
- بیگماں [illegible]
- جگ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- اسرار
- کم ٹوٹ
- سیر دہلی

مولانا اشرف علی
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب
- تعلیم الدین
- اکسیر فی اثبات التقدیر
- الانتباہات المفیدہ
- اصلاح الرسوم
- کلید مثنوی ۲ حصہ
- مناجات مقبول
- امداد الفتاویٰ
- فتاوی اشرفیہ
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- جزاء الاعمال
- فروع الایمان
- التکشف ۵ حصے
- اصلاح ترجمہ دہلویہ

حکیم محمد علی خاں
- عبرت کامل
- حسن سرور
- دیوال دیوی
- گوپا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- اخنہ و صنیہ کامل

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- اقبال دلہن
- حسن معاشرت

نیاز فتح پوری
- ایک شاعر کا انجام
- عائشہ صدیقہ
- جذبات بھاشا

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند مجلد
- عربی بول چال ۲ حصہ
- کتاب الصرف
- کتاب النحو

سیماب اکبرآبادی
- ماہیت الرسول
- جام کوثر
- بہشتی جوہر

مولوی مصباح الدین احمد
- الہارون
- محاربۂ فرانس و پرشیا
- مصباح الادب

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- لغات جدیدہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد

مولانا راشد الخیری
- طوفان حیات
- سراب مغرب
- الزہرا
- [illegible]

مسٹر ظفر علی خاں
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد
- خیابان فارس
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- جنگ روس و جاپان
- فلسفۂ ابن سینا
- معاشرت

مفتی انوار الحق
- تاریخ ابوالبشر
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- قوت خیال
- اصول خانہ داری ۲ حصہ

سید راحت حسین
- القمر
- النحل

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- حیات صالح
- نساء المسلمین
- آثار خیر
- امرائے ہنود

حاجی اسمٰعیل خاں
- فلاح دارین
- حالات زمین
- تربیۃ الدجاج
- غذائے صفا
- نظم نعت

مولوی حبیب الرحمن خاں
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- ذکر الحبیب
- ذکر جمیل

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد مجلد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- اسلام کی دنیوی برکتیں
- حضرت سلیمان
- حضرت ہاجرہ
- حقیقۃ السحر
- یورپ و قرآن
- احسان عام

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ یورپ ۲ جلد
- تاریخ پٹیالہ

مسٹر ظفر عمر
- مستقبل اسلام
- پولیس تین
- نیلی چھتری

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی ۸ر
- ابوبکر شبلی ۸ر
- خواجہ معین الدین ۴ر
- عصر قدیم ۱۲ر
- دولت ہسپانیہ ۸ر
- حروب صلیبیہ ۱۲ر
- تاریخ سندھ ۱۲ر
- قرۃ العین ۸ر
- تاریخ یہود ۱۲ر
- مسیح اور مسیحیت ۱۲ر
- کلمہ زنوبیہ ۴ر
- حکم الرفاعیہ ۴ر
- آغا صادق صاحب ۸ر
- سکینہ بنت حسین ۶ر
- مفیدات مجلد ۱۲ر
- تذکرہ مشاہیر عالم ۱۲ر
- درگیش نندنی ۱۰ر
- حسن بن صباح ۲ر
- افسانہ قیس ۴ر
- مقدس نازنین ۶ر
- فلپانا ۸ر
- ایام عرب ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو ۴ر
- مینا بازار ۴ر
- شوقین ملکہ ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۸ر
- یوسف و نجمہ ۴ر
- زوال بغداد ۸ر
- بدر النسا کی مصیبت ۱۲ر
- فردوس بریں ۴ر
- فاتح مفتوح ۱۲ر
- ہندوستان کی موسیقی ۴ر
- سیرۂ نبوی ۴ر
- جویا حق ۴ر
- بابک خرمی ۴ر
- فتح اندلس ۱۲ر
- اردو کی ترقی ۴ر
- الفانسو ۱۲ر
- خوفناک محبت ۸ر
- رضیہ بیگم ۴ر
- زمانہ اور اسلام ۴ر
- فلورا فلورنڈا ۸ر
- روئداد لکھنؤ ۱۲ر
- زیادہ وعلاوہ ۸ر
- سوانح ۱۲ر
- فیروز ملک ۸ر
- میوہ تلخ ۴ر
- حسن و عشق ۸ر
- بدر النسا ۴ر
- شوکت وحشت ۱۲ر
- بہشت ۴ر
- دلچسپ ناول ۱۲ر

مرزا محمد ہادی رسوا

- امراؤ جان ادا ۱۲ر
- لیلیٰ مجنوں ۴ر
- موجودہ ۴ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۶ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۱۰ر
- طرحدار لونڈی ۱۲ر
- میٹھی چھری ۸ر
- کایا پلٹ ۱۰ر
- کمینی نوازش ۱۲ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو ۶ر
- بچھڑی دلہن ۸ر
- کڑم دھم ۸ر
- پی کہاں ۶ر
- کامنی ۱۲ر
- جام سرشار ۸ر
- خدائی فوجدار ۸ر
- فسانہ آزاد ۸ر
- سیر کہسار ۸ر

منشی محمد الدین شاد برق

- مرزا بنی ۸ر
- مارا مستی ۱۰ر
- نجاتی دولہن ۱۲ر
- پرتاب ۸ر
- مشتو قصہ ۲ر
- بروگ ۵ر
- آتشیں ۴ر

جلال مرحوم

- مفید بحاکی کش ۸ر
- نظم نگارین ۸ر
- افادۂ تاریخ ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۲ر

منشی احمد علی شوق

- ترانہ شوق ۱۲ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر
- عالم خیال ۸ر
- سیکفرنڈ لوسی ۲ر

منشی احمد علی مرحوم

- تاریخ تمدن ۱۲ر
- شباب لکھنؤ ۸ر
- مرقع اودھ ۸ر

مسٹر عبدالماجد

- تاریخ اخلاق یورپ مجلد ۸ر
- فلسفہ جذبات ۸ر
- فلسفہ اجتماع ۸ر
- غذائے انسانی ۳ر
- فلسفہ کی تعلیم ۲ر
- دو پشیاں (ڈرامہ) ۸ر

مسٹر انیس احمد عباسی

- جوہر کی کامیابی ۱ر
- بیوی کی حکومت ۸ر

مولانا عبدالشکور

- اسد الغابہ ۸ جلد ۱۶ر
- علم الفقہ ۲ حصے ۸ر

علامہ سید احمد

- حمایت الاسلام حصہ اول ۸ر
- " حصہ دوم ۱۲ر
- فن ہیئت ۸ر
- فن کیمسٹری ۲ر

خواجہ عشرت

- زبان دانی ۴ر
- اصلاح زبان اردو ۸ر

منشی عاشق حسین

- مشتاق و زہرہ ۸ر
- افشائے راز ۸ر
- مظفر ورا بابائی ۱۲ر
- سلطان ناور کی دار حصہ ۸ر
- شادی و غم ۸ر
- تارا ۲ حصے ۸ر

وحشی بلگرامی

- مجموعہ گشت ۸ر
- خون آرزو ۴ر
- خواب عبرت ۲ر
- معشوقہ عرب ۸ر
- جا بجا ساز ۸ر

مسٹر حسین قدوائی

- ذکر طیب محمد عربی ۱۰ر
- بشیر ۸ر
- عرض حال ۱۱ر
- جذب دل ۸ر
- حاکم و محکوم ۴ر

منشی سعید احمد ناطق

- خون عاشق ۵ر
- انجمن آرا ۸ر
- مسافر و مشتاق ۴ر
- اسمٰعیل و زہرہ ۹ر
- ہر فرمونے راموسکی ۱۲ر
- مجموعۂ فرانس ۸ر
- شہر آشوب لندن ۱۲ر

شیخ احمد علی کامل

- راوحارانی ۳ر
- پاربتی ۳ر
- کلثوم ۳ر
- دو پھول ۳ر

متفرق کتابیں

- واقعات ہیں ۸ر
- جمیلہ کی کلائیاں ۸ر
- جواہر القاسر ۸ر
- خیالات پریشاں ۸ر
- خواب گلگشت ۸ر
- مختصر عشق نامہ ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰۷ | یکم مئی سنہ ۱۹۱۹ء | جلد ۱۸

فہرست مضامین

الناظر پریس، چوک، لکھنؤ

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اُردوئے معلی — عا ر
- عود ہندی — ۱۰ر
- دیوان غالب قسم اعلیٰ — عہ ر
- ،، معہ شرح نظم طباطبائی — عا ر
- ،، معہ شرح حسرت موہانی — عہ ر

مولانا حالی مرحوم

- حیاتِ جاوید مجلد — للعہ ر
- یادگار غالب — عہ
- حیات سعدی — عہ ر
- مضامین حالی — عہ ر
- مجموعہ نظم حالی — ۶ر
- مسدس حالی — ۸ر و ۱۲ر
- شکوہ ہند — ۲ر
- مثنوی حقوق اولاد — ۲ر
- رباعیات حالی — ۱ر
- قطعات حالی — ۸ر
- مرثیہ مرزا غالب — ۱ر
- بیوہ کی مناجات — ۲ر
- الدین یسر — ۳ر
- تحفۃ الاخوان — ۵ر
- رحم و انصاف — ۱ر
- چپ کی داد — ۱ر
- ننگ خدمت — ۱ر
- پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ — ۱ر
- حب وطن — ۱ر
- تعصب اور انصاف — ۱ر

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق تین جلد مجلد — ہے ۸ر
- تفسیر القرآن (۶ جلد) — ۲عہ
- تبیین الکلام (۲ جلد) — للعہ
- آثار الصنادید — ہے ر
- خطبات احمدیہ — عا ر
- مکمل مجموعہ لکچر مجلد — ہے ۸ر
- سیرۃ فریدیہ — ۱۰ر
- اسباب بغاوت ہند — ۶ر
- مقالات سرسید — عہ ر
- آخری مضامین سرسید — عہ ر
- النظر فی بعض مسائل — ۱۲ر
- تحریر فی اصول التفسیر — ۸ر
- احکام طعام اہل الکتاب — ۶ر
- ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف — ۶ر
- ازالۃ الغین — ۵ر
- تفسیر السموات — ۸ر
- جواب امہات المومنین — ۳ر
- الدعاء والاستجابۃ — ۳ر
- کاشنش — ۱ر
- ایک نادان خدا پرست — ۱ر
- انشاء اللہ — ۱ر
- خلق الانسان — ۲ر
- الجن والجان — ۵ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- خیالات عزیز — عہ ر
- دکرم اروسی — عہ ر

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد — ہیہ ر
- ترجمۃ القرآن بین السطور ،، — للعہ ر
- ترجمہ حمائل بین السطور ،، — ہے ۱۲ر
- ادعیۃ القرآن — ۶ر
- دہ سورہ — ۸ر
- مطالب القرآن — عہ ر
- الحقوق والفرائض ۳ جلد — عہ ر
- اجتہاد — عہ ر
- امہات الامہ — ۱۲ر
- مرآۃ العروس — ۸ر
- بنات النعش — ۶ر
- توبۃ النصوح — ۸ر
- مجموعہ نظم بے نظیر — عہ
- چند پند — ۴ر
- منتخب الحکایات — ۴ر
- مبادی الحکمہ — ۸ر
- موعظہ حسنہ — ۱۰ر
- رویائے صادقہ — عہ
- ابن الوقت — عہ ر
- ایامیٰ — ۴ر
- فسانۂ مبتلا — عہ ر
- لکچروں کا مجموعہ — عہ ر
- لکچر نمبر ۲۳ و ۲۴ — ۳ر
- لکچر نمبر ۲۶ مع تحریر — ۴ر
- لکچر تنبیہ ۴ر، لکچر تعلیم ۴ر
- نصاب المسلمین ۴ر، آزادی نسواں ۱ر
- رسم خط ۲ر، اتمام حجۃ ۱ر

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات — عہ ر
- دربار اکبری — للعہ
- سخندان فارس — ہے ر
- نیرنگ خیال — ۹ر
- نظم آزاد — ۱ر
- قند پارسی — ۱۰ر
- قصص ہند — ۶ر
- نصیحت کا کرن پھول — ۸ر
- سپاک وناک — ۸ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — للدعہ
- تاریخ عہد سلطنت ملکہ معظمہ — ہے
- سوانح عمری ملکہ معظمہ — عہ ر
- کرزن نامہ — عہ ر
- فلسفۂ امثال — ۸ر
- محاسن الاخلاق — عہ ر
- تہذیب الاخلاق — ۱۰ر
- صحیفہ فطرت — عہ ر
- تقویم اللسان — ۴ر
- تعلیم الانتظام — ۴ر
- جغرافیہ ریاضیہ — عہ ر
- معادن الحساب — عہ ر
- مساحت خرد — ۶ر
- محاربات عظیم — عہ ر
- عجائب الحساب — ۸ر
- رسالہ علم تناسب — ۴ر

مولانا شبلی مرحوم

- موازنۂ انیس و دبیر — للعہ ر
- الفاروق — عہ ر
- الغزالی — عا ر
- المامون — عہ ر
- سیرۃ النعمان — عہ ر
- سوانح عمری مولانا روم — عہ ر
- حیات خسرو — ۱۰ر
- علم الکلام — عہ ر
- الکلام — عہ ر
- سفرنامہ مصر و روم و شام — عہ ر
- رسائل شبلی — عہ ر
- مقالات شبلی — عہ ر
- مضامین عالمگیر — ۱۰ر
- شعر العجم جلد اول — ہے
- ،، جلد دوم — عہ ر
- ،، ،، سوم — عا ر
- ،، ،، چہارم — عہ ر
- مثنوی صبح امید — ۴ر
- آغاز اسلام — ۱۲ر
- اسلامی حکومت — ۲ر
- زیب النساء — ۱ر
- جہانگیر — ۲ر
- مجموعۂ کلام شبلی — ۱۶ر
- دیوان شبلی فارسی — ۸ر
- بوئے گل ،، — ۴ر
- دستۂ گل ،، — ۴ر
- برگ گل ،، — ۴ر

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد — ہے ۸ر
- مسلمانوں کی تہذیب — ۴ر
- مکاتیب الخلان — عا ر
- تقلید و عمل بالحدیث — ۸ر
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب — ۸ر
- کتاب المحبت والشوق — ۸ر
- فطرت اور قانون فطرت — ۳ر
- اسلام — ۲ر
- آیات بینات ۳ جلد — عمہ
- مجموعۂ لکچر مجلد — ہے ۸ر

مولانا شہری مرحوم

- حیات انیس — عا ر
- ایشیائی شاعری — عہ ر
- ادیب — ۸ر
- لغات الخواتین — عا ر
- نور جہاں — ۸ر
- ٹیپو سلطان — ۸ر
- حیدر علی سلطان — ۱۲ر
- اُردو کا گلدستہ — ۴ر
- اردو کی ڈالی — ۳ر
- قومی نظم — ۴ر
- مرقع تاجپوشی — عہ ر
- مکالمہ مرد و عورت — ۳ر
- حیات جاودانی — ۸ر
- سوانح عمری نظام حیدرآباد — ۱۲ر
- دربار تاجپوشی — ۸ر

تازہ مطبوعات

تحفۂ سائنس

مرتبہ شیخ فیروز الدین مراد، بی اے، ایم ایس سی، پروفیسر علوم طبیعات علیگڈھ کالج کے سائنٹفک مضامین کا مجموعہ (حصہ اول)، جس میں شبنم کی سرگذشت۔ زمین کا وزن۔ چاند کی سیر۔ آثار قیامت۔ اعجاز سائنس۔ انتہائے سائنس۔ نہ دکھائی دینے والی روشنائی۔ فلسفۂ فطرت وغیرہ مضامین قابل دید ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف سائنس کے مسائل کو نہایت سہل اور عام فہم عبارت میں بیان کرتے ہیں تاکہ اردو خواں اصحاب پوری طرح مستفیض ہوسکیں۔ قیمت ۱۲؍

تاریخ تمدن حصہ دوم

سر طامس ہنری بکل کی معرکہ آرا تصنیف "ہسٹری آف سولیزیشن" کے ترجمہ کی ایک جلد دس برس ہوئے شائع ہوئی تھی بقیہ اجزا لائق مترجم منشی احمد علی صاحب مرحوم بی اے، ایل ایل بی رئیس کاکوری کی جوانمرگی کے باعث شائع نہ ہوسکے۔ بالآخر انجمن ترقی اردو کی تحریک پر مسٹر عبد الماجد بی اے نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی اور دوسری جلد چھپکر تیار ہوگئی ہے۔ قیمت عہ

تاریخ یونان قدیم

سید ہاشمی صاحب فرید آبادی جنھوں نے انجمن ترقی اردو کی فرمایش پر حکیم پلوٹارک یونانی کی شہرۂ آفاق اور نادرۂ جاوید کتاب مشاہیر یونان و روما کو بڑی قابلیت کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا ہے، حال ہی میں یونان قدیم کی ایک مختصر تاریخ مرتب کی ہے جس سے طلبا اور علم شایقین یکساں طور پر مستفید ہوسکیں گے۔ یہ کتاب بھی انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیگئی ہے۔ قیمت عہ

بنت الوقت

شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت لکھا تھا۔ زمانہ نے اسقدر ترقی کرلی ہے کہ مولوی عبد الراشد الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت کو بنت الوقت لکھنا پڑی۔ جدید تمدن و تہذیب نے ہماری خواتین کو جن بربادیوں میں مبتلا کردیا ہے اسکی اصلاح کے لیے یہ کتاب لائق ہے۔ قیمت

پولیٹکل سرگذشت

اس کتاب میں شیخ ضیاء الحق صاحب ایڈیٹر اخبار پیشوا نے ظفر علیخاں (ایڈیٹر زمیندار) کی حقیقت بیان کی ہے اور ملکی اخبارات اور ملک کے مستند اہل الرائے اصحاب کے خیالات پیش کیے ہیں جن سے ایڈیٹر زمیندار کے عبرتناک مدارج زندگی، بے اصولیوں، اخلاقی کمزوریوں اور سیاسی قلابازیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ قیمت ۱۲؍

شیخ الہند

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح و حالات اسیری جسے صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی نے شایع کیا ہے۔ قیمت ۲؍

۵/

پین ہیلر

یہ ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی - درد - موچ - چوٹ گٹھیا کے سب جوڑون یا گانٹھون مین ریاح یا سردی کے سبب سے کمر - کولھا - پنجر - گردن یا اینٹھن وغیرہ سے جیسا بھی درد ہو پین ہیلر کے مالش سے فوراً جاتا رہتا ہے - قیمت فی شیشی بارہ آنے (۱۲/) محصول ڈاک ۵/ ، دیکھیے جناب یعقوب علی صاحب ایڈیٹر الحکم اپنے اخبار مورخہ ۷/ اگست سنہ ۱۹۱۵ء مین کیا لکھتے ہین -

ڈاکٹر ایس کے برمن کا کامیاب علاج

مجھے ڈاکٹر ایس کے برمن کے متعلق ایک سے زیادہ مرتبہ الحکم میں لکھنا پڑا ہے لیکن آج مین دلی شکرگذاری کے ساتھ انکے کامیاب علاج کا ذکر کرتا ہون - ناظرین الحکم کو معلوم ہوگا کہ میری اہلیہ ایک سال سے زیادہ عرصہ سے بیمار ہے سلسلہ کے معزز اور مخلص ڈاکٹرون اور طبیبون نے ہماری ہمدردی اور توجہ سے اسکے علاج میں کوشش کی مگر انکی حالت صحت کی طرف نہین آئی یہانتک کہ وہ چلنے پھرنے سے بالکل عاری ہوگئیں اور ٹانگوں کے درد نے لاچار کردیا - میرے بچوں نے بطور خود ڈاکٹر برمن سے انکی دوائی دافع درد منگوائی اور اسکا استعمال شروع کیا خدا تعالیٰ نے اپنے محض فضل سے ڈاکٹر صاحب کی دوائی میری اہلیہ کیلیے نہایت مفید ثابت ہوئی - وہ مریضہ جو چارپائی سے اُٹھ نہین سکتی تھی میں دیکھتا ہون وہ دن بدن اس بیماری سے نجات پا رہی ہے - ایسی مفید دوائی کیلیے مین اپنے ناظرین کو سفارش کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر ایس کے برمن کی ادویات جو نہایت قیمتی اور مفید ہین ضرورتاً استعمال کریں -

یعقوب علی ایڈیٹر الحکم قادیان

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۷ جلد ۱۸ — یکم مئی ۱۹۱۸ء

مادیت[1]

عام خیال یہ ہے، کہ انسان دو بالکل مختلف بلکہ متضاد چیزوں سے بنا ہے۔ ایک کا نام بدن، جسم یا مادہ ہے، اور دوسری کا ذہن، نفس، یا روح۔ مادہ ایک فانی بےحس و ادراک، ٹھوس، ممتد یا پھیلاؤ والی شے ہے۔ اُسکی تقسیم ہو سکتی ہے، اُس میں تغیر تبدل واقع ہو سکتا ہے۔ بخلاف اِسکے روح ایک قطعاً غیر منقسم، ناقابلِ فنا اور بسیط جوہر ہے، اُس میں نہ تو کوئی امتداد ہے نہ کسی طرح کی کمی بیشی اور تبدیلی کا امکان ہے، شعور و ادراک اُسی کا خاصہ بلکہ اُسکی ذات

---

[1] اس مضمون کے لکھتے وقت زیادہ تر حسب ذیل کتابیں پیش نظر تھیں:

(۱) تاریخ مادیت، از البرٹ لینج۔

(۲) معمۂ کائنات (Riddle of the Universe) از ارنسٹ ہیکل

(۳) جدید مذہب زردشتی (ماڈرن زوراسترانزم) از سیموئل لینگ

(۴) ہکسلے کا مشہور مضمون 'مادی اساس حیات' (فزیکل بیسس آف لائف) (Physical basis of life)

(۵) ایک آدھ تاریخ فلسفہ مثلاً ویبر کی

میں داخل ہے۔ فلاسفہ میں اس دوئی کے قائلین کا لقب **ثنویہ** ہے۔ ارسطو اور ڈیکارٹ اسی گروہ کے علمبردار ہیں۔

لیکن چونکہ فلسفہ کو کثرت و تعدد سے قدرتی بُعد تھا، اسلیے وہ اس دوئی پر قرار گیر نہیں ہوسکتا تھا، اور لازمی طور پر **وحدت** کی جستجو میں ایک فریق اس امر کا مدعی بنگیا، کہ حقیقی اور جوہری وجود صرف روح کا ہے، باقی عالم جسمانیات کی ہستی ظل اور پرتو یا خود روح کے آفریدہ تصورات سے زیادہ نہیں۔ اس مسلک کا وسیع ترین اصطلاحی نام **تصوریت** ہے، جس میں فلاطون سے لیکر ہیگل[1] تک نہایت ہی **متفاوت** اور متباین الخیال فلاسفہ شامل ہیں۔ دوسرے سرے پر **مادیت** کا ادعا ہے، کہ نہیں جو کچھ ہے بس مادہ ہی مادہ ہے، جن افعال کو روح کی جانب منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی مادہ ہی کی قوتوں کا ایک کرشمہ ہیں۔ ہم ذیل میں **وحدیت** (مانزم) کے اسی آخر الذکر مذہب کی معبری اور وکالت کرنا چاہتے ہیں :-

اگرچہ بقول البرٹ لینج[2] کے "مادیت اُتنی ہی قدیم ہے، جتنا خود فلسفہ" اور اس میں بھی کچھ شک نہیں، کہ بحیثیت فلسفہ کے ایک مستقل و منضبط اسکول کے اسکی بنیاد تقریباً چوبیس سو سال پہلے دیمقراطیس[3] کے ہاتھ پڑ چکی تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ دیمقراطیس اور اُسکے اتباع ایپکیورس[4] وغیرہ کی مادیت کی بساط ایک نظریہ اور تخمین سے زائد نہ تھی۔ گر عہد حاضر میں، علم کیمیا، تشریح، عضویات و علم الجنین وغیرہ کی تحقیقات، خوردبینی مشاہدات اور نظریۂ **ارتقا** نے اس ظن و تخمین کو ایک سائنٹفک حقیقت بنا دیا ہے۔ جسکا توڑ ہمارے نزدیک صرف برکلے کی انتہائی **تصوریت**[5] (آئیڈیلزم) ہے۔ بعض باتیں

---

[1] جرمنی کے متاخرین فلاسفہ میں سب سے بلند پایہ خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۸۳۱ء میں مرا۔

[2] ۱۸۲۸ء تا ۱۸۷۵ء۔ اسکی "تاریخ مادیت" جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، یورپ بھر کے لٹریچر میں اس موضوع پر غالباً اس سے بہتر اور جامع تر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اصل جرمن میں ہے۔ انگریزی میں ترجمہ ہوگیا ہے۔

[3] مادیت کا ابوالآبا، اور سالمات کے نظریہ کا کہنا چاہیے کہ بانی اول ہے۔ اجزائے دیمقراطیسی اسی کے نام سے مشہور ہیں (۴۶۰ ق م)

[4] ۳۴۱ تا ۲۷۰ ق م مادیت کا نہایت زبردست اور بیباک حامی تھا۔ اور اخلاق میں لذتیت کے بدنام مذہب کا بانی ہے۔

[5] جسکا خلاصہ یہ ہے کہ عالم جسمانیات کی ہستی ذہن یا روح کے آفریدہ تصورات سے زیادہ نہیں، ذہن کے باہر مادہ کا کوئی وجود نہیں۔ مزید تفصیل کیلیے خود برکلے کی اصل کتاب "مبادی علم انسانی" اور "مکالمات" مطبوعہ شبلی اکاڈمی کی طرف رجوع کرسکتے ہو۔

بچپن سے سنتے سنتے اس طرح ذہن میں جم جاتی ہیں کہ بلا ادنیٰ ثبوت کے بھی ایک محسوس اور اٹل حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسلیے مادیت کے تائیدی دلائل و شواہد پر بحث سے پہلے، دم بھر کے لیے مذہب و روایت کے تعصبات سے خالی الذہن ہوکر یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ وجودِ روح کے عالمگیر اعتقاد کی بنا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ روح جسم کی طرح کوئی مرئی یا محسوس شے نہیں ہے: نہ اُسکے وجود کا اذعان بالواسطہ یا براہِ راست شہادتِ حسّی پر مبنی ہے۔ ابتداءً روح کا خیال جن علم النفسی اور ضیاتی (ماتھالوجیکل Mythological) محرکات سے پیدا ہوا، اولاً تو اُنکی کافی پردہ دری ہوچکی ہے، دوسرے یہ موقع اُنکے چھیڑنے کا نہیں ہے۔ سردست ہمکو صرف اُس شے سے بحث ہے، جسکی بنا پر انیسویں صدی کے علم الحیاتی اکتشافات کے بعد بھی لوگ روح کے اقرار پر مضطر ہیں۔ اور جس کا ماحصل یہ ہے، کہ یہ بات کسی طرح دل میں نہیں اُترتی کہ انسانی فکر و استدلال کی محیر العقل قوتیں ہڈی اور پتھر جیسے بے حس و حرکت اجسام ہی کا ایک مظہر ہیں۔ اور گلیلیو و نیوٹن کے اندر جسم خاکی کے ڈھیر کے علاوہ کوئی اور شے کارفرما تھی۔ یہ کسی طرح تصور میں نہیں آتا، کہ عقل و فہم کی وہ قوتیں جن سے فلسفہ و حکمت کے عجائب صادر ہوتے ہیں، وہ ذرات مادی کی محض کسی مخصوص تالیف و حرکات کا نتیجہ ہیں۔

ہمکو اعتراف ہے، کہ یہ اشکال و استبعاد بے بنیاد نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی خفیف تامل کے بعد صاف نظر آنے لگتا ہے، کہ اسکی بنا ایک طرح کے محض نفسیاتی مغالطہ پر ہے۔ چونکہ روح کا وجود فقط انسان کے ساتھ مختص خیال کیا جاتا ہے، اور مادہ سے بالعموم ذہن کا انتقال بے جان یا غیر عضوی (inorganic) اجسام کی جانب ہوتا ہے، اس لیے جب کوئی شخص مادہ اور روح پر ایک ساتھ مقابلۃً غور کرتا ہے، تو ایک طرف تو اُسکے پیش نظر عقل انسانی کے کارنامے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف براستہ گلی کے افتادہ کنکر پتھر، بیج کی گٹھلیوں سے ذہن بالکل غیر ملتفت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک سنگریزہ اور اصل الانواع کے مصنف (ڈاروِن) کے مابین جو بعد المشرقین ہے، اُسکا قطع کرنا انسان کی سمجھ کے لیے نہ صرف عسیر التصور بلکہ قطعاً ناممکن ہے، اور وہ یقیناً یہ ماننے پر بے بس ہے، کہ ریل، تار، اور ہوائی جہاز کے موجدین کے اندر کوئی ایسی فوق الفہم شے کام کر رہی ہے، جو پتھر اور لوہے کے بےحس و حرکت پاروں سے نہ صرف مدارج میں مختلف بلکہ اپنی ماہیت و نوعیت میں متباین ہے۔

ایک شخص جس نے کبھی ایک گز کی دیوار اٹھتے نہ دیکھی ہو، اسکو اگر تم دفعۃً سیکڑوں فٹ لمبے اہرام مصری یا قطب مینار کے پاس لیجا کر کھڑا کر دو تو کیا وہ مشہور حکایت کے تین احمقوں کی طرح انکی لمبائی سے حیرت زدہ ہو کر انکی تعمیر کی نسبت عجیب و غریب نظریات نہ قائم کرے گا؟ لیکن اگر یہی شخص چند دن کسی شہر میں رہے، جہاں ہر روز چھوٹے بڑے مکانات بنا کرتے ہیں، پھر اسکو نیویارک کی سر بفلک عمارتوں کے نیچے بھی لیجا کر کھڑا کر دو جب بھی وہ انکو اپنے ہی جیسے ۵، ۶ فٹ کے آدمیوں کا کارنامہ خیال کریگا، اور یہ کبھی نہ کہے گا، کہ "انکے بنانے والے کیسے لمبے تھے"!

اسی طرح ایک بے تعصب علم الحیات کے متعلم (اسٹوڈنٹ۔ Student) کے لیے جو غیر عضوی مخلوقات اور پروٹوپلازم سے لیکر انسان تک سلسلۂ ارتقاء کی مختلف کڑیوں سے باخبر ہے، یا کم از کم ایک مرتبہ غور سے ہکسلے کی کتاب "کائنات میں انسان کی جگہ" یا ارنسٹ ہیکل کا کارنامہ "تخلیق کی تاریخ طبعی" پڑھ چکا ہے، اسکے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے، کہ انسان کی عقل و حکمت کا سرچشمہ کوئی ایسی ماوراء کوئی فوق الفطرۃ اور کلیۃً متباین الماہیۃ غیر فانی مبدء ہے، جو انسان کا کالبد تیار کرنے کے بعد اسمیں داخل کر دیا جاتا ہے، اور اس کالبد کے برباد ہونے کے ساتھ ہی، وہ اس طرح پرواز کر جاتا ہے جیسے قفس کی تیلیاں ٹوٹنے کے ساتھ طائر۔ اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں، کہ مسئلۂ ارتقاء پر کوئی مفصل بحث کی جاسکے۔ اسلئے ہم صرف ایک عام فہم تشریح اور چند موٹی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں۔

روح کا لفظ عوام سے لیکر حکما تک ایسے مبہم اور غیر معین معنی میں استعمال کرتے ہیں کہ کبھی تو وہ نہایت وسیع ہو جاتا ہے اور کبھی نہایت تنگ۔ ہم سہولتِ فہم کے لیے افعالِ نفس کے تین مراتب قائم کرتے ہیں، جنکے مجموعہ کو روح سمجھنا چاہیے (۱) افعالِ حیات (۲) حس و حرکت اور (۳) فکر و شعور۔

اول الذکر میں عمل ہضم، نمو اور تولید جنس کی قوتیں داخل ہیں۔ یہ نفس یا جاندار مخلوق کی سرحد کی اولین منزل ہے۔ نباتات کا کوئی فرد ان سے یا افعالِ حیات سے خالی نہیں ہوتا۔ اب [illegible] کی جگہ بجائے غیر عضوی اجسام خصوصاً بلور کرسٹل، جنکی ساخت ہمیشہ ایک خاص اقلیدسی شکل کی ہوتی ہے، وغیرہ سے کسی درخت اور پودے کا موازنہ کرو، تو ان دونوں میں تمھو اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز فرق نہ معلوم ہوگا، کہ نمو وغیرہ کے افعال کا منشا کسی غیر مادی چیز کو سمجھنے لگو۔ چنانچہ عوام سے لیکر علماے مذہب و فلسفہ تک میں

سلہ تفصیل آگے آتی ہے۔

بہت ہی کم لوگ ایسے ہونگے، جو یہ مانتے ہوں، کہ درختوں کے خشک ہونے، پتیوں اور پھولوں کے مرجھا جانے کے بعد کوئی مجرد غیر فانی روحانی ہستی اُن سے نکل کر علٰحدہ قائم رہتی ہے۔ دوسرے طبقہ میں ہم نے جن افعال کو داخل کیا ہے، وہ اگرچہ حیاتِ نفسی کا پہلا قدم نہیں ہیں، لیکن بلحاظ اپنی اہمیت کے سب پر مقدم ہیں۔ اسلیے کہ روح یا عقلِ انسانی کی تعمیر کا ہیولیٰ اور اساس احساس اور حرکت (جسکو علی العموم حرکتِ ارادی یا حیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے) ہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر بوس کے تجربات وتحقیقات نے دنیاے سائنس میں اس حقیقت کو قریبًا مسلم الثبوت بنا دیا ہے، کہ حس وحرکت بھی نباتات ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اس مضمون کے مباحث کو زیادہ تر گرد وپیش کے معمولی حوادث ومشاہدات ہی پر مبنی رکھنا منظور ہے۔ اس لیے تائیدِ مادیت کی ایک زبردست سائنٹفک شہادت سے سردست چشم پوشی کرنا پڑتی ہے، اور ہم یہ مانے لیتے ہیں، کہ حرکتِ ارادی اور احساس کی ابتدا حیوانات سے ہوتی ہے۔ اب تم ادنیٰ درجہ کے حیوانات مثلاً اسفنج (جسکی نسبت مدتوں کی بحث وتحقیق کے بعد یہ طے پاسکا، کہ نباتات نہیں بلکہ حیوانات کی صنف میں شامل ہے) کا مقابلہ چھوئی موئی وغیرہ جیسے نباتات سے، جن میں نمایاں طور پر ایک طرح کا حس نظر آتا ہے، کرو، تو کیا پھر بھی تمکو ان دونوں میں اتنا کچھ تفاوت محسوس ہوتا ہے، کہ اسفنج وغیرہ میں کسی غیر مادی مبدء (پرنسپل — Principle) کے قبول کرنے پر مضطر کرتا ہو۔

آخر الذکر صنف میں شعور سے مراد اپنی ذات کی شخصیت یا انانیت کا ادراک اور علم العلم ہے، یعنی کسی ذہن کا یہ جاننا، کہ وہ جانتا ہے، یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو، کہ اُن حوادث واحساسات سے باخبر ہونا، جو اُسپر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ پھر انھیں احساسات یا حوادثِ ذہنی کو خاص خاص سلسلوں میں مربوط کرنا، جزئیات کی باہمی تالیف وتحلیل سے کلی نتائج اخذ کرنا، اور اُن کلی نتائج سے نامعلوم جزئیات کے متعلق رہنمائی حاصل کرنا، یہی چیزیں عملِ فکر یا سوچنا ہیں، جنکو منطق کی اصطلاح میں استقرا اور قیاس کہا جاتا ہے۔ بہت سے علماے نفسیات فکر وشعور کو قریب المعنی بلکہ ہم معنی لفظوں کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ نوعی لحاظ سے یہی افعال حیاتِ ذہنی کا منتہاے کمال ہیں، اور بالعموم انسان یا غیر مادی روح کے ساتھ مختص سمجھے جاتے ہیں۔ خود حکما وفلاسفہ کے مابین انکے بارے میں شدید اختلافات ہیں۔ اور متعدد نظریات قائم ہوگئے ہیں۔ شوپنہائر[۱] کے نزدیک بلا تفریق ادنیٰ واعلیٰ تمام حیوانات ذی شعور

---

[۱] ہیگل کا معاصر اور جرمنی کا مشہور فلسفی ہے۔ اسکا فلسفہ "فلسفۂ ارادہ" کہلاتا ہے۔ جو کچھ ہے ارادہ ہی ارادہ ہے۔ تمام کائنات مادی اور غیر مادی کا مبدء حقیقی ارادہ ہی ہے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں فوت ہوا۔

ہیں، لیکن محققین علماے حیوانات فکر وشعور کو صرف اُن حیوانات تک محدود مانتے ہیں، جن میں الگ الگ آلات حس اور ایک مرکزی نظام (عصبی) پایا جاتا ہے۔ مثلاً فقاری (ریڑھ والے) اور ذوات الثدی (پستان والے) حیوانات۔ (ہیکل کی کتاب "معمۂ کائنات" باب ۸)

لیکن ہمارے نزدیک تم کو علم الحیوانات کے دفاتر کی ورق گردانی کی مطلق احتیاج نہیں۔ اگر تم اپنے روزمرہ کے معمولی مشاہدات ہی کا ایک تامل وبے تعصبی سے اعادہ کرسکو، تو ڈیکارٹ کی اس کوتاہ نظری کا پردہ فاش ہوجائیگا، کہ فکر وشعور کی خریت کا دعویدار تنہا انسان ہی ہے۔ چند دن کا ذکر ہے کہ میرے اُٹھنے بیٹھنے کے کمرہ میں بہت سی چڑیوں نے کئی آشیانے بنالیئے تھے۔ اکثر لڑتی اور بیحد شور مچایا کرتی تھیں، جس سے پڑھنے لکھنے میں خلل پڑتا تھا۔ میں اپنے پاس چھڑی یا رومال رکھ لیتا تھا، جسکو ہلاہلا کر اُڑادیا کرتا تھا، لیکن کیا ذہین جانور ہے! جب چند دفعہ دیکھ لیتا کہ میں خالی اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا چھڑی ہلایا کرتا ہوں، تو پھر اس بے اثر دھمکی سے ذرا بھی نہ ڈرتا، اور برابر اپنی جگہ پر جما ہوا چیخا کرتا۔ آخر دق ہوکر میں قریب سے جاکر ہانکتا، تین ہی چار بار ایسا کرنے سے یہ ہوتا تھا، کہ میں اپنی کرسی پر سے اُٹھنا چاہتا اور وہ اُڑ جاتا، بلکہ میرا سر اُٹھانا ہی اُسکو بھگا دینے کے لیے کافی ہوتا۔ گر ظالم کو جب متعدد تجربات سے یقین ہوجاتا کہ یہ بھی محض تہدید ہے، تو پھر سر ہلانا کیا کرسی سے اُٹھ بیٹھنا بھی بے سود ہوتا تھا۔ اور جب تک میں پاس نہ پہونچ جاتا، وہ اپنی جگہ سے نہ جنبش کرتا۔ کیا یہ تجربات وواقعات کے استقصا سے نتائج کلیہ اخذ کرنے اور قیاسات بنانے کی وہی قوتیں نہیں ہیں، جو ارسطو اور مل کی منطق کا موضوع ہیں اور جو انسان میں ترقی پاکر سائنس وفلسفہ کے انکشافات کی موجب ہوتی ہیں؟ کُتے کو جس دسترخوان سے دو چار روز ہڈی مل جاتی ہے، وہاں وہ بلا روعین اُسی وقت پر روزانہ آکھڑا ہوتا ہے۔ (وقت یا زمانہ کے اندازکی یہ کیسی استعجاب انگیز مثال ہے!) کیا یہ نفس کا وہی فعل نہیں ہے جو گداگر کو روز اس دروازہ پر گھسیٹ لاتا ہے، جہاں سے اُسکو ٹکڑا روٹی ملتی ہے؟ سرکسوں میں تم نے دیکھا ہوگا، کہ سکھلائے ہوے شیر، گھوڑے، بندر، اور ہاتھی وغیرہ عقل وذہانت کے کیسے عجیب عجیب تماشے دکھلاتے ہیں کہ آدمی کی بھی عقل دنگ رہ جاتی ہے! اس بیان سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالنا چاہیے، کہ انسان اور حیوان کی عقل میں کوئی فرق نہیں، فرق ہے اور نہایت عظیم ہے۔ لیکن نوعیت کا نہیں، بلکہ نقط مدارج کا ہے، جو خود

نوع انسان کی مختلف نسلوں، قوموں اور افراد میں باہم پایا جاتا ہے ڈاروِن اور آسٹریلیا کے اُن وحشی آدمیوں کے مابین، جو تین چار سے آگے گنتی نہیں جانتے، اس سے کسی طرح کم فرق نہیں ہے۔ جتنا ان وحشی انسانوں اور بندروں کی ترقی یافتہ جنس چمپینزی[1] کے مابین ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے، کہ حیوانات میں سرے سے کسی درجہ کا بھی فکر و شعور نہیں پایا جاتا، تو بھی ہمارے نزدیک اُن اہلِ مذاہب اور فلاسفہ کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانات کے باقی تمام افعالِ ذہنی کو فقط مادّہ اور مادی قوتوں کا معلول یقین کرتے ہیں، یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، کہ انسان کے ایک یا دو (فکر و شعور) مخصوص ذہنی قوی کا مبدء کوئی فوق الفطرت غیر مادی ہستی ہے۔ کیا مادّہ کی جو طاقت سماعت، بصارت، لمس، وغیرہ کے احساسات، حرکتِ ارادی اور حافظہ وغیرہ تمام حیوانی افعال کا مظہر بن سکتی ہے، وہ صرف فکر و شعور ہی کی تخلیق سے عاجز ہے؟ کیا ڈیکارٹ کا یہ دعویٰ کہ "حیوانات تو سرتاسر مادّہ ہی کی ایک میکانکی مخلوق یا مشین ہیں، لیکن انسان کے اندر ایک مجرد روح کارفرما ہے" ہٹ دھرمی سے زیادہ وقعت رکھتا ہے؟ سچ یہ ہے، کہ ایسی ہی حیرت انگیز مثالوں سے روایتی (ٹریڈیشنل Traditional) عصبیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ کیا عقل انسانی کی یہ عصبیت، اور بڑے سے بڑے حکما و فلاسفہ کی ایسی تاسف خیز کوتاہ بینیاں، خود اس بات کا ایک ثبوت نہیں ہیں، کہ جس روح کو ہم ذاتِ الٰہی کا مظہر بلکہ جزو خیال کرتے ہیں، وہ اسی بے عقل و شعور مادّہ کی ایک ناقص پیداوار ہے؟

بہرکیف اگرچہ اسفنج سے لیکر انسان تک ارتقائے ذہنی کے اتنے لاتعداد مدارج ہیں، کہ انکے اجمالی ذکر کے لیے بھی ایک دفتر چاہیے، لیکن ان میں سے اگر دس بیس بھی وضاحت کے ساتھ کسی بے تعصب سوچنے والے کے پیشِ نظر ہوں تو اُسکو بلا کسی دلیل کے از خود اس بات کا اذعان ہو جائیگا کہ انسان بھی اپنی روح سمیت اُنھی معمولی قوانین فطرت کا آفریدہ ہے جن کے ماتحت اور ساری مخلوق ہے۔ "وہ نہ آسمان سے ٹپکا ہے، نہ اختیار زمین سے بنا بنایا نکل پڑا ہے" اور اتنا تو کم از کم مذکورہ بالا تقسیم کے تین موٹے موٹے مدارج کو سامنے رکھنے سے بھی ہونا چاہیے کہ جو تحیر اور استعجاب دیدہ و دانستہ منکر ہیں اور عقل انسانی کے مقابلے سے پیدا ہوتا تھا، وہ قابل لحاظ

[1] انکی اگر تم انسان کے پہلو میں محض تصویر ہی دیکھو جب بھی تم پر یہ اثر پڑیگا کہ دونوں میں صرف مدارج ہی کا فرق ہے۔

حد تک گھٹ جاتا ہے، اور جو چیز پہلے قطعاً ناقابلِ تصور تھی، وہ محقق نہ سہی، لیکن بمراتب قابلِ تصور ضرور ہوگئی ہے۔ لہذا اب ہم اس قابل التصور حقیقت کے ایجابی دلائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

مادیت کے قائلین کا دعویٰ ہے، کہ ذہن کی مختلف قوتیں عضو دماغ (بھیجا) کے مختلف حصوں کے اسی طرح مختلف افعال ہیں، جس طرح معدہ کا فعل عملِ ہضم ہے، جگر کا تولیدِ صفرا، اور زبان و لب کی حرکات کا تلفظ و گویائی۔ یا اور زیادہ صاف مادیانہ لہجہ میں یوں کہہ سکتے ہو، کہ فکر شعور دماغ کے ذراتِ مادی کی مخصوص ترکیب و حرکات کا ویسا ہی ایک خاصہ، معلول یا قوت ہے، جیسا کہ پانی کے مخصوص اجزائے ترکیبی کا خاصہ سیلان، لوہے کے سالمات (ایٹم atom) کے التصاق کی معلول صلابت، اور مقناطیس کے اندر قوتِ کشش۔ لہذا سب سے اول یہ جان لینا چاہیے، کہ کوئی عضوی فعل کسی عضو کی جانب، کوئی ترکیبی خاصہ اجزائے ترکیبی کی جانب کوئی معلول کسی علت کی جانب اور کوئی قوت کسی خاص جسم کی جانب کیوں اور کس بنا پر منسوب کی جاتی ہے۔

اس کا ایک اور صرف ایک جواب ہے۔ یعنی سلسلۂ علت و معلول اور اشیاء کے افعال، خواص اور قویٰ کے علم کا واحد ذریعہ واقعات و حوادث کا استقراء ہے، اور پھر اس استقراء کی مختلف تجربات سے تائید و تصدیق۔ استقراء اور تجربہ ہی یہ بتلاتا ہے، کہ عمل ہضم جگر نہیں بلکہ معدہ کا وظیفہ ہے اور تولید صفرا معدہ نہیں جگر کا فعل ہے جب کبھی ہاضمہ بگڑتا ہے یا صفراوی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں تو اسکے مقابل میں معدہ اور جگر میں کوئی نہ کوئی نقص ملتا ہے، لکنت یا بودے پن کا مرض ہمیشہ آلاتِ نطق کے ایک خاص خلل کا معلول ہوتا ہے۔ اگر ڈماستھینز (یونان کا شہرۂ آفاق مقرر) اور برک کی زبان بند کر دی جاتی، یا لب سی دیے جاتے، تو آج ہم تک انکی مقرری کا شہرہ نہ پہونچتا۔ آکسیجن اور ہائڈروجن کے خاص خاص مقدار میں ملنے سے ہوا کبھی نہیں، بلکہ ہمیشہ پانی ہی بنتا ہے، اسلیے انکا ترکیبی خاصہ سیلان یقین کیا جاتا ہے۔ لوہے کی صلابت یا ٹھوس پن کی علت بجز اسکے ذرات کی قربت یا التصاق کے اور کیا ہے، چنانچہ جب حرارت کے ذریعہ سے پگھلا کر تم التصاقِ ذرات کو گھٹا دو تو وہ پانی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ مقناطیس میں کشش کیوں مانی جاتی ہے، صرف اسلیے کہ جب وہ لوہے سے ایک فاصلہ پر ہوتا ہے تو اپنی طرف اسکو ہمیشہ کھینچتا ہے۔ اب آؤ ذرا اسی معیار پر عضو دماغ اور افعالِ روح کے باہمی تعلقات کی جانچ کریں۔ ہمارے نزدیک اسکے لیے دو تین قسم کے مختلف مشاہدات و تجربات کا یکجا کر دینا کافی ہے۔

۱- عقلی اور ذہنی تفاوت کے ساتھ ساتھ دماغ کے حجم اور وزن میں بھی ہمیشہ فرق ہوتا ہے:- چنانچہ انسان کا دماغ اپنے جسم کے تناسب سے، تقریباً تمام حیوانات سے بڑا اور وزنی ہوتا ہے۔ یورپی اقوام کے دماغ کا وزن اوسطاً ۴۹ ½ آونس ہوتا ہے، زنگیوں کا ۴۰ سے کچھ کم اور ایک ابلہ آدمی کا مشکل ہی سے ۲۳ آونس سے کبھی زیادہ نکلتا ہے۔ معمولی عقل وفہم کے لیے کم ازکم ۳۴ آونس وزن ہونا چاہیے۔ علیٰ ہذا حجم کے لحاظ سے جرمنی، فرانس، انگلستان اور امریکہ کے لوگوں کا دماغ بالاوسط ۹۲ مکعب انچ ہوتا ہے، زنگیوں کا ۸۴ اور آسٹریلیا کے وحشیوں کا ۷۵ ہوتا ہے۔ بچپن سے بوڑھاپے تک، جسمی نشوونما اور انحطاط کے ساتھ ساتھ عقل میں جو ارتقا و تنزل ہوتا رہتا ہے، اُس کا تم خود روزمرہ مشاہدہ کرتے ہو۔ جسمانی بیماریوں کا دماغ کے کاموں پر جو نامرفوع اثر پڑتا ہے، اُس سے کون انکار کرسکتا ہے بعدہ میں کچھ خرابی واقع ہوتی ہے یا قبض وغیرہ کی شکایت ہوتی ہے، تو پڑھنے لکھنے کے کام میں کیسی اتری پڑ جاتی ہے۔ جس وقت دماغ تھک جاتا ہے، آسان سے آسان کتاب کا سمجھنا مشکل پڑ جاتا ہے۔ سرسام و جنون وغیرہ کی بیماریاں، جن سے عقل میں فتور آجاتا ہے، اِسکے سوا اور کیا ہیں، کہ عضوِ دماغ کے نظام عصبی میں ایک خاص قسم کا خلل لاحق ہو جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہاضمہ کے فتور کا منشا معدہ کا کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے، کہ عقل (روح) اور جسم (دماغ) میں ایسی ناقابلِ انفکاک وابستگی ہے، کہ اول الذکر کو آخر الذکر سے جدا کرنا ویسا ہی ہے، جیسا کہ حرارت کا آگ سے۔

۲- **وظائف الاعضا** کی تحقیقات نے اس حقیقت کو قطعاً غیرمشتبہ بنا دیا ہے، کہ ذہن کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام افعال دماغ کے خاص خاص حصوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی آدمی کا کاسہ سر (یعنی سرپوش کھوپڑی) اس طرح اُتار لیا جائے، کہ وہ مرنے نہ پاوے، تو عضویات کا ایک ہوشیار عالم سماعت، بصارت، گویائی، حافظہ، ارادہ، حتیٰ کہ عقل و شعور کے مراکز دماغی کو یکے بادیگرے برباد کرکے، ان افعالِ ذہنی کو ایک ایک کرکے باطل یا فنا کرسکتا ہے۔ کبوتر اور کتوں وغیرہ پر اس قسم کے تجربات کیے بھی گئے ہیں۔ کیا اب بھی دماغ کے ان حصوں کی حیثیت مشین کے اُن مختلف پرزوں سے زیادہ ہے جن میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام انجام دیتا ہے۔ اور کیا افعالِ روح کے میکانکی (Mechanical) میکنکل ہونے کا یہ اٹل ثبوت نہیں ہے؟

۳- ہمارے برتر سے برتر اور پیچیدہ سے پیچیدہ افکار ذہنی کی اگر تحلیل کی جائے، تو وہ کثیر مفرد بسیط

احساسات پر منتہی ہوں گے لیکن خود یہ احساسات بسیطہ کیا تمام تر آلاتِ حس، نظامِ عصبی اور مرکزِ دماغی کے جسمی یا مادّی اعضا پر موقوف نہیں ہیں؟ ایک آدمی اگر تمام آلاتِ حس سے محروم کر دیا جائے، تو کیا پھر بھی وہ بطلیموس اور کوپرنکس کا نظامِ ہیئت مرتب کر سکے گا۔ کسی شخص کو اگر پیدائش کے دن سے ۳۰، ۴۰ سال کی عمر تک ایک تاریک کمرے میں اس طرح پرورش کرو، کہ زیست بھر کی غذا، ہوا، اور روشنی تو پہونچ جائے، لیکن اس سے آگے اُسکے احساسات نہ ترقی کرنے پاویں، تو کیا پھر بھی وہ اپنی عقل کے لحاظ سے اُن حیوانات سے پست تر نہ ہوگا، جنپر شرف و تفوق کا ہمکو بلا قید و استثنا دعوےٰ ہے؟

۴۔ اگرچہ بالعموم لوگ یہی سمجھتے اور مانتے ہیں، کہ روح کا وجود صرف انسان میں ہے، باقی اَور تمام حیوانات اسی معمولی بے جان مادّہ سے بنے ہیں، اُنکے سارے افعالِ حیات و ذہن پتھر اور لوہے ہی جیسے اجسام کی مخصوص ترکیب و حرکات کے معلول ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اگر یہ قبول کر لیا گیا، کہ عملِ ہضم، نمو، تولید، اور حس و حرکت وغیرہ نباتی اور حیوانی تو نرے بے حس و حیات ذراتِ مادی ہی کی کیمیاوی تالیف اور میکانکی حرکات کا کرشمہ ہیں، تو پھر **قانونِ ارتقا** کی مدد سے آخر تک راستہ صاف ہے، اور انسان کے اندر کسی غیر مادی مبدء کی کارفرمائی کا ادعا عصبیت اور ہٹ دھرمی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لہذا اصلی مرحلہ اُس عظیم الشان خلیج کے پاٹنے کا ہے، جو عضوی اور غیر عضوی یا جاندار اور بے جان مخلوقات کے مابین حائل ہے۔ اگر یہ پٹ گیا یعنی یہ قطعیت کے ساتھ ثابت ہو گیا، کہ زندگی اسی طرح بے جان عناصر مادی کی کیمیاوی اور میکانکی ترکیب و حرکات کا ایک خاصہ ہے، جیسا کہ عناصر مائی کی ترکیب کا خاصہ سیلان اور ذراتِ آہنی کے التصاق کا خاصہ صلابت، تو پھر مادیت کی آخری فتح ہے۔

سائنس کی رہنمائی میں یہ ہفتخوان بھی بڑی حد تک طے ہو چکا ہے **عضوی علم کیمیا** کی تحقیقات اور خوردبینی مشاہدات نے ہمکو نہ صرف اُس نقطہ تک پہونچا دیا ہے، جو ہکسلے کے لفظوں میں **مادی اساس حیات** (پروٹوپلازم Proto-plasm) کے لقب کا بجا طور سے مستحق ہے، بلکہ اُسکے ایک ایک عناصر ترکیبی ٹھیک ٹھیک اُسی صحت سے دریافت ہو چکے ہیں جیسے پانی، ہوا وغیرہ کے۔ جس طرح آکسیجن و ہائڈروجن کے ملنے سے **پانی** بنتا ہے، نائٹروجن و ہائڈروجن کے امتزاج سے **نوشادر** (امونیا)، اور کاربن آکسیجن جب باہم ملتے ہیں تو **کاربونک ایسڈ** پیدا ہو جاتا ہے، اُسی طرح یہ مرکباتِ ثلثہ

جب خاص خاص مقادیر و حالات میں باہم ترکیب پاتے ہیں تو **پروٹوپلازم** کا مرکب درمرکب وجود میں آتا ہے، جس میں تمام لوازمِ حیات پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس **مادی اساس حیات** کے کیمیاوی اجزا کے ٹھیک ٹھیک اوزان تک دریافت ہو چکے ہیں، مثلاً کاربن ۵۵ و ۵۲ فی صدی ہوتا ہے، اور آکسیجن ۲۱ و ۲۳ فی صدی وکذلک الی الآخر۔ یہاں تک کہ علم الحیات کے حلقوں میں یہ امید باندھی جا چکی ہے، کہ وہ دن بھی آکر رہے گا، جبکہ لیبوریٹری میں زندگی اپنے عناصر کیمیاوی کی تالیف سے اسی طرح تیار کیجا سکے گی، جس طرح آج پانی وغیرہ بنایا جاتا ہے (دیکھو ہکسلے کا مضمون فزیکل بیس آف لائف)

ان تمام باتوں پر بھی ایک کھٹک دل سے نہیں نکلتی۔ یہ مانا کہ زندگی کے عناصر ترکیبی اسی طرح معلوم ہوگئے ہیں جس طرح کہ پانی اور ہوا کے، اور یہ بھی قبول ہے، کہ ان عناصر سے زندگی ایسے ہی خلق کی جا سکتی ہے، جیسے عناصر مائی کی ترکیب سے پانی، لیکن پھر بھی کسی طرح یہ بات عقل میں نہیں سماتی، کہ قطعاً بے جان اور بے حس عناصر یا ذراتِ مادی کے اجتماع سے حیات و احساسات کی بالکل متضاد صفتیں کیسے پیدا ہو جاتی ہیں؛ ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ کیا یہ ایسا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی یہ کہے، کہ دو اور دو مل کر پانچ بنجاتے ہیں؟ ہمکو بلا ذرہ بھر اختلاف کے تسلیم ہے، کہ یہ کھٹک بالکل بجا ہے، اور مادیت کا کوئی دعویدار اس گرہ کو نہیں کھول سکتا ہے۔ یہاں حکمت و فلسفہ سب کا جواب **لا ادری** ہے۔ مگر یہ وہ معمہ ہے، جسکی تخصیص خالی حیات و احساسات کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ عضوی اور غیر عضوی ساری مخلوقات کے صفات و خواص اور سلسلۂ علت و معلول کا ہر ذرہ **مابعد الطبیعات** کے اسی لاینحل عقدہ سے بندھا ہے۔

آکسیجن اور ہائڈروجن دو گیسی مادے یا ہوائیں ہیں؛ اب تم بتلاؤ کہ ان دو ہواؤں کے ملنے سے پانی کیسے بنجاتا ہے، جسکے افعال و خواص اپنے اجزائے ترکیبی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کیا قیاس یہ نہیں چاہتا کہ دو ہوائیں ملکر تیسری ہوا ہی بنا چاہیے؟ فرض کرو آکسیجن اور ہائڈروجن کے ملنے سے پارہ بنتا ہوتا، تو کیا پھر تم کسی مخصوص علاقہ یا مناسبت کی بنا پر یہ دعوے کر سکتے تھے کہ نہیں انکی ترکیب سے تو پانی ہی بنا چاہیے؟ کہربا کو تاریکی میں اون پر رگڑنے سے بجلی پیدا ہوتی ہے، چقماق اور فولاد کے تصادم یا رگڑ سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں، اب مابعد الطبیعات کے نقطۂ نظر سے دیکھو کہ بجلی اور چنگاریوں کو دو جسموں کی رگڑ سے کیا مناسبت ہے؟ بجز اسکے کہ ہم ہمیشہ ایسا ہوتے

دیکھتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں، کہ ایک دوسرے کا خاصہ یا معلول ہے۔ مادیت کا بھی اس سے زیادہ کچھ اور مطالبہ نہیں ہے، کہ جس طرح پانی کے اجزائے ترکیبی کا خاصہ سیلان ہے، اور کہربا اور اُون کی رگڑ کا معلول بجلی ہے، اسی طرح پانی، نوشادر اور کاربونک ایسڈ کی ترکیب کا خاصہ و معلول حیات و احساس ہے۔

باقی اگر تمہاری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کیسر بیجان مادہ کی ترکیب سے کیسے حس و حیات پیدا ہوسکتی ہے تو اپنے سمجھانے کے لیے تمام ذرات مادی (سالمات) کو زندہ اور ذی احساس مان لو جیسا کہ بعض حکما اور فلاسفہ کہتے بھی ہیں۔ یا اگر کسی کے مذہبی جذبہ کی تسکین اسی سے ہوتی ہے، کہ جس وقت پانی، نوشادر اور کاربونک ایسڈ باہم ملتے ہیں عین اُسی وقت ایک فوق الفطرت ہستی (خدا) ان اجسام ثلثہ کے مجموعہ کے اندر ایک غیر جسمی مبدء حس و حیات اُسی طرح داخل کردیتی ہے، جیسے پنجرے میں چڑیا، تو خیر وہ یہی مانے "خواب نادیدہ" کی تعبیر تو یہ ہی ہے، جسکے جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ جو کچھ ذہنی افعال و خواص کے لیے قبول کروگے وہی تم کو غیر ذہنی افعال و حوادث کے لیے بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر عناصر مرکبات کے اجتماع کے وقت، زندگی اور احساس خدا اپنی طرف سے ڈال دیتا ہے، تو اجزائے مائی کی یکجائی کے وقت سیلان، اور کہربا کی رگڑ کے وقت بجلی بھی خدا اپنی طرف سے خلق کردیتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ کائنات کے کسی ذرہ میں جب کوئی تغیر ہوتا یا کوئی معلول و خاصہ ظاہر ہوتا ہے، تو خدا کا ہاتھ پردہ کے پیچھے سے کارفرما ہوتا ہے متکلمین کا ایک بڑا گروہ (اشاعرہ) اور بعض فلاسفہ اسی کے قائل ہیں۔ مادیین کا مدعا بڑی حد تک اس میں بھی حاصل ہے، اسلیے کہ اُنکے دعاوی کا نچوڑ یہی ہے، کہ عقل و حیات کے حوادث (Phenomenon) کو کائنات کے غیر عضوی حوادث سے الگ اور مافوق نہ قرار دیا جائے جو ایک کے لیے مانا جاتا ہے، وہی دوسرے کے لیے بھی مانا جائے۔

چونکہ یہ آخر الذکر صورت اہل مذاہب کے میلان اور اس اعتقاد عام کے عین مطابق ہے کہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ، اسلیے وہ لوگ تو اسکو نہایت ترحیب و مسرت کے ساتھ قبول کرلینگے لیکن ایک سوچنے والا ذہن جب اس الگ سے داخل ہونے والی روح پر غور کرتا ہے، تو عجیب عجیب پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے:۔ روح کے اول المتعلقات میں یہ ہے، کہ وہ ایک

غیرمادی جوہر ہے، اور مادہ کی ماہیت کا غیرمنفک جزو امتداد ہے، اسلیے روح لازماً ایک غیرممتد ہستی ٹھیرتی ہے، جس میں نہ کوئی لمبائی ہے نہ چوڑائی نہ دبازت۔ اب قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کوئی غیرممتد جوہر کسی جگہ یا مکان (space) میں کیونکر موجود ہو سکتا ہے؟ کسی شے کے کسی جگہ موجود ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُسکو شاغل یا گھیرے ہوئے ہے۔ اور یہی امتداد کی حقیقت ہے۔ لہذا اگر کسی غیرممتد روح کا وجود ہو بھی تو وہ محل و مکان یا بدن میں ہوکر نہیں پائی جاسکتی کہ یہ بین تناقض ہے۔

اب تم خود ذرا سوچ کر انصاف سے کہو، کہ ایک بے طول، عرض و عمق اور فوق الزمان والمکان ذات کا وجود (جو اپنی تعریف کے لحاظ سے عدم کے برابر ہے) اور پھر اُس کا جسم و مکان سے متعلق ہونے کے بعد بھی غیرممتد سمجھنا زیادہ ناقابل تصور اور مستبعد ہے، یا حس و حیات کو حرکت، حرارت، روشنی اور مقناطیس وغیرہ کی طرح ذرات یا عناصر مادی کی ترکیب کا خاصہ اور معلول مان لینا؟ قائلین روحیت کو یہ تو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ممتد شے (مادہ) سوچتی اور ادراک کرتی ہے لیکن کسی نامعلوم غیرممتد شے کی نسبت یہی دعویٰ کیا اور بھی عجیب تر نہیں ہے؟ ع این سخن را چہ جواب ست تو خود میدانی! اتنا ہی نہیں بلکہ روح کو قائم بالذات بسیط اور بدن سے قابل الانفکاک تسلیم کرنے میں اور بھی طرح طرح کے دوسے پیدا ہوتے ہیں، جنکا کوئی اطمینان بخش حل نہیں سوجھتا:۔ اگر روح مستقل بالذات جوہر ہے، تو جسم کے ساتھ اُسکی وابستگی کا محرک اور داعی کیا ہے؟ اگر وہ مطلقاً بسیط ہے، تو جسم کے نشو و نما اور انحطاط سے اس میں کمی بیشی اور تغیر کیوں واقع ہوتا ہے؟ کیا یہ بساطت کے صریحاً منافی نہیں؟ ماحصل یہ ہے کہ اگر روح کے فرض سے ایک گتھی سلجھتی تو بیسیوں اور پڑجاتی ہیں۔

گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

اِن چند صفحات سے امید ہے کہ **مادیت** کا مفہوم و مدعا اور اُسکے دلائل کی نوعیت اچھی طرح ذہن نشین ہوگئی ہوگی۔ آخر میں اب ہم بس ایک مختصر یکجائی اعادہ پر قناعت کرتے ہیں:۔

مادہ اور **قوت** (انرجی) دو چیزیں قدیم اور غیرفانی ہیں، ایک کا دوسرے سے انفکاک ناممکن ہے، نہ مادہ بے قوت کے پایا جاسکتا ہے، نہ قوت بے مادہ کے۔ جس طرح مادہ کبھی مطلقاً نیست نہیں ہوتا بلکہ صرف صورت بدلتی رہتی ہے، اُسی طرح قوت بھی کبھی معدوم محض نہیں ہوتی۔ بلکہ پنہاں یا آشکارا کسی نہ کسی حال میں موجود رہتی ہے۔ حرکت، حرارت، مقناطیس وغیرہ کی مختلف قوتیں

ایک دوسرے میں منقلب ہوتی رہتی ہیں۔ لوہے یا پتھر کے دو ٹکڑے باہم تھوڑی دیر تک رگڑو۔ اور پھر انکو چھوؤ تو گرمی محسوس ہوگی، تم سمجھتے ہو کہ رگڑ کی حرکت فنا ہوگئی، نہیں، بلکہ وہ ایک دوسری قوت، یعنی حرارت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ریل کے انجن میں جو کوئلہ جلتا ہے، جب وہ بجھ جاتا ہے، تو تم خیال کرتے ہوگے کہ اسکی پیدا کی ہوئی آگ یا گرمی فنا ہوگئی۔ یہ نہیں ہوا، بلکہ وہی گرمی ہے، جو اسٹیم وغیرہ کے مدارج طے کرنے کے بعد ریل کی حرکت بنجاتی ہے، اور تمکو گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے۔ اجرام سماوی سے لیکر سمندر کی تہ تک جو کچھ ہے یا ہوتا ہے، سب اسی ازلی اور عدیم الفنا مادہ اور قوت کی نیرنگیوں کا تماشا ہے۔ ارضی اور سماوی، عضوی اور غیر عضوی ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ اور تمام حوادث بلا استثنا مادہ ہی کے ناقابل تقسیم ذرات مع قوت کے باہمی اجتماع اور تعامل یا فعل و انفعال کے معلول ہیں۔ حیات، حس و حرکت اور فکر و شعور تک جنکا منشا لوگ ایک غیر مادی روح کو جانتے ہیں، اسی طرح مادہ کی قوت کے مختلف مظاہر ہیں، جس طرح حرکت، حرارت، بجلی، مقناطیس، روشنی وغیرہ۔ جو قوت پتھر کو زمین پر گراتی ہے، سمندر کی موجوں کو چاند کی طرف کھینچتی ہے، سیارات کو چکر میں اور ثوابت کو ساکن رکھتی ہے، وہی پیدا ہو تو لازم ہیں حیات، خون میں گردش، جگر میں مولد صفرا، زبان میں ذائقہ شناسی، دل میں حرکت، اور دماغ کے بھوسے مادہ میں فکر و شعور ہے۔ یہ ہے مادیت کی حقیقت اور اسکا بے حجاب ادعا۔

آخر میں ہمکو صرف اتنا اور کہنا ہے، کہ اس طائفہ گرامی سے تو روئے سخن نہیں جسکا مشغلہ وحید تکفیر و تفسیق ہے، لیکن سنجیدہ پڑھنے والوں سے التجا ہے، کہ مقالہ نگار کو مادہ پرست یا لامذہب سمجھنے میں جلدبازی سے کام نہ لینگے، اور کم ازکم ماہیت مادہ کے مضمون کا انتظار کرینگے۔ شروع میں بھی کہدیا گیا ہے، کہ یہ فلسفہ کے ایک مذہب کی فقط وکالت و مخبری ہے

عبدالباری

پروفیسر عبدالباری نے ندوہ میں تکمیل کرکے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ اور چند ہی سال میں یورپ کے فلسفہ جدید سے جو تمتع حاصل کیا اسکا اندازہ اس مضمون سے ہو سکتا ہے۔ آپ کی ایک فلسفیانہ تالیف بھی عنقریب شایع ہونے والی ہے جس سے ناظرین الناظر کا جلد تعارف کرایا جائیگا۔ الناظر کی خوش قسمتی ہے کہ باوجود مصروفیت پروفیسر صاحب نے اسکے لیے مضمون لکھنے کی تکلیف اٹھائی۔

میر ببر علی انیس

(سلسلۂ ماہ گذشتہ)

اب ناظرین بزم کی جانب سے عنان توجہ کو پھیر کر انیس کی رزم ملاحظہ کریں۔ تمام لوگ یکزباں ہیں کہ فردوسی رزم کا بادشاہ ہے۔ اُسکے شاہنامہ کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں۔ بزم میں تو فردوسی کو کوئی مانتا نہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ رزم بھی انیس سے گھٹ کر لکھتا ہے۔ جب انیس رزم کا نقشہ کھینچتے ہیں تو معرکہ کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ تمام جزئیات کو بیان کر دیتے ہیں۔ جنگ کا تلاطم۔ حملہ کا زور شور۔ حریفوں کا مقابلہ۔ ہر ایک کے ہنر جنگ۔ اسلحۂ حرب کی تفصیل۔ ایک کا دوسرے پر حملہ۔ دوسرے کی مدافعت اور پھر حملہ۔ فوجوں کی ابتری۔ لشکر کی بھگدڑ۔ سپہ سالار کا اضطراب۔ الحاصل کوئی نکتہ انیس سے بچا نہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:—

(۱) مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر بجلی گری شقی کے سرپُر عتاب پر

پہلے مصرعہ میں پوری تصویر کھینچی ہے۔ جس وقت پورا ہاتھ لگایا جائے گا، سوار آگے بڑھے گا اور دونوں پاؤں رکاب میں استوار ہو جائیں گے۔ زین سے سوار اُٹھ جائیگا اور رکاب پر قریب قریب کھڑا ہو جائیگا۔ پھر کس پھرتی سے ہاتھ لگا ہے کہ معلوم ہوا تلوار نہیں گری بجلی گری۔ تلوار کی چمک تو دھوپ میں دکھائی دی لیکن تلوار پھرتی سے چلنے کی وجہ سے نہ دکھائی دی۔

(۲) نیزے کی لڑائی ملاحظہ ہو:—

"کس طنطنے سے شاہ پہ آیا وہ خود پسند کل کی طرح سے پھرنے لگے ہر طرف سمند
"نیزے کی اُس لعیں سے لڑائی جو آپڑی دونوں طرف سے جنگ میں کوشش ہوئی بڑی
انیوں سے اُڑ رہے تھے شرارے گھڑی گھڑی تھی چوب سے تو چوب سناں سے سناں لڑی"

آمد ملاحظہ ہو۔ حملہ شروع ہوا۔ گھوڑے ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وار کی ردو بدل ہو رہی ہے۔ چوب کا چوب سے لڑنا اور سناں کا سناں سے، یہ لڑائی کے جزئیات ہیں۔ انیوں سے شرر اُڑنا بتلاتا ہے کہ کس زور سے نیزے سے نیزہ ٹکراتا ہے اور "گھڑی گھڑی" سے معلوم ہوا کہ حملے

پیہم ہو رہے ہیں۔ پھر ترقی ملاحظہ ہو۔

"اک معرکہ تھا بیچ میں دشتِ قتال کے — دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے"
پیہم ہوئیں تھاں تھاں پہ کانیں جو کج گر — ظالم کبھی ادھر تھا تو حضرت کبھی اُدھر
کس نوک جھوک سے وہیں نیزہ کو پھیر کر — فرزندِ شیرِ حق نے دکھایا عجب ہنر
ظالم پہ آسمان سے بلا ناگہاں گری — دو نیم نیزہ اُڑ کے زمیں پہ سناں گری"

وار سخت اور برابر ہو رہے ہیں اسلیے دونوں حریف ہر طرف پھرتے ہیں۔ مگر امام نے آخرکار اس تیزی سے نیزے کو پھیرا کہ اُسے خبر بھی نہ ہوئی اور سناں گر پڑی۔ اب میر صاحب فرماتے ہیں:۔

"بجلی سا نکل چلا تھا کر چمک کے راہوار — نیزے کا اک کمر پہ کیا شاہِ دیں نے وار
موذی تھا وہ لعیں پہ انی فتنہ کوب تھی — سر میں سناں تھی پشت کے مُہرو میں چوب تھی۔
زیں سے اُٹھا کے اُسکو سناں پر کیا بلند — ٹپکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند"

ناظرین انصاف کریں کہ کوئی امر باقی رہ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ بہت بڑے نیزہ باز تھے۔

(۳) کمان کی لڑائی ملاحظہ ہو اور انیسؔ کے علم تیر اندازی کا لطف دیکھنا چاہیے کہ کس طرح تمام جزئیات بیان کرتے ہیں:۔

"یاں دوش سے کماں کو اُتارا جنابؑ نے — قبضہ میں ماہِ نو کو لیا آفتاب نے
تاکا خطا کو تیر نگہ سے صواب نے
ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا — نکلا عقاب تیر تو پر تولنے لگا
چلہ میں رکھکے تیر بڑھے قبلۂ امم — اک ہاتھ راست کرکے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہکے گوشِ شہ میں چلا تیر تیز دم — آواز دی کماں نے زہے شاہِ با کرم
چلہ تو شست شاہِ زمن سے نکل گیا — واں تیر دل کو توڑ کے تن سے نکل گیا"

کمان کا کاندھے سے اُتارنا اور ایک ہاتھ میں لینا۔ کمان کا ماہِ نو کی طرح ہاتھ میں ہونا۔ ترکش سے تیر کا نکالنا اور تیر کا نکلنا تو پر تولنا۔ امام کا حریف کو تیز نگاہوں سے تاکنا۔ پھر چلہ میں تیر کو جوڑ کر آگے بڑھنا اور نشانہ باندھنا۔ جس ہاتھ میں کمان تھی اُسکا سیدھا کرنا اور شانے کے برابر مقابل میں رکھنا۔ چلہ کو دوسرے ہاتھ سے کھینچنا۔ ہاتھ کا اس حالت میں خم ہونا۔ شست کا کمان سے مل جانا۔

کمان کا زور سے کھینچنے کی وجہ سے آواز دینا۔ پھر چلہ کا شست سے نکلنا اور تیر کا نشانہ سے پار نکلجانا وغیرہ وغیرہ تمام جزئیات کس خوبی سے بیان ہوئے ہیں، کوئی نکتہ نہیں چھوٹا۔ کیا کوئی قدر انداز انیس سے بہتر بیان کر سکتا ہے۔

انیس کی شاعری کے مہاتم موضوع میں تلوار اور گھوڑا بھی شامل ہیں۔ جس طرح انیس نے ان دونوں کی تعریف کی کہیں ایسی تعریف نہیں ملتی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

تلوار:- "اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے"۔ بے مثال بیت ہے، تعریف نہیں ہو سکتی۔ شریفوں کا زیور ہے۔ پُرانے زمانے میں لوگ بڑے سپاہی ہوتے تھے مگر سپہگری صرف شرفا میں محدود رہتی تھی اور اُنکے لیے یہ فن قریب قریب لازمی تھا۔ رؤسا کو شان و شوکت دکھلانے کو تلوار درکار ہے تاکہ سپاہی باندکر ہمراہ جائیں یا ڈیوڑھی کی حفاظت کریں۔ بادشاہ کی عزت و آبرو کا تلوار ہی پر دارومدار ہے۔ اور بادشاہ کو آبرو جان سے پیاری ہوتی ہے، اس لیے اُسکی آبرو ہے۔ سپاہی کی جان تلوار دو طرح ہوئی۔ ایک تو رزق کا ذریعہ، دوسرے حفاظت کا آلہ۔

"تلوار کا سراپا ملاحظہ ہو۔

"قد کتنا خوشنما ہے بدن کسقدر ہے گول"۔ "پشتہ وہ اُسکا اور وہ باریکی خمیر × کس بل میں بے مثال صالت میں بے نظیر"

"گیتی نورد بادیہ پیما، فلک مسیر جنگ آزما خراج ستانندہ ملک گیر"

"کثرتِ جوہرِ ذاتی سے وہ گوجال میں تھی بر تڑپ صورتِ ماہی وہی ہر حال میں تھی"

گھوڑا:- "نازک مزاج و خوش قد و طناز و سر بلند وہ پیش و پس وہ سُم وہ کنوتی وہ جوڑ بند

کوتاہ و گرد و صاف کنوتی کمر کفل کیا خوشنما کتاوگی سینہ و بغل

وہ تھوتھنی وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال گویا کھُلے تھے حورکے گیسو پری کے بال

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے

سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے"

یہ سب سچی اور اصلی تعریف ہے۔ چہرہ مہرہ، چال ڈھال سب کا نقشہ کھینچدیا ہے۔ اب ذرا مبالغہ ملاحظہ ہو گھوڑے کی سرعت دیکھیے۔

"سرعت کا ذکر گر کوئی لائے زبان پر ساکن جو حرف ہو وہ نہ آوے زبان پر"

تشبیہ و استعارات:- انیس کا کلام نادر اور اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں سے بھرا ہے۔ بڑی

خوبی یہ ہے کہ مفید مطلب تشبیہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حضرت حبیب ابن مظاہر طالبِ اذن جہاد ہیں۔ امامؑ بخیال پیرانہ سالی تامل فرماتے ہیں اور نجف جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ حبیب اپنی ارادتِ دیرینہ کا حوالہ دیکر کہتے ہیں کہ میری پیرانہ سالی کا خیال نہ فرمائیے۔۔۔۔۔۔

"کچھ ضعف نہیں آپکے قدموں کی قسم ہے سر بار ہے تن پر کہ اسواسطے خم ہے"

یعنی یہ نہ تصور فرمائیے کہ سر بوجہ پیرانہ سالی اور ضعف کے ہلتا ہے، بلکہ میرا سر آپ کی امانت ہے جسے آپ کے قدموں پر نثار ہونا چاہیے اور اسی خوف سے ہلتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو امانت میں خیانت ہو اور روز قیامت رسول صلعم سے محجوب ہوں۔ اب میں اس بارگراں کا متحمل نہیں۔ اسے قبول کرکے مجھے سبکدوش کیجیے تو میری کمر خمیدہ ابھی سیدھی ہو جائے۔

"آنکھیں جنابِ فاطمہ کی نوردیدہ" ایک معمولی بات ہے مگر ہر ایک کی نظر نہیں پہونچتی۔ ہر ایک بیٹا اپنی ماں کا نوردیدہ ہے لہذا اُسکی آنکھیں بدرجۂ اولیٰ ماں کی نوردیدہ ہوئیں۔ مگر بلاغت ملاحظہ ہو، ماں نہیں کہا بلکہ نام لے دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو آنکھیں جنابِ فاطمہ بنتِ رسولؐ کی نوردیدہ ہوں اُنکی عزت اور عظمت کا کیا کہنا۔ کیا اُن آنکھوں سے بہتر اہل اسلام کے نزدیک کوئی آنکھ ہوسکتی ہے جو بنتِ احمدؐ کی نوردیدہ ہوں۔ پھر لطف یہ کہ بالکل سچی اور بلا مبالغہ و تصنع تعریف کی ہے جس سے اثر بڑھ گیا۔

"آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں مرجھا کے رہ گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں"

"کس طرح شہنشاہ سے وہ فوج جدا ہو مشکل ہے کہ دریا سے کہیں موج جدا ہو"

"یوں آ گیا سنانوں میں وہ آسماں جناب ہو جس طرح خطوطِ شعاعی میں آفتاب"

سنانوں میں آنا مغلوب ہونے کی علامت ہے مگر تشبیہ نے صورت بدل دی۔

"ناخن جو مہ نو سے تھے بالائے انامل سو قید میں بڑھ بڑھ کے ہوئے وہ مہ کامل"

ناخن کا بڑھنا قبیح ہے مگر تشبیہ نے قبح کو حسن سے بدل دیا۔

"کیا ذکر خود کا سر و گردن کا کیا حساب گویا تھا اک قرابۂ معکوس پُر شراب"

دشمن کا سراپا ہے۔ "پُر شراب" کے معنوں پر غور کیا جائے۔ عجیب لطافت ہے۔ حضرت حُرؑ کے لیے فرماتے ہیں

"صورتِ برگ خزاں دیدہ گنہ دور ہوے"

جب حضرت علی اکبر شہید ہو گئے تو حضرت زینب بیتاب ہو نکل پڑیں اُس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

"نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہؓ جلال   گویا جنابِ سیدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح پہ رخ کی ضیا اس جناب کے   جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب سے"

'فاطمہ جلال' کا استعارہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ حضرتِ زینب کی عظمت بنتِ رسولؐ سے مشابہت دیکر ثابت کی ہے۔ دوسرے شعر میں تشبیہ میں یہ کنایہ ہے کہ جیسے کوئی آفتاب پر نگاہ نہیں ڈال سکتا اسی طرح روے منور حضرت زینب پر نامحرموں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی ہے۔ بلاغت تو دیکھیے نام نہیں لیا مگر فاطمہ جلال کے استعارے نے بتلا دیا کہ کون معظمہ ہیں۔

صنائع اور بدایع فی زمانہ انگریزی تعلیم کے اثر سے معرضِ اعتراض میں آ گئے ہیں۔ مولوی شبلی سرے سے صنائع و بدائع کی خوبیوں سے انکار کرتے ہیں۔ مگر اگر بے ساختہ آ جائیں تو مولوی صاحب کو اعتراض نہیں۔ بہر حال صنائع کلامِ ربانی میں موجود ہیں اور اُنکی خوبیوں سے یکسر انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر ہاں صنائع بلا تکلف اور بیساختہ آنے چاہییں تاکہ اثرِ کلام نہ ضائع ہو۔ انیس نے جتنے صنائع برتے ہیں وہ سب بلا تکلف آئے ہیں۔ اول تو وہ ایسی صنعت کو برتتے نہیں جس سے محض صنعت گری اور استادی مقصود ہو۔ بقول حافظ شیراز

آنرا کہ خوانی اُستاد گر بنگری بتحقیق   صنعت گرست اما طبعِ رواں ندارد

لیکن جہاں کہیں کوئی ایسی صنعت جو فضول ہوتی ہے ایسی خوبی سے کہ پتہ نہیں چلتا اور یہ انتہا قادر الکلامی ہے۔

اکثر لوگ صنعت مہملہ کو مہمل تصور کرتے ہیں۔ میر انیس نے دو چار بند اس صنعت میں لکھے ہیں۔ ناظرین غور کریں اور دیکھیں کہیں سے کلام میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے۔ روانی۔ سلاست۔ چستی۔ بندش سب خوبی کے ساتھ موجود ہیں۔ کیا اس سے بڑھکر قادر الکلامی ہو سکتی ہے۔

"وہ طاہر د اطہر ہو اگر معرکہ آرا   حملہ اسد اللہ کا معلوم ہو سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا   صمصام کا اک وار ہوا اُسکو گوارا"

مولوی شبلی کا یہ عذر کہ انیس نے جو مبتذل صنائع برتے ہیں وہ محض سوسائٹی کے مذاق کی وجہ سے اور اُسکے دباؤ سے۔ کیونکہ ماتحتاج کا دارومدار اسی کی قدردانی پر تھا۔ بالکل عذر لنگ معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب اس تہ تک نہیں پہونچے۔ اگر آج تک کوئی شاعر سوسائٹی کی حکومت سے آزاد

رہا ہے اور سوسائٹی کے مذاق سے خود نہیں ہٹا بلکہ سوسائٹی کو اپنے مذاق پر کھینچ لایا ہے تو یہ شرف اردو کے شعرا میں انیس ہی کو حاصل ہے۔ اور یہی دلیل اُنکے شاعر وہبی ہونے کی ہے۔ میر انیس بہرحال بشر تھے، اور کسی بشر کا کلام فروگذاشتوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔ مگر جو معمولی فروگذاشتیں مولوی صاحب میر انیس سے منسوب کرتے ہیں وہ اُنکی قابلیت سے بعید ہیں۔ جہاں کہیں کوئی بدل صنعت آگئی ہے اُسکی تہ میں کوئی نہ کوئی باریکی نہاں ہے۔ میر انیس کا مصرعہ ہے " کہیں کو ترکے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے" اسپر مولوی صاحب نے ایراد صادر کیا ہے کہ یہ سوقی اور عامیانہ زبان ہے اور مبتذل صنعت برتی ہے۔ یہ مصرعہ عمرو سعد کی زبانی انیس نے نظم کیا ہے۔ حضرت حُر آمادہ ہیں کہ اُدھر سے ٹوٹ کر سبطِ رسول سے آملیں۔ اُن سے اور عمرو سعد سے گفتگو ہوئی ہے۔ اُسی سلسلہ کا مصرعہ متذکرہ ہے۔ میر انیس کی بڑی صنعت کیرکٹر نگاری اور فرق مراتب ہے۔ مولوی شبلی کے نزدیک عمرو سعد معزز ہوگا مگر ہمارا ہیرو تو اُسے ایک کمینہ اور جاہل شخص تصور کرتا ہے۔ اور اسی ہیئت میں اُسکا خاکہ اُتارا ہے۔ پھر اُسکی زبان سے یہ مصرعہ میر انیس کی قابلیت کا ثبوت ہے نہ کہ غلطی کا۔

عمر سعد حُر سے کہتا ہے . . . . . .

"تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسہ نے کہ تاج جنھیں سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کیا کسی حور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال مل گیا سایۂ طوبےٰ کہ جو ایسا ہے نہال"

اب حُر کا جواب ملاحظہ ہو۔ اور دونوں کی تقریر سے عمرو سعد کا کیرکٹر اخذ کیا جاوے۔

"اہلِ دنیوں سے ہے محبت تجھے او سفلہ مزاج خاکِ پا اُسکا ہوں میں جو ہے سرِ عرش کا تاج
جنکو کا ندھے پہ محمدؐ کے ملی ہے معراج میرا آقا سا سخی کون ہے کونین میں آج
کیوں ترے سامنے کروں کہ نہیں بخشا ہے ہاں سبھے شاہ نے فردوس بریں بخشا ہے"

اب ملاحظہ ہو کہ میر انیس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ عمرو سعد کو سفلہ اور جاہل اُسکی تقریر سے ثابت کیا بلکہ حضرت حُر کی زبانی کہلوا کر اور بھی اُسکا کیرکٹر واضح کردیا۔ انیس اسی خصوصیت کے بدولت ہم رتبۂ شکسپیر ہیں۔ کیرکٹر نگاری کے لحاظ سے شیکسپیر کے مشہور ڈراما 'ہیملٹ' میں 'آسرک' مصاحب اور قبر کنوں کی تقریر اور 'میکبتھ' میں 'پورٹر' کی تقریر۔ اور مرچنٹ آف وینس' میں' لانسلاٹ' کی تقریر ملاحظہ ہو۔ اور پھر عمرو سعد کی پوری تقریر دیکھی جائے تو انیس کے جوہر کھلیں۔

اب ناظرین عنان توجہ میر انیس کی واقعہ نگاری کی جانب پھیریں اور ملاحظہ کریں کہ انیس نے میدان واقعہ نگاری کو کتنا وسیع کر دیا ہے۔ اُردو پر یہ بڑا الزام ہے کہ اُس میں واقعہ نگاری مفقود ہے۔ اور اُس میں کوئی واقعہ لکھنا چاہیں تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ مگر اسکا ذمہ دار کون ہے۔ اول تو وہ شعرا جو منتہائے خیال زلف و کاکل کو سمجھے ہیں اور اپنا وقتِ عزیز و بیش بہا جوہر مدح و قدح میں صرف کیا۔ مگر وہ افرادِ قوم جو سخن فہم اور نکتہ شناس ہیں ان شعرا سے بھی زیادہ ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی قدردانی کا مستحق اصلی امانت لکھنوی اور داغ دہلوی کو تصور فرماتے ہیں اور مناظر قدرت کا سماں دکھانے والے اور ہر قسم کے واقعات نظم کرنے والے شعرا سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ میر انیس کا کلام ملاحظہ کیا جاوے تو ہزاروں قسم کی واقعہ نگاری سے بھرا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہر ایک واقعہ مختلف اور متعدد صورتوں میں جو پیش آسکتی ہیں کچھ نظم کرنے سے انیس نے چھوڑا نہیں۔ مگر باوجود اسکے اُردو کی بے بضاعتی کے شاکی انیس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اس خداے سخن کو خراج تحسین اور باج آفریں نہیں دیتے۔ گو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ملک میں شہرت پا اُسکا قبضہ بڑھتا جاتا ہے۔ مگر اسے اُسکے کلام کا اعجاز کہنا چاہیے ورنہ سخن فہم حضرات نے جو فی زمانہ افتخار قوم ہیں انیس کو پبلک سے متعارف کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس باب میں مولوی شبلی قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں اور اُنکا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اُنکی لاجواب تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" نے ایک بڑی حد تک لوگوں میں انیس کے کلام سے دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ موازنہ میں پھول کے ساتھ کانٹے بھی کثرت سے ہیں مگر موازنہ کی خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بقول مولوی حالی مرحوم۔

"مو رسکے پایہ بہ پا کر سکے　نظر　کر حسن و جمال کا نہ اُسکے　انکار"

افسوس گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے واقعہ نگاری کی مثالیں زیادہ نہیں پیش کی جا سکتی ہیں صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ مگر رزمیہ شاعری واقعہ نگاری کا ایک جزو ہے اور اُسکی مثالیں پہلے پیش ہو چکی ہیں اس سلسلہ میں اُنپر بھی نگاہ ڈالی جائے اور بلاغت و جذبات کے سلسلہ میں جو مثالیں پیش کی گئیں وہ بھی واقعہ نگاری کے تحت میں ہیں۔ اُنھیں بھی ملاحظہ کیا جاوے۔

(۱) سواری کی حالت ملاحظہ ہو:۔

"تو دامن قبا نے لیا بوسۂ کمر + لو ہٹ کے ہاتھ آپنے رکھا ایال پر + لو آفتاب خانۂ زیں میں ہے جلوہ گر"

دیکھیے ایک ایک جزئی بات کو کس طرح ادا کیا ہے۔ پہلے دامنوں کو گردان کر کمر سے لپٹنا، پھر ایک ہاتھ ہٹ کر ایال پر رکھنا، پھر سوار ہوتا۔

(۲) لگا وغا میں ٹپکنے لہو جو قبضہ سے ۔۔۔ چڑھا لیا شہ والا نے آستینوں کو"

(۳) عباس علیہ السلام زین فرش سے فرشِ زمین پہ آتے ہیں۔ خیمۂ حسینؑ کی حالت ملاحظہ ہو۔

"انکا تو یاں ہے کوچ سنو دو انکی اب خبر ۔۔۔ ڈیوڑھی کے پاس بیٹھے ہیں حضرت برہنہ سر
لپٹا ہوا ہے چھاتی سے عباسؑ کا پسر ۔۔۔ روتی ہے سر جھکائے سکینہ قریبِ در
زینب کھڑی ہیں ڈیوڑھی پہ اور دلپہ ہاتھ ہے ۔۔۔ گھبرائے بال زوجۂ عباس ساتھ ہے"

(۴) حسینؑ کربلا پہونچ گئے ہیں۔ خیمۂ اہلبیتؑ اطہار نصب ہو گیا ہے۔ مخدراتِ عصمت محلوں سے اتر کر خیموں میں تشریف لے جاتی ہیں۔

"فراش جو باہر گئے فرش اُس میں بچھا کر ۔۔۔ کس شان سے داخل ہوئے ناموسِ پیمبرؐ
ہودج سے اترنے لگیں جب دخترِ حیدرؑ ۔۔۔ پردے کو سنبھالے ہوئے تھے قاسمؑ و اکبرؑ
رایت لیے عباسِ فلک جاہ کھڑے تھے ۔۔۔ خود اپنی عبا روکے ہوئے شاہ کھڑے تھے
محمل سے اُتر آئیں جو نیہوڑائے ہوئے سر ۔۔۔ نعلین رکھی زوجۂ عباس نے بڑھکر
اک ہاتھ کو تھامے ہوئے تھی بانوئے سرور ۔۔۔ سجاد اُٹھائے تھے لٹکتی ہوئی چادر
اک دخترِ شبیر اِدھر ایک اُدھر تھی ۔۔۔ سر لیوہ میں کھل جائیگا اسکی نہ خبر تھی"

اب ناظرین میر انیس کے کلام کی تدریجی ترقی ملاحظہ فرمائیں۔ میر انیس کا مطبوعہ کلام چھ جلدوں میں ہے اور تقریباً ڈیڑھ سو مرثیے اور بکثرت سلام و رباعیاں ہیں۔ زمانۂ ابتدائی کے کلام سے مثال ذیل ملاحظہ ہو اور غور کیا جائے کہ انیس کی خصوصیات سب نمایاں ہیں یا نہیں۔

"عالم میں مرتضیٰؑ کی ولادت کی دھوم ہے ۔۔۔ کعبہ کے گرد قدسیوں کا اک ہجوم ہے
غل تہنیت کا شام سے لے تا بہ روم ہے ۔۔۔ کس دبدبہ سے آمدِ بابِ علوم ہے
ارکانِ کعبہ راست ہیں تعظیم کے لیے ۔۔۔ محراب خم ہے شاہ کی تسلیم کے لیے"

میر انیس کی جملہ خصوصیات روانی۔ سلاست۔ برجستگی۔ چستی بندش سب موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں رنگ ہلکا ہے۔ کثرتِ مشق کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا گیا ہے۔

اقتباسات ذیل اُس مرثیہ سے ہیں جسکا مطلع ہے ۔ " جب قطع کی مسافتِ شبِ آفتاب نے " ۔ یہ مرثیہ غالباً آخری عمر کا تصنیف ہے ۔ کیونکہ مقطع میں میر صاحب فرماتے ہیں " پیری کے دلولے ہیں خزاں کی بہار ہے " اس مرثیہ میں تسلسل بھی ملاحظہ ہو اور واقعہ نگاری بھی ۔ " ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں " ناظرین انصاف فرمائیں کہ صبح کی آمد کی تصویر ایک مصرعہ میں اس سے بہتر نہیں کھینچی جا سکتی ۔ جب سپیدۂ سحر کا طلوع ہوتا ہے تو آسمان پر ایک خطِ روشن کھنچ جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس بڑے تڑکے اُٹھکر مناظر قدرت کا نظارہ فرمایا کرتے تھے ۔ امام علیہ السلام جانماز پر تشریف لائے ۔ انصار نے سجادے لاکر عقب شاہ بچھا دیے ۔ اب کیا ہوتا ہے ؟ " صوتِ حسن سے اکبرِ مہ رو نے دی اذاں ؛ ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ؛ گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آگئی " ۔ حضرت علی اکبرؑ ہمشکل پیغمبر تھے ، اسلیے اُنکی آواز کا آوازِ رسولؐ ہونا مبالغہ نہیں ہے ۔ مگر پھر بھی آخر مصرعہ میں لفظ "گویا" نے اثر دوبالا کر دیا ہے ۔ ہر ایک کی چشم ڈبڈبانا مزید ثبوتِ مشابہتِ آواز ہے ۔ اس سے ثبوت ہوتا ہے کہ آواز میں اثر اور درد بھی پرلے سرے کا تھا ۔ بلاغت ملاحظہ ہو ۔ پہلے اثر کو بیان کر دیا جو استدلال شاعری ہے پھر صدائے رسول سے مشابہت دی ۔

" چُپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر ۔۔۔ پانی سے مُنہ نکالے تھے دریا کے جانور "

انداز بیان ملاحظہ ہو ۔ طیور جو بول سکتے ہیں ، عالمِ محویت میں خاموش ہیں ۔ اور شجر اسقدر متاثر ہوئے کہ جھومنے لگے ۔ صبح کا وقت ہے عراق عرب کی سرزمین ہے ، لبِ نہر ہے ، ہوا کے سرد سرد جھونکے آتے ہونگے ۔ ہر شے پر عالمِ محویت میں اُسکی عادتِ طبعی کے خلاف اثر ہوتا ہے ۔ اسلیے طائر خاموش ہیں ، شجر وجد کرتے ہیں یعنی جھوم کر زبانِ حال سے اثرِ محویت کا اظہار کرتے ہیں ۔ محویت کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا ۔ مگر انیس کی قوت کے لیے کوئی احاطہ نہیں ہے وہ اپنے لیے نئے نئے میدان پیدا کر لیتی ہے ۔ ترقی ملاحظہ ہو " اعجاز تھی کہ دلبرِ شبیر کی صدا ؛ ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا " ۔

اِدھر تو یہ عالم ہے ، اُدھر خیمہ میں ناموس گریاں و پریشاں ہیں کہ صبحِ فراق آگئی ۔۔۔۔۔۔۔ " چپکے کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار ؛ زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار ؛ صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار ؛ ۔۔۔۔۔۔۔ لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی " ؛ معلوم نہیں حضرت بانو کس عالمِ تحیر میں غرق ہیں ۔ خدا جانے کیا کیا خیال دل میں آتے ہونگے ۔ مانگ و کوکھ اُجڑنے کا سماں پیش نظر ہوگا ۔ پیارے بیٹے کی آخری اذاں سنتی ہونگی اور خنجرِ الم کلیجے پر چلتے ہونگے ۔ قافلہ سالارِ حرم

حضرت زینب کا حال ملاحظہ ہو۔ موذن کے پیار میں نمازیوں پر بھی صدقے ہوتی ہیں۔ آخری مصرعہ میں ہر شخص سے اذاں سننے کی فرمائش ہے۔ ہائے عجیب بلیغ مصرعہ ہے۔ جس محبت کا اظہار یہ مصرعہ کرتا ہے اُسے صرف ذوق سلیم ہی اندازہ کرسکتا ہے، بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر یوسف جمال کی تلمیح پر غور کیا جاوے تو عجیب مرثیت پیدا ہوتی ہے۔ یوسفؑ بچھڑ کر یعقوبؑ سے پھر ملے تھے۔ یعقوبؑ کے گیارہ پسر اور تھے۔ اُنکو یہ بھی معلوم تھا کہ یوسفؑ زندہ ہیں، مگر روتے روتے اندھے ہوگئے تھے۔ مگر ہائے بنتِ فاطمہ کو اُنکا یوسف قیامت تک نہ ملے گا۔ دو لال اپنی کوکھ کے بھی جدا ہو جائینگے۔ پھر زینب کا کیا حال ہوگا۔ حضرت زینب دعا دیتی ہیں ...... "یا رب رکھ اس صدا کو زمانہ میں تا ابد" یہ مصرعہ سامعین کو یاد دلاتا ہے کہ تا ابد کون کہے، دوپہر ہی کو اکبر سناں کھا کر گرینگے اور زینب گھر سے ننگے سر باہر نکلیں گی۔ ہائے ری حسرت۔ پھر وہ معظمہ فرماتی ہیں۔

"تشبیہ صدا میں، پنکھڑیاں جیسے پھول میں بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"

پہلا مصرعہ تو یقیناً لاجواب ہے۔ اس سے بہتر اور نازک تشبیہ کیا کوئی ڈھونڈھ کر لائے گا۔ مگر دوسرے مصرعہ میں ریاضِ رسولؐ غور طلب ہے۔ تمامی خاندان نبوت جمع ہے اور اُنکے درمیان اکبر اذاں دیتے ہیں۔ ہائے دوپہر میں کوئی نہ رہے گا۔ واقعی کیا وہ لوگ مسلمان ہیں جو ریاضِ رسولؐ برباد کرینگے۔

نماز سے فارغ ہوکر حضرت حرم میں تشریف لاتے ہیں۔ وہ منظر ملاحظہ ہو۔

خیمہ میں جاکے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذو الجلال بچ جائے اس فساد سے خیرالنسا کا لال
بانوئے نیکنام کی کھیتی ہری رہے صندل سے مانگ بچوں سے گود ی بھری رہے"

واقعہ نگاری ملاحظہ ہو۔ چہرے فق ہیں، سر کے بال کھلے ہیں، عین پریشانی کا نقشہ ہے۔ زینبؑ کی محبت کا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ خیرالنسا کے لال کے سوا کسی کی خبر نہیں۔ بیت میں تو قیامت کردی ہے مستورات کی زبان اور محاورہ کو کس بلاغت سے نظم کیا ہے۔ مانگ و کوکھ دونوں آباد رہیں، یہ دعا بجز مستورات کے اور کون دیگا۔ اور پھر بڑی چھوٹیوں کو یوں ہی دعا دیتی ہیں۔ علاوہ اسکے یہ سب حسینؑ کی محبت کے بدولت ہے کہ زینب بانو کو دعا دے رہی ہیں۔

حضرت نے بہن کی تسلی و تشفی فرمائی اور مسلح ہوئے۔ علم خیرالبشر بھی تیار ہوا۔ جنابِ زینب چوبِ علم سے

لیٹی ہوئی رو رہی ہیں - اُنکے گرد مخدراتِ عصمت کھڑی ہیں - اب حضرت زینب کے صاحبزادوں
کا حال ملاحظہ ہو -

"تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے — زینب کے لال زیرِ علم آکھڑے ہوئے"
"گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار — مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار"
"آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے — رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے"

عون و محمد اپنے کو ورثہ دارِ جعفر طیار اور ورثہ دارِ حیدر کرار تصور کرتے ہیں اور اس منصب کے لیے بیخود ہو رہے ہیں مگر ماں سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی - قبا کا دامن گردانے ہیں - آستینیں اُلٹے ہیں - علم کے گرد پھر رہے ہیں یہ سب واقعہ نگاری ہے - پھر دل مضبوط کر کے ماں سے پوچھتے ہیں "اماں کسے ملیگا علم نانا جان کا" نانا جان کا علم کہکر اپنا استحقاق ثابت کرتے ہیں - اور پھر عرض کرتے ہیں -

"کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال — ہم بھی محق ہیں آپکو اسکا رہے خیال"

یہ درپردہ درخواست سفارش ہے اور وہ جانتے ہیں کہ امام علیہ السلام اپنی خواہر عالیقدر سے مشورہ ضرور کریں گے - بلاغت تو ملاحظہ ہو - صاحبزادوں سے یہ بیان کرادیا کہ امام اُنسے مشورہ ضرور کرینگے حضرت زینب ناراض ہو کر فرماتی ہیں ..... "کیا دخل مجھکو مالک و مختار ہیں امام" ..... یعنی ہرگز ہرگز سفارش نکرینگی - امام علیہ السلام اپنی خوشی سے دیدیں تو البتہ امید ہوسکتی ہے - .....

"لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے — کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے"

یعنی لڑکوں میں جاؤ یہاں تمھارا کیا کام ہے - یہ امور نازک ہیں اور تم ابھی بچے ہو - تمھیں علی اکبر جو تمھارے آقازادے اور ہمسن ہیں اُنکی خدمت میں حاضر رہنا چاہیے - ....

"سرکو - ہٹو - بڑھو - نہ کھڑے ہو علم کے پاس — ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس"

حضرت زینب کا اضطراب پہلے مصرعہ سے اور اُسکا سبب دوسرے سے ظاہر ہے ......

"رونے لگو گے کچھ جو بُرا یا بھلا کہوں — اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں"

بچوں کی فطرت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے - محبتِ مادری جوش کرتی ہے - اگر کچھ کہیں تو غیور بچے رو دینگے اور یہ گوارا نہیں ....

"ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل — ہاں اپنے ہمسنوں میں تمھارا نہیں عدیل"

یہ منظور ہے کہ دل نہ ٹوٹے کیونکہ ابھی بڑا کام لینا ہے۔ نانا کی شجاعت کے افسانے سنا کر میدانِ جنگ میں عمرو شمر کا سر لینے کو بھیجنا ہے۔ اسلیے طلب علم کو بلند ہمتی قرار دیتی ہیں۔ مگر بلاغت ملاحظہ ہو۔ گو علم نہ اُٹھا سکو گے گرچہ تم میں اسکی ہمت ہو گر سن مانع ہے۔ لیکن ہاں اپنے ہمسنوں میں تم سب سے زیادہ جری اور بہادر ہو۔ علم جو نہیں ملتا تو یہ شجاعت کی کمی نہیں ہے بلکہ کم سنی کا سبب ہے۔ ...... پھر نشیب فراز سمجھا کر فرماتی ہیں...

"رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے"

اگر میدانِ جنگ کی سفارش چاہو تو میں رخصت دلانے کو تیار رہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ یا یہ کہ یہ میری غرض ہے دوسرے مصرعہ میں کس بلاغت سے نام آوری کا خیال دلاتی ہیں، جسکے بچے جویاں ہیں۔ اور اس طرح مرنے پر تیار کرتی ہیں .....

"پھر تمکو کیا بزرگ تھے گر فخر روزگار زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں فوجیں پکار اُٹھیں کہ نواسے علی کے ہیں"

اس بند کی بلاغت بیان میں نہیں آتی۔ اگر بزرگ فخر زمانہ تھے تو تمھیں کیا وہ اُنکی صفت تھی۔ تم بھی اُنکے اوصاف دکھلاؤ تب اُنکا ورثہ ملے گا۔ یہاں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر حیدر و جعفر کی ورثہ داری کا دعویٰ ہے تو آج میدانِ جنگ میں اُنکے معرکے دکھلا دو۔ پھر تمھیں اسکے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی کہ ہم حیدر و جعفر کے وارث ہیں۔ دُنیا خود ہی مان لیگی اور تمھارا مقصود حاصل ہو جائیگا۔

"ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام غصہ کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امام"

ملاحظہ ہو کہ اس حالتِ غضب میں ماں کو ماں نہیں کہا بلکہ خواہرِ امام۔ اور جب علم کی سفارش چاہی تھی تو ...."اماں کسے ملیگا علم نانا جان کا"۔ دیکھیے دونوں موقعوں کے واسطے مختلف الفاظ حسب مقتضای مقام استعمال کرکے اصلی واقعہ کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ یہی واقعہ نگاری اور یہی بلاغت ہے۔

اب امام علیہ السلام بہن سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ بہن تم نے دونوں بچوں کی باتیں سنیں...

"تو دس برس کے سن میں یہ جرأت یہ ولولے بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی منچلے
بیشک یہ ورثہ دارِ جناب امیر ہیں پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں
بس جسکو تم کہو اُسے دیں فوج کا علم کی عرض جو صلاحِ شہِ آسماں حشم"

زبان ملاحظہ ہو۔سلیس سے دعویٰ ہوئی ہے - بلاغت کا کیا ذکر۔کسی طرح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ نہیں -
پورا جھگڑا واقعہ نگاری کی بہترین مثال ہے - امام علیہ السلام ہادی کے معرف ہیں اور وہ وارث جناب امیر
بھی تسلیم کرتے ہیں مگر کسی سے مجبور ہیں - پھر بھی بہن کی دل شکنی نہیں منظور مگر بہن کی اطاعت ملاحظہ ہو - بالکل
بھائی پر چھوڑ دیا ہے - گر امام مظلوم بہن کے مشورہ کے بغیر کچھ نہ کرینگے وہاں صاف صاف نہیں فرمایا تھا
وہ ہم کو ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ صغیر السن بچوں کو چھوڑ کر جسے تمھاری صلاح ہو علم عنایت
کریں - اسلیے جب بہن امام ہی کی مرضی پر محمول کرتی ہیں تو امام مظلوم صاف صاف فرماتے ہیں...

"مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خورد ہو　　جس کو کہو اُسی کو یہ عہدہ سپرد ہو"

یہاں اسلوب بیاں نے جو بلاغت پیدا کی ہے اُسکا مزا صرف ذوقِ سلیم پر منحصر ہے - بیان نہیں ہو سکتا۔

"بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام　　ہے کس طرف توجہ سردار خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام　　قرآں کے بعد ہے تو علی کا ہے کچھ کلام
شوکت قدم میں شان میں ہمسر نہیں کوئی　　عباس نامدار سے بہتر نہیں کوئی"

حضرت زینب نے اپنی رائے دینے سے پہلے بھائی کا عندیہ لیا - دوسرے مصرعہ میں سردار خاص و عام
نے عجب بلاغت پیدا کی ہے - امام نے "خورد و بزرگ" کہا تھا جسکا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ دولت
خاندان ہی میں رہے اور خاندان کے کسی شخص کو نصیب ہو، مگر خواہر امام "سردار خاص و عام" فرماکر تمام
فوج حسینی کو حصر کر لیتی ہیں - اور رفتہ رفتہ مطلب صاف اور روشن ہوتا جاتا ہے - ایک بند دوسرے
بند کو حل کرتا ہے - اگر حضرت زینب کی رائے امام دریافت فرماتے ہیں تو وہ تو ابوالفضل عباس کے
ہوتے اور کسی کو مستحق نہیں سمجھتیں - اور مصرع ..." قرآں کے بعد ہے تو علی کا ہے کچھ کلام" سے در پردہ یہ
بھی اشارہ ہے کہ حضرت زینب اپنی رائے نہیں دیتیں بلکہ اپنے پدر عالیمقدار سے کبھی سنا تھا اُسی کا اعلان
کر دیا - اس سے حضرت زینب کی محبت کا جو امام مظلوم کے ساتھ ہے اندازہ ہوتا ہے - باوجودیکہ معلوم
ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی وصیت ہے اور یہ بھی جانتی ہیں کہ عباس کو علم ملے گا مگر اسقدر پیش بینی
کے بعد اُنکا نام لیتی ہیں - مبادا حضرت کی رائے کے خلاف ہو اور حضرت زینب نے جناب امیر سے
جو کچھ سنا ہو اُسکا مفہوم وہ غلط سمجھی ہوں - کیونکہ جب امیر علیہ السلام کی وصیت تھی تو امام حسین زینب سے
کیوں مشورہ فرماتے تھے - کیونکہ ظاہر ہے وصیت کے خلاف نہیں ہو سکتا - حضرت زینب یہ بھی تو

فرماتی ہیں کہ ابوالفضل عباس سے بہتر کم از کم اعزا میں کوئی نہیں اور وصیتِ جناب امیر کا بھی انھیں علم ہے۔ باوجود ان باتوں کے امام کا مشورہ کرنا اور جسے زینب کہیں علم دینے کو تیار ہو جانا یہ کیا معنی۔ اس سے قدرتاً حضرت زینب کو یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ ممکن ہے غیر اعزا کی جانب نظر ہو تا کہ نہ عباس کو علم ملے اور نہ عون و محمد کو۔ کسی کی دلشکنی نہ ہو۔" ہے کس طرف توجہ سردارِ خاص و عام" اسی لیے غالباً خاص و عام بجائے خورد و بزرگ کے حضرت زینب نے استعمال کیا تھا۔

امام علیہ السلام آنکھوں میں اشک بھر کر فرماتے ہیں ..." ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی لے بہن"..... اچھا عباس کو بلائیے۔ علی اکبر خوش ہو کر باہر جاتے اور عم محترم سے عرض کرتے ہیں .....

"کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو"

یہ روزمرہ۔ یہ برجستگی۔ یہ سلاست۔ یہ صفائی۔ انیس تیرا ہی حصہ ہے۔

حضرت عباس تشریف لاتے ہیں۔ اور حضرت یہ کہکر" انکی رضا جو ہے وہ خوشی پنجتن کی ہے؛ لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے"... بھائی کو علم حوالہ کرتے ہیں۔ ابوالفضل عباس بہن کے قدموں پر گر پڑتے ہیں۔ یہ بھائی سے خبردار رہنے کی تاکید فرماتی ہیں۔ ابوالفضل عباس عرض کرتے ہیں کہ جب تک جسم میں جان ہے حسینؑ کے پسینے پر اپنا خون گرائیں گے۔ اتنے میں ابوالفضل عباس کی زوجہ تشریف لاتی ہیں اور سبطِ پیمبر اور بنتِ فاطمہ کی بلائیں لیتی ہیں اور شوہر کے سرفراز کرنے کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ بنتِ فاطمہؑ چھوٹی بھاوج کو دعا دیتی ہیں..." تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا" ناظرین ملاحظہ کریں اسی مرثیہ کے اقتباسات کے شروع کے حصہ میں حضرت زینب نے حضرت شہربانو کو بھی دعا دی ہے اور یہی دعا اُن معظمہ کو بھی دی ہے مگر اسلوبِ بیان مختلف تھا۔ اُنکے باب میں فرمایا تھا۔

" بانوے نامدار کی کھیتی ہری رہے صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے"

اختلافِ اسلوبِ بیان نے عجیب بلاغت پیدا کر دی ہے۔ یہ فرقِ مراتب قائم رکھنا انیس ہی کا کام ہے۔ بانوے حسین ابن علیؑ اور زوجۂ ابوالفضل عباس میں فرقِ مراتب ظاہر کر دیا۔

انیس کے کلام میں مرثیت اس سرخی کے قائم کرنے کا باعث ناظرین کو معلوم ہو جائیگا۔ ابھی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) "گرتے ہیں اب حسینؑ فرس پر سے ہے غضب نکلی رکاب پائے مطہر سے ہے غضب

پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قرآن رحل زیں سے سر فرش گر پڑا دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا"

ناظرین غور کریں کہ ایک ایک لفظ مرثیت کے رنگ میں رنگا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرثیت کے ساتھ ساتھ بلاغت اور واقعہ نگاری بھی اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ ناتوانی سے گھوڑے پر ڈگمگانا۔ رکاب سے پیروں کا نکلنا۔ پہلو پر زخم لگنا۔ غش میں جھکنا۔ بالآخر فرش زیں پر آجانا۔ تمام جزئیات بیان کیے ہیں۔ آخری حالت میں شانِ امامت کی کسی قدر سبکی ہوتی تھی۔ لہذا انیس نے بیت میں اعلیٰ درجے کے استعارے پیدا کرکے اُسکا انسداد کر دیا۔ شاید کوئی ناواقف اعتراض کرے کہ استعارہ میں مبالغہ بے حد ہے تو مجبوری ہے۔ انیس اور شیعی دنیا کا اعتقاد ہی یہی ہے۔ اُنکے نزدیک کچھ بھی مبالغہ نہیں ہے پہلے قرآن سے استعارہ کیا۔ پھر دیوار کعبہ سے، پھر عرش معظم سے۔ ایک استعارہ دوسرے سے بڑھتا گیا ہے۔ یہ ترقی بلاغت کی جان ہے۔

اب گرنے کے بعد کی حالت ملاحظہ ہو۔ مرثیت۔ بلاغت۔ واقعہ نگاری سب اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

"گر کر کبھی اُٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر اُبلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی اُدھر
اُٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے"

گر کر اُٹھنا اور ضعف سے پھر زمین پر سر رکھنا۔ زخموں سے لہو کا بہنا اور ہاتھوں سے جگر کا سنبھالنا۔ اس حالت میں خیام کی جانب مایوسی سے تکنا۔ ہائے عجیب مرثیت ہے۔ بار بار کروٹیں بدلنا بتلاتا ہے کہ دونوں پہلو زخموں سے چور تھے۔ کثرتِ زخم کا یہ عالم ہے۔ اور زخم اتنے کشادہ تھے کہ اُٹھ بیٹھنے پر برچھی کے پھل گر جاتے تھے۔ ضعف ایسا ہے کہ سنبھل نہیں سکتے اور گر پڑتے تھے تو برچھی کے پھل پھر پیوست ہو جاتے تھے۔ اتنی سکت نہ تھی کہ ہاتھوں سے گڑے ہوئے پھل علیحدہ کر دیتے۔ ہائے حسین ایسے بیکس و بے یار ہو گئے تھے۔

(۲) حضرت علی اکبر باپ سے اذنِ جنگ طلب کرتے ہیں۔ امام مظلوم پھوپھی اور ماں سے رخصت طلب کرنے کو فرماتے ہیں۔ دونوں کا پیار اکبر کو معلوم ہے۔ مایوس خیمہ میں آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"دامن سے آکے بالی سکینہ چمٹ گئی زینب بلائیں لیکے گلے سے لپٹ گئی"

حضرت سکینہ کا دامن سے لپٹنا اور حضرت زینب کا گلے سے عجب واقعہ نگاری ہے۔ پھر مرثیت ملاحظہ ہو تو بیشک بیت ہے۔ علی اکبر اور بھی مایوس ہوئے اور رونے لگے۔ ماں پوچھتی ہیں .....

"کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں صدمہ جو دل پہ ہو اُسے کچھ منہ سے کہتے ہیں"

مگر اکبر کچھ بولتے نہیں تو حضرتِ بانو گھبرا کر پوچھتی ہیں ..... "صغرا کی تو وطن سے نہیں آئی کچھ خبر" واقعاتِ امام مظلوم میں یہ واقعہ بھی نہایت دردانگیز ہے۔ اسے یاد دلا کر کیا عجب مرثیت پیدا کی ہے۔ ایسے ایسے گوشے مرثیت کی جان ہیں۔ ممکن تھا کہ بجائے صغرا امامِ مظلوم کا نام لیا جاتا، کیونکہ حضرت بانو جانتی ہیں کہ اب امام علیہ السلام تن تنہا ہیں، مگر یہ مرثیت نہ پیدا ہوتی۔ اب حضرت اکبر کو دردِ دل کہنے کا موقعہ ملا تو فرماتے ہیں .....

"اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر لٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر"

یہ بلاغت اور یہ مرثیت کس طرح بیان کیجائے۔ گویا ابتک خیر النسا کا گھر لٹا ہی نہیں اور خیر النسا کا گھر امام مظلوم ہی سے وابستہ ہے۔ وہ ہیں تو خیر النسا کا گھر آباد ہے۔ اور اسی کے بچانے کو تمام مخدرات عصمت نے اپنی دولتِ اولاد نثار دی ہے۔ حضرت بانو کو چاہیے کہ اب وہ حتی الوسع اُسکی حفاظت کریں۔ کیونکہ اب وہی اس قابل ہیں، اُنھیں کے پاس دولتِ اولاد ہے اور کسی بی بی کے پاس نہیں ہے جو نثار کرے سب نثار کر چکیں۔

(۳) امام علیہ السلام حرم سے رخصت ہوتے ہیں۔ سکینہ مچل گئیں اور نہیں جانے دیتیں۔ آپ فرماتے ہیں جانے دو تو پانی لانے کی کوشش کریں۔ وہ ناداں فرماتی ہیں .....

"میں خوب جانتی ہوں کہ منہ موڑتے ہیں آپ صغرا تو واں چھٹیں مجھے یاں چھوڑتے ہیں آپ"

(۴) حضرت اکبر حضرت عابد سے رخصت ہوتے اور وصیت کرتے ہیں۔

"اس معرکہ سے جب ہو وطن آپ کا جانا صغرا کو کئی بار کلیجے سے لگانا
کہنا کہ بہن پھر گیا بابا سے زمانا وعدہ تو کیا تھا یہ نہ تم تک ہوا آنا
تقدیر پہ فوجوں کی گھٹا چھا گئی صغرا آنے ہی پہ ہم تھے کہ قضا آگئی صغرا"

ناظرین بنظر انصاف یہ مرثیت ملاحظہ فرماویں اور پھر فیصلہ کریں کہ بعض حضرات کا خیال کہ میر انیس میں مرثیت کم ہوتی ہے، کہاں تک صحیح ہے۔ غیر عوام جو کچھ کہیں جب خواص دھوکا کھا جاتے ہیں تو سخت تعجب

اور افسوس ہوتا ہے۔ آزاد مرحوم سے تعجب اور سخت تعجب ہے۔ آب حیات میں فرماتے ہیں ..." یہ درست ہے کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں خوش ادائی نہ تھی لیکن حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ انکا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تو رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ اس کام کی علت غائی یہی ہے۔" آزاد مرحوم کے دھوکا کھانے کی صرف ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ آزاد مرحوم مرثیہ پڑھتے تھے۔ کبھی دبیریوں کے مجمع میں پڑھے ہونگے۔ اور اسی بنا پر یہ رائے قائم کی ہوگی کیونکہ اُس زمانہ کے دبیری اور انیسی ایسے سخت متعصب و "جاہل" تھے کہ ایک امت دوسرے کے کلام کی تعریف کرنا یا اُس سے متاثر ہو کر رونا گناہ کبیرہ خیال کرتی تھی۔ مرزا دبیر مرحوم کو ایک بار ایسا اتفاق پیش آیا تھا۔ جناب مرزا صاحب کی پیش خوانی مرزا اوج صاحب نے کی۔ ایک قطرۂ آنسو کا کسی کی آنکھ سے نہ نکلا۔ مجلس ٹھس رہگئی۔ جب مرزا صاحب ممبر پر گئے تو مرحوم نے قسم دلادی کہ آپ لوگوں کو قسم ہے جو روئیے۔ گر مرزا صاحب نے رُلا کر چھوڑا۔

غالباً ایسا ہی واقعہ کہیں ہمارے ہیرو کو بھی پیش آیا تھا۔ کیونکہ ایک مرثیہ میں میر انیس مرحوم فرماتے ہیں

"خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوے ہیں　　اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوے ہیں"

رباعیات اور سلام | میر صاحب نے متعدد مضامین پر رُباعیاں لکھی ہیں اور کثرت سے رباعیاں لکھی ہیں۔ زیادہ تر بے ثباتیِ دنیا، اخلاق وغیرہ پر ہیں۔ بہر حال ذیل کی تین رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

انسان ذی عقل و ہوش ہو جاتا ہے　　اور صاحب چشم و گوش ہو جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو تبلا یئے پھر　　کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے　　آتا نہیں پھر کر جو نفس جاتا ہے
جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا　　یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے

وہ موج حوادث کا بکھیڑا نہ رہا　　کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک ہیں　　جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

سلام بھی میر صاحب نے بکثرت لکھے ہیں۔ اور خوب لکھے ہیں۔ سلام غزل کا قائم مقام ہے اور میر مونس سلام لاجواب کہتے ہیں۔ چونکہ غزل کو اعلیٰ درجے کے تھے اسلیے مونس مرحوم کا دعویٰ ہے .....

"ہمیشہ ہم نے مضامیں کے تازہ پھولوں سے　　بسا رکھا ہے سلاموں کی ان زمینوں کو"

گر میر انیس کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی سے اس میدان میں پیچھے نہیں شاید دو چار قدم تھک گئے ہوں۔ اب

اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(۱) شبیہِ امامِ زماں کھینچتے ہیں — تصور میں تصویرِ جاں کھینچتے ہیں
محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک — مجھے کس لیے قدرداں کھینچتے ہیں
کہا رو کے اکبر نے لے درد تھم جا — کلیجے سے بابا سناں کھینچتے ہیں

(۲) امیر جس درِ دولت پہ اک زمانہ ہوا — وہ گھر اُجڑ گیا غارت وہ کارخانہ ہوا
کہیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا — زمیں اُلٹ گئی کیا انقلاب زمانہ ہوا
حسین نے کبھی شکوہ کیا نہ امت کا — گلہ ہوا بھی کسی سے تو دوستانہ ہوا
رہا نہ کوئی بہتر میں ظہر تک باقی — حسین رہ گئے سب کارواں روانہ ہوا
شتاب تھا کہ دم واپسیں کی آمد شد — یہ مضطرب ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا
پڑا جو سایۂ گیسوے پیچدارِ حسین — تو ذوالجناح یہ سمجھا کہ تازیانہ ہوا

(۳) گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا — مگر حسین سے صابر کو اضطراب نہ تھا
حسین اور طلبِ آب سلے معاذ اللہ — تمام کرنے تھے حجت سوال آب نہ تھا
حضورِ شاہ پھر آیا کہاں سے حر شہید — خطا کی راہ میں گر جادۂ ثواب نہ تھا
نمود و بودِ بشر کیا محیطِ عالم میں — ہوا کا جھونکا کوئی جھونکا بڑا حباب نہ تھا
ستارے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک — ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

(۴) بیکسی کا شہ کی چرچا رہ گیا — مجرئی ہمان پیاسا رہ گیا
سب ہوئے سیراب تجھ سے کیوں فرات — قافلہ یثرب کا پیاسا رہ گیا
فیض تھا بے پردگی میں آل کی — ہم گنہگاروں کا پردا رہ گیا
قبر میں ہوگا حسابِ زندگی — بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا
دیر آنے پہ یہ جلد آئے رسول — دور لاکھوں کوس سایا رہ گیا

ناظرین ملاحظہ کریں کہ (۱) م ۲/۳ - (۲) م ۱،۲،۳،۴/۱ - (۳) م ۲/۱ - (۴) م ۳،۲،۱/۱ مرثیت کی جان ہیں۔ (۱) م ۲/۱ - (۲) م ۶،۵/۵ - (۳) م ۵،۴/۴ - (۴) م ۴/۱ کسقدر غزلیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہیں غزل کہتے تو کیسی کہتے۔ قصائد بھی میر صاحب لاجواب کہتے۔ کسی مرثیہ کا

پھر اعرفی اور قاآنی کے قصائد کی تشبیب سے ملا لیا جائے اور اندازہ ہو جائیگا کہ اگر اس کوچہ میں قدم رکھتے تو انیس عرفی اور قاآنی کو بھی مات کر دیتے۔ (۱) ۱۷ - (۲) ۳۱ - پر ناظرین غور فرمائیں اور انیس کو داد دیں -

خاتمہ میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انیس کی مضموں آفرینی کی داد دینے کے لیے (۴) ۳۸ پر بھی غور کیا جائے - ایک مقام پر میر انیس مرثیہ میں فرماتے ہیں جناب عون و محمد کی زبانی.......

"آدم سے جو پہلے تھا وہ ہے نور ہمارا   دیر آئے کہ مسکن تھا بہت دور ہمارا"

فارسی کا کسی کا شعر ہے غالباً ایک رباعی کا آخری شعر ہے -

"اے ختم رسل قرب تو معلوم شد   دیر آمدۂ ز راہ دور آمدۂ"

یہ شعر اور متذکرہ بالا شعر میر انیس کے مرثیہ کا قریب قریب ہم معنی ہیں - آخری مصرعے تو بالکل ایک ہی ہیں - مگر اسے سرقہ نہیں کہا جا سکتا - کیونکہ ایک معمولی مضمون ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آ سکتا ہے - پھر انیس جیسے معنی آفریں پر سرقہ کا شبہ کرنا کوتاہ نظری ہے - ہاں توارد البتہ کہہ سکتے ہیں - مگر ملاحظہ ہو مرزا غالب توارد کے متعلق کیا فرماتے ہیں -

"مبرگمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد   متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُردست"

اب فارسی کے شعر اور سلام (۴) ۳۸ شعر کا توازن اور تقابل کیا جائے تو معلوم ہو کہ انیس کی طبیعت کس قدر نکتہ رس اور باریک بیں تھی - ڈاکٹر اقبال مرزا غالب کے لیے کہتے ہیں -

"فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا   ہے پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا"

راقم ڈاکٹر صاحب موصوف کا شعر لیکر اپنے ہیرو کے لیے کہتا ہے اور اسکے لیے کہنے کا زیادہ مستحق ہے

"فکر انساں پر تری ہستی سے یہ ظاہر ہوا   ہے پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا"

الراقم - سید امیر الحسن نقوی

فریبِ محبت

رسالہ تمدن کے کسی گذشتہ نمبر میں ایک مضمون میری نظر سے گذرا جو غالباً کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایک فرشتۂ رحمت نے خداوند عالم کی اجازت سے اعراف میں اپنا دلکش کن راگ شروع کیا تاکہ وہاں کی بے چین اور مضطرب روحوں کو تسکین دے سکے۔ اُسکی سُریلی اور مستانہ آواز سے وہ تمام فرشتے جو عذاب پر مامور تھے مست و مدہوش ہوگئے اور وہ روحیں جو ابدی عذاب کی ناقابلِ برداشت تکلیفوں سے بے چین ہو کر صدائے نالہ و آہ بلند کر رہی تھیں اس لطف آفریں نغمۂ شیریں سے متوالی ہوگئیں۔ مگر ایک روح صرف ایک نازک اور غمزدہ عورت کی کمزور روح جو اپنے عاشقِ دلنواز کے ہجر و فراق میں بے چین اور نشۂ الفت میں سرشار ہو رہی تھی اور فریبِ محبت نے اُسکے دل و جگر میں مندمل نہ ہونے والے ناسور ڈالدیے تھے اُسکے زارنالی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اُس فرشتۂ رحمت کی سفارش سے اُس غریب اور بیکس عورت نے ایک ساعت کی اجازت حاصل کی کہ ایک ہزار سال کا مزید عذاب اُسے گوارا ہے مگر وہ اپنے محبوب ترین دوست کو ایک نظر دیکھ لے۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر کس قدر نازاں تھی اور اُسکی حقیقی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسکو اجازت ملی ہے۔ لیکن آہ! اُسنے اپنے (بخیالِ خود) عاشقِ صادق کے پہلو میں ایک دوسری عورت کو خلافِ اُمید پایا۔ اُس بیوفا کو مست بادۂ عشرت دیکھکر اور اُسکے منہ سے یہ الفاظ سنکر (نہیں پیاری تم کچھ خیال نہ کرو۔ مجھے مرحومہ سے کوئی محبت نہیں تھی صرف وہ ارتباط ضرور تھا جو کسی کو اپنے ایک پالے ہوئے جانور کے ساتھ ہو سکتا ہے) اُسکی کیا حالت ہوگی۔ اُف کسقدر دلخراش اور عبرتناک منظر ہے۔ افسوس کہ فاضل مصنف نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ اگرچہ جذبات اور خصوصاً کسی بیکس عورت کے جذبات میں رنگ بھرنا کوئی آسان کام نہیں اور پھر مجھ سے عدیم الفرصت کے لیے۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سرسری طور پر جو کچھ مجھ سے ہو سکا وہ ہدیۂ ناظرین ہے

یاد ہیں وہ دن کہ میرے رخ کا تو پروانہ تھا — اور مرکز تھا تری اُلفت کا میرا ہی جمال
یاد ہیں وہ دن کہ تو میرے لیے دیوانہ تھا — تیرے دل میں جاگزیں تھا صرف میرا ہی خیال

پھر رہا ہے آج تک نظروں میں وہ دلکش سماں — جب مری الفت میں تو رہتا تھا ظالم بے قرار

یاد ہے ہاں یاد ہے اب تک وہ پچھلی داستاں　　جب مری چشمِ عنایت کا تھا تو امیدوار

یاد ہے مجھکو زمانہ ابتدائے عشق کا　　جبکہ میں سرمایۂ راحت تھی تیرے واسطے
جب سے مئے الفت سے تیرا جامِ دل لبریز تھا　　جب تمنائیں تری تھیں صرف میرے واسطے

شام کو وہ باغ میں ہر روز میرا انتظار　　اک ذرا تاخیر پر وہ ہائے تیرا اضطراب
اُف وہ ہر آہٹ پہ تیرا چونک پڑنا بار بار　　دل ہی دل میں دیر ہوجانے پہ کھانا پیچ و تاب

وہ نگاہوں کا تری مُڑ مُڑ کے ہر سو دیکھنا　　جوشِ بیتابی سے وہ اُٹھ بیٹھنا تیرا کبھی
وہ ٹہلنا محویت کے ساتھ گھنٹوں تک ترا　　عالَمِ تخئیل میں وہ تیری از خود رفتگی

منہ بنانا خود بخود کہنا کبھی یوں زیرِ لب　　یا الٰہی خیر وہ تو دیر کی عادی نہ تھیں
کچھ نہیں آتا سمجھ میں اس توقف کا سبب　　ہاں طبیعت ہی نہ ہو کچھ بدمزہ اُنکی کہیں

اُف نصیبِ دشمناں گر یہ ہوا تو ہوگا کیا　　خیر ہو اب یا الٰہی خیر میرے مُنہ میں خاک
یا ضروری کام کچھ درپیش اُن کو ہوگیا　　آج جاؤں گا وہاں سے کیا یوں ہی اندوہناک

دفعتاً پھر باغ میں آنا مرا تجھکو نظر　　اور وہ جوشِ مسرّت تیرا مجھکو یاد ہے
وہ ٹہلنا پھر روش پر ہاتھ میرا تھام کر　　اور وہ اظہارِ الفت تیرا مجھکو یاد ہے

حالِ دل اپنا سُنانا مجھکو باچشمِ پُرآب　　داستانِ غم کبھی اظہارِ بیتابی کبھی
وہ نئے الفاظ سے میری طرف کرنا خطاب　　اور وہ عرضِ محبت کے لیے منت تری

وہ وہ لانا موت کا اپنی کبھی مجھکو نفس عاجزی سے یوں کبھی کہنا ترا با چشمِ تر
او ستم ایجاد اگر نکلی ترے منہ سے نہیں تو سمجھ لے آج ہی دنیا سے ہے میرا سفر

ہائے بیتابی تری بیرحم! سُننے کو جواب اور وہ مایوسی سے ظالم میری صورت دیکھنا
یاد ہے آنسو بہانا تیرا اے خانہ خراب یاد ہے میری طرف با چشمِ حسرت دیکھنا

یاد ہیں اب تک مجھے وہ منتیں ظالم تری اور وہ اقرارِ الفت پر مسرت یاد ہے
ہائے وہ پُر لطف منظر میں نہ بھولونگی کبھی مجھکو وہ اک اک ادائے جوشِ الفت یاد ہے

کیا سمجھتی تھی کہ اک دھوکا ہے پیمانِ وفا کیا خبر تھی نقشِ الفت بھی ہے اک نقش بر آب
اس قدر نازک ہے یہ رشتہ یہ کیا معلوم تھا جانتی تھی کیا کہ آنسو ہیں ترے مثلِ سراب

ہائے وہ ساعت کہ جب دنیا سے تھا قصدِ سفر اور چھلکنے ہی کو تھا جب میرا جامِ زندگی
جب دوائیں اور دعائیں ہو چکی تھیں بے اثر اور شمعِ زیست میری آہ گُل ہونے کو تھی

ہو رہا تھا جامۂ ہستی مرا جب تار تار جب پریشاں ہونے والا زیست کا شیرازہ تھا
اصل کی جانب تھا راجع جب مرا مشتِ غبار چند ساعت زندگی کا اور جب اندازہ تھا

جب مرے ماتم میں ارماں لوٹتے تھے خاک پر بیکسی سر پیٹتی تھی حسرتیں تھیں سوگوار
تھیں تمنائیں مری بالیں پہ میری نوحہ گر آرزو روتی تھی امیدوں سے مل کر بار بار

سامنے آنکھوں کے تصویرِ خیالی تھی تری کر رہی تھی جو اُسی صورت سے پیمانِ وفا
منتظر تیری نگاہِ یاس بھی جب تھی مری ہائے دنیا سے گئی میں لیکے ارمانِ وفا

قبر میں بھی کچھ نہ پایا چین تیری یاد سے
باعثِ وحشت رہی اعراف میں الفت مری
کام تھا مجھکو ہمیشہ نالۂ و فریاد سے
دل دکھاتی تھی فرشتوں کا بھی یہ حالت مری

بارگاہِ کبریائی میں یہ سب نے عرض کی
"چاہتی ہے اپنے عاشق کو یہ دم بھر دیکھنا"
ایک ساعت کی اجازت دے لیکر آئی تھی
ہاں مگر قسمت میں لکھا تھا یہ منظر دیکھنا

میں تو اب سمجھی ہوں ظالم تیرے اس مفہوم کو
بے غرض دنیا میں عالمگیر الفت کچھ نہیں
آج دھوکا دے رہا ہے اک نئے معصوم کو
درحقیقت تجھکو اُس سے بھی محبت کچھ نہیں

کیا سُنایا مجھکو قسمت نے یہ تو نے کیا کہا
تیرے ہر فقرے میں ظالم اک غرض مستور ہے
تیری اس تبدیلِ الفت سے یہ ثابت ہوگیا
آنکھ سے جو دور ہے بیشک وہ دل سے دور ہے

سید محمود اعظم - فہمی (بھوپال)

پھر بلا سے شامِ فرقت آگئی
اُن کا جانا تھا کہ آفت آگئی
رات گذری صبحِ فرقت آگئی
آنے والی تھی قیامت آگئی
الفراق اے عیش و لطفِ زندگی
لب پہ اُنکے لفظِ رخصت آگئی
بلبل و گل کو جو دیکھا ایکجا
یاد اپنی اُنکی صحبت آگئی
حُسن جو کچھ تھا وہ تمکو مل گیا
میرے حصہ میں محبت آگئی
کی اگر نیت کبھی ہجرِ نماز
سامنے اُس بُت کی صورت آگئی
پہلے شوقِ میکشی اتنا نہ تھا
توبہ کرتے ہی قیامت آگئی
میکدے میں کون دیتا قرض سے
کام دستارِ فضیلت آگئی
غیر کو درباں بنایا آپ نے
قبضۂ کافر میں جنت آگئی
خاک میں ہمکو ملانے کے لیے
آپ کے دل میں کدورت آگئی
رکھ لیا تھا دل میں جسکو اے رقم
آج لب پر وہ شکایت آگئی

اُس کا آخری گناہ

جب ڈاکٹر پریم چند کی آنکھ کھلی، صبح کا سہانا وقت تھا، طائرانِ خوش الحان نغمۂ ترنم میں مست، اُس وقت کی فضا میں ایک عجب دلکشی پیدا کر رہے تھے۔ ان چھوٹے جانوروں کی چہکار نے چلتی گاڑیوں کی چوں چوں سے مل کے پریم چند کی نیند کے سکون کو آنِ واحد میں دُور کر دیا۔ صبح کے دُھندلکے میں اُسکی خمار آلود آنکھوں کے سامنے سارے کمرے میں نقش و نگار پیدا ہوتے اور اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑتے اور غائب ہو جاتے۔ ابھی نیند کا اثر باقی تھا!

اس نے کسی قدر تکلف سے آرام کرسی پر کروٹ لی۔ اور تعجب کرنے لگا کہ وہ رات کو ہجوم خیالات میں کرسی ہی پر سو گیا۔ اس خیال کے ساتھ وہی رات کے وحشت خیز خیالات اپنا پرا جما کے آموجود ہوئے۔ اب وہ پھر اُن پریشان افکار کے نرغہ میں تھا۔ یہ دو پار منٹ کی بات معلوم ہوتی تھی اور وہ باریک لیکن درشت آواز اُسکے کانوں میں گونج رہی تھی —— کہ اُسکی بیوی نے سونے سے پہلے اُس سے ملامت آمیز گفتگو کی اور بڑبڑاتی ہوئی اپنے بستر پر جا لیٹی اور اُسے رنج و فکر میں مبتلا کر گئی۔

ان خیالات نے اُسے عنفوانِ شباب کا وہ زمانہ یاد دلا دیا جبکہ اُس نے دریائے ستلج کے کنارے دھڑکتے ہوئے دل سے، ایک پری جمال کمسن نازنین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکے پیامِ محبت دیا تھا، اور کسی کی رسیلی آنکھوں نے دلِ بیتاب کی بیقراری کو سکون سے بدل دیا تھا۔ آہ! شادی کے بعد صرف چند ماہ، مسرت و عیش کا اوجِ کمال تھے اور بعد کی ساری زندگی ہدفِ رنج و محن! سرد آہ نے ایک درد کے ساتھ اُسکے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا کہ اِس ظالم بتِ طناز نے کبھی اُس سے محبت نہیں کی۔ حالانکہ اُس نے ہمیشہ اُس نازنین بیوی کی پرستش کی۔ اور اب گو کہولت نے رام پیاری کے گورے رخساروں سے جوانی کی چمک اور دلفریبی دور کر دی تھی اور اُسکے سیاہ مرغولوں میں سفید تار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے اندھیری رات میں دور سے بہتا ہوا دریا ایک سفید باریک لکیر نظر آتا ہے، تاہم اس کبر سنی میں بھی رام پیاری اسکے لیے وہی حُسن آفریں نازنین تھی جس نے اُس شفاف ندی کے کنارے صاف دل سے محبت کا اقرار کیا تھا۔ آہ! ڈاکٹر پریم چند کے دل میں ایک کسک سی معلوم ہوئی اور

اُس پُر لطف پہلے زمانہ کی جگہ حالتِ موجودہ نے لے لی جو اتنی زیادہ جگر پاش تھی جتنی کبھی پہلے زمانہ کی پُر لطف سے پُر لطف گھڑی مسرت خیز نہ ہوئی تھی۔ آہ! یہ کتنی بڑی غلطی تھی! ساری عمر غم میں گذری اور کوئی گھڑی ایسی نہ آئی جیسے پُرانے زخموں پر مرہم رکھدیا ہو۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹر اُس سے محبت کرتا تھا۔ ہاں! وہ اب بھی اُس سے محبت کرتا تھا!

انہی خیالات میں نیند نے اُسے تھپک کر سُلا دیا، وہ ایک شکستہ خاطر بُڈھا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک ضدی عورت ہمہ تن انتظار بستر پر دراز تھی اور لحظہ بہ لحظہ اُسکی زبان زہرآلود ہوتی جاتی اور جھنجھلاہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن آج خلافِ معمول حُسن کے اس آثارِ قدیمہ پر ایک عجب کیفیتِ فکر طاری تھی: "بیشک میری زیادتی ہے! اس بیکس و بے زبان نے کبھی اُف نہیں کی! میں نے اسکے شریف سلوک کا کبھی معاوضہ نہ دیا" چندے انہی اپنی خیالی زیادتیوں پر غور کرتی رہی۔ آخر شوہر کے لیے دعا مانگتی ہوئی نیند کے آغوش میں سوگئی کیونکہ وہ قائل تھی کہ اللہ نے اُسے ایسا اچھا شوہر دیا۔

اب جو پریم چند کی آنکھ کھُلی تو اُسنے بستر پر لیٹ کے دو گھڑی آنکھ لگانے کا ارادہ کیا لیکن فوراً ہی ایک غم آلود مسکراہٹ اُسکے لبوں پر نمودار ہوگئی۔ کہ شاید اُسکی بیوی اُسکے سینے میں بستر پر لیٹنے سے پہلے ایک تیر اور رسید کرے۔ فوراً ہی وہ لیٹا اور اب اُسکے دل میں ایک خوفناک ارادہ جوش مار رہا تھا۔ آخر اس رنج والم کی کوئی حد بھی ہے؟ اسکا ضرور خاتمہ ہونا چاہیے، اب ایک مصمم ارادہ اُسپر مستولی تھا! وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اندوہ و الم کا اثر دنیا کے کسی فردِ بشر پر ڈالے۔ اُسے دن رات بیماروں سے سابقہ پڑتا تھا جو اکثر اوقات مغز چاٹا کرتے اور اُسکے طوفاں خیز دماغ میں اور تلاطم پیدا کردیتے۔ بس! اب انسداد لازم ہے!

پریم چند کو اپنی ہستی حقیر نظر آرہی تھی۔ اور اُسکا اصلی حُلیہ اُسے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک درم ناخریدہ، بے حمیت و بے غیرت، زن مُرید شوہر تھا۔ آہ! یہ ایسا دردفزا احساس تھا کہ اُسنے فوراً اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ "اگر مجھ میں کچھ بھی مردانگی ہے تو اب اُسکے اظہار کا موقع ہے۔ اسے ہمتِ مردانہ لغزش کا وقت نہیں ہے!" وہ ستی والا کھیت اُسے یاد آیا جو متاہل زندگی کے پہلے پُر شوق سال میں اُن دونوں نے چتا کے لیے منتخب کیا تھا اور پہلے ہی سے ایک بُرجی وہاں کھڑی کردی تھی۔ دونوں اُس جگہ سے الفت کیا کرتے تھے۔ اس جگہ کا خیال اُسوقت ڈاکٹر کے دل و دماغ پر

عادی تھا۔ دنیا میں جو کچھ میرا ہے رام پیاری اُسکی مالک ہے لیکن اگر زندگی کا آرام و آسایش وہ مہیا نہیں کرسکتی تو کم از کم اُس تکلیف کا ضرور انسداد چاہیے جسکو سہتے سہتے یہ وقت آگیا ......

ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور گالوں پر ڈھلکنے لگے ۔ آہ! رام پیاری کا دنیا میں سوائے اُسکے اور کوئی نہیں ہے ۔ دنیا سے جب وہ اُٹھ جائیگا تو اُسکی ہجولیاں اُسے طعنہ دینگی اور ڈاکٹر کے دوست نفرت و حقارت سے رام پیاری کا ذکر کرینگے کیونکہ سب کو اسکی بیوی کی تنک مزاجی اور نافرمانی کا حال معلوم تھا۔ کیا یہ آنسو بزدلی کی وجہ سے تھے؟ نہیں! اُسکے دل میں رام پیاری کے لیے جذبات رحم پیدا ہو رہے تھے۔ وہ بہ تن درشتی و کج ادائی تھی اور وہ دنیا میں اُس سے محبت کرنے اور اُسکے ناز اُٹھانے کے لیے تھا!

اُس کھیت کا خیال اُسے آتا تھا جہاں اکثر وہ دونوں پھولوں کے گلدستے بنا کے لے جاتے۔ اور اُس بُرجی پر چڑھ جاتے تھے، جہاں ایک درخت کھڑا تھا اور اُسپر ایک پرندے کا آشیانہ تھا۔ دھوپ اُس درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کے زمیں پر اطلس و زربفت کے نمونے پیدا کرتی اور پھر غائب ہو جاتی! نرم نرم ہوا چلتی اور سبزۂ نو دمیدہ کو غیر معلوم ہلکورے دیتی، وہ دونوں اسی سکون کے مقام پر آتے، اور اُس بُرجی کے پاس کھڑے ہو کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے اور ایک دوسرے کو خوب گھور کے دیکھتے اور کسی دوسرے عالم میں پہونچ جاتے ۔ کاش! سامانِ سفر دونوں کا ساتھ ہو!

ان خیالات نے رام پیاری کے لیے اُسکے دل میں رحم اور ترس پیدا کر دیا اور وہ اپنے تیرو نشتر کے باوجود اُسکے دل میں بیٹھی اُسکے ارادہ میں کمزوری پیدا کر رہی تھی! تو کیا وہ اپنے ارادہ کو ترک کرکے اُس سے پھر ملے اور حسب معمول اسکی استمالت و رضا جوئی کرے، نہیں، نہیں، یہ مضحکہ انگیز بات ہے، آئیں بنگی ہے، بس اُس درخت کے پاس ہی اُسے دائمی آرام و سکون نصیب ہوگا!

اس فیصلے نے اُسکی پیشانی سے فکر کی شکنوں کو دور کر دیا۔ اور وہ خفیف سا مسکرا دیا، آخری مرتبہ اُس بیارد کا دیدار کر لینا چاہیے، وہ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا اور اس خیال سے باز آیا، اس رنج و کرب کا خاتمہ ہی لازم ہے اور اب کوئی سخت لفظ اُسکی زبان سے نہیں سُننا چاہیے، اب تاب نہیں ہے!

وہ مسکراتا ہوا اُٹھا اور گرد و پیش کمرے میں نظر ڈالی اور ہر ہر چیز کو آخری نظر سے دیکھ کے رخصت طلب کی، آگے بڑھا۔ ایک جگہ ایک کرسی پر اُس سنگدل رام پیاری کے ہاتھ کی سلی ہوئی ایک

چیز دیکھکے ٹھٹک گیا، دیر تک حیرت و اندوہ سے دیکھا کیا، پھر ٹھنڈی سانس کے ساتھ اُسکی طرف ہاتھ، پیار کا ہاتھ بڑھایا، اُسپر، اُسکے باریک تاروں پر، اپنی محبت بھری اُنگلیاں پھیریں، اور آنکھوں سے اُسکو لگایا، اور پھر اُسی جگہ رکھدیا، یا دلِ ناخواستہ اُس چیز سے جدا ہوا، اُسے مُڑ کے پھر دیکھا، اور تاب نہ لاکر منہ پھیر لیا، قدموں کا رُخ دواخانہ کی جانب تھا، آخر دروازہ قریب آگیا، ڈاکٹر اُسوقت ایک بزدلی کے ارادہ پر جا ہوا تھا لیکن یہ بزدلی اُس بزدلی و پست ہمتی سے زیادہ نہ تھی جو اُسے روز اپنی خشمگیں و غضبناک بیوی کے سامنے محسوس ہوتی تھی! ڈاکٹر نے دواخانہ میں قدم رکھا اور دروازہ بند کرلیا۔۔

＊　＊　＊　＊　＊

سورج کی ایک کرن نے کھڑکی کی ایک درز سے رام پیاری کے چہرہ پر جھانکا، اُسکی آنکھ کھلی تو وہ کچھ دیر مبہوت سی بستر پر پڑی رہی، آنکھیں ملیں، چندھیا چندھیا کے سورج کی روشنی کو دیکھتی رہی، اُسے خیال آیا کہ اُسکا شوہر رات کو سویا نہیں، بستر خالی ہے، شاید کوئی مریض اُسے بہت سویرے اُٹھاکے لیگیا ہو، اُسے ضرور ملامت کرنی چاہیے، فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ رات ہی کو اُسنے اُسکو بُرا بھلا کہا ہے، گناہ یہ تھا، بیچارہ سگرٹ پی رہا تھا، اُسکی راکھ جھڑی اور فرش پر گرپڑی، رام پیاری کو ناگوار گزرا، اُسے سختی کے ساتھ ٹوکا، غریب نے سگرٹ بُجھا باہر پھینکدی، اپنے دل پر جبر کیا، کھانا کھانے کے بعد چُرٹ کے لطیف دھوئیں سے حظ حاصل کر رہا تھا، بیوی کو ناگوار ہے تو یہ قربانی بھی گوارا ہے، شوہر کی اس حرکت پر رام پیاری کو اور بھی غصہ آیا اور اول فول خدا جانے کیا کیا کہ گئی ـــــــ

رات کے خیال سے وہ خود بخود شرمائی، اکثر باتیں واقعی اُسنے سخت کہی تھیں۔!

اُسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ پہلے بھی اُسکے سخت سُست کہنے پر وہ رات بھر کرسی پر پڑا رہا اور بالکل نہ سویا، جس سے اُسے شدید نزلہ و زکام ہوگیا اور کئی مہینوں میں اچھا ہوا۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے ایک جُھرجُھری سی محسوس ہوئی، حقیقت میں اسنے اُسکی زندگی بدمزہ کر رکھی تھی، اب ڈاکٹر پریمی اُسکی نظروں کے سامنے تھا، اُسکی اصلی حالت میں وہ اُسے دیکھ رہی تھی، کمر قدرے خمیدہ ہوگئی تھی، ناہاتھ اور رخسار بے خون کے تھے، چہرہ پر غم و اندوہ نے جُھریاں ڈالدی تھیں، چلتے وقت اُسکی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں، گو وہ اپنے آپ کو سنبھالتا، آواز میں تھرتھراہٹ تھی اور آنکھیں دُھندلی۔ ایں! پہلے یہ یوں اتنا کمزور نہیں معلوم ہوا، کیا سے کیا ہوگیا، اب سے پہلے رام اپنی

کی آنکھیں گویا بند تھیں، اب وہ پیر فرتوت نظر آتا تھا!

آہ! اُس کا پیارا پریمی! فی الواقع وہ محبت کے قابل ہے! وہ اپنے دل میں یہ خیال زبردستی قائم کرنے لگی کہ اُس نے ہمیشہ پریمی پیارے کی اطاعت و فرمانبرداری کی ہے!

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اُسے اب خیال آیا، کہ اسکی ہٹ دھرمی نے اُس نازبردار شوہر کی کیا حالت بنا دی ہے، اُس غریب کی دوکانداری پھیکی تھی، گو وہ اپنے کام میں بہت محنت و جانفشانی کرتا تھا لیکن اُسکی قسمت نے اُسے غریب رکھا، وہ اُسے طعنے دیا کرتی کہ اُسکے ساتھی کیسے مالدار ہوگئے ہیں اور وہ ٹوٹی پھوٹی ہی حالت میں ہے، وہ اُسکے میلے اور بھدے کپڑوں پر اُسکے دُکھتے دل میں کچو کے لگاتی، گو بذاتِ خود اُسے اچھے کپڑے میسر تھے جنکو وہ اچھی طرح پہنتی، وہ بیچارا اپنا کام چلانے، اپنی حالت اچھی کرنے کی بہت ہی کوشش کرتا، اُسکے پاس سرمایہ اور رسوخ نہیں تھا۔ بایں ہمہ اُسکی کوششیں اپنی بیوی کو آرام پہونچانے پر مرکوز تھیں، لیکن رام پیاری ہمیشہ طعن و تشنیع دیتی، بینگ بیخ نکالتی، سخت و سُست کہتی، ایسے تیر و نشتر چبھوتی کہ پریم چند دل ہی دل میں بلبلا کے رہ جاتا۔ اور یہ اسکی حالت دیکھکے پھولتی اور اُسے زیادہ اذیت دیتی! رام پیاری نے سوچا کہ بے شک! میں نے ساری عمر اُسکو رنج و غم میں مبتلا رکھا، ہمیشہ اسکے لیے تپ دق بنی رہی!

اس احساس نے اُسے چونکا دیا۔ فوراً اپنے بستر پر سے اُٹھی اور زینے پر لپکی ہوئی گئی اور آہستگی سے پکارا، "پریمی!" "پیارے پریمی!" وہ زینے سے نیچے اُتری، ننگے ہی پیر بڑے کمرے میں گئی، وہ وہاں بھی نہ تھا، وہاں اُسکا ایک بھدا اور پرانا کوٹ لٹک رہا تھا، وہ اپنے پنجے کے بل کھڑی ہوئی اور اپنے آپ کو بلند کرکے اُس کوٹ کے کالر کو چوما جہاں پریم چند کے گلے کا میل جمع ہو کر چمک رہا تھا، اب وہ باورچی خانہ گئی، کیونکہ پریم چند سب سے پہلے اُٹھتا اور اپنی بیوی کے جاگنے سے پہلے آگ جلاتا اور پانی گرم کرتا کہ بیوی کو منہ دھونے کے لیے پانی تیار ملے۔ نوکر کی پروا نہ کرتا، ایسے ایسے بیسیوں موقعوں پر وہ خود اُسکا نوکر بننا پسند کرتا، باورچی خانہ میں پکارا "پریمی" وہاں ایک کرسی پڑی تھی، جسپر اکثر وہ لیٹ جایا کرتا تھا، اس کرسی کی پشت پر اُسکے سر رکھنے کی جگہ ایک گڑھا سا پڑ گیا تھا اور وہاں اُسکے سر کی چکنائی لگی ہوئی تھی، اس سفید بالوں والی نازنین نے جھک کے اُس جگہ کو چوما اور اپنے رخسار اُسپر ملے، پریمی اس جگہ بھی نہیں ہے، ضرور اپنے دوا خانہ میں ہوگا!

"پریمی" ! دواخانے کے دروازے پر کھڑی ہوکے انتظار کیا، اُسکے لبوں پر مسکراہٹ شوخی سے کھیل رہی تھی، اُسکے خیالات اپنے حسن و جوانی کے مرغزار بہاریں گلگشت کر رہے تھے، لیکن وہ زمانہ اب واپس نہیں آسکتا تھا۔ ان خیالات کے ہجوم میں وہ کمرہ میں آہستگی سے داخل ہوئی!

ڈاکٹر پریم چند ایک کرسی پر لیٹا ہوا تھا، اُسکا پہلو دروازہ کی طرف تھا، جس طرف سے رام پیاری داخل ہوئی، اور وہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کے نرم و نازک نیند سے پاک منظر کو اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اُسپر ایک سکون طاری تھا۔ رام پیاری محبت کے جوش اضطراب میں کانپ رہی تھی، وفور بیقراری میں اُسکے قدم ڈگمگائے، اُس نے "پریمی" کہا اور اپنے شوہر کی کرسی کے سامنے قریب ہی دوزانو جھک گئی، پہلے ہیں اُس نے داخل ہوتے ہی بُرا بھلا کہنا چاہا، اور حقیقت میں اُس نے ٹیڑھی آواز میں اُسے سخت سُست کہا بھی، پھر اُسکے ہاتھوں کو جو کرسی کے بازووں پر سے نیچے لٹک رہے تھے، اور صبح کی خنکی میں برف ہو رہے تھے، اپنے ہاتھوں میں لیا، اور سسکیاں لیتے ہوئی خود اپنے سر کو اُسکی رانوں پر رکھدیا اور رو رو کے کہنا شروع کیا کہ میں تمھاری گنہگار ہوں، ساری عمر تم کو تکلیف دی، کبھی آرام نہیں پہونچایا، تمھاری محبت کی قدر نہ کی، اب

قتل کر ڈالو ہمیں یا جرم اُلفت بخش دو　　لو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہم تمھارے سامنے!

اب وہ خاموش تھی، اور کلمۂ معافی سننے کے لیے ہمہ تن انتظار! ان باتوں نے پریمی کو اسکی گہری نیند سے نہ جگایا اور وہ اُسی طرح پڑا تھا، رام پیاری نے اُسکے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور اُنکے بہت سے بوسے لے ڈالے، ان ہاتھوں کو اپنے چھوٹے ہاتھوں سے تھپکا اور پھر اپنی پیشانی اُنپر رکھکے خاموش اُسکے جواب کا انتظار کرنے لگی لیکن پریمی کو نہ جاگنا تھا نہ جاگا!

رام پیاری برابر اُسی حالت میں جھکی ہوئی ہے اور جیسے ہم نے بچپن میں پریوں اور جنوں کی کہانیوں میں سُنا ہے، اب بھی وہ اُسی حالت میں اُسی طرح جھکی اپنے شوہر کے جاگنے اور جواب دینے کا انتظار کر رہی ہے!

محمد ظفر (ایم۔ اے ایل ایل بی) از گڑگانوہ

میسور اور سرنگاپٹم کی ایک جھلک

پیارے نظام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ میں ایک اور طولانی خط چند روز ہوئے لکھ چکا ہوں۔ اُسکے جواب کا انتظار کیے بغیر تمھیں یہ دوسرا خط اس لیے لکھنے بیٹھ گیا کہ اس عرصہ میں میں میسور اور سرنگاپٹم کی سیر کر آیا ۔ میسور بنگلور سے کوئی ستاسی میل ہے ۔ چار گھنٹے ریل کا سفر بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھا ۔ راستے کے پہاڑ، جھیل، جنگل اور دریاے کاوری کا منظر بہت دلکش تھا ۔ اور وقت بھی صبح کا تھا ۔ بارہ بجے دن کو ہم لوگ میسور پہونچے ۔ اور کسی ہوٹل میں جگہ نہ تھی ناچار ایک ہندو ہوٹل میں ٹھیرے ۔ عمارت بہت شاندار تھی ۔ مگر کھانا ہندوؤں کا کھانا پڑا ۔ دال بھات مختلف قسم کی ترکاریاں، اچار، چٹنی، دہی، گھی، قہوہ، چاے ۔ سب سے عجیب بات میسور میں یہ نظر آئی کہ باوجود خالص ہندو ریاست ہونے کے ہمارے وطن کا سا چھوت اوربچار نہیں ۔ ہر ہندو مسلمان کو جب سلام کرتا ہے تو السلام علیکم کہتا ہے ۔ کھانا اپنے پیتل کے ظروف میں کھلاتا ہے اپنے لوٹے میں پانی پلاتا ہے ۔ اور مسلمان کا جھوٹا برتن دھوتا ہے ۔ چھوتا ہے ۔ یہ لوگ معمولی ہندو نہیں ۔ برہمن اور بامن ہیں۔ بامن یہاں کی حکمراں ذات کا نام ہے یہ میسور میں بہت ترقی یافتہ ہیں ۔ تم نے آبِ حیات میں ولی دکنی کے تذکرے میں ولی کے نمونۂ کلام میں اکثر "بامن کی بیٹی" کا ذکر دیکھا ہوگا ۔ یہ وہی بامن ہیں ۔ ڈھیر (Dravadian نسل کے لوگ جو آج تک ڈوم چمار کی طرح میلے کام کرتے اور رہتے ہیں وہ بھی مسلمان کو "السلام علیکم اعلیٰ حضرت" کے لفظوں سے خطاب کرتے ہیں ۔

میسور میں مسلمان نہایت زبوں حالت میں ہیں ۔ کوئی پختہ مکان، کوئی اچھی دوکان کسی مسلمان کی نظر نہ آئی ۔ دو تین سڑے گلے گندے "اسلامیہ ہوٹل" ہیں جو پٹنہ کے محلہ گورہٹہ کے چاے خانوں اور چنڈو خانوں سے بھی بدتر ہیں ۔ مسلمانوں کی صورت پر اگر نظر پڑتی ہے تو بحیثیت سائیس اور کوچبان یا ٹٹ پونجیے بساطیوں کے ۔ کہتے ہیں کہ ہندو اگرچہ مسلمانوں سے مذہبی تعصب نہیں رکھتے مگر قومی عصبیت بہت رکھتے ہیں ۔ وہ انھیں پنپنے نہیں دیتے اور گورنمنٹ (میسور) انکی ترقی کا سامان نہیں کرتی ۔ سنتے ہیں کہ ایکبار لارڈ ہارڈنگ نے اپنی سیر میسور کے دوران میں از خود ریاست کا انتظام ملاحظہ کرکے یہ ریمارک کیا کہ

اتنے ملازمین میں مسلمان ایک بھی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اُسی دن دس بیس مسلمان (غالباً بالحاظ قابلیت) معزز عہدوں پر سرفراز کردیے گئے۔ اسکے بعد پھر روزِ اوّل۔

میسور کا شہر بہت بڑا ہے نہ چنداں خوبصورت۔ بازار میلے ہیں۔ صفائی کا انتظام عمدہ نہیں۔ شہر کا خاص حصہ جہاں جدید قصر شاہی اور باغ، میدان، اور عمدہ عمارتیں ہیں اور جسے سرکاری کوارٹر کہہ سکتے ہیں البتہ صاف خوبصورت اور شاندار بھی ہے مگر زیادہ شان جس چیز نے اس کو ارٹر میں پیدا کردی ہے وہ قدرتی منظر یعنی جھیل اور پہاڑ ہے۔ راجہ کا جدید قصر نہایت حسین اور رفیع الشان ہے۔ یہاں ایک باغ حیوانات (زو) بھی ہے جس میں سوا زرافہ یا تسترلنگ کے کوئی چیز کلکتہ کے زو کے مقابلہ میں قابلِ ذکر نہیں۔ زرافہ کی شکل تم نے مصور ڈکشنریوں میں دیکھی ہوگی۔ ممکن ہے کہ کلکتہ میوزیم میں بھی دیکھی ہو۔ اللہ نے اس جانور کے خلق میں عجیب جدت اور ندرت دکھائی ہے۔ ٹانگیں اور گردن اونٹ کی سی، سُم گھوڑے کے سے، سر ہرن کا سا، کھال چیتے کی سی، سینگ کی سی دو ہڈیاں سر پر نکلی ہوئی۔ قد اونٹ کے برابر بلکہ گردن شاید کچھ زیادہ لمبی مگر اس سے بھی عجیب تر ایک اور جانور دیکھا۔ ایک تین فٹ کے جنٹلمین سوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے ہاتھ میں پولیس بید لیے جانوروں کا ملاحظہ فرما رہے تھے مگر وہ خود ایک تماشا تھے۔ میں نے کہا کہ بہتر ہو کہ راجہ صاحب کو خبر دیکر انھیں بھی زو کے جانوروں میں داخل کرلیا جائے۔ مگر معلوم ہوا کہ واقعی راجہ صاحب بھی ہم لوگوں سے کم زندہ دل نہیں۔ وہ ایسے جانور کو کسی پنجرے یا احاطے میں بند کرکے رکھ تو سکتے نہ تھے، انھوں نے اسے جانوروں کا انسپکٹر بنا کر اور ۵۰ روپے تنخواہ مقرر کرکے آخر اپنے زو سے متعلق کر ہی لیا۔ وہ سارے دن جانوروں کا معائنہ (بے ضرورت) کرتے پھرتے ہیں مگر انھیں خبر نہیں کہ وہ خود تماشائیوں کا تماشا ہوتے ہیں۔ آپ اپنے خیال میں بڑے رعب داب اور شان سے رہتے ہیں۔ ان سے ہم لوگوں نے باتیں کیں۔ وہ بمبئی کے ساحل پر پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو عرب بتاتے ہیں۔ سیاہ فام ہیں۔ مونچھیں بڑی بڑی، داڑھی صاف۔ غرض یہ عجیب تماشا تھے۔

میسور کا قدیم شاہی محل اب راجہ کا میوزیم ہے۔ جہاں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے تبرکات کچھ رکھے ہوئے ہیں مگر کوئی نادر چیز نہیں۔ ہماری سمجھ میں زیادہ قابل قدر تبرکات برٹش گورنمنٹ کے قبضے میں ہیں۔ رنگین تصاویر بہت ہیں جن سے ان سلاطین کے طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ تصویر دیکھکر ہم سب کے دل بھر آئے جس میں ٹیپو سلطان کے اپنے بیٹے، معصوم، حسین شاہزادے باپ کی شہادت کے بعد اپنی ماں اور

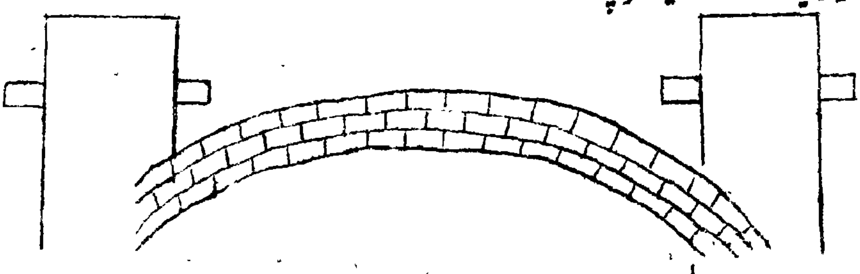
مستوراتِ محل سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ایک اور تصویر ہے جس میں ایک بھائی (شاہزادہ) انگریز جنرل کو دیوانی کا کاغذ حوالہ کر رہا ہے اور دوسرا اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک رہا ہے۔ ایک تصویر میں وہ منظر ہے جس میں ٹیپو سلطان تیر کھا کر گھوڑے سے گرے ہیں، ایک انگریز جنرل ان کی پیٹی کی طرف ہاتھ بڑھا کر انھیں گرفتار کرنا چاہتا ہے مگر اس زخم خوردہ شیر میں ابھی جان اور آن باقی ہے وہ تلوار نکال کر جانبازانہ و سرفروشانہ وار کرتا ہے اور اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک گر نہیں جاتا۔ ایک اور تصویر ہے جس میں ٹیپو سلطان کی لاش محل میں لا کر رکھی گئی ہے بائیں پر اسکے اعزا کا اضطراب نہایت موثر و دلدوز ہے۔ سارا محل نہایت بیش بہا اثاثہ اور اسباب سے آراستہ ہے مگر بحیثیت تاریخی تبرکات کے کچھ زیادہ وقیع میوزیم نہیں۔

میسور میں جھیل کے علاوہ جو قدرتی منظر قابلِ دید ہے وہ چوپاٹی پہاڑ ہے۔ اسکی چوٹی پر راجہ کا بنگلہ اور ذرا نیچے ایک بستی ہے۔ ایک ہزار زینے بنے ہیں جو برقی روشنی سے آراستہ ہیں۔ مگر ہم ۵۰۰ زینوں سے اوپر نہ جاسکے۔ بھوکے پیاسے تھے، اور تھکے ماندے۔ بنگلور کی طرح میسور میں بھی مسلمانوں کی زبان اُردو ہی ہے۔ اور ہندوؤں کی زیادہ تر کناری و ملایالم مگر تامل و تیلگو بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس سفر میں مجھ پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہوگئی کہ اُردو تمام انڈیا (ہندوستان و دکن) کی اسلامی زبان ہے اور ممالک متحدہ مع دہلی اور بہار کی مشترک قومی زبان۔

ایک دن رات میسور میں رہ کر سرنگاپٹم کی طرف لوٹا۔ سرنگاپٹم میسور سے آٹھ میل ادھر ہی ہے۔ پہلے ایک پانچ چھ میل کے وسیع شہر کو گھیرے ہوئے ایک عظیم الشان قلعہ تھا۔ مگر اب تمام آثارِ قدیمہ مٹا دیے گئے۔ صرف قلعہ کی فصیلیں کہیں کہیں رہ گئی ہیں۔ شہر اب ایک قصبہ ہے۔ سات آٹھ سو کے قریب کھپریل کے مکان ہیں۔ مسلمان خال خال ہیں اور تباہ حال۔ ایک مرہٹے کی کھانے کی دوکان میں آزادی سے کھانا کھایا۔ ایک طرف ہندو کھاتے ہیں اور اُسی دالان میں ایک طرف مگر متصل مسلمان۔ مرہٹے نے السلام علیکم سے تواضع کی اور رخصت کیا۔ بخلاف میسور کے سرنگاپٹم کے ہندو کچھ اُردو بول اور سمجھ لیتے ہیں۔ حیدر علی کی مسجد دیکھی۔ دو عظیم الشان مینارے ہیں۔ اوپر چڑھا۔ حیدر علی یا ٹیپو سلطان کے وقت کی جتنی مسجدیں میسور، سرنگاپٹم یا بنگلور میں دیکھیں ان سب کی قطع کلکتہ کی دھرم تلا والی ٹیپو سلطان کی مسجد کی سی ہے۔ قلعہ سے باہر میر صادق (وہ نمک حرام وزیر جس نے دشمنوں سے سازش کر لی تھی) کی قبر دیکھی۔ رسم ہے کہ ہر راہرو اس قبر پر ایک جوتا لگاتا ہے۔ ہم نے ایسا نہ کیا۔ شہر سے باہر ایک منارہ دیکھا جو اُس مقام کا نشان اور یادگار

ہے، جہاں ٹیپو سلطان نے ایک خاندان وزارت کی خاتون کو زنا کی علت میں پھانسی دی تھی۔ شہر سے کئی میل پر ایک مقام ہے جو گنبد کہلاتا ہے۔ یہ وہ متبرک مقام ہے جہاں شیران دکن حیدر علی اور اُسکا سپوت فرزند ٹیپو آرام کر رہے ہیں۔ انکے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ گنبد کے بغل میں بیلی کی قبر ہے جو حیدر علی کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا تھا۔ پلٹتے ہوے "دریا دولت" یعنے ٹیپو سلطان کا محل شاہی دیکھا۔ جو دریا کے کنارے واقع ہے۔ یہ محل راجہ نے آج تک جوں کا توں قائم رکھا ہے۔ دیواریں رنگا رنگ اور سنہری نقش و نگار سے معمور ہیں۔ میں نے اس سے زیادہ پر تکلف محل نہیں دیکھا۔ آج تک کبھی کبھار راجہ میسور رانی سمیت یہاں آکر ٹھیرتے اور اشنان کرتے ہیں اسی لیے اسکی مرمت ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں ایک سیاہ تہ خانہ بھی دکھایا گیا جسکے اوپر لکھا ہوا تھا کہ "اس تہ خانے میں انگریز سپاہیوں کو ٹیپو نے برسوں قید رکھا تھا"۔ اسی قسم کا ایک تہ خانہ بنگلور کے قلعہ میں بھی ہے جہاں انگریز فوجی افسر ایک عرصہ تک مقید رہ چکے ہیں۔ تمام آثار ڈھا کر برابر کر دیے گئے مگر یہ تلخ یادگاریں بہت احتیاط سے قائم رکھی جاتی ہیں۔ معلوم نہیں اس پالیسی میں کہاں تک عقل یا انصاف سے کام لیا گیا ہے۔

سب سے نادر چیز سرنگا پٹم میں ایک محراب ہے جو زمین پر کمان کی طرح بے ضرورت اینٹ اور چونے سے بنایا گیا ہے۔ ندرت یہ ہے کہ اسکے اوپر چڑھکر کودنے سے یہ کمانی کی طرح لچکتا ہے۔ انگریز حیران رہے کہ اس میں کیا اسرار ہے کہیں کہیں سے کھود کر دیکھا مگر پتہ نہ ملا۔



مقامی روایات | حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے متعلق انگریزی تاریخوں میں تم نے پڑھا ہوگا۔ اسکے معتبر و غیر معتبر ہونے سے ابھی ہمیں بحث نہیں۔ بحیثیت سیاح کے ہم صرف یہاں کی تاریخی روایات تمھاری دلچسپی کے لیے بیان کیے دیتے ہیں۔ ایک غریب نوجوان بیکس و بے یار و مددگار ایک ہندو زمیندار کا ملازم ہوا۔ گائے بھینس چرانا، اور انکی نگہبانی کرنا اسکی خدمت تھی۔ ایک دن اسکو گھر واپس آنے میں معمول سے زیادہ دیر لگی تو مالک جو قیافہ شناس تھا اور اپنے نوعمر ملازم کے حرکات و سکنات پر نظر رکھتا تھا اسے ڈھونڈھنے نکلا۔ جنگل میں دیکھا ہے کہ وہ سو رہا ہے اور ایک سانپ کنفوہ پھیلائے اُسکے سر پر سایہ کیے ہوے کھڑا ہے۔ زمیندار کی آہٹ پاکر وہ جھاڑیوں میں جا رہا۔

مالک نے اس نظارہ سے کوئی خاص منجمانہ نتیجہ اخذ کیا۔ اور ایکدن اُس سے پوچھا کہ تو اگر بادشاہ ہو جائے تو مجھے کیا دے گا؟ ملازم اس تمسخر پر حیران ہوا۔ آخر اُسکو واپس کرتے ہی بن پڑی کہ اگر میں بادشاہ ہو جاؤں تو آپ کو وزیر بناؤنگا۔ زمیندار نے کاغذ پر یا قرارنامہ لکھوالیا اور دستخط کرا لیے اور اسے کچھ سرمایہ دیکر رخصت کر دیا کہ جاؤ کچھ کاروبار کرو۔ یہ ملازم ریاست میسور میں جو اُس وقت بھی ایک ہندو ریاست تھی سپاہیوں میں داخل ہوگیا۔ اور اپنی ذہانت و شجاعت سے ترقی کرتا ہوا اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوا۔ قصہ مختصر یہ ملازم حیدر علی ہوگیا۔ ریاست پر قابض ہوگیا اور ایک نہایت قوی سلطنت کی بناڈالی۔ جابجا قلعے بنوائے۔ اور جو کچھ کیا تاریخ میں روشن ہے۔ جب یہ بادشاہ ہوا تو زمیندار اپنا اقرارنامہ لیے دربار میں پہونچا۔ حیدر علی نے اپنے قول کے مطابق اُسے فوراً اپنا وزیر اعظم بنایا۔ یہی زمیندار تھا جسکا نام پورنیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ٹیپو کی انگریزوں سے جنگ کے زمانہ میں وہ انگریزوں سے ملگیا اور ٹیپو کے زوال کے بعد میسور کی ریاست قدیم ہندو راجہ کی اولاد کے حوالہ کی گئی۔ چنانچہ موجودہ راجہ اُسی کی اولاد ہیں۔

چنانکہ دست بدست رسید ست ملک بما ہمچنیں بدستہائے دگر بخواہد رفت

کہتے ہیں کہ ریاست میسور پر ایک خاندان دو پشت سے زیادہ حکمرانی نہیں کرنے پاتا۔ یعنی جائز وارث نہیں رہتا۔ غیر قوم سے ولیعہد کو متبنیٰ کرنا پڑتا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار جو حیدر علی و ٹیپو سلطان کے مقبرے پر درج ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ یہ اپنے کو صرف دکن کا بادشاہ نہیں بلکہ حامیِ دین، غازی، اور امیر سمجھتے تھے اور اپنی جنگوں کو جہاد سمجھتے تھے۔

مغربی محراب

آن سید شہدائے عرب سبط نبی لخت جگر فاطمہ و جان علی
از فاطمہ و حیدر یعنی ٹیپو سلطان شہیداں شدہ از شوق دلی

مشرقی محراب

از فاطمہ زوجہ علی شیر خدا شد سبط نبی سید شہدا پیدا
این فاطمہ زاد از علی حیدر ٹیپو سلطان کہ گشت شاہ شہدا

جنوبی محراب

در ملک عبا تاافن علی حیدر مفتوح شدہ ہفت قلاع خیبر
این حیدر و کمنی دول کرناٹک گشتند مطیع یک فدیو کشور

شمالی محراب

:شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے ... بدیں جانباز سلطانے کہ آمد شد چو مہمانے

(اگلی تینوں رباعیوں میں کنایہ ہے اس توارد قدرتی کی طرف کہ ٹیپو کے باپ کا نام حیدر علی تو تھا ہی ماں کا نام بھی فاطمہ تھا۔ اور علیؓ و فاطمہؓ کے جگر گوشہ کی طرح یہ بھی شہید ہی ہوا۔)

ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ ... خون خود ریخت فی سبیل اللہ

مصیبۃ ما اشتہا ازخہتا ... : ہب فخر الروم و الہند کلھا

۱۳ ... ۱۲ھ

تاریخ :۔ حامیِ دیں شہ زمانہ برفت ۔ شمشیر گم شد

محمد مسلم عظیم آبادی (از بنگلور)

وہ نزع میں آ گئے سرہانے ... دکھلایا اثر مری دعا نے
ہے موسمِ گُل کی آمد آمد ... بلبل کے سنیں گے اب ترانے
دردِ غمِ ہجر سے چھڑایا ... احسان کیا ہے یہ قضا نے
تجدیدِ تصور پر تُلا ہوں ... اچھا یہ اثر کیا سزا نے
اصرار سے آج سُن رہا ہوں ... گذرے ہوئے قصے اور فسانے
شوخی سے وہ بڑھ کے پھیر لیے کیوں ... روکا ہے اُنھیں مگر حیا نے
واعظ کو پلائے میکشوں نے ... دو ایک بہانے ہی بہانے
میں نے تو سنا دی حالتِ دل ... اب جانے وہ مانے یا نہ مانے
ہوتے رہیں زخم لذت اندوز ... رگ رگ کے لگائیے نشانے
دزدیدہ نظر سے مے کو دیکھا ... زاہد کی نگاہِ پارسا نے
اللہ ری سیری تیرہ بختی ... وہ شمع کو آئے ہیں بجھانے
حسرت کو غیر وفا کی کر دی ... نگہت تری آہِ نارسا نے
لائی ہے شمیم زلف نگہت ... احسان کیا ہے یہ صبا نے

(نگہت)

نظرے خوش گزرے

اقبال، ہمارے قومی شاعر نے حال ہی میں رموزِ بیخودی کے نام سے ایک مثنوی بہ زبان فارسی لکھی ہے جس میں حیاتِ ملتِ اسلامیہ کے اسرار بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے قبل دو سال ہوئے اسرارِ خودی کے نام سے ایک مثنوی شایع ہو کر حسنِ قبول حاصل کر چکی ہے۔ اگرچہ خواجہ حافظ پر اقبال کی خردہ گیری نے بہت سے اصحاب کو کبیدہ بھی بنا دیا۔ میری خرابیِ صحت کے باعث اسرارِ خودی پر کوئی بسیط ریویو الناظر میں نہیں نکل سکا رموزِ بیخودی کے متعلق انشاء اللہ میں کئی نمبروں میں لکھوں گا۔ سردست یہ تعارف کافی ہے۔

پولیٹیکل گرگٹ کے نام سے ایک رسالہ مکرمی شیخ ضیاء الحق صاحب سابق اڈیٹر اخبار پیشوا نے مرتب کیا ہے "یہ بنظر افادہ و آگاہی اہلِ ملک و قوم اور مخصوص قوم فروش، شہرت کے غلام خود نما لیڈروں کی عبرت کے لیے شایع کیا گیا ہے جس میں ملکی اخبارات اور ملک کے مستند اہل الرائے اصحاب کے وہ خیالات جو ظفر علی خاں سابق اڈیٹر زمیندار کی نمایاں تبدیلی۔ عبرتناک مدارجِ زندگی، بے اصولی۔ اندازِ طبیعت، طرزِ عمل اور ان کی طامع، خود غرض، متلون طبیعت کی کارستانیوں، خود نمائیوں، اخلاقی کمزوریوں، سیاسی قلابازیوں اور چھچھورے پن پر لکھے گئے ہیں بہ اضافہ ایک دیباچے اور جامع مانع تمہید کے جمع کر دیے گئے ہیں"۔ دیباچہ و تمہید کے درشت لہجے پر ہمارے عزیز دوست قاضی عبد الغفار صاحب اڈیٹر جمہور نے کسیقدر ناک بھوں چڑھائی ہے مگر غلیظ کے ٹوکرے میں ڈھیلا پھینکنے کے بعد عفونت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ بحث ہی ایسا نہیں کہ بہ آزادی اور صاف گوئی کے ساتھ کچھ لکھا جائے اور متانت و سنجیدگی کے بار سے سبکدوش نہ ہونا پڑے۔ سعدی جیسا مصلحِ قوم بھی اپنی گلستاں کے دامن کو ان کانٹوں سے نہ بچا سکا۔ اس لیے ہم شیخ ضیاء الحق صاحب پر عتاب کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ پولیٹیکل گرگٹ کی قیمت ۱۲؍ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ شیخ ضیاء الحق۔ ہاپوڑ۔ ضلع میرٹھ۔

انجمن اعانتِ نظربندانِ اسلام دہلی نے سلسلۂ حالاتِ نظربندانِ اسلام کا تیسرا رسالہ شایع کیا ہے جس میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی کے مختصر سوانح و حالاتِ اسیری درج ہیں۔ آخری حصہ میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں عام طور پر لوگ ان سے ناواقف ہیں۔ اس لیے یقین ہے کہ یہ رسالہ ذوق سے پڑھا جائیگا۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ:۔ صدر دفتر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام۔ فتحپوری۔ دہلی۔

الناظر کی پرانی جلدیں

جولائی سنہ ۱۹۰۹ء سے دسمبر سنہ ۱۹۱۷ء تک سترہ ششماہی جلدیں شائع ہوئی ہیں جنمیں سے کم و بیش اکثر موجود ہیں کپڑے کی مجلد جلدیں بنی ہیں اور حسب ذیل قیمتوں پر دیجائیں گی

جلد اول	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء)	عمہ
جلد دوم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۰ء)	عہ
جلد سوم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء)	عمہ
جلد چہارم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۱ء)	۱۲ر
جلد پنجم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء)	۱۲ر
جلد ششم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۲ء)	عمہ
جلد ہفتم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء)	عہ
جلد ہشتم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۳ء)	عہ
جلد نہم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء)	عہ
جلد دہم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۴ء)	عہ
جلد یازدہم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء)	عہ
جلد دوازدہم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۵ء)	عہ
جلد سیزدہم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء)	عہ
جلد چہاردہم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۶ء)	عہ
جلد پانزدہم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء)	عہ
جلد شانزدہم	(جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۱۷ء)	عمہ
جلد ہفدہم	(جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۷ء)	عمہ

(نوٹ) مکمل سٹ تھوڑے ہی ہیں لہذا جو صاحب خواہاں ہوں جلد منگائیں مکمل سٹ لینے والوں سے مجلد ۱۷ جلدوں کی قیمت صرف ۱۵ روپے لیجائیگی۔

اطلاع۔ الناظر کا سب سے پرانا پرچہ جو علحدہ مل سکتا ہے اسمیں "مذہب کی ضرورت" "معاشرت انسانی اور عورتوں کی منزلت" "حسن کامل" "انگریزی تیرستان کا ایک سبق" اور "آزادی" پڑھنے کے قابل مضامین ہیں قیمت ۸ر

مینیجر الناظر لکھنؤ

کلیات احمد

(از عمدۃ الابرار شاہ حافظ احمد حسین خاں شاہجہانپوری قدس سرہٗ)

یہ بے بہا اور نادر کلیات ایک مقدس خدا رسیدہ صوفی صافی کے پاک نفوس کا ذخیرہ اور عمر بھر کا خزینۂ راز و سرمایۂ ناز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلام نہیں سراسر اعجاز ہے اسکا ایک ایک شعر اسکا عشق و محبت کا دفتر اور دل درد آشنا کے حق میں تیر و خنجر ہے عشق حقیقی و مجازی کو ہمرنگ بنایا اور دریا کو کوزہ میں بند کر دکھایا ہے ایسے ہی کلام سے الشعراء تلامیذ الرحمٰن کا پتہ ملتا اور المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کا اسرار سربستہ کھلتا ہے۔ یہی سخن سحر آفریں پر اہل طریقت لداده و وارفتہ اور اس خدنگ ناز و ادا کے کشتہ ہیں یہی وہ غزلیں ہیں جنسے بزم سماع قلقلہ کا منظر دکھاتی اور ہر اہل دل کو بسمل وار زمین پر لٹاتی ہے سب سے بڑھکر یہ ہے کہ کلام ہی اردو کا مجموعہ گویا خمخانہ وحدت کی مئے دو آتشہ ہے پھر زبان بھی شستہ و رفتہ ہے۔ ہر طرح سے یہ کلیات اس قابل ہے کہ ہاتھوں ہاتھ خرید لیا جائے اور طوق گلو و حرز جاں بنایا جائے۔ لکھائی و چھپائی عمدہ۔ کاغذ سفید۔ قیمت مع محصول ڈاک عمہ

ملنے کا پتہ۔ بشیر احمد۔ مکان منشی مولا بخش صاحب۔ پیر جلیل۔ لکھنؤ

سے اندلس پر عرب فاتحوں نے حکومت کی ویسی حکومت اُندلس کو کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ یہ بتلانا مشکل ہے کہ ان لوگوں میں اس انتظام کا سلیقہ کہاں سے آیا تھا ۔ اس لیے کہ وہ تو سیدھے اپنے عرب کے میدانوں سے آئے تھے اور فتوحات کی سرعت سے انھیں بہت ہی کم فرصت ملی تھی کہ اجنبی قوموں پر حکومت کرنے کا فن حاصل کر سکیں ۔ انکے مشیروں میں سے بعض یونانی و اسپینی تھے مگر اس سے بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ خود یہی مشورہ دینے والے اور جگہ اسی قسم کے نتیجے بالکل پیدا نہیں کر سکتے تھے اور اسپین کا سارا انتظامی سلیقہ اتنا بھی کر نہ سکا تھا کہ قوم قوط کی بالادستی کو اُسکی رعایا کے لیے قابل برداشت بنا دے ۔ برخلاف اسکے عربوں کی حکومت میں وہاں کے لوگ بہیئت مجموعی راضی و شاکر تھے (یعنی اس قدر راضی و شاکر جس قدر ایسی قوم کا راضی ہونا ممکن ہے جسکے حکمراں مختلف قومیت و مذہب کے لوگ ہوں) اور اُس وقت سے کہیں زیادہ خوش و خرم تھے جبکہ اُنکے بادشاہ اُسی مذہب کے تھے جس میں برائے نام وہ بھی داخل تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں کو جو مشکل مذہب کی وجہ سے پیش آئی وہ ابتدا میں بہت ہی خفیف سی تھی گو بعد کو تکلیف دہ ہو گئی ۔ اسپین والے جس درجہ کے عیسائی تھے اُسی درجے کے مجوسی بھی تھے ۔ اُس جدید مذہب نے جسکی قسطنطین نے اشاعت کی تھی عامہ خلائق پر جو اُس وقت تک نمایش کے لیے رومی وضع رکھتے تھے بہت ہی کم اثر ڈالا تھا ۔ جس چیز کی ان لوگوں میں کمی تھی وہ مذہب نہیں بلکہ ایک ایسی قوت تھی جسکی وجہ سے امن و فراغت میں زندگی بسر کر سکیں ۔ اور یہی شے اُنکے عرب آقاؤں نے اُنھیں عطا کی ۔

اوائل میں تو بلاشبہہ ایک مختصر سی مدت ایسی گذری تھی جس میں کچھ اُلجھن اور کسی قدر جلانا ۔ لوٹنا ۔ قتل عام کرنا واقع ہوا تھا لیکن عرب عاملوں نے جلد اس کا انسداد کر دیا جب ہر شے اطمینان کی حالت میں ہو گئی تو رعایا کو بدرجۂ اتم یہ معلوم ہوا کہ ہم پہلے سے کچھ بدتر حالت میں نہیں ہیں ۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ محسوس کرنے لگے کہ حکمرانوں کی تبدیلی سے ہم نفع میں رہے ۔ اُنھیں اجازت ہو گئی کہ خود اپنے قوانین اور حکام باقی رکھیں ۔ خود اُنھیں

کی قوم کے عامل اضلاع کا انتظام محصولوں کی تحصیل اور اُنکے آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ کرتے تھے۔ شہریوں کی متوسط جماعتیں بجائے اسکے کہ مصارف سلطنت کا سارا بوجھ اُنکے سر پڑے صرف جزیہ ادا کرتی تھیں جسکی شرح کچھ ایسی سخت تعداد کی نہ تھی اور کُل ذمہ داریوں سے بَری تھیں۔ البتہ اگر قابل زراعت اراضی اُنکے قبضے میں ہوتی تھی تو جزیہ کے علاوہ اُنکو خراج یعنی زمین کا محصول بھی دینا پڑتا تھا۔ جزیہ کی شرح دینے والوں کی حیثیت کے موافق مختلف تھی۔ یعنی سالانہ بارہ درہم سے لیکر اڑتالیس درہم تک جسکو اس زمانے کے انگریزی سکّے کے حساب سے تین پونڈ سے لیکر بارہ پونڈ تک سمجھنا چاہیے۔ اور چونکہ اُسکی تحصیل بارہ ماہانہ قسطوں میں ہوتی تھی اس لیے اُسکا ادا کرنا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ جزیہ کُفر کا جرمانہ تھا۔ یہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور برعکس اسکے خراج جو اراضی کی حیثیت پیداوار کے موافق تعداد میں مختلف ہوتا تھا عیسائیوں۔ یہودیوں اور مسلمانوں سے یکساں لیا جاتا تھا۔ بطور قاعدۂ کلیہ کے جائدادیں قدیم مالکوں اور شہریوں کے متعلق اُسی طرح سے رہیں جس طرح اس فتح سے پہلے تھیں۔ فی الحقیقت وہ زمینیں جو کلیسا اور ایسے زمینداروں کی تھیں جو شمال کے پہاڑوں کو بھاگ گئے تھے ضبط کر لی گئی تھیں مگر پھر ان میں بھی یہ حالت تھی کہ جو مزدورے ان اراضیوں میں کام کیا کرتے تھے وہی اُنکے کاشتکار باقی رکھے گئے اور اُن سے صرف یہی مطلوب تھا کہ اپنے مسلمان مالکوں کو فلاں رسدی سے پیداوار دیا کریں اور یہ رسدی مختلف تھی یعنی ایک ثُلث سے لیکر چار خُمس تک۔ بعض اوقات میریڈا اور اُوری ہیولا جیسے شہروں نے ان فاتحوں سے نہایت ہی خاطر خواہ شرائط حاصل کیے اور ایک معین خراج ادا کرنے پر اپنے اسباب و اراضی پر قابض رہنے دیے گئے تھے۔ بدترین حالت میں بھی عیسائیوں سے باستثناء جزیہ کے کسی طرح اُنکے مسلمان پڑوسیوں سے زیادہ سنگین خراج نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ اِن لوگوں کو ایک ایسا حق حاصل ہوا تھا جسکی قوطی بادشاہوں کے زمانے میں بھی اُنھیں اجازت نہیں ملی تھی یعنی وہ اپنی زمینوں

کو منتقل کرنے کے مجاز تھے۔ مذہبی آزادی میں انکو کوئی موقع شکایت کا نہ تھا۔ بجائے اسکے کہ وہ مذہب کی وجہ سے دِق کیے جائیں اور تبدیلِ مذہب کے لیے اُنپر جبر کیا جائے جیسا کہ قوط یہودیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے عربوں نے اُنکو چھوڑ دیا کہ جس چیز یا جس شخص کی چاہیں پرستش کریں۔ اور بیت المال کے لحاظ سے یہ جزیہ اس قدر قابل قدر تھا کہ سلاطینِ قرطبہ اشاعت اسلام کے بڑے جوش کو جس سے سلطنت آمدنی کے ایسے مفید ذریعے سے محروم ہو جاتی زیادہ تر دبانے کی طرف مائل تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عیسائی اس نئی حکومت سے خوش تھے اور علانیہ اسکا اقرار کرتے تھے کہ عربوں کی حکومت ہمارے نزدیک فرنگیوں یا قوط کی حکومت سے زیادہ تر پسندیدہ ہے۔ اور تو اور اُنکے مذہبی مقتدا بھی جنکا سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا اس تبدیلی سے اولاً صرف بہت ہی کم غیظ میں آئے جیسا کہ اُن قدیم وقائع سے ظاہر ہوتا ہے جو ۷۵۴ء میں قرطبہ میں لکھے گئے اور بیجا کے رہنے والے رہبان اسی دَور کی طرف منسب ہیں۔ اس نیک بخت رہبان کو ایسے ناپاک اتحاد کا بھی عار نہ آیا جیسا کہ رزریق کی بیوہ اور موسیٰ کے بیٹے کا باہمی ازدواج۔ لیکن عمدہ ترین ثبوت اس بات کا کہ عیسائی اپنے نئے حکمرانوں سے راضی تھے یہ واقعہ ہے کہ آٹھویں صدی کے اندر ایک مذہبی بغاوت کا بھی ظہور نہ ہوا۔

سب سے بڑھکر یہ ہے کہ غلام جنکے ساتھ قوط اور رومیوں نے ظالمانہ بُرا سلوک کیا تھا اس تبدیلی پر اپنے آپ کو مبارک باد کہتے تھے۔ غلامی نیکوکار مسلمان کے اعتبار سے ایک بہت ہی نرم اور انسانیت کی چیز ہے۔ پیغمبرِ عرب درحالیکہ ایک قدیم طریقے کو جو اسلام کے ملنساری کے اصولوں سے باانیہمہ مخالف تھا بالکل اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے حتی المقدور غلامی کی سختیوں کو نرم کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہ ہے کہ تمھارے ہی بھائی تمھارے غلام ہیں: اس لیے اس شخص کو جسکی نسبت تقدیرِ الٰہی یہ ہوئی ہے کہ اپنے ہی بھائی کا غلام بنے اُسکا بھائی وہی کھانا دے جو وہ خود کھاتا ہے اور وہی لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے اور اُسکو کسی ایسی چیز کے کرنے کا حکم نہ دے جو اُسکی طاقت سے باہر ہو .... وہ شخص جو

اپنے غلام کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتا ہے فردوس میں داخل نہیں ہونے کا" ——— مسلمانوں کے ثواب کے کاموں میں کوئی امر غلام آزاد کرنے سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تخصیص کے ساتھ بیجا ضرب یا دوسرے گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا ہے۔ اندلس میں اُن زمینداروں کے غلام جو عیسائیوں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں قریب قریب چھوٹے اجارہ داروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُنکے مسلمان آقاؤں نے جنکا پیشہ لڑائی تھا اور جو ایسے ذلیل کام کو جیسا کہ زمین کا جوتنا ہے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے انھیں اپنی خوشی کے موافق کاشت کرنے کو آزاد چھوڑ دیا تھا اور وہ صرف پیداوار کا واجبی حصہ چاہتے تھے۔ عیسائیوں کے غلاموں کے لیے بجائے اسکے کہ وہ مدت العمر کی غلامی میں مایوس ہو کر پڑے رہیں اب نہایت ہی سیدھا سادہ راستہ آزادی کا کھُل گیا تھا۔ اُنکو صرف یہ کرنا پڑتا تھا کہ اپنے قریب کے کسی ذی وقعت مسلمان کے پاس چلے جائیں اور ایمان کا کلمہ" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ" اُسکے روبرو پڑھ ڈالیں اور فوراً آزاد ہو جائیں۔ اس طرح قبول اسلام کے ساتھ ساتھ آزادی چلتی تھی اس لیے کوئی حیرت کا مقام نہیں ہے کہ ہم اسپین کے غلاموں کو سرعت کے ساتھ نیا دین قبول کرتے اور اُسکے ذریعے سے آزاد ہوتے دیکھتے ہیں۔ کیتھولک پادریوں نے بہت ہی کم شفقت اس امر کے لیے گوارا کی تھی کہ عیسائی مذہب اُنکے دلوں میں راسخ ہو جائے ان بیچاروں کو اپنی زمینداریوں کی خبر گیری اور امیروں کی روحوں کی اصلاح سے فرصت کب تھی جو جاہلوں کی روحانی ضرورتوں کے لیے تکلیف اُٹھاتے۔ اور چونکہ آدھے مجوسی آدھے عیسائی خالی الذہن تھے اس لیے اُنکے تقلید پسند دل پر شاید یکساں طور پر سمجھ میں نہ آنے والے اسلام کا قبول کر لینا کچھ سخت چیز نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی طرح صرف غلام ہی اس نئے مذہب کے قبول کرنے والے ہوں۔ بہت سے بڑی بڑی جائداد والے اور ممتاز آدمی مسلمان ہو گئے یا تو اس لیے کہ جزیہ سے بچیں یا اس لیے کہ اُنکی زمینداریاں محفوظ رہیں، یا اس وجہ سے کہ اس خالق کے بیانِ خدا شناسی کی سادہ عظمت کو سچے دل سے اُنھوں نے

پسند کیا۔ ان نومسلموں یا مرتدوں نے آخر سلطنت کو کچھ تکلیف دی جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔ چونکہ تبدیل مذہب مساوات پر مشتمل تھی یہ نومسلم برابری کے درجے میں تو آجاتے تھے لیکن حقیقت میں اُنکو مساوی حقوق اور رعائتیں نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ یہ سلطنت کے عہدوں سے خارج رہتے تھے اور مسلمان اُنھیں شبہے کی نگاہ سے دیکھتے اور اہل غرض نومسلم اور ایسے لوگوں میں سمجھتے تھے جو دولت کے لیے اپنی روحوں کو بیچتے ہیں۔ آخر میں یہ تفرقے مٹ گئے لیکن سخت اختلافات اور نیز شورشوں کے بعد۔

اُس حد تک کہ مفتوحین کا تعلق تھا ہم نے دیکھا ہے کہ عربوں کا اندلس کو فتح کرنا بہیئت مجموعی نفع بخش تھا۔ اس نے بڑے بڑے امرا اور کلیسا والوں کی حد سے بڑھی ہوئی زمینداریوں کو مٹایا اور اُنکو چھوٹی چھوٹی ملکیتیں بنادیا۔ متوسطین کے سروں سے بھاری بوجھ اُٹھا دیا اور محصولوں کو محدود کر کے صرف کافروں سے جزیہ اور مسلمان و عیسائی سے مساوی طور پر خراج لینے پر اکتفا کیا۔ اور غلاموں کے کثرت سے آزاد کرنے کی رغبت دلائی اور جو آزاد نہ ہوئے اُنکی حالت بہت زیادہ سُدھار دی اس لیے کہ یہ لوگ اب اپنے غیر کاشتکار مسلمان آقاؤں کی ملازمت بھی خود مختار اجارہ دار کی حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن فاتحین کے اعتبار سے یہ حالت برعکس تھی۔ یہ خیال کرنا کہ عرب جو ایسی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ نصف مہذب دُنیا میں پھیل گئے۔ اصلی معنی میں کوئی متحد لوگ تھے بڑی بھاری غلطی ہے۔ یہ امر واقعیت سے اس قدر دور تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حیات کے زمانے میں بھی اُن میں ظاہری اتحاد قائم رکھنے کے لیے اپنی ساری مدبرانہ دانشمندی اور کُل معجز نما ذاتی اقتدار صرف کرنا پڑا۔ یہ عرب بہت سے تخالف قبیلوں اور جرگوں کا مجموعہ تھے جن میں سے بہتیرے قبیلے بہت سی نسلوں تک آپس میں خونخوار لڑائیاں لڑتے رہے تھے اور جن میں سے کل ایک دوسرے کے ساتھ ایسی خاندانی رقابت رکھتے تھے جو کبھی پورے طور سے نہیں مٹی۔ اگر جدید قائم شدہ اسلامی سلطنت ملک عرب ہی کے حدود میں محدود رہتی تو کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے

کہ متعدد قبیلوں کی رقابتیں بہت جلد اُسکو مٹا چھوڑتیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی قبیلوں کی عام شورشیں شروع ہوگئیں۔ اسلام اک پائدار و عالمگیر مذہب صرف اُس وقت ہوگیا جب اُس نے اپنے آپ کو سلاحِ جنگ سے آراستہ کیا اور دینی جنگجو (مجاہد) بنا۔ ملک گیری کی رَو نے اس دین کی جان بچالی۔ عربوں نے تھوڑے عرصے تک اپنی خونخوار رقابتوں کو اس لیے تہ کر رکھا کہ مالِ غنیمت کی پُرشوکت تلاش میں باہم شریک ہوں۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ملک گیری کی گرمجوشی میں حرارتِ دینی کا ایک قوی عنصر ملا ہوا تھا۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے لڑتے تھے کہ خدا اور اُسکے رسول کے دشمنوں سے مقابلہ ہے اور جو کوئی خدا کی راہ میں مارا جائیگا بہشت اُسکے لیے آغوشِ تمنا کھولے ہوے ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ قیصر و خسرو کی دولتوں اور آس پاس کی سلطنتوں کی زرخیز زمینوں اور خوشحال شہروں کو بھی مسلمانوں کے اُس جوش میں جو وہ اپنے دین کے پھیلانے میں دکھاتے تھے بہت کچھ دخل تھا۔

اِدھر ملک گیری کا رَو پائدار قبضے کے امن و عافیت سے بدلا اُدھر مختلف قسم کی رقابتیں اور عداوتیں جنکو حملے کی ہلچل اور منفعتوں نے کسی درجے تک دبا رکھا تھا خطرناک مستعدی کے ساتھ اُبھر پڑیں۔ قبائل عرب کی باہمی تفرق کا خیال اُس وسیع مملکت کے کُل حصوں میں پھیل گیا جسکو ان لوگوں نے تابع فرمان کیا تھا اور اُس خلیفہ پر بھی اسکا اثر پہونچا جو دمشق میں تھا۔ نہایت دُور دست علاقوں کیلیے عاملوں کی نامزد کرنے میں بھی فرقیوں کا خیال پیش نظر رہتا تھا۔ اسپین میں بھی جہاں امیر اندلس کا تقرر یا تو امیر افریقیہ کرتا تھا یا خود خلیفہ۔ اِن جماعتی تفرقوں نے سلطنتِ اسلامیہ کے اول پچاس برسوں کے آرام و عافیت میں سخت خلل ڈالا۔ بہت سے امیروں کا تقرر یا موقوفی یا قتل اسلیے عمل میں آتا تھا کہ بعض ایسی باغی جماعت کے فرمان کی تعمیل کیجاتی تھی جو نہیں چاہتی تھی کہ جماعت مدینہ کے کسی شخص کو امارت دی جائے۔ یا قبیلۂ قیس کے کسی شخص کو پسند نہیں کرتی یا جماعتِ یمن کے کسی رُکن کے تقرر پر معترض ہوتی تھی۔ اور اسپین میں مسلمانوں کے غلبے کی ساری تواریخ کے اندر یہ فساد انگیز اقتدار برابر سلطنت کو ضرر پہونچاتا رہا۔

علاوہ بریں اندلس میں عربوں کی مختلف معاند جماعتوں کے سوا ایک اور اہم باعث قابلِ لحاظ تھی۔ اس جزیرہ نما کو تقریباً تمام و کمال طارق اور اُسکے بربروں نے فتح کیا تھا اور یہ بربری (کہ اصل مُراکشی وہی تھے۔ اگرچہ مراکشی کا لفظ سہولت کے لیے عرب و بربری دونوں پر مخلوطاً بولا جاتا ہے) اس جدید حالت کے اک بڑے عنصر تھے۔ یہ لوگ رومی نما اہلِ ہسپانیہ کی طرح خالی الذہن نہ تھے بلکہ ایک ایسی قوم تھے جو جوش و ستعدی سے معمور تھی۔ بربروں نے اپنے کوہی قلعوں اور اُن مضبوط میدانی مقاموں میں جو مصر سے بحر اطلانتک تک برابر چلے گئے تھے اپنے متعدد اور بہت متمائز جرگوں کے ذریعے سے عربوں کی ایسی ہولناک مزاحمت کی تھی جو روم و فارس کی قواعدداں سپاہ بھی نہیں کر سکی تھی۔ بہت سی باتوں میں وہ اپنے حملہ آوروں کے مماثل تھے۔ وہ سب عربوں کی طرح قبیلے کے آدمی تھے۔ اُنکے انتظامی خیالات مثل اُنکے جمہوری تھے اور اُنھیں کی طرح امرا کے خاندان کی تعظیم بھی اُن میں تھی جس نے جاہلوں میں سے خالص جمہوری حکومت کی پُرخطر خاصیتوں کو دُور کر دیا تھا۔ خود اُنکی جنگ کا طریقہ بھی ٹھیک عربوں ہی کا سا تھا۔ ستر برس تک یہ دونوں خانہ بدوش قومیں باہم لڑتی رہیں اور جب آخر میں عرب غالب بھی آئے تو اس وجہ سے نہیں کہ اُن لوگوں نے صریح طور پر اطاعت قبول کر لی ہو بلکہ ایک گونہ رضامندی سے۔ بربریوں نے عرب کے امیر کو ساحل کے قریب دارالامارۃ قائم کرنے دیا لیکن خود اپنے آپس میں اپنی ہی جمہوری حکومت باصرار قائم رہنے دی۔ اور اس بات کے متقاضی ہوے کہ اُنکے دشمن اُنکے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کریں نہ کہ خادموں کا سا۔ اس برادرانہ طریقے کا ایک مدت تک تو عمدہ اثر ہوا۔ بربریوں نے جو ہمیشہ سے نہایت ہی زود اعتقاد تھے سرعت کے ساتھ نئے دین کو قبول کر لیا۔ اور قبول بھی اس جوش کے ساتھ کیا کہ خود عربوں کے وسواسی دل اس قسم کا جوش پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ بہت ہی جلد ملک بربر مذہبی انحراف کا ماویٰ و ملجا بن گیا۔ اسلام کے خشک مسائل میں بہت جلد زیادہ تر ایسے متصوفانہ و جذباتی عناصر کے پیوند لگ گئے جو تخیلی دل و دماغ ہر دین و مذہب میں جلد لگا سکتے ہیں اور

اپنے مسائل کو پھیلانے میں اُن منحرف المذہب مسلمانوں کے لیے جو ایسے مقاموں سے نکالدیے جاتے تھے جہاں مذہب کی پابندی سختی کے ساتھ ہوتی تھی۔ بربریوں کے سیدھے سادے دل سیر حاصل زمین کا کام دیتے تھے۔ مذہبی جوش سے متاثر ہونے کی اُسی استعداد نے جس نے اس افراط کے ساتھ ان لوگوں کو مسلمان بنایا کہ ہسپانیہ کو بربری ہی سپہ سالار اور بارہ ہزار بربری ہی سپاہیوں نے فتح کیا بہت جلد اور تحریکوں کا باعث ہوئی۔ ان زود اعتقاد لوگوں پر مشائخوں کا ایسا زور اور اثر پڑا جو عرب حاکم یا قبائل کے شیخ کو بھی کبھی نصیب نہ ہوا۔ صرف چند جھوٹی کرامتیں درکار تھیں جس نے انکا بندوبست کر لیا۔ اُسکے پاس خالی الذہن مرید جوق جوق آکر جمع ہو گئے۔ اور ایک عرب سپہ سالار لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کے اس طریقے کو ایسا صاف سمجھتا تھا کہ جب اُس نے دیکھا کہ ایک عورت نے اپنی پٹہ بازی کے ذریعے سے لوگوں پر سکہ بٹھا دیا ہے تو اُس ذکی الطبع عرب نے بھی وہی چال اختیار کی اور بہت جلد وہ بھی بڑا مشاق شعبدہ باز یا اُس زمانے کا مسخرِ روح بن گیا اور اس سے نہایت ہی عمدہ نتائج پیدا ہوے۔ لیکن جو لوگ کہ ایسے ذریعوں سے آسانی کے ساتھ متاثر ہو سکتے ہوں یعنی جو قوم کہ مذہبی مقتداؤں کے ہاتھ میں ہو وہ ہمیشہ اس قابل ہوتی ہے کہ دفعتہً اُس میں سخت انقلاب پیدا ہو جائے اور اُسکے مقتدا فقط ایک لفظ سے اُسکو بھڑکا سکتے ہیں۔ شمالی افریقیہ میں جتنی تخیلی تبدیلیاں ہوئیں اُن میں سے اکثر کے باعث بربریوں کے مشائخ ہی تھے۔ انھیں لوگوں نے فاطمیوں کو بڑھایا۔ مروانیوں کو بربروہسپانیہ میں فتحمند بنا کر بھیجا اور پھر اُنکو موحدین سے دبوایا۔ ان لوگوں نے بہت ہی اوائل میں عرب حاکموں کے خلاف میں کارروائیاں شروع کیں اور جس وقت ان حاکموں میں سے ایک شخص اپنی رعایا پر بے رحمانہ ظلم کے ذریعے سے عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا تو مشائخوں نے بربریوں سے بغاوت کرا دی اور دم بھر میں ساحل بحر روم کا سارا نصفِ مغربی مسلح ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور عربوں کو ہولناک شکست دی۔ تیس ہزار شامی سپاہی ملک شام سے اس علاقے کو باغیوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے آئے۔ لیکن یہ بھی بشمول اُن عربوں کے جو ابھی تک افریقیہ

سرمایۂ حصولِ مراد انسانی

معدن تندرستی جاودانی

آتنک نگرہ گولیاں

مخزن نعمت کامرانی

اگرچہ آپ اس زمانہ میں حد سے زیادہ مبالغہ آمیز لفاظی اشتہاروں میں ملاحظہ فرمائیں گے مگر ہم اس امر سے بیکنا ہوکر صرف اتنا ہی کہنے کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ تندرستی کے خواہاں ہیں۔ یا کہ آپ یا آپ کے دوست کو کمزوری اعضاے رئیسہ یا کہ دورانِ سر یا کہ مرض نسیان جریان احتلام ضعفِ باہ یا کہ رقت سرعت وغیرہ وغیرہ امراضِ خبیثہ نے بجد تنگ کرکے ہر چہار طرف سے گھیر لیا ہے۔ اور علاج سے تنگ آکر مایوس ہو رہے ہیں تو ہماری نوایجاد عالم تقویت بخش آتنک نگرہ گولیاں استعمال کرکے اپنی دلی مراد حاصل کریں۔ اُس وقت آپ کو ہماری راست گفتاری کا تصدیق جاں یقین ہو جائیگا۔ بڑے بڑے نامی گرامی مشہور معروف ڈاکٹروں ویدوں طبیبوں و نیز یورپین صاحبوں نے مذکور گولیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ تجربہ فرما کر ان کو پُر اثر اکسیر نافع تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گولیاں نہایت درجہ کی مقوی باہ و مصفی خون ہونے کے علاوہ بچپن کی تمام غلط کاریوں کے نقائص کو دُور کرکے حالتِ شیب میں عالمِ شباب کا ظہور بتلاتی ہیں۔ مرد عورت دونوں کو مفید ہیں۔ ان میں رسائین مطلق نہیں بلکہ جڑی بوٹیوں سے ہماری نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں۔ ہر موسم میں انکا استعمال ہوسکتا ہے

قیمت ۳۲ گولی کا ڈبیہ ایک روپیہ۔ علاوہ محصول۔

مزید آگاہی کے لیے ہماری کتاب کام شاستر جو اٹھارہ زبان میں ترجمہ شدہ ہے اور تخمیناً گیارہ لاکھ کے ہم مفت تقسیم کرچکے ہیں ہم سے مفت طلب کرکے ملاحظہ فرماویں۔

ملنے کا پتہ

ویدشاستری مُنی شنکر گووندجی۔ جام نگر کاٹھیاواڑ

لوکل ایجنٹ:- اندر چند اینڈ کو۔ چوک لکھنؤ۔

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد
- البرامکہ

مولوی چراغ علی مرحوم
- تہذیب الاخلاق مضامین
- تحقیق الجہاد مجلد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- اسلام کی دنیوی برکتیں ۸/
- حضرت سلیمان ۴/
- حضرت ہاجرہ ۲/
- حقیقۃ السحر ۲/
- یورپ و قرآن ۳/
- احسان عام ۱/

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- نشاط عمر
- عصائے پیری ۱۲/
- اقبال دولہن
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت

منشی سید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو ۱۲/
- حیات صالح ۳/
- نسا آء السلطین ۱۲/
- آثار خیر
- امرائے ہنود

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- میڈیکل جورس پروڈنس
- اردو بنگالی تعبیر ۴/
- سفرنامہ سیوتھیونو
- جنگ ہرنسول

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف ۱۲/
- اسلامی اخلاق ۸/
- ذکر الحبیب ۲/
- ذکر جمیل ۵/

مسٹر ظفر علی خاں بی اے
مولانا راشد الخیری
- مذہب و سائنس مجلد
- خیابان فارس
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- ڈرامہ جنگ روس و جاپان
- ایڈیٹر کا حشر ۱/
- معاشرت ۲/
- صبح زندگی
- شام زندگی
- طوفان حیات
- سراب مغرب ۸/
- ستاروں کے جھرمٹ ۲/
- الزہرا ۱۲/
- لارڈ کیو کی انشا ۸/

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- بولیسین
- نیلی چھتری

مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن
- لغات جدیدہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد ۱۲/

سید احسن حسین بی اے
- التقسیر
- التخیل

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفیٰ ۱/
- معارج الدین ۱۰/

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا ۸/
- شمع و شاعر ۴/
- بلال ۱/
- شکوہ ۱/
- جواب شکوہ ۲/
- نالہ یتیم
- رموز بیخودی
- نالہ یتیم
- فریاد امت ۴/
- تصویر درد ۴/
- اکبر و اقبال

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ با تصویر
- بلا تصویر
- روزنامچہ
- تسخیر ہمزاد ۸/
- رسول کی عیدی ۲/
- بیاہی بیٹی
- آئین فقر و نظامی
- خاتون ۱/
- اسلام کا انجام ۴/
- بیوی کی تعلیم ۱۱/
- انتخاب توحید
- میلاد نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں ۲/
- فلسفۂ شہادت ۲/
- غدر دہلی کے افسانے ۲/
- بیگمات کے آنسو ۸/
- آپ بیتی ۲/
- بچوں کی کہانیاں ۲/
- اسرار
- کم ڈوموت
- قبروں کے نصیب نوشتے ۱/
- فرام قبلہ ڈشلہ ۱/
- یورپ اینگزیں (رسالے)
- رہنمائے سیر دہلی
- محرم نامہ
- یزید نامہ
- محفل نامہ

حکیم محمد علی خاں
- عبرت الکمال
- حسن سرور
- دیول دیوی
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- ثمر حسینہ (کامل)

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامۂ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- المرتضیٰ
- سیاحت ہند مجلد
- عربی بول چال ۲ حصہ
- کتاب الصرف
- کتاب النحو

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق
- ریاض الاخلاق ۱۰/
- سراج الاخلاق ۱۰/
- فن شاعری
- فنون لطیفہ
- خیالات
- امثال

منشی محمد الحسن فریدآبادی
- معلم السیاست
- تاریخ مصر جدید ۱۲/

منشی محمد احسن خاں
- گھریلو معاشرت

مولانا عبداللہ العمادی
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث
- صناعۃ العرب

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ
- حیات جامی ۱۲/
- علوم عرب
- خواتین

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام ۱۲/
- عائشہ صدیقہ ۱۲/
- جذبات بھاشا ۱۲/
- کیوپڈ اینڈ سائکس ۲/

سیماب اکبرآبادی
- سیرۃ خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسول
- جام کوثر
- بہشتی جوہر

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- زندگانی بے نظیر

ناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مرزا رجب علی بیگ سرور
- فسانۂ عجائب علی قلم — ۱۲ر
- گلزار سرور — ۸ر
- انشائے سرور — ۶ر

مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی — عہ
- ابوبکر شبلی — عہ
- خواجہ معین الدین — ۲ر
- عصر قدیم — ہر
- دولت ہسپانیہ عرب — عہ
- حروب صلیبیہ — عار
- مسیح اور مسیحیت — ہر
- مخدرات مجلد — ۵ر
- تذکرہ مشاہیر عالم — ہر
- مقدس نازنین — ہر
- قیس و لبنیٰ — ہر
- ایام عرب — عار
- فلورا فلورنڈا — عار
- حسن کا ڈاکو — ہر
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — ہر
- الفانسو — ۱۲ر
- فلپانا — ہر
- فاتح مفتوح — ہر
- جویائے حق — ہر
- بابک خرمی ۲ حصہ — ہر
- فتح اندلس — عار

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین — ۶ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس — عار
- طرحدار لونڈی — ۱۲ر
- میٹھی چھری — ۴ر
- کایا پلٹ — ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو — ۲ر
- بچھڑی دلہن — ۸ر
- کڑم دھم — ۴ر
- پی کہاں — ۵ر
- کامنی — ہر
- خدائی فوجدار — عار
- فسانہ آزاد — عہ
- الف لیلہ — ۱۲ر
- سیر کہسار — ہر
- جام سرشار — عہ

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنالنی — ۱۰ر
- مار آستین — ۱۰ر
- بنگالی دولہن — ۱۲ر
- پرتاب — ۴ر
- معشوقۂ فرنگ — ۱ر
- بروگ — ۵ر

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا — ۱۲ر
- لیلیٰ مجنوں — ۸ر
- نوبہار — ۲ر
- مثنوی امید و بیم — ۴ر

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن — ہر
- شباب لکھنؤ — ہر
- مرقع اودھ — ۹ر
- حرمان نصیب — ہر

مسٹر عبد الماجد بی اے
- تاریخ اخلاق یورپ مجلد — ے
- فلسفہ جذبات — ہر
- فلسفہ اجتماع — ہر
- غذائے انسانی — ۳ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
- زرد پتیاں (ڈراما) — ۸ر

پنڈت چکبست لکھنوی
- صبح وطن — عہ
- گلدستۂ پنچ — ہر
- کملا — عہ

مسٹر انیس احمد عباسی
- ناجرہ کی کامیابی
- بحری جنگ — ۸ر

جلال مرحوم
- مضمونہائے دلکش — عہ
- نظم نگارین — عہ
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۲ر

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق — ۱۲ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- عالم خیال — ۱۲ر
- میکفرن دلوسی — ۲ر

منشی امیر حسن کاکوروی
- فسانۂ لارنس رقہ — ہر
- دیگزونسیڈا — ہر
- الادین لیلیٰ — ہر

منشی ارتضا علی سرور کاکوروی
- یادگار شرر — ۶ر
- خیابان — ۴ر
- ہفت گلبن — ۸ر
- صبح وصل — ۶ر
- شہید جفا — ۴ر
- دو پھول — ۴ر
- تصویر عبرت — ۴ر
- ارمغان حباب — ۶ر
- شام شملہ — ۴ر

مولانا عبد الشکور
- اسد الغابہ ۸ جلد — ۱۲
- علم الفقہ ۲ حصے — للعہ

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام حصہ اول — عہ
- ” حصہ دوم — ۱۲ر
- فن ہیئت — ۹ر
- فن کیمسٹری — ۶ر

مسٹر مشیر حسین قدوائی
- ذکر حبیب عربی — ۱۰ر
- مشیر — ۸ر
- عرض حال — ۱ر
- تعلیم نسواں — ۲ر
- جاذب دل — ۱ر
- حاکم و محکوم — ۴ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی — ۴ر
- اصلاح زبان اردو — ۱۲ر

وحشی بلگرامی
- مجموعۂ گلشت — عہ
- جام زہر — ۱۲ر
- خون آرزو — ۴ر
- معشوقۂ عرب — عہ
- جفائے ناز — عہ

مطبوعات الناظر پریس
- قواعد اردو — عار
- کلیات نعت — ہر
- محاربات صلیبی — ہر
- تسخیر فرانس — ۸ر
- واقعات کربلا — ہر
- الاحسان — ۹ر
- میلاد انجمن ترقی مترجم — ۴ر
- حیات نظامی — ۴ر
- تذکرہ حزیں — ۴ر
- میکفرن دلوسی — ۲ر
- ایک نادان قدر است — ۱ر
- مصنوعی شوہر — ۲ر
- زرد پتیاں — ۹ر
- نوبہار — ۲ر
- کنولا (۲ جلد) — عار
- مثنوی صبح امید — ۴ر
- اصول نسخ — ۲ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں — ۴ر
- عورتوں کی انشا — عہ
- اساس التعلیم — عار
- شعر العجم حصہ اول — ۱۲ر
- ” حصہ دوم — عار
- مجموعہ کلام شبلی — ۱۲ر
- ترقی زبان — ۴ر
- عورتوں کی انشا — عہ
- اتفاقات زمانہ ۱ ساوا ۱
- جمیل و جمیلہ ۲ رشوکیہ ۱

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

قیمت سالانہ عہ

قیمت فی پرچہ ۸/

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰۸ | یکم جون سنہ ۱۹۱۸ء | جلد ۱۸

فہرست مضامین

الناظر پریس، چوک، لکھنؤ

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اُردوی معلّی عار
- عود ہندی ۱۰ر
- دیوانِ غالب قسم اعلیٰ ۸ر
- ,, مع شرح نظم طباطبائی عار
- ,, مع شرح حسرت موہانی عہ ر

مولانا حالی مرحوم

- حیاتِ جاوید مجلد للعہ ر
- یادگارِ غالب عار
- حیاتِ سعدی ۸ر
- مضامینِ حالی ۸ر
- مجموعۂ نظم حالی ۱۲ر
- مسدس حالی ۸ر و ۴ر
- شکوۂ ہند ۲ر
- مثنوی حقوقِ اولاد ۲ر
- رباعیاتِ حالی ۶ر
- قطعاتِ حالی ۸ر
- مرثیۂ مرزا غالب ار
- بیوہ کی مناجات ۲ر
- الدین یسر ۳ر
- تحفۃ الاخوان ۵ر
- رحم و انصاف ار
- چپ کی داد ار
- نمک خدمت ار
- پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ ار
- حبّ وطن ار
- تعصب اور انصاف ار

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق تین جلد ے ر
- تفسیر القرآن (۵ جلد) دعہ
- تبیین الکلام (۲ جلد) للعہ
- آثار الصنادید ے ر
- خطباتِ احمدیہ عار
- مکمل مجموعہ لکچر مجلد ے ر
- سیرۃ فریدیہ ۱۰ر
- اسبابِ بغاوتِ ہند ۶ر
- مقالاتِ سرسید عہ ر
- آخری مضامین سرسید عہ ر
- نظر فی بعض مسائل ۱۲ر
- تحریر فی اصول التفسیر ۸ر
- احکام طعام اہل الکتاب ۶ر
- ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف ۶ر
- ازالۃ الغین ۵ر
- تفسیر السماوات ۸ر
- خطوطِ امہات المومنین ۴ر
- الدعاء والاستجابۃ ۳ر
- کشش ار
- ایک نادان خدا پرست ار
- انشاء اللہ ار
- خلق الانسان ۲ر
- الجن والجان ۵ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- خیالاتِ عزیز عہ ر
- ذکرم اروی عہ ر

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد ے ر
- ترجمۃ القرآن متوسط للعہ
- ترجمہ حمائل شریف ے ۱۲ر
- ادعیۃ القرآن ۶ر
- دہ سورہ ۸ر
- مطالب القرآن عہ ر
- الحقوق والفرائض ۳ جلد ۸ر
- اجتہاد عہ ر
- امہات الامہ ۱۲ر
- مرآۃ العروس ۸ر
- بنات النعش ۸ر
- توبۃ النصوح ۸ر
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ ر
- چند پند ۴ر
- منتخب الحکایات ۴ر
- مبادی الحکمہ ۸ر
- موعظہ حسنہ ۱۰ر
- رویائے صادقہ عہ
- ابن الوقت عہ ر
- ایامیٰ ۴ر
- فسانۂ مبتلا عہ ر
- لکچروں کا مجموعہ عہ ر
- لکچر نمبر ۲۳ و ۲۴ ۳ر
- لکچر نمبر ۲۶ مع تحریر سرسید ۴ر
- لکچر تنبیہ ۴ر لکچر تعلیم ۲ر
- نصاب السلمین ۴ر آزادیِ نسواں ار
- رسم خط ۲ر اتمام حجت ار

مولانا آزاد مرحوم

- آبِ حیات ۸ر
- دربارِ اکبری للعہ
- سخندانِ فارس ے ر
- نیرنگِ خیال ۹ر
- نظمِ آزاد ۱۲ر
- قندِ پارسی ۱۰ر
- قصصِ ہند ۶ر
- نصیحت کا کرن پھول ۸ر
- سپاک و نماک ۸ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد للاعہ
- تاریخ عہد سلطنت ملکہ معظمہ ے
- سوانح عمری ملکہ معظمہ عار
- کرزن نامہ عہ ر
- فلسفۂ امثال ۸ر
- محاسن الاخلاق ۸ر
- تہذیب الاخلاق ۱۰ر
- صحیفۂ فطرت ۸ر
- تقویم اللسان ۴ر
- تعلیم الانتظام ۳ر
- جغرافیہ ریاضیہ عہ ر
- معاون الحساب عہ ر
- مساحت خرد ۶ر
- محاربات عظیم عہ ر
- عجائب الحساب ۸ر
- رسالہ علم تناسب ۳ر

مولانا شبلی مرحوم

- موازنہ انیس و دبیر للعہ
- الفاروق عار
- الغزالی عار
- المامون ۸ر
- سیرۃ النعمان عہ ر
- سوانح عمری مولانا روم عہ ر
- بیانِ خسرو ۱۰ر
- علم الکلام عہ ر
- الکلام ۸ر
- سفرنامہ مصر و روم و شام عہ ر
- رسائل شبلی عہ ر
- مقالات شبلی ۸ر
- مضامین عالمگیر ۱۰ر
- شعر العجم جلد اول ے ر
- ,, جلد دوم عار
- ,, ,, سوم عار
- ,, ,, چہارم عار
- مثنوی صبح امید ۴ر
- آغاز اسلام ۱۲ر
- اسلامی حکومت ۲ر
- زیب النسا ار
- جہانگیر ۲ر
- مجموعۂ کلام شبلی ۱۴ر
- دیوان شبلی فارسی ۹ر
- بوئے گل ,, ۴ر
- دستہ گل ,, ۴ر
- برگ گل ,, ۴ر

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد ے ر
- مسلمانوں کی تہذیب ۴ر
- مکاتبات الخلان عار
- تقلید و عمل بالحدیث ۸ر
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب ۸ر
- کتاب المحبت والشوق ۸ر
- فطرت اور قانون فطرت ۳ر
- اسلام ۲ر
- آیات بینات ۳ جلد حمہ
- مجموعۂ لکچر مجلد ے ر

مولانا شرر مرحوم

- حیاتِ انیس عار
- ایشیائی شاعری عہ ر
- ادیب ۸ر
- لغات الخواتین عار
- نورجہاں ۸ر
- ٹیپو سلطان ۸ر
- حیدر علی سلطان ۱۲ر
- اُردو کا گلدستہ ۴ر
- اردو کی ڈالی ۳ر
- قومی نظم ۴ر
- مرقع تاجپوشی عہ ر
- مکالمہ مرد و عورت ۳ر
- حیاتِ جاودانی ۸ر
- سوانح نظام حیدرآباد ۱۲ر
- وزیر شاہ اودھ ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

کتب خانہ میں رکھنے کے قابل کتابیں

تاریخی کتابیں

تاریخ حبیب الٰہ	۳ر
تاریخ خلفائے عرب و الاسلام	۱۲ر
تفریح الاذکیا	عہ
قصص الانبیا کامل	عہ۴ر
ترجمہ فتوح الشام منظوم	ع۴ر
ترجمہ واقدی کامل	للعہ
ترجمہ مدارج النبوۃ	ے ر
صحیفۂ زریں	عہ،
مصائب غدر	۸ر
ترجمہ تاریخ فرشتہ کامل	للعہ
تاریخ بغاوت ہند	ع۴ر
ترجمہ سیر المتاخرین	ع۸ر
ترجمہ تاریخ روسیہ	ے ر
قیصر التواریخ	ع۴ر
ترجمہ منتخب التواریخ	عہ۴ر
تاریخ عہد دلیہ	عہ ر
فسانۂ برطانیہ	ع ر
سیر المتقدمین کامل	عہ۴ر
مختصر سیر گلشن ہند	عہ۴ر
توزک جہانگیری (ترجمہ اُردو)	ع۸ر
تاریخ یونان قدیم	عہ۴ر
تاریخ مصر جدید	ع۴ر
تاریخ اندلس مجلد	للعہ
مشاہیر یونان و روما	ع۴ر
تاریخ تمدن (۲ جلد)	ع۴ر
تاریخ اخلاق یورپ (مجلد)	ے ر

اساتذۂ اردو کا کلام

کلیات میر تقی میر	ع۴ر
کلیات سودا	ع۴ر
کلیات انشاء اللہ خاں	عہ ر
کلیات مومن	۱۰ر
کلیات ظفر	ع۴ر
کلیات آتش	۱۲ر
کلیات ناسخ	عہ
کلیات امیر اللہ تسلیم	عہ
کلیات نعت محسن کاکوروی	ع۴ر
کلیات مصحفی	عہ ر
دیوان ذوق	۸ر
مہتاب داغ	ے ر
آفتاب داغ	۱۲ر
گلزار داغ	عہ
یادگار داغ	۸ر
دیوان رند	۸ر
دیوان مہر	ع۴ر
دیوان خواجہ میر درد	۳ر
دیوان شاہ تراب	۱۲ر
دیوان میر حسن	۸ر
دیوان قلق	۸ر
کلیات نظیر اکبرآبادی	ع۴ر
دیوان مومن دہلوی	ع۴ر
دیوان شہیدی	۳ر
دیوان بحر سامری	۵ر
دیوان مشفی	۸ر

اساتذۂ فارسی کا کلام

کلیات سعدی	عہ ر
کلیات جامی	ع۴ر
کلیات عراقی	عہ ر
کلیات نظم غالب	ع۴ر
کلیات شمس تبریز	صمہ،
کلیات خاقانی	صمہ ر
کلیات انوری	ع ر
کلیات مرزا بیدل	ع۴ر
کلیات صائب	عہ ر
کلیات حزیں	ع ر
کلیات ظہیر فاریابی	۱۲ر
کلیات مرزا جلال اسیر	ع۴ر
کلیات غلام امام شہید	عہ ر
دیوان امیر خسرو	عہ ر
دیوان ظہوری	ع ر
دیوان عرفی	۱۰ر
دیوان حافظ	ع۴ر
دیوان مخفی	۳ر
دیوان غنی	۵ر
دیوان ناصر علی سرہندی	۳ر
دیوان ہلالی	۵ر
دیوان واقف	۹ر
گلشن عشق	۷ر
دیوان مخزن التوحید	۸ر
دیوان نعمت خان عالی	عہ ر
دیوان حضرت احمد جام	۸ر

الناشر کتب الحسینی لکھنؤ

ہنستے ہی گھر بستے ہیں

یہ مسلم امر ہے کہ ظرافت اور خوش مذاقی کے باب میں لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کی نظیر نہیں مل سکتی منشی سجاد حسین۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ مرزا مچھو بیگ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی۔ نواب سید محمد آزاد۔ جوالا پرشاد برق۔ وغیرہ جو اس عہد کے بہترین اہل قلم تھے سب کے جوہر طبع کی نمائش اسی میدان میں ہوا کرتی تھی۔ اودھ پنچ کچھ دنوں کے التوا کے بعد اب پھر جاری ہو گیا ہے۔ مگر جس وقت سے منشی سجاد حسین مرحوم مبتلائے فالج ہوئے اور بعض لائق نامہ نگاروں نے دنیا سے منہ موڑا اودھ پنچ کی بہار جاتی رہی۔

چند سال ہوئے منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ کے انتقال پر بعض احباب کی رائے سے پنڈت کشن پرشاد کول بی اے اڈیٹر ہندوستانی نے اودھ پنچ کے لاجواب مضامین سے ایک

گلدستۂ پنچ

منتخب و مرتب کر کے شائع کیا۔ کیونکہ اودھ پنچ کے پرانے فائل تو اب مل نہیں سکتے اور ارباب ذوق اس دلآویز اور نہایت ہی دلچسپ سامان ادب سے محروم رہ جاتے۔ اس مجموعہ کو اگرچہ منشی سجاد حسین و دیگر مضامین نگاران اودھ پنچ کے سوانحی حالات اور اُنکی تصاویر نے ایک تاریخی اہمیت بھی دے دی ہے لیکن اسکی اصلی خوبی اُنھیں منتخب مضامین اور کارٹونوں سے ہے جو اودھ پنچ سے لیے گئے ہیں۔ پڑھیے اور پڑھکر ہنسیے تو آپ کا گھر آباد ہو جائے۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحے چہرہ عکسی تصاویر مستزاد۔ قیمت صرف عہ

دیوان وحشت

مولانا رضا علی وحشت متوطن کلکتہ اس زمانہ کے پختہ مشق اور نہایت ہی خوش فکر شاعر و عظیم ہیں۔ آپکے کلام کے متعلق حسب ذیل آرا قابل ملاحظہ ہیں :-

مولانا حالی :- . . . "تکلف بر طرف اگر مرزا صاحب (مرزا غالب) کے اُن بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے مستثنیٰ کر لیا جائے تو آپ کے اُردو دیوان کو بے شائبہ تصنع اُنکے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہو سکتا"

مولانا شبلی مرحوم :- . . . . . "آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت۔ ندرت اور پختگی ہوتی ہے، غالب و مومن کی ترکیبیں اور طرز ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہے"

حضرت شوق قدوائی :- . . . . . "آجکل ہندوستان میں حضرت غالب اور حضرت میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے تو اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم۔ میں نے کم کا لفظ صرف اس بنا پر لکھا ہے کہ پوری تقلید حضرت غالب کے رنگ کی حضرت "وحشت" ہی نے کی ہے اور اُنکی ذات والا "کم" ہی کے لفظ کی مصداق ہو سکتی ہے"

مولانا شرر :- "حضرت وحشت کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پرانے مذاق کے نباہنے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں ہی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے"

مولانا حسرت موہانی :- "مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے اُن چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جنکے حسن کلام پر اُردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے" قیمت فی جلد عہ

المیزان یعنی مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ تبصرہ۔ جس میں لائق مصنف نے مرزا دبیر کی شاعری پر تفصیلی بحث کی ہے اور اُنکی ہر قسم کی صاف اور سلیس نظم کا نمونہ پیش کیا ہے اور اُنکے محاسن سخن اور فصاحت و بلاغت کلام کا مشرح تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کی خوبی کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود مولانا شبلی مرحوم نے صاحب موصوف کی بے تعصبی و قابلیت کا اعتراف کیا۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی نہایت ہی اعلیٰ درجے کی۔ حجم چھ سو صفحے سے زائد۔ قیمت تین روپیہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰ جلد ۱۸ — یکم جون سنہ ۱۹۱۸ء

عہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم

مسلمانوں کا علمی مذاق

مسلمانان عالم کی ہستی عربوں کی اُس حیرت انگیز ملکی و مذہبی ترقی کا نتیجہ ہے جسکی نظیر تاریخ عالم آج تک جم نہیں پہونچا سکی۔ چنانچہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر بمقتضائے فطرت عربی تمدن و اخلاق کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا عرب کس مذاق اور اخلاق کو لیکر تسخیر و تعلیم عالم کو نکلے۔

قبل اسلام عربوں کی نمایاں خوبی قادر الکلامی، فصاحت و بلاغت تھی جسکا ثبوت کلام ربانی کے نزول سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کیونکہ عرب جیسی فصیح و بلیغ قوم کو متوجہ کرنے کے لیے قرآن پاک ہی جیسی معدن فصاحت و مخزن بلاغت کتاب کی ضرورت تھی۔ اس مقدس کتاب نے انکے ادبی و علمی مذاق کو اسدرجہ مشتعل کر دیا کہ فتوحات ملکی سے فارغ ہوتے ہی اپنی تشنگی علم سے بیتاب ہو کر سرچشمۂ علم یعنی یونان پر جا ٹوٹے اور جام علوم و فنون خوب سیر ہو کر پیا اور دوسروں کو پلایا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی اقبال کے زمانہ میں غرناطہ، قرطبہ، اسکندریہ اور بغداد کے دار العلوم کل مہذب دنیا کو اپنی علمی ترقیوں اور فیاضیوں کے سبب ایسا گرویدہ کیے ہوے تھے کہ تمام

اقصائے عالم کے متعلمین اکتسابِ علوم و فنون کے اشتیاق میں آتے۔ ان درسگاہوں اور دارالاقاموں میں رہکر اپنے دل و دماغ کو یہاں کی بیش بہا تعلیم و تربیت سے مالامال کرتے اور اعلیٰ نصب العین اور بے نظیر قومی خدمات کے خیالات اور جذبات کے ساتھ اپنے ملکوں کو واپس جاتے۔

گو کہ سلاطین عباسیہ جنکا دور دورہ ایک عرصۂ مزید تک ممالک ایشیا میں رہا جنکی جنبش لبِ قلم پر کرورہا مسلمانوں اور ذمیوں کی بہبودی کا انحصار تھا نیز اُنکے حریف بنو اُمیہ جو اسی زمانے میں براعظم یورپ میں اپنا جوہر حکمرانی کمال تعلیم ماہِ کامل کی طرح دکھا رہے تھے اپنے مذاقِ علمی اور اہل علم کی قدردانی کے سبب آج تک ضرب المثل ہیں لیکن حیرت انگیز یہ امر ہے کہ تاتاری، منگولوی اور ترکی قومیں جو آوارہ گردی، غارتگری اور کشت و خون میں تمام مہذب دنیا کے لیے قہرِ الٰہی ہو رہی تھیں ان عربی معلمین کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرتے ہی یکبارگی ایسے معراجِ کمال پر پہونچیں کہ تمام جہان کو اپنا محوِ حیرت بنا لیا۔

سلاطین مغلیہ کے ابتدائی حالات سلطان تیمور صاحبقراں اپنی خداداد علمی قابلیت اور اہل علم کی قدردانی کے سبب کل مسلمانوں کے لیے باعث فخر ہے۔ یہ مختلف علوم کا ماہر تھا۔ اکثر زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ متعدد کتابیں اسکی تصنیف شدہ زبان ترکی میں موجود ہیں جن میں تزکِ تیموری تاریخی حیثیت سے اس عہد کی بہترین تاریخ ہے۔ دیگر شاہانِ اسلام کی طرح اسکو بھی اہلِ کمال سے ملنے کا نہایت شوق تھا۔ مولانا حافظ شیرازی علیہ الرحمہ اور ابن خلدون موجد فلسفۂ تاریخ کا بڑا مداح تھا۔ انکی نہایت ہی عزت و توقیر کرتا اور ہمیشہ دربار میں تشریف لانے کا اِنسے متمنی رہا۔ دربار میں اکثر مشاہیر روزگار کا مجمع رہتا جنکو ہر طرح سلطان انعام واکرام سے خوش رکھتا تھا۔ تعلیم عام کے لیے سلطنت میں اکثر مدرسے جاری کرائے۔ خاص شہر سمرقند میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا جس میں مدرسین و متعلمین کی آرام و آسایش کا انتظام کیا گیا تھا۔

اگرچہ مورخینِ ہندوستان اسکو خونریزی اور غارتگری کا مجسمہ لکھتے ہیں لیکن جب اس نے ہندوستان پر فوجکشی کی اور قلع لونی کو محاصرہ کے بعد فتح کیا تو اپنے سپاہیوں اور افسرانِ فوج کو خاص طور پر تاکید کی کہ سادات۔ شیوخ اور علماے شہر کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے۔ اسکو شاہزادۂ ولیعہد کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال تھا۔ بڑے بڑے علما اور فضلا شاہرخ کے معلم اور اتالیق مقرر کیے جنکے باعث شاہزادۂ ولیعہد نہایت جلد مختلف علوم و فنون کا ماہر ہو گیا تھا۔ علمی قابلیت اور خداداد علمی ذوق کے سبب تعلیم اور اہل فضل کی سرپرستی میں شاہرخ اپنے باپ پر بھی فوقیت لیگیا تھا۔ اس نے ہزارہا درہم اور دینار خرچ کرکے اپنے وقت کی

مشہور کتابوں کی نقلیں دوسرے ممالک کے کتبخانوں سے بہم پہونچائیں۔ ایک مرتبہ ایک کتاب کی نقل اور جلد سازی میں اسکو ساٹھ ہزار دینار صرف کرنا پڑے۔ آرکسن صاحب لکھتے ہیں کہ "محمد سلطان مرزا ابن جہانگیر مرزا ابن تیمور صاحبقراں نے دارالحکومت سمرقند کے سنگین قلعہ کے باہر ایک مدرسہ قائم کیا جس میں وہ اور اُسکے بعد کے فرمانروائے خاندان اپنی وصیت کے مطابق مدفون ہیں کیونکہ وہ ایک درسگاہ کی زمین کو محلات و باغات شاہی سے زیادہ پاک اور عزیز سمجھتے تھے۔

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی مختصر علمی تاریخ ظہیرالدین بابر نبیرہ سلطان تیمور ابھی گیارہ ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بادشاہی کا اہم کام انجام دینے کے لیے اسکو کتب چھوڑ کر تخت سلطنت پر آنا پڑا۔ دنیا میں اگرچہ اکثر ناقابل آدمی بغیر کچھ زحمت اُٹھائے خوش قسمتی کی مدد سے شہرت اور نام حاصل کر لیتے ہیں لیکن یہ کچھ عرصہ کے بعد خواب و خیال ہو جاتا ہے۔ مگر ہاں بڑے آدمی جو حقیقی معنی میں بڑے آدمی کہے جانے کے مستحق ہیں ابتدا میں سخت سے سخت مشکلات برداشت کر کے سونے کی طرح زمانے کی بھٹی کی آنچ سے کُندن بنکر نکلتے ہیں۔ بابر جسکو تاریخ آج دنیا کے بڑے فاتحین میں شمار کرتی ہے، اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے ملک فرغانہ سے اپنا موروثی تخت و تاج لینے کے لیے اُزبکوں سے لڑنے نکلا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ تقدیر کہاں لیے جاتی ہے۔ اُسکے اس حملہ نے دشمنوں کو خونخوار بھیڑیوں کی طرح چھیڑ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ گیارہ بارہ برس کی متواتر لڑائی کے بعد اسکو مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا۔ کچھ عرصہ کی آوارہ گردی کے بعد آخر کار وہ افغانستان آیا۔ اسوقت یہ سلطنت کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ اصحاب غرض ہر طرح سے ذاتی نفع کی کوشش کر رہے تھے ایک سچے صاحب جوہر سے بھلا ایسی حالت میں کب خاموش رہا جا سکتا تھا۔ نفع عام کا خیال کمزوروں کی دادرسی کی فکر اُسے کب چپکا بیٹھنے دیتی تھی۔ غرض تھوڑے ہی عرصے میں صداقت اور شمشیر کے زور سے اصحاب غرض کو شکست دیکر افغانستان میں ایک مستحکم سلطنت قائم کی جسکے بعد ہندوستان کی فتح و تسخیر کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ متعدد حملوں کے بعد ۱۵۲۶ء میں جنگ پانی پت اور معرکہ سیکری کے بعد سلطنت مغلیہ کا اس ملک میں سنگِ بنیاد رکھا۔ قضا نے فرصت نہ دی ورنہ بہت کچھ اصلاحات اس مدبر کے ذہنِ رسا نے حکومت کے مختلف صیغوں میں کرنا چاہے تھے۔ ملکی تاریخ کو چھوڑ کر ہم اپنے معزز ناظرین کو اس بادشاہ کی مختلف خوبیاں بتانے کے لیے آرکسن صاحب کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ "اگر بے تعصبی سے ہم شاہان ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمکو بابر کی کیاست اور فراست کے سبب اُسکو چیدہ چیدہ

بادشاہوں کی فہرست میں ممتاز جگہ دینا پڑیگی۔ ... گو کہ تیمور اور چنگیز خاں اپنے کمالات سپہگری اور نادر فتوحات کے سبب اُسپر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں لیکن وہ (بابر) اپنی دماغی قابلیت خوش مزاجی جوہرِ مردانگی اور رحمدلی کے سبب تمام فرمانروایانِ ایشیا میں اپنا کم نظیر رکھتا ہے۔"

تاریخ رشیدی بابر کی علمی قابلیتوں پر اس طرح گواہ ہے کہ" بابر ترکی زبان میں شاعری کے لحاظ سے امیر علی شیر کا ثانی تھا.... اُس نے قانون تعزیرات پر ایک نہایت مفید شرح لکھی جسنے عوام میں نہایت مقبولیت حاصل کی۔ اُس نے ترکی علم عروض پر بھی ایک نہایت فصیح رسالہ لکھا تھا اور ایک نہایت مشہور عربی رسالہ کو منظوم کیا۔ بابر خوشنویسی کا بھی استاد تھا۔ ۱۵۰۴ء میں اُس نے ایک رسم خط ایجاد کیا جسکو خطِ بابری کہتے ہیں۔ اس طرز میں دو کلام مجید لکھکر بطور ہدیہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو بھیجے۔" بابر کو روزنامچہ لکھنے کا خاص شوق تھا۔ ہمیشہ صحیح واقعات لکھنے کی کوشش کرتا۔ انگریزی مورخ اسکی عزت اُسکے روزنامچہ کی صحت اور صاف گوئی کے سبب تمام شاہانِ ہندوستان سے زیادہ کرتے ہیں۔ اسکے پڑھنے سے حقیقتاً اُسکی بے تعصبی اور کمالِ زباندانی کا پتہ چلتا ہے۔ بابر کو اہلِ کمال سے ملنے کا نہایت شوق تھا۔ ہمیشہ مولانا شہاب الدین معمائی اور مرزا ابراہیم ہراتی کے ملنے کا آرزومند رہا۔ کتب بینی کا برابر شوق رہا۔ ہمیشہ سفر میں کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ غازی خاں والیِ پنجاب جس نے ابتدا میں اُس کو ہندوستان آنےکی دعوت دی تھی مگر بعد میں سرکش ہوگیا تھا۔ جب اُسکو شکست دیکر گرفتار کیا تو اُس کا کتب خانہ بھی بادشاہ کے قبضہ میں آگیا جسکی اکثر کتابیں اُس نے شاہزادۂ ہمایوں کو بطور تحفہ بھیجیں۔ اُسکو قدرتاً فنِ نقاشی سے خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی تصویر بنا لیتا تھا۔ کتب خانۂ تیموریہ سے اکثر تصاویر اپنے ساتھ یہاں لایا تھا جو نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں دہلی سے فارس لے گیا۔

بابر جب نظامِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوا اُسوقت جن چیزوں کی کمی اُس نے ہندوستان میں محسوس کی تھی اُن میں عالموں اور درسگاہوں کی بھی کمی تھی۔ لیکن افسوس اچانک موت کے سبب وہ کوئی خاص انتظام تعلیم عام کا ملک میں جاری نہیں کرسکا۔

اسکی بیوقت موت کے بعد بابر کا سب سے بڑا اور عزیز ترین بیٹا ہمایوں سلطنتِ ہندوستان کا فرمانروا ہوا۔ یہ باپ سے زیادہ علم اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ ہمیشہ کتب بینی میں منہمک رہتا۔ اکثر مورخین کا یہ اعتراض ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت کتب بینی میں گذارتا تھا جس کے سبب کمزور سے کمزور

دشمن کو سر اُٹھانے کا کافی موقع ملجاتا تھا۔ ہمایوں علم نجوم میں اُستاد تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سات دیوان تعمیر کرائے تھے جہاں کہ وہ سلطنت کے باوقار لوگوں سے ملتا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک کا نام سات سیاروں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بخیال اختصار ہم صرف اتنا کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ علما اور فضلا کے ملنے کے دیوان مریخ اور زحل کے نام سے موسوم تھے۔ اور انھیں سیاروں کی گردش کے لحاظ سے یوم چہارشنبہ و پنجشنبہ اہل کمال سے ملنے کے دن مقرر کیے گئے تھے کیونکہ اہلِ نجوم کے خیال کے بموجب یہی سیارے اہلِ کمال کے دیوتا تسلیم کیے گئے ہیں۔

مصنف آثارِ خیر لکھتے ہیں کہ "بابر کے بعد ہمایوں تخت نشیں ہوا لیکن بھائیوں کے نفاق اور شیرشاہ کے اقبال نے اُسے چندروز بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جب اُس نے دوبارہ ہندوستان کو فتح کیا تو اجل نے مہلت نہ دی۔ باوجود اسکے وہ اپنے زمانے کے عالموں اور فاضلوں، بزرگوں اور شاعروں کی قدردانی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اُسکے دربار میں بڑے بڑے باکمال جمع تھے جن میں شیخ حمید سنبھلی، مولانا جنوبی بدخشی معمہ گو، شیخ زین الدین خاں صدر، اور مولانا نادری سمرقندی بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں خود بھی نجوم اور ہیئت اور تمام شریف علموں میں بے نظیر تھا۔"

ہیموں کی شکست کے بعد ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اکبر کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر اُسوقت صرف تیرہ برس کا تھا اور چچا کے پاس متقید رہنے کے سبب تعلیم سے مطلق بے بہرہ رہا گر قضا و قدر نے اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اور اہلِ کمال کی بے مثل قدردانی کا شوق اُسکے دل میں ودیعت کیا تھا۔ چنانچہ خود مختار ہوتے ہی اپنے آبا و اجداد کی طرح علمی خدمت شروع کردی۔ حکما اور علما کی تصانیف سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے وہ ہمیشہ راتوں کو کتابیں پڑھوا کر سنا۔ اقوام عالم کی وضع و آئین سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے شاید ہی کوئی تاریخ کی کتاب ایسی ہو جو اُس نے نہ سنی ہو۔ ادب وغیرہ کی کتابوں میں گلستاں، بوستاں، قابوس نامہ، مثنوی مولانا روم، جام جم۔ غرض تمام مشہور کتابیں کئی کئی مرتبہ پڑھوا کر اُس نے سنیں۔ دربارِ اکبری ایک گلدستہ تھا جس میں رنگ برنگ کے پھول اور پتوں کی طرح ہر مذہب و ملت ہر قوم و ملک کے علما و فضلا اور باکمال اصحابِ فن جمع تھے۔ اسکو علمی صحبتوں کا اس درجہ شوق تھا کہ اپنے نئے دارالحکومت فتحپورسیکری میں مختلف مذاہب کے عالموں کی بحث و مباحثہ سننے کی غرض سے ایک عالیشان محل تعمیر کروایا جو آج تک عبادت خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں شب کو بادشاہ کی موجودگی میں

بڑے بڑے علما اور فقہا مذہبی مسائل پر بحث و استدلال کرتے تھے۔ مصوری، نقاشی، فنِ موسیقی، فنِ تعمیر وغیرہ سے بھی اکبر کو نہایت مذاق تھا۔ بڑے بڑے اساتذۂ فن دربارِ شاہی میں موجود تھے جنکو گراں قدر مشغلوں سے وہ ہمیشہ خوش کرتا رہتا۔ اس بادشاہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی کہ اُسکی سلطنت کسی طرح اساتذۂ علوم و فنون کا ایک مرقع بنجائے۔

نور الدین سلیم جو اکبر کے بعد جہانگیر کے لقب سے اس خاندان کا مشہور بادشاہ ہوا ہے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اپنے باپ پر نمایاں فوقیت رکھتا تھا۔ زبان فارسی اور ترکی کا ماہر تھا۔ اپنے آبائی طریقے کے موافق اہلِ علم کی قدردانی و سرپرستی اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا۔ تختِ سلطنت پر آتے ہی جو فرامین اس بادشاہ نے جاری کیے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ اگر کوئی مالدار مسافر یا دولتمند باشندۂ سلطنت لاولد اور لاوارث مر جائے تو اُسکی ملکیت کی سلطنت وارث ہوگی جو رفاہِ عام کے کام میں مثلاً تعمیرِ پل اور اشاعتِ تعلیم و امدادِ مکاتب میں صرف کیا جائے گا۔ تاریخ جامِ جہاں نما میں مرقوم ہے کہ جہانگیر نے تخت پر آتے ہی اُن پرانے اور ویران مدرسوں کی درستی کرائی جو تیس چالیس سال سے غیر آباد ہونے کے سبب وحشی جانوروں اور ویرانہ پسند پرندوں کے جائے قیام ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے اپنے زمانے کی تاریخ خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہے جو بلحاظ زبان اور واقعات کی صداقت کے نہایت قابلِ وقعت کتاب ہے۔

کتب بینی کی عادت جہانگیر نے ورثہ میں پائی تھی۔ تاریخ کے مطالعہ کا خاص شوق تھا۔ شاہی کتبخانہ میں بھی اسکے زمانے میں نہایت بیش بہا اضافہ ہوا۔ مکتوب خاں اسکا محافظ کتبخانہ تھا۔ لکھتا ہے ایک مرتبہ جب جہانگیر گجرات ایک مہم کو سر کرنے کی غرض سے گیا تو کچھ کتابیں شاہی کتبخانے سے اپنے ہمراہ رکھ لی تھیں جن میں سے تفسیر کاشفی اور تفسیر حسینی وہاں کے شیخ معروف کو بطور نذر عنایت کیں اور اپنے دستِ خاص سے ان کتابوں کی پشت پر اپنا نام اور تاریخ نذر ثبت فرمائی۔

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں وارثِ تخت و تاج ہوا۔ اگرچہ یہ اپنی شاندار عمارتوں کے سبب مشہور زمانہ ہے لیکن یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اُسکے عہد میں جس طرح اور ترقیاں ہو رہی تھیں اُسی طرح تعلیمی ترقی بھی نہایت اطمینان بخش تھی۔ تمام سررشتہ دارانِ مملکت اور بڑے بڑے علما و فضلا اکبر اور جہانگیر کے قائم کیے ہوئے درسگاہوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ اسوقت ہندوستان تعلیمی حیثیت سے بھی دنیا کے مختلف ممالک سے ہمسری کا دعویٰ کر رہا تھا۔ شاہ جہاں خود بھی تکمیلِ تعلیم و تربیت حاصل کیے ہوئے تھا۔

جسکے سبب اہل کمال کی قدردانی تعلیم عام کا شوق اور بھی دوبالا ہو گیا تھا۔ دربار شاہی میں بے شمار صاحب کمال موجود تھے۔ تمام قلمرو کے علما کے وظائف خزانۂ شاہی سے مقرر کر دیے گئے تھے تاکہ آزادی سے اپنا تمام وقت تحصیل و تحقیق علم میں صرف کر سکیں۔ شاہ جہاں سونے سے پہلے کچھ گھنٹے ضرور کتب بینی کرتا تھا۔ مصنف آثار خیر لکھتے ہیں کہ "شاہ جہاں کی علمی قدردانی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُسنے اپنے ایام سلطنت میں اکثر اہل کمال کو (جن میں عالم فاضل۔ شاعر۔ طبیب ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں) سونے اور چاندی سے تلوا کر ہموزن سیم و زر اُنھیں بطور انعام مرحمت کیا"۔ اس عہد میں اکثر مشہور کتابیں فائدۂ عام کی غرض سے ترجمہ کی گئیں۔ پادشاہ نامہ مصنفۂ محمد امین قاضوئی اسی بادشاہ کے حکم سے لکھا گیا تھا جو تاج محل سے زیادہ اسکی پائدار یادگار رہے۔

واقعہ سموگڈھ کے بعد محی الدین عالمگیر نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ جس طرح اس عہد میں سلطنت مغلیہ بلحاظ وسعت اور اقتدار کے منتہائے کمال پر پہونچ گئی تھی اسی طرح تعلیمی لحاظ سے بھی اہل ہند معراج ترقی پر پہونچے ہوے تھے۔ عالمگیر کو تعلیم سے فطرتی دلچسپی تھی۔ عربی فارسی کا فاضل وقت تھا۔ اسکے رقعات بوجہ انشا پردازی فارسی کے کتب درسیہ میں شامل ہیں۔ خط نسخ اور نستعلیق کا اُستاد تھا۔ اپنے ہاتھ سے دو قرآن شریف کے نسخے لکھکر سات ہزار روپے کے صرف سے اُنکی لوح و جدول اور جلد تیار کرا کر مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ کو بطور ہدیہ روانہ کیے۔ آثار خیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن شریف ہندوستان میں بھی موجود ہے جسکو کچھ عرصہ ہوا ایک مسلمان رئیس نے وکٹوریہ میموریل ہال میں رکھے جانے کی غرض سے جناب ویسرائے ہند کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ عالمگیر قرآن کا حافظ تھا۔ تفسیر کا اکثر مطالعہ کرتا رہتا۔ شریعت کے پابند ہونے کے سبب علم فقہ اور حدیث میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اگر برنیر سیاح فرانس (جو اسی عہد میں شاہی معالج تھا) کا قول صحیح مان لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے شاہزادگان کے طریقہ اور نصاب تعلیم کے نقائص بخوبی دریافت کر لیے تھے۔ کیونکہ اُس نے اپنے اُستاد کو جو انعام کی امید میں تخت نشینی کے بعد دار الخلافت آرہا تھا یوں لکھا کہ تم نے مجھکو صرف عربی قواعد اور ادب کی تعلیم دی جو ایک عالم اور ادیب کے مفید ہو لیکن شاہزادہ کے لیے ہرگز سودمند نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ تخت پر بیٹھکر رعایا کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ میدان جنگ میں غنیم کے حملہ کا جواب دیتا ہے۔ ترقی اور اصلاح ملک کے لیے نئے نئے قوانین وضع کرتا ہے۔ لہذا اُسکی تعلیم ایسے طریقہ اور نصاب کے ساتھ ہونا چاہیے جو

ان تمام ضروریات کو پورے طور پر کافی ہو۔

شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد نظام سلطنت کچھ ایسا بگڑا کہ پھر کوئی بھی بادشاہ یا وزیر سلطنت کے اس زوور و زوال کو نہ روک سکا۔ بقول مولانا حالی علیہ الرحمہ۔

جبکہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا وقت لے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا
گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار
تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے نوبتِ تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

کوتاہ بیں اصحاب کا دربار میں اختیار ہو گیا شاہی اقتدار گھٹنے لگا۔ اہل غرض دستِ طمع بڑھاتے۔ حاسد دندانِ حرص کو کھولے وقت کے امیدوار۔ جاٹ، مرہٹے، سکھ، روہیلے سلطنت کے مختلف حصوں میں لوٹ مار کرنے لگے۔ دور دراز کے صوبوں میں جس نے چاہا نواب بن بیٹھا۔ قانون کا تازیانہ اٹھ گیا بدنظمی عام طور پر پھیل گئی۔ امن و چین اپنا رختِ سفر باندھ کر کوچ کرنے لگے۔ جہالت، غرور، سرکشی، بُری عادتیں عام طور سے لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔ علم و فضل نے ملک سے کنارہ کشی اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوازمات امن و تہذیب بلکلیہ ہندوستان سے دور ہو گئے۔

مدرسے، مساجد، درس گاہیں ویران ہو گئیں۔ اہل کمال بھوکوں مرنے لگے۔ کتابیں دیمک کی خوراک بن گئیں۔ کتبخانے اہل علم و کمال کے مدفن ہو گئے۔ بقول مولانا حالی مرحوم

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب

جنکو کھو بیٹھے نظیر انکا کہیں پایا نہ پھر
ہو گیا اُسکا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

غرض تباہی اور بے چینی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ عربی فارسی کو لوگ بھلاتے جاتے تھے۔ ایک نئی زبان شاہانِ دہلی کے سایۂ عاطفت اور شعرائے دہلی کے ہاتھوں پر ورش پا رہی تھی۔ کبھی ریختہ کے نام سے پکاری جاتی جیسے کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

کبھی اُردو کے نام سے موسوم ہوتی جیسا کہ داغ مرحوم اپنے مقطع میں فرماتے ہیں۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو ۔۔۔ کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

کم علمی اور زمانہ کی تبدیلی کے اثر سے کُل اہل دربار کی زبان میں نمایاں تبدیلی ہو رہی تھی۔ شعرائے دربار اس نئی زبان کو فروغ دینے کے لیے اور بیش قیمت انعامات کی امید میں بڑے بڑے قصائد لکھنے اور کمال شاعری دکھانے لگے۔ یہ زمانہ کل زمانہ سابق کا نچوڑ تھا۔ اگرچہ یہ سلطنت اقتدار قدیم کے لحاظ سے مٹ چکی تھی مگر مرتے مرتے بھی ایسا کام کر گئی کہ ہم مسلمانان موجودہ و نیز آنے والی نسلوں کی قومیت، زبان اور مذہب کے استحکام کے لیے اُردو زبان کی پرورش کر کے اُس میں اتنی قابلیت پیدا کر گئی کہ اگر ہم اور ہماری آنیوالی نسلیں کچھ توجہ سے کام لیکر اسکی کچھ بھی خدمت کریں تو اُمید ہے کہ یہ نوخیز زبان بھی دنیا کی مشہور پُر ذخائر ادبی زبانوں میں شمار کی جانے لگے۔ زمانہ نے اگرچہ شاہانِ مغلیہ کو شاہ شطرنج کی طرح بنا دیا تھا، اگرچہ اُن میں سپہگری اور حکمرانی کی قابلیتیں تعیش و دیگر وجوہات کے باعث مفقود ہو گئی تھیں یا کم از کم وہ اُن سے کوئی خاص فائدہ نہیں حاصل کر سکتے تھے تاہم اُنکے چلبلے دل، اُنکا موروثی علمی مذاق، اہل علم کی قدر دانی کا شوق، شعر و شاعری کا ذوق کوئی سلطنت کا خزانہ نہ تھا جو مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کے ظلم و تعدی کے ہاتھوں لٹ جاتا۔ چنانچہ شاہ عالم ثانی گو اپنے زمانۂ شاہزادگی ہی سے مختلف مصائب میں مبتلا رہا لیکن پھر بھی کتب بینی کا شغل، اہلِ علم کی صحبتیں، شعر و شاعری کے جلسے اس سے کبھی نہ چھوٹے۔ اسکے دربار میں بھی میر محمد تقی میر، مرزا رفیع الدین سودا، میر حسن جیسے باکمال زبانِ اُردو کے اُستاد موجود تھے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنکی سعی اور توجہ سے زبانِ اُردو قائم ہوئی اور یہ بچہ پاؤں چلنے کے قابل ہو گیا۔ آخر زوال کا کمال ہوا۔ دہلی کے آخری فرمانروا، شاہان مغلیہ کا آخری نشان بہادر شاہ ظفر جن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم تو نہیں مگر زبان اُردو ضرور پرورش پا رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کی صورت میں بادِ مخالف کے پُرزور تھپیڑوں نے اسکے حبابِ ہستی کو ہمیشہ کے لیے بحرِ جاہ و جلال سے معدوم کر دیا۔

اک تختہ رہ گیا تھا تیری ڈوٹی ناؤ کا ۔۔۔ لے گئی سیلِ فنا اُسکو بھی اے دِلّی بہا

ظفر کے دربار میں بھی بڑے باکمال شعرائے اُردو موجود تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب جو اپنی گرمیِ کلام اور دقائق مطالب کے سبب شعرائے اُردو میں آفتابِ کمال ہیں اسی دربار کے امرا میں سے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق جو سادہ بیانی اور قصیدہ گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں جنکی شاگردی پر مولانا آزاد مرحوم اور اُستاد داغ جیسے باکمال لوگوں کو فخر ہے ظفر کے اُستاد تھے اور دربار میں بڑا منصب و مرتبہ رکھتے تھے۔ شاہ ظفر خود

نہایت عمدہ تعلیم و تربیت حاصل کیے ہوئے تھے۔ زبان فارسی اور عربی میں نہایت اچھی استعداد تھی۔ اُردو کے شاعر تھے۔ کلام درد اور سادگی کے سبب آجتک لوگوں کے نوکِ زباں ہے۔ ہم یہاں پر اُنکی ایک مشہور غزل کے چند اشعار اُنکا رنگ و کمالِ شاعری دکھانے کی غرض سے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

وہاں کی مخلصی سے وائے قسمت ہو تو کیونکر ہو ۔۔۔ کہ میں آلودۂ عصیاں شفاعت ہو تو کیونکر ہو
برنگِ طائرِ تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں ۔۔۔ رہائی کی ہماری کوئی صورت ہو تو کیونکر ہو
وہ ہمت ہی سے ہو سکتا ہو جو ہی کام ہمت کا ۔۔۔ ظفر بے ہمتوں سے صرف ہمت ہو تو کیونکر ہو

آغازِ مضمون | اس قدر طول طویل تمہید سے ہماری یہ غرض تھی کہ ہم اپنے معزز ناظرین کو پہلے شاہانِ مغلیہ کے علمی مذاق اور استعداد سے واقف کر دیں تاکہ آ ساانی مسئلۂ ترویجِ تعلیم پر روشنی پڑ سکے۔ ہر شخصی سلطنت میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، نیز رعایا کی اخلاقی حالت فرمانروائے زمانہ کی طبیعت اور قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ حکماے قدیم اس امر پر متفق الرائے ہیں کہ رعایا پر بادشاہِ وقت کی ہر ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ قابلِ فخر یہ بات ہے کہ شاہانِ اسلام میں ہر ملک اور ہر زمانہ میں علمی مذاق اور اہلِ علم کی قدردانی کی ہمیشہ عادت قائم رہی۔ بقول مصنفِ آثار خیر "سلطنت مغلیہ سے پہلے فیروز شاہ مشہور فرمانروائے خاندان تغلق نے عام علمی فیاضیوں اور اموراتِ رفاہِ عام کے علاوہ اپنے ممالکِ محروسہ میں کئی مختلف مقامات پر تمیس عالیشان مدرسے قائم کرائے ان میں عالم، ادیب، خوشنویس متعین کیے۔ ان مدرسوں میں دینی و دنیوی دونوں طرح کی تعلیم ہوتی تھی تمام مدرس اور دیگر ملازمین خزانۂ شاہی سے نقد تنخواہ پاتے تھے۔ چنانچہ خاندان لودی کے عہد میں بھی کچھ معمولی تبدیلی کے ساتھ فیروز شاہی طریقۂ تعلیم ہی جاری رہا۔ سلطان سکندر لودی جو علم سے نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ اُسنے اپنے زمانہ کے عالموں کو ایسی بڑی بڑی جاگیریں دیں جو پہلے کہیں بڑی سلطنتوں میں بھی نہیں دی گئی تھیں۔ سب سے پہلے اسی بادشاہ کے حکم سے ہندو رعایا کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اس سے قبل ہندو اصحاب فارسی کو ملکش بھاشا کہکر اُس سے متنفر رہے"۔ تاریخ قدیم کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کی تسخیرِ ہندوستان کے وقت طریقۂ تعلیم آج کل کے عربی اور فارسی کے مکتبوں کے طریقۂ تعلیم کی طرح تھا۔ پُرانے اساتذۂ عرب و عجم کا کلام کتبِ درسیہ کے نصاب میں داخل تھا۔ ملک کے باکمال اہلِ علم کسی مسجد یا شاہی درس گاہ کی عمارت میں متعدد شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھکر کسی خاص کتاب کا درس دیا کرتے تھے۔ جب تک وہ کتاب ختم نہ ہو جاتی کسی دوسری کتاب کا پڑھنا دیکھنا بلکہ اُسکا نام تک لینا کفر تھا۔ بعض بعض

شاہی مدرسوں میں مدرسین اور متعلمین کو خزانۂ شاہی سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ کچھ مدرسے اور مکاتب مقامی نوابوں یا ذی دولت اصحاب کی فیاضی اور علمی دلچسپی کے سبب اُن مقامات پر تعلیم عام کا کام انجام دے رہے تھے لیکن یہ سب کچھ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں تعلیم عام پھیلانے کے لیے اس درجہ کم تھے کہ جو پہلی کمی بابر نے ہندوستان میں معلوم کی وہ اہل علم اور علمی درس گاہوں کی قلت تھی مگر افسوس موت نے اسکو کافی وقت نہ دیا اس لیے وہ بھی بجز دو ایک مدرسے قائم کرنے اور شاہی کتبخانے کی حالت درست کرنے کے کوئی خاص صورت تعلیم عام کو ترقی دینے کی عمل میں نہ لا سکا۔

ہمایوں جو علمی قابلیت اور بےنظیر تعلیمی مذاق لیکر تخت پر آیا تھا اور جسکی طرف ہماری گذشتہ نسلوں کی نظریں تعلیمی اصلاحات کے لیے لگی ہوئی تھیں دشمنوں کی شورش و فساد کے سبب کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کر سکا۔ کچھ مدرسے اور مکاتب دہلی اور آگرہ میں رفاہِ عام کی غرض سے کھلوائے جہاں قرب و جوار کے لوگ بکثرت جمع ہو کر درس لیتے تھے۔ شاہی کتبخانہ کو اس عہد میں بہت کچھ فروغ ہوا۔ صدہا بیش قیمت کتابیں لاکھوں کے صرف سے خرید کر شاملِ کتب خانہ کی گئیں۔ مگر قابلِ افسوس یہ امر ہے کہ کسی تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا شاہی کتبخانے سے عام خلائق بھی فیضیاب ہو سکتی تھی۔ بعض کتابوں کے دیکھنے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ امراء و علمائے دربار مقربانِ شاہی اس کتبخانے سے فائدہ اُٹھانے کے مجاز تھے۔ اس عہد تک تعلیم عام کا کوئی باقاعدہ سررشتہ قائم نہ ہوا تھا۔ سلطنت کی طرف سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کچھ مدرسے جاری تھے جنکے اخراجات خزانۂ شاہی سے ادا کیے جاتے لیکن اُنکے نظام اور طریقۂ تعلیم میں سلطنت کی طرف سے کوئی دست اندازی نہیں ہوتی تھی۔

جب تک سلطنت نے تعلیمی اصلاحات کی طرف توجہ نہ کی اور اُسکو اپنے ہاتھ میں نہ لیا اور علما اور فضلا کی قدردانی کرکے اُنکو عام خلائق کی جہالت کی تاریکی کو ضیائے علم سے دُور کرنے پر تحریص و ترغیب دلائی اُسوقت تک ملک میں کوئی دار العلوم یا کلیہ مثل ایتھنس یا موجودہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے قائم نہیں ہوا۔ غرض تعلیم کی کمی۔ لوگوں کی بےپروائی۔ مدارس کی بدانتظامی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ جب اکبر تخت نشین ہو کر درستگیِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوا تو اُسکو از سرِ نو سررشتۂ آموزش قائم کرنا پڑا۔

سررشتۂ تعلیم | بادشاہ نے اپنے ذہنِ رسا اور طبع آزاد کی مدد سے پرانے طریقۂ درس و تدریس میں بہت کچھ ترمیمات و اختراعات کیے۔ سب سے پہلا کام جو اس سررشتہ نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ نہایت

آزادانہ طریقے سے تمام رعایائے ہند کی تعلیم وہی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس وقت سے تعلیمی مور میں مسلمان اور ہندو، افغان یا مغل۔ غرض ہر مذہب اور قومیت کا امتیاز پوری طور پر اُٹھا دیا گیا۔ شاہی مدرسے ہر متنفس کیلیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے۔ ہر رنگ و زبان کا متعلم کمال آزادی کے ساتھ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ یہ سررشتہ آموزش مثل موجودہ سررشتۂ تعلیم کے تھا۔ اکبر کی بنفس نفیس روشن دماغی اور ہمیشہ نگرانی کے سبب حکام نہایت احتیاط اور توجہ سے کام کرتے تھے۔ سررشتۂ آموزش (جیسا کہ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے) کے ساتھ ساتھ آئین آموزش بھی خود اکبر نے علامہ ابوالفضل و دیگر مشیران سلطنت کی مدد سے مقرر کر دیے تھے جنکی رو سے قدیم نصاب تعلیم اور طریقۂ درس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا گیا تھا۔ پہلا آئین سررشتہ کا یہ تھا کہ تعلیم سلطنت میں ہر قوم و ملت کے بچوں کے لیے عام اور مفت ہوگی۔ کسی قسم کا جبر و تشدد حکومت کی طرف سے کسی خاص زبان یا علم کی تحصیل کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہر شخص سرکاری مدرسہ کا سند یافتہ ہو بلکہ اُسکو سرکاری ملازمت یا دربار میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ہی کافی تھا۔ دوسرے یہ کہ سلطنت تحصیل علم و اشاعت علم میں صرف لوگوں کی مدد کرنا اپنا فرض خیال کرتی تھی۔ چنانچہ تمام سلطنت میں سررشتہ کی طرف سے مدرسے اور مکاتب جاری کیے گئے۔ معلمین کا انتظام کیا گیا۔ متعلمین کی نوشت و خواند کی ضروریات کی چیزیں فراہم کی گئیں۔ بعض مدارس کو براہ راست خزانۂ شاہی سے مدد ملتی تھی۔ بعض کے اخراجات کے لیے سلطنت کی طرف سے کچھ اوقاف مقرر کر دیے گئے تھے۔ سررشتہ اُن مدرسوں اور مکتبوں کو جو کسی شہر میں وہاں کے کسی شخص یا کسی فرقہ کی کوشش سے قائم ہوتے تھے اُنکے منتظمین کی درخواست پر خزانۂ شاہی سے کافی امداد منظور کرا دیتا تھا۔ اگرچہ اس سررشتہ کی کوشش اور سرپرستی میں بھی کوئی خاص کلیہ موجودہ یونیورسٹیوں کے طرز پر قائم نہیں ہوا لیکن یہ ضرور تھا کہ دہلی یا دوسرے پرانے تعلیمی مرکز اپنے علمی مذاق، عالموں کی فراوانی اور فضلا کی فیض رسانی کے باعث اس درجہ مشہور اور کارآمد ہو گئے تھے کہ اگر زمانہ مسلمانوں کے اقبال کی طرح اُنکو بھی تباہ نہ کر دیتا تو امید تھی کہ جونپور۔ بدایوں۔ سیالکوٹ وغیرہ آج ہندستان کے آکسفورڈ اور کیمبرج کہلانے کے مستحق ہوتے۔

زمانہ کے دستور کے موجب سررشتہ کی طرف سے جو عمارتیں مدرسوں یا مکتبوں کی تیار کرائی جاتی تھیں وہ اکثر وسیع۔ خوش سلیقہ۔ خوش قطع۔ ہوادار ہوتیں۔ اکثر مدرسہ کی عمارت کے ساتھ دارالاقامت کی عمارت بھی شامل ہوتی تھی جہاں متعلمین شب و روز رہ کر بہ آسانی تحصیل علم کر سکتے تھے۔ ہر مدرسہ میں ایک مسجد کا

ہونا لازمی تھا کیونکہ سلطنت دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا ذمہ اپنے سر لیے ہوئے تھی۔ ہر مذہب کے طالبعلم کو اُسکے مذہب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ ہندوؤں کو مذہبی کرنا ویدانت اور پتیان جلی وغیرہ پڑھائی جاتی تھیں۔ طالبعلم صبح و شام ہمارے موجودہ مکتبوں کے اوقات کے موجب اپنے معلمین کے پاس اپنی جماعت کے

طریقۂ تعلیم

لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں جمع ہوجاتے تھے۔ یہ کمرے آرائش کے لحاظ سے بالکل سادہ رکھے جاتے۔ طلبا کے بیٹھنے کے لیے دری یا چٹائی کا فرش کافی سمجھا گیا تھا۔ اُستاد کے بیٹھنے کے لیے قالین یا ایک مسند اور گاؤتکیہ نیز ایک اُگالدان فراہم کیا جاتا تھا۔ اکثر خوشنویسی کے کمروں میں عمدہ خوشخط لکھی ہوئی وصلیاں، کچھ طغرے وغیرہ دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے۔ ہر اُستاد اپنے اپنے مقررہ درجوں کو مقررہ وقت تک ہمارے موجودہ مکتبوں کے مُلّاؤں کی طرح تعلیم دیتا تھا۔ عام طریقہ یہ تھا کہ اُستاد کُل جماعت میں سے کسی ایک لڑکے کو قریب بُلا کر سبق پڑھاتا، دوسرے لڑکے خاموشی کے ساتھ اُسکو سُنتے جاتے۔ اگر کہیں پر کسی کو کوئی مشکل پیش آتی تو فوراً اُستاد سے رجوع کرتا تھا۔

عہد اکبری سے قبل اہل ہند کے بچوں کو فارسی وغیرہ کی تحصیل میں طریقۂ تعلیم کے ناقص ہونے کے سبب بڑی دشواریاں اُٹھانا پڑتی تھیں۔ چنانچہ اکبر نے یہ طریقہ مقرر کر دیا تھا کہ اولاً اُستاد ایک بچے کو عربی فارسی کی ابجد یاد کراتا تھا اسکے بعد اعراب وغیرہ بتائے جاتے تھے۔ جب بچہ ان سے بخوبی واقف ہوجاتا تھا تو مرکب حروف کی مشق کرائی جاتی تھی اور ساتھ ہی تختی لکھنا بھی بتایا جاتا تھا۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں بچہ میں آسان الفاظ کے پڑھنے کی استعداد پیدا ہوجاتی تھی جس کے بعد مرکب الفاظ، چھوٹے چھوٹے فقرے اور آسان آسان اخلاقی یا مذہبی اشعار کی مزاولت کرائی جاتی تھی جسکے سبب پندرہ بیس روز میں آسان اور سلیس عبارت کے پڑھنے کی قابلیت بچہ میں پیدا ہوجاتی تھی۔ ہر بچہ کو ایک دن میں دو تین تختیاں لکھنا۔ کچھ آموختہ پڑھنا۔ مطالعہ دیکھکر نیا سبق پڑھنا ضروری تھا۔ اس طرح بچے بہت جلد کافی استعداد حاصل کر لیتے تھے۔ بڑی جماعتوں میں درس دینے کا طریقہ قریب قریب ایسا ہی تھا جیسا زمانۂ موجودہ میں بعض علما اپنے شاگردوں کو حدیث اور فقہ وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ ہر جماعت کا ہم نہیں بتا سکتے کہ کس طرح سے امتحان لیا جاتا تھا اور بالائی جماعت میں وہ کس طرح ترقی پاکر آجاتے تھے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی کرنے کے لیے طالبعلموں کو اپنے کورس کی کتاب کا ختم کرلینا ہی ضروری تھا۔ انتہائی درجہ میں جو طالبعلم آجاتے تھے اُنکو کتابیں ختم کرنے کے بعد اُستاد کی سفارش اور رائے کے موجب ہر سالانہ جلسہ میں جس میں اکثر

کوئی معزز شخص اور علماے شہر جمع ہوتے تھے دستارِ فضیلت ملتی تھی۔ اس قسم کے جلسے دستار بندی کے جلسے کہلاتے تھے۔ دہلی کے دستار بندی کے جلسوں میں بادشاہ اور شاہزادے اکثر شریک ہوتے رہے ہیں۔

نصاب تعلیم جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں طریقہ آموزش کے ساتھ نصاب آموزش بھی مقرر کر دیا تھا چنانچہ آئین اکبری کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حسب ذیل مضامین کا خاص طور سے درس دیا جاتا تھا مثلاً اخلاق۔ حساب۔ سیاق۔ فلاحت۔ مساحت۔ ہندسہ۔ نجوم۔ رمل۔ تدبیر منزل۔ سیاستِ مدن۔ طب۔ منطق۔ طبیعی۔ ریاضی۔ الٰہی۔ تاریخ۔

علامہ ابوالفضل کا قول ہے کہ ان اصول آموزش کے سبب مکتبوں کی رونق دوبالا ہوگئی تھی اور مدرسوں کو تازہ فروغ حاصل ہوگیا تھا۔ اکبر انھیں اصلاحات اور ترمیمات پر مطمئن نہیں رہا بلکہ متعدد مدارس بادشاہت میں اکثر فنون کی ترقی کے لیے جاری کیے اور ہمیشہ ان درس گاہوں کے متعلمین کو سرکاری ملازمتیں دیتا۔ قلعہ جات ساجد۔ مدرسگاہوں اور ایوان شاہی کی تعمیر کا کام سپرد کرتا تاکہ دوسروں میں علوم و فنون کے حاصل کرنے کی تحریص پیدا ہو۔

سررشتہ کی کوشش اور بادشاہ کی علمی قدردانی کے سبب ملک میں عام طور پر تعلیم کا چرچا پھیل گیا ہر شخص کے دل میں اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی حرص پیدا ہونے لگی جسکو جہانگیر کی داد گستری۔ روشن دماغی۔ اور ساوات کے اصول نے اور بھی ترقی دی۔ جہانگیر نے اکبری قواعد و آئین میں سرمو کوئی بھی تبدیلی نہیں کی۔ نظم و نسق حکومت وہی قائم رکھا جو اکبر اپنے مشیران باکمال اور راستبازوں کی صلاح و مشورے سے ترتیب دے گیا تھا۔ اگرچہ تبدیلی نہیں کی گئی تھی مگر پرانے قوانین پر نہایت احتیاط اور عرقریزی کے ساتھ کام کیا گیا۔ کسی حاکم کی مجال نہ تھی کہ کبھی کسی بےقاعدگی کا خواب بھی دیکھ سکتا۔ سررشتہ آموزش کو بادشاہ کی فیاضیوں کے سبب نہایت ترقی ہوئی۔ اکثر پرانے مدارس جو سالہا سال سے شکستہ اور ویران پڑے ہوئے تھے شاہی حکم سے انکی مرمت کرادی گئی اور از سرِ نو جویندگان تعلیم کا ملجا بنگئے۔ بادشاہ نے تخت نشینی کے بعد ہی جیسا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ایک فرمان جاری کیا تھا کہ جو کوئی دولتمند باشندہ یا مسافر حدودِ سلطنت میں لاوارث مرے اُسکی ملکیت کی وارث سلطنت ہوگی جو رفاہِ عام کے کاموں میں جس میں مدارس کا خاص طور پر ذکر تھا خرچ کی جائے گی۔ اس فرمان کے بموجب سررشتہ کی آمدنی میں ایک نہایت بیش قدر اضافہ ہوا۔

شاہجہاں نے اپنے عہد میں نہ صرف اکبری قواعد کو جاری رکھا بلکہ کچھ ضروری ترمیمات بھی کیں چنانچہ

صیغۂ تعلیم میں جو ترمیات کی گئی تھیں اُس سے اشاعت تعلیم میں بہت کچھ سہولیت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بہت بڑا احسان جو اُس نے سر رشتۂ تعلیم پر کیا وہ یہ تھا کہ اسکو ہر دلعزیز بنانے اور اسکی قدر و منزلت بڑھانے کی غرض سے اُس نے اپنی وزارت کے اہم کام کو انجام دینے کے لیے طبقۂ علما سے دو ایسے شخصوں کو انتخاب کیا جو اکبری درسگاہوں کے تعلیم یافتہ اور ہندوستان میں قابل فخر بزرگ تھے چنانچہ علامی کا خطاب ابوالفضل کے بعد جس شخص نے ہندوستان میں حاصل کیا وہ اُسکا وزیر باتدبیر علامہ سعد اللہ خاں تھا۔ عہد معدلت مہد شاہجہانی میں امن و چین کے باعث درسگاہیں نہایت آزادی اور حسن و خوبی سے اپنا کام انجام دے رہی تھیں۔ شاہزادگان و بالخصوص دارا شکوہ کی سرپرستی، دلچسپی اور علمی سرگرمی کے سبب معلمین و متعلمین میں درس و تدریس کا ایک بےنظیر جوش پیدا ہو گیا تھا۔ سرکاری دفاتر اور محکمہ جات میں اب بیشتر انھیں درسگاہوں کے تعلیم یافتہ ہر اعلیٰ اور ادنیٰ عہدوں پر نظر آتے تھے۔ شاہجہاں کے حکم سے شاہجہاں آباد یعنی نئی دہلی میں ایک نہایت شاندار مدرسہ جامع مسجد کے شمال میں تعمیر ہوا تھا اور بادشاہی کے حکم سے مدرسہ مسمّی بہ دار البقا کی بھی مرمت کرائی گئی جو تقریباً بالکل مسمار ہو چکا تھا۔ تعمیر کے علاوہ بڑے بڑے علما اور فضلا ان مدرسوں میں تعلیم دینے کی غرض سے معین کیے گئے۔ بادشاہ اور شاہزادگان نیز بیگمات کے بےنظیر علمی مذاق اور فیاضیوں کے باعث اکثر درسگاہوں میں مفید اصلاحات ہوتے اور گرانقدر عطیات خزانۂ شاہی سے ملتے رہتے تھے۔ حکیم محمود خاں صاحب کا مرثیہ لکھتے وقت جس دہلی کا عروج اور علمی کمال مولانا حالی علیہ الرحمہ کے پیش نظر تھا وہ یہی شاہجہان آباد ہے جسکو مولانا مرحوم اس بند میں مخاطب فرماتے ہیں۔

اے جہان آباد۔ اے اسلام کے دار العلوم　　اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پہ نجوم　　تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھکو جہان آباد کا
نام روشن تجھسے تھا غرناطہ و بغداد کا

عہد عالمگیر جس طرح عروج سلطنت کی عمارت کا آخری تھپر تھا اسی طرح تعلیمی شباب کا بھی آخری درجہ تھا۔ چنانچہ مصنف آثار خیر فرماتے ہیں " اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت میں ایک وسیع سلسلۂ تعلیم جاری کیا۔ اس سے پہلے صرف بڑے بڑے شہروں میں شاہی مدرسے قائم تھے۔ اورنگ زیب نے تمام ممالک محروسہ کے شہروں اور قصبوں میں مدرسے جاری کرائے اور اُن میں بڑے بڑے فاضل مدرّسوں کو پڑھانے کے واسطے مقرر کیا۔ جنکو خزانۂ شاہی سے نقد تنخواہ ملتی تھی بعض

بعض مدرس روزینہ پاتے تھے۔ کسی کسی کو جاگیریں بھی دی گئی تھی۔ طالبعلموں کے واسطے بھی وظیفے مقرر کیے گئے تھے"۔ اس اضافہ کے ساتھ ساتھ سررشتۂ تعلیم کے پرانے قواعد جو زمانۂ ابوالفضل میں مقرر ہوچکے تھے اور جنکے سبب کُل ملک میں تعلیم عام اور ہردلعزیز ہورہی تھی اور لوگ بآسانی اچھی تعلیمی ترقی حاصل کرلیتے تھے بدستور قائم رکھے گئے۔ اگرچہ ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے ان میں کچھ معمولی ترمیمات کی گئی تھیں۔ مرأۃ احمدی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے تمام سلطنت میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے مکتب اور مدارس جاری کرائے اور کرامت خاں دیوان گجرات نیز دوسرے صوبجات کے دیوان کے پاس فرمان روانہ کیے کہ تمام اعلیٰ اور ادنیٰ جماعتوں کے طالبعلموں کو انکے مدرسین اور مقامی صدر کی سفارش پر خزانۂ شاہی سے وظیفے دیے جائیں۔ ایک بے نظیر اختراع جو عالمگیر نے رعایا کی تعلیم دہی کے اصول میں کیا وہ یہ تھا کہ گجرات کے بوروں کی کُل قوم کے لیے تعلیم جبریہ اور مفت کردی۔ سلطنت کی طرف سے استاد مقرر کیے گئے۔ ماہ بماہ ہر جماعت کا امتحان ہوتا جسکا نتیجہ شاہی ملاحظہ کی غرض سے دربار میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک بار کچھ لوگوں کی شرارت کے سبب ناراض ہوکر اورنگزیب نے یہ حکم جاری کیا کہ تعلیمی اخراجات قوم خود برداشت کرے۔ اس عہد فرجام کے ختم ہونے کے بعد جس طرح سلطنت کے دوسرے سررشتے ناقص اور کمزور ہوگئے اُسی طرح محکمۂ تعلیم بھی ورطۂ تباہی میں آکر ہمیشہ کے لیے تخت و تاجِ مغلیہ کے ساتھ بحرِ فنا میں تہ نشین ہوگیا۔ قبل اسکے کہ میں اس مضمون کو ختم کروں یہ امر بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ سررشتہ کی تعلیم ہی فضیلت اور کمال کا معیار نہیں تھی بلکہ اکثر قابل اور علم سے مذاق رکھنے والے لوگ ایک مدرسہ سے دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد بعض علوم کی تحصیل و تکمیل کے لیے اکثر مشاہیر علما اور اساتذۂ فنون کے مکانوں اور درسگاہوں پر سالہا سال رہتے اور علم سے دامنِ مراد بھرتے چنانچہ ملا عبدالقادر مصنف تاریخ بداونی کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موصوف اپنے وطنِ مالوف سے آکر اکبرآباد یعنی آگرہ میں اپنے استادِ معظم مولانا مہر علی بیگ علیہ الرحمہ کے یہاں ایک مدت تک تکمیلِ علم کرتے رہے۔

کوئی کلیہ یا دار العلوم موجودہ یونیورسٹیوں کی طرح کیوں نہ قائم ہوا۔

اگرچہ سررشتۂ تعلیم اور باکمال اساتذہ کی سرپرستی اور توجہ کے سبب تعلیم نہایت تیزی سے عوام میں پھیلتی رہی۔ اکثر صاحبِ قلم ایسے نکلے جنکا نام آج تک ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ صدہا مصنفین اپنی تصانیف سے ایسی یادگاریں قائم کرگئے کہ زمانہ اُنکو کبھی نہیں مٹا سکتا۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن جب ہم اُس وقت کے علمی مذاق، اہلِ علم کی فیاضیاں، بادشاہوں اور امیروں کی مربیانہ توجہ اور بیش بہا عطیات پر نظر کرتے ہیں تو قدرتاً دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اسکے کہ تمام اسباب ایک کلیہ کے نشوونما کے لیے موجود تھے جبکہ اس نہالِ آموزش کے لیے ارضِ ہند جیسی زرخیز زمین علمی دلچسپیوں کی ہوا، بادشاہوں کی ہر توجہ

کی شعاعیں اُسکے بڑھانے کے لیے حاضر، امرائے والامراتب کے گرانقدر عطیات کا پانی اُسکے سینچنے کے لیے بکثرت موجود پھر بھی یہ نخل بارور نہ ہوا - ایک نہیں بلکہ صدہا مدرسے اور درسگاہیں قائم ہوکر نہال خزاں خوردہ کی طرح زمانہ کی دستبرد کی سموم کا شکار ہوئیں - حقیقتًا ہم نہیں سمجھتے کہ ان درسگاہوں کی تباہی کا سبب کیا ہے کیونکہ اکثر حصوں میں ملک کے پُرانے زمانے کے اوقاف اِنکے اخراجات کے لیے اب تک قائم ہیں - قدامت پسندی کا شوق اب تک ہم میں موجود ہے - عربی فارسی کے پڑھنے اور انکو اپنی زبانیں کہنے کا اب تک ہمارے دلوں میں ولولہ موجود ہے - اب بھی اگر ہم جستجو کریں تو ملک میں بڑے بڑے عربی داں مل سکتے ہیں مگر پھر بھی سیالکوٹ، جونپور، بدایوں اپنے علمی فیض اور علمی عروج قائم نہ رکھ سکے - دہلی کا دارالعلوم کہاں ہے؟ کیوں اُسکی گذشتہ حالت اور علمی فیض قائم نہ رہا؟ کیا دنیا میں تعلیمی مرکز بھی دارالخلافتوں کی طرح بادشاہت کے تبدیل ہونے سے برباد ہو جاتے ہیں؟ کیا شاہجہان آباد کی تباہی نے دارالبقا کو بھی باقی نہ رہنے دیا؟ کیا ان تعلیمی مرکزوں کی ویرانی مسلمانوں کی تباہی کی خصوصیت ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے زمانہ کا رومن کیتھولک مذہب کا گرجا آج تک آگرہ میں قائم ہے اور نہایت عمدگی سے اشاعتِ مذہب اور تعلیم عام کا کام انجام دے رہا ہے۔ اگر تباہی اسلامی درسگاہوں سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتی تھی تو پھر اُس کلیسا کو اُس پرآشوب زمانہ میں جب آگرہ جاٹ اور مرہٹوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو رہا تھا کس چیز نے بچایا؟ ہم یہ ہرگز نہ کہینگے کہ شاہی زمانہ کی درسگاہیں قائم کرنے والے انتظامی قابلیت نہ رکھتے تھے یا اُن میں دوراندیشی کا مادہ نہ تھا - نہیں یہ نہیں بلکہ وہ نہایت منتظم، اعلیٰ درجہ کے دوراندیش، نہایت اخلاص اور صداقت سے کام کرنے والے بزرگ تھے لہذا ان دارالعلوموں کے قائم نہ رہنے کا سبب میرے ایک دوست کی رائے کے موافق یہ ہے کہ مشرقی کاموں کی بنیاد ہمیشہ شخصیت پر ہوتی ہے - جس طرح ہماری شخصی سلطنتیں ایک زبردست حکمراں کے مرنے کے بعد کمزور ہو جاتی ہیں اسی طرح ہماری انجمنیں بھی اپنے بانی کے زمانۂ حیات یا اُسکے کچھ عرصہ بعد تک قائم رہکر فنا ہو جاتی ہیں - شخصیت کا سوال ہمیشہ ہمارے بزرگوں کے پیشِ نظر رہا - تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ ثروت، ہر عالم، ہر باکمال کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ خود ایسا نمایاں کام کرے یا کوئی نئی درسگاہ قائم کرے جو محض اُسی کی دولت اور کمال کی یادگار ہو جس میں تمامتر اختیارات صرف اُسی کو حاصل ہوں - جسکے اصول و قواعد صرف اُسی کی حسب خواہش ہوں - انھیں وجوہات کے باعث آج ہم کو ہندوستان میں سوائے چند ویران عمارتوں کے کوئی ایسی قدیم درسگاہ نظر نہیں آتی جو اپنی رکھی

حالت پر فخر کر سکے اور جس سے اس وقت بھی تشنگانِ علم کو سیرابی حاصل ہو سکے۔

اختتام پر کچھ اسمائے گرامی علمائے قدیم کے اور کچھ مدرسوں اور مکتبوں کی حالت بھی بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دہلی اور آگرہ چونکہ اس وقت دارالحکومت تھے لہذا ہر قسم کے اہل کمال اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھانے کے لیے دور دراز سے آکر یہاں جمع ہوتے تھے۔ بقول مولانا حالی مرحوم "جتنے اہل علم جمع تھے" عہدِ اکبری حقیقتاً علما اور فضلا کا ایک گلدستہ تھا۔ صدہا باکمال دربارِ شاہی میں موجود تھے جن میں علامہ ابو الفضل، ملا فیضی، ملا عبدالقادر بدایونی، محمد حسین کشمیری زریں قلم، مولانا عبداللہ سمرقندی، شیخ عبدالغنی دہلوی، قاضی جلال الدین ہندی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

جہانگیر کے زمانے کے عالموں میں ملا یا قر ٹھٹوی، مولانا عبدالمطلب سلطانپوری، اور مولانا محمد جونپوری کے نام ہمیشہ یادگارِ زمانہ رہیں گے۔ شاہجہانی تختِ طاؤس کے پاس بیٹھنے والے صاحبِ علم و فن میں سید بخاری گجراتی۔ سید جلال الدین، مرزا زین الدین اور شیخ بہلول قادری کے اسمائے گرامی زمانہ کبھی نہیں بھول سکتا علاوہ انکے صدہا اور علما انکے ہم مرتبہ اور ہمعصر ہیں جنکا ذکر بوجہ طوالت ہم اس وقت نہیں کر سکتے۔

عہدِ مغلیہ کے قابلِ ذکر مشہور مدارس میں ماہم آنگہ کا بےنظیر مدرسہ جو عہدِ اکبری میں قائم ہوا اور ایک مدت تک نہایت خوبی سے تعلیم کا کام انجام دیتا رہا بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ بلگرنے سی اسٹیفنس کے دہلی کی (ارجیالوجی) یعنی علم اشیائے قدیم میں بیان کیا ہے کہ اس مدرسہ کی عمارت نہایت عالیشان، وسیع اور خوش وضع تھی۔ اسکے متعلق ایک مسجد تھی جسپر نہایت عمدگی سے استرکاری کی گئی تھی۔ اُسکے پیش طاق اور دروازے پر نہایت نفیس منبت کاری اور نقاشی کی گئی تھی۔ اس عمارت کا نقشہ ہمارے پیش نظر ہے جسکو دیکھتے ہوے بیساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ   آثار پدید است صنادیدِ عجم را

عہدِ اکبری میں خواجہ معین مرحوم کا بھی مدرسہ قابلِ ذکر ہے۔ اسکی عمارت بھی نہایت عالیشان تھی اور اسکے متعلق خواجہ مرحوم کا عطا کیا ہوا ایک بڑا وقف تھا جس سے اسکے اخراجات ادا کیے جاتے تھے۔ عہدِ عالمگیری میں نواب غازی الدین مورثِ اعلیٰ حضور عالیجاہ نظامِ دکن کی فیاضی اور توجہ سے دہلی میں ایک عالیشان مدرسہ قائم کیا گیا۔ جسکے متعلق اسٹیفنس صاحب کی رائے ہے کہ یہ مدرسہ ایک بہترین نمونہ ہے ان رفاہ عام کی عمارتوں کا جو زمانۂ وسطیٰ میں یورپ کا خاص شعار تھیں۔ کیونکہ یورپی عمارت کی طرح اس

مدرسہ میں بھی ایک خانقاہ، مکتب اور مقبرہ کی عمارت شامل ہے۔ آخر زمانۂ سلطنت مغلیہ میں نواب شرف الدولہ مرحوم نے ایک رفیع الشان مدرسہ دہلی میں عہد محمد شاہ میں تعمیر کرایا تھا۔ حقیقتاً یہ عمارت بھی اپنے طرز میں لاجواب تھی۔

تعلیم نسواں عہد مغلیہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ دہلی تعلیم نسواں کی اشاعت میں بھی ہمیشہ کوشاں رہے۔ اگرچہ عام عورتوں میں تعلیم نہ پھیل سکی مگر امرائے دربار کی لڑکیاں اور شاہزادیاں عام طور سے تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

عہد اکبری میں دارالخلافت فتحپور سیکری میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعلیم نسواں کے لیے تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس زمانہ سے آخر سلطنت مغلیہ تک ہم کو شاہزادیوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو زیورِ علم سے ہمیشہ مزین رہیں۔ یہاں پر ہم گلبدن بیگم دختر شہنشاہ ظہیرالدین بابر جو علم و فضل میں بڑا پایہ رکھتی تھی اور جو ہمایوں نامہ تصنیف کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا یادگار قائم کر گئی، نیز سلیمہ سلطانہ شہنشاہ ہمایوں کی بھانجی۔ نور جہاں بیگم جہانگیر کی محبوب ملکہ، ممتاز محل جو تاج بی بی کے نام سے مشہور خلائق ہے اور جہاں آرا بیگم (جسکی تعمیر کردہ مسجد آگرہ میں آج تک اپنی قدیم خوبصورتی کے ساتھ قائم ہے) کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

زیب النسا بیگم دختر نیک اختر شاہنشاہ عالمگیر جسکے سوانح اکثر طبع ہوچکے ہیں اور جسکے علم و فضل کا چرچا عام زبانوں پر ہے ہندوستان کی تعلیم یافتہ عورتوں کی انگوٹھی کا بیش بہا نگ کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ فلسفہ، علم ہیئت اور علم ادب میں اعلیٰ معلومات رکھتی تھی۔ آخر میں ہمکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم کسی عام عورت کا نام نہیں دے سکے جسکی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کے نام عام طور سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کیجاتی تھی۔

ابرار حسین۔ قادری

تیر پر تیر نہیں ہیں کہ شب تار نہیں
عشق کی کونسی منزل ہے جو دشوار نہیں

مست آنکھوں کو تری کس نے بنایا بیمار
چشم بد دور یہ آنکھیں تری بیمار نہیں

دل ہو پہلو میں تو طرح کی ایذائیں ہیں
وہ ہی جب پاس نہ ہو تو کوئی آزار نہیں

سرخ دھبّے ترے دامن پہ پڑے ہیں کیسے
میں سنے نام مرے قاتل تو خطاوار نہیں

ظلم و بیداد کی غیروں سے شکایت بیجا
حد ہوئی۔ آہ۔ کہ دل بھی مرا غمخوار نہیں

مجھکو منظور نہ تھا کہ کھوجے کے ادنا دیکھو
تم رقیبوں کی نگاہوں سے خبردار نہیں

ایک تم ہو کہ کبھی بھول کے وعدہ نہ کیا
ایک فریاد کہ دل دیکے طلبگار نہیں

تطبیق سائنس واسلام

(پروفیسر فیروز الدین مراد صاحب ایم ایس سی کے ایک انگریزی مضمون مطبوعۂ ہندوستان ریویو مئی ۱۹۱۳ء کا ترجمہ)

ہم ایک اہم مسئلہ پیش کرتے ہیں جس سے سائنس اور اسلام کے مابین باہمی مناسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مذہب اسلام کے تمام احکام اور اصول قرآن مجید میں موجود ہیں۔ جسکے متعلق مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا کلامِ پاک ہے۔ ہر وہ حکم جو مذہبِ اسلام کی کسی رسم یا عبادت کے متعلق ہو قبل اسکے کہ وہ اسلام کا جزو بنے بلا واسطہ یا بالواسطہ کتاب اللہ سے اخذ کیا جانا چاہیے۔ اس بارے میں جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث فقط کلام مجید کی صحیح تفسیر کا کام دیتی ہیں۔ احادیثِ پاک میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہو۔ اور اگر کسی حدیث میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآن مجید کے خلاف ثابت ہوتی ہو تو وہ حدیث نہیں مانی جاتی۔ مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ احادیث ایک حد تک الہامی چیز ہیں۔ اتنی صدیوں کے گذر جانے کے بعد یہ امر نہایت دقت طلب ہے کہ احادیث کے ہو بہو اور صحیح الفاظ کی تحقیق کامل کی جائے۔ کیونکہ وہ آں حضرت صلعم کے زمانہ میں قلمبند نہیں کی گئی تھیں اور جو صحیح اور مستند احادیث کی کتابیں آجکل رائج ہیں وہ آں حضرت صلعم کے دو سو برس بعد لکھی گئی تھیں۔

فی الجملہ قرآن مجید اور مستند اور صحیح احادیث ہی کا نام اسلام ہے۔ اور مسلمان انکو بالعقیدہ کلام خدا مانتے ہیں یعنی کلام مجید کلامِ خدا اور احادیث کلام پیغمبر صلعم جو خداوند کریم کی ہدایات اور ارشادات کے بموجب اور کتاب اللہ کی مطابقت میں آں حضرت صلعم نے اپنی زبان مبارک سے بیان فرمایا۔

یہ ہمارے مسئلہ کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا یہ ہے کہ قدرت یا فطرت کو جیسی کہ حقیقتاً وہ ہے مخلوق خدا ماننا چاہیے۔ اسرار قدرت، اُسکے قوانین اور لاتعداد مظاہر جو ہمارے مشاہدات میں آتے رہتے ہیں سائنس اُنکو بخوبی دریافت کرتا ہے۔ اسلیے سائنس خداوند کریم کی صنعتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اور قوانین سائنس قوانینِ فطرت ہیں۔ لیکن سائنس میں ہم کو غیر متیقن اور دشوار گذار میدان طے کرنا پڑتے ہیں۔ قوانین سائنس جو فطرت کے قوانین اور اُنکے مشاہدات کی بنا پر اخذ کیے جاتے ہیں وہ انتہائی درجہ پر پہونچکر حقیقتِ اعلیٰ کے قریب قریب پہونچ جاتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ قوانین فطرت اٹل اور ناقابل ترمیم ہیں جو فقط خالق

کی سب سے زبردست قوتِ ارادی کے محکوم ہیں اور یہ خالق قادر و مختار ہے۔ اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اُسکو یہ بھی قدرت ہے کہ اگر چاہے تو نہ صرف قوانین فطرت کو بلکہ تمام کی تمام فطرت ہی کو بدلدے۔ یا انہیں ترمیم کردے یا بالکل ایک سرے سے ضائع کردے۔ واللہ علی العظیم۔ لیکن جبتک کہ خدائےتعالیٰ انسان کو انہیں قدیم قوتوں کے ساتھ پیدا کرتا رہے اور فطرت کو تماشا گاہِ انسانی اور اُسکی مہد بناتا رہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ اُسوقت تک وہ مختارِ کلُ قوانین فطرت میں خلل انداز نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس عقیدہ پر جمے ہوے ہیں کہ نظام فطرت ایک مقررہ و مستحکم ناقابل تغیر اور اٹل نظام ہے۔ اور خدائےتعالیٰ اسپر خاص خاص قوانین کے ساتھ قدرتِ تامہ رکھتا ہے۔ پس سائنس کا یہ منشا اور مقصد ہے کہ ان قوانین کا مطالعہ کیا جائے اور حضرت انسان پر خدائے برتر کی صنعتیں اور نعمتیں ظاہر کردی جائیں۔

اب اس طرح ہم ایک ایسے درجہ پر پہونچتے ہیں جہاں ہمارے مسئلہ کے دونوں اجزا باہم مل جاتے ہیں۔ اور جو فقط یہ ہے کہ خداوند کریم کے کہنے میں اور اُسکے کرنے میں کسی قسم کا اختلاف نہ تو ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہم ایسے اتفاق کو ہر الہامی مذہب کی صداقت کا ثبوتِ عظیم خیال کرتے ہیں مسلمان قرآن مجید کو خدا کا کلام مانتے ہیں اور اُنکا عقیدہ یہ ہے کہ تمام تحقیقات، ایجادات و اکتشافات قرآن پاک کے مضامین کی پیشین گوئیوں کے ماتحت اور اُنکے مطابق ظہور میں آئینگی۔

یہاں پر ایک و نکتہ نکلتا ہے جسکو دو چیزوں کی باہم مناسبت ظاہر کرتے ہوے یا اُنکا مقابلہ کرتے ہوے کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ سائنس جیسا کہ ہم بیان کرتے آئے ہیں قدرت کا سچا فوٹو کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام برخلاف اسکے علم ہیئت یا علم طبیعات سے کوئی ظاہرا تعلق نہیں رکھتا ہے بلکہ اُسکا مقصد فقط انسان کو مرتفع کرنا اور خدائے واحد کی یکتائی کا ثبوت دینا ہے۔ پس اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوے قرآن پاک کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اسی سے اُسکی اصلی غرض معلوم ہوتی ہے۔ انسان پر خداوند تعالیٰ نے جو احسانات فرمائے ہیں اُنکا شکریہ پانے کے لیے اور انسان کو اچھی طرح محسوس کرانے کے لیے کہ وہ کس حد تک خالق کا محتاج ہے خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں ضمناً و تبعاً چند باتوں کا ذکر فرماتا ہے اور چند طبیعی امور مظاہر فطرت اور کائنات کی دوسری عجائبات کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوے ہم قرآن مجید کو علم ہیئت کی درسی کتاب یا فلاں فلاں فن کا ابتدائی رسالہ یا مجموعۂ علوم و فنون نہیں سمجھتے ہیں بلکہ حضرت انسان کو علم الاخلاق سمجھانا اور اُسکو خالق کا شاکر و فرماں بردار خادم بنانا اُسکا پہلا اور لازمی مقصد تھا اور ہے، اور آنے والے

تمام زمانوں میں رہے گا۔

جہاں تک قرآن مجید سے تعلق ہے یا مرکچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے کہ نظریۂ اجزائے لاتیجزی کبھی غلط ثابت ہو جائے، یا مادہ کو ایتھر کا ایک جزو ثابت کیا جائے۔ اسلام سے اسکا کوئی تعلق نہیں کہ نظام شمسی کو سچا ثابت کیا جائے یا یہ امر تحقیق ہو کہ قمر ایک کرہ ہے جسپر دو سروں والے آدمی آباد ہیں! یہ سب اور اس قسم کی تمام باتیں اسلام میں اصولاً کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتی ہیں نہ یہ انسانی اخلاق پر اپنا اثر ڈال سکتی ہیں نہ خدا کی وحدانیت کو ان سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو لازم ہے کہ بحیثیت ایک ترقی یافتہ اور ترقی کرنے والے آزاد اور معقول مذہب کے پیرو ہونے کے سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھے چلیں اور خدائے تعالیٰ کی صنعتوں کی برگزیدہ تفسیر میں دوسری اقوام کے دوش بدوش حصۂ وافر شرکت کریں۔

قرآن پاک کا یہ ایک عام معجزہ ہے کہ تمام طبقوں کے آدمی کیا بوڑھے کیا جوان کیا سائنس دان اور کیا ادیب سب اسکے مطالعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ہر ایک اس کتاب پاک کو اپنی دماغی قوت و فہم کے مطابق سمجھتا، اور تخیل اور فکر کے لیے ایک غذائے لذیذ سے کم نہیں پاتا۔ اِس قابلیتِ کُل کا کوئی انسانی کام مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔ جس وقت ایک ادنیٰ لیاقت کا مسلمان یہ پڑھتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس مردہ زمین کو بارانِ رحمت کی بوچھاروں سے کیونکر زندہ کرتا ہے اور دن کس طرح رات کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور آسمان بغیر کسی نظر آنے والے سہارے کے کیونکر اس بلندی پر پھیلا ہوا ہے۔ تو وہ اُسی قدر ان مظاہر قدرت کے تذکروں سے محظوظ ہوتا ہے جسقدر کہ ایک فلسفی جو قانون تبخیر و غلیان اور علم ارضیات کے مبادیات سے واقف ہو یا جو اجرام فلکی کی حرکت اور نظام شمسی سے بخوبی آگاہ ہو اور جو یہ بھی خوب جانتا ہو کہ فضاء اپنے ہر ایک بُعد میں غیر محدود ہے۔ اور یہ کہ آسمان کا نیلگوں ہونا مظاہرِ قدرت میں سے ایک مظہر ہے جسکا انحصار تمام تر ہوا کے اعلیٰ طبقات میں ننھے ننھے مادّی ذرات کی موجودگی پر ہے۔

بموجب اُس تصور کائنات کے جو ہمارے سائنس کے اصول پر مبنی ہے مادہ کا ہر ایک ذرہ اور چھوٹے سے چھوٹا حصہ جو اُس کائنات میں ہے خواہ وہ کسی ذی روح کا جسم ضروری ہو خواہ کسی غیر ذی روح اور مردہ مادہ کا ممتاز حصہ ہو۔ اُسی قانون کا معمول ہوگا جو اُسپر قدرت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ جبکہ پانی کی وسیع سطح سے آبی بخارات کا صعود شروع ہوا اور بخارات آبی ہوا سے مقابلۃً ہلکے ہوں۔ اس طرح پر زیادتی کے ساتھ وہ ہوا کے بالاتر کروں کی جانب صعود کرتے ہیں اور ہوا کے طبقات میں ہوا کی

ضخامت اور حجم کے کم ہونے کے سبب جو ازدیادِ حجم بخاراتِ آبی میں ہوتا ہے اُس سے وہ ہوا کے طبقوں میں جم جاتے ہیں اور اس طرح بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بالآخر وہ باراں کی صورت میں برسنے لگتے ہیں۔ اور اسی طرح ژالہ یا برف ہو جاتے ہیں اگر وہ سرد بخارات ہلکی ہوا کے مقابلہ میں زیادہ وزنی ہونے لگیں۔ اس طریق پر ہم قدرتی قوانین کے ایک کامل سلسلہ کو طے کر چکے ہیں اور یہ سلسلۂ قوانین اُس دانائے کل اور مخلوقات کی علتِ اولیٰ یعنی خداوند عزوجل کے زیر فرمان اور اُسکے حکم کے محتاج ہیں۔ اس کتاب پاک میں خداوند تعالےٰ اُن مظاہر اور قوانین کا بیان فرماتا ہے جو کہ نوعِ انسانی کی فلاح اور بہتری کے لیے خوشنودی اور رضائے آلہی کے لازمی نتیجہ ہیں۔ ایک اَن پڑھ کو دیکھیے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُسکا خدا اُسپر اور تمام انسانوں پر کیا کیا برکتیں فیاضی کے ساتھ نازل فرما رہا ہے تو بلا اسکے کہ وہ اِن بادلوں کی ترکیب کی تحقیق کے جزوی مسائل پر غور کرے یا اُنکو سمجھنے کی کوشش کرے اپنے پروردگار کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور اُسپر توپے طور سے بھروسا کرتا ہے۔ اب سائنس داں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور علمِ آلہی کی دلآویز اور خوش کن بھول بھلیاں میں ایک نظر جھانکتے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ اُس باری تعالیٰ پروردگارِ کل کے ممنون اور شاکر ہوتے ہیں جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اتنے عمدہ قوانین فطرت جنکو اُس ارحم الراحمین نے بنایا ہے نہ ہوتے تو حضرت انسان ان سرد ہواؤں اور روح افزا بارش کی نعمتوں سے محروم رہ جاتے۔ اگر ایک جاہل آدمی اپنے مالک کا شکریہ محض ایک بارش کی نعمت پر کرتا ہے تو ایک سائنس داں جو بارش کی ترکیب سے بخوبی واقف ہوتا ہے لاتعداد نعمتوں کے بدلہ میں اپنے خدائے تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں "عالموں" کی بجید تعریف فرماتے ہوے اُنھیں خطاب فرمایا ہے۔

بعض متعصب اور سائنس نہ جاننے والے مسلمان قرآن پاک کے معانی سمجھنے میں سخت غلطی کرتے ہیں وہ اُس میں یہ پڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس کائنات میں واقع ہوتا ہے وہ بلا شرکت و مداخلت غیرے خدائے تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور جب سائنس داں مظاہر فطرت کو خاص خاص قوانین پر مبنی کرتے ہیں تو وہ ناواقف مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ لامذہب ہیں۔ قرآن مجید کے بغور مطالعہ سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ ہر ایک چیز کو اپنی جانب منسوب کرتا ہے کیونکہ تمام تغیرات کا جو اس کائنات میں ہوتے ہیں وہی علتِ اولیٰ اور سبب ہے۔ اب ایک سائنس داں جو کچھ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلہ وجود کی کچھ درمیانی کڑیوں کا مطالعہ اور اُنکی تحقیق کرتا ہے۔ وہ بھی یہی یقین کرتا ہے کہ یہ سب خدا ہی نے کیا ہے اور خدا ہی کرتا ہے۔

لیکن وہ خدائے تعالیٰ کے سب سے زیادہ عالم اور دانا ہونے کا بھی یقین کرتا ہے جو عقل اور دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مثل ایک اچھے حاکم کے خدائے تعالیٰ نے اپنی حکومت کے لیے چند قواعد و ضوابط منضبط فرمائے ہیں اور یہ کہ ان قواعد و ضوابط میں خدائے تعالیٰ کی مرضی جس میں عقل الٰہی شامل ہوتی ہے رد و بدل کر سکتی ہے اور یہ تمام اپنی مخلوق کے کاموں میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ہے۔ اور یہ کہ بلا کسی خاص ضرورت اور معقول وجہ کے خدائے تعالیٰ ان قواعد و ضوابط مقررہ میں دخل نہیں دیتا ہے۔

یہ قواعد و ضوابط سائنس کی اصطلاح میں "قوانین قدرت" یا قوانین فطرت کے نام سے اور قرآن پاک میں "سنت اللہ" کے لفظ سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ اپنے کلام پاک کی اکثر آیات میں مسلمانوں کو اسکی اور بہت سی اور باتوں کی تعلیم فرماتا ہے جن میں سے واضح ترین آیات میں سے چند یہ ہیں:— فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ دوسرے موقعہ پر فرماتا ہے:۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ قانون قدرت کی مضبوطی مطلقاً اس آیت سے ظاہر ہو جاتی ہے:۔ وَخَلَقْنَا كُلَّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ۔

اس بحث میں یعنی سائنس اور اسلام کے باہمی تعلق پر بحث کرتے ہوئے اب ہم ایک بہت اہم مقام پر پہونچتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کیا سائنس کے قوانین بالکل قوانین فطرت کے مطابق ہیں؟" یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ "کیا ہمکو پورا یقین ہے کہ ہماری سائنس کی موجودہ تحقیقات اٹل اور کامل ہیں؟" سائنس داں آدمیوں کے لیے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا جانا بالکل ظاہر ہے۔ اور تھوڑی سی تشریح اسکو سب لوگوں کے لیے بالکل واضح کر دیگی۔

سب سے پہلے ہمکو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ سائنس کیا ہے اور اسکے مقاصد کیا ہیں؟ اور عام طور پر ہم جسکو "تشریح سائنس" کہتے ہیں اُسکی کیا اہمیت ہے اور کیونکر سائنس کے اصول اخذ کیے جاتے ہیں اور انسانی علم کی حد اور وسعت اور اُسکی خصوصیات کو کیونکر وہ بالآخر معلوم کہتے ہیں؟ ہکسلے سائنس کی یوں تعریف کرتا ہے کہ

"سائنس ایک باقاعدہ اور متوسط درجے کی سمجھ کا نام ہے۔ اور سائنس داں وہ متوسط العقل آدمی ہیں جو متوسط درجے کی ادراک و عقل کی راہ میں مشاق ہیں۔ سائنس تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ہر ایک آدمی اور تمام لوگوں کا حصہ ہے۔"

یہ علم خاص خاص واقعات کے لباس میں پنہاں نہیں ہے بلکہ یہ دماغی کیفیت کا ایک خاص نام ہے۔ اور نہ یہ کسی

خاص طرز تحقیق کا محتاج ہے۔ یہ صرف اُن سچے حقیقی خیالات کا مجموعہ ہے جو فقط اُن نتائج کو تسلیم کرتا ہے جنکے بارہ میں شہادتِ کامل ملجائے۔ یہ ایک تنقید شدہ باقاعدہ اور منتظم علم ہے۔

سائنس میں مظاہر فطرت کے مطالعہ اور اُنکی تحقیقات میں جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ بلا کسی تعصب اور جانبداری کے اور اپنی شخصیت کو بالائے طاق رکھکر کرتے ہیں۔ ایک سائنس داں کے پاس مشاہدۂ عینی اور تجربہ یہی دو اصلی ذرایع تحقیقات ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں وہ دور سے قدرت کی نیرنگیاں اور اُسکے کام دیکھتا ہے اور دوسرے میں وہ نزدیک لاکر اپنی مرضی کے مطابق ادل بدل کرکے قدرتی مظاہر کی تحقیق کرسکتا ہے۔ تجربہ ہمکو دوہرا کام دیتا ہے اوّل تو اُن فطرتی قوتوں کی تحقیق پھر دوسرے نئے اصول اور موضوعات کا اضافہ۔ سائنس کے اصول میں سے ایک قانون یکسانیتِ فطرت ہے جسکا دوسرا نام قانونِ اسباب و علل ہے۔ اسباب ہمیشہ یکساں اثرات پیدا کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے ایک ہی قسم کے اثرات مختلف اسباب سے پیدا ہوسکتے ہیں۔

فطرت کے وسیع مطالعہ کی مدد سے سائنس داں مشاہدہ و تجربہ کے واقعات کو باہم مطابق اور یکجا کرنے کیلئے ایک قیاس یا نظریہ پیش کرتے ہیں جو فقط ایک مختصر بیان اور دلیل کا دوسرا نام ہے جبتک وہ اُن ہوئی باتوں کے ساتھ جو ہمارے پیش نظر ہوں مطابقت کرتا رہیگا اُسے قائم رکھتے ہیں لیکن جوں ہی نئے واقعات اور حادثات پیش آویں جو اُسکی تعریف میں نہ آسکیں تو یا تو اُسکی ترمیم کیجاتی ہے یا اگر اُس سے بھی کام نہ چلے تو پھر اسے بالکل منسوخ اور رد کردیا جاتا ہے۔ وہ نظریہ جو زمانہ کی آزمایشوں میں پورا اُترا ہو قانون سائنس کے مرتبہ پر پہونچا دیا جاتا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا جاچکا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صحیح نظریہ یا علمی قیاس میں تین باتیں لازمی ہونا چاہییں۔ (۱) اولاً یہ کہ اس نظریہ میں یہ بات بخوبی پائی جاتی ہو کہ وہ کسی خاص قسم کے مشاہدے کے تمام معلوم شدہ شرائط اور واقعات کے متعلق واضح طور پر اسباب و وجوہات بتلانے اور اُنکے درمیان مطابقت ظاہر کرنے کے لائق ہو۔ (۲) دوسرے یہ کہ وہ اس لایق ہو کہ ہمارے گذشتہ تجربۂ شخصی سے نئے مشاہدات کے واقعات کو ملاسکے۔ اور یہ کہ صحیح نظریہ میں یہ بات ضروری ہونی چاہیے کہ ہم اُسکی بنا پر دوراندیشی کرسکیں۔ یعنی ہم جو اتفاقات آیندہ کے متعلق اکثر اوقات قبل از وقوع پیشین گوئی کردیا کرتے ہیں وہ بھی کرسکیں۔ اور (۳) تیسرے یہ کہ قیاسات اور تخمینہ اور حساب جو ہم اس نظریہ کی بنا پر کرتے ہیں وہ اصل واقعہ کے مطابق ہوں۔ ڈاکٹر ڈریپر اپنی کتاب معرکۂ مذہب و سائنس میں لکھتا ہے:-

"فطرت کا سائنس کے اصول پر مطالعہ کرنے سے نہ صرف انسان کا تصور ذہنی صحیح اور مرتفع ہوتا ہے

بلکہ اُسکی خارجی حالت کو بھی ترقی ہوتی ہے۔ تحقیقات تدوین اصول کے بعد فوراً ہی عملی ایجادات شروع ہوجاتی ہیں۔ مگر قوت ایجادی فقط ضروری اشیاء ہی کی ایجاد نہیں کرتی ہے بلکہ بڑی بڑی دلچسپ اور دل بہلانیوالی چیزیں بھی پیدا کرتی ہے .... کیونکہ تجربہ سے جو نتائج اخذ ہوتے تھے وہ کچھ کم اہمیت نہ رکھتے تھے اور اسی طرح ایک نئے نگران کرامتیں دکھانے والوں کا بہت بڑا اور کامیاب رقیب ہوگیا۔ (اس موقعہ پر مسلمانوں کو چاہیے کہ خراسان کے نقاب پوش مدعی نبوت کی مثال کو پیش نظر رکھیں) وہ مقدس دھوکہ بازیاں جو گرجاؤں میں کی جاتی تھیں اُنکی حیرت انگیزی اور کشش سب کافور ہوگئی جبکہ وہ بازاری بازیگر کے مقابلہ میں لائی گئیں۔ تحقیق اور سچائی کے سامنے اوہام کی دلچسپیاں باطل ہوگئیں۔ آلۂ دوربین انسان کو کائنات کی انتہائی شان اور جلوہ گری دکھانے لگی اور خوردبین چھوٹی سے چھوٹی چیزوں اور ذروں کا ایک عجیب و دلکش تماشہ کرنے لگی۔ ایک اور عجیب بات ہیلے صاحب کے دُمدار سیارہ کی دریافت سے واضح ہوتی ہے جو سنہ ۱۴۵۶ء میں دریافت کیا گیا تھا اور جسکے بارے میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ یہ قہر خداوندی کا پیش خیمہ ہے یا یہ خدا کی طرف سے زبردست انتقام لینے کے واسطے بھیجا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پاپائے روم کی تلقین سے یورپ کے گرجاؤں کے گھنٹے اسلیے بجائے جاتے تھے کہ وہ اس بلائے آسمانی کو دور کریں اور جو مومنین تھے اُنکو یہ بتایا گیا تھا کہ ہر روز اپنی نماز میں ایک دعا اور بڑھا لیا کریں۔ اور چونکہ یہ دعائیں اکثر گرجوں خشک سالی و بارش کے موقعوں پر صاف طور پر کامیابی حاصل کر چکی تھیں اسلیے اس موقعہ پر بھی یہ اعلان کیا گیا کہ پاپائے تقدس مآب سے اس امر کا وعدہ ہو چکا ہے کہ تمکو یقیناً اس سیارہ پر فتح حاصل ہوگی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں برخلاف اسکے کہ اس سیارہ کو دعاؤں کے ذریعہ دفع کیا جاتا۔ اسکو بذریعہ دوربین دیکھا گیا اور نظام شمسی کے ایک جزو کی طرح اسکا خیر مقدم کیا گیا۔"

ہم نے یہاں اس لیے اس قدر مفصل اقتباس کیا ہے تاکہ ہم یہ بخوبی ثابت کردیں کہ سائنس کو توہمات اور اُن دھوکہ دینے والے فریبوں سے جو مذہب کے لباس میں دیے جاتے ہیں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ صورت جو کروروں مسلمانان زمانۂ حال کے طرز عمل سے نمایاں ہے تاریک پہلو سے خالی نہیں ہے۔ جماعت اسلامی میں حکمت طبیعی کے بہت سے دشمن ہیں جنکی مخالفت اکثر صورتوں میں خود غرضی اور سفاہت کی نمایاں مثال ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکے ایسے خالص اور صحیح العقیدہ مسلمان بھی موجود ہیں جو حقائق طبیعی سے اپنی آنکھیں بند کرکے تاریکی میں رہنا نہیں چاہتے اور مسلمہ طور پر اسلام میں عقلیت اور حکمت کے حامی ہیں۔

المترجم۔ سلطان علی۔ متعلم بی ایس سی کلاس (علیگڈھ)

تخمیس

بر غزل فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں صاحب والیِ رامپور

الزام سُنیے عہدِ وفا سر بسر غلط   قایم ہی رہے گی جواب ہے نظر غلط
مرتے رہو گے ہم پہ یونہیں عمر بھر غلط   میں نے کہا کہ دعوے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کسقدر غلط

تمہیدِ داستانِ دلِ بیقرار جھوٹ   تشریحِ واقعاتِ غمِ انتظار جھوٹ
تاویلِ ذوق و شوق بہر اعتبار جھوٹ   تاثیرِ آہ و زاریِ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعا سے سحر غلط

اک داغِ دل وہ مہر قیامت بھی سوا   جس وقت دیکھیے تپِ فرقت میں مبتلا
خلقِ خدا کی شرم نہ کچھ خوفِ کبریا   سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

اصلا نہیں شکایتِ گردونِ دوں دروغ   حاشا نہیں حکایتِ بختِ زبوں دروغ
انا نہیں روایتِ جوشِ جنوں دروغ   ہاں سینے سے نمایشِ داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

کیا ضبطِ غم سے فائدہ آنسو نہ پیجیے   ہاتھوں میں بات بات پہ قرآں نہ لیجیے
نادان جان کر ہمیں فقرے نہ دیجیے   آ جائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے
عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط

اصرار کر رہے ہو کہ یہ کب فریب ہیں   آنکھیں تو کہہ رہی ہیں کہ بدڈھب فریب ہیں
قسمیں بتا رہی ہیں مہذب فریب ہیں   بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

پہلے تھا سجدہ گاہِ جہاں سنگِ آستاں   پھر رفتہ رفتہ بام ہوا رشکِ آسماں
اندھیر کر دیا کہ ہوئے ایسے مہرباں   لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں

احمق ہیں ہم اسکو نہ سمجھیں اگر غلط

کچھ خیر ہے نہیں نہ کہیں تیرا ہمنشیں بھولے سے ایسی بات نہ کہنا پھر کہیں
ہم کیا کسی کو بھی تو نہ آئیگا یہ یقیں سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہمکو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی کمر غلط

آ جائیں انکی باتوں میں ساری یہ گھات ہے عارض ہیں دن کبھی تو کبھی زلف رات ہے
باز آئے اس سے ہم جو یہی التفات ہے کہنا اداکو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اُنکی سمجھنا سپر غلط

لڑکوں کا کھیل ہو گئی ٹھیری نہ عاشقی آتا ہے دل کا آپکے نزدیک دل لگی
خیر اُسکی ایک بات تھی یہ ایک ہی کہی مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے نذر دی
جانِ عزیز پیشکش نامہ بر غلط

ہر وقت موت ہی سے تو رہتا ہے تمکو کام دیکھا اودھر کسی نے کہ قصہ ہوا تمام
اللہ کس قدر ہے تمہارا خیال خام پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جاں دی ہے سرِ رہگذر غلط

اس واسطے کہ خلق سے کہے نام کر گیا تم نے سنا وہ تمسے جو مرتا تھا مر گیا
ناشاد و نامراد جہاں سے گذر گیا ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اُڑائی خبر غلط

ہے اختیار آپ کو مرنے کی ٹھانیے یا کچھ دن اور خاک محبت میں چھانیے
جو بات جھوٹ ہو اُسے سچ کیسے جانیے آیت نہیں حدیث نہیں جسکو مانیے
ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

کھٹکا تھا جسکا صدق کو آخر وہی ہوا اظہار عشق پر وہ ستمگر برس پڑا
سچ ہے کہ ہو کے رہتا ہے تقدیر کا لکھا وہ کچھ سنا جواب میں ناظم سٹپٹا گیا
وہ کیوں کہا کہ دعوے الفت مگر غلط

صدق جائسی

راج دُلاری اور مُراری داوا

اُردو میں تنقید ایک نئی چیز ہے اور اب تک جو تنقیدیں ہوئی ہیں اُن میں سے اکثر صرف مدح و ستائش سے مملو ہیں۔ تنقید لکھنے والے حضرات اس فن کی ضرورتوں کو مدنظر نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعبہ ابھی بہت کچھ اہل قلم کی توجہ کا محتاج ہے۔

انگریزی زبان میں متعدد رسالے اسی غرض سے اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ ان رسالجات سے زبان میں وہ خوبیاں رونما ہوتی ہیں جو کسی دوسری طرح ممکن نہیں۔ تصنیفات میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے اور جس مسئلہ پر کوئی قلم اُٹھاتا ہے پورا پورا اُسکا حق ادا کرتا ہے اور حتی الوسع کوئی فروگذاشت نہیں کرتا۔ پھر نقادانِ سخن ان رسالجات میں اس تصنیف کے محاسن و معائب بلا تکلف تحریر کرتے ہیں۔ کوئی اس صاف بیانی سے ناراض نہیں ہوتا۔ جو نقائص ہوتے ہیں اُن سے خود مصنف بھی آگاہ ہو جاتا ہے اور دوسرے پڑھنے والے بھی ان باتوں سے متنبہ ہو کے ان کو حرز جاں بنا لیتے ہیں۔ خوبیوں کی تعریف کی جاتی ہے جس سے مصنف کا دل بڑھتا ہے اور آئندہ اُسے تفوق و برتری حاصل کرنے کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مشہور رسالہ انگلستان کا ریویو آف ریویوز ہے جسکو مسٹر سٹیڈ آنجہانی جیسا زبردست اہل قلم ترتیب دیا کرتا تھا اور جو اُسکے غرق ہونے کے بعد بھی اُسی آن بان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسپکٹیٹر، لندن ٹائمز ایک خاص تتمہ اپنے پرچہ کے ساتھ مہینہ بھر کی کتابوں کے متعلق نکالتے ہیں جو فی الواقع پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔

ادبی تاریخ داں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ تنقید کی ایجاد کا فخر اہل عرب کو ہے جنہوں نے اپنے زمانۂ عروج میں ہر فن میں وہ وہ موشگافیاں کی ہیں جنکی نظیر صفحۂ تاریخ پر نہیں ملتی۔ سنسکرت زبان فنِ تاریخ کی طرح اس نایاب جوہر سے بھی قطعی عاری ہے۔ بہرحال آج کل تقریظ و تنقید کے الفاظ سے روشناس ہمیں صرف عربی زبان کی بدولت ہے اور جدید روشنی والے اس فن کے متعلق انگریزی کے مرہونِ احسان ہیں۔ اُردو اب ایک باقاعدہ زبان ہے اور لائق و ذی علم ہندوستانی ہر فن پر کتابیں لکھ لکھ کر اس زبان کو مالامال کر رہے ہیں۔ لیکن ان کتابوں کو آئندہ بہتر بنانے اور علم ادب کو ترقی دینے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہم ان تصنیفات کو محک تنقید پر کسیں۔ اور بغیر جنبہ داری اُنکے حسن و قبح کو اہل نظر کے سامنے

پیش کریں اور موقع دیں کہ اسپر معقول بحث ہو اور کوئی نتیجہ پیدا کیا جائے جس سے آیندہ کے لیے کوئی فائدہ مترتب ہو سکے

اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوے آج میں دو جدید تصنیفات پر تنقید لکھنے کی ہمت کرتا ہوں - اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان میں قابل اشخاص کے قلموں سے نکلے ہوے ڈراما بہت کم ہیں اور باستثناے چند کتابوں کے باقی سب کسب زر کی غرض سے لیے ہوتے ہیں - اور پبلک کا مذاق چونکہ بگڑا ہوا ہے اس لیے اُنھیں ڈراموں سے تھیٹر مقبولیت حاصل کرتے اور ملک کا بہت سا روپیہ اس بیکار مشغلہ سے کھینچ لیتے ہیں - اس عنوان پر مولانا شرر نے ابتدا میں طبع آزمائی کی تھی اور شہید وفا اور میوۂ تلخ ڈرامے لکھکے اُن کا ارادہ تھا کہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں لیکن اُنکی زندگی کے انقلاب و اضطراب نے جہاں اُنکے اور کاموں کو متزلزل رکھا، اس ارادہ کو بھی ناکمل چھوڑا - اُنھیں دنوں میں اُنھوں نے انگریزی کی طرح نظم معرّٰی یعنی بلینک ورس لکھنا شروع کی جو نئے تعلیم یافتوں نے بہت پسند کی اور ملک کے ہر کونے سے مولانا موصوف کے پاس فرمائشات آنے لگیں کہ اسپر مستقل طور سے لکھا جائے - لیکن یہ ارادہ بھی حیدر آباد کی آمد و رفت اور مولانا کی ضرب المثل بیقاعدگی کی نذر ہوا - بعد میں علم دوست حضرات نے ایک ایک دو دو کتابیں لکھیں لیکن کسی صاحب نے ڈراما کو اپنا مستقل عنوان نہیں قرار دیا - اسی وجہ سے اس فن میں کوئی قابل قدر اصلاح نہ ہو سکی - اور یہ صرف تھیٹروں کے زرق برق پردوں میں لپٹا رہا اور آفتاب ترقی و اصلاح کی کرنیں اس تک نہ پہونچ سکیں -

حال میں دو کتابیں راج دولاری، اور مراری دادا، پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے شایع فرمائی ہیں - گو راج دُلاری سنہ ۱۹۱۶ء میں میرے پاس آگئی تھی لیکن شروع کرنے کے بعد شوق نے اتنا غلبہ نہیں کیا جو اسے ختم کرتا - اب مراری دادا کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ راج دُلاری کو پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے شرف قبولیت بخشا، اور مصنف کو اعلیٰ درجہ کا انعام عطا فرمایا اور اب سفارش یہ ہے کہ اسکو پنجاب کے اسکولوں میں داخل نصاب کیا جائے - اس لیے اس دفعہ بمشکل تمام راج دلاری کو ختم کیا تاکہ اسکے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے اور اسکے حسن و قبح پر نظر ڈالی جاسکے - یہ دونوں ڈرامے مولانا شرر کے ناٹک میوۂ تلخ کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں - مولانا نے اُس ناٹک کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ عقد بیوگاں کس قدر ضروری چیز ہے اور مسلمان محض مراسم کی زنجیروں میں اسیر ہو کے اپنے مذہب سے کیسی لاعلمی برتتے اور تمدنی تکالیف اُٹھاتے ہیں - اسی طرح ان دونوں ڈراموں میں مصنف نے یہ سوال مدنظر رکھا ہے جیسا کہ وہ دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ انگریزی تعلیم و تربیت اور مغربی شایستگی کو

کس درجے تک ہم اپنے گھروں میں جگہ دیں - اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اُنھوں نے اس سوال کا جواب اپنے ہر دو ڈراموں میں کس درجہ تک شافی اور اطمینان بخش دیا ہے -

راج دولاری ۱۹۲ صفحے کی چھوٹی تقطیع کی کتاب ہے - اسکا پلاٹ یہ ہے کہ لکشمی کو اپنی بیٹی راج دُلاری کی نسبت کی فکر ہے کیونکہ اسکے تعلیم یافتہ ہونے اور مخلی بالطبع باہر پھرنے اور ٹینس کھیلنے وغیرہ سے اسکی برادری والے بدگمان ہیں اور کوئی رشتہ کرنے کی ہانی نہیں بھرتا - لیکن راج نرائن پدر راج دُلاری کا ایک دوست اسکی شادی جانکی ناتھ ایک بی اے کے طالبِ علم کے ساتھ کرا دیتا ہے - چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ راج نرائن شملہ پہ ملازم ہے اور جانکی ناتھ رام نگر کا رہنے والا ہے جہاں وہ بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو جاتا ہے - رام نگر میں راج دُلاری سوشل رفارم کا بیڑا اُٹھاتی ہے اور مدرسے کھول دیتی ہے جس سے دو فریق پیدا ہو جاتے ہیں ایک اُسکا حامی اور دوسرا مخالف - مخالفوں میں قدامت رائے - رائے بہادر بدری ناتھ اور گوپی ناتھ ہیں اور مداحین میں بخشی - جانکی پرشاد اور بابو نند کشور ہیں - زندگی کے دن اسی طرح گذرتے جا رہے ہیں کہ راج نرائن پدر راج دُلاری پنشن لے کے تارک الدنیا ہو جاتا ہے اور باوجود راج دُلاری اور اسکے بھائی رام نرائن کے منع کرنے کے وہ باز نہیں آتا - راج دُلاری کا بچہ اپنے نانا کا گریبان پکڑ لیتا ہے اسپر راج دُلاری سراپ دیتی ہے کہ گو تم اسوقت میرا دل کلپا کے جاتے ہو لیکن اس بچے کی محبت تمکو کھینچ لائے گی اور پھر میں تم سے طنزیہ گفتگو کرونگی - لیکن باپ چلا جاتا ہے ، اور کسی کی نہیں سنتا - جانکی ناتھ کو اپنے ضلع کے کلکٹر سے اَن بَن ہو جانے کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑتا ہے اور وہ فوراً ولایت بیرسٹری کے لیے روانہ ہو جاتا ہے - پیچھے راج دُلاری ملک ہند کا دورہ کرتی ہے اور بہت سا روپیہ اور کئی آدمی اپنے مشن کی تائید میں لاتی ہے - اور ایک نئی روشنی کے نمونہ مسٹر بھاردواج کو راہِ راست دکھاتی ہے ادھر جنگ ٹرنسوال کے چھڑ جانے کی وجہ سے جانکی ناتھ فوج والنٹئر میں بھرتی ہو کے میدان جنگ کو جاتا ہے جہاں وہ فسانہ آزاد کے میاں آزاد کی طرح کارہائے نمایاں کرکے کپتان آنمن ہو جاتا ہے لیکن بعد میں ملک افریقہ کے قریبی جزیرہ کے وحشیوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جاتا ہے - معجزنما طریقہ سے وہ وحشیوں کی لڑکی کے جنگل سے بچتا ہے - ادھر موقع پاکے مخالفین راج دولاری کو ایک چال سے تکلیف کے بھنور میں پھنسا دیتے ہیں - راج کا لڑکا بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے - قدامت رائے ایک فرضی خط پولیس انسپکٹر کو لکھتا ہے کہ بچہ طاعون میں مبتلا ہے - اسپر وہ انسپکٹر کلکٹر ضلع کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے بچہ کو پانی میں بہا دیتا کہ

اور راج کو پلیگ کوارنٹین میں محبوس کر دیتا ہے جہاں سے ایک عجیب طریقہ سے وہ رہائی پاتی ہے اور ناظرین کی گرفتاری اور بچہ کی گم شدگی کے رنج میں صاحب فراش ہو جاتی ہے۔ اتنے میں جو لوگ بچہ کو گنگا کے کنارے کنارے ڈھونڈھنے گئے تھے مع راج نرائن پدر راج دُلاری کے آتے ہیں اور بچہ کے زندہ مل جانے کی خوشی سناتے ہیں۔ راج باپ سے طنزیہ گفتگو کرتی ہے۔ اسی اثنا میں جانکی ناتھ بھی آجاتا ہے اور جان اور راج دونوں بغلگیر ہوتے ہیں اور تماشہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے پلاٹ۔ جو غرض دیباچہ میں تحریر کی گئی ہے اُسکے مطابق پلاٹ کو مرتب نہیں کیا گیا۔ محض راج دُلاری کی گفتگوئیں اور پھر اس عنوان کی تفصیل و توضیح کرتی ہیں جہاں پڑھنے والا اُکتا جاتا ہے اور اس سے بھی بُرا اثر تماشہ دیکھنے والوں پر پڑنے کا احتمال ہے۔ قصہ کو دل آویز و موثر بنانے اور اُسکے نتائج دلنشیں کرنے کے لیے لازم ہے کہ پند و نصائح کو بصورتِ واقعات دکھایا جائے تاکہ ناظرین نتیجہ خود بخود مستنبط کریں ورنہ یوں تو سیکڑوں کتابیں پند و مواعظ کی ہیں جنکو صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو دنیا کی دلچسپیوں اور دلکشیوں میں لطف محسوس نہیں کرتے۔ راج دُلاری کی تصنیف کا جو مقصد ہے وہ کُل قصہ کا محور ہونا چاہیے تھا۔ اور اسی سے معمولی عقل کا آدمی وہ نتیجہ اخذ کر لیتا جو مصنف نے دیباچہ میں اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ میری رائے میں جناب کیفی نے سخت فروگذاشت کی ہے کہ راج دُلاری کو آج کل کے فسانوں اور ناولوں کی طرح قصہ ہی کہا۔ اور اپنے موضوع کو صرف راج دُلاری کی گفتگو کے ذریعہ سے ظاہر کیا۔ اسکے علاوہ پلاٹ میں کوئی خاص جدت یا دلکشی نہیں ہے۔ فسانۂ آزاد کی طرح جانکی ناتھ کو ایسا ہیرو قرار دیا ہے جسکی نظیر نہایت کمیاب ہے۔ میاں آزاد جوش عشق میں ہندوستان سے سفر کر کے روم کو بہ ارادۂ شرکت جنگ جاتے ہیں اور وہاں ایسے ایسے کارہائے نمایاں کرتے ہیں کہ آزاد سے آزاد پاشا ہو جاتے ہیں اور از اول تا آخر مافوق العادت دلربائیوں اور خوبیوں کا معدن و منبع بنے رہتے ہیں۔ جناب کیفی کا دعویٰ اُردو ڈراما نویسی میں موجودہ ناٹک سے ایک انقلاب پیدا کرنے کا ہے لیکن زلدربائی اور کاسہ لیسی اُن دعووں کو ذرہ بھر بھی پورا نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی اُردو کے مصنفوں کے دماغوں سے پچھلے زمانوں کی خیالی داستانوں کا نقش محو نہیں ہوا۔ بوستانِ خیال، طلسم ہوشربا، فسانۂ عجائب وغیرہ جیسی داستانیں گو اب اس ذوق و شوق سے ہر جگہ نہیں پڑھی جاتیں لیکن اُنکے مضامین کی جھلک آج کل کے قصوں میں ضرور نظر آجاتی ہے۔ جو ہیرو بنایا جاتا ہے عموماً اُسکو معمولی افتادِ طبیعت و روشِ زمانہ سے بالاتر دکھایا جاتا ہے

اُسکے محاسن اس طرح ظاہر کیے جاتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے لیکن حقیقۃً یہ بہت بڑا نقص ہے۔ اگر ہم فسانہ نگاری سے کوئی نتیجہ تمدنی یا اخلاقی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں واقعات روزمرہ کی زندگی سے لینے چاہییں اور انسانی سیرت فطرت کی خوبیاں و کمزوریاں اسی طرح دکھانی چاہییں گویا وہ واقعات کتاب دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ہی گزر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راج دلاری کو پڑھنے کے بعد پلاٹ دماغ میں ایک قصہ کی ہی حیثیت سے رہتا ہے اور کوئی عملی فائدہ رونما نہیں ہوتا۔

پلاٹ کے بعد ہمیں تسلسل مضمون، ترکیب عبارت و محاورۂ زبان، اشخاص ناٹک و دیگر ضروریات پر نظر ڈالنی ہے۔ آج کل کے مصنفین قصہ نگاری کی دُھن میں مطابقت مضمون کا خیال نہیں رکھتے عموماً یہی پتہ نہیں چلتا کہ جائے قصہ کہاں ہے اور کیا موسم ہے۔ چنانچہ راج دلاری میں موسم کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ غض کمپنی والوں پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ جس موسم کا چاہیں لباس زیب تن کریں۔ خواہ ایک سین کا لباس دوسرے سین کی پوشاک سے بالکل مختلف و متناقض ہو۔ جب مصنف راج دلاری نے اپنے ناٹک میں ہدایات اسٹیج میں خاص اہتمام سے کام لیا ہے تو تعجب ہے کہ یہ فروگذاشت کیسے وقوع میں آئی۔

اسکے علاوہ واقعات سلسلہ وار بیان کیے جانے چاہییں۔ پہلے ایکٹ کے پانچویں سین میں بدری ناتھ کی زبان سے ناظرین کا نواب سلیمان قدر و قمر الدولہ وغیرہا سے تعارف کرایا جاتا ہے اور یہ ذکر محض ضمناً آتا ہے۔ اس ایکٹ میں ۱۳ سین ہیں۔ دوسرے ایکٹ کے دوسرے سین میں یکایک بڑی بیگم اور اُنکی لڑکی اپنے بیٹے سلیمان قدر کی آوارہ مزاجی پر متفکر نظر آتی ہیں۔ اس ڈرامہ کے پہلی مرتبہ دیکھنے والے کو دوبارہ ورق گردانی کرکے بدری ناتھ کی گفتگو دیکھنی پڑتی ہے جیسے بوستان خیال کا مصنف اپنا ایک قصہ چھوڑ کے دوسری نئی بات شروع کر دیتا ہے اور پھر اسی جلد میں بہت دور یا دوسری تیسری جلد میں اس پرانے قصہ کو شروع کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے کہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ فلاں موقعہ پر فلاں جلد میں ایسا ایسا ہوا تھا، اور پڑھنے والا غریب یا تو بمشکل اُسکو سوچ کے یاد کرتا ہے یا اُس پچھلی جلد کو اُٹھا کے یاد تازہ کرنے کے لیے دوبارہ قصہ کو پڑھتا ہے۔ اسی طرح راج دلاری میں اس موقع پر دماغ کے ساتھ کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ بوستان خیال کا مصنف پچھلا تھوڑا سا خلاصہ تحریر کرکے یاد تو دلا دیتا ہے لیکن یہاں ڈراما ہونے کی وجہ سے یہ بھی میسر نہیں۔ میری رائے میں اس قدر حد فاصل مستحسن نہیں ہے۔ پڑھنے والوں اور تماشہ دیکھنے والوں کو ایک تسنطہ و تذبذب کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ایسے ہی اکثر جگہ یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ ایک شخص کوئی سوال اپنی لاعلمی کی وجہ سے کرتا ہے

دوسرا جواب دینے کو ہوتا ہے کہ خود ہی وہ شخص جواب دینا شروع کر دیتا ہے یا ایک شخص اپنی واقفیت یا شاہد کی بنا پر کوئی بات کہتا ہے دوسرا اُس بات کو لیک کے خود بھی کچھ کہنے لگتا ہے ۔ اصل غرض مصنف کی یہ ہے کہ جو اشخاص سین ہوں بیکار نہ رہیں ۔ گفتگو میں ہر ایک کو شرکت کا فخر حاصل کرنا چاہیے خواہ وہ بیجا ہی کیوں نہ ہو ۔ پہلے ایکٹ کے پانچویں سین میں راج دُلاری کے مخالفین قدامت رلے ، بدری ناتھ اور گوپی ناتھ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ۔ بدری حیران ہوکے پوچھتا ہے کہ" اور تو اور سنتا ہوں راج دُلاری کا جادو بڑی بیگم پر بھی چل گیا"۔ اور یہ بات جو سیاق گفتگو سے سوال کا طرز لیے ہوے ہے خود بخود آگے جاکے بدری صاف کر دیتا ہے یعنی خود ہی جواب دیتا ہے ۔ گفتگو قلمبند کرتے ہوے متکلمین کا ضرور خیال رکھنا چاہیے اور ہر شخص کے منہ سے باموقع و برجستہ بات نکلنی چاہیے ۔

ایک نقص اُردو کے ناولوں میں عام طور پر یہ پایا جاتا ہے کہ عبارت میں مطابقت نہیں رکھی جاتی ۔ مخالفت بیانات مضمون کی خوبی کو ملیامیٹ کر دیتا ہے ۔ افسوس ہے کہ ڈراما زیر بحث بھی اس عیب سے مبرّا نہیں ہے ۔

(۱) چنانچہ پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں راج نرائن اپنے نوکر سے کہتا ہے کہ" شام ہوگئی ہے ۔ بچوں سے کہو کہ اب کھیل بند کریں ۔ لیکن ٹھہرو ۔ کوئی باہر کا تو نہیں ہے "۔ نوکر کہتا ہے کہ" ہاں مس صاحب ہیں ۔ فلورا "۔ اسپر راج نرائن کہتا ہے "اچھا رام جی کو الگ بُلاکے سمجھانا ۔ سمجھے "۔ اس سے آگے چھٹے سین میں تختی جانکی پرشاد کی زبانی یہ عقدہ کھُلتا ہے کہ فلورا راج نرائن کے آغوش تربیت میں زندگی بسر کرتی ہے اور اوائل زمانہ سے وہ اُنکے گھر رہتی ہے ۔ کیونکہ اُسکے والدین مرگئے اور وصیت کے وقت اپنی بچّی کو راج نرائن کے سپرد کر گئے ۔ علاوہ ازیں فلورا اور راج دُلاری کی گفتگو سے بھی یہی بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ اس خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی ہے ۔ ایسی صورت میں راج نرائن اور نوکر کی گفتگو کسقدر بھدّی اور بیموقع ہے ۔

(۲) ایکٹ اول کے دوسرے سین میں راج نرائن کو اُسکے دوست کی چھٹی ملی ہے جس میں لئے ایک رشتہ بتایا گیا ہے ۔ جانکی ناتھ شملہ پر کرکٹ کا ایک میچ کھیلنے کو آیا ہوا ہے ۔ راج نرائن آپ ہی آپ باتیں کرتا ہے کہ

"یہ رلے صاحب کا خط خوب تنت پر پہونچا نہیں تو خدا جانے کے دن تک ہوبی مہاراج کا ٹھٹا جڑا رہتا اور کیا حسن اتفاق ہے کہ لڑکا بھی آج کل میں یہاں آیا چاہتا ہے بلکہ آج صبح وہ لوگ یہاں پہونچ گئے ہونگے مگر وہ نئی جگہ بن بلائے آئیگا کیسے ۔ اسکی سبیل یہ ہے کہ میں اُسے بحیثیت اُس کے باپ کے دوست کے چھٹی لکھے دیتا ہوں "۔

چنانچہ وہ چٹھی لکھ کے فوراً اپنے چپراسی کو دیتا ہے کہ انڈین ہوٹل میں فلاں ٹیم کے فلاں لڑکے کو لے آئے۔ اسی اثنا میں راج نرائن بیوی کو بلا کے یہ خبر سناتا ہے۔ اسکے بعد فلورا، راج دُلاری اور اُسکا بھائی رام نرائن بھی آ جاتے ہیں۔ فلورا کو ایک مذاق سوجھتا ہے اور وہ رام نرائن کو سمجھا کے خود باہر ٹہلنے لگتی ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ فلورا کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جانکی ناتھ کو اس وقت بلایا ہے۔ وہ باہر ٹہل رہی تھی کہ جانکی ناتھ آتا نظر آیا۔ دونوں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ چونکہ جانکی ناتھ راستہ سے بیخبر ہے اسلیے فلورا اُس سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ راج مندر میں پہونچا دیگی لیکن چونکہ تاریکی چھاگئی تھی اسلیے لالٹین کا لینا فلورا نے ضروری سمجھا اور اتنی دیر کیلیے اُس نے راج دُلاری کے کمرے کا دروازہ کھول کے اُس میں اُسے بیٹھ کے انتظار کرنے کو کہا۔ اس اچانک داخلہ سے راج دُلاری اور جانکی ناتھ کی ایک بیچ ہوتی ہے۔

اب [illegible] یہ ہے کہ جب فلورا کے سامنے راج نرائن نے جانکی کے بلانے کا کوئی ذکر نہیں کیا تو اُسے یہ الہام کیسے ہوا کہ راج دُلاری اور جانکی کے ساتھ دل لگی ہونی چاہیے۔ دوسرے ابھی چٹھی بھیجی ہی گئی ہے لیکن مصنف کے نقطۂ خیال سے وہ جانکی کو مل بھی گئی اور وہ آن واحد میں آ بھی پہونچا اور جانکی راستہ سے بیخبر ہے اگر چپراسی رقعہ پہونچا دیتا اور جانکی فوراً چل پڑتا تو ضرور چپراسی بھی ساتھ ہوتا۔ یہ باتیں وقت تصنیف خیال رکھے جانے کے قابل تھیں جنکا نظر انداز کیا جانا ضرور تاسف خیز ہے۔

(۳) ایکٹ وال سین دوم میں راما ایک معمولی لڑکا نظر آتا ہے۔ اسکے بعد ہی چھٹے سین میں وہ ایم اے، ایل ایل ڈی، پی ایچ ڈی، ہو گیا ہے۔ حالانکہ تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا سین بہت قریب مانے کے ہیں۔ رام نرائن ایم اے بھی ہو گیا۔ اور ولایت جاکے ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے اپنے وطن واپس بھی آ گیا۔

(۴) پہلے ایکٹ کے آٹھویں سین میں راج دُلاری جانکی ناتھ کے دہلی سے واپس آنے کا انتظار کر رہی ہے دل بہلانے کے لیے چمن میں ست خرام ہے لیکن مالیوں کی غفلت پر جھلا اُٹھتی ہے اور سب پودوں اور پھولوں کو مرجھایا دیکھ کے کہتی ہے:-

"جدھر دیکھو خزاں کا موسم چھایا ہوا ہے ..... یہ باغ ہے یا اُجاڑ سنسان ویران۔ مجھے تو اسکے دیکھنے سے وحشت معلوم ہوتی ہے"

اتنے میں جانکی ناتھ آ جاتا ہے۔ آپس میں عشق و محبت کی باتیں ہونے کے بعد آخر راج گفتگو کو اس طرح ختم کرتی ہے:

"آؤ ذرا ادھر ٹہلیں۔ کیا رونق اور کیسی بہار ہے۔ دیکھو دیکھو پتے پتے پر کیسا جوبن ہے"

گویا جانکی کے آتے ہی وہ سنسان اُجاڑ سرسبز باغ بنگیا - اور پتہ پتہ پر رونق آگئی۔

(۵) کلکٹر صاحب کی میم کی جب شادی نہ ہوئی تھی ایک مرتبہ اسکی جانکی ناتھ سے ریل گاڑی میں ٹبھیر ہوئی تھی اور اوس وقت جو گفتگو ہوئی تھی اُس سے میم صاحبہ بہت ممنون ہوئی تھیں۔ اور جانکی ناتھ اُسی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر تھا جہاں سے کلکٹر سے وہ بیاہی گئی۔ بنگلہ پر آتے جاتے یا اور مواقع پر ضرور جانکی ناتھ پر میم صاحبہ کی نظر پڑجانے کا امکان ہے۔ لیکن جب کوارنٹین میں راج دُلاری محبوس ہوتی ہے اور اپنی بدقسمتی پر آہ و بکا کرتی ہے اُس وقت کلکٹر اور میم صاحبہ اتفاق سے آنکلتے ہیں۔ چونکہ وفورِ غم سے راج کو کچھ نظر نہیں آتا اس لیے اپنے خطوط میم صاحبہ سے پڑھواتی ہے۔ بعد میں راج تصویر کے ایک لاکٹ کو اپنے گلے میں ٹٹولتی ہے جو نہیں ملتا۔ میم صاحبہ زمین سے اُٹھا کے دیتی ہیں اور اُسپر نظر پڑجانے سے اُسے پہچان لیتی ہیں اور دوسری جگہ اپنے شوہر سے کہتی ہیں کہ میں جانکی ناتھ کو جانتی ہوں۔ باوجود اسکے دو ایک جگہ یہ دکھایا جاتا ہے کہ کلکٹر صاحب اور جانکی ناتھ کے چھٹنے کی وجہ یہ تھی کہ جانکی نے اپنی گورنس کو برخاست کردیا تھا وہ کلکٹر صاحب کے یہاں ملازم ہوگئی۔ وہ اُسے بہکایا کرتی کہ میم صاحبہ کا تعلق ایک دفعہ پہلے جانکی سے ہوچکا ہے۔ اس سبب سے وہ جانکی ناتھ کو دق کیا کرتا تھا۔ ایکٹ ۲ - سین ۱۴ میں اسکا ذکر آتا ہے جو نہایت مبہم ہے۔ قارئین کرام خود غور فرمائیں کہ کیا تناقض ہے۔ لطف یہ ہے کہ گورنس کو ریل میں جانکی اور میم صاحبہ کی ملاقات کی خبر نہیں ہے۔ پھر بہکانا کیسا؟ اسی طرح اسی ایکٹ کے سین ۱۸ - ۱۹ بالکل مبہم ہیں۔ رام نرائن اسی شہر میں ایک ممتاز جگہ پر متمکن ہے۔ کلکٹر صاحب کی صورت سے ضرور آشنا ہوگا اور ملنے کا موقع بھی ضرور ملا ہوگا۔ کلکٹر ضلع سے ہر معزز ملازم شخص خواہ ملنے کا کتنا ہی چور ہو دو ایک دفعہ تو ضرور مل لیتا ہے لیکن ان دو مذکورہ بالا سینوں میں اسقدر ابہام ہے کہ کلکٹر رام نرائن سے باتیں کرتا ہے اور سین ۱۷-۱۸ میں یکجا رہتے ہیں لیکن سین ۱۹ میں اجنبی ہوکے ملتے ہیں اور باوجود راج دُلاری کے ملائم لہجے کے رام ناگواری سے کلکٹر ضلع سے ہاتھ ملاتا ہے۔

(۶) جب جانکی ناتھ ولایت گیا ہے اُسکا بچہ بہت ہی چھوٹا تھا۔ تیسرے ایکٹ کے چوتھے سین میں یکایک سروپ کا ذکر آتا ہے۔ پہلی مرتبہ پڑھنے والے کو گیارہویں سین تک یہ پتہ نہیں ملتا کہ سروپ کون ہے۔ اس سین میں راج دُلاری ڈاک خانہ جانے سے پہلے اپنے بچے کے دیکھنے کو آتی ہے۔ یہاں ناظر سمجھتا ہے کہ سروپ راج کا بیٹا ہے۔ اس سین میں بھی اس بچہ کی زبان سے ایک فقرہ بے محل نکلا ہے:

"کہیں پاپا کی طرح تم بھی غائب نہ ہوجانا۔ ماموں بھی نہیں ہیں"

جن دنوں جانکی ولایت گیا ہے اس بچہ کو ہوش نہیں تھا اور اسکو ایک عرصہ بھی گزر چکا تھا۔ ولایت میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد جانکی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ وہ فوج انگلستان میں رہی۔ بعدازاں ضرورۃً افریقہ بھیجدی گئی جہاں جانکی ناتھ نے کارہائے نمایاں کیے لیکن بعد میں اتفاقاً وحشیوں کے ہاتھوں میں اسیر ہوگیا۔ ان تمام واقعات کے تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جانکی ناتھ کو گئے اتنا زمانہ گزر چکا تھا۔ چنانچہ ایکٹ ۱۔ سین ۱۲ میں شیر خوار بچہ دکھایا گیا ہے۔ جسکے تھوڑے ہی دنوں بعد ناتھ ولایت روانہ ہوگیا۔

یہ اختلافات و نقائص سرسری طور سے پڑھنے والے کو بھی کھٹک جاتے ہیں۔ پنڈت کیفی جیسے انشا پرداز سے انکا صدور ضرور تعجب خیز ہے۔ اب مجھے اشخاص ڈراما کے کیرکٹر کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ اچھے ناول کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسکے اشخاص دنیاوی اور واقعی ہوں۔ محض خیالی یا ملکوتی صفات واقعات کے متلاشی کو تسلی نہیں دے سکتے۔ اور جو سیرت و سرشت کسی شخص کی دکھائی جائے اول سے آخر تک وہی قائم رکھی جائے۔ یہاں بھی اختلاف و تضاد نہایت برنما ہے۔ راج دُلاری جو اس ڈراما کی ہیروئن ہے، جسکی شخصیت پر اس قصہ کا دارومدار ہے نہایت اعلیٰ صفات کی لیڈی ہے۔ جتنے کام اس نے کیے ہیں سب حیرت انگیز ہیں اور کوئی کامیابی سے خالی نہیں لیکن مصنف نے اس میں اس درجہ غلو کیا ہے کہ کئی جگہ اسکو روحانیت کا وہ درجہ عطا کر دیا ہے جو بڑے بڑے زاہد و عابد مدتوں کی ریاضتوں اور جفاکشیوں پر بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ معمولی اُفتادِ زمانہ سے راج دُلاری بہت بالاتر ہے۔ ایکٹ ۱۔ سین ۱۳۔ میں راج دُلاری بہت غمگین ہے۔ وجہ یہ بتاتی ہے کہ جو کچھ ہونا ہے ہوئے جاتا ہے۔ چنانچہ راج نرائن اُسکا باپ اُس سے اور رام نرائن سے ملنے آتا ہے اور دنیا کو تیاگ دینے کا عزم بالجزم ظاہر کرتا ہے تو راج دُلاری اُسے بالحاح وزاری منع کرتی ہے لیکن یہ تضرع اُس پیرمرد پر ذرا کارگر نہیں ہوتا۔ آخر مایوسی کی جھنجھلاہٹ میں وہ اپنے بچہ کو اُسکی گود میں دیتی ہے جسے تھوڑی دیر بعد چونک کے راج نرائن راج دُلاری کو واپس دیتا ہے لیکن بچہ کا ہاتھ اپنے ناناکے گریبان میں اُلجھ جاتا ہے اسپر راج کہتی ہے:-

"آہ! پاپا۔ تم میری آتما کلپا کر ہمارے دل دُکھا کر جاتے ہو۔ یاد رکھنا اگر میں تمہاری بیٹی اور بقول تمہارے سیتا اور پدماوت کی جانشیں ہوں تو یہ ہاتھ (بچہ کی طرف اشارہ کرکے) جو کمزور ہاتھ۔ ہاں یہی ننھا سا ہاتھ ایک دن تم کو کھینچتا ہوا یہاں راج نواس کے پھاٹک پر لائیگا اور میں کہوں گی پاپاجی جاؤ اپنی بن کٹیا کو چلے جاؤ اور اس بالکے کو بھی واپس لے جاؤ مگر تم نہیں جاؤ گے اور میرا دامن پکڑ کے بیٹھ جاؤ گے"۔

چنانچہ یہ پیشینگوئی حرف بحرف آخری سین میں تکمیل کو پہونچی۔ اسی طرح بالکل آخر میں جب راج نرائن اپنے داماد کا حال

اپنے بیٹے رام سے پوچھتا ہے تو راج مرتاض کا منہ کی طرح ذومعنی الفاظ میں کہتی ہے کہ " جان - جان - جان - اب اس قید فنا سے آزاد ہونے کو ہے" اس فقرہ کا ختم کرنا تھا کہ جان آپہونچا اور اپنی معشوقہ کو گلے سے لگا لیا - اس طرح یہ دوسری پیشین گوئی فی الفور پوری ہوئی -

عقل و دانش میں راج دُلاری کامل ہے حتیٰ کہ بھاردواج وسلیمان قدر و مدرسہ والے وغیرہم اسکی حیرت انگیز تمثیلوں سے ایک ہی ملاقات میں راہ راست پر آجاتے ہیں - اسکی براہین قاطع کی کوئی تاب نہیں لاسکتا - غرضکہ اُس میں کوئی نقص نہیں نظر آتا - یا تو اُسکے کمالات اس درجہ کو پہونچے ہوے ہیں یا اُس سے ایک جگہ ایسی کمزوری ظاہر ہوئی ہے جسکا ارتکاب اُس جیسی زیرک ذی ہوش لیڈی سے بعید از قیاس اور غیر یقینی ہے - ایکٹ ۳ سین ۲ - میں وہ ایک نجومی کو بلاتی ہے اور اُس سے اپنے معشوق و عاشق شوہر کے متعلق سوال کرتی ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ وہ میدان جنگ میں ایک تیر سے زخمی ہوکے ایک عورت کے ہاتھ میں گرفتار ہوجائیگا - لیکن بعد میں رہائی کا یقین ہے - تو وہ رنج سے بیتاب ہوکے اُسے رخصت کردیتی ہے اور پھر اپنی اس کمزوری پر پڑتی ہے لیکن نجومی کا حساب لفظ بلفظ درست ثابت ہوتا ہے ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا ۔

ایسے ہی رلے بہادر ہری ناتھ کو ایک مسخرے کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے لیکن کہیں کہیں وہ متانت بھی اختیار کرلیتے ہیں - اس موقع پر میں اتنا عرض کرونگا کہ ایک رلے بہادر کے لیے مسخرے کا پارٹ نہایت نازیبا ہے اور بھاری بھرکم ہونے کا جو گمان اُنکے نام کے پڑھنے سے ناظر کے دل پر پڑتا ہے وہ اُنکے اصلی رنگ سے مبدل بہ نفرت و کراہت ہوجاتا ہے -

فلورا ایک چلبلی طبیعت کی لڑکی ہے - یہ امید اول کے دو تین سینوں میں اسکے متعلق پیدا ہوگئی تھی کہ اسکی گفتگو آئندہ ڈراما میں ایک خاص چٹخارہ دیگی لیکن باوجودیکہ وہ راج نرائن کے آغوش عاطفت میں پرورش پاتی اور اُسکے خاندان کے ممبر ہونے کی حیثیت سے رہتی سہتی ہے لیکن پھر اُسکو راج نرائن یا راج دُلاری کے کُنبہ میں نہیں دیکھا گیا - حالانکہ ایکٹ ا - سین ۴ - میں ہری کشن اور بخشی جانکی پرشاد کی گفتگو سے یہ بات عیاں ہے کہ وہ راج دُلاری کے ساتھ ہے اور برادری کے لوگ ایک بدیسی عورت کے راج وناتھن کے ساتھ ایسے خلا وملا سے ناراض ہیں - البتہ ناتھن کے افریقہ میں گرفتار ہوجانے کے موقع پر فلورا کا اتنا حال کھلتا ہے کہ اب وہ انگلستان میں ہے اور وہ ناتھن کے متعلق راج سے خط وکتابت کرتی ہے اور آخر میں اُس جزیرہ میں جہاں جانکی مقید ہے جاتی ہے - پھر اسکے بعد یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ چھلاوا کہاں گیا - !

بعض اشخاص کا ذکر اُس صفحہ پر نہیں ہے جسکو تختۂ ناٹک کہا جاتا ہے اور جہاں ہر شخص کے متعلق مختصر سا نوٹ درج ہوتا ہے اسلیے بعض جگہ اجنبی لوگوں کے آجانے سے خلجان سا ہونے لگتا ہے۔

سورج و چاند کا جب ذکر آتا ہے اُس وقت یہی صورت پیش آتی ہے لیکن بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ظرافت اور طفلی کی شوخی کا ایک عمدہ نمونہ پیش نظر کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے اپنے ذکر میں فکر و تامل سے کام لیا ہے لیکن یہاں بھی بعض جگہ وہ لغزش کھا گئے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے بہت چھوٹی عمر کا ایک جوڑا شوخی اور چلبلاہٹ دکھا رہا ہے کہ یکایک معلوم ہوتا ہے کہ سورج بی اے ہو گیا۔ اور اسکے دو ایک سین بعد چاند مذاق کرتی ہے کہ ہائیکورٹ میں مقدمہ کرنے گئے اور مخالف سمت کی بحث شروع کردی۔ گو سورج بی اے ایل ایل بی بتایا جاتا ہے لیکن اسکے بعد بھی جو مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اُن میں وہی طفلانہ چھیڑ چھاڑ اور شرارت آمیز گفتگو قائم ہے جو کسی طرح اُنکی عمر و درجۂ تعلیم کے متقاضی نہیں۔ آخر تک وہ دونوں بچے معلوم ہوتے ہیں۔ (باقی دارد)

محمد ظفر (ایم اے ایل ایل بی) گڑگانوہ

شادمانی کا تری باعث تھا یہ ناشاد بھی　　اے نگاہِ بے مروت یاد ہے تجھے کچھ یاد بھی!
اُسکی چشمِ نشئیں نے کر دیا ہے زہرہ آب　　بے صدا ہے نالہ بھی خاموش ہے فریاد بھی
ہو رہائی کا سبب شاید پر افشانی مری　　تنگ ہے مجھ سے قفس میں خانۂ صیاد بھی
بس یہی حسرت نگاہی ہے فغانِ بلبلاں　　کیا کوئی فریاد ہے ظالم مری فریاد بھی؟
ہے عجب حیرت کا عالم صیدگاہِ عشق پر　　صید بھی مُنہ دیکھتا ہے محو ہے صیاد بھی
قدِ موزوں کی ترے صلِ علےٰ کیا بات ہے　　اس قیامت کا نہ ہوگا مصرعہ استاد بھی
دام سے تیرے نکل کر ہو بلا گردانِ دام　　صید تیرا کر دیا جائے اگر آزاد بھی
اے جزاک اللہ یہ چتون تری بیدادگر　　داد دینگے کشتگانِ خنجرِ بیداد بھی!
پر کتر ڈالے تھے پہلے ہی مرے صیاد نے　　چھین لی ظالم نے اب تو طاقتِ فریاد بھی
جس سے تجھکو کچھ بھی نسبت ہے وہ ہے فرخندہ بخت　　کشتۂ احساں ہے تیرا کشتۂ بیداد بھی
آپ آئے ہیں مرادیں پا رہے ہیں دل کی ہم　　شکوۂ فرقت کا کریں کیا۔ ہے نہیں کچھ یاد بھی
ہو فقط بیداد ہی تو دادخواہی ہم کریں　　یہ ستم ہے کہتے ہیں وہ لطف بھی بیداد بھی
کیا ہوا وحشت اگر ہوں دور کوئے یار سے
رکھتی ہے نسبت چمن سے نکہتِ برباد بھی

رضا علی وحشت

غزل جناب تپش

زمستی سر کنم ہوئے کہ افروزد گلستاں را — ز شورش بر کشم آہے کہ سوزد نیستاں را
زنم بر فرقِ خود سنداں کہ من سر با خستن دانم — بہ بازی گاہِ یاراں ہدیہ کردم جام و سنداں را
بروئے چارہ گر در قدبرم ذاں ناشناساں رو — تنا بہ لذتِ رنجوریم تیمار و درماں را
بجرمِ آنکہ لذاتِ فنا را خوش نیندیشد — بیابے مرگ ریزم آبروئے آبِ حیواں را
صلائے نامرادی تلخکاماں را کہ می خواہم — تنے چند از رفیقاں گرمیِ بازارِ حرماں را
گرفتارانِ عشقش را کجا یارائے سرتابی — بمعشوقانِ رنگیں عرضہ فرما بند و زنداں را
ہجومِ ناکساں آخر وبالِ انجمن باشد — کہ انبوہِ تہی مغزاں بسوزاند نیستاں را
ز طوفانِ جنونِ عقلِ عمل پیرا چہ می پرسی — کہ آں تنہاست در سر صد چراغِ زیرِ داماں را
تماشائے پلیدن بیں کہ از دشواریِ مردن — پیامِ مرگ دادم آرزوئے مرگِ ساں را
بدرگاہِ خدا خوانیم استسقائے مستانہ — رحیقِ خلد بارد ز آسماں تکریم مستاں را

طلوعِ نیرِ توحید آمد صبحِ عرفاں را — ز طاقِ دیرِ کفر آمد بروں شمعِ طغیاں را
فروغِ طالعِ مجنوں ز انوارِ جہاں آرا — بصحرائے جہنم چرخ زن انداخت شیطاں را
شہِ کشور عطائے ما چو بر اورنگِ فقر آید — بانبوہِ گدایاں سیدہ ملکِ سلیماں را
نبی در اوجِ وحدت ارتفاعِ شانِ محبوبی — کہ پامالِ سمندِ ناز سازد بزمِ رضواں را
براقش چوں بہ اسرائے رو پروازِ تعلی شد — غبارِ خاکِ راہش طوطیا شد چشمِ کیواں را
بسرکارِ رسالت می سرایم نغمۂ رنگیں — ز انگشتِ شہادت بر زنم تارِ رگِ جاں را
تپش از نعرۂ نقش اگر آرد صبا بوئے — فدائے مقدمش سازم بہائے دین و ایماں را

عبداللہ خان تپش

آزادی کا حق

ادعاے آزادی آسان ہے مگر آزادی کے علم کی پرستاری مشکل۔ ہندوستان میں کتنے نفوس ایسے ہیں جو علمبردار حریت کی قدر کریں۔ وہ حسرت موہانی جسکی آزادی کی حمایت نے آج ہندوستان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ وہ حسرت ہانی جسنے حکومت کے جابرانہ اور ناجائز احکام کی تعمیل کرنے سے مردانہ وار انکار کرکے خاموش مقابلہ کی راہ میں عملی قدم اُٹھاکر قوم کو راہ دکھائی۔ وہ حسرت جس نے قوم اور ملک سے اپنے اصول اور حق پرستی کی کوئی قیمت نہیں مانگی۔ آج سنٹرل بیورو اس حق پرست کے لیے پرستاران حریت اور مدعیانِ آزادی سے کچھ مانگتا ہے۔ حسرت پر مصیبتوں کا طومار ٹوٹ پڑا حکومت کے جابرانہ تشدد کی وجہ سے "قید فرنگ" کا سامنا ہوا اُسکا کاروبار تباہ ہو گیا اس قید فرنگ ہی کے زمانہ میں حسرت کے مکان میں چوروں نے حملہ کیا مگر حسرت اور اُنکی صابر و شاکر محترم خاتون نے دستِ سوال دراز کرنا اور اپنی اصول پرستی کا معاوضہ لینا گوارا نہ کیا۔ آج سنٹرل بیورو حسرت کا قرضہ ادا کرنے کے لیے جو تین ہزار سے اوپر ہے چند ایسے نفوس کو تلاش کرتا ہے جو حسرت کے دیوان حصہ چہارم کو جو صرف اُن غزلوں پر مشتمل ہے جو میرٹھ اور فیض آباد جیل میں لکھی گئیں بطور تبرک قبول کرنا گوارا کریں اور کم از کم تین روپیہ (Rs 3/-/-) دینا منظور کریں۔

آج آزادی آپکا امتحان لیتی ہے۔ آج دنیا کی آنکھیں آپکی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ آپ پرستارانِ حریت فنا فی الحریت اور قابل احترام پیشواؤں کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ کیا ہندوستان کے کروڑوں نفوس اس اپنے امتحان کے لیے تیار نہ ہونگے آزاد پرست آئیں اور صرف تین روپیہ میں ایک دفتر گراہم امتحان دیں۔ کیا حسرت کے فدائیوں کی تعداد ایک ہزار بھی نہیں۔

اراکین انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی کے بجد اصرار کے بعد بیگم صاحبہ حسرت ہانی نے قوم کی طرف سے تین ہزار روپیہ مولانا حسرت کے قرض کی ادائگی کے لیے چند شرائط کے ساتھ لینا منظور کر لیا ہے چونکہ اُنکی غیور طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ وہ اُس رقم کو پبلک سے بطور چندہ کے لیں اس لیے بجد اصرار کے بعد انھوں نے مولانا کے دیوان کا چوتھا حصہ ترتیب دیا اور اسکا حق اشاعت صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی کو دیا ہے یہ دیوان اُن حضرات کی خدمت میں مفت نذر کیا جائیگا جو اس فنڈ میں کم از کم تین روپیہ عنایت کریں جو مولانا حسرت کے قرض کی ادائگی کے لیے ہوگا جن حضرات کو اس نیک کام میں شریک ہونا منظور ہو وہ فوراً ایک کارڈ لکھ کر دیوان طلب کریں۔

نیازمند تاج الدین۔ سپرنٹنڈنٹ صدر دفتر

زور چلتا ہے کہیں تدبیر کا تقدیر سے

مدعا حاصل نہ ہو جب کوشش و تدبیر سے
کیجے لب آشنا پھر شکوۂ تقدیر سے

رشتۂ مقصد میں پڑ جائے اگر کوئی گرہ
کھولنا لازم ہے اسکو ناخنِ تدبیر سے

لیس للانسان الا ما سعیٰ کو بھول کر
باندھیے کیوں دست و پا تقدیر کی زنجیر سے

جانتے ہیں وہ تحرک ہی کو عینِ زندگی
جنکی آنکھیں کھل گئی ہیں علم کی تنویر سے

شاہدِ رعنائے عزت پر جو ہیں دل سے فدا
تیز رو ہر دم ہیں وہ راہِ عمل میں تیر سے

کوئی ہے ان میں عروسِ مدعا سے ہم بغل
کوئی محوِ گفتگو ہے یار کی تصویر سے

ہم سے ناکاموں کا ہو کیا کام بس اِسکے سوا
بخت کا کرنا گلہ یا شکوہ چرخِ پیر سے

وائے نادانی کہ اپنی بند آنکھیں جب کھلیں
جل گئی جب کیسۂ زر آتشِ تبذیر سے

آبرو کی وہ چمک جاتی رہی دولت کے ساتھ
دیکھتے ہیں سب ہمیں اب دیدۂ تحقیر سے

اپنی رسوائی کا آئے گا ہمیں اب کیا خیال
ہم کہ جویائے نمود و نام تھے تشہیر سے

ہے ہماری غفلت و مستی کی وہ بھی شکوہ سنج
ہے گلہ ہمکو اگر پھوٹی ہوئی تقدیر سے

تھا ہمارا ہر عمل قانونِ فطرت کے خلاف
اب بچیں ہم کس طرح اس جرم کی تعزیر سے

ناصحِ ناداں ہمارا مغز کیوں کھاتا ہے تو
دم الجھتا ہے تری الجھی ہوئی تقریر سے

لاکھ تو سمجھائے لیکن ہے یہ اپنا اعتقاد
زور چلتا ہے کہیں تدبیر کا تقدیر سے

سیفؔ تڑپوگے کہاں تک عقل سے تم کام لو
جاؤ اب انکو منا لاؤ کوئی تدبیر سے بلا

سید عبد الحکیم سیفؔ (شاہجہانپوری)

رباعی

(حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ العزیز)

روئے سیہ و موئے سپید آوردم
چشمے گریاں قدسے چو بید آوردم
چوں خود گفتی کہ نا امیدی کفر ست
فرمانِ تو بُردم و امید آوردم

نظرے خوش گزرے

صفحہ ۴۱ پر "آزادی کا حق" کے عنوان سے پیر تاج الدین صاحب کی مراسلت درج کی گئی ہے۔ بہت اصحاب ایسے ہونگے جو غالباً مولانا حسرت موہانی کے سیاسی عقائد سے متفق نہ ہوں۔ اور ایسے بھی کثرت اصحاب نکلیں گے جو شاید حسرت کے کمالاتِ شاعری کے اعتراف میں دریغ کریں۔ لیکن یقیناً ایک متنفس بھی ایسا موجود نہ ہوگا جو مولانا حسرت کی آزادی و جوش، جرأت و ہمت، استقلال و پا مردی، حبِ وطن اور اعزازِ نفس کے اقرار میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل و تذبذب ظاہر کر سکے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں کم لوگ ایسے ملیں گے جنکو وطن یا قوم کی خدمت نے ایسی سخت آزمائشوں میں ڈالا ہو۔ اور اس سے بھی کمتر اُن اصحاب کی تعداد نکلے گی جو اس امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے ہوں۔ مگر حسرت ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ اپنے جذباتِ وطنیت کی خاطر قید کی مصیبتناک زندگی بسر کر چکے ہیں اور اب تیسری دفعہ پھر اُسی آگ میں کودنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا ایسے اولوالعزم، نفس کش، جاں نثارِ ملک و قوم کا ہمپر اتنا بھی حق نہیں کہ اُسکے خاندان کو مالی مشکلات سے نجات دلانے کے لیے ہمارے پڑھے لکھے اور ذی احساس افراد تین تین روپے ملا کر تین ہزار روپیہ فراہم کر دیں۔

الناظر کے معزز ناظرین اپنے ذوقِ علمی اور دردِ قومی کی وجہ سے مسلمہ طور پر اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ضروریات و حالاتِ زمانہ سے واقف اور قوم و ملک کی خدمت کا قدرشناس کہا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر آج وہ خاص طور پر مخاطب کیے جاتے ہیں اور یقین واثق ہے کہ وہ تا امکان اس نہایت ہی مبارک خراج کی ادائی میں دریغ نہ کریں گے۔

اُردو کے دیرینہ خدمتگزاروں میں سے مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ نے بھی عالم بقا کو انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اگرچہ اس پایہ کے انشا پرداز نہیں تھے جیسے آزاد، نذیر احمد یا حالی۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ جیسے محسنین اُردو کے ساتھ اُنکا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ ترتیب لغات کے کام میں اُنھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا اور گو اُنھیں اپنی مجوزہ

لغت کو تمام وکمال شایع کرنے کا موقع نہیں ملا تاہم فرہنگ آصفیہ بھی ہر طرح قابل فخر ہے - افسوس ہے کہ عرصہ ہوا اُنکے گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے فرہنگ آصفیہ قریب قریب معدوم ہو گئی ہے اور اب دوبارہ طباعت کا جو سامان کیا جا رہا تھا اندیشہ ہے کہ اُنکے انتقال کے باعث اس میں بھی تعویق اور مشکلات حائل راہ ہونگی

مولوی نذیر احمد کی طرح مرحوم نے بھی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے متعدد کتابیں لکھی تھیں اور علیگڈھ وبھوپال کے مدارس کے لیے تعلیم نسواں کے نصاب کی ترتیب میں بھی اُنکا خاص حصہ تھا اور غالبًا ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عام ادبی تصانیف کے مقابلہ میں اُنکی یہ منفی خدمات زیادہ سرسبز ہوئیں -

مرحوم کی صحت کچھ عرصہ سے خراب ہو رہی تھی - چنانچہ انتقال سے تقریبًا چند ہفتے قبل جو والانامہ ایڈیٹر الناظر کے نام صادر ہوا تھا اُس میں اپنی حالت کا یوں اظہار فرمایا تھا :-

"..... بصیرت نے مجھے جواب دے دیا - حافظہ میرا دم دبا کر بھاگا - دوران سر نے مجھے چکرا دیا - اب تو میں ایک مضغۂ گوشت ہوں - نہ خود لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں - دوسروں کا محتاج ہوں "

مرحوم کے کم عمر جانشیں کو جو دہلی کے کسی مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں ریاست حیدرآباد دکن سے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جا رہا ہے اور جملہ ہوا خواہان اُردو یقینًا متوقع رہیں گے کہ فرہنگ آصفیہ کی طبع ثانی کا سرانجام بھی دولت آصفیہ کی فیاضی و توجہ سے ہو جائے گا -

ناظرین کرام بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ حضرت ارحم الراحمین مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں - آمین -

---

ہندوؤں میں کالیستھوں اور کشمیری پنڈتوں کو فارسی و اُردو علم ادب سے ایک خاص دلچسپی رہی ہے - اور گو اب سیاست ملکی کے خاطر ان میں سے بھی اکثر اصحاب مردم شماری کے موقع پر اپنی اور اپنے اہل خاندان کی مادری زبان ہندی لکھواتے ہیں اور علی الاعلان حمایت اُردو سے بھی احتراز کرتے ہیں - تاہم حقیقت یہ ہے کہ اُنکا ذوق اور اُنکی شائستگی اُنکو مجبور بنا دیتی ہے کہ وہ دل سے اُردو کی قدر کریں - وہ گھروں میں نہایت صاف ستھری اُردو بولتے ہیں - مجالس میں بڑی فصاحت اور قابلیت کے ساتھ اُردو میں تقریریں کرتے ہیں اخبارات و رسائل میں نہایت ہی سلیس اور پاکیزہ اُردو میں مضامین لکھکر اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی کے جوہر دکھاتے ہیں اور مشاعروں یا دیگر مواقع پر اُردو غزلیں اور نظمیں پڑھکر سناتے اور حاضرین سے تحسین پاتے

کی داد حاصل کرتے ہیں۔ انھیں اصحاب میں ہمارے شہر کے مشہور انشاپرداز و شاعر پنڈت برج نرائن چکبست ہیں۔ چکبست صاحب نے رسالہ کشمیری درپن الہ آباد اور نیز بعض دیگر جرائد میں جو مضامین لکھے یا غزلیات اور نظمیں شایع کیں اُن سے اُنکی ادبی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسکے بعد اُنھوں نے مثنوی گلزار نسیم کا ایک جدید اڈیشن معہ ایک مفصل مقدمہ کے چھاپا جسکی وجہ سے دنیاے ادب ایک عرصہ کارزار بنگئی اور اس ذریعہ سے چکبست صاحب کو ادبی حلقوں میں ایک خاص امتیاز و شہرت حاصل ہوگئی۔ مگر عرصہ سے پیشۂ وکالت میں انہماک رکھنے کے باعث صاحب موصوف کی ادبی خدمات کم ہوگئی تھیں۔ ادھر جدید سیاسی جذبات نے ملک میں جو بیداری و جوش کے آثار ہویدا کر دیے اُن سے ہمارے پنڈت صاحب بھی متاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اُنھوں نے پھر توجہ کے ساتھ لکھنا شروع کیا ہے۔ نثر میں ایک ناول اور نظموں کی معقول تعداد اسی عہد کی لکھی ہوئی ہے۔ حال ہی میں ہندوستانی پریس نے اُنکا مجموعہ کلام **صبح وطن** کے نام سے تقریبًا ڈیڑھ سو صفحوں پر چھاپا ہے۔ جو صاحب اُنکی فکر رسا اور خوبی اداسے لذت اندوز ہونا چاہیں وہ **صبح وطن** کا ایک نسخہ دفتر اخبار ہندستانی لکھنؤ سے بقیمت ایک روپیہ (عہ) طلب کرلیں۔

عزیز محترم جناب منشی ارتضا علی علوی شرر کاکوروی، مرزا داغ مرحوم کے شاگردوں میں خاص طور پر ممتاز ہیں کہ اُنھوں نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ جدید رنگ کی نظمیں بھی بکثرت اور بڑی خوبی سے لکھی ہیں۔ منشی صاحب موصوف ہمارے وطن میں بھی اپنی ذہانت طباعی۔ خوش مذاقی و نازک خیالی کے لیے مشہور ہیں اور انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھنے کی وجہ سے جدید تخئیل اور انگریزی علم ادب سے پوری طرح مستفید ہوے ہیں چنانچہ انگریزی کے مشہور اور ناقابل تقلید انشاپرداز ایڈیسن کے بعض مضامین کا ترجمہ جو صاحب موصوف نے عرصہ ہوا شایع کیا تھا اُس سے آپکی قابلیت و ذہانت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب اب بازار میں نہیں نظر آتی۔ اسوقت صاحب موصوف کی چند نظموں کے ایک مجموعہ کا تعارف کرانا منظور ہے جو **خیابان** کے دلکش نام سے شایع ہوا ہے۔ اس میں سات نظمیں ہیں جنکے عنوان یہ ہیں۔ ذاتِ باری (بطرز مسٹر ایڈیسن) مسلمانان اندلس اور ایک مثل عالی ظرفی۔ تغیر موسم۔ وفادار عورت۔ حکیم عمر خیام کے خیالات۔ صنعت باری۔ ایک سنسکرت شاعر کے خیالات۔ اس سے قبل آپ کی نظموں کے کئی چھوٹے چھوٹے مجموعے اور بعض کنفرد نظمیں مثل ہفت گلبن۔ دو پھول۔ تصویر عبرت۔ یادگار شرر وغیرہ چھپکر مقبول ہو چکی ہیں امید ہے کہ خیاباں بھی اسی طرح پسند کیا جائیگا قیمت ۴؍

ملنے کا پتہ:- الناظر ایجنسی لکھنؤ

سفرنامہ شاہ ایران

ناصرالدین شاہ ایران نے اپنی سیاحت یورپ کے حالات قلمبند کیے تھے جو اس قدر دلچسپ اور پُرازمعلومات ہیں کہ مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے گئے۔ اُردو کا ترجمہ مولوی فرخی صاحب اُستاد نواب رامپور نے کیا ہے قابل دید ہے قیمت مجلد ۱۲ر

چین اور چینی

اس رسالہ میں ملک چین کے حالات اور چینی باشندوں کے معاشرتی رسوم وغیرہ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مولفہ منشی محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی۔ ایم آر۔ اے۔ ایس قیمت ۸ر

یادگار شرر

منشی ارتضا علی علوی شرر کاکوروی کا مجموعۂ نظم۔ جس میں حسب ذیل نظمیں ہیں۔ مسدس قومی۔ خواب عبرت۔ پیاری برسات۔ صبح گلگوں۔ سہانی شام جنت بہار۔ امید۔ اظہار محبت۔ عشق و فرض منصبی۔ مہتاب کی روشنی۔ دوشیزگی۔ نغمۂ عشق وغیرہ قیمت ۵ر

اخلاق محمدی

یہ کتاب اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہے جس سے تمام مسلمان اپنی زندگی کو سنت نبوی اور اسوۂ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے دوسرے تاریخی نام تقویم الاخلاق کے لحاظ سے بھی اسم بامسمّٰی ہے معاشرۂ زندگی کے تقریباً ہر پہلو کے متعلق آیات قرآنیہ احادیث نبویہ مع ترجمہ درج کی ہیں۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اُٹھنا بیٹھنا۔ پہننا اوڑھنا۔ ملاقات۔ حقوق و فرائض۔ غرض جملہ امور کے متعلق قرآن و حدیث کی ہدایت موجود ہے۔ اسکو پڑھکر

الدر النظیم فی خواص القرآن العظیم

خداوند کریم جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں جو عجیب غریب برکتیں ودیعت کی ہیں منکرین اور مشککین اُن کا اقرار نہیں کرتے لیکن جملہ دیندار مسلمانوں کو انپر یقین واثق ہے۔ بایں ہمہ افسوس ہے کہ اس دور ضلالت میں عام مسلمان جھوٹے اور مصنوعی تعویذوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اصل کلام الٰہی کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

اس رسالہ میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے خواص القرآن والسور اور قاضی ابوبکر داغستانی نے برق اللامع و الغیث الہامع کو جمع کر دیا ہے اللہ دونوں مسلمہ طور پر خواص و اسرار قرآن شریف میں مشتمل ہیں حاجتمندوں کو اور نیز اُنکو جو دوسروں کی خدمت پر مامور ہیں اس قابل قدر رسالہ کو حرز جاں بنانا چاہیے۔ قیمت ۱۲ر

ہر انسان راہ ہدایت پا سکتا اور ہر مسلمان اپنی زندگی طریق سنت پر لا سکتا ہے۔ کتاب کی اصل خوبیوں کا تصور صرف اسکے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ قیمت (حصہ اول و دوم) ۱۲ر

مختارات الصوفیہ

مذکورۂ بالا کتاب (جو عربی زبان میں ہے) اُسی کا یہ کتاب اُردو ترجمہ ہے۔ مسلمان ہر پیر بنجانے والے شخص کے نہایت آسانی سے گرویدہ اور اُسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسلیے اس کتاب کا ہر مسلمان کے مطالعہ سے ایک بار گزر جانا ضروری ہے تاکہ اُنھیں معلوم ہو جائے کہ

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

کتاب کی زبان نہایت عام فہم ہے جس سے معمولی استعداد کے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہ کتاب واقعی اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اسے خود پڑھے اور دوسروں کو سنائے اور سمجھائے قیمت ۱۲ر

ازواج الانبیا

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جملہ انبیاے کرام کی ازواج مطہرات کے حالات۔ اُردو کیا معنی فارسی عربی میں بھی اس سے قبل کوئی تذکرہ اس نوعیت کا موجود نہ تھا۔ قیمت ۱۲ر

مساوات بیرسٹر سلطان حیدر جوش کا مقبول عام فسانہ۔ ۱ر

انقلابات زمانہ " " " ۱ر

سیکفرن الولوسی حضرت شوق قدوائی کا بے نظیر ڈراما۔ ۱ر

مصنوعی شوہر اس ڈرامے کو پڑھیے تو ہنستے ہنستے بیدم ہو جائیگا ۱۲ر

فن شاعری

۱۰۹ صفحے - قیمت عہ

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے رشحات قلم کا فیض اخبارات اور رسائل کے ناظرین کے لیے اس قدر عام ہے کہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب مصنف کی تصنیف ہے جس میں شاعری پر باعتبار نئے اور پرانے خیالات کے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ کتاب ۱۹۰۸ء میں چھپی تھی اب صرف چند ہی نسخے رہ گئے ہیں لہذا شائقین جلد منگا لیں۔

خیالات

۲۴۰ صفحے قیمت ہر

یعنی مرزا سلطان احمد صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور رسائل مخزن۔ دکن ریویو۔ زمانہ۔ اُردوئے معلی علیگڈھ منتھلی۔ تہذیب۔ عصر جدید وغیرہ میں شایع ہوئے تھے۔ مطبوعہ ۱۹۱۸ء

امثال

۲۱۴ صفحے قیمت ہر

اس کتاب میں مرزا صاحب نے ضرب الامثال پر فلسفیانہ رنگ میں بحث کی ہے اور پنجابی اور اُردو زبان میں جو نسبت ہے اُسے بھی واضح کر دیا ہے۔ اور آخر میں سو صفحے پر پنجابی مثلیں معہ اُردو ترجمے کے درج کی ہیں۔ یہ کتاب اُن لوگوں کیلئے خاصکر قابل قدر ہے جو علم اللسان کا ذوق رکھتے ہیں۔

بادشاہ بنا چاہتے ہو یا ولی

یہ لاجواب کتاب ترجمہ ہے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر تصنیف سر مکنون کا۔ حضرت حجۃ الاسلام نے اس میں وہ تمام وسائل رقم فرمائے ہیں جنکے ذریعے ایک ناتوان و پراگندہ دل شخص ظاہری و باطنی ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہونچ جائے۔ امام صاحب نے ہمت و جرأت۔ عزم و استقلال۔ شجاعت و حوصلہ مندی کے واقعات تاریخی و حکایات لطیفہ سے اس کتاب کو ایسے اسلوب سے مزین کیا ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے پڑھنے والے کے دل میں امید و اُمنگ کی موج دوڑ جاتی ہے۔ پھر بادشاہ سے لیکر علما۔ افسران فوج۔ مزارعین صناع اور رعایا کے کل طبقوں تک کے فرائض و تعلقات پر بحث کرکے علم کیمیا و موسیقی کے حقائق۔ طب کے نادر نسخہ جات اور بعض ادویہ کے خواص۔ سحر اور طلسم کی حقیقت۔ روح کی ماہیت اور دیگر روحانی کیفیات کو بیان فرماکر آداب مجلس تہذیب نفس۔ موت۔ حشر۔ احوال باطنی کی اصلاح اور مدارج نبوت و سعادت لکھکر مجاہدات و زہد و تقوی و مکاشفات و اسرار الہی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور آخر میں ساحری و کہانت۔ سحر و کرامات۔ معجزات و نیرنجات میں فرق کرنے کے طریقے بتائے ہیں غرضکہ ساری کتاب علوم و معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ قیمت ہر

اُردو زبان کو اس ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کرانے کی آرزو رکھتے ہیں۔

فنون لطیفہ

۲۴۲ صفحے - قیمت ہر

مرزا صاحب کی یہ کتاب اُردو میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے جس میں فنون لطیفہ کی ماہیت، حسن یا خوبصورتی کا فلسفہ۔ حُسن کے مدارج و اقسام۔ شاعری اور اسکی حقیقت۔ اُسکی تاریخ اور اسکے ماخذات و محرکات۔ موسیقی۔ اسکے اثرات اور اُسکا فلسفہ اور مختلف اقوام میں اُسکا رواج۔ فن تعمیر۔ سنگ تراشی اور مصوری وغیرہ پر تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور تمام قدر دانان فنون لطیفہ کیلیے خاص طور پر ملاحظہ کے لائق ہے۔

زود پشیماں

مسٹر عبد الماجد بی اے کا نہایت دلچسپ اور قابل دید ڈراما۔ جسکا حصہ نظم بھی تمامتر صاحب موصوف کی فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ قیمت ۸ر

پولیٹیکل گرگٹ

اس کتاب میں شیخ ضیاء الحق صاحب ایڈیٹر اخبار پیشوا نے ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار) کی حقیقت بیان کی ہے اور ملکی اخبارات اور ملک کے مستند اہل الرائے اصحاب کے خیالات پیش کیے ہیں جنسے ایڈیٹر زمیندار کے عبرتناک تاریخ زندگی۔ بے اصولیوں، اخلاقی کمزوریوں اور سیاسی قلابازیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

تذکرۃ الاصفیا

یعنی حضرت خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی لاجواب کتاب **تذکرۃ الاولیا** کا اُردو ترجمہ۔ حضرت امام جعفر صادقؒ حضرت اویس قرنیؒ۔ حضرت حسن بصریؒ۔ حضرت ابراہیم ادہمؒ حضرت ذوالنون مصریؒ۔ حضرت بایزید بسطامیؒ۔ حضرت سفیان ثوریؒ۔ حضرت معروف کرخیؒ۔ حضرت سری سقطیؒ۔ حضرت جنید بغدادیؒ۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ وغیرہ جملہ ۹۶۔ اولیاء کرام کے تذکرے درج ہیں۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت ؏

سبیل النجات

یہ ابن قیم علیہ الرحمہ کی کتاب الصلوٰۃ کا ترجمہ ہے جس میں امور ذیل پر بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے (۱) جو شخص دانستہ نماز کو چھوڑ دے اُسکا قتل واجب ہے یا نہیں۔ (۲) اگر قتل کیا جائے تو اسپر مرتد کا حکم لگایا جائے اور اُسکی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں۔ (۳) کیا بے نماز کے سب عمل ضایع ہو جاتے ہیں (۴) کیا دن کی نمازیں رات کو قبول ہوتی ہے یا نہیں (۵) کیا جماعت پر قادر شخص کی نماز بے جماعت جائز ہے (۶) کیا ترک جماعت سے گناہ لازم آتا ہے (۷) کیا نماز کے لیے مسجد کی حاضری شرط ہے (۸) جو نماز کے رکوع و سجود اچھی طرح ادا نہ کرے اُسکے لیے کیا حکم ہے (۹) حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی تھی۔ (۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کل نمازوں کی کیفیت مع حکمتیں۔ انکے علاوہ اور مسائل میں بھی نہایت لطیف بحث کی گئی ہے کہ مرتے کا طریقہ پڑھنے سے انسان مسلمان ہو سکتا ہے یا اعمال کی بھی ضرورت ہے قیمت [illegible]

مدینہ کانفرنس

دسویں صدی ہجری کے آخر میں مختلف بلاد و امصار کے تیرہ علمائے کرام نے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب علل پر غور و بحث کرنے اور اُنکی فلاح و بہبود کی تدابیر سوچنے کی غرض سے مدینہ منورہ میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی تھی جسکی روداد کا ایک نسخہ بزبان عربی خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے ہاتھ لگا۔ صاحب موصوف کی علم دوستی اور محبت قومی کی وجہ سے اُسکا ترجمہ "مدینہ کانفرنس" کے نام سے اُردو میں ہو گیا ہے۔ جسکے شروع میں صاحب موصوف نے ایک تبصرہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب جملہ دردمندان و بہی خواہان اسلام کے ملاحظہ کے قابل ہے۔ کیونکہ جو تدابیر اُن علمائے عظام نے بتائی ہیں اگر اُنپر آج بھی مسلمان عمل کرنے لگیں تو دنیائے اسلام کی کایا پلٹ جائے اور موجودہ دور تنزل کا ہمیشہ کیلیے خاتمہ ہو جائے۔ قیمت عہ

آیات اللہ الکاملہ

کتاب حجۃ اللہ البالغہ عربی زبان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف ہے۔ جسمیں اسلامی شریعت کے مسائل مدلل طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرز تصنیف کے بانی حضرت امام غزالی اور خاتم شاہ ولی اللہ صاحب ہیں شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی پروفیسر عربی علیگڈھ نے اسکا ترجمہ نہایت خوبی اور احتیاط سے کیا ہے اور دیباچے میں مصنف علیہ الرحمہ کے حالات اضافہ کیے ہیں۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۶۲۰ صفحہ پر نہایت صفائی کے ساتھ چھپی ہے قیمت مجلد ۱۲؍ روپے

کارنامہ ترک

شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی پروفیسر عربی مدرسۃ العلوم علیگڈھ نے دولت عثمانیہ کی تاریخ موسومہ "آثار مؤمن ترک" کو علیگڈھ کے بعض تعلیم یافتہ نوجوانوں کی امداد سے اردو کا لباس پہنایا ہے حصہ اول میں امیر عثمان سے سلیمان اعظم تک کے عہد کی تاریخ آگئی ہے۔ اور فاضل مترجم نے ہر عہد کا ایک نقشہ مرتب کرکے اضافہ فرمایا ہے جس سے مقامات کی توضیح اور سلطنت کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ قیمت ؏

میلاد ابن جوزی

مع ترجمہ اُردو۔ جس میں جملہ واقعات و حالات میلاد مبارک از روے حدیث و کتب معتبرہ لکھے گئے ہیں۔ قیمت ۴؍

حیات نظامی

یعنی حضرت نظامی گنجوی کے قابل دید حالات قیمت ۴؍

[illegible] گئے تھے بڑی خونریزی کے ساتھ دبا دیے گئے اور جو باقی بچے [illegible]
[illegible] تھا اور قتل عام کا خوف دامنگیر رہتا تھا۔

بربر جو ابھی اندلس میں تھے چونکہ افریقہ کے راستے ہمیشہ اپنے رشتہ داروں سے گہری مراسلت جاری رکھتے تھے اس لیے جو انقلاب اس قسم کا [illegible] میں ہوتا تھا (شمالی) افریقہ میں ہوتا تھا اسکا اثر تیزی کے ساتھ اندلس پر بھی پہنچتا تھا۔ ادھر چونکہ اندلس کے مال غنیمت کا عربوں نے سب سے بڑا حصہ لیا۔ حالانکہ بربریوں کے تیروں اور نیزوں سے فتح ہوا تھا انکے دلوں میں کینے کا پیدا ہونا بے وجہ نہ رکھتا تھا۔ عربوں نے جو صرف ایسے وقت پہنچے تھے کہ اس فتح سے متمتع ہونے کا وقت تھا اس جزیرہ نما کے کل سرسبز اور زرخیز علاقے تو اپنے لیے اور بربری نہایت وحشت افزا حصوں میں جلاوطن کر دیے گئے۔ انہیں [illegible] المیدان یا لیون کے برف اندود پہاڑ انکے حصہ میں آئے جہاں انکو اس سخت آب و ہوا سے مقابلہ کرنا تھا جو افریقہ کی گرمی کی جہاں انکی پرورش ہوئی تھی بالکل متضاد تھی اور جہاں انکو اپنے عرب رفیقوں اور شمال کے عیسائیوں سے ہمیشہ سینہ سپر ہونا پڑتا تھا۔ ناراضی کی علامتیں فوراً ظاہر ہونے لگیں۔ فاتح کے بربری سرداروں میں سے ایک شخص منوزا نام تھا جس نے اکوئیٹین کے ڈیوک یوڈس کی بیٹی سے شادی کی تھی جب یہ سنا کہ افریقہ میں میرے ہم وطنوں پر ظلم ہو رہا ہے تو علم بغاوت بلند کیا اور اس وقت میں جبکہ [illegible] اس طرف پیرینیز کا بول بالا رہا تو شمالی اضلاع میں ایک عام بربری [illegible] ہوا۔ [illegible] بربری [illegible] پیدا کر دیا اور انکے ہر چہار طرف [illegible] [illegible] جانب طلیطلہ، قرطبہ اور [illegible] چڑھائی شروع کر دی [illegible] [illegible] سے [illegible]

[illegible] اندلس کے عرب [illegible]
[illegible]

بڑی سختی کے ساتھ مدد دینے سے ابا کیا تھا۔ اب دو امروں میں سے ایک ناگزیر تھا۔ یا تو خود اپنے باغی بربریوں کے آگے سر جھکا دے یا اُنھیں شامی عربوں سے مدد کا خواستگار ہو۔ جنکو مدد دینے سے خود اصرار کے ساتھ انکار کر چکا تھا۔ مگر ان عربوں سے یہ اندیشہ تھا کہ مبادا یہاں پہونچکر اُس سے زیادہ تکلیف دیں جسکے دفع کرنے کو بلائے جائیں۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ اُسنے سخت اندیشے کے ساتھ جہازہ بھیجکر شامیوں کو بلوایا اور پہلے ہی اُن سے وعدہ لے لیا کہ جب وہ اس مہم کو سر کرلیں تو اُلٹے پاؤں واپس چلے جائیں۔ بالآخر اس کمک کے ذریعہ سے اُندلس کے عربوں نے بربریوں کو بڑی بھاری شکست دی اور جنگلی جانوروں کی طرح سارے ملک سے نکال کر اُنکے کوہی قلعوں تک اُنھیں بھگا کر پہونچایا اور خوب جی بھر کر اُن سے انتقام لیا۔ جب یہ ہو چکا تو وہ واقعہ پیش آیا جسکے لیے عبد الملک نے حفظ ما تقدم کیا تھا۔ ان شامی معاونوں نے کہا کہ اُندلس کی زرخیز زمینیں چھوڑ کر افریقیہ کے جنگلوں میں نعمتذ بربریوں کا نشانہ بننے ہم تو نہیں جاتے۔ ان لوگوں نے عبد الملک کی ایک بھی نہیں سُنی اور اُسکو قتل کر ڈالا اور اُسکی جگہ پر خود اپنے سردار کو بٹھایا ؎

تو از چنگال گرگم در ربودی — چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی پرانی جماعت اور اس نئی کھیپ کے درمیان عرصے تک نہایت ہی سخت دھینگا مشتی ہوتی رہی۔ جس میں بہت خونریزی اور ملک کی تباہی ہوئی۔ اس جھگڑے کا صرف اُسوقت خاتمہ ہوا جب دمشق کے خلیفہ نے اک نیا اور لائق امیر بھیجا۔ اس نے معاند جماعتوں کو ایک دوسرے سے بہت دُور دُور پر شہروں میں آباد کر کے تقسیم اور اُنکے سرداروں میں سے جو بہت زیادہ شورپشت تھے اُنکو وہاں سے جلا وطن کر دیا۔ اس انتظام سے شامی فوج کے مصری سپاہی مرشیا میں آباد ہوے جسکا نیا نام ان نئے باشندوں نے مصر رکھا۔ فلسطین والوں نے سیدونیا اور الجسرہ میں سکونت اختیار کی۔ جورڈن والے ملاقہ میں اقامت گزیں ہوے۔ دمشق والے غرناطہ میں رہنے لگے اور تنسرین کی پلٹن جئین میں بسی۔ اس زمانے سے

اندلس میں عداوت کا ایک سبب تو رفع ہوگیا لیکن رقابت کا جوش اور بھی زیادہ ہوگیا۔ اور اکثر مستقل حکومت کی جگہ طوائف الملوکی ہوا کی۔ یہ حالت اُس وقت دفع ہوئی جب ایک ایسا حکمران وہاں پہونچا جو مخصوص فوقیت کے ساتھ مسلح تھا۔ اسکی ذات میں خلفائے دمشق کی سرداری اور خون دونوں جمع تھے۔ اس شخص نے اس ابتر ملک کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور تھوڑے عرصے کے لیے کل مخالف فرقوں کو سلطنتِ قرطبہ کے علم کے نیچے باہم متحد کردیا۔ یہ نوجوان وہی جدید حکمران تھا جسکے نکالنے کو شارلے مین آیا اور ناکام پھر گیا تھا۔ اسکا نام عبدالرحمن اموی تھا۔

چوتھا باب

ایک نوجوان مدعی سلطنت

چھ سو برس تک اسلامی سلطنت کا بہت بڑا حصہ برائے نام اک صدر حکمران کے ماتحت رہا جو خلیفہ کہلاتا تھا جسکے معنی جانشین وقائم مقام کے ہیں۔ پہلے تو خلیفہ کی حکومت واقعی وزن دار تھی۔ ہسپانیہ سے لیکر کوہ ہندوکش کی سرحدوں تک کے سارے ملکوں کے امیروں کا تقرر خلیفہ ہی کرتا اور اُن میں سے اپنی خوشی سے جسکو چاہتا معزول کرتا تھا۔ لیکن یہ سلطنت اس قدر بڑی تھی کہ زیادہ عرصے تک ایک ہی مرکز پر مجتمع نہیں رہ سکتی تھی اور رفتہ رفتہ مختلف ملکوں و علاقوں کے امیروں نے اپنے آپ کو خودمختار بنالیا۔ گو وہ عموماً خلیفہ کی حد درجے کی تعظیم و توقیر اور اُنکی ہر طرح کی عزت اطاعت کے سوا کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ یہ ظاہری تعظیم و تکریم بھی اُٹھادی گئی اور ایسے خاندان اُٹھ کھڑے ہوے جنھوں نے منکرانہ اصول اختیار کیے اور خلیفہ کی باطنی سرداری کے منکر بنے اور اُسکو اور اُسکے سارے خاندان کو غاصب قرار دیا۔ بالآخر وہ وقت آیا جبکہ خلفاء ظاہری حکومت میں ویسے ہی ضعیف ہوگئے جیسے رومہ کے پوپ ہیں اور یہانتک نوبت پہونچی کہ وہ ہی کرایہ کے محافظ جنکو اپنے باغی امراء کے مقابلے میں اپنی ذاتی حفاظت

کے لیے نوکر رکھتے تھے اُنکو محلوں میں مقید رکھنے لگے۔ یہ حالت خلافت کی بنیاد سے تین سو برس بعد وقوع میں آئی اور خلفاء اپنے وجود کے نصف اخیر زمانے میں قریب قریب وجود معطل کے ہوگئے۔ جنکو اس سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہ پُتلیوں کی طرح اپنے کام میں لاتے اور اپنی تخت نشینیوں کے وقت اُن سے لانبے چوڑے خطاب لیتے تھے۔ آخرکار تیرھویں صدی میں مغلوں کے حملے نے ایشیا میں خلافت کا رہا سہا نام بھی مٹا دیا اور اگرچہ سلطانِ ترکی اِس وقت تک اس خطاب کی مدعی ہیں لیکن اب کوئی خلیفہ اُس جامع و مانع معنی میں نہیں ہے جو پُرانے زمانے میں اس لفظ سے سمجھے جاتے تھے۔

جس علاقے نے سب سے پہلے خلیفہ کی حکومت کو پس پشت ڈال دیا وہ اُندلس تھا۔ اسکے سمجھانے کے لیے کہ یہ امر کیونکر وقوع میں آیا ہمکو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خلفاء یکے بعد دیگرے علی التسلسل ایک ہی خاندان سے نہیں ہوے۔ چاروں خلفاے برحق ابوبکر۔ عمر۔ عثمان۔ اور علی رضی اللہ عنہم کے بعد جو کم و بیش جمہور کے انتخاب سے مسند نشینِ خلافت ہوے تھے شامیوں نے دمشق میں معاویہؓ کو خلیفہ بنایا اور انھیں کی نسل سے اموی خلفاء ہوے جو اپنے جد اعلیٰ اُمیّہ کی کی طرف منسوب ہیں۔ بنی اُمیّہ میں سے چودہ خلیفہ ہوے جنھوں نے سنہ ۶۶۱ عیسوی سے ۷۵۰ء تک سلطنت کی۔ سفاحؔ (خونریز) نے انکو تخت سے اُتارا۔ یہ شخص دوسرے خاندانِ خلافت کا بانی ہوا جو خاندانِ عباسیہ کہلایا اور اُسکے جد اعلیٰ عباسؓ کی طرف جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے منسوب ہوا۔

عـه جو لفظ خطوطِ قوسی کے اندر ہے وہ مصنف کے انگریزی لفظ "بوچر" کا ترجمہ ہے۔ بوچر کے حقیقی معنی گوشت بیچنے یا قصاب کے ہیں اور مجازی معنی خونریز و سفاک کے۔ مصنف نے سفاح کے بعد کوٹیشن میں بوچر کا لفظ لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے سفاح کے لفظ کا ترجمہ کیا ہے لیکن عربی لغت میں سفاح کے معنی حقیقی یا مجازی بوچر کے نہیں ہیں بلکہ برعکس اسکے سفاح کے معنی "مرد بسیار عطا و فصیح و توانا بر سخن کے ہیں" چونکہ یورپین مصنف نے دیکھا کہ اس شخص نے بنی امیہ کو قتل کیا تھا اس لیے سفاک و سفاح کو ایک ہی لفظ سمجھ کر اُس کے یہ معنے لکھ دیے سفاح کا نام عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عباس تھا۔ مترجم

خلفائے عباسیہ نے بجائے دمشق کے بغداد کو دار الخلافہ بنایا۔ اور مغلوں کی تاخت وتاراج کے
قبل یعنی ۱۲۵۸ء عیسوی تک خلافت اسی خاندان میں رہی۔ بنی اُمیہ کے معزول خاندان میں کا
ایک شخص عبد الرحمٰن تھا۔ اُسکے اکثر اعزا و اقربا کا اس سنگدل عباسی نے خاتمہ کردیا تھا دنیا
کے ہر حصے میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہ لوگ بیرحمی کے ساتھ تہ تیغ کیے گئے۔ اوروں کی طرح
عبد الرحمٰن بھی بھاگا مگر اسکی قسمت اچھی تھی۔ اسلیے کہ دریاے فرات کے کناروں تک صحیح وسالم
پہونچ گیا۔ ایک دن وہ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا اور اُسکے سامنے باہر اُسکا چھوٹا سا بچہ کھیل
رہا تھا کہ دفعۃً وہ بچہ ڈر کر اُسکے پاس بھاگ آیا۔ عبد الرحمٰن سبب دریافت کرنے کو باہر نکلا
تو دیکھا کہ گانوں تہ وبالا ہو رہا ہے اور عباسیوں کے سیاہ علم افق میں لہرا رہے ہیں۔ وہ سُرعت
کے ساتھ اپنے بچے کو اُٹھا کر گانوں سے باہر بھاگا اور دریا کے نزدیک پہونچا۔ یہاں دشمن
گویا آہی پہونچے اور آواز دی کہ گانوں والو تمھیں خوف کھانا نہیں چاہیے۔ ہم تمھیں ضرر
پہونچانا نہیں چاہتے۔ عبد الرحمٰن کا ایک چھوٹا بھائی بھی اُسکے ساتھ تھا وہ تیرنے سے تھک گیا
تھا پیچھے پھرا اور فوراً اُسکا سر تن سے جدا ہوگیا۔ لیکن عبد الرحمٰن تیرتا ہی چلا گیا اور اپنے
بچے کو لیے ہوے دوسری جانب جا پہونچا اور اُسکے پیچھے پیچھے اُسکا خادم بدر بھی پہونچا۔ یہاں
سے اِن لوگوں نے خشکی میں رات دن چلنا شروع کیا اور افریقیہ پہونچکر دم لیا یہاں خاندان کے
اور لوگ بھی اُس سے آملے اور اموی شہزادوں کے اس تنہا بقیۃ السیف کو اسکی مہلت ملی
کہ آیندہ اپنی حالت کی نسبت غور کرے۔

یہ شخص صرف بیس برس کا ارمان و حوصلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسکی دماغی قوتیں بہت اچھی
تھیں اور اسکے ساتھ ساتھ امیرانہ رعب وداب، اعلیٰ درجے کی جسمانی چستی و دلیری بھی پائی
تھی۔ لیکن عربی مورخوں نے مخالف تفصیلیں درج کی ہیں کہ وہ کانا تھا اور قوت شامہ سے
محروم۔ اسکے بچپن میں دانشمندوں نے اس کے مستقبل کی نسبت بڑی بڑی پیشین گوئیاں کی
تھیں اور باوجود اسکے کہ اُسکا خاندان مٹ گیا تھا وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔ پہلے پہل اُسکے

خیالات افریقیہ کی طرف رجوع ہوے۔ اس لیے کہ اُس نے صاف دیکھ لیا کہ عباسیوں کے عروج نے مشرق میں تو کوئی موقع میرے لیے باقی نہیں رکھا ہے۔ لیکن پانچ سال تک ساحلِ بربر کے قریب آوارہ گردی کے بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ عربی امیر کا تخت اُلٹ دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور مغرب کی جانب جو بربری بغاوت کر چکے ہیں وہ اپنی نئی حاصل کی ہوئی خود مختاری کو ایک اموی کے محکوم ہونے کی محض خیالی عزت کے بدلے خوشی کے ساتھ نہیں بیچیں گے۔ اس وجہ سے اب اُسکی نگاہ اُندلس کی طرف گئی جہاں مختلف فرقیوں کی دائمی نزاعوں نے ایک ہوشیار مدعیِ سلطنت کے لیے راہ کھول دی تھی۔ اور ایسے شخص کے لیے تو اور بھی صاف راستہ موجود تھا جو عبدالرحمٰن کا سا موروثی حق پیش کر سکے۔ لہذا اُس نے اپنے خادم بدر کو اُندلس کی شامی جماعت کے سرداروں کے پاس روانہ کیا۔ اس جماعت میں بنی اُمیّہ کے آزاد کیے ہوے غلام بہت سے تھے اور عرب کے قواعدِ عزت کے رُو سے اُنپر فرض تھا کہ اپنے اگلے آقاؤں کے ہر رشتہ دار کی امداد کریں۔ بدر نے دیکھا کہ یہ سردار نوجوان شہزادے کا استقبال کرنے پر رضامند ہیں اور مخالف فرقوں کے ساتھ تھوڑا نامہ و پیام کرنے کے بعد بربری والوں نے بھی تائید کا وعدہ کر لیا۔ جب یہ ہو چکا تو بدر افریقیہ کو واپس آیا۔

سمندر کے کنارے پر عبدالرحمٰن نماز پڑھ رہا تھا کہ اُس جہاز پر نظر پڑی جو اُسکے پاس قاصد لایا تھا۔ اور جس طرح ملک مشرق کے سب لوگ ذری ذری واقعات سے شگون لینے پر آمادہ رہتے ہیں، اُس نے بھی اُس قاصد کے نام سے جو اُندلس سے آیا اور اُسکے سامنے پیش کیا گیا تھا نیک فال لی۔ جب اُس نے سنا کہ اُسکا نام ابو غالب التمام ہے تو چلا اُٹھا کہ "ہمارا مقصد تمام یعنی پورا ہوگا اور ہم اس مُلک پر غالب آئیں گے"۔ فوراً وہ جہاز پر سوار ہو گیا اور ستمبر ۵۵ء میں بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہتا ہوا اُندلس کی طرف روانہ ہوا۔ بنی اُمیّہ کے پسماندہ شہزادے کا اُندلس میں آنا ایک عجیب و غریب امر تھا۔ جس طرح ۱۴۸۵ء میں ہینگ بری ٹیوڈر نوجوان

دعی سلطنت) کا اسکاٹ لینڈ پہونچا۔ اسکی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی خاندان خلافت کے قدیم وابستہ عرض نیاز کو دوڑے اور بنی امیہ کے آزاد کیے ہوئے غلاموں کی اولاد نے کہا کہ ہم آپ کا حکم بجا لانے کو موجود ہیں۔ اور تو اور یمنی قبیلوں پر بھی باوجود اسکے کہ ان سے امید نہ تھی کہ اس نوبادۂ خلافت سے کوئی خصوصیت ظاہر کرینگے اسکے جان نثاروں کا اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اپنے وعدے پر قائم رہنے اور اسکی تائید میں ملکر کام کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ امیر اندلس نے دیکھا کہ اسکے اکثر سپاہی اس سے برگشتہ ہوگئے اور مجبوراً اسکو ایک نئی فوج کا انتظار کرنا پڑا۔ اس اثنار میں موسم سرما کے مینھ نے جنگ کو حیز التوا میں ڈال دیا۔ اور عبدالرحمن کو اپنی فوجوں کے درست اور تازہ دم کرنے کا موقع مل گیا۔

دوسرے سال کے موسم بہار میں جمکر لڑائی شروع ہوئی۔ ارشید دنا واشبیلیہ میں گرمجوشی کے ساتھ عبدالرحمن کو خیر مقدم کہا گیا۔ اور یہیں سے اس نے قرطبہ پر دھاوا کرنے کی تیاری کی۔ یوسف وہاں کا امیر روکنے کو آگے بڑھا لیکن مینھ کے پانی سے وادی الکبیر چڑھا ہوا تھا اور دونوں فوجیں دونوں متقابل کناروں سے مسابقت کرنے لگیں کہ دیکھیں پہلے کون قرطبہ پہونچتا ہے۔ آخر عبدالرحمن نے فریب آمیز حیلے کے ذریعے سے جو اسکی شان کے شایاں نہ تھا یوسف کو صلح کا دھوکا دیکر اسپر آمادہ کیا کہ اسکو دریا سے جو اب اُتر گیا تھا پار اُترنے دے۔ اور جب اُس پار پہونچ گیا تو اپنے مطمئن دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ فتحمندی سے اعلان کر دیا کہ میں نوبادۂ خلافت کے جانب ہوں۔ اور فتح و نصرت کے ساتھ قرطبہ میں داخل ہوگیا۔ اس میں اسقدر حمیت تھی کہ کوشش کرکے اپنے سپاہیوں کی لوٹنے کی حرص اور خواہشوں کو روکا۔ اور امیر معزول کی حریم یعنے زنانہ کو امن و عافیت میں رکھا۔ یہ سال ختم بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ ہسپانیہ کے سارے اسلامی علاقے کا مالک ہوگیا اور قرطبہ میں بنی اُمیہ کا خاندان جسکی قسمت میں تین سو برس تک قائم رہنا لکھا تھا قائم ہوگیا۔

لیکن بہت سی لڑائیاں لڑے بغیر اس سلطانِ قرطبہ کے قدم مضبوطی کے ساتھ نہیں جمے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عبدالرحمٰن تخت پر بٹھایا گیا لیکن یہ کرشمہ اُن متعدد فریقوں میں سے جو اس ملک کو آپس میں تقسیم کیے ہوئے تھے ایک چھوٹے سے فریق کا تھا۔ مگر اس نے سلطان میں اکثر بادشاہوں سے زیادہ تر اسکی قابلیت تھی کہ اپنی سلطنت کے مخالف و سرکش عناصر کے درمیان اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ یہ شخص کاموں کو بروقت اور مکمل طور پر کرنے والا، شبہہ اور وسوسے سے بہت کم تکلیف اُٹھانے والا، کبھی نہایت ہی درشت اور کبھی دغاباز مدبر تھا اسکی حکمت عملی ہمیشہ اقتضائے وقت کے مطابق ہوتی تھی۔ اور کچھ چند ہی ایسے مواقع نہ تھے جس میں اُسکا امتحان ہوا ہو۔ اندلس میں آئے ہوئے اسکو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ابن مغیث افریقیہ سے ہسپانیہ میں عباسیوں کا سیاہ جھنڈا نصب کرنے کے لیے تری کی راہ سے روانہ ہوا۔ یہ شخص بیجا کے علاقے میں جہاز سے اُترا اور فوراً بہت سے ناراض آدمی جو ہمیشہ نئی بات میں شریک ہونے کو مستعد رہا کرتے ہیں اُسکے معاون ہو گئے۔ دو مہینے تک عبدالرحمٰن کارمونا میں محصور رہا۔ یہ حالت بدرجۂ غایت خطرناک تھی اس لیے کہ ہر روز دشمن کو اپنی قوتیں بڑھانے کا زیادہ تر موقع ملتا جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے جو ہمیشہ سے پُرازتدبیر تھا جب یہ سنا کہ دشمن نے احتیاط میں کسی قدر سُستی کو راہ دیا ہے تو اپنے پیرؤوں میں سے سات سو نہایت بہادر آدمیوں کو ایک جگہ مجتمع کیا۔ بڑی آگ روشن کی۔ اور یہ کہکر کہ اب دو ہی باتیں مدنظر ہیں موت یا فتح۔ اپنے نیام کو آگ میں ڈال دیا۔ اُن ساتوں سو نے اسکی اقتدا کی۔ جسکا مطلب یہ تھا کہ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ جب تک ہم آزاد نہ ہو جائیں گے ہماری تلواریں نیام میں نہ جائیں گی۔ اسکے بعد اپنے سردار کے پیچھے پیچھے محاصرین پر دل توڑ کر ٹوٹ پڑے اور عباسی حملہ آوروں کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے اُس سفاکی سے جو کبھی کبھی اسکی ناموری کے چہرے کو بدنما کر دیا کرتی تھی، حملہ آوروں کے سروں کو ایک تھیلی میں رکھا اور ہر ایک کی شناخت کے لیے اُنکے کانوں پر چٹھیاں لگا دیں اور اس مہیب گٹھری کو ایک

سرمایۂ حصولِ مراد انسانی

معدن تندرستی جاودانی

خزینۂ صحت جوانی

آتنک نگرہ گولیاں

اگرچہ آپ اس زمانہ میں حد سے زیادہ مبالغہ آمیز لفاظی اشتہاروں میں ملاحظہ فرمائیں گے مگر ہم اس امر سے برکنار ہوکر صرف اتنا ہی کہنے کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ تندرستی کے خواہاں ہیں۔ یا کہ آپ یا آپ کے دوست کو کمزوری اعضاے رئیسہ یا کہ دوران سر یا کہ مرض نسیان جریان احتلام ضعف یا کہ وقت سرعت وغیرہ غیرہ امراض خبیثہ نے بیحد تنگ کرکے ہرچہارطرف سے گھیر لیا ہے۔ اور علاج سے تنگ آکر مایوس ہورہے ہیں تو ہماری نوایجاد عالم تقویت بخش آتنک نگرہ گولیاں استعمال کرکے اپنی دلی مراد حاصل کریں۔ اسوقت آپکو ہماری راست گفتاری کا بصدق جان یقین ہوجائیگا۔ بڑے بڑے نامی گرامی مشہور ومعروف ڈاکٹروں ویدوں طبیبوں نیز زیور بین اصحابوں نے مذکورہ گولیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ تجربہ فرماکر انکو بڑا اکسیر فرض تسلیم کرلیا ہے۔ یہ گولیاں نہایت درجہ کی مقوی باہ و مصفی خون ہونے کے علاوہ بچپن کی تمام غلط کاریوں کے نقائص دور کرکے حالتِ شیب میں عالم شباب کا ظہور دکھاتی ہیں۔ مرد عورت دونوں کو مفید ہیں۔ ان میں رسائین مطلق نہیں۔ بلکہ جڑی بوٹیوں سے ہماری نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں۔ ہر موسم میں انکا استعمال ہوسکتا ہے۔

قیمت ۳۲ گولیوں کا ڈبہ ایک روپیہ۔ علاوہ محصول

مزید آگاہی کیلیے ہماری کتاب کام شاستر جو اٹھارہ زبان میں ترجمہ شدہ ہے اور تخمیناً گیارہ لاکھ کے ہم مفت تقسیم کرچکے ہیں ہم سے مفت طلب کرکے ملاحظہ فرماویں۔

ملنے کا پتہ

ویدشاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

لوکل ایجنٹ

اندرچند اینڈ کو۔ چوک۔ لکھنؤ

مولوی عبدالرزاق

- نظام الملک طوسی مجلد — ؏ہ ر
- البرامکہ ״ — ؎ ر

مولوی چراغ علی مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — عہ ر
- تحقیق الجہاد مجلد — ؎ ر
- اعظم الکلام ۲ جلد — ؎ ر
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۸ ر

- حضرت سلیمان — ۴ ر
- حضرت ہاجرہ — ۲ ر
- حقیقۃ السحر — ۲ ر
- یورپ و قرآن — ۴ ر
- احسان عام — ۱ ر

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی

- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — ؎ ر
- نشاط عمر — عہ ر
- عصائے پیری — ۱۲ ر
- اقبال دولہن — عہ ر
- حسن معاشرت — ۸ ر
- اصلاح معیشت — ؏ہ ر

منشی سید احمد مارہروی

- آثار اکبری — ؏ ر
- حیات خسرو — ۱۲ ر
- حیات صالح — ۴ ر
- ثنائے السلاطین — ۱۲ ر
- آثار خیر — عہ ر
- امرائے ہنود — ؏ ر

مولوی سید علی بلگرامی

- تمدن ہند — مشہ
- میڈیکل جورس پروڈنس — ؎ ر
- عروج کا فن تعمیر — ۴ ر
- سفرنامہ موسیو تھیونو — عہ ر
- جنگ ٹرنسوال — عہ ر

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- علمائے سلف — ۱۲ ر
- اسلامی اخلاق — ۸ ر
- ذکر الحبیب — ۲ ر
- ذکر جمیل — ۵ ر

مسٹر ظفر علی خاں بی اے

- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد — صمہ ر
- خیابان فارس ״ — عـہ ر
- جنگل میں منگل — ؏ہ ر
- سیر ظلمات — عہ ر
- ڈراما جنگ روس و جاپان — ؏ہ ر
- ایڈیٹر کا حشر — ۱۰ ر
- معاشرت — ۶ ر

مسٹر ظفر عمر بی اے

- مستقبل اسلام — ؏ہ ر
- بولیسین — ۸ ر
- نیلی چھتری — ۱۲ ر

سید راحت حسین بی اے

- المقسر — ۸ ر
- المنخل — ۱۰ ر

ڈاکٹر اقبال

- ملت بیضا — ۴ ر
- شمع و شاعر — ۴ ر
- بلال — ۱ ر
- شکوہ — ۱ ر
- جواب شکوہ — ۲ ر
- مکمل ترانہ — ۲ ر
- رموز بیخودی — عہ ر
- نالۂ یتیم — ۳ ر
- فریاد امت — ۴ ر
- تصویر درد — ۴ ر
- ابر گہربار اقبال — ۳ ر

مولانا راشد الخیری

- صبح زندگی — ؏ہ ر
- شام زندگی — عہ ر
- طوفان حیات — عہ ر
- سراب مغرب — ۸ ر
- ستارۂ صبح و شمع حرم — ۶ ر
- الزہرا — ۱۲ ر
- لڑکیوں کی انشا — ۸ ر

مولوی سید سلیمان

- ارض القرآن — ؏ ر
- لغات جدیدہ — عہ ر
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — ؎ ر

پروفیسر نواب علی ایم اے

- تذکرۃ المصطفیٰ — ؏ہ ر
- معارج الدین — ؏ہ ر

خواجہ حسن نظامی

- سیپارۂ دل — ؏ہ ر
- روزنامہ باتصویر — ؎ ر
- ״ بلاتصویر — ؏ہ ر
- روزنامچہ — ۸ ر
- تسخیر مہر و قہر — ۸ ر
- رسول کی عیدی — ۲ ر
- پیاری تیکڑی — ۲ ر
- تاریخ خط و نویسی — ۱۰ ر
- گاما خاتون — ۱ ر
- اسلام کا انجام — ؏ہ ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۱ ر
- انتخاب توحید — صہ ر
- میلاد نامہ — صہ ر
- کرشن بیتی — ؏ ر
- اردو دعائیں — ۲ ر
- فلسفۂ شہادت — ۲ ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۲ ر
- بیگمات کے آنسو گدایان — ۸ ر
- جگ بیتی — ۴ ر
- بچوں کی کہانیاں — ۲ ر
- اسرار — ۴ ر
- کم ثوموت — عہ ر
- قبروں کے غیبی نشتے — ۶ ر
- فرام قبلہ تو شملہ — ۱ ر
- پارہ انگریزی (۱۸ رسالے) — ۵ ر
- رہنمائے سیر دہلی — ؏ہ ر
- محرم نامہ — عہ ر
- یزید نامہ — ؏ہ ر
- محفل نامہ — ۱۲ ر

حکیم محمد علی خاں

- عبرت اکمال — ؎ ر
- حسن سرور ״ — ؎ ر
- دیول دیوی — ؏ہ ر
- گورا — ؏ ر
- نیل کا سانپ — ؏ہ ر
- جعفر و عباسہ — ؏ہ ر
- تہمور حسینہ (کامل) — ؏ ر

حافظ عبدالرحمن امرتسری

- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ؏ہ ر
- الصدیق — عہ ر
- المرتضیٰ — عہ ر
- سیاحت ہند مجلد — ؏ ر
- عربی بول چال ۲ حصہ — عہ ر
- کتاب الصرف — ۸ ر
- کتاب النحو — ۵ ر

مرزا سلطان احمد

- اساس الاخلاق — ؎ ر
- ریاض الاخلاق — ۱ ر
- سراج الاخلاق — ۱۰ ر
- فن شاعری — عہ ر
- فنون لطیفہ — ؏ہ ر
- خیالات — ؏ہ ر
- امثال — ؏ہ ر

منشی سجاد حسین فرید آبادی

- معلم السیاست — ؏ ر
- تاریخ مصر جدید — ؏ ر

منشی محمد حسن بی اے

- ہاجرہ — ؏ ر
- ترکوں کی معاشرت — ؏ ر

مولانا عبداللہ العمادی

- تاریخ عرب قدیم — مہ ر
- علم الحدیث — مہ ر
- منافرۃ العرب — ۴ ر

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ — ؏ہ ر
- حیات جامی — ۱۲ ر
- علوم عرب — ؏ہ ر
- خواتین — ؏ ر

نیاز فتحپوری

- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ ر
- عائشہ صدیقہ رض — ۱۲ ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ ر
- کیوپڈ اینڈ سائکس — ۲ ر

سیماب اکبرآبادی

- سیرۃ خدیجۃ الکبریٰ — ؏ہ ر
- بنت الرسول — ۵ ر
- جام کوثر — مہ ر
- بہشتی جوہر — ۱۲ ر

پروفیسر شہباز مرحوم

- کلیات نظیر اکبرآبادی — ؏ ر
- زندگانی بے نظیر — ؏ہ ر

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مرزا رجب علی سرور
- فسانۂ عجائب علی قلم — ۱۲ر
- گلزار سرور — ۸ر
- انشائے سرور — ۶ر

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی — عہ
- ابوبکر شبلی — عہ
- خواجہ معین الدین — ۶ر
- عصر قدیم — عہ
- دولت ہسپانیہ عرب — عہ
- حروب صلیبیہ — عہ
- مسیح اور مسیحیت — عہ
- محمدات مجلد — ۵ر
- تذکرہ مشاہیر عالم — عہ
- مقدس نازنین — عہ
- قیس و لبنیٰ — عہ
- ایام عرب — عہ
- فلورا فلورنڈا — عہ
- حسن کا ڈاکو — عہ
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — عہ
- الفانسو — ۴ر
- فلپانا — عہ
- فاتح مفتوح — عہ
- جویائے حق — عہ
- ملک عزیز ورجنا ۲ حصہ — عہ
- فتح اندلس — عہ

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین — ۶ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس — عہ
- طرحدار لونڈی — ۱۲ر
- میٹھی چھری — ۴ر
- کایا پلٹ — ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو — ۶ر
- بچھڑی دلہن — ۸ر
- کرم دھم — ۴ر
- پی کہاں — ۵ر
- سامنی — عہ
- خدائی فوجدار — عہ
- فسانۂ آزاد — عہ
- الف لیلہ — ۱۲ر
- سیر کہسار — عہ
- جام سرشار — عہ

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنا منی — ۱۰ر
- ادا شیں — ۱۰ر
- بنگالی دولہن — ۱۲ر
- پرتاب — ۲ر
- مستورۂ فرنگ — ۶ر
- بیدگ — ۵ر

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا — ۱۲ر
- لیلےٰ مجنوں — ۸ر
- نوبہار — ۲ر
- مثنوی امید و بیم — ۴ر

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن — عہ
- شباب لکھنؤ — عہ
- مرقع اودھ — ۸ر
- ارمان نصیب — عہ

مسٹر عبدالماجد بی اے
- تاریخ اخلاق یورپ مجلد — ۷ر
- فلسفۂ جذبات — عہ
- فلسفۂ اجتماع — عہ
- غذائے انسانی — ۴ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
- زود پشیماں (ڈراما) — ۸ر

پنڈت چکبست لکھنوی
- صبح وطن — عہ
- گلدستۂ پنچ — عہ
- کملا — ۸ر

مسٹر انیس احمد عباسی
- ہاجرہ کی کامیابی — ۴ر
- بحری جنگ — ۸ر

جلال مرحوم
- مفیدہائے دلکش — عہ
- نظم نگاریں — عہ
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۶ر

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق — ۱۲ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- مسدس لیل و نہار — ۶ر
- سکفرن دلوسی — ۲ر

منشی امیر حسن کاکوروی
- فسانۂ لارنس و رتھ — عہ
- ونگز و نسیڈا — عہ
- الوین و لیلی — عہ

منشی رضا علی سرور کاکوروی
- یادگار سرور — ۶ر
- خیابان — ۴ر
- ہفت گلبن — ۸ر
- صبح وصل — ۱۲ر
- تصویر عبرت — ۴ر
- دو پھول — ۲ر

منشی جلیل احمد عباسی
- ہوا باز عاشق — ۱۰ر

مولانا عبدالشکور
- اسد الغابہ ۳ جلد — عہ
- علم الفقہ ۲ حصے — للعہ

علامہ سید احمد
- حمایت اسلام حصہ اول — عہ
- حمایت اسلام حصہ دوم — ۱۲ر
- فن ہیئت — ۱ر
- فن کیمسٹری — ۲ر

مسٹر مشیر حسین قدوائی
- ذکر محبوب عرب — ۱۰ر
- مشیر — ۱ر
- عرض حال — ۱ر
- تعلیم نسواں — ۴ر
- جذب دل — ۸ر
- حاکم و محکوم — ۴ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی — ۴ر
- اصلاح زبان اردو — ۴ر
- تذکرہ آب بقا — عہ
- گلدستۂ ظرافت — ۴ر
- بھولی — ۷ر

مرزا افدا علی خنجر لکھنوی
- خلوت خانۂ شاہی — ۱۰ر
- بے زبان دوست — صہ

مطبوعات الناظر پریس
- قواعد اردو — عہ
- کلیات نعت — عہ
- تجارب سلیمی — عہ
- تسخیر فرانس — ۸ر
- واقعات کربلا — عہ
- الاحسان — ۱ر
- سیلاب و بزنی ترجمہ — ۴ر
- حیات نظامی — ۴ر
- تذکرۂ خیریں — ۴ر
- سیکفرن دلوسی — ۳ر
- ایک تاوان خدریت — ۱ر
- مصنوعی شوہر — ۲ر
- زود پشیماں — ۹ر
- نوبہار — ۲ر
- کنولا (۲ جلد) — عہ
- مثنوی صبح امید — ۴ر
- اصول نسخ — ۲ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں — ۴ر
- عورتوں کی انشا — صہ
- اساس التعلیم — عہ
- شعر العجم حصہ اول — عہ
- شعر العجم حصہ دوم — عہ
- مجموعہ کلام شبلی — ۱۲ر
- ترقی زبان — ۴ر
- عورتوں کی انشا — صہ
- افغانستان از رسالہ — ۱ر
- جمیل و جمیلہ ہر شوکیہ — ۱ر

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰۹	یکم جولائی سنہ ۱۹۱۸ء	جلد ۱۹

فہرست مضامین

الناظر پریس چوک ۔ لکھنؤ

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اُردوئے معلّی
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلیٰ
- ,, معہ شرح نظم طباطبائی
- ,, معہ شرح حسرت موہانی

مولانا حالی مرحوم
- حیات جاوید مجلد
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مضامین حالی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی
- شکوہ ہند
- مثنوی حقوق اولاد
- رباعیات حالی
- قطعات حالی
- مرثیہ مرزا غالب
- بیوہ کی مناجات
- الدین یسیر
- تحفۃ الاخوان
- رحم و انصاف
- چپ کی داد
- بیگم خدمت
- ٹپکو اور ملیریا
- حب وطن
- تعصب اور انصاف

سر سید احمد خاں مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد
- تفسیر القرآن (۵ جلد)
- تبیین الکلام (۲ جلد)
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر مجلد
- سیرۃ فریدیہ
- اسباب بغاوت ہند
- مقالات سرسید
- آخری مضامین سرسید
- النظر فی بعض مسائل
- تحریر فی اصول التفسیر
- احکام طعام اہل الکتاب
- ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف
- ازالۃ الغین
- تفسیر السمٰوٰت
- جواب امہات المؤمنین
- الدعاء والاستجابۃ
- کلمۃ الحق
- ایک نادان خدا پرست
- ان شاء اللہ
- خلق الانسان
- الجن والجان

مولوی نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد
- ترجمۃ القرآن متوسط
- ترجمہ حمائل شریف
- ادعیۃ القرآن
- دہ سورہ
- مطالب القرآن
- الحقوق و الفرائض ۳ جلد
- اجتہاد
- امہات الامہ
- مرأۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم بے نظیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- مبادی الحکمہ
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ
- لکچر نمبر ۲، ۳، ۴
- لکچر نمبر ۶، ۳ مع تبصرہ سید
- لکچر تنبیہ ۔ لکچر تعلیم
- نصاب السلمین ۔ آزادی نسواں
- رسم خط ۔ اتمام حجۃ

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نیرنگ خیال
- نظم آزاد
- قند پارسی
- قصص ہند
- نصیحت کا کرن پھول
- سپاک و نماک

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۔ جلد
- تاریخ عہد سلطنت ملکہ معظمہ
- سوانحعمری ملکہ معظمہ
- کرزن نامہ
- تحفۂ امثال
- محاسن الاخلاق
- تہذیب الاخلاق
- صحیفۂ فطرت
- تقویم اللسان
- تعلیم الانتظام
- جغرافیہ ریاضیہ
- معاون الحساب
- مساحت خرد
- غرائب ۔ ۔ ۔
- عجائب الحساب
- رسالہ علم تناسب

مولانا شبلی مرحوم
- موازنہ انیس و دبیر
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانحعمری مولانا روم
- بیان خسرو
- علم الکلام
- الکلام
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر
- شعر العجم جلد اول
- ,, جلد دوم
- ,, ,, سوم
- ,, ,, چہارم
- مثنوی صبح امید
- آغاز اسلام
- اسلامی حکومت
- زیب النسا
- جہانگیر
- مجموعۂ کلام شبلی
- دیوان شبلی فارسی
- بوئے گل ,,
- دستۂ گل ,,
- برگ گل ,,
- قصیدۂ ۔ ۔ ۔

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد
- مسلمانوں کی تہذیب
- مکاتبات الخلان
- تقلید و عمل بالحدیث
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب
- کتاب المحبت و الشوق
- نیچر اور قانون فطرت
- اسلام
- آیات بینات ۳ جلد
- مجموعہ لکچر مجلد

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- ادیب
- لطائف الخواتین
- نور جہاں
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- ۔ ۔ ۔
- اردو کی ڈالی
- قومی نظم
- ۔ ۔ ۔
- مکالمہ مرد و عورت
- حیات جاودانی
- سوانح نظام حیدرآباد

مولوی نظیر حسن مرحوم
- خیالات عزیز
- ۔ ۔ ۔ اردو

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

مشاطۂ سخن*

(از صفدر مرزاپوری)

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ اگلے اُستادانِ فن اپنے شاگردوں کو کیسے عمدہ شاعر بنا دیتے تھے تو آپ اُن اصلاحات کو بغور پڑھیے جو مختلف اُستادوں نے وقتاً فوقتاً دی ہیں ایک ایک لفظ کے تغیر تبدل نے بعض اوقات معمولی اشعار کو اس قدر بلند بنا دیا ہے کہ اچھے اچھے شاعر کی فکر وہاں تک نہیں پہونچتی۔

اُردو زبان میں یہ اپنی قسم کی پہلی ہی کتاب ہے جسمیں مصحفی سے لیکر اسوقت تک کے اکثر اُستادانِ فن کی اصلاحوں کے نمونے نہایت خوبی سے ترتیب دیے گئے ہیں متاخرین میں سے آسیر مینائی۔ امیر اللہ تسلیم اور شوق قدوائی کے لکھے ہوے نوٹ بہت خوب ہیں۔ قیمت عہ

حیات مالکؒ

یعنی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح زندگی۔ اُنکی تصنیفات پر تبصرہ۔ تابعین مدینہ اور فقہاے حجاز کے حالات علم حدیث کی ابتدائی تاریخ اور جمع حدیث کیلیے محدثین کرام کی کوششوں کا ذکر۔ از جانشین علامہ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی قیمت ۱۲ر

چند از صد ہزار چند

(از نواب حاجی محمد اسمعیل خاں رئیس دتاولی وایڈیٹر افادہ آگرہ)

اس رسالہ میں بیہقی۔ ابن اثیر جزری۔ ابن ماجہ۔ ابن تیمیہ۔ امام اشعری۔ ابن حجر عسقلانی۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور متعدد دیگر مسلمان مصنفین متقدمین کے مختصر حالات جمع کیے گئے ہیں قیمت ۳ر

اصحاب و ائمہ کرام

نواب حاجی اسمعیل خاں صاحب نے اس مختصر تذکرہ میں ابتداءً بعض مذہبی اصطلاحات مثل صحابی۔ مہاجرین۔ انصار۔ خلفاء اربعہ۔ عشرہ مبشرہ۔ ائمہ اربعہ وغیرہ کی آسان و عام فہم توضیح کردی ہے تاکہ بچوں اور بچیوں کے علاوہ انگریزی پڑھے ہوے نوجوانوں کی واقفیت کا سبب ہو۔ اور بعد ازاں اکثر اکابر صحابہ و ائمہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں۔

قیمت ۸ر

التناسخ

(از مولانا سید احمد مجتہد العصر لکھنوی مصنف فلسفۃ الاسلام وغیرہ)

اس رسالہ میں تناسخ کے بارے میں علمی رنگ میں نہایت مدلل طریقہ پر بحث کی گئی ہے۔

قیمت ۲ر

صبر کی دیوی

مسٹر سلطان حیدر جوش جنکے دلچسپ اور موثر افسانے الناظر میں ہمیشہ شایع ہوتے رہے ہیں یہ انھیں کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں سوتیا ڈاہ کے دردناک واقعات اور صبر کے عمدہ نتایج بڑی خوبی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں قیمت ۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

---

* جناب صفدر مرزاپوری کی مقبول عام تالیف بزم خیال جسمیں ساتھ سے زیادہ اُردو کے اشعار درج کیے گئے ہیں جن سے کسی قصہ یا لطیفہ کا تعلق ہے۔ اب چوتھا ایڈیشن چھپا ہے۔ شائقین منگا لیں۔ قیمت عہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۰۹ جلد ۱۹ ——— یکم جولائی سنہ ۱۹۱۸ء

مسئلۂ ارتقا اور اُسکا علم حیوانات و نباتات پر اثر

جب ہم موجوداتِ عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دو قسم کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ جنھیں ہم جاندار کے لقب سے خطاب کرتے ہیں اور دوسری وہ جنکو ہم بے جان کہکر پکارتے ہیں۔ اول الذکر میں پودے اور جانور شامل ہیں۔ اور موخر الذکر میں معدنیات۔ ہوا۔ مٹی وغیرہ۔ یہ سب کچھ دیکھکر ہمارے دل میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں

اول کرۂ زمین کس طرح بنا؟

دوم جاندار چیزیں کس طرح پیدا ہوئیں؟

سوم یہ گوناگوں انواع مستقل بالذات ہیں یا ایک دوسرے سے مشتق و منشعب؟

سوال اول کا علمی ثبوت بہم پہونچانا بہت مشکل ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کرۂ زمین سورج کا ایک ٹکڑا تھا قانون انتقال کے مطابق سورج بڑے بڑے دہکتے ہوے ٹکڑے اُچھالتا رہتا ہے۔ جو تھوڑی دور جاکر واپس آجاتے ہیں اور اس میں ملجاتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ سورج اپنے محور پر گردش کرتا رہتا ہے اور اسی حالت میں اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ پیش ہوجاتا ہے جسکی وجہ سے کوئی ٹکڑا اس میں سے نکل جاتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا۔ بلکہ منفق ہوکر ایک خاص دائرہ میں سورج کے گرد بلا انقطاع گردش کرنے لگتا ہے۔

زمین بھی سورج کا ایک ٹکڑا تھا جو اسی طرح اس سے الگ ہو گیا - ابتدائے انقطاع میں یہ مجسم شعلہ تھا۔ فضائے محض میں گردش کا تقاضا حرارت کا کم ہونا تھا - خروجِ حرارت کے معنی برودت کا پیدا ہونا، اور برودت کا لازمی نتیجہ انجماد ہے - غرضکہ کرۂ زمین میں انجماد شروع ہوا - اور وہ سیال ہو گئی - اسکے بعد اسکے بالائی حصہ پر ایک سطح منجمد قشر تیار ہو گئی جسے زمین کا طبقۂ اولیٰ کہتے ہیں - اس بات کا ثبوت کہ زمین کسی زمانے میں سیال تھی ایک یہ بھی دیا جاتا ہے کہ زمین کی موجودہ شکل ایسی ہے جو ایک سیال گولے کے اپنے محور پر گردش کرنے سے ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ خط استوا پر سے اُبھری اور قطبین پر چپٹی ہے - اور چونکہ زمین کا اپنے محور پر گردش کرنا بطور ایک واقعہ کے ثابت ہو چکا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ زمین کسی زمانے میں سیال تھی۔

طبقۂ اولیٰ کے نیچے سے زمین پر ابر مشتعل تھی اسکی وجہ سے بخارات نکلے اور بلند ہو گئے اور اُوپر جا کر ابر بنے - ابروں سے دریا پیدا ہوئے اور ان دریاؤں میں جو اجزا ارضیت کے قابل تھے وہ نیچے بیٹھ گئے جس سے ایک دوسرا طبقہ پیدا ہو گیا - یہ سلسلہ انجماد کرۂ زمین کے اندرونی حصہ میں اب تک جاری ہے۔ اسکا ثبوت ہمیں آتش فشاں پہاڑ دیتے ہیں جبکہ ان میں سے پگھلے ہوئے معدنیات و پتھر نکلتے ہیں - خیال کیا جاتا ہے کہ ایک دن یہ کرہ بالکل ٹھوس اور سرد ہو جائیگا اور کوئی ذی حیات جسم اسپر زندہ نہیں رہ سکے گا۔

سوال دوم کی بابت ہکسلی اور ہیکل کا خیال تھا کہ سب سے پہلا جسم عضوی بے جان مادّہ سے پیدا ہوا۔ اور وہ ایک بے ڈیل ڈول گولا سا تھا - ہیکل کے خیال کے مطابق حیات کی ابتدا سمندر سے ہوئی- اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سے دلائل پیش کرتا ہے - ڈارون صاحب کا خیال تھا کہ عورت کو حیض کا آنا اسی اہم واقعہ کی نشانی ہے۔

اگر ہم پانی اور ہوا کی ترکیب پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہی کیمیائی مفرد پائے جاتے ہیں جن سے ایک جسم عضوی مرکب ہے - ہوا، نائٹروجن اور آکسیجن دو گاسوں کے مجموعہ کا نام ہے - پانی آکسیجن و ہیڈروجن سے مرکب ہے - اجسام عضوی کے بڑے بڑے اجزا یہی نائٹروجن، آکسیجن اور ہیڈروجن ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ضرور ایک خفیف سا تعلق ہے۔

آؤ ہم اس سے ذرا اور آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ حیوانات اور پودوں میں کیا فرق ہے اور ہم انھیں کس صحت کے ساتھ جدا کر سکتے ہیں۔

اوّل - حیوانات عام طور پر جامد غذا کھاتے ہیں - وہ کاربن کا جز نشاستہ وغیرہ یا اقسام شکر اور

چربی وغیرہ سے حاصل کرتے ہیں۔ جو کہ پہلے سے پودوں یا اور جانوروں کی مدد سے بنے ہوئے ہوں۔ وہ نائٹروجن کا جز تیار شدہ ایومن سے لیتے ہیں۔ پودے مقابلۃً سادہ غذا کھاتے ہیں۔ وہ کاربن کا جز کاربانک ایسڈ گاس سے لے سکتے ہیں۔ جو کہ ہوا یا پانی میں موجود ہو وہ نائٹروجن زمین سے بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔

دوم۔ حیوانات میں وہ سبز جوہر جو اکثر پودوں کی پتیوں میں پایا جاتا ہے نہیں ہوتا۔ پودوں میں یہ سبز جوہر موجود ہوتا ہے۔ اسکی وجہ سے وہ سورج کی شعاعوں کی قوت کو کاربانک ایسڈ گاس میں سے کاربن نکالنے اور پھر اس سے ایومن وغیرہ بنانے میں صرف کر سکتے ہیں۔ حیوانات اپنی غذا کے لیے پودوں کے محتاج نہیں۔

سوم۔ حیوانات حرکت بالارادہ پر قادر ہیں۔ پودے اس سے معذور ہیں۔

چہارم۔ حیوانات میں فضلہ نکالنے والے اعضا موجود ہوتے ہیں۔ پودوں میں ایسے اعضا نہیں ہوتے۔

پنجم۔ حیوانات میں تقسیم اشتغال (Assimilation) بہت نمایاں ہے پودوں میں تقسیم اشتغال اسقدر نمایاں نہیں

ان صفات سے عام طور پر فتوے دیا جا سکتا ہے کہ فلاں جسم عضوی حیوان ہے یا پودہ۔ مگر جب ہم ادنیٰ درجہ کے حیوانات اور ادنیٰ درجہ کے پودوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان میں تمیز کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی چھوٹے چھوٹے کیڑے جو پلیگ یا ہیضہ وغیرہ پھیلانے کا موجب ہوتے ہیں اور ہر سال اسقدر جانوں کو تلف کرتے ہیں حیوانات یا پودے دونوں کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں بعض خصوصیات تو پودوں کی سی پائی جاتی ہیں اور بعض حیوانات کی سی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پودے اور جانور ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور ان میں حقیقی فرق بہت کم ہے۔ اسکے علاوہ پودے اور حیوانات دونوں خلایا سے مرکب ہوتے ہیں اور دونوں کے خلایا میں وہی علقہ الاولے (یعنی پروٹوپلازم) اور مرکز الجوہر (نکلی اس) پایا جاتا ہے۔ غرضکہ دونوں کے ترکیبی اجزا یکساں ہیں حیوانات اور پودے اپنے اپنے دور اولیٰ میں بالکل یکساں ہوتے ہیں اور وہ ایک واحد خلیہ سے پیدا ہوتے ہیں جو کہ خلیۂ بیضیہ یا درخلیۂ منویہ سے پیدا ہوتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حیوانات و نباتات ایک ہی زینے کے مختلف درجے ہیں غالباً بیجا نہ ہوگا۔

تیسرا سوال نہایت اہم ہے اور ہمارے مضمون کا زیادہ حصہ اسی میں صرف ہوگا۔ پرانے زمانے

کے عالموں کا خیال تھا کہ انواع حیوانات و نباتات مستقل بالذات ہیں - اور وہ ایک ایسے عمل تخلیق سے پیدا ہوئی تھیں جسکا انسان کی عقل میں آنا مشکل بلکہ محال ہے - اس دعوے کی بنیاد چونکہ نہایت کمزور تھی اسلیے یہ جلد ہی باطل ہوگیا - اسکے بعد ایک اور خیال پیدا ہوا یعنی کہ یہ انواع مستقل بالذات نہیں بلکہ آپس میں مشتق اور ایک سست رفتار عمل ارتقا سے پیدا ہوئی ہیں - یہ تو ایک روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس عالم میں کسی چیز کو سکون نہیں - ہر ایک ذرہ ہر لحظہ ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے اور اسمیں ایک نیا تغیر پیدا ہوجاتا ہے - جس طرح ایک بچہ جوان ہوتا ہے یا ایک بیج ایک زبردست درخت کی صورت اختیار کرلیتا ہے - اسی طرح یہ عالم بھی ایک ادنیٰ حالت سے بذریعہ ایک ایسے عمل کے موجودہ حالت میں پہونچا ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے - اسی کا نام ارتقا ہے - ارتقا ایک طبعی قانون ہے جو دنیا کے ہر ایک ذرے پر نافذ ہے - اس عمل کو سمجھانے کے لیے لوگوں نے بہت سے نظائر پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کی طرف ہمنے ابھی اشارہ کیا ہے - غلط فہمی سے بچنے کے لیے یہاں پر یہ سمجھا دینا غالباً غیر موزوں نہ ہوگا کہ ارتقا اور مسئلۂ ارتقا دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں - ارتقا تو جیسا کہ ابھی ہمنے بیان کیا قدرت کا ایک زبردست اور اٹل قانون ہے جس سے کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا - اور مسئلۂ ارتقا اس قانون کو سمجھانے کی کوشش کا نام ہے کہ وہ کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے - اسی کے ضمن میں مختلف نظائر جو ارتقا کے متعلق ہیں آنے چاہییں - یہ بات ایک تمثیل سے خوب واضح ہوجائے گی - اگر ہم کوئی وزندار چیز اچھالیں تو وہ آخرکار زمین پر آٹھیرتی ہے - یہ تو واقعہ ہے - اب ہم اسکی مختلف تاویلیں کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے - اس چیز کو کھینچنے والی خواہ کشش زمین ہو یا اور کوئی قوت ان تفصیحات سے واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا -

عمل ارتقا کے ثبوت میں ہم چار قسم کے واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں -

اول - وہ جو صور انواع اور تشریح الاجسام کے مطالعہ سے اخذ کیے جاسکتے ہیں -

دوم - وہ جنکو علم الجنین (Embryology) ہم پہونچاتا ہے -

سوم - وہ جو علم طبقات الارض سے اخذ کیے گئے ہیں -

چہارم - وہ جو جماعت بندی یا تنظیم (Classification) حیوانات و نباتات سے معلوم ہوتے ہیں -

اول - اگر حیوانات (و نباتات) ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں تو انکے جسموں کی بناوٹ

بحیثیت مجموعی ایک ہی ہونی چاہیے۔ گو وہ ہر ایک فرد میں اُسکی عادتوں کے مطابق بدل گئی ہو۔ مختلف انواع کے وہ اعضا جو کہ ایک عام ترکیبی بناوٹ سے مرکب ہوں تشابہ (homologous) اور اسکے خلاف ایسے اعضا جنکا وظیفۂ عضوی تو وہی ہو لیکن جنکی بناوٹ مختلف ہو اعضائے مماثل (analogous) کہلاتے ہیں مثال کے طور پر تتریوں اور پرندوں کے پر گو وہ دونوں اُڑنے کے کام آتے ہیں لیکن انکی بناوٹ بہت مختلف ہوتی ہے۔

تشابہ بناوٹیں اور اعضائے انواع کے دم بدم بدلتے رہنے کی ایک زبردست دلیل ہے۔ وہیل مچھلی کے پر کی ساخت چوپائے جانوروں کے اگلے پاؤں اور انسانی بازو سے ایک ایک ہڈی میں ملتی ہے۔ چمگادڑ کے بازوؤں کی ہڈیاں اور دودھ پلانے والے جانوروں ہی کی طرح بنی ہوئی ہیں (تصویر نمبر ۱۳) معدوم اُڑنے والے زحافات پرندوں اور چمگادڑ کے پر ایک ہی ترکیب سے بنے ہوئے ہیں (تصویر نمبر ۵) ان واقعات کی صحیح تفسیر یہی ہو سکتی ہے کہ تمام جانور ایک ہی گروہ کے مختلف افراد ہیں اسلیے انکے اعضا میں ایک عام مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن اعضا ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہو گئے ہیں۔ اس تغیر کو ہم دوسرے الفاظ میں بطور ایک قانون کے بیان کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر کسی عضو کا وظیفہ طبیعی بدل جائے تو ساتھ ہی اسکی ساخت بھی بدل جاتی ہے۔

اعضائے غیر نشو و نما یافتہ (Rudimentary structure) اکثر حیوانات میں ایسے اعضا اور بناوٹیں پائی جاتی ہیں جو انکے مصرف میں نہیں آتیں۔ حالانکہ قدرت کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کرتی۔ وہیل مچھلی کی پچھلی ٹانگیں بہت ہی مختصر ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ کھال میں چھپی رہتی ہیں۔ عام طور پر سانپوں میں بازوؤں یا ٹانگوں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا لیکن اژدہوں میں ٹانگوں کا خفیف سا نشان پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں سانپوں کے آبا و اجداد کے ٹانگیں اور بازو موجود تھے۔ جب کسی عضو کو کام میں نہیں لایا جاتا تو وہ یا تو آئندہ نسلوں میں بالکل غائب ہو جاتا ہے یا ایک نامکمل صورت میں باقی رہتا ہے آپ نے اکثر سنیاسیوں کو دیکھا ہوگا جنکا ایک بازو ہمیشہ اوپر اُٹھائے رہنے کی وجہ سے آخر خشک اور بیکار ہو جاتا ہے۔

آدمی حقیقت میں حیوانات کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ عالم حیوانات کے ارتقائی مدارج کا آخری نتیجہ ہے۔ اس بات کی صرف یہی دلیل نہیں کہ وہ بندر سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے بلکہ بہت سی کڑیاں ایسی موجود ہیں جو اسکا سلسلہ حیوانات سے ملاتی ہیں۔ وی ڈرشیم (Wiedersheim) نے

ایک سو ایسی ہی غیر نشو و نما یافتہ بناوٹیں شمار کی ہیں جو کہ انسان کے کسی مصرف کی نہیں اور جنکو صرف اسکے آباؤ اجداد جانوروں کی نشانیاں کہا جا سکتا ہے۔

بہت سے جانور اپنی کھال اور کانوں کو (خاص اعصاب (muscles) کے ذریعہ) مکھی وغیرہ اُڑانے کے لیے ہلا سکتے ہیں۔ انسان میں بھی ایسے اعصاب کے نشان پائے جاتے ہیں۔ گو وہ اب اُنکو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا۔ دُم جو اکثر جانوروں میں پائی جاتی ہے، انسان میں اُسکا کھال کے نیچے صرف نشان باقی ہے؛ اور ایسے اعصاب بھی موجود ہیں جنکے ذریعہ سے وہ ہلائی جاتی تھی۔ اس بات کا ثبوت کہ واقعی یہ اعضا غیر نشو و نما یافتہ ہیں۔ یہ ہے کہ انسانی جنین میں اچھی خاصی دُم موجود ہوتی ہے۔ (تصویر نمبر ۳)۔ ایسا ہی ایک اور عضو انسان میں اندھی آنت ہے (تصویر نمبر ۴) یہ آنت سبزی خور جانوروں میں مفید مطلب ہے لیکن انسان کے لیے غیر مفید ہے بلکہ بعض اوقات باعث خطرہ ہو جاتی ہے

دُوم۔ ہمنے دیکھا کہ صورتوں اور اعضا کی مشابہت انواع کا طبیعی رشتہ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اوقات بعض اپنے ماحول (Environment) کی تطابقت کی وجہ سے اسقدر متغیر ہو جاتے ہیں کہ ہم انھیں آسانی سے نہیں پہچان سکتے۔ اگر ایسے جانوروں کے جنین کی نشو و نما کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی دقتیں آسانی حل ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر جسم عضوی اپنے دور اولی سے دور آخر تک تقریباً وہ تمام مراحل طے کرتا ہے جو اسکے آبا و اجداد نے کیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انفرادی تاریخ حیات کی مراجعت ہوتی ہے۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ فرد انھیں مراحل کو جو اسکے آبا و اجداد نے صدیوں میں طے کیے چند مہینوں یا دنوں میں طے کر لیتا ہے۔ اسے ذرا اور واضح کرنے کے لیے آؤ ہم دیکھیں کہ اجسام عضوی کے جنین دور اولی میں کس طرح ترقی کرتے ہیں:۔

ہر ایک جسم عضوی کی بنا ایک احد خلیۂ بیضیہ (egg-cell) سے ہوتی ہے۔ اس خلیہ سے خلیۂ منویہ (Sperm-cell) ملتا ہے۔ وصل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مرکب خلیہ پیدا ہو جاتا ہے (تصویر نمبر ۷) کچھ مدت کے بعد یہ مرکب یا مثمر خلیہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک مستقل خلیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان دو خلایہ میں سے ہر ایک پھر دو حصوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور وہ حصے مکمل خلایا بن جاتے ہیں۔ یہ عمل جاری رہتا ہے حتی کہ ایک گیندسی بنجاتی ہے جو کہ ٹھوس ہوتی ہے۔ مرکزی خلایا اب مائع ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس ٹھوس گنبد میں خلاء پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس وقت

اسکی شکل ایک کھوکھلے گیند کی سی ہو جاتی ہے جسکی دیواروں کی موٹائی ایک خلیہ سے زیادہ نہیں ہوتی - یہ اسکا دوسرا دَور ہے - تین دور میں ہم اس متعدد الخلایا کرہ کو دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں - ایک بیرونی یا جلدی دوسرا اندرونی - ان دونوں تہوں کے درمیان ایک چھید باقی رہ جاتا ہے جو کہ اس جسم عضوی کا ابتدائی منہ کا نشان ہے - اسکے بعد یہ کرہ اپنے اوپر دوہرا ہو جاتا ہے - ہر ایک (multicellular organism) متعدد الخلایہ جسم عضوی کو تمام مراحل طے کرنا پڑتے ہیں - گویا تمام اجسام عضوی اپنے دور اول میں ایکدوسرے سے بہت مشابہت رکھتے ہیں - اس قانون میں دو باتیں قابل تفہیم ہیں (الف) یہ ضروری نہیں کہ انفرادی تاریخ حیات میں آبائی تاریخ حیات کے تمام مدارج پائے جائیں - مثلاً انسان اپنے کسی دور میں بھی کُتے یا بلی سے مشابہت نہیں رکھتا - (ب) یہ مراجعت مختصر ہوتی ہے - مفصل نہیں جب جنین کو بہت سے مراحل طے کرنا ہوتے ہیں تو وہ اکثر بجاے زینہ بہ زینہ اوپر چڑھنے کے بہت سے زینے ایک ہی چھلانگ میں طے کر لیتا ہے -

نباتات کی زندگی بھی خلیۂ واحد سے شروع ہوتی ہے - اور ان میں بھی اسی طرح مختلف دَور پائے جاتے ہیں - یہ تمام باتیں اس بات کی زبردست دلیل ہیں کہ حیوانات و نباتات آپس میں مشتق ہیں - اور انواع حیوانات و نباتات میں خود بھی ایک طبعی رشتہ ہے -

- عالم طبقات الارض (Geologist) زمین کو بلحاظ عمر کے مختلف طبقات میں تقسیم کرتے ہیں - ان طبقات کو کھودنے سے بہت سے معدومہ حیوانات و نباتات کے آثار ملے ہیں جو موجودہ زمانے میں نہیں پائے جاتے - بعض جانوران میں ایسے بھی پائے گئے ہیں جن کو ہم گمشدہ کڑیاں کہیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا -

مثال کے طور پر بویریا میں دو معدوم جانور پائے گئے تھے - جن میں سے ایک تو اسوقت برلن کے اور دوسرا لنڈن کے عجائب خانے میں ہے - اس عجیب جانور میں زحافات اور پرندوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں - اسکے پَر تو بالکل پرندوں سے ملتے جلتے ہیں مگر دُم اُن سے مختلف ہے - جبڑوں میں دانت موجود ہیں - اور بازوؤں کی ہڈیاں زحافات کے بازو کی ہڈیوں سے مشابہت رکھتی ہیں - خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پرندوں اور زحافات کی درمیانی

کڑی ہے۔

ان طبقات میں سے بعض جانوروں کے آبا و اجداد کی پوری تاریخ بھی مل گئی ہے۔ ایسے جانوروں میں ایک گھوڑا بھی ہے۔ اسکے آبا و اجداد کے اگلے اور پچھلے پاؤں کی پانچ انگلیاں تھیں جو آہستہ آہستہ کم ہونی شروع ہوئیں حتیٰ کہ ایک ہی انگلی اور وہ بھی بہت ہی مختصر صورت میں باقی رہ گئی۔ (تصویر نمبر) - یہ بات قیاسی نہیں۔ گھوڑے کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کی ہڈیاں برآمد ہو چکی ہیں جنکے پاؤں کی انگلیاں بالترتیب پانچ، چار، تین اور دو تھیں۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ ایک خاص زمانے کے طبقات میں ایک ہی قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایسے طبقات جن میں ادنیٰ قسم کے ریڑھ کی ہڈی والے جانور ملتے ہیں۔ پرندوں کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ پرند ان طبقات سے بہت اوپر والے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرند ان حیوانات سے بعد میں پیدا ہوئے۔

معترض یہ سوال کر سکتا ہے کہ آیا وہ تمام درمیانی کڑیاں مل گئی ہیں جن سے ثبوتِ ارتقا لازم آتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ چند در چند وجوہ سے علم طبقات الارض کی شہادت ابھی نامکمل ہے۔

(۱) اکثر اجسام عضوی مرنے کے بعد گل سڑ جاتے ہیں۔ ان تمام میں ہڈیاں یا اور ایسی ہی سخت چیزیں نہیں پائی جاتیں جو کہ حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرکے اسوقت تک باقی رہتیں۔

(۲) یہ ضروری نہیں کہ تمام حیوانات کو ایسے موقعے پیش آئیں جن سے وہ زمین میں دب جائیں اور اس زمین کو قدرت چٹانوں میں بدل دے۔ خشکی پر رہنے والے جانوروں کے اجسام اکثر مردار خوار یا گوشت خوار جانور تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ انکا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔

(۳) قدرت میں توڑنے پھوڑنے کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ پرانی چٹانیں اور طبقات تباہ ہو جاتے ہیں اور نئی زمینیں اور پہاڑ ہمیشہ بنتے رہتے ہیں۔ اکثر دبے ہوئے آثار اس طرح تباہ ہونا ممکن ہیں۔

(۴) ہمارا طبقات الارض کا مطالعہ ابھی بہت محدود ہے۔ خدا جانے کتنے طبقات ایسے ہیں جنکی ہمکو خبر بھی نہیں اور نہ ہو گی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ طبقات الارض کی شہادت جسقدر بہم پہنچ چکی ہے اس سے انکار نہیں ہو

چہارم - اگر یہ گوناگوں اقسام نباتات و حیوانات عمل ارتقا ہی سے پیدا ہوئی ہیں تو لازم آتا ہے کہ ہم انکو مختلف گروہوں، جماعتوں، خاندانوں اور انواع میں تقسیم کر سکیں۔ کیونکہ پشت اول اور پشت دوم میں آٹھویں اور نویں پشت کی نسبت زیادہ مناسبت ہوگی۔

ہم انسان ہی سے شروع کرتے ہیں۔ اس جماعت میں وہ تمام جانور شامل ہو سکتے ہیں جنمیں کم از کم ذیل کی خصوصیات پائی جائیں:-

(۱) پھیپھڑوں کے ذریعہ سانس لیتے ہوں

(۲) خون گرم ہو -

(۳) جسم پر بال ہوں -

(۴) بچوں کو تھنوں کے ذریعہ دودھ پلاتے ہوں -

(۵) بدن اندر سے دو حصوں میں تقسیم ہو۔ ایک تو وہ حصہ جسمیں دل اور پھیپھڑے اور دوسرا وہ جسمیں اور اعضا معدہ، آنتیں، جگر وغیرہ ہوتے ہیں -

(۶) قلب پوری طرح چار خانوں میں تقسیم ہو -

(۷) دانت دو طرح کے ہوں ایک دودھ کے دوسرے مستقل -

پرندوں میں ذیل کی صفات لازم ہیں:-

(۱) سانس پھیپھڑوں کے ذریعہ لیتے ہیں -

(۲) حرارت غریزی تیز ہوتی ہے -

(۳) بالوں کے بجائے جسم پر پر ہوتے ہیں

(۴) نسل انڈوں کے ذریعہ قائم رکھتے ہیں -

(۵) دل کے چار خانے ہوتے ہیں -

(۷) دانت نہیں ہوتے

(۸) انکے جسم ہوا میں اڑنے کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ ہڈیاں ہلکی پھلکی ہوتی ہیں اور اگلے بازو پروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں -

اسکے بعد زاحفات (Reptilia) کی جماعت آتی ہے وہ بھی چند خصوصیات سے مخصوص ہیں

(۱) سانس پھیپھڑوں کے ذریعہ ہی لیتے ہیں
(۲) خون سرد ہوتا ہے۔
(۳) جسم پر چھلکے (scales) ہوتے ہیں۔
(۴) دانت موجود ہوتے ہیں۔
(۵) نسل انڈوں سے قائم رکھتے ہیں۔
(۶) قلب پوری طرح چار خانوں میں تقسیم نہیں ہوتا۔

اس سے آگے بڑھیں تو دوگلی جانوروں (amphibians) کی جماعت آتی ہے جو خشکی اور تری دونوں میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان میں زحافات اور مچھلیوں کی جماعت (جسکا ہم آئندہ ذکر کریں گے) کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ گویا وہ انکی درمیانی کڑی ہیں۔

(۱) آلاتِ تنفس حالتِ جنین میں گلپھڑے ہوتے ہیں جو کہ یا تو قائم رہتے ہیں یا پھیپھڑوں سے بدل جاتے ہیں
(۲) انکی کھال میں غدد پائے جاتے ہیں
(۳) ہاتھ پاؤں جب موجود ہوں تو انکی پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔
(۴) انکا خون ٹھنڈا ہوتا ہے
(۵) دل پانچ خانوں میں منقسم ہوتا ہے۔

دوگلی جانوروں کے بعد مچھلیوں کی جماعت آتی ہے جو ہمیشہ پانی میں زندگی بسر کرتی ہیں۔

(۱) انکے ہاتھ پاؤں اور آلاتِ تنفس پانی میں رہنے کے لیے موزوں ہوتے ہیں یعنی گلپھڑے موجود ہوتے ہیں
(۲) دل تین خانوں میں تقسیم ہوتا ہے۔
(۳) اندرونی نتھنے نہیں ہوتے۔ دوگلی جانوروں، زحافات، پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں میں موجود ہوتے ہیں۔
(۴) ایک جلدی ڈھانچہ موجود ہوتا ہے۔
(۵) مخیخ نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔

ان تمام جماعات کو ہم ایک بڑے گروہ میں شامل کر سکتے ہیں جو کہ صفات ذیل سے متصف ہوں۔

(۱) ریڑھ کی ہڈی یا حالتِ جنین میں اسکا نشان باقی ہو۔

(۲) ایک ڈھری کھوکھلا نظام عصبی موجود ہو۔
(۳) گلپھڑوں کے چھید کم از کم حالتِ جنین میں موجود ہوں۔

اسی طریقہ سے تمام اقسامِ حیوانات و نباتات گروہوں اور خاندانوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ تقسیم قدرت نے نہیں کی بلکہ ایک انسانی فعل ہے کیونکہ یہ گروہ و خاندان آپس میں بہت سی خصوصیات میں مشترک ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی شجر کی مختلف شاخیں یا ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔

واقعات سے ہٹ کر ہم ارتقا کے مختلف نظائر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بسمارک نامی ایک شخص ڈارون سے پہلے ہوا ہے۔ یہ فرانس کے باغِ نباتات کا جس میں بہت سے اقسام حیوانات بھی موجود تھے مہتمم تھا۔ اسلیے اسے وہاں وحدتِ نوع کا مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا۔ وہ ارتقا کے دو بڑے سبب بتاتا ہے۔ اول تو ماحول کا اثر، دوسرے کثرتِ استعمال سے اعضاؤں کا نشوونما پاجانا اور ترکِ استعمال سے انکا غیر نشوونما یافتہ رہجانا اسکا زیادہ اعتماد قانون وراثت اور قانون مطابقت پر تھا۔ تنازع البقا اور انتخابِ طبعی کو اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ تاہم وہ اس سے بے خبر بھی نہ تھا۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ زراف کی گردن اسلیے زیادہ لمبی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اونچی اونچی شاخوں کے پتے کھانے کی کوشش کرتا رہا۔ سانپوں کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں اسلیے مفقود ہوگئیں کہ وہ انکو استعمال نہ کرتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ تغیرات ماحول افراد کو بھی متغیر کردیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسکا اثر آئندہ نسلوں میں باقی رہتا ہے یا نہیں۔

ڈارون کے نظریہ کے دو بڑے جز ہیں (الف) کشمکشِ حیات (ب) تغیرات۔

(الف) ہر ایک فرد کیلیے بعض حالات مفید ہوتے ہیں اور بعض مضر۔ مثلاً ایک پودہ ایسی زمین میں جو اسکی ضروریات کو پورا کرسکے خوب بارآور ہوگا۔ ایسی مناسب موزوں جگہ لینے کیلیے اس نوع کے افراد مختلفہ کی آپس میں اور دوسری انواع کی جو اس سے مشابہت رکھتی ہیں ایک رقابت لگی رہے گی۔ اگر آپ کسی میں ایک قطعہ زمین بن بوئے چھوڑ دیں تو اس میں مختلف قسم کے پودے نکل پڑیں گے جو باغ کے سابقہ پودوں کو مار ڈالینگے رفتہ رفتہ وہ پودے جو زیادہ قوی ہیں کمزور پودوں پر غالب آجائینگے اور انکو بالکل نیست و نابود کردینگے نلائی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے ناکارہ پودے ان پودوں کا جنکو کسان پال رہا ہے حق نہ چھین لیں یا مار نہ ڈالیں۔ نباتات کو صرف دوسرے پودوں سے روشنی اور غذا کے لیے مقابلہ کرنا نہیں پڑتا بلکہ

انکے دشمن جانور بھی ہیں ۔ نوخیز پودوں کو بہت سے سبزی خور جانور تہ و بالا کر دیتے ہیں ۔ ڈاروِن صاحب نے اسپر متواتر تجربے بھی کیے تھے ۔ انھوں نے ایک قطعہ زمین کو ناکارہ خس و خاشاک سے بالکل صاف کرکے اُس میں چند پودے لگائے ۔ اور وہ دیکھتے رہے کہ ان پودوں کا کیا حشر ہوتا ہے انمیں سے تقریباً ۴/۵ پودے تو کیڑوں مکوڑوں نے ضائع کر دیے اسکے علاوہ بکریوں وغیرہ نے ۔ اکثر جنگلات بکریوں کی مداخلت سے برباد ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ چھوٹے چھوٹے پودوں کو کھا جاتی ہیں ۔ اگر ہم ایک چراگاہ کو باڑے سے احاطہ کر دیں تو اُس میں بہت سے درخت صرف اسلیے نشو و نما پا جاتے ہیں کہ وہاں ایسے جانوروں کا گزر نہیں ہوتا ۔

اسی طرح حیوانات میں بھی کشمکش حیات (Struggle for life instance) موجود ہے ۔ ادنے درجے کے جانوروں کے انڈے اور بچے ہمیشہ بڑی تعداد میں تباہ ہوتے رہتے ہیں ۔ کچھ تو دوسرے جانوروں کی خوراک بنتے ہیں اور کچھ مناسب مقام پر پہونچنے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ لیکن سب سے پہلے ایسے بچے لقمۂ اجل بنتے ہیں جو ماحول سے تطابقت یا غذا وغیرہ تلاش کرنے کے ناقابل ہوں ۔ اس سابقت کے علاوہ ایک نوع کو دوسرے نوع سے بھی مقابلہ درپیش رہتا ہے ۔ وہ انواع جو ایک دوسری سے زیادہ ملتی جلتی ہیں یا جنکا قریبی رشتہ ہے ان میں یہ کشمکش سخت ترین ہوتی ہے کیونکہ ایسی انواع کی غذا اور مناسب حالات حیات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں ۔ اسکے علاوہ ایک اور کشمکش بھی جاری رہتی ہے ۔ جیسے گوشت خوار جانوروں میں اور اُن جانوروں میں جو اُنکا شکار بنے ہوتے ہیں ۔ غرضکہ ڈاروِن صاحب تنازع البقا کو دو طرح کا مانتے ہیں :- ایک تو فاعلی کشمکش جو حیوانات کو ایک دوسرے سے پیش آتی ہے ۔ اور دوسری مفعولی جو اُنکو قوائے طبیعۂ صادرہ سے کرنی پڑتی ہے

(ب) تغیرات (mutations) اگر آپ ایک جنگلی پودے سے بیج لیکر انکو بونا شروع کریں تو اس میں بہت سی اقسام پیدا ہو جاتی ہیں ۔ تمام اقسام گوبھی یا گلاب جنگلی خودرو پودوں سے حاصل کی گئی ہیں ۔ جانوروں میں کتے کی طرف دیکھیے کہ انکی اقسام بےشمار ہیں ۔ بعض اتنے چھوٹے کہ آپ کی جیب میں سما جائیں اور ایک اتنے بڑے کہ تنہا بھیڑیے کو مار ڈالیں ۔ یہ سب اقسام جنگلی کتے کی نسل میں سے ہیں ۔ ایسے تغیرات جو انسان کی پسند کی وجہ سے پیدا ہو جائیں انتخاب صناعی (artificial selection) کے تحت میں آ جائینگے ۔ اسی ضمن میں ایک نئے نظریہ کا بیان کرنا غالباً غیر موزوں نہ ہوگا ۔ جسکا پیش کرنے والا

ذی وریز ہے۔ اسکا خیال ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے علاوہ بعض اوقات ایک عظیم الشان تغیر یکایک پیدا ہو جاتا ہے جسکو وہ تحول انفجائی (Mutation) (یا اچانک تغیر) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ نظریہ نباتات کے ایک خاص گروہ پر معدودے چند تجربات کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔ اسلیے ہم اسے زیادہ دیر تک زیر بحث رکھنا نہیں چاہتے۔ حیوانات میں ایسے عمل کی کوئی مثال نہیں دیکھی گئی۔ تحول انفجائی ابھی تک احتمال کے درجے سے آگے نہیں بڑھا۔

انتخاب طبیعی۔ طبیعت کو ایک مالی سے تشبیہ دیجا سکتی ہے۔ جس طرح ایک مالی انھیں پودوں کے بیج بوتا ہے جو اسکے حسب پسند ہوں اور اسی طرح رفتہ رفتہ نئی نئی انواع پیدا ہو جاتی ہیں، اسی طرح قدرت بھی چند تغیرات کو چن لیتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل ہو جاتے ہیں اور جن سے ایک نئی نوع کی بنا پڑتی ہے۔ آؤ ہم دیکھیں کہ یہ تغیرات کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔

ایک نوع کے افراد مختلفہ میں کشمکش حیات کا یہ اثر ہوگا کہ وہ افراد زندہ رہیں گے جو اقوی اور اصلح ہیں۔ کمزور اور غیر اصلح افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ مثلاً جو افراد دشمن سے تیز بھاگ کر یا دھوکا دیکر بچ سکتے ہیں وہ قائم رہیں گے اور رفتہ رفتہ بھاگنے کی یا دھوکا دینے کی طاقت نسلاً بعد نسلاً قائم رہیگی۔ حتیٰ کہ ایک ایسی نوع پیدا ہو جائے جو نوعِ سابقہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر شرائط ماحول بدل جائیں۔ مثلاً ایک ایسی نوع جو دوسری نوع کا شکار اور غذا تھی محذوف ہو جائے یا اُسکا کسی نئے دشمن سے واسطہ پڑے تو ان حالتوں میں وہی افراد بچ سکتے ہیں جو تغیراتِ ماحول کی تطابقت اچھی طرح کر سکیں۔ نسل بھی اپنے افراد کی قائم رہ سکے گی۔ رفتہ رفتہ یہ تغیرات ایک نئی نوع کو پیدا کرنے کے موجب ہونگے۔

بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا دوسرا پہلو (Elimination of the unfittest) حذف غیر اصلح ہے۔ اسکا نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نوع کے افراد میں صحت اور تندرستی کا ایک خاص معیار قائم رہتا ہے۔ جو اس معیار سے گر جاتے ہیں وہ تباہی کا راستہ دیکھتے ہیں اور جو اس سے بلند ہوتے ہیں وہ قائم رہتے ہیں۔ بعض اوقات انتخاب طبیعی کا اثر ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسوقت کمزور اور قوی ہر طرح کے افراد زندہ اور ایک دوسرے سے تناسل ہوتے رہتے ہیں اور اس طریق میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ انتخاب طبیعی کے اس طرح بے اثر ہو جانے کا نام توقف انتخاب (Cessation of selection) ہے۔ اسکا اثر اجسام ذی حیات کی نسبت اعضاؤں پر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک جانور کے

ماحول کی کیفیات بدل جائیں اور اُسکا ایک عضو اُس حالت میں کارآمد نہ ہو تو توقف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ افراد جنکا یہ عضو کافی طور پر نہیں بڑھا حذف نہ ہوگا۔ یہ حالت نسلاً بعد نسلاً ترقی کرتی جائے گی حتی کہ وہ عضو بہت ہی چھوٹا یا بالکل مفقود ہو جائیگا۔ اس طرح گویا قدرت میں ایک طرح کا انقلاب انتخاب (Reversal of selection) بھی ہوتا رہتا ہے۔

جو تغیرات ڈارون کے پیش نظر ہیں وہ نہایت بحقیقت اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ انسے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان افراد کو جن میں وہ موجود ہوں دوسرے افراد پر کشمکش حیات میں کامیابی دلاتے ہیں۔ اگر غیر اصلح افراد نہ مریں تو وہ اصلح افراد سے تناسل ہونگے اور اس سے بچے پیدا ہونگے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی نئی نوع پیدا نہ ہوگی۔ ہاں اگر ایسے عوامل پیدا ہو جائیں جن سے غیر اصلح اور اصلح افراد میں انقطاع ہو جائے تو ممکن ہے کہ ایک نئی نوع پیدا ہو۔ مثلاً وہ افراد جو نئے ماحول سے پوری تطابقت کر چکے ہیں دوسرے افراد سے بذریعہ ایک ناقابل گذر سد جدا ہو جائیں تو ممکن ہے کہ نوع سابقہ کے طبع ہونے کے بغیر نئی نوع پیدا ہو جائے۔ یا مثلاً تغیرات اس قسم کے ہوں جن سے آپس میں مواصلت ناممکن ہو جائے تو اس حالت میں بھی نوع قدیمہ کو بغیر کسی تغیر کے قیام ہو سکتا ہے۔ اسے ہم انقطاع جنسی کہیں گے۔ ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے بعض حصوں میں ایسے مشاہدات کیے جا چکے ہیں جن سے یہ اخذ ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد کا انقطاع جن میں چند چھوٹے چھوٹے تغیرات پیدا ہو چکے ہیں نئی انواع پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ بعض مصنفوں کا خیال ہے کہ ارتقا اسی عمل کا نتیجہ ہے اور اس میں انتخاب طبعی کو ذرا بھی دخل نہیں۔

غرضکہ انقطاع دو طرح پر ممکن ہے ایک تو جب منشعب انواع میں کوئی سد طبعی یا رکاوٹ حائل ہو۔ دوسرے جب خاص تغیرات کی وجہ سے وہ آپس میں تناسل نہ ہو سکیں۔ یہ دونوں امور مسئلۂ ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہنے کے ہرگز مجاز نہیں کہ ارتقائے حیات ان ہی تغیرات کا نتیجہ ہے۔ انتخاب طبعی کا ایک خاص پہلو انتخاب جنسی (Sexual selection) ہے۔ اسکے ذریعہ سے ان ثانوی تغیرات کو سمجھایا جا سکتا ہے جو ایک ہی نوع کے نر و مادہ میں پائے جاتے ہیں۔ نر کا ایک فعل یہ بھی ہے کہ وہ اپنی نسل قائم رکھنے کے لیے مادہ سے مواصلت کرے۔ مادہ کا فعل بچوں کی حفاظت اور اُنکے لیے غذا وغیرہ مہیا کرنا ہے۔ جنسی خصوصیات علم التشریح اور علم النفس دونوں سے تعلق رکھتی ہیں اور مختلف جنسوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض انواع کے نروں میں ہمیشہ مقابلہ ہوا رہتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں حفاظتی اعضا مثلاً سینگ وغیرہ

پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر حیوانات میں نر اپنی مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے جسکی وجہ سے وہ اسے آسانی سے لبھا لیتا ہے۔ پرندوں اور بہت سے کیڑوں میں تفرقات جنسی بلحاظ رنگوں کے بہت ہی عیاں ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اکثر نر پرندوں (مثلاً مور، مرغ) کے سر پر کلغی یا تاج ہوتا ہے۔ مادہ پرندوں کے رنگ عام طور پر مدھم ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنے گھونسلوں میں بیٹھی ہوئی ہوں تو دشمن کی نظر سے بچ جاویں۔ ان مادہ پرندوں کے گھونسلے جنکے رنگ شوخ ہوتے ہیں یا تو اوپر سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں یا وہ زمین میں سوراخ کرکے رہتے ہیں۔ نروں میں شوخ رنگ یا اور ایسی ہی خصوصیات کا پایا جانا جس سے وہ زیادہ خوبصورت معلوم ہوں انتخاب جنسی ہی کا نتیجہ ہے۔ اور انتخاب جنسی انتخاب طبعی کا ایک حصہ ہے۔ تغیرات پیدا کرنے میں مادہ کا انتخاب بھی ایک عامل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو نر اسے زیادہ خوبصورت معلوم ہوگا وہ اُسی کو پسند کریگی لیکن اس امر کی تائید کرنے والے واقعات بہت کم ہیں۔ موجودہ زمانے میں انتخاب طبعی ثانوی جنسی خصوصیات کی توضیح کرنے میں زیادہ صحیح نہیں مانا جاتا۔

انتخاب طبعی کے ان تمام پہلوؤں کے علاوہ ارتقاء کے چند اور اسباب بھی بڑے مؤید ہیں۔ آپ نے اکثر جانوروں کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے گرد و نواح کی چیزوں سے بیحد شباہت رکھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ انھیں پہچان بھی نہیں سکتے صرف آپ ہی نہیں بلکہ انکے اور دشمن بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس طرح انکی جان بچ جاتی ہے۔ گویا قدرت نے یہ تغیر ان میں صرف انکی جان بچانے کو پیدا کر دیا ہے۔ بعض کیڑوں کے جسم سے ایک عجیب ناگوار بو نکلتی ہے جسکی وجہ سے وہ شکار ہو جانے سے بچ رہتے ہیں لیکن اکثر قبل اسکے کہ انکی بو محسوس ہو وہ مار ڈالے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی انکے بچانے والے ہی رنگ ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات جانور دوسرے جانوروں کی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں جس سے انکی جان خطرہ سے محفوظ رہتی ہے۔ مثلاً ایک تیتری جسکے جسم میں سے کوئی ایسی ناگوار بو نہیں نکلتی جو اسکی حفاظت کا باعث ہو، ایک بودار کیڑے کی ہیئت اختیار کر لے تو یقیناً وہ دشمنوں کے حملے سے محفوظ رہے گی۔ حیوانات میں اس قسم کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں جو ہم نے ابھی اوپر بیان کیں تغیرات پیدا کرنے میں بہت بڑا اثر رکھتی ہیں۔

توارث (Inheritance) انواع نسلاً بعد نسلاً اپنی خصوصیات کو قائم رکھتی ہیں۔ اعلیٰ درجات کے حیوانات میں یہ صرف خلیۂ جنسی کے ذریعہ عمل پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ صرف ان ہی خلایا میں نسل

پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے - لیکن ادنیٰ درجہ کے اجسام عضوی میں یہ قابلیت بہت سے حصوں کو حاصل ہوتی ہے اسی طرح پودوں کے اعلیٰ اقسام میں بھی - جرمانی مادّہ کُل جسم میں پھیلا ہوا ہوتا ہے - اگر آپ ایک پودے کی ٹہنی کے چند حصے کر دیں تو ہر ایک حصہ ایک سالم درخت کی صورت اختیار کر کے اعضاے جنسی یعنی پھول پیدا کر سکتا ہے - بعض حیوانات مثلاً ہائیڈرا (Hydra) میں بھی اسی طرح کی صلاحیت موجود ہے - یہ ایک چھوٹا سا جسم عضوی ہے جو پانی میں رہتا ہے - اسکے کسی حصۂ جسم سے ایک شگوفہ سا پھوٹ کر ایک پورا جانور بن سکتا اور اکثر بن جاتا ہے جس سے خلائیہ جنسی پیدا ہو سکتے ہیں -

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ المانی یا جرمانی مادہ جس سے نسل اور اُسکی خصوصیات قائم رہتی ہیں بدن کے کس حصہ میں ہوتا ہے ؟ مظاہر تجدید (Regeneration) اس معمے کو حل کرنے میں ایک حد تک ہمارے معین ہو سکتے ہیں - اگر ایک کیچوے کا جسم کٹ جائے تو کٹا ہوا حصہ چند دن بعد نیا پیدا ہو جاتا ہے - اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس جانور کے بعض خلایا میں قوتِ تناسل موجود ہے - اسلیے ضرور ہے کہ ان میں جرمانی مادّہ بھی ہو - دودھ پلانے والے اور اسی گروہ کے اور جانوروں میں مظہرِ تجدید کبھی دیکھنے میں نہیں آیا - اگر ان میں سے کسی کی دُم یا کان کٹ جائے تو وہ دوبارہ پیدا نہیں ہوتی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں خلائیہ تناسل خاص اعضاؤں میں محدود ہیں -

غرضکہ خلایہ تناسل خصوصیاتِ نوع کو نسلاً بعد نسلاً جاری رکھنے میں معین و مددگار ہیں - خلایہ تناسل کی اسی صفت کا نام توارثت ہے - یہ سمجھنا غلط ہے کہ توارثت کے ذریعہ سے ایک نسل کی تمام خصوصیات نسل مابعد میں مطلق راسخ ہو جاتی ہیں - بخلاف اسکے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا تغیرات ہمیشہ عمل پذیر ہوتے رہتے ہیں - ان تغیرات میں سے کچھ تو ماحول کے اثر اور کچھ اعضاؤں کے استعمال اور عدم استعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں - ان تغیرات کا جنھیں ہم آیندہ تغیراتِ غیر حقیقی کے نام سے پکاریں گے کافی ثبوت ہم پہونچ چکا ہے - ایک دوسری قسم کے تغیرات وہ ہیں جو خلیۂ بیضیہ و خلیۂ منویہ کے وصل کے بعد خلایہ تناسل میں پیدا ہو جاتے ہیں - گویا وہ اسی وصل کا نتیجہ ہوتے ہیں - ان تغیرات کو ہم تغیراتِ حقیقی کہیں گے - تغیرات غیر حقیقی ہمیشہ اسبابِ ظاہری سے ظہور میں آتے ہیں - یہ اسباب بہت ہی مختلف ہوتے ہیں -

شاید آپ کے دل میں سوال پیدا ہو کہ تغیرات غیر حقیقی قابلِ ترسیل ہیں یا نہیں - بسمارک کا جواب ہاں میں ہے - لیکن اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو ہم انتخابِ طبعی کو ارتقا کا سبب کہنے کے مجاز

نہ رہیں گے - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارتقا انتخاب طبعی اور تغیرات حقیقی و غیر حقیقی سب کے اثر کا نتیجہ ہو -

یہ تو ضرور ہے کہ تغیر حقیقی اور غیر حقیقی میں سے کوئی ایک ضرور قابل ترسیل ہے - کیونکہ بغیر اسکے ارتقا ناممکن ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ ان میں کون ایسا ہے - جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نوع میں چند نئی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغیرات واقعی نئے ہیں یا موروثی - کیونکہ ممکن ہے کہ اس نوع کے آبا و اجداد میں یہی خصوصیات پائی جاتی ہوں - البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا نہیں تھا تو ہم مان لیں گے کہ حقیقت میں وہ نئے تغیرات ظاہری موثرات ہی کے بدلنے سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ خلایہ جرمانی میں تغیر پیدا ہونے کی وجہ سے -

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جذام اعضا قابل وراثت ہے لیکن جذام اعضا تو ایک فوری اثر کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ تغیرات جو انواع کو بدلتے ہیں بہت آہستہ آہستہ اثر کرتے ہیں - اسلیے انکا اثر زیادہ ہونا چاہیے -

حقیقی اور غیر حقیقی تغیرات میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی - کیونکہ ممکن ہے کہ جرمانی خلایا میں جو تغیرات پیدا ہوں وہ ظاہری موثرات ہی کا نتیجہ ہوں -

وہ مادہ جس سے خلایائے تناسل بنتے ہیں - بعض جانوروں اور پودوں میں کل جسم سے اسقدر گہرا تعلق رکھتا ہے کہ ظاہری موثرات سے اسکے ساتھ یہ بھی متاثر ہو جاتا ہے - اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا خلایائے جرمانی کا کوئی حصہ مخصوص کیا جا سکتا ہے جو عمل توارث کا مجاز ہو؟ کیا صرف مرکز الجوہر ہی اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے یا خلایا کے اور اجزا بھی - اس راز کو افشا کرنے کے لیے بہت سے تجربے کیے گئے ہیں - مثلاً ایک تجربہ میں ایک جانور کا ایسا خلیۂ بیضیہ جس میں مرکز الجوہر نہ تھا خلیۂ منویہ سے مثمر کیا گیا - وس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مدت کے بعد جنین پیدا ہو گیا - یہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ توارث صرف مرکز الجواہر کا ہی فعل نہیں بلکہ خلیہ کے اور حصے بھی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں -

چونکہ مثمر خلیہ بیضیہ مقررہ وقت کے بعد جانور یا پودے کی شکل اختیار کر لیتا ہے - اسلیے ضرور ہے کہ اس میں اس جسم عضوی کے ہر حصہ پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو - ڈارون صاحب کا خیال تھا کہ جسم کے مختلف حصوں کے خلایا نہایت باریک ذرات پیدا کرتے رہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح خلایائے تناسل میں گھس جاتے ہیں - یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ تمام اعضا کے ذرات ہر ایک خلیہ تناسل میں جمع نہ ہو جائیں - جب نشو و نما شروع ہوتا ہے تو ہر ایک ذرہ اسی عضو کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے

وہ پیدا ہوا تھا۔

اگر یہ خیال درست ہو تو ہر خلیۂ بیضیہ میں نہ صرف ان ہی ذرات کا پایا جانا لازم آتا ہے بلکہ ایسے ذرات کی موجودگی بھی ضروری ہے جن میں سے بعض تو جنین کا ہر دور ظاہر کرسکیں اور بعض آباواجداد کی خصوصیات لیے ہوئے ہوں۔ کیونکہ بعض اوقات آبائی خصوصیات کا انقلاب بھی دکھایا گیا ہے۔

ڈارون صاحب اس سوال کا جواب نہیں دے سکے کہ یہ ذرات جو کیمیائی ذرات سے کئی گنا بڑے ہوتے ہیں اس بقدار عظیم میں ایک اعد خلیۂ بیضیہ میں کس طرح سما جاتے ہیں۔

اس مختصر سی بحث کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ گو مسئلہ ارتقا بطور ایک حقیقت کے صحیح مانا جاچکا ہے حیاتیین کو اسکے جزوں کی بابت بہت سے تشکوک ہیں جو ابھی تک رفع نہیں ہوے۔ مثلاً دو بڑے سوال آج کل درپیش ہیں جنکو ہمنے مختصراً اوپر بیان کیا۔ (الف) تغیرات نوع کی بنا اور حقیقت کیا ہے؟ (ب) وہ کون سے عوامل ہیں جو انواع میں فرق ڈال سکتے ہیں اور انکو نیست یا ہست کرنیکے مجاز ہیں؟

اب ہم مضمون کے آخری حصہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اس مسئلہ کا علم حیوانات و نباتات پر کیا اثر ہوا۔

نظائر واقعات و مشاہدات کو تفصیل کے ساتھ سمجھانے کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ انکے بغیر کسی علم کا ہماری سمجھ میں آنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ کسی نظریہ کی قدر و قیمت مختلف مظاہر کو جو ظاہراً بکھرے ہوے ہوں مرتب کرکے ایک مناسب رائے کے تحت میں لانے پر منحصر ہے۔ ایسے عامل اصول کا اطلاق جتنا وسیع ہوگا اسی قدر وہ زیادہ صحیح مانا جائے گا۔ اسی بنا پر مسئلۂ ارتقا انسانی عمل کا ایک جوہری دعوی بلا ثبوت سمجھا جائے گا۔ کسی نظریہ کے صحیح ہونے کی یہی بڑی کسوٹی ہے کہ وہ واقعات و مشاہدات معلومہ کے مخالف نہ ہو بلکہ عین مطابق ہو۔ اور انکو پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا سکے۔ اس مسئلہ کی صحت بھی اسی پر منحصر ہے۔ جتنے واقعات آجتک معلوم ہوے ہیں انکے سمجھانے میں یہ ہمارا معین و مددگار رہا ہے۔ پرانا نظریۂ تخلیق ان میں سے بہت سے واقعات کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کرسکتا۔ مسئلہ ارتقا نے حیاتیات میں ایک نئی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ اگر اسے حیاتیات کا بانی کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے کوئی باقاعدہ علم حیوانات و نباتات نہ تھا۔ زمانۂ سابقہ کے عالم حیوانات و نباتات کو بغیر کسی خاص مقصد کے مطالعہ کرتے تھے۔ اب حیاتیین کا ایک مدعا قائم ہوچکا ہے اور وہ برابر اسکی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

مسئلہ ارتقا نے زندگی کو ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ زندگی کے تمام مظاہر ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں اور ہماری حد نظر کو کمال وسعت بخشی ہے۔ اسنے ہمارے دل میں نئی نئی امنگیں اور امیدیں پیدا کر دی ہیں اور نئے نئے ممکنات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔

تصویر نمبر



ویل

مسئلہ ارتقا اس موجودہ تنظیم کا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اور جس پر حیاتیئین آج فخر کر رہے ہیں وجود بخشا ہے۔

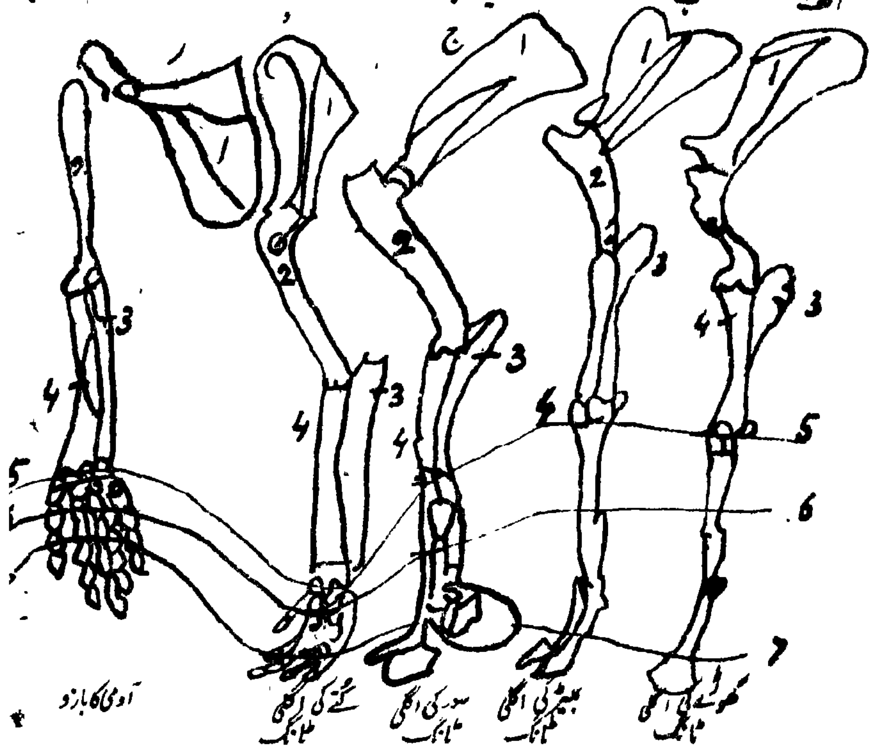
جدید تحقیقات و انکشافات جو آجکل حیاتیئین کر رہے ہیں وہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا آج اس تمام علم سے بیگانہ رہتی جس پر موجودہ صدیاں ناز کر رہی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو علم حیوانات و نباتات کی کل عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر بنیاد نہ ہو تو عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے؟

غرضکہ یہ مسئلہ حیاتیات کے حق میں از حد مفید ثابت ہوا ہے۔ اور امید دلاتا ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

حبیب احمد (متعلم تھرڈ ایر کلاس سینٹ جانس کالج
(آگرہ)

(نوٹ) اس مضمون میں جن تصاویر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اب درج کیجاتی ہیں۔ طباعت کی آسانی کے لحاظ سے سب یکجا کر دیگئی ہیں۔

تصویر نمبر ۲



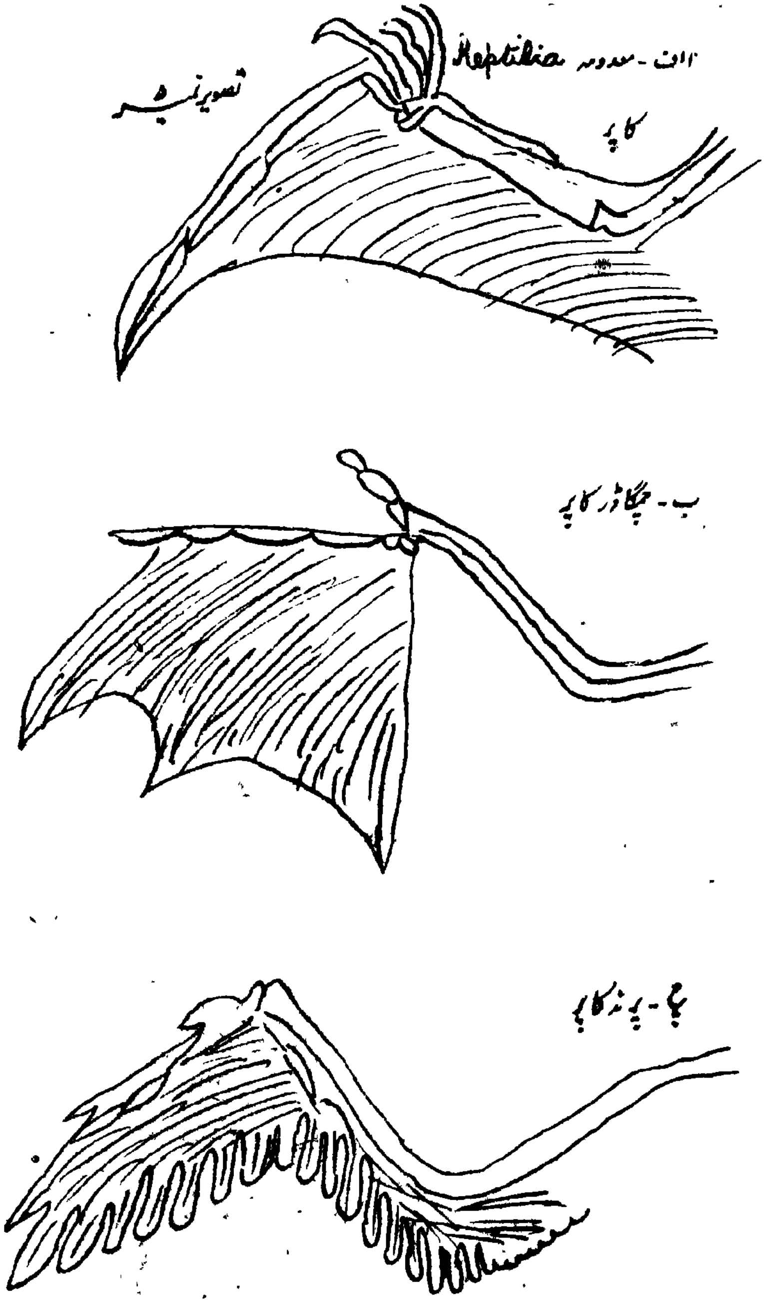
تصویر نمبر ۳

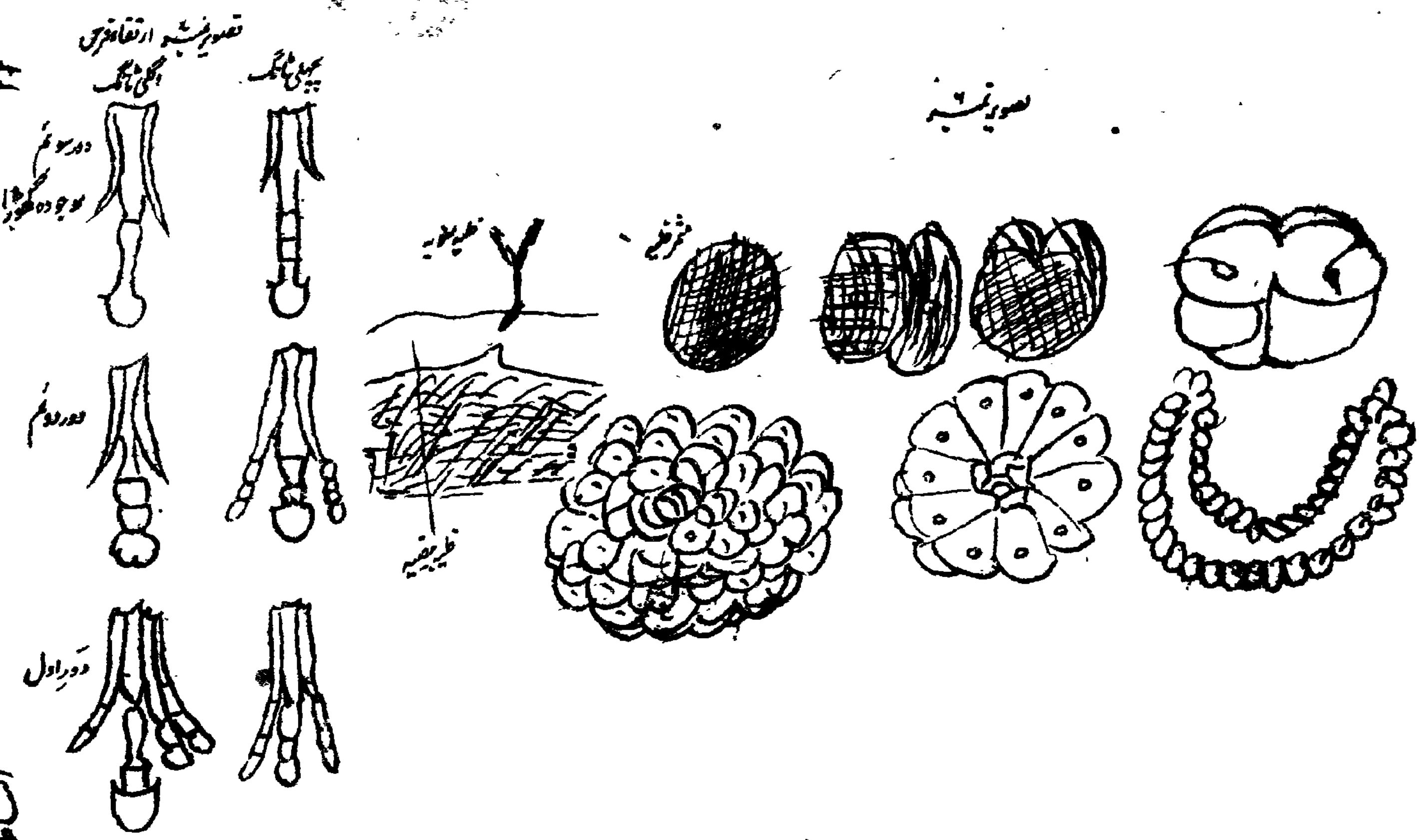


تصویر نمبر ۴



تصویر نمبر ۵




تصویر نمبر ۵ ارتقاء فرس
اگلی ٹانگ
پچھلی ٹانگ
دور سوم
موجودہ گھوڑا
دور دوم
دور اول
خلیہ نباتیہ
خلیہ حیوانیہ
تصویر نمبر ۶

فغانِ حسرت

(از مولوی بشیر احمد برہان پوری پرشین ٹیچر ہائی اسکول ٹھانہ (بمبئی)

مندرجۂ ذیل نظم تھامس گرے کی الجی (مرثیہ) کا فارسی ترجمہ ہے۔ انگریزی میں گرے کی الجی کو طبع ہوئے قریبًا دوسو برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ مگر اسکی قدر وعظمت جرعہ کشانِ صہبائے فصاحت کے دلوں میں اُسی تر وتازگی کے ساتھ موجزن ہے جس طرح اسلاف کے قلوبِ مصفا میں متمکن تھی۔ اِس کی فصاحت وبلاغت، بندش وبرجستگی، شکوہِ الفاظ اور بلند پروازی پر شاعرانِ مغربی سر دُھنتے ہیں۔ فی الواقع اس نظم میں حُسنِ تخیل اور اصولِ خدا شناسی وحق رسی کے جو جزیں پہلو تائے گئے ہیں اُنکے پڑھنے سے بیساختہ یہ مصرعہ موزوں ہو جاتا ہے۔ ع۔ ایں تازہ تر گلیست ز بستانِ ایشیا؛

دارفتگانِ عدم کی خاکِ پریشاں پر آٹھ آٹھ آنسو رونا۔ چند وعشق بیجاں کا دلآویز تذکرہ۔ شورِ ابابیل کے مسرت خیز نغمے۔ بانگِ مرغِ سحر خیز کی ترنم ریزیاں۔ بے ثباتیِ دنیا کے ثبوت میں دنیوی جاہ وثروت کو پا در ہوا تصور کرنے کا پاکیزہ تخیل۔ حسنِ بے نظیر اور گنجِ بے پایاں کو غریقِ بحرِ فانی ہونے کا اشارا۔ خفتگانِ آغوشِ زمین کو بُرا بھلا کہ کر بجلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے خیال کی تحقیر۔ یہ جملہ باتیں با وازِ دُہل زبانِ حال سے کہ رہی ہیں کہ ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

مزید براں ایشیائی شاعروں کے تتبع میں ہمارے ہیرو کی یہ حسرت ظاہر کرنا کہ "ممکن ہو کہ میرے بعد کوئی دہقانِ پیر بیرا بھی اسی طرح مرثیہ لکھے اور اپنی سحر طرازی کی نیرنگیاں دکھاتے ہوئے اپنے تخیل کی جولانی اس طرح ظاہر کرے کہ میں بارہا ایک جوانِ رعنا کو دیکھا کرتا کہ وہ علی الصباح فرطِ شوق سے گلہائے زنگار رنگ در ہری ہری گھاس کے زمردیں رخساروں پر سے قطراتِ شبنم جھاڑ دیا کرتا تھا تاکہ وہ فضائے علوتی میں پرواز کر کے اپنے جانبازِ صادق یعنی خورشیدِ جہانتاب سے جا کر ہمکنار ہو جائیں"۔ گویا اس مغربی شاہِ سخن نے اپنے دلآویز کلام میں صائب تبریزی کی روح پھونکی ہے۔ ایشیائی خیال شاعری کے تاجدار مرزا صائب اسی رنگ میں اس طرح جولانیِ طبع دکھاتے ہیں۔

اُفتادگی گزیں کہ ازیں خاکدانِ پست شبنم بہ آفتاب از یں بال و پر رسد

(بند نمبر ۲۴ - ۲۵)

اسکے بعد اس جادو نگار نیچرل شاعر (گرے) نے دہقانِ پیر کی زبان سے سچے عاشق اور پریشانیوں کا سین اس طرح کھینچا ہے -

"دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوجوان کسی کے خنجرِ تغافل کا بسمل ہے - اسکی آوارگیاں پریشانیاں اور حرماں نصیبیاں اس بات کا کافی ثبوت دے رہی تھیں کہ اسنے اپنا متاعِ صبر و شکیب کسی سفاک کے ہاتھ بے داموں بیچ ڈالا ہے - کیونکہ وہ حضرت قیس کی طرح پہروں بحرِ خیال میں مستغرق نظر آتا تھا - اور اگر کسی بہتے ہوے چشمے پر اُسکی نظر پڑتی تو اُسکی آنکھیں پانی کی برق وش متلاطم موجوں میں گر جاتیں - اگرچہ بوقت صحرانوردی کوئی خوش کن منظر اُسکے غنچۂ لب میں مسکراہٹ پیدا کر دیا کرتا تھا مگر اُسکی یہ مختصر سی مسکراہٹ بھی حسرت و حرماں کا رنگ لیے ہوے ہوتی - کبھی وہ نامرادیوں کے ہاتھوں جھلا کر یہ کہہ اُٹھتا کہ یہ نا راہِ عشق خدا جانے کبتک ایڑیاں رگڑوائیگا - کبھی وہ حصولِ وصال کی مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوے اپنے بشاش ارغوانی چہرے کو غم و اندوہ کی حقارت آمیزی سے بدل دیا کرتا - (بند نمبر ۲۶ - ۲۷)

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو گرے کی الجی کے آخری کتبے میں پاکیزگی خیالات - حُسنِ بندش - اظہارِ جبر - خیلرتِ دُرہاے اشک - حسن و قبحِ اعمال اور امید و بیم کے فیصلہ کا ذاتِ باری پر انحصار وغیرہ جملہ باتیں نہایت خوبی سے ادا کی گئی ہیں جو بادہ کشانِ بلاغت و معانی سے خراجِ تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہتیں - ہم مرحوم گرے کی بلند پروازی اور حُسنِ تخیل کی داد دیتے ہوے دبی زبان سے یہ بھی کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ ایشیائی بادۂ گلگوں مغرب کے نفیس ترین بلوریں جام میں پری بنکر جھلک رہی ہے - انشاء اللہ آئندہ پرچے میں اسکے ثبوت میں ایک مدلل مضمون پیش کش اربابِ معانی کیا جائے گا -

(منظرِ شام و نقشۂ سکوت)

شُد جرس از بہرِ فوتِ روزِ روشن نوحہ خواں (۱) رمہ ہا بن بن کناں گردند اندر مرغزار
روستائی می رود چوں ماندگاں سوے مکاں — می گزارد بہرِ تاریکی و بہرم روزگار

منظرِ پیشِ نظر پوشیدہ می گردد کنوں (۲) باد از فرطِ ادب خاموش گشت وہم زمیں

گر برآید وِژ وِژِ زنبور اسود در سکوں   یا صدائے زنگ[1] ہائے گلہ گمرا[2] نشیں

از درونِ عشق پیچاں کوست بربُجے رواں (۳) چند می آرد صدائے شکوہ پیشِ ماہِ شب
از کسے کو می کُند اورا بسختی تیم جان   یا ز کنجِ عزلتش می آورد او را غضب

(جائے مقابر و حسرت شاعر)

زیر پاسے شاخ گندہ قشرِ توتِ[3] سایہ دار (۴) قطعۂ ہست از زمیں جائے نشیب و جا فراز
کاندراں خسپند امتیانِ دہ چندیں ہزار   ہر یکے در گورِ تنگِ خویش کردہ پا دراز

خوش نوائیِ نسیمِ عطر بیزِ صبحدم (۵) نغمۂ شورِ ابابیل از درونِ سقفِ کاہ
صوتِ ناقوسِ تکارِ دمگن و بانگِ مرغ ہم   خفتگاں را کے بہوش آرند از آرامگاہ

نے بسوزد بہر آنہا آتش شعلہ فشاں (۶) نے زنِ مشغول کو سازد بعجلت نانِ شام
نے صبیّے کز عذوبت بارِ لکنت در زباں   می کُند از رشکِ زانوے پدر را تا بکام

از دمِ پاغوک[4] شاں ہم فصل و خرمن ہا خمید (۷) قلبہ کندیدے زمینِ سخت آنہا صبح و شام
در چہ خوشنودی کدیور قلبہ ہا را می کشید   زیرِ صدماتِ تبر چوں درخت ہا می گشت رام

عبرت دادن توانگران اولوالعزمان و تحقیرِ عالی گوہری و طمطراقِ مملکت

چوں اُولوالعزمی مکن تحقیرِ تصدیعِ مفید (۸) تا مقدّر با مسرت ہائے شاں پوشی ز خلق
ایں نزیبد اہلِ ثروت را کہ از نظرِ شدید   قصۂ آزادگاں خوانند کہ پوشند دلق

---

[1] زنگ چھوٹی گھنٹی کو کہتے ہیں۔ [2] گمرا بھیڑ ونکے تہانگاہ کو کہتے ہیں۔ [3] انگریزی میں یہ Yew ہے۔ مگر اسکا کوئی مترادف لفظ نہ ملنے کے باعث لفظ توت استعمال کیا گیا۔ [4] پاغوک درانتی کو کہتے ہیں۔

(۹) گنجِ بے پایانِ حسنِ بے نظیر و بے مثال ؛ فرمالی گوہری و طمطراقِ مملکت
راہ دارد در مقابر عظمتِ جاہ و جلال می شوند نذرِ فنا۔ ماند نہ در ہر شش جہت

:. ؛ :.

(۱۰) نصب ہم کردہ نہ رکنِ فتح و نصرت بہرِ شاں اے غیور الزام تو ہیچ ست گرچہ یادگار
نغمہ ہائے حمد حق خیزد و سازد شادماں از نوردن قبۂ رنگیں معبد بار بار

:. ؛ :.

(۱۱) باز نارد روح پراں را بہ چشمِ عنصری کتبہائے کوزہا ہم بہتِ خندانِ سنگ
از اجل با التجا ہرگز نخواہی شد بری مشتِ خاکِ خفتہ کے گیرد زعزت آبِ رنگ

:. ؛ :.

افسوس نمودن شاعر بر ہستی ہائے خوابندگانِ خاک

(۱۲) بودگاہے مطلعِ انوارِ یزداں قلبِ آں وہ کہ ہستیے درین ویراں سراپا شب نشیں
یا ز شعرِ نغمہ زا تسخیر کردندے جہاں دستہاکہ داشتندے مملکت زیر نگیں

:. ؛ :.

(۱۳) صفحۂ علم و ہنر از گنجِ معلوماتِ خویش وانہ کردہ گردشِ افلاک پیشِ چشمِ شاں
مفلسی روح و روانِ عاجزاں را کردہ ریش انتہائے فقر گشتہ دشمنِ طبعِ رواں

:. ؛ :.

(۱۴) غارہائے تیرہ و تاریک دارد در دریاں ہاں بسا لعل و گہر ہائے درخشاں زیرِ آب
چوں کسے گشتہ نہ در دشت و میل خواہانِ آں ہم بسا گلہائے خنداں کرد نکہت را خراب

:. ؛ :.

توقیر نمودن خفتگانِ خاک از تقابلِ شاں بہ امرا و شعرا و شجاعانِ ماضی

ممکن است اینجا کسے باشد چو رستم با کمال (۱۵) کو دلیرانہ ز مزرع دزد را کردے بروں

ملہ زمانۂ پیشیں میں اہل یونان کا دستور تھا کہ مردے کی خاکستر کو کسی کوزہ میں بھر کر اس پر متوفی کی مختصر سی تاریخ کھدا کر دفن کرتے تھے۔
ملہ کسی مردہ شخص کا ایسا مجسمہ بنا ہوا ہے کہ جیسے گویا وہ سکوت ابھی ٹوٹا چاہتی ہے۔

یا سخندانِ بلیغ و نغز گو خسرو مثال — یا کسے مثلِ بلا کو لیک پاک از کشتِ خون

مرحبا ئے حاضرینِ بارگاهِ قیصران (۱۶) یا مُبکِ دانستنِ حالِ خراب زجر و شور
یا بیانِ برکت و زر خیزیِ مزروعِ شان — شد: منظورِ جهان آرا که باشد در سطور

گر سیه بختی نکرده فعلِ نیکِ شان فزون (۱۷) هم هجومِ جُرم و عصیان را نمود از مرگ بند
کرد تحقیر آنکه تاج آید بدست از کشتِ خون — باز جورِ ظالمان باشند خلقے در گزند

دور تر بوده ز رنجِ سیرِ حق و راستی (۱۸) هم پری از تخلت شرسندگی جانستان
مغز اہلِ فخر و عشرت را نداده چاشنی — از بخورِ جانفزائے نغمهائے شاعران

عریه جوئیِ شان بوده بطورِ سادگی (۱۹) یا نبا ورد از متانت گه خیالِ شان بدون
از درونِ تنگنائے عمر از آمادگی — می نمودندے منازل قطع در فرطِ سکون

اشارهٔ شاعر که کیفیاتِ معمولی و نقش و نگار ساده نیز برائے شهرتِ آنها کافیست

تا نباشد در جهان تحقیرِ مشتِ استخوان (۲۰) ساده تر کتباتِ الواحِ قبورِ آن تباه
با نگار و نقشِ معمولی و شعرِ پا تال — می شناسند از درونِ قلبِ زائر باج آه

واقعاتِ شان ز جاہل شاعران این بیا (۲۱) در مقامِ مرثیه یا شهرتِ نام است بس
بست بر هر گور از آیاتِ قرآنی ہبا — زان سبق دهقان بگیرد نیست دائم این نفس"

ذکرِ مرگ چند از آزادان به حسرتِ اندوه بحالتِ وقتِ مرگ آنها
آن که گفته غالب اندوه گین را خیر باد (۲۲) اندرین دهرِ کهن گشته نشانها

بود ہنگام مساکورفت زیں جا شاد شاد   فارغ از حرمان و حسرت گشت و خمش شد ندا

———: ۞ :———

جاں بحق شد و لے در آغوشِ محبوبے جواں (۲۳) کو فشاندے اشکہاے پاک از چشمانِ تر
از درونِ قبر شد آواز قدرت نوحہ خواں   در دلِ ما نیز یادش ہست با یادِ دگر

———: ۞ :———

اے کہ تو حالاتِ دہقانانِ نارسیدہ حال (۲۴) می سپاری خامہ را باشد کہ روزے بہرِ تو
نغز گوئے تازہ دم در عزلتش کردہ خیال   دردِ خشکِ حال و قالت را بجنبد زنگ دو

———: ۞ :———

اشارۂ شاعر کہ بعد مرگ او نیز کسے مرثیۂ او نویسد و در آں اظہار ضطرابش نماید

بست ممکن آ پس مرگم کسے دہقانِ پیر (۲۵) ایں بگوید "وقتِ گرگ[۹] و میش دیدم چند بار
از گیا و سبزِ شبنم را فشاندے آں دبیر[۷]   تا بپرد سوے خورشید و بگردد ہمکنار

———: ۞ :———

در بس آں سروِ شہر[۸]منبان و آزاد و بلند (۲۶) می شدے سایہ فگن ہنگام ہاچی[۱۰] او مدام
با خیالاتِ عمیقش را فگندے چوں سمند   بر بہارِ رود کی کو رفت غلطاں صبح و شام

———: ۞ :———

گہ قریبِ یک بیاباں محو خندہ در غضب (۲۷) می چمیدے ہمچو مجنوں غرق در تخئیلِ خویش
گہ چو مہجوران گشتے زرد از رنج و تعب   گہ ز عشقش نا امید و گہ ز دستِ فکرِ ریش

———: ۞ :———

بر سرِ کوہے کہ بودہ شائقش یک بامداد (۲۸) در نظر نامد نہ بر میدان نزدیک شجر
نے کنارِ چشمہ کز آب آں می گشت شاد   نے بہ کہسارانِ ہاموں نے بہ سبزہ زارِ تر

۷ دبیر سے مراد خود شاعر ہے۔ ۸ انگریزی میں (Beech tree) ہے مگر فارسی میں اسکا مترادف لفظ نہ ملنے کے باعث سرو استعمال کیا ہے۔ ۹ وقتِ گرگ و میش تاروں کی چھاؤں کو کہتے ہیں جو صبح کاذب و صبح صادق کے درمیان کا وقت ہے۔ ۱۰ وقت دوپہر کو ہاچی کہتے ہیں۔

روز دیگر دیدمش با نالہاے ماتمی (۲۹) سوے گورستاں برندش سالکاں اندوہگیں
بعد ساعت چوں رسیدم تا بپایانش آگہی بود بر سنگے نوشتہ زیرِ نخلے اینچنیں:-

کتبہ

محوِ خواب اینجا یکے بزناست در آغوشِ گور (۳۰) کو نشد از جاہ و ثروت بہرہ ور اندر جہاں
پیکر علم و ہنر گشتہ نہ از رویش نفور سینہ اش آماجگاہِ رنج بودہ ہر زماں

فیض گستر۔ پاک باطن۔ راحم و مخلص چناں (۳۱) بود ایں مردِ خدا کو دادہ از بہرِ کریم
قطرہ قطرہ تنگدستاں را زچشمِ دُر فشاں در تلافی مرحمت کردش خدا قلبِ سلیم

نیست اکنوں حاجتِ اظہارِ اعمالِ حسن (۳۲) ہم چو ایں از درونِ گور نتواں کرد کم
زاں کہ گشتہ در امید و بیم ہردو تکیہ زن بر عطاے عفوِ رحمٰن۔ بر رسولِ محترم"

بندۂ ساقی رہے ممنونِ پیمانہ رہے
ہم رہے جب تک بلا گردانِ میخانہ رہے

سجدہ رقصاں ہی رہا اپنی جبینِ شوق پہ
ہم ہلاکِ شانِ استغنائے تنہا نہ رہے

حسن عالم سوز جب ہوتا ہے مشتاقِ نمود
شمعِ بے پروا کو کیا پروا ہے پروانہ رہے

ہاں اسی ترکیب سے لوٹو گے اک عالم کے دل
چال البیلی رہے انداز مستانہ رہے

ہم نے تو کچھ بھی نہ دیکھا، چشمِ حیراں کی قسم
اور یوں کہنے کو محوِ حسنِ جانانہ رہے

آپ جب محفل میں ہیں تو شمع کیوں لائیں یہاں
ہم جہاں موجود ہوں کیوں کوئی پروانہ رہے

عقل دیتی ہے دعا آمین کہتا ہے جنوں
دل قیامت تک تری زلفوں کا دیوانہ رہے

کر نہ دے گستاخ تیرا غمزۂ دشمن نواز!
آشنا کب تک تری محفل میں بیگانہ رہے

دے مرے ساقی مری پیمانہ پیمائی کی داد
تو تو بھرتا جائے پر خالی ہی پیمانہ رہے!

اے دلِ محزوں شبِ غم گا ہے تجھکو ماننا
دیکھ۔ سودائے سوادِ زلفِ جانانہ رہے

ہو تڑپ اس طرح کی جیسے ہو سکتہ کا گماں
ہاں دلِ بیتاب طرز اپنی جداگانہ رہے

عمر بھیر تو نہیں گزری خدا کا شکر ہے
مینیِ وحشت ہم گدائے کوئے جانانہ رہے

راج دلاری اور مراری دادا

(نمبر ۲)

اب مجھے دوسرے ناٹک پر مختصر سی تنقید لکھکے، دونوں کتابوں کے متعلق چند باتیں عرض کر کے مضمون کو ختم کرنا ہے۔ مراری دادا ناٹک کا مقصد دیباچہ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو تعلیم کس درجہ تک دی جائے۔ تین ایکٹ کا ایک باقاعدہ سا ڈراما ہے۔ پہلے ایکٹ میں سوشلا مدرسہ سے اپنا انعام کا ڈھیر لاتی ہے اور اپنے والدین سے کہتی ہے کہ آج شام کو حضور میسرلے کے ہاں ہماری چاء کی دعوت ہے۔ اتنے میں گردھاری سوشلا کا بھائی آتا ہے اور کچھ تعلیم کے متعلق مختصر سی گفتگو ہوتی ہے۔ مراری آتا ہے اور وہ اس انداز تعلیم پر معترض ہوتا ہے۔ دوسرے ایکٹ میں سوشلا اور اسکی ہمجولیوں کی چہل دکھائی جاتی ہے کہ وہ انگریزی طرز کی کس قدر دلدادہ ہیں۔ سوشلا کا باپ بہاری اور بہاری کا دوست ابراہیم مراری سے بحث کرتے ہیں کیونکہ ابراہیم کی لڑکی زہرہ اور لڑکا اسمعیل بھی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دونوں مراری کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تیسرے ایکٹ میں دکھایا جاتا ہے کہ سوشلا گردھاری اور اسمعیل تکمیلِ تعلیم کی غرض سے ولایت جانے کا نام لیتے ہیں اور دونوں کے باپوں کے پانوں کے نیچے سے زمین نکل جاتی ہے۔ سوشلا کنواری رہنا چاہتی ہے اور اسمعیل اپنی خالہ کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ صدمہ بہاری اور ابراہیم کو تارک الدنیا ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا ناٹک ہے۔ اسکے متعلق کسی بڑی تقریظ کی ضرورت نہیں ہے البتہ اتنی گذارش ہے گو غایتِ قصہ ایک عمدہ مضمون تھا لیکن اسکو نباہا نہیں گیا۔ مراری اور بہاری میں تعلیم نسواں پر جو بحث ہوتی ہے تشفی آمیز نہیں۔ مراری مخالف ہے اسکی بحث کا پہلو زبردست ہے۔ بہاری گو وکیل ہائیکورٹ اور بعد میں جج ہو جاتا ہے لیکن وہ بحث میں دبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ حریف کے مقابلہ میں بالکل کمزور نظر آتا ہے اور بار بار لاجواب ہو ہو کے کھسیا جاتا ہے اور آخر تاب نہ لاکے نوکرم بھاگتا ہے اور پہلا ایکٹ تمام ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے مباحثوں میں مصنف کو دونوں پہلو مضبوطی سے دکھانے چاہئیں۔ مصنف کا جو مدعا ہے مراری اسکو ظاہر کرتا ہے اسی لیے اسکو بحث میں صریح غلبہ حاصل ہے۔ گو وہ مخالف کے دلائل یا تو دیدہ و دانستہ مصنف نے نظر انداز کر دیئے جسکا گمان نہیں ہو سکتا یا انکو ان دلائل کا خیال ہی نہیں آیا۔ صرف اپنے ہی خیالات کا نقشہ

نظروں کے سامنے رہا۔ ایسے یکطرفہ مکالمہ سے فریق مخالف کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ پنڈت کیفی صاحب نے اپنی دونوں کتابوں میں اس نقص کو قائم رکھا ہے۔ امید ہے آئندہ وہ اس امر کا خیال رکھینگے۔

اس کتاب کے کیرکٹر چونکہ بالاجمال دکھائے گئے ہیں اسلیے اُنکے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کیجا سکتی۔ مراری کا پارٹ ضرور قابل تعریف ہے۔ لیکن اس شخص کے نام سے کتاب کو موسوم کرنا ذرا بے تکا ہے۔ الفاظ مراری دادا سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراری دادا اس ناٹک میں کوئی ایسی شخصیت ہے جو مذاق اور تمسخر کا سراپا ہوگی۔ قصہ کا مطلب و مقصد اسکا طلبگار تھا کہ یہ نام اس کتاب کا نہ رکھا جاتا۔ کتابوں کے نام عموماً اُسکے مضامین و مقاصد کے لحاظ سے رکھے جاتے ہیں لیکن فی الحال یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مراری دادا نام رکھنے میں فاضل مصنف صاحب کا کیا منشا ہے؟

اختلافات اس مختصر سی کتاب میں بھی موجود ہیں۔ دوسرے ہی صفحہ پر صاف نظر آتا ہے۔ آنریبل رائے بہادر بہاری لال اخبار پڑھ رہے ہیں کہ اتنے میں اسکول سے انکی لڑکی انعامات کی پوٹ باندھے آتی ہے۔ باپ کو انعام ملنے کی خوشی میں سلام تک نہیں کرتی اور جب یاں آتی ہے تو اُسکے سامنے اپنے فرط مسرت کا اظہار کرتی ہوئی اُسے بھی سلام نہیں کرتی۔ بہاری اپنی بیٹی سے کہتا ہے "آؤ بیٹا۔ بڑی دیر لگی انعام میں۔ میں اس جلسہ کا حال ہی اخبار میں پڑھ رہا تھا" یعنی اُدھر تو انعامات تقسیم ہو رہے تھے اور اِدھر جو اخبار بہاری لال پڑھ رہا تھا گویا ایک جام جہاں نما تھا کہ وہاں کے کل واقعات بہاری کی نظروں کے سامنے ہو گئے۔ ابھی جلسہ ہو رہا ہے اسکے حالات پریس میں قبل از وقت کیسے پہونچ گئے؟ اسی طرح سوبھدرا جو بہاری لال کی بیوی ہے کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی بخوبی جانتی ہے اور اڈمی، ٹوٹل ٹوٹل ٹل ہٹا رکھتی نظر آتی ہے اور کہیں اتنی ناواقف ہے کہ اپنی بچی کی انعامی کتابوں کے نام خود نہیں پڑھ سکتی اور اپنے شوہر سے پڑھواتی ہے اور اُس سے اُنکے متعلق سوالات کرتی ہے۔ بہاری لال گو بہت تعلیمیافتہ ہے لیکن اُسکے منہ سے بھی پوئٹری (پوئٹری۔ نظم) جیسا لفظ بار بار نکلتا ہے جو یقیناً انگریزی خواندہ ہرگز نہیں بولتے۔ میاں بی بی کا لطف محبت تعریف انگیز ہے لیکن ناز و کرشمہ کی حالت میں سوبھدرا نے جو مذاق اپنے شوہر سے کیا ہے لائق تحسین نہیں۔ فرے میں آکے وہ اپنے شوہر کے سر پر کرسی یا کوچ کا گدا رکھدیتی ہے اور بہاری کو سر ہلانے کے بجائے ناگہانی اپنے سر سے ٹالنی پڑتی ہے۔ یہ مذاق کریہہ اور بھدا ہے۔ اگر میرے پنجابی دوست برا نہ مانیں تو میں بیاختہ کہونگا کہ یہ مذاق بالکل پنجابی ہے اور یہ اثر ہاشے پنڈت صاحب پر اسلیے پڑا ہے کہ وہ بچپن سے پنجاب میں ہی رہے ہیں۔

مکالمہ میں جو نقص راج دُلاری میں نظر آتا ہے وہی مراری دادا میں بھی موجود ہے۔ زہرہ۔ سوشلا اور اُسکی سہیلیوں میں جو پُر مذاق گفتگو ہوتی ہے اُس میں نہایت لاپروائی سے کام لیا گیا ہے۔ فسانۂ آزاد کی طرح وہ مضحک حکایات سناتی ہیں۔ اور ایک کی گفتگو دوسرے سے اسی طرح خلط ملط ہو جاتی ہے جس طرح سرشار کی کتابوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہے۔ زہرہ ایک لطیفہ سنا رہی ہے اور سوشلا بالکل ناواقف ہے۔ لیکن ابھی زہرہ اپنے قصہ کو ختم نہیں کر چکی کہ سوشلا اُسے لے دوڑی اور گو زہرہ ذکر آفتاب بیگ کا کر رہی تھی سوشلا نے اُسے ہندوں سے مخلوط کر کے اس قصہ کو تمام کیا۔ میری رائے میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ ایک شخص ایک بات کو خود سنا رہا ہے اور دوسرے ناواقف ہیں۔ وہی بات جھٹ دوسرے سے کہلوانا شروع کر دی۔ مطلب یہ کہ سب حاضر الوقت گفتگو میں شریک ہیں اور کوئی عضو معطل نہ نظر آئے۔ لیکن یہ کوشش بجائے اصلاح و خوبی پیدا کرنے کے بڑا سقم پیدا کرتی ہے۔

موضوع قصہ سے مجھے اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کا منشا یہ ہے کہ بچوں کو مغربی تعلیم بے سوچے سمجھے نہیں دینی چاہیے اور تعلیم صرف اسی قدر ہونی چاہیے جو ضروری ہے۔ لیکن ہر دو کتب پڑھنے کے بعد آدمی کو رہ جاتا ہے کہ کیا پڑھا ہے۔ مصنف کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے موثر پیرایہ اور نتیجہ خیز پلاٹ بنانا چاہیے۔ مراری دادا سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوشلا چونکہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنا اور مجرد رہنا چاہتی ہے اور گردھاری اور اسمعیل ولایت جا کے تکمیل تعلیم کرنا چاہتے ہیں اسلیے والدین جو باوجودیکہ روشن خیال اور نہایت تعلیم یافتہ تھے ناراض و ناخوش ہوے اور اسقدر ملول و محزون ہوے کہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن یہ بالکل خلاف قیاس اور بعید از عقل ہے۔ تجرد اور شوق تعلیم کچھ گناہ نہیں جس سے تعلیم کی مؤیّد پارٹی کو اشتباہ ہو۔ اور یہ بالکل متضاد فعل ہے کہ جنھوں نے نہایت فراخ حوصلگی اور آزاد منشی سے انگریزی مدرسوں میں بھیج کے اپنے بچوں کو تعلیم دی ہو وہ صرف اتنی ذرا سی بات پر دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اگر کوئی سبق آموز نتیجہ سوشلا اور گردھاری و اسمٰعیل کے رویہ سے نکالا جاتا تو ضرور دوسروں کو عبرت ہوتی کیا جناب ٹیگنی کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کو تعلیم ہی نہ دی جائے کیونکہ وہ اپنے والدین کی بعض خواہشوں کو تسلیم نہیں کرتے اور اُنکا پرستش نما ادب نہیں کرتے جیسا کہ کیٹ ؟ کے مطالعہ سے ظاہر ہے اور اس آزاد منشی کے عملی ثبوت میں وہ مغربی تعلیم سے ہی بیزار ہو گئے ہیں، جو مراری دادا کے صفحہ آخر پر اشتہار کی شکل میں ہے کہ اُنکے فرزند رشید نے راج دُلاری کی توصیف کرتے ہوے اپنے پدر بزرگوار کا نام معمولی تعلیم و ادب کے الفاظ کر

معرّیٰ رکھکے صرف برجموہن وتاتریہ صاحب کیفیؔ دہلوی تحریر کردیا ہے تو یہ قصور تربیت کا ہے۔ مرادی دادا کا پلاٹ بالکل غیر مکمل اور غیر موثر ہے۔ خود ہماری گنگوتری کو ہجرت کرتے ہوے مرآری سے کہا جاتا ہے کہ تسوشیلا اور گردھاری کے بابت جو جو کچھ دیکھو یا سنو سب ڈائری کے طور پر لکھتے جانا۔ اگر میں کبھی واپس آیا تو اسے ضرور دیکھوں گا"۔ بہرحال جو کچھ بھی اس ناٹک میں لکھا گیا ہے نفس مضمون ایسا نہیں ہے کہ تسوشیلا اور اُسکے ساتھیوں پہ اظہار نفرت کیا جائے۔ البتہ تربیت کے متعلق ہدایت لاجی ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ آجکل انتہائی تعلیمیافتہ ہی مذہب کے بڑے حامی و پابند اور ملک کے بہی خواہ ہیں۔ تمثیلات غیر ضروری ہیں۔ ہر شخص بجاے خود غور کرسکتا ہے ایک جاہل بھی کندۂ ناتراش ہے اگر اُسے تربیت ہی نہ دی جائے۔ اور فقدان تربیت کے ذمہ دار خود والدین ہیں۔ سوشیلا، گردھاری اور اہلیل کا کیا قصور؟ لیکن فقدانِ تربیت کے نتائج پیشِ ناظرین کرنا مصنف کا منتہاے خیال نہیں ہے۔ اسلیے یہ بات بھی میرے قلم سے از خود نکل گئی۔

باوجود اختصار و ایجاز مدنظر رکھنے کے مضمون کسی قدر طویل ہوگیا ہے۔ اسلیے میں زبان و دیگر امور کے متعلق مختصراً عرض کرکے مضمون ختم کردونگا۔ فرداً فرداً ہر دو کتاب پر رائے ظاہر کرنے کے بعد اب بالاشتراک امور قابل توجہ ہیں۔ میں زبان کے متعلق ذرا مفصل لکھتا لیکن اب مجھے صرف سرسری رائے ظاہر کرنا ضروری ہے۔ جناب کیفیؔ اُن انشاپردازوں میں ہیں جو مخزن و زمانہ و ادیب کے عمدہ ناظم و ناثر کہلاتے تھے۔ جناب کیفیؔ ہمیشہ بعض شخصوں کی ایسی اُردو پر سخت اعتراض کیا کرتے تھے جو وقت کلام یا تحریر انگریزی، عربی و ہندی الفاظ کی بھرمار کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ میرے پاس سے اخبار وکیل امرتسر کا ایک پرچہ لے گئے کہ "میں ایک کتاب اُردو طرز تحریر کے متعلق لکھ رہا ہوں اُس میں ایسی تحریروں کا حوالہ دونگا"۔ وکیل کے کسی مضمون میں اُنھوں نے انگریزی الفاظ بہت دیکھے اسلیے وہ پرچہ اُنکی زنبیل میں شامل ہوگیا۔ لیکن اب مجھے ہر دو مذکورہ بالا ناٹکوں کے مطالعہ سے سخت تعجب ہوا کہ اسی اعتراض کے مورد وہ خود بھی ہیں۔ انگریزی اور ہندی الفاظ اکثر جگہ استعمال کیے گئے ہیں جو عام فہم نہیں ہیں۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں کتابوں میں یہ بات مجھے بہت کھٹکی کہ کسی شخص نامک کی گفتگو ایک جگہ ہندی کے غیر مانوس الفاظ سے مملو و مشحون ہے تو دوسری جگہ ہندی الفاظ غائب اور عربی و فارسی الفاظ اپنی آب و تاب دکھا رہے ہیں۔ مثلاً راج دُلاری میں لکشمی "گتی" "لنگوٹیا دمن" جیسے الفاظ استعمال کرتی ہے اور دوسری جگہ چشم بد دور اور الم نشرح بیساختہ بول جاتی ہے یہی حال رام نرائن کا ہے کہ ایک جگہ ہندی الفاظ ہیں تو دوسری جگہ فارسی و عربی کی عبارت۔ غلو اگر کہیں تو

ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتی ہے اور جب اپنے دل سے جانکی ناتھ کے متعلق باتیں کرتی ہے یا کہیں دوسری جگہ اسکی بول چال درج ہے تو نہایت شستہ و برجستہ تقریر ہے۔

جو انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اُنکے ہم معنی اُردو الفاظ موجود ہیں لیکن اُن کو خواہ مخواہ عبارت میں شامل کر لیا گیا۔ ایسے الفاظ کی میں ایک مختصر سی فہرست دیتا ہوں:۔

کارونگ۔ کشن۔ اسٹرس۔ آئیڈیل لیڈی۔ سٹینڈ لیر۔ فارچون سیلر۔ ہوم لائف۔ ولا۔ ڈیزائن۔ اسٹیٹ۔ گورنس۔ بوسٹاکنگ۔ انرجی۔ کانسٹی ٹیوشنل مونارکی۔ رلیف سکلپچر۔ آرڈینس۔ ٹرانزیشن میکانیکل (ہندی) ابھیشک۔ دیاو۔ کرپائے۔ بشن شہنشتر۔ اوید۔ سنکلپ۔ استتی۔ رحم اور کھشما کی دیوی۔ پرکرا۔ ساتا روہن۔ اُپاؤ۔ تھاوس۔ چینشتا۔ کوپ بھون۔

ناظرین کرام ان الفاظ کے متعلق خود رائے قائم فرما سکتے ہیں۔ اس قسم کی انشا پردازی کبھی نظر استحسان نہیں دیکھی جا سکتی اور نہ اس سے کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ جناب کیفی اس جدت طرازی سے آئندہ پرہیز کریں۔

اس مخلوط زبان سے قطع نظر اگر محاورات و روزمرہ کو دیکھا جائے تو جو بات ایک دہلوی کی تصنیف میں نظر آنی چاہیے ہمیں ان دونوں کتابوں میں نہیں دکھائی دی۔ شاید اسکا یہ سبب ہو کہ پنڈت صاحب موصوف ہمیشہ سے جالندھر وغیرہ میں رہے ہیں اور گردوپیش کا اثر لازمی طور پر اُن پر ہوا۔ ان دونوں کتابوں کی زبان اکثر موقعوں پر محض مصنوعی اور غیر فصیح ہے۔ اُکھڑی اُکھڑی معلوم ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایکٹ ۲ سین ۱۔ میں سورج کی زبان سے لکھنؤ پر اس طرح حملہ کیا گیا ہے:۔ " یہ آپ نے لکھنؤ کی کھڑی بولی ملاحظہ فرمائی"۔ میں نے تو اس بولی کے ملاحظہ فرمانے کی بہت کوشش کی جس سے سورج مکالمہ کر رہا ہے اُسکی زبان لکھنؤ تو لکھنؤ نواحِ دہلی کے دیہاتوں کی سی بھی نہیں ہے۔ بلکہ اُن دیہاتوں کے شرفا کی زبان کا اس کتاب کی زبان سے محاورات کا مقابلہ کرتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قسم کی فضول چوٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب زمانہ وہ آگیا ہے کہ ایسے امتیازات عام طور پر دور ہوتے جاتے ہیں اور لکھنؤ اور دہلی کے باحوصلہ و عالی ظرف اصحابِ قلم نے اغیار و اجانب زبان کو صلائے عام دے دی ہے کہ آؤ اور طبع آزمائی کرو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اُردو علم ادب کی خدمت کرے لیکن اہل لسانِ زبان کے منہ نہ لگے۔ اس لا یعنی کاوش و دائی سے ترقی معکوس ہوتی ہے۔

فسانۂ آزاد کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جہاں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے فارسی علم ادب سے واقفیت کا عمدہ ثبوت دیا ہے اُنھوں نے کئی جگہ مسلمانوں کے معاشرتی پہلو پر تعریضات بھی کی ہیں۔ مثلاً ہندوں کی طرح مسلمانوں میں گوت کا لحاظ نہ رکھا جانا اور چچا اور ماموں کی بیٹی سے نکاح کرلیا اور چار بیویوں کا جواز گو اس قسم کی لغو گفتگو کے سلسلہ میں کوئی دلیل اُنھوں نے پیش نہیں کی لیکن اس سے اُنکے ظرفِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔

راج دُلاری و مراری دادا کے مطالعہ سے اکثر جگہ یہ یقین ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے فسانۂ آزاد سے اچھا استفادہ کیا ہے۔ بحیثیت زبان و آمد مضامین کے نہیں بلکہ پلاٹ و گفتگو کی طرز میں اور مسلمانوں پر پھبتیاں اُڑانے میں۔ میں راج دُلاری اور مراری دادا میں سے چند فقرے اس مضمون کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ایکٹ ۲۔ سین ۳۔ میں شکسپیر کے ہملٹ اور اُردو ترجمہ خون ناحق کی طرح اسٹیج میں اسٹیج دکھایا گیا ہے اس میں تماشہ دیکھنے والی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ ایک عورت کہتی ہے :۔

" توبہ توبہ ایک ہندنی مسلمانوں کی لڑکیوں کو پڑھائے "

ایکٹ ۱۔ سین ۱۰ میں راج اپنے دل سے باتیں کررہی ہے اور کہتی ہے :۔

" مگر یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ میری برادری کے آدمی تو مجھے اور میرے اسکول کو نام رکھیں کہ وہ میم ہے کرانن ہے بیدھرم ہے لڑکیوں کو بگاڑ دیگی اور مسلمان میرا دامن پکڑتے ہیں کہ کیوں نہ اُنکی لڑکیاں بھی اسی اسکول میں بھرتی کیجائیں "

ایکٹ ۳۔ سین ۱۲۔ میں سکندر ایک بچہ کی زبان سے یہ باتیں کہلائی جاتی ہیں :۔

" وہ ہے ہماری کھورو والی مسجد کا مُلّاں۔ بڑا بُرا ہے۔ صبح ہی صبح گلا پھاڑ کے چیختا ہے۔ سونے بھی نہیں دیتا مُوا۔ میں اماں سے کہتا ہوں اسے منع کردو وہ بس مجھے گھُرک دیتی ہیں "

مزا یہ ہے کہ یہ بات والدہ اور بڑی بہن کی موجودگی میں کہی گئی۔ حالانکہ جو مسلمان بیبیاں نماز روزہ کی پابند نہیں وہ بھی کم از کم یہ اہانت آمیز فقرہ اپنے بچوں کے منہ سے نہیں سن سکتیں۔ اگر بفرض محال کہیں بچے کے منہ سے یہ بات نکل بھی جائے تو پہلی ہی مرتبہ اسکو اس طرح چشم نمائی کرکے سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ پھر اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتا۔ لیکن مصنف کو تو اپنے محلہ کی مسجد سے فجر کی اذان آنے سے نیند کے اُچاٹ ہونے کا مرثیہ کہنا تھا وہی وقت سونے کا ہوتا ہے اور اُسی وقت الصلوٰۃ خیر من النوم کی آواز مومنوں کو نیند کی غفلت سے ہوشیار کرنا چاہتی ہے۔

سب سے افسوسناک حملہ مراری دادا میں نظر آتا ہے۔ صفحہ ۴۸ پر باپ بیٹے میں تیز تیز گفتگو ہوتی ہے اور بیٹا اسمٰعیل اپنے باپ براہیم سے صاف انکار کر کے کہتا ہے کہ :۔

"میں نے جو کچھ پڑھا اور سوچا ہے اس سے اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ بیاہ آدمی کے لیے لازمی اور لابدی چیز نہیں۔ بلکہ اُسکے ہاتھ پاؤں کو جکڑ دیتا ہے۔ اور یہ سگے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کا باہم ازدواج تو قانونِ قدرت اور سائنس کے بالکل خلاف ہے"

اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ

"زہرہ (اسمٰعیل کی زبان) بھی تو گھر ہی رہتی ہی ہے"

یعنی اُسکو چھوڑ کے چچا کی بیٹی سے ہی شادی کیا ضرور ہے۔ گھر کی چیز چھوڑ کے پرائی چیز پر کیوں نظر ڈالو۔

اس رکیک حملہ سے جو رنج خاص طور پر مجھے ہوا ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔ جناب کیفی کے جو تعلقات عام طور پر مسلمانوں سے ہیں اور جو طرز تحریر اُن کا عام طور پر کتابوں میں ہوتا ہے بالکل تضاد ہے۔ بہر حال انکو ایسی کتاب میں جسکو وہ نُدرت نواز اور انقلاب انگیز ڈراما تصور کرتے ہیں ان ہفوات و ہزلیات سے اجتناب لازم تھا۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کے ضمن میں ہمارے ابناے وطن دلائل سے کام نہیں لیتے۔ میں اس علمی مضمون میں مذہبی پہلو اختیار کر کے رنگ تحریر کو نہیں بدلوں گا لیکن کم از کم یہ ضرور عرض کرونگا کہ جو خود شیشے کے محلوں میں بستے ہوں اُنکو اپنی دیواروں کے کلینوں کی طرف سنگ باری نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف صاحب کا نام دتاتریہ ہی اس گذارش کی مضبوط دلیل ہے خواہ دور از کار ناویل سے اس سے پناہ ڈھونڈھی جائے دتاتریہ یعنی تین منہ والے کا پیرو۔ قُلْ و دلّ! العاقل تکفیہ الاشارۃ۔

میں نے مذہبی کتابوں کا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مطالعہ کیا ہے لیکن اس قسم کی شادی کی ممانعت میں کوئی شافی دلیل پیش نہیں کی جاتی۔ صرف یہ ہے کہ کنبہ میں شادی کرنے سے کمزوری بڑھتی ہے۔ ناچاقی جلد ہو جاتی ہے۔ محبت نہیں پیدا ہوتی۔ قریب رشتہ کرنے سے عورت کے رشتہ داروں کو اسکے حالات کی خبر رہتی ہے وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ جو غلامی عورتوں کو ہندوؤں کے ہاں ہے انکے لحاظ سے اسکے حالات سے اُسکے عزیزوں کو بیخبر رکھنا ضروری ہے لیکن آجکل تو بُعد و قرب میں کچھ فرق نہ رہا۔ ریل و تار نے سب مشکلات رفع کر دیں۔ یہ دلیل تو یوں باد ہوا ہوئی۔ دوسرے دلائل کے متعلق عرض کرنا فضول ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ دنیا میں جو واقعات فسانہ بنکے زبان زد خلائق ہیں

وہ عشق کی داستانیں قریبی رشتہ کی مرد و عورت سے پیدا ہوئیں۔ جو لطف و محبت اعزہ و اقارب میں جلوہ گر ہوتا ہے اغیار و اجانب میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ تاریخیں شاہد ہیں کہ خاندانی خصوصیات کے برقرار رکھنے کے لیے خاندان میں ہی بیاہ والے وضوابط تاہل کس قدر لابدی ہیں۔ قومیں اسی سے بنیں اور اس سے اغماض کرنے سے بگڑیں۔ جو محرمات معمولی عقل بھی تسلیم کرتی ہے مسلمانوں کے ہاں اُن سے بدرجۂ اتم پرہیز ہے۔ حالانکہ وحشی سے وحشی بھی اسکو برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک بیوی کے کئی شوہر ہوں پھر بھی پانڈو پانچ بھائی تھے اور دروپدی کا واقعہ مشہور ہے۔ اسی سلسلہ میں شاید اب تک اکثر جگہ صرف ایک بیوی کئی بھائیوں کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے۔ ماموں کی بیٹی سے دکن میں شادی جائز ہے اسکے متعلق فیلوک ہے۔ ماں کی طرف کا اتنا پرہیز نہیں کیا جاتا جس قدر باپ کی گوت کا۔ کیوں؟ کیا ماں کی طرف کے ایسے ہی رشتہ دار نہیں جیسے باپ کے عزیز و قریب۔ آریہ سماج نے شمس اسلام سے اکتساب نور کرکے توحید کا رنگ اپنے مذہب پر چڑھانا چاہا ہے لیکن پھر بھی بہت ایسے مزخرفات و حشوات رہ گئے ہیں کہ انکا ذکر اس جگہ ہمارے لیے غیر متعلق ہے۔ منجملہ انکے نیوگ ہے۔ اِن باتوں کا جواب مباحثہ و مناظرہ کی کتابوں میں بہت مفصل موجود ہے جناب کیفی کو اگر تحقیق مذہب کا شوق ہے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ ہندوؤں نے اکثر باتیں خود اختیار کرلی ہیں جن سے وہ پہلے مسلمانوں پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ مثلاً ساتھ کھانا پینا۔ گوشت کھانا۔ بیوہ کی شادی۔ صغیر سنی کے بیاہ سے اجتناب وغیرہم۔ کوئی دن جاتا ہے یہ گوت کی قید بھی گاؤخورد ہو جائیگی۔

جناب کیفی ہمیشہ شد و مد سے یہ اعتراض جڑا کرتے ہیں کہ یہ کیا اردو ہے "شام کو غروب ہونے والا سورج" اور اسی قسم کے فقروں کو وہ انگریزی کا فضول تتبع قرار دیا کرتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ چاہ کندہ را چاہ درپیش مراری دادا میں صفحہ ۱۰۵ پر آپ لکھتے ہیں :-

"ہماری لال جو سفید چہرہ لیے کھڑا تھا" اور "فراک کا دامن ساڑھی کے نیچے سے نکلکر جھانک رہا ہے"

اسی طرح راج دلاری میں لکھا ہے :-

"یہ تو پتھر کے بت کو لمزہ چڑھاکے چھوڑیں"۔ "بیچ و بیچ سب کیا سلائی لگی ہوئی بادود نکر ہوا پر جا رہے"

میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں بلکہ جناب کیفی کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاید اب اُنھوں نے خود اس طریقہ کو مرغوب طبع تصور کیا۔ کچھ حرج نہیں اگر کوئی جدت آفرینی کی جائے۔ اگر کوئی غیر زبان کا محاورہ یا لفظ

ہماری زبان کسی سے عمدہ اظہار مطلب کر سکتا ہے اور خوش آیند ہے تو اُسکے استعمال نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں دنیا کی ہر ایک نئی بان اسی طرح بنی ہے۔

جذبات میں بھی جناب کیفی نے ذرا تصنع سے کام لیا ہے۔ ایکٹ اول سین چہارم راج دُلاری میں جانکی ناتھ کے یکایک آجانے سے جو متضاد حالت راج کی دکھائی ہے بالکل خلاف ہے۔ راج تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور باہر نکلتی اور پھرتی ہے۔ گو جانکی ناتھ ایک اجنبی تھا لیکن خلقی بالطبع لڑکی کا مختلف النوع حالت میں مبتلا ہو جانا عجیب بات ہے۔ میرے خیال میں مصنف صاحب نے سب جذبات ایک ساتھ ظاہر کر دیے تاکہ جو جذبہ جس شخص موزوں معلوم ہو تصور کر لے کہ راج اُسی میں مبتلا تھی۔ لیکن اس سے بجائے خوبی پیدا ہونے کے خرابی پیدا ہو گئی۔ ایسے ہی اسٹیج میں اسٹیج جو دکھایا گیا ہے بالکل فضول ہے۔ ناظرین پر اس موقع پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ راج دُلاری اُسوقت ایک مضحکہ بن گئی ہے۔ چار پانچ صفحے جو اس میں لگائے گئے کچھ مطلب خیز نہیں۔ سارے جذبات موضوع ہیں۔ اسی طرح جو سین کلکٹر کے راج سے معذرت طلب کرنے کے سلسلہ میں ہیں سب خلاف واقعات ہیں۔ محض حاضرین شایقین تماشہ کے تفنن طبع کے لیے لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ مذاق واقعات پر مبنی نہیں۔ اسی طرح مراری دادا میں گلاب جب کوئی بات کہنے کو ہوتی ہے تو جو پوزیشن دوسری لڑکیوں کی دکھائی گئی ہے لا یعنی محض برائے وزن بیت ہے۔ ملاحظہ ہو

گلاب - ہاں یہ مانا۔ وہ بات ہے ہی لعنت کے لائق۔ اب سب لڑکیاں چپ چاپ۔

زہرہ گم سم

جانکی تکی تکی

اختری لنگڑی لولی

ڈورا بہری گونگی

سوشیلا ہو کر بیٹھیں - (سب ہنستی ہیں)

ور لڑکیوں کی حالت کچھ تو ٹھیک ہے لیکن یہ سوشیلا ہو کر بیٹھنے سے کیا مطلب ہے؟

ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والا گویا تشنہ رہ جاتا ہے اور کوئی خاص اثر اپنے لیے نہیں پاتا۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ نفس مضمون کو اس طرح نہیں لیا گیا کہ قصہ مکمل طور سے بنا یا جاتا اور منوع کتاب خود بخود قصہ سے مترشح اور مستنبط ہوتا۔ لیکن مراری دادا کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

مصنف نے راج دُلاری کی اس کمی کو محسوس کرکے اسکی طرف توجہ کی۔ لیکن اختصار کی وجہ سے مراری دادا کو ادھورا اور بے مزا چھوڑنا پڑا۔

مراری دادا تو جیسا میں اوپر تحریر کر چکا ہوں ایک نہایت مختصر ڈراما ہے۔ لیکن راج دُلاری میں گانے بھی موجود ہیں۔ غزلیں اور ہندی کی دو چار چیزیں ہیں۔ جناب کیفی کا پایہ بحیثیت شاعری بلند ہے لیکن راج دلاری کی غزلیں بے لطف ہونے کے علاوہ صوری ومعنوی محاسن شاعری سے قطعی معرّی ہیں۔ جذبات بھی ان میں موضوع ومصنوع ہیں۔ علاوہ اسکے ڈراما نگاری کے اصول کے خلاف جہاں کہیں گانا آتا ہے اُس جگہ ایک ہی شخص کی زبان سے پانچ سات غزلیں یکے بعد دیگرے سنائی جاتی ہیں۔ جس سے تماشے کی خوبی ضائع ہوتی ہے۔ اگر حسن اتفاق سے جس کمپنی میں یہ تماشہ دکھایا جائے خوش گلو ایکٹر اُن پارٹوں کو کر رہے ہوں جہاں غزلوں اور ترانوں کی ایسی بوچھاڑ ہوئی ہے اور شائقین کی طرف سے مکرر سہ کرر فرمائش کی تالیاں بجنا شروع ہوں تو انکی آواز اور گلے تو ایک ہی سین کے ہو رہے۔ مزید براں تواتر سے کسی چیز کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گانا بامحل ہونا چاہیے۔ اور ایسی جگہ اسکا لطف ناظرین کو دیا جائے جس سے تاثراتِ خاص ہیجان میں آجائیں لیکن یہ بات افسوس ہے راج دُلاری میں مفقود ہے۔ ہندی چیزوں کی بندش بھی کچھ انوکھی انوکھی معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انکا ترکیب دینے والا یا گانے والا سچے جذبات سے بیگانہ ہے اور زبردستی احتفاظِ پبلک میں کوشاں ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مصنف الفت آگین تعلقات زناشوئی کی حقیقی مسرتوں سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے جہاں کہیں اس قسم کے مکالمے لکھے ہیں ایک خاص پیرایہ میں اُسکا التزام رکھا ہے اور فی الواقع یہ بڑی تعریف وتوصیف کی بات ہے کہ اُنھوں نے اس زمانہ کے اُردو ناٹکوں کی طرح اس قسم کی گفتگو کو پایۂ سنجیدگی سے گزرنے نہیں دیا۔ بے لوث وپاک جذبات الفت کی صنوانگنی سے ل[?]ا اچھا اثر پیدا ہو علاوہ ذاتی علم کے کتابوں کے پڑھنے سے بھی مجھے صاف عیاں ہو گیا کہ مصنف نے ڈراما نگاری کے فن میں بہت غور واِمعان سے کام لیا ہے۔ یہ پہلی کوشش ہے جس میں لغزشیں بھی ضرور ہیں لیکن اس سے دلشکنی مقصود نہیں اور نہ اس میں تعریض مضمر ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آئندہ ان کمیوں کا جناب کیفی لحاظ رکھیں۔ راج دُلاری کئی سال کی محنت وکاوش طبع کا نتیجہ ہے اور بعد تصنیف کے بھی

مصنف نے اس کتاب کو متعدد اہل قلم اصحاب کے پیش نظر کیا - اردو زبان اس صنف میں یقیناً بہت کم مایہ ہے اور آجکل کے ڈرامانی الواقع اس فن کا ایک مضحک خاکہ ہیں - چونکہ قابل لوگوں کے قلم سے نہیں نکلتے اس لیے ان میں وہ دیدہ ریزی و کاوش طبعی سے کام نہیں لیا جاتا جو دیگر ادبی کتابوں میں عمدہ نتائج پیدا کرتی ہیں - یہ میرا منشا نہیں کہ اُردو کے کل ڈرامانگار میرے اس ریمارک کا نشانہ بنیں - حسن طالب بنارسی وغیرہما کے ناٹک ممتاز رتبہ رکھتے ہیں لیکن ان حضرات نے بھی وہی طرز لیا ہے جو دیگر ناٹکوں میں نمایاں ہے - عشقیہ جذبات کو برانگیختہ کرنا، گانا بجانا، بس یہی غایت نظر ہوتا ہے اور عام طور پر اُردو کے ناٹکوں میں نظم اور نثر کی مٹی بہت خراب کی جاتی ہے - جذبات کی صحیح تصویر نہیں کھینچی جاتی ہر ناٹک میں بے موقع اور فضول گانے ہوتے ہیں - ایک شخص پھانسی پر چڑھایا جا رہا ہے اور وہ لہرا لہرا کے گا رہا ہے - بادشاہ سلامت سو رہے ہیں اور گا رہے ہیں ایک شخص کا پارٹ نہایت متانت و سنجیدگی کا ہے لیکن اُسے بھی الا بے دکھا کے لوگوں کی نظروں میں اُسکی وقعت گھٹا دی جاتی ہے - غیر ضروری مناظر دکھائے جاتے ہیں - خرق عادات سے مدوح ڈراما کو ممتاز کیا جاتا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ اُردو ڈرامانگاری پیدا ہوتے ہی ناقابل آغوش میں دیدی گئی ہے جہاں بجائے پرورش کے قبل از وقت اسکی ممات کا اندیشہ ہے - دیباچہ میں مصنف صاحب نے اُردو میں ناٹک نویسی کی کمی کے جو وجوہات دیے ہیں اُن میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے - مسلمانوں کو سنسکرت زبان سے بدشوقی کا الزام دیا گیا ہے کہ جب وہ خود سیکھنے کے درپے نہ ہوں تو پنڈتوں کو کیا غرض پڑی تھی کہ اپنی پوتھیاں کھول کے اُنھیں سبق دیتے - زندہ مثالیں زیادہ قرین یقین ہوتی ہیں - بنگال کے ایک مسلمان نے بی اے کی سنسکرت میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی - ایم اے میں اس نے سنسکرت لی لیکن پنڈتوں نے اسے سنسکرت پڑھانے سے بایں وجہ انکار کیا کہ وہ ملکش تھا - اخباروں میں بہت غل مچا - یونیورسٹی بھی دخل دینے پر کچھ نہ کر سکی - مذہبی عصبیت تنگدلی نے سنسکرت کو ایک دُرِ مکتوم رکھا - اور یہی وجہ اس واقعہ میں اس زبان کے مردہ کہلانے کی ہوئی -

مسلمانوں کو مصنف نے علم موسیقی و ناٹک سے بے بہرہ بتا کے اسکو اُنکا ایک قصور بتایا ہے چنانچہ انھوں نے علم موسیقی کے ایک جزوِ زندگی بنائے جانے کا خیال پلاٹ میں بھی پیش نظر رکھا ہے - نظریہ مصنف کی دلی آرزو بر آتی نظر آتی ہے - مدرسوں میں بچوں کو مدرسہ شروع ہونے سے پہلے

کوئی غزل یا حمد دس پندرہ منٹ گانی پڑتی ہے۔ اچھا ہے اس سے جن بچوں کو گانے کا شوق ہوگا یہ ابتدائی شوق انکو کلاونت کا ڈپلوما حاصل کرنے کے لیے اچھی ترغیب ثابت ہو جائیگی۔ ناٹک اور گانا اخلاق پر اچھا اثر نہیں ڈالتے۔ کالج والے شہروں میں جب کمپنیاں چلی جاتی ہیں اور لڑکے کسی طرح تماشہ دیکھ لیتے ہیں تو عام طور پر انکے جذبات و تاثرات کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ کسی ایکٹرس کی نازک ادائی و کرشمہ نوازی کا ہدف بن گئے۔ کمپنی جبتک اس شہر میں رہی ہمیشہ اسکا طواف کرتے رہے۔ ایکٹروں سے، نوکروں سے، غرضیکہ جس سے شوق دیدار کی تکمیل کا امکان ہو ملاقاتیں پیدا کرنے کی بیجا کوشش ہوتی ہیں لکھنا پڑھنا سب بند ہوتا ہے۔ جب کمپنی شہر سے "خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں" کا دردناک مرثیہ پڑھتی ہے اسکے بعد انکی صحبتوں میں، سیروں میں، اسکے تذکرے ہوتے رہتے ہیں۔ گانا سنتے ہیں، اسکو دوہرایا جاتا ہے۔ کسی لفظ پر، کسی جذبہ پر، آواز کی کسی مرکی پر سر دھنا جاتا ہے۔ سینہ سے دود آہ باد سموم کے تند جھونکے کی طرح نکلتی ہے اور دیر تک انکو مبہوت رکھتی ہے۔ یہ عام حالت ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں تماشہ دیکھنے سے یہ شوق بھی سمانے لگتا ہے کہ وہ بھی ایکٹ کریں۔ ایکٹروں کی زندگی نہایت خوش آیند معلوم ہوتی ہے۔ غرضیکہ ان باتوں کا نتیجہ اہل نظر اصحاب تصور کرسکتے ہیں۔ میرا مطلب ان باتوں سے یہ نہیں کہ اس لحاظ سے ڈرامے لکھے ہی نہ جائیں، بلکہ یہ ہے کہ جس بات کو مصنف راج دلاری نے ایک مذموم طریقہ سے قابل نکوہش قرار دیا اسکے اصلی معنی شاہدہ کی لغت سے جتا دیے جائیں۔ یہ غلط ہے کہ عربی زبان ڈراما سے بیگانہ ہے۔ عربی میں ڈرامے موجود ہیں اور اکثر افسانے ڈراما کے طرز پہ لکھے گئے ہیں عربی زبان علم و ادب کے گوناگوں جواہرات سے مالامال ہے اور آج یورپ جس معراج کمال پر پہونچا ہے اس سے ہی استفادہ کا انعام ہے۔

بہر حال اردو میں ڈراما کی کمی کے وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن زمانہ کی ہوا اسکی متقاضی ہے کہ ہم بھی اس سے استمتاع راحت کریں۔ لیکن ڈراما نویسی قابل لوگوں کا مشغلہ طبع ہو۔ پبلک کا مذاق قابل اصلاح ہے پہلے اسکو درست کیا جائے پھر وہ مذموم و مضر ڈرامے خود بخود پامال ہونگے اور کوئی انکی طرف نظر نہیں اٹھائیگا آج انگریزی ڈراما ان ہی کشمکشوں کے بعد اس دلفریب حلیہ میں نظر آتا ہے۔ بچہ پہلے گھٹنیوں چلتا ہے کہیں دھلکتا ہے، کہیں گر پڑتا ہے، آخر چوٹیں کھا کے اس میں چلنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر اردو میں مخرب اخلاق ڈرامے ہیں تو مضائقہ نہیں۔ ان ہی ڈراموں سے پبلک کو شوق شروع ہوا۔

پہلے فسانہ عجائب، سرورِ سخن، آرائش محفل، طوطا کہانی وغیرہ ہم ہی عوام الناس کی تفریح طبع کا باعث تھیں۔ آج بہت کم ایسے ہیں جو ان کتابوں کو بمقابلہ ناولوں کے پڑھتے ہیں۔ طرز تحریر نے کتنا پلٹا کھایا ہے۔ وہ بیقاعدہ قافیے، وہ فضول و مغلق عبارت آرائی غائب ہو گئی۔ اب سلاست و مطلب کو عبارت و لیاقت سے مغلوب نہیں کیا جاتا۔ بس اسی قسم کا انقلاب ڈراما میں ہونے والا ہے جسکی جد و جہد شروع ہے۔ اردو میں ڈرامے لکھے جا رہے ہیں۔ اور امید ہوتی ہے کہ یہ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں مذاق سلیم کی بارش ابر خیال کے سفید ٹکڑوں پر لیے جلد آئیں گی، اور ملک و زبان کو سیراب کریں گی۔

محمد ظفر (ایم اے ایل ایل بی)
گڑگانوہ

افسانۂ غم

جلوۂ دلدار سے ہوتے ہیں جب مایوس ہم اور اکیلے ہیں اپنی بیکسی محسوس ہم
دل کو یوں مجبوریوں میں دیکھ کر مجبوس ہم یاد ہی سے اسکی ہو جاتے ہیں پھر مانوس ہم
اور تصور سے رہا کرتی ہیں برہم آرائیاں

درد و غم سے جب بہت بیچین ہو جاتے ہیں ہم اس طرح اپنے دل وحشی کو بہلاتے ہیں ہم
جب کسی محفل میں اسکا ذکر سن پاتے ہیں ہم اس سے کچھ تسکین اپنے دل کو پہونچاتے ہیں ہم
تذکرہ بھی اسکا ہوتا ہے مسرت آفریں

ہائے وہ دن جبکہ ہوں دیدار سے محروم ہم اور نہ اسکو کر سکیں جب حالِ دل مرقوم ہم
ہائے جب امید ہو پامال اور مغموم ہم اور پھر قاصد کو بھی پاتے ہوں جب معدوم ہم
ہائے ممکن ہی نہ ہو جب مرہم زخم جگر

کیا سنائیں ہمنشیں اسوقت کی تقریر ہم کیا دکھائیں اس دل بیتاب کی تصویر ہم
کیا کہیں اس خواب وحشتناک کی تعبیر ہم مضطرب رہتے ہیں دن بھر صورت نخچیر ہم
بس وہ روز بد ہوا کرتا ہے محشر کا جواب

یا تو پابندیوں سے ہو گئے مجبور ہم یا کسی کے خوف سے رہتے ہیں یوں مہجور ہم
زندگی میں تو مے الفت سے ہیں مخمور ہم بعد مردن بھی رہیں گے اس نشہ میں چور ہم
قبر سے بعد فنا نکلے گی آواز خروش

(ماخوذ از عربی)

سید محمود اعظم ۔ فہمی (از بھوپال)

قومیت کی حفاظت

دُنیا میں کوئی قوم نہیں رہی جب تک اُس نے اپنی قومیت کی حفاظت نہیں کی۔ کوئی شے بدون حفاظت نہیں رہ سکتی۔ ہر شے کی حفاظت کے طریقے مدبّروں اور حکیموں نے بتلائے ہیں۔ جبتک اُن طریقوں کو نہ برتا جاوے کوئی شے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ قومیت بھی اسی کلیہ کے تحت میں ہے۔ اُن قوموں پر نظر کرو جو دنیا میں آئیں اور حفاظت پر قومیت کی متوجہ نہ ہوئیں۔ آج صفحاتِ تاریخ اُنکے ذکر سے سادے ہیں۔ جن اقوام نے جتنی حفاظتی تدابیر کیے اُتنی ہی اُس قوم کو بقا اور دوام ہوا۔ حیوانات بھی اپنی صنف کی بقا کے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ہر صنف بجز اپنی صنف کی مادہ کے دوسری صنف کی مادہ پر توالد وتناسل کے لیے توجہ نہیں کرتا۔ یہ ایک فطری خاصہ ہے جو بقاے نوع کی غرض سے ہے تاکہ نطفہ ضائع نہ ہو مگر گاہ گاہ اتفاقی طور پر اسکے خلاف بھی ظاہر ہوا ہے جو کلیہ کو نہیں توڑتا۔

اسلام نے جسقدر حفاظت قومی کی تعلیم دی ہے کسی مذہب میں بمشکل ملے گی۔ لیکن مسلمانوں نے اُس تعلیم کو پس پشت ڈال دیا ہے یہاں تک کہ ایک صنف کے حیوان کو دوسری صنف سے جفت کرنے کو منع کیا ہے اور حیوان کی صنف کی نگہداشت کی ہے چہ جائیکہ انسان نبی آخر الزمانؐ وحی دالعداد کی بعثت خاص اس غرض سے ہوئی کہ قوم کے اخلاق واطوار سدھاریں اور اُنکی قومیت کی حفاظت کے لیے تمام افعال واعمال میں حفظِ قومیت کے گہرے اصول قائم کردیں تاکہ اُن خصوصیات کے دیکھنے سے معلوم ہو کہ یہ قوم آبھی حضرت آدمؑ کے عہد سے ایک ہی قوم ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت خاتم النبییّن تک انبیاء و اولیاء کے جو کارنامے تھے اُن سب کو قوم کےلیے فرض وسنت قرار دیا اور ہر مسلمان کو تمام اسلامی دنیا کی یادگار بنادیا۔ حج، صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خمس وغیرہ وغیرہ اللہ امور میں انبیاء کی یادگار قائم کی گئی۔ کتب احادیث و اخبار کے دیکھنے والے علت کو مذکورہ احکام کی جانتے ہیں۔ روزہ حضرت آدمؑ کے ترک اولیٰ کی یادگار میں قائم ہوا ہے۔ تیس روز گندم کا اثر جسم حضرت آدمؑ میں رہا تھا بہشت سے نکل کر حضرت آدمؑ کو تا زیر ھائی گئی۔ دنیا میں آنے کی یادگار اس

نمانہ سے قائم ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی چاہی۔ مسلمانوں کے واسطے بقرعید کے روز قربانی کا حکم ہوا۔ ارکان حج مجموعہ اُن افعال کا ہیں جو انبیاء سے وقتاً فوقتاً ظہور میں آئے یہ سب افعال یادگار بزرگوں کی ہے۔ ان یادگاروں کو قائم رکھکر قوم کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے اسوقت تک انبیاء کے سچے پیرو سب ایک قوم ہیں اور علامت و نشانی اُنکی یہی ہے کہ وہ زندہ یادگار انبیاء کی ہوں۔ جبھی تو قرآن مجید میں ہے " ہذہ امتکم امۃ واحدۃ " حضرت آدمؑ کے عہد سے حضرت خاتمؐ کے وقت تک سب قومیں انبیا کی ایک ہی قوم ہیں۔

یہاں تک حفظِ قومیت کی نگہداشت اسلام نے کی ہے کہ ہر معمولی سے معمولی شخص کی بھی یادگار قائم رکھکر اُسکو جلایا نہیں گیا۔ مرنے کے بعد جلاکر خاک سیاہ کردیا اور میت کے جلنے سے عفونت و سمّی گاس کے ضرر سے دوسرے ذی روحوں کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح میت کو بہاکر دریاؤں اور چشموں کے پانیوں کو فاسد و مضر صحت نہیں بنایا گیا ہے بلکہ دفن کرکے اُسکی یادگار قائم کرنے کا حکم ہوا ہے۔ جسکا کوئی دفن کرنے والا نہ ہو اوروں پر اُسکا دفن واجب کیا گیا ہے۔ اور دفن کے طریقے کو حیوان کی فطرت سے تعلیم دیا گیا ہے۔ دنیا میں کیڑے کوڑے، حشرات الارض، چرند پرند کے ہمات انسان سے کروروں درجہ زائد ہیں اور سبھی مرتے رہتے ہیں لیکن کسی جانور کی نعش جو اپنی موت سے مرا ہو زمین پر پڑی نظر نہیں آتی۔ پھر وہ کیا ہو جاتے ہیں؟ بجز اسکے کہ اُنکی فطرت میں یہ ہے کہ مرتے وقت وہ خود زمین کے سوراخوں میں جاکر پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہی اُنکی قبر ہوتی ہے۔ چونٹیوں پر تجربہ کیا ہوگا کہ ایک مُردے کو بہت سی چونٹیاں کھینچکر سوراخ میں لے جاتی ہیں۔ قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا اور کوّے کا آکر طریقۂ دفن تعلیم کرنا مشہور ہے۔ یہ وہی فطری سبق تھا جسکی پابندی میں یادگار انسانی مُردوں کے دفن سے قائم کی گئی ہے بعد دفن بھی میت کو بھلا دینا نہ چاہیے۔ قومیت کی حفاظت یہاں تک کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد فاتحہ اور امور خیر سے یاد کرنے کا حکم ہے۔ اگر روز میت کو یاد نہ کرسکیں تو ہفتہ شب جمعہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور یاد کریں تاکہ قوم کا ایک مردہ بھی بھولا نہ جاسکے اور قوم میں محسوب رہے۔ زیارتِ قبور مومنین کا حکم ہے تاکہ زندہ لوگ مُردوں کے اخلاق و اطوار و عادات حسنہ کو یاد کریں اور خود بھی اُنکے اخلاق حسنہ سے متخلق ہوں اور اخلاف اسلاف کی جگہ کو پورا کرنے میں کامیاب ہوں۔ غرضکہ پیدا ہونے سے مرنے تک ہر حکم میں اسلام کی قومیت کی حفاظت و نگہداشت

میں کمال کوشش کی گئی ہے جب تک ان اصولِ اسلامی کو مسلمان اپنا شعار قرار نہ دیں گے کبھی وہ ترقی کے میدان میں قدم نہیں دھر سکتے ۔

مسلمانو۔ قوم پرستی سیکھو اور یادگارِ اسلاف بنو۔ ہر ترقی کا میدان تمھارے ہاتھ ہوگا۔ اُن افعال و اعمال سے بچو جو تمھاری قومیت کے منافی ہیں۔

سید احمد (علامہ ہندی)

دیوانہ بلبلوں کو کیا لالہ زار نے | رشکِ پری چمن کو بنایا بہار نے
رکھا قدم جو باغ میں اُس گلعذار نے | آنکھیں بچھائیں آکے نسیمِ بہار نے
پایا ہے رنگ روپ جو رخسارِ یار نے | وہ گل کہاں کھلائے چمن میں بہار نے
لی کس نے جان؟ ناوکِ مژگانِ یار نے | دل کس نے لے لیا؟ نگہِ شرمسار نے
بلبل سمجھ نہ پھول کلیاں ہیں سرخ سرخ | مے کی گلابیاں یہ بھری ہیں بہار نے
اتنا دراز ہوگا نہ محشر کا دن کبھی | پایا ہے جتنا طول شبِ انتظار نے
صبحِ شبِ وصال جو وہ جا رہے ہیں گھر | اک حشر اُٹھا دیا ہے دلِ بیقرار نے
یہ کہکے ہم اُٹھائے گئے بزمِ یار سے | دیکھو تو کون آیا ہے باہر پکارنے
اڑتی سی یہ خبر جو سُنی! آئی فصلِ گل | بلبل لگی قفس میں سر و سینہ مارنے
اے کاش مجکو مل گئی ہوتی یہ مستعار | تقدیر جیسی پائی ہے پھولوں کے ہار نے
دیکھا جہاں سکون دلِ بیقرار میں | ماری چھُری تصورِ مژگانِ یار نے
کلیوں کے پھوٹے مُنہ سے نکلا نہ حیف یہ | صیاد کیا قصور کیا ہے ہزار نے
دانے کے ساتھ کرتی ہو جو آسیا سلوک | مجھسے کیا وہ گردشِ لیل و نہار نے
مطلب عدم سے آنے کا اپنے نہ تھا کچھ اور | آئے تھے صرف جامۂ ہستی اتارنے
وہ دل کمندِ زلف میں اُلجھا ہوا ہے آج | کل تک جسے نہ آتے تھے گیسو سنوارنے
ہمکو ہماری موت نے شرمندہ کر دیا | آئی تھی وہ حسینوں کے زیور اُتارنے

توبہ تو مے سے کرتے ہو آفاق تم مگر
چھینٹے دیئے جو آکے پھر ابرِ بہار نے؟

عاصی آفاق بنارسی

دلچسپ اجمال

رجب المرجب

رجب المرجب ۲۴۵ھ مطابق ۲ راکتوبر ۸۵۹ء بروز دوشنبہ عربیت اور لغت کا معروف الدہر امام ابو یوسف یعقوب بن اسحاق (المعروف بہ ابن السکیت) خلیفۂ بغداد المتوکل کے شہزادوں کو درس دے رہا تھا۔ اثنائے درس میں المتوکل آگیا اور امام موصوف سے پوچھا کہ "بتاؤ میرے دونوں بیٹے اچھے ہیں یا حضرت امام حسن و حسین علیہ السلام" اس سوال نے یعقوب کو غضبناک کر دیا اُس نے نہایت غصہ سے جواب دیا۔ "واللہ حضرت علی کا غلام قنبر تیرے دونوں بیٹوں سے ہزاروں درجہ اچھا ہے" خلیفہ کو اس جواب سے تاب نہ رہی۔ غصہ میں اپنے ترکی غلام کو حکم دیا کہ یعقوب کی زبان تالو سے کھینچی جائے۔ غصہ فرو ہو جانے کے بعد اس افسوسناک حرکت سے سخت شرمندہ ہوا اور اُسکا خونبہا اولاد کے پاس بھیجدیا۔ لیکن اس جانگاہ صدمہ سے امام موصوف نے ایک دن بعد وفات پائی۔

رجب المرجب ۲۷۹ھ مطابق ۷ ر ستمبر ۸۹۲ء بروز چہارشنبہ۔ اپنے چچا المعتمد کے انتقال کے بعد المعتضد تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ امیر مصر خمارویہ نے بیش قیمت تحائف دربار خلافت میں بھیجے اور اپنی بیٹی قطر الندی سے المعتضد کا نکاح کر دیا۔

خلیفہ کے حکم سے کتب فروشوں کو حکم دیا گیا کہ کتب فلسفہ نہ بکنے پائیں۔ نجومی۔ کاہن اور قصہ گو جو شارع عام پر بیٹھا کرتے تھے وہ بھی خلیفہ کے عہد میں راستوں سے اُٹھوا دیے گئے۔

رجب المرجب ۳۱۷ھ مطابق ۹۲۹ء بروز شنبہ۔ ابو طاہر قرمطی نے حرم کعبہ پر یورش کی اور مسجد الحرام میں قتل و غارت کو عام کیا۔ لاشیں چاہ زمزم میں ڈلوا دیں۔ حجراسود کو گرز سے توڑ ڈالا۔ اور ہمراہ لے گیا۔ باوجود اسکے کہ حجراسود کے معاوضہ میں پچاس ہزار دینار پیش کیے گئے لیکن حجرالاسود مسلمانوں کو واپس نہ ملا۔ خلافت المطیع باللہ میں بائیس برس بعد بتاریخ ۲۰ ر جون ۹۵۰ء مطابق محرم ۳۳۹ھ کو خود ابو طاہر نے محمد بن سنبر کے ذریعے روانہ کر دیا اور کسی معاوضہ کا طالب نہ ہوا۔

رجب المرجب ۴۴۳ھ مطابق ۱۰ ر نومبر ۱۰۵۱ء بروز جمعہ۔ خلیفہ القائم بامراللہ عباسی کے دربار میں

سلطان طغرل بیگ سلجوقی کا سفیر پیش ہوا اور گراں بہا تحائف پیش کیے۔

رجب المرجب ۴۷۱ھ مطابق ۷ رجنوری ۱۰۷۹ء بروز دوشنبہ۔ سلطان ملک شاہ کا شحنہ سعد اللہ گوہر آئین بغداد میں آیا اور اپنے محل کے دروازہ پر اوقاتِ نماز کے لیے طبل بجوایا۔ اس نئی بات کے چونکہ لوگ عادی نہ تھے اسلیے کامیابی نہ ہوئی۔

رجب المرجب ۴۸۲ھ مطابق ۱۷ رمارچ ۱۰۹۰ء بروز یکشنبہ۔ ملک شام کی فتوحات کے لیے مصری لشکر روانہ ہوا۔ اور شہر صور۔ صیدا۔ عکہ۔ اور الجبل کو ایک بڑے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا۔

رجب ۴۸۳ھ مطابق ۳۰ راگست ۱۰۹۰ء بروز جمعہ۔ امام عبداللہ طبری۔ مدرس مدرسہ نظامیہ نے انتقال کیا۔

شعبان المعظم

شعبان المعظم ۴۱۱ھ مطابق ۲۰ رنومبر ۱۰۲۰ء بروز یکشنبہ۔ خلیفہ الحاکم بامر اللہ مفقود الخبر ہوگیا جب ساری قلمروِ مصر چھان ڈالی تو ۲۷ رشوال ۴۱۱ھ کو اسکی لاش الجبل المقطم پر پائی گئی۔ یہ خلیفہ اپنی ہمشیر سیدۃ الملوک کے اشارے سے قتل کیا گیا۔

شعبان المعظم ۴۱۶ھ مطابق ۲۷ رستمبر ۱۰۲۵-۲۶ء دوشنبہ کو غازی سلطان محمود غزنوی نے سومنات فتح کیا۔

شعبان المعظم ۴۳۶ھ مطابق ۲۱ رفروری ۱۰۴۵ء بروز پنجشنبہ علامہ شریف مرتضیٰ نے اس جہان سے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شعبان المعظم ۴۵۱ھ مطابق ۱۲ رستمبر ۱۰۵۹ء روز یکشنبہ جغری بیگ داؤد (برادر طغرل بیگ) نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔ اور اُسکی جگہ سلطان الپ ارسلان تختِ سلطنت پر آیا۔

شعبان المعظم ۴۶۱ھ مطابق ۲۶ رمئی ۱۰۶۸ء روز شنبہ۔ جامع دمشق نذرِ آتش ہوگئی۔ اور عظیم الشان شہر کی ساری خوبیاں مٹ گئیں۔ جامع کی سقف میں جو سونے چاندی کی صناعی کی گئی تھی غارت ہوگئی۔

شعبان المعظم ۴۶۴ھ مطابق ۲۳ راپریل ۱۰۷۲ء بروز دوشنبہ خلیفہ المقتدی بامر اللہ کا عقد سفری خاتون سلطان الپ ارسلان کی چھوٹی بیٹی سے بمقام نیشاپور ہوا۔ خلیفہ بغداد کی طرف سے صدر اعظم عمید الدولہ جہیر اور سلطان الپ ارسلان کی طرف سے خواجہ نظام الملک طوسی وکیل مقرر ہوئے۔

شعبان المعظم ۴۸۰ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۰۸۷ء بروز سہ شنبہ خواجہ نظام الملک طوسی اور ترکان خاتون کے مشورے سے سلطان ملک شاہ سلجوقی نے اپنی دختر نیک اختر کا نکاح خلیفہ مقتدی بامراللہ سے کر دیا۔ مہر معجل قرار پایا اور پچاس لاکھ دینار خلیفہ نے ادا کیے اور یہ شرط کی گئی کہ خلیفہ اپنی کسی دوسری منکوحہ بی بی یا کنیز سے تعلق نہ رکھے گا۔

شعبان المعظم ۴۷۸ھ مطابق ۱۰۸۵ء بروز شنبہ۔ شہر طلیطلہ (واقع ملکِ اندلس) پر اہل فرانس نے قبضہ کیا۔

شعبان المعظم ۴۸۴ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۰۹۱ء بروز پنجشنبہ۔ راجرس دویم نے جزیرۂ صقلیہ یعنی سسلی کو اہلِ اسلام سے چھین لیا۔ لیکن مسلمانوں سے نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا۔ اُسکا دربار نامور مسلمان علما سے بھرا رہتا تھا۔ جغرافیہ کی نادر العصر کتاب "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" علامہ ابو عبداللہ شریف ادریسی نے اُسی کے دربار میں تیار کی۔ اس مشہور کتاب کے بعض حصے لنڈن میں چھپ چکے ہیں۔ یہی علامہ اول پہلا شخص ہے جسنے رودِ نیل کا منبع (خط استوا کی جھیلیں) معلوم کیا۔ تحقیقاتِ جدیدہ بھی یہی ہے۔

شعبان المعظم ۴۹۲ھ مطابق ۲۳ جون ۱۰۹۹ء بروز پنجشنبہ۔ ۲۱ شعبان کو آل عباس نے بیت المقدس چالیس روز کے محاصرہ اور شدید صلیبی جنگ کے بعد نصاریٰ و یہود سے لے لیا۔ اس معرکہ میں ستر ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

رمضان المبارک

رمضان المبارک ۲۵۰ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۸۶۴ء بروز جمعہ امام ابو الحسین علی ابن حسین نے ایک بڑے گروہ کے ساتھ کوفہ میں خروج کیا۔ اور شہر پر قابض ہوگیا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر سپہ سالار نے دربار خلافت کی طرف سے مقابلہ کیا۔ اور امام موصوف کا سر اُتار کر دربارِ خلافت کو بھیجدیا۔

رمضان المبارک ۲۶۳ھ مطابق ۸۷۶ء روز شنبہ جامع طولون "واقع مصر" بنکر تیار ہوئی۔ یہ عظیم الشان عمارت مصر کے آثارِ قدیمہ میں سے ہے۔ اسپر ۶ لاکھ روپیہ لاگت آئی۔

رمضان المبارک ۴۸۵ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۰۹۲ء بروز پنجشنبہ خواجہ نظام الملک طوسیؒ وزیر ملک شاہ کو موضع سحنہ (نہاوند) میں ابو طاہر حارث دیلمی نے ۱۰ رمضان کو چھری سے قتل کر دیا۔ خواجہ کے اس بیدردانہ قتل کے بعد سے فدائیوں میں سنت قرار پاگئی کہ مخالفان فرقۂ باطنیہ اسی لعلی آلہ سے قتل ہوں۔

رمضان المبارک ۴۹۴ھ مطابق ۳۰ جون ۱۱۰۱ء بروز یکشنبہ سلطان برکیارق ابن ملک شاہ نے ایک عام حکم قتل فرقۂ باطنیہ کا دیدیا۔ کیونکہ عراق و اصفہان میں باطنیین کا بڑا زور شور تھا اور بڑھتا جاتا تھا اُس زمانہ میں چھری بندفدائیوں کے خوف سے لوگ کپڑوں کے نیچے زرہ پہنتے تھے۔ (ماخوذ از تاریخ اسلام)

عبد الحی - مالک (علیگڈھی)

نظرے خوش گذرے

ناظرین الناظر اور دیگر علم دوست اصحاب کو یہ سنکر یقیناً دلی رنج ہوگا کہ مولانا سید عبدالغنی وارثی جنکا ترجمہ مسلمانانِ اندلس، الناظر میں بطور ضمیمہ شایع کیا جا رہا ہے ماہ جون کے دوسرے ہفتہ میں اپنے وطن استھاواں (ضلع پٹنہ) میں انتقال فرماگئے - انا للہ و انا الیہ راجعون - مولانا نے مرحوم نے علوم مشرقیہ میں مہارت تام حاصل کرنے کے علاوہ انگریزی کی تعلیم علیگڈھ میں پائی تھی - اور سرسید احمد خاں مرحوم کے شیدائیوں میں تھے - اسی وجہ سے ہر قومی کام میں خصوصاً تعلیمی اور علمی تحریکات سے گہری دلی دلچسپی ظاہر کرتے تھے - ملازمت کے سلسلہ میں آپ کا قیام حیدرآباد میں تھا جہاں آپ مددگار صدر محاسب یا اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر فائز تھے اور حال ہی میں وظیفہ یاب ہوکر وطن پہونچے تھے - قیام حیدرآباد کے زمانہ میں وہاں کی کوئی علمی - تعلیمی - معاشرتی تحریک ایسی نہ تھی جس سے آپ کو خاص تعلق نہ ہو - کتبخانہ آصفیہ کی مجلس منتظمہ اور نیز دیگر تعلیمی مجالس کے آپ رکن بنائے گئے تھے - آپ پر مذہب اور تصوف کا رنگ بہت غالب تھا - دیوہ ضلع بارہ بنکی کے مشہور بزرگ حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز سے آپ کو بیعت تھی - لیکن اس سلسلہ کے اکثر اصحاب نے شریعت کو جس طرح بالائے طاق رکھدیا ہے مرحوم کی روش اسکے خلاف تھی - وہ نہ صرف صوم و صلوٰۃ کے پورے پابند تھے بلکہ اکثر امورِ دینی و دنیوی میں شریعتِ محمدیہ کی اتباع کی کوشش کرتے تھے - سید احمد خاں صاحب کے شیدائی ہونے کے باوجود اُنکے معتقدات سید صاحب کے زیر اثر نہیں ہوئے گو سیاسی - تعلیمی - و معاشرتی امور میں وہ سید صاحب کی اصابت رائے پر بلا ادنیٰ تامل و تذبذب اعتماد کلی رکھتے تھے -

مولانا کو تصنیف و تالیف سے بھی خاص ذوق تھا - چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی کی لاجواب کتاب طبقات الکبریٰ کا ترجمہ کر رہے تھے - تین جلدیں شایع بھی ہوچکی تھیں چوتھی بھی تیار تھی - اسکے علاوہ گوتم بدھ کے فلسفیانہ خیالات پر بوزاسف بلوہر نامی ایک کتاب عرصہ ہوا ترجمہ کی تھی - بہت سی تحریریں اُنکے مسودات میں ملیں گی جو آپ اُن کے ورثا کو طبع کرانا چاہیے -

پندرہ برس ہوئے جب پہلی دفعہ ہم حیدرآباد گئے ہیں تو مولانا کی خدمت میں بھی نیاز حاصل ہوا تھا - اور اُسکے بعد جب کبھی ہم دکن جاتے تو مولانا سے بکثرت ملاقاتیں ہوتیں اور مولانا کے علمی ذوق - اسلامی ہمدردی اور خلوص و محبت کی ہمارے دل میں خاص منزلت تھی -

اس سانحہ پر مولانا کے صاحبزادے مسٹر محی الدین بیرسٹر ایٹ لا مددگار ناظم محکمہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن

ودیگر ورثا سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنکو صبر جمیل اور اعلیٰ اعلیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

انجمن اعانت نظربندان اسلام نے یہ تحریک کی ہے کہ ۲۰ جولائی سے لیکر ۲۰ جولائی تک یعنی آخر ہفتۂ رمضان میں اعانت نظربندان کے لیے چندہ فراہم کرنے کی خاص کوشش کی جائے۔ خدا کرے کہ انجمن کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو۔ جب قوم کے احساس کا یہ حال ہے کہ حسرت جیسے فدا کار وطن کی امداد کے لیے ایک ہزار ایسے افراد نہیں ملتے جو تین روپیہ دیکر دیوان حسرت حصۂ چہارم خرید سکیں تو یہ اندیشہ بیجا نہیں کہا جا سکتا کہ انجمن کی یہ تحریک بھی عجب نہیں جو صدا بصحرا ثابت ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو فی الاصل کچھ خلافِ توقع نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک خفتہ حال طبقہ کی غفلت شعاری کے بدولت جو قوم سیاسی تعلیم سے قطعاً محروم اور منظم صورت میں کسی بڑی تحریک کو چلانے سے کلیۃً ناقابل ہو اُسکے احساس و حمیت کی شکوہ سنجی عبث ہے۔

اسوقت اگر ایک دوسری قوم کے حالات پر نظر کیجیے تو حیرت و عبرت ہوتی ہے کہ اُسکی ایک دختر اُٹھتی ہے اور چند ماہ کے اندر پچاس ہزار روپیہ ایک اسکول قائم کرنے کے لیے فراہم کر دیتی ہے۔ اور جب ہوم رول لیگ کا ڈپوٹیشن ولایت بیجانے کے لیے لوکمانیہ تلک اپنی قوم سے سرمایہ طلب کرتے ہیں تو چند ماہ کے اندر کئی لاکھ روپیہ اُنکے قدموں پر نثار کر دیا جاتا ہے۔

مگر ہمارے قومی رہنماؤں اور تعلیمیافتہ سرگروہوں کو اسکی کیا پروا۔ وہ اسکو غنیمت جانتے ہیں کہ قوم کی موجودہ جہالت کے زمانہ میں اُن جیسے نااہل اور خود غرض افراد کو لیڈری کا اعزاز اور کونسل کی ممبریاں بہت ارزاں قیمت پر فراہم ہو جاتی ہیں۔ اور اسکے آگے اُنکا کوئی مطمح نظر نہیں۔

انجمن نظربندان اسلام کی جماعتِ منتظمہ کے ارکان و اعیان ایسے ہی لوگ بنائے گئے ہیں۔ اسوجہ سے اگر کامیابی نہ ہو تو قوم کے احساس پر حرف لانے کے بجائے ہمیں خود اپنے گریبانوں میں سر ڈالنا چاہیے اور اپنی رنگ برنگ نکٹائیوں اور سفید براق کالروں پر تھوکنا چاہیے کہ حمیتِ قومی اور جوش ملی کی سرد بازاری کا اصلی سبب یہی ہیں۔

تصحیح

اردوئے معلی بابت جون ۱۹۱۸ء کے صفحہ ۳۹ پر جناب انار رضا علی وحشت متوطن کلکتہ کی غزل شایع ہوئی ہے اسکا ایک شعر ہے

ہے رہائی کا سبب شاید پر افشانی مری
تنگ ہے مجھ پر قفس بھی خانۂ صیاد بھی

غلطی سے "قفس بھی" کی جگہ "قفس ہی" چھپ گیا ہے۔ ناظرین کرام اپنے پرچوں میں "ہی" کے بجائے "بھی" بنالیں اور حضرت وحشت ہمیں معاف فرمائیں۔ اسی پرچے میں مولوی عبد الصمد خان تپش کی غزل بھی چھپی ہے۔ فہرست مضامین میں اُنکے نام کے آگے غلطی سے لکھنوی لکھا گیا ہے حالانکہ وہ ضلع بلند شہر کے باشندہ ہیں۔ تپش صاحب معاف فرمائیں آیندہ احتیاط ہوگی۔

کتبخانہ میں رکھنے کے قابل کتابیں

اساتذۂ اردو کا کلام		اساتذۂ فارسی کا کلام		تاریخ اور تذکرے				دلکش ناول	
کلیات میر تقی میر	[illegible]	کلیات سعدی	[illegible]	تاریخ خلفائے عرب و اسلام	[illegible]	تاریخ یونان قدیم	[illegible]	ابن مسلم	[illegible]
کلیات سودا	[illegible]	کلیات جامی	[illegible]	تمدن ہند	[illegible]	تاریخ اسپین مجلد	للعہ	پاتال کی سیر	[illegible]
کلیات انشاء اللہ خاں	عہ	کلیات عراقی	عہ	تفریح الاذکیا	ے	مشاہیر یونان و روم	[illegible]	سمندر کی سیر	[illegible]
کلیات مومن	۱۰ر	کلیات نظم غالب	[illegible]	قصص الانبیا کامل	[illegible]	تاریخ تمدن ۲ جلد	[illegible]	دو جہان کی سیر	[illegible]
کلیات ظفر	[illegible]	کلیات شمس تبریز	صمہ	ترجمہ فتوح الشام منظوم	[illegible]	تاریخ اخلاق یورپ مجلد	ے	روح لطیف	ے
کلیات آتش	۱۲ر	کلیات خاقانی	صمہ	عجائب القصص	[illegible]	تاریخ جیالہ	[illegible]	زنوبی	[illegible]
کلیات ناسخ	عہ	کلیات انوری	[illegible]	ترجمہ واقدی کامل	صمہ	افتخار التواریخ	ے	خواب ہستی	[illegible]
کلیات امیر اللہ تسلیم	عمہ	کلیات مرزا بیدل	[illegible]	ترجمہ مدارج النبوۃ	ے	خلافت اندلس مجلد	صمہ	یاسمین	[illegible]
کلیات نعت محسن کاکوروی	[illegible]	کلیات صائب	[illegible]	ظہیر الاصفیا	[illegible]	تاریخ اودھ ۴ جلد	ے	بزم اکبری	[illegible]
کلیات ناسخ	[illegible]	کلیات حزیں	[illegible]	صحیفۂ زریں	[illegible]	نفائس التواریخ	۸ر	الف لیلہ شہرزاد	[illegible]
دیوان ذوق	۸ر	کلیات ظہیر فاریابی	۱۲ر	ترجمہ تاریخ فرشتہ کامل	[illegible]	تاریخ تمدن اسلام ۲ جلد	ے	اسرار	[illegible]
مہتاب داغ	ے	کلیات مرزا جلال اسیر	[illegible]	روضۃ الاصفیا	۸ر	ترجمہ تاریخ ابن خلدون ۸ جلد	[illegible]	خونی قسمت	[illegible]
آفتاب داغ	۱۲ر	کلیات غلام امام شہید	صمہ	مراۃ الکونین	[illegible]	تاریخ لب لباب	[illegible]	شہید جفا	[illegible]
گلزار داغ	[illegible]	دیوان امیر خسرو	[illegible]	البدر	عہ	تذکرہ سراپای سخن	[illegible]	فریب حسن	[illegible]
یادگار داغ	۸ر	دیوان انوری	[illegible]	سیر المدار	[illegible]	گلزار سخن	[illegible]	روز الیمبرٹ	[illegible]
دیوان رند	۸ر	دیوان عرفی	۱۰ر	تاریخ بغاوت ہند	[illegible]	نغمۂ عندلیب	۱۲ر	داستان	[illegible]
دیوان مہر	[illegible]	دیوان حافظ	[illegible]	ترجمہ سیر المتاخرین	[illegible]	گلشن ہند	[illegible]	لعبت فرنگ	[illegible]
دیوان خواجہ میر درد	[illegible]	دیوان مخفی	۸ر	ترجمہ تاریخ روسیہ	ے	تذکرہ آب بقا	[illegible]	حاجی بابا اصفہانی	[illegible]
دیوان شاہ تراب	۱۲ر	دیوان غنی	صہ	قیصر التواریخ	[illegible]	خمخانۂ جاوید		فسانہ دو جہاں	[illegible]
دیوان میر حسن	۸ر	دیوان ناصر علی سرہندی	۸ر	ترجمہ منتخب التواریخ	[illegible]	جلد اول	صمہ	زہرہ	[illegible]
دیوان قلق	۸ر	دیوان ہلالی	۵ر	کارنامۂ ترک	[illegible]	جلد دوم	[illegible]	انجام بخیر	[illegible]
کلیات نظیر اکبرآبادی	[illegible]	دیوان واقف	۹ر	فسانۂ برطانیہ	[illegible]	جلد سوم	صمہ	سیتا	[illegible]
دیوان [illegible] دہلوی	[illegible]	گلشن عشق	[illegible]	سیر المتقدمین کامل	[illegible]	تذکرہ علمائے حال	۸ر	جام زہر	[illegible]
دیوان شہیدی	[illegible]	دیوان مخزن التوحید	[illegible]	مختصر گلشن ہند	[illegible]	ترجمہ تاریخ [illegible]	[illegible]	داغ حسرت	[illegible]
دیوان [illegible]	[illegible]	دیوان [illegible] علی	[illegible]	تزک سکندری	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible] دل [illegible]	[illegible]
دیوان [illegible]	[illegible]	دیوان [illegible]	[illegible]	تزک جہانگیری	[illegible]	[illegible] التواریخ	[illegible]	[illegible]	[illegible]

حاجی کے سپرد کیا چونکہ جاتا تھا اس حاجی نے خود عباسی خلیفہ منصور کے ہاتھ میں جا کر دیا خلیفہ نے جو اس گٹھری کے اندر کی چیز دیکھی تو غصے سے آگ بھبوکا ہو گیا مگر بے اختیار چلا اُٹھا "خدا کا شکر ہے کہ اُس شخص اور میرے درمیان میں ایک سمندر حائل ہے۔" عبدالرحمٰن کا عباسی رقیب اُسکی کامیابی پر تہِ دل سے ناراض تو متردد ہوا مگر بے اختیار اُس کی ہشیاری و دلیری کی تعریف بھی کی۔ وہ عبدالرحمٰن کو قبیلۂ قریش کا (جس قبیلے کے خود پیغمبر تھے) باز کہا کرتا تھا۔ اور اکثر کہہ اُٹھتا تھا کہ "حیرت انگیز ہے وہ دلیری، دانشمندی اور مآل اندیشی جو اُس سے ظہور میں آئی ہے! - پُرخطر راہوں پر چلنا، ایسے دور دست ملک میں جہاں پہونچنا دشوار ہے اور جو بخوبی محفوظ ہے اپنے کو ڈال دینا اور وہاں جا کر مخالف جماعتوں کی باہمی رقابت سے فائدہ اُٹھانا اور بجائے اسکے کہ وہ فریق اسکے مقابلے میں ہتھیار اُٹھائیں اُنھیں آپس ہی میں لڑانا - اور اپنی رعایا کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لینا۔ اور ساری مشکلوں کو رفع دفع کر کے سب کا بالادست بنکر حکومت کرنا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی آدمی نے نہیں کیا تھا!"

عباسیہ حملے کو شکست دینے کے بعد یکے بعد دیگرے اس نئے سلطان کو اور کامیابیاں بھی ہوتی گئیں۔ طلیطلہ کے لوگ بہت دنوں تک اسکی مخالفت پر قائم رہے ان لوگوں کو صلح کرنے اور اپنے سرداروں کو اُنکے حوالہ کر دینے پر راضی کیا۔ یہ سردار سخت بےحرمت کر کے پھانسی دیے گئے۔ یمنی فرقے کا سردار جب خطرناک ثابت ہوا تو عبدالرحمٰن نے اُسکو راہداری کی چٹھی دی اور اس طرح سے اُسکو اپنے ایوان میں آنے کی ترغیب دی۔ جب وہ وہاں پہونچا تو عبدالرحمٰن نے پہلے اپنے ہاتھ سے اسکے مار ڈالنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ یہ عرب بہت ہی زبردست ہے تو اپنے پہرے والوں کو اندر بلایا اور اُسکو قتل کروا ڈالا۔ تقریباً اسکے بعد فوراً ہی شمالی بربریوں کی بغاوت واقع ہوئی۔ دس سال اُنکے مطیع کرنے میں صرف ہوئے اور اسی اثنا میں یمن والے جو پ

سردار کے قتل کا انتقام لینے کو بیتاب ہو رہے تھے سلطان کو دارالخلافت سے غائب پاکر سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ انکو ابھی تک اس شخص کی مستعدی و ہوشیاری کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔ یہ باغی بربریوں کو اُنکے آپس کی جزئی رقابتوں سے فائدہ اُٹھا کر آپس میں لڑا چکا تھا اور اب اُس نے اپنا مدبرانہ جال یمن والوں کے آپس میں پھوٹ ڈالنے کو پھیلایا اس نے بربریوں کو جن سے یمنیوں کی فوج کا بڑا حصہ مرکب تھا دم دیکر ان سے برگشتہ کردیا یہاں تک کہ ان لوگوں نے عین لڑائی میں کنارہ کشی کی اور عبدالرحمٰن کے سپاہی اس بھاگنے والے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور نتیجہ یہ ہوا کہ تیس ہزار آدمی کھیت رہے۔ اور زمانے تک انکا بہت بڑا گنج شہیداں حالات دریافت کرنے والوں کی تماشا گاہ رہا۔ اسکے بعد وہ ہیبت ناک سازش ہوئی جو تین ناراض عرب سرداروں نے شارلیمین کے ساتھ کی تھی اور جس سے قریب تھا کہ وہ جال جسکو عبدالرحمٰن نے اسقدر تکلیفیں اُٹھا کر بنا تھا نیست و نابود ہو جائے۔ لیکن سرقسطہ اور رانسے ویلیس کے سامنے بغیر اسکے کہ وہ شخص جسکی تباہی کے لیے یہ سب جمع ہوے تھے ایک وار بھی کرے اُسکا خاتمہ ہو گیا۔

اسکے بعد سے سلطان باعتبار پہلے کے امن کے ساتھ اپنی فتوحات کے ثمرے سے متمتع ہونے لگا۔ اس نے اپنی بڑی مستحکم مرضی کے موافق ہسپانیہ کے کُل مخالف عنصروں کو دبا دیا۔ اور عرب کے اُن مغرور سرداروں کو جنھوں نے اُسکے سامنے تلواریں کھینچنے کی جرأت کی تھی نیچا دکھایا۔ باغیوں کے سرغناؤں کے سرکاٹے یا اُنھیں قتل کرایا۔ اور ثابت کر دیا کہ میں اس رتبے کے لائق ہوں لیکن ایسے بیرحم و دغاباز کا ظلم اپنی مکافات دیئے بغیر نہیں رہتا ظالم جبر سے چاہے اطاعت کرالے لیکن وہ جبر سے لوگوں کے دل ہاتھ میں نہیں لے سکتا اور جو سلطنت تلواروں سے لی جائے ضرور ہے کہ اُنھیں کے ذریعہ سے قائم بھی رکھی جائے۔ متدیّن لوگوں نے ایسے مالک کی ملازمت میں داخل ہونے سے انکار کیا جو عہد کر کے دھوکا اور قتل کر سکتا ہو جیسا کہ اسی سلطان نے کیا تھا۔ اُسکے پرانے

معاون جنھوں نے سب سے پہلے اُسکو ہسپانیہ میں خیر مقدم کیا تھا اب بد دل ہو کر اس سے الگ ہو گئے اسلیے کہ اس جابر کی بیرحمی کا پردہ فاش ہو گیا۔ اسکے خود اپنے رشتہ دار جو عباسیوں کے پنجے سے نکل کر جوق جوق اسکے دربار میں پناہ گزین ہوے تھے اس کے جبر و تعدی کو برداشت نہ کر سکے اور ان لوگوں نے بار بار اسکے تخت سے اُتار نے کے لیے جال پھیلائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں کے سر قلم ہو گئے۔ عبدالرحمن اندوہناک تنہائی میں چھوڑ دیا گیا اور زبان حال سے یہ شعر پڑھنے لگا ؎

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم حدیث دل بکہ گویم عجب غمے دارم

اُسکے پرانے دوستوں نے اُسکو چھوڑ دیا تھا اُسکے دشمن اگرچہ مجبور تھے مگر وہ بھی کچھ کم نہیں کوستے تھے۔ خود اُسکے رشتہ دار اور ملازم اُس سے پھر گئے۔ اسکی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ مخالفوں کے ساتھ مدت تک لڑنے نے اُسکی خلقی خوبی کو برباد کر دیا۔ اور کچھ یہ تھی کہ وہ سنگدل تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح سے اُن مجمعوں میں نہیں مل سکتا تھا جنکا قرطبہ کی گلیوں میں انبوہ رہتا تھا۔ ہر شخص سے بدگمانی تکلیف دہ خیالات میں غلطاں و پیچاں خونریزیوں کی یاد سے پریشان۔ غیر ملکوں کے مضبوط پہرے سے گھرا ہوا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر گلیوں میں سے جاتا تھا۔ چالیس ہزار افریقی سلطان کی اُن لوگوں سے حفاظت کرتے تھے جنکو اس نے اپنی ایڑی کے نیچے مسل ڈالا تھا اور یہ لوگ جسقدر اپنے آقا کے جس سے تنخواہ پاتے تھے جاں نثار تھے اُسی قدر ساری آبادی سے جنکو وہ دباتے تھے متنفر تھے۔ اس بیکسی و تنہائی کی حالت میں اُس نے ایک کھجور کے درخت پر جسکو اپنے آبا و اجداد کی زمین سے منگوا کر یہاں نصب کرایا تھا ایک نظم لکھی (اس لیے کہ اکثر اندلسی عربوں کی طرح کسیقدر شاعری میں بھی دخل رکھتا تھا) اس نظم میں اُسی درخت کے اپنے وطن سے جدا ہونے پر اپنے افسوس کیا ہے

میری طرح سے تو بھی عزیزوں سے چھٹ گیا یاروں کے غم سے تیرا بھی دل چور چور ہے

پیدا ہوا تھا تو بھی کسی اور ملک میں مولد سے اپنے آ کے پڑا تو بھی دور ہے

اس نے وہ کام پورا کر لیا جس کا اپنی نوجوانی کے حوصلے کے زمانے میں جس وقت یہ اجنبی وارث تن تنہا اک سلطنت کو تابع کرنے کیلئے آیا تھا منصوبہ باندھا تھا گر اپنی رعایا کے دلوں کو اپنے ہاتھوں سے کھو کر پورا کیا - یہ حسین جوان جو ہسپانیہ کے عربوں کی اطاعت و جاں نثاری حاصل کرنے کو آیا تھا - بتیس برس کے بعد نفرت انگیز جابر بنکر جسکا خون آلود تخت و تاج صرف کرایہ والوں کی تلواروں نے سیم وزر کے زور سے قائم رکھا تھا، قبر میں پہونچ گیا - اس نے ہسپانیہ میں تلوار کی حکومت کی بنا ڈالی اور اسکے جانشینوں کو مجبوراً یہی اصول باقی رکھنا پڑا - جیسا کہ عربوں کے بڑے مورخ نے کہا ہے اسکا سمجھنا آسان نہیں ہے کہ جب تک کہ دبانے کی سخت تدبیروں سے کام نہیں لیا جاتا عربوں اور بربریوں کے سرکش و متمرد فرقے کیونکر چین سے بیٹھے جاتے یا کیونکر طوائف الملوکی کو دفع کیا جاتا - اسلئے کہ ان دونوں قوموں میں سے کوئی بھی شخصی سلطنت کی عادی نہ تھی بایں ہمہ جو جبر و تعدی کہ اس طرح سے قائم رکھی گئی تھی باوجود ساری شان و شوکتوں کے جنکی چمک دمک دُور دُور تک پہونچی تھی اک غم انگیز منظر کا تماشا دکھاتی تھی - ایک قدیم عربی مورخ ابن حیان قرطبہ کے پہلے سلطان کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :-

"عبد الرحمن نرم دل اور رحم کی طرف مائل تھا - فصیح اللسان و سریع الاحساس تھا - کسی کام کے ارادہ میں جلدی نہیں کرتا تھا لیکن اُسکی تعمیل میں مستقل اور پختہ تھا - وہ مستعد و بے قرار آدمی تھا وہ کبھی آرام لینے کو نہیں پڑا رہتا اور نہ اپنے آپکو عیش و عشرت میں ڈالتا تھا - اُس نے کبھی سلطنت کے معاملات کسی اور شخص کے سپرد نہیں کیے بلکہ اُنھیں خود ہی طے کرتا تھا تاہم مشکل معاملات میں عقل و تجربے والوں سے مشورہ لینے سے کبھی باز نہیں رہا - وہ اک جانباز دلیر سپاہی تھا - ہمیشہ میدان جنگ میں سب سے پہلے خود ہی جاتا تھا - اپنے غصے میں ہیبتناک تھا اور مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا - جو لوگ اُسکے قریب جاتے تھے اُنکے دلوں

میں اُسکی صورت دیکھکر ہیبت طاری ہوتی تھی اس میں دوست اور دشمن دونوں برابر تھے — جنازوں کے ساتھ جانا اور جنازے کی نماز پڑھنا اسکی عادت میں داخل تھا۔ اور جمعے کے دن جو مسجد جایا کرتا تو اکثر منبر پر چڑھ کر لوگوں کو وعظ ونصائح کرتا تھا۔ بیماروں کی عیادت اور خوشی میں لوگوں کی شرکت کرتا تھا۔"

بلاشبہ یہ نوجوان عبدالرحمٰن کی تصویر اس سے پہلے کی ہے جب مخالفت وسازش نے اُسکو بیرحم وبدگمان بنا دیا تھا۔ اکثر اوقات قوت واقتدار اپنے مالکوں کو عیب طور سے سزا دیا کرتا ہے۔

جب کوئی جابر مرتا ہے تو عموماً یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی جگہ پر کون بیٹھے گا؟ اور عام جواب یہ ہوتا ہے کہ انقلاب طوائف الملوکی جس تخت کی بنیاد فولاد کی دھاروں پر ہوتی ہے وہ فوراً باپ کے بعد بیٹے کو نہیں ملتا۔ اسپر بھی خاندان عبدالرحمٰن کی عمارت اسکے جابر بانی کی وفات سے منہدم نہیں ہوئی۔ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ معاند قوتیں جنکو اس نے مشکل سے دبا رکھا تھا جب اُسکی وفات کے باعث شتر بے مہار ہوجائیں گی تو دونے زور کے ساتھ اُبھریں گی۔ لیکن یہ حالت نہیں ہوئی۔ اسکا سبب کچھ تو یہ تھا کہ اُس نے لوگوں کو اس درجہ خوف زدہ کردیا تھا کہ پھر پہلی سی جرأت کرنا اُنکے لیے آسان نہ تھا اور کچھ یہ کہ اُسکے جانشین میں لوگوں نے اُسکے باپ کے متضاد صفات دیکھے۔ (یعنی یہ ایسا شاہزادہ تھا کہ قابل محبت بھی تھا اور قابل عزت بھی) اسلیے لوگ کئی برسوں تک چپ چاپ رہے۔ ہشام جو ۷۸۸ء میں اپنے باپ کی جگہ پر بیٹھا۔ تیس برس کی عمر میں ساری خوبیوں کا نمونہ تھا اور گویا یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ اپنے مختصر سے زمانۂ سلطنت میں ان نیکیوں پر مستعدی کے ساتھ عملدرآمد کرے گا ایک نجومی نے پیشین گوئی کی تھی کہ اسکی زندگی کے کل آٹھ ہی سال باقی ہیں اس سلطان نے فطرتی طور پر اس مختصر مدت کو آخرت کے لیے تیاری کرنے میں صرف کیا۔ اسکی کمسنی میں اسکا محل علوم کے ماہروں۔ شاعروں۔ اور دانشمندوں سے بھرا رہتا تھا۔ اور

اور یہ لڑکا جوانی میں جیسا ہونے والا تھا اُسکے آثار اُسی وقت نمایاں تھے ؎

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

اسکے دینداری کے کاموں کی کوئی انتہا نہ تھی اور جو شخص مفلس یا ستایا ہوا ہوتا تھا اُس کو یقیناً اُسی کے یہاں پناہ ملتی تھی وہ معتمد علیہ پرچہ نویسوں کو اپنی سلطنت کے کُل حصوں میں اسلیے بھیجا کرتا تھا کہ ظلم کی جستجو کرکے اُسکو رفع کریں اور پارسائی کی باتوں کو رواج دیں۔ وہ راتوں کو گلیوں میں گشت کرواتا تھا تاکہ بدمعاشی و بُرائی کے افعال؛ جو نے پائیں اور جو جرمانے کہ یہ لوگ بدکاروں سے وصول کرتے تھے وہ اُن نکوکاروں میں تقسیم ہوتے تھے جنکو بارش یا سردی بھی رات کے وقت مسجد جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ سلطان بنفس نفیس بیماروں کی عیادت کو جاتا اور اکثر آندھی پانی کی راتوں میں پرہیزگار بیماروں کو کھانا پہنچانے اور اُنکی تیمارداری کرنے کو باہر نکلتا تھا۔ باوجود ان سب باتوں کے وہ کچھ نامرد نہ تھا۔ یہ اپنے سپاہیوں کو شمال کے عیسائیوں کے مقابلے میں پکے عرب سپاہی کی طرح لڑانے کو لیجایا کرتا تھا اور اگرچہ محبت سے لوگ اسکو العزیز اور العادل کہتے تھے لیکن جس وقت اسکے چچاؤں کی سازشوں سے اُسکی سلطنت کے لالے پڑگئے تو جس قدر کڑے پن کی ضرورت تھی اس نے دکھلائی۔ اس نے اپنے مملوکوں یعنی باڈی گارڈ کی تعداد بڑھائی اور ان میں سے ایک ہزار ہمیشہ رات دن دریا کے دونوں جانب اُسکے ایوان کی حفاظت کیلیے مامور الخدمت رہتے تھے۔ یہ شکار کا شائق تھا۔ تاہم اس قدر محتاط تھا کہ جب اس نے قرطبہ کا پُل دوبارہ بنوایا جو آج تک قائم ہے تو یہ سُنکر کہ میری رعایا یہ سرگوشیاں کرتی ہے کہ میں نے یہ بڑا کام صرف اس لیے کیا ہے کہ میری شکاری جماعتوں کو زیادہ سہولت ہو تو اُس نے عہد کرلیا کہ میں کبھی اس پُل پر سے نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ اُسپر ہوکر کبھی نہیں گیا۔ قبل اسکے کہ وہ آٹھ برس پورے ہوں یہ نمونے کے قابل شہزادہ اُس جنت الفردوس کو سدھارا جس کا کامل استحقاق اُس نے حاصل کیا تھا۔ اور اُس وقت یہ امر آشکارا ہوگیا کہ اس کی

نیکوکاری ہی اس کا سبب ہوئی تھی کہ سلطنت میں بغاوت کا ایک جدید عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ یہ نیا عنصر اسلام کے دینی پیشواؤں کا اقتدار تھا۔ دینی پیشوا کا لفظ پورے طور پر صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اسلام میں کوئی دینی پیشوائی ٹھیک ویسی نہیں ہے جیسی کہ کیتھولک عیسائیت میں ہے۔ جو لوگ کہ نمازیں پڑھاتے اور جمعے کے دن مسجدوں میں وعظ ونصائح کیا کرتے ہیں وہ دنیادار ہوا کرتے ہیں جو اپنی دکانیں یا اور پیشے چھوڑ کر آتے اور اُس وقت کے لیے امام و پیشوا بنا دیئے جاتے ہیں۔ اسلام میں دنیاوی و دینی آدمیوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ باایں ہمہ بعض اور ایسے ہیں جو کم و بیش اُس سے ملتے جُلتے ہیں جسکو ہم دینی پیشوائی کہتے ہیں۔ اسلامی ملکوں میں ہمیشہ ایک جماعت ایسے لوگوں کی رہتی ہے جنکی زندگی خاصکر مذہب ہی پر وقف رہا کرتی ہے۔ ایسے لوگ چاہے خاص طریقے کے فقرا ہوں یا صرف دینیات پڑھنے والے کسی مشہور عالم کے تلامذہ جنکے مسائل نے اُن میں غیر معمولی مستعدی و گرمجوشی پیدا کر دی ہو۔ یا قرآن خواں ہوں یا مدرسے کے مدرسین۔ ایسا گروہ ساری اسلامی دُنیا میں ملتا ہے اور ہر اسلامی ملک میں ان کا لحاظ رکھنا ضرور ہوتا ہے۔

القاہرہ میں جامع الازہر کے طلبا۔ قسطنطنیہ میں سوفسطا۔ اور بہت سے مشرقی شہروں کے ملّا نے ثابت کر دیا ہے کہ جوش و خروش کے زمانے میں دینی حرارت کیا کچھ آگ لگا سکتی ہے عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد سب سے پہلی بغاوت اُس جانب سے ہوئی جس طرف سب سے کم خیال جاتا تھا۔ یہ بغاوت نہ عیسائیوں کی طرف سے ہوئی نہ عربوں یا بربریوں کے کسی مُلکی فرقے کی جانب سے۔ بلکہ اسلام کی جاں نثار اولادیعنی قرطبہ کے دینیات پڑھنے والے طلبا کی طرف سے۔

ان طلبہ میں زیادہ تر تعداد نومسلموں یا نومسلم کے بیٹوں کی تھی۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہسپانیہ والے بڑی خوشی سے اسلام قبول کرتے جاتے تھے اور اکثر نو ذمیوں کی طرح خود

مسلمانوں سے بھی زیادہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن اس پرلے سرے کا دانشمند اور اس غایت درجے کا دنیادار تھا کہ اُس نے فقیہوں کو اور خاص کر اُن لوگوں کو جن میں ہسپانیہ کا خون تھا اپنی سلطنت میں کوئی بالادستی کا اقتدار نہیں دیا تھا لیکن خدا پرست ہشام نے تو اس خطرے کو نہیں دیکھا اور اگر اسنے دیکھا بھی ہوتا تو ہرگز اسکو خطرہ نہ سمجھتا۔ اُسکو اس بات کا عشق تھا کہ ایسے مقدس لوگوں کو اپنا رازدار بنائے جو شرع کے سخت پابند ہوں۔ اور ان لوگوں میں جو عام طور کی دنیاوی طمع و حرص اور اقتدار کی آرزو بہت ہی پوشیدہ ہوا کرتی ہے اُسکو وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہوا کہ اس زمانے کے فقہا کا افسر ایک غیر معمولی ذہانت و فطانت کا آدمی مدینۂ منورہ کی نوآبادیوں میں سے ایک کا شاگرد رشید تھا۔ یہ ایک ایسا آدمی تھا جسکے لیے مذہبی حرارت اور ملکی اقتدار کا حرص جس نے بارہا قوموں کا ستیاناس کیا ہے سوہان روح تھا۔ اس شخص یعنی قاضی یحییٰ نے ہشام کے حسن عقیدت اور پارسائی سے یہ نفع حاصل کیا کہ قرطبہ کے فقہا کو رسوخ و اقتدار کی ایسی بلندی پر پہونچا دیا کہ جس سے اُسکے ہوشیار باپ عبدالرحمٰن کو قبر میں بھی بے چینی ہوئی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ جب تک یہ لوگ اپنے طور پر رہنے دیے گئے اُس وقت تک خیریت رہی۔ لیکن سنہ ۷۹۶ء میں جب نیکوکار ہشام نے جنت کی خوشبوؤں کے لیے اس دنیا کو الوداع کہا تو دربار کی حالت بالکل بدل گئی۔ نیا سلطان حکم مذہب سے کچھ بے سروکار یا کسی طرح برگشتہ نہ تھا لیکن خوشدل اور طرحدار تھا اور جو زندگی اسکے پیش نظر تھی اُس سے متمتع ہوتا تھا اور اُسکا میلان نفس کشی کی طرف نہ تھا۔ اس رویّہ کا آدمی متعصب فقہا کے نزدیک بالکل قابل اعتراض تھا۔ وہ اس سلطان کا ذکر پارسایانہ ہیبت کے ساتھ کرتے تھے۔ علانیہ اسکے راہ راست پر آنے کے لیے دعائیں کرتے اور اُسکے رُو در رُو اُسکی تذلیل و تحقیر تک کرتے تھے۔ جب اُن لوگوں نے دیکھا کہ اسکی عیش پسندی ناقابل علاج ہے تو اُسکے خاندان کے کسی اور شخص کو تخت پر بٹھانے کی ٹھیرائی۔ یہ سازش ناکام رہی اور بہت سے چوٹی کے امرا جو اس سازش

نسخہ حصول مراد انسانی

معدن تندرستی جاودانی

[illegible]

آتنک نگرہ گولیاں

اگرچہ آپ اس زمانہ میں حد سے زیادہ مبالغہ آمیز لفاظی اشتہاروں میں ملاحظہ فرمائینگے مگر ہم اس امر سے برکنار ہو کر صرف اتنا ہی کہنے کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ تندرستی کے خواہاں ہیں یا کہ آپ یا آپکے دوست کو کمزوری اعضائے رئیسہ یا کہ دوران سر یا کہ مرض نسیان جریان احتلام ضعف باہ یا کہ رقت سرعت وغیرہ وغیرہ امراض خبیثہ نے سخت تنگ کرکے ہر چہار طرف سے گھیر لیا ہے۔ اور علاج سے تنگ کر مایوس ہو رہے ہیں تو ہماری نوایجاد عالم تقویت بخش **آتنک نگرہ گولیاں** استعمال کرکے اپنی دلی مراد حاصل کریں اُسوقت آپ کو ہماری راست گفتاری کا بصدق جاں یقین ہو جائیگا۔ بڑے بڑے نامی گرامی مشہور و معروف ڈاکٹروں ویدوں طبیبوں نیز دیگر روشن ضمیر اصحابوں نے مذکور گولیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ تجربہ فرما کر انکو پُراثر اکسیر نافع تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گولیاں نہایت درجہ کی مقوی باہ و مصفی خون ہونے کے علاوہ بچپن کی تمام غلط کاریوں کے نقائص کو دُور کرکے حالتِ شیب میں عالم شباب کا ظہور بتلاتی ہیں۔ مرد و عورت دونوں کو مفید ہیں۔ انمیں رسائن مطلق نہیں بلکہ جڑی بوٹیوں سے ہماری نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں۔ ہر موسم میں انکا استعمال ہو سکتا ہے

قیمت ۳۲ گولیوں کا ڈبیہ ایک روپیہ علاوہ محصول۔

مزید آگاہی کیلئے ہماری کتاب "کام شاستر" جو اٹھارہ زبان میں ترجمہ شدہ ہے اور تخمیناً گیارہ لاکھ کے ہم مفت تقسیم کر چکے ہیں ہم سے مفت طلب کرکے ملاحظہ فرماویں۔ ملنے کا پتہ

وید شاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر کاٹھیاوار

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد — صہ
- البرامکہ ″ — سے

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق — ہہ
- تحقیق الجہاد مجلد — ہے
- اعظم الکلام ۲ جلد — سے
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۸ر
- حضرت سلیمان — ۴ر
- حضرت ہاجرہ — ۲ر
- حقیقۃ السحر — ۲ر
- یورپ و قرآن — ۳ر
- احسان عام — ار

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — سے
- نشاطِ عمر — عمر
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال دولھن — عہ
- حسن معاشرت — عہ
- اصلاح معیشت — ۴ر

منشی سید احمد مارہروی
- آثار اکبری — عار
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۴ر
- نساء المسلمین — ۱۲ر
- آثار خیر — عہ
- امرائے ہنود — عار

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — قسہ
- میڈیکل جورس پروڈنس — ے
- عروق کا فن تعمیر — ۲ر
- سفرنامۂ سید تحقیق نو — عہ
- بنگ ٹرنسٹول — ہر

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف — ۲ر
- اسلامی اخلاق — ۱ر
- ذکر الحبیب — ۲ر
- ذکر جمیل — ۵ر

مسٹر ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد — ہہ
- خیابان فارس ″ — سہ
- جنگل میں منگل — عار
- سیر ظلمات — عمر
- ڈراما جنگ روس و جاپان — عہ
- ایڈیٹر کا حشر — ۱۰ر
- معاشرت — ۶ر

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام — عہ
- پولیسین — ۸ر
- نیلی چھتری — ۱۲ر

سید احمد حسین بی اے
- القسمر — ۸ر
- النحل — ۱۰ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۴ر
- شمع و شاعر — ۴ر
- بلال — ار
- شکوہ — ار
- جواب شکوہ — ۳ر
- ملی ترانہ
- رموز بیخودی — عہ
- نالۂ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۴ر
- تصویر درد — ۴ر
- اکبری اقبال — ۴ر

بی اے مولانا راشد الخیری
- صبح زندگی — ہہ
- شام زندگی — عہ
- طوفان حیات — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- سات روحوں کے اعمالنامے — ۶ر
- الزہرا — ۱۲ر
- لڑکیوں کی انشا — ۸ر

مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن — عار
- لغات جدیدہ — عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — سے

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفیٰ — ہہ
- معارج الدین — ہہ

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — عمر
- روزنامہ باتصویر — ست
- ″ بلاتصویر — عمر
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قہر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- پیاری تنکڑی — ۲ر
- آیاتِ خطوط نویسی — ۱۰ر
- [illegible] خاتون — ۲ر
- اسلام کا انجام — ۴ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ
- میلاد نامہ — عہ
- کرشن بیتی — عار
- اردو دعائیں — ۲ر
- فلسفۂ شہادت — ۲ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۲ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۸ر
- جگ بیتی — ۲ر
- بچوں کی کہانیاں — ۶ر
- اسرار — ۴ر
- کم تو موت — ۵ر
- قبروں کے غیبی نوشتے — ۹ر
- [illegible] — ار
- پورا میگزین (۲ رسالے) — ۵ر
- ہمارے سیر دہلی — ہہ
- محرم نامہ — ار
- یزید نامہ — ہہ
- محفل نامہ — ۱۲ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — ۱ عہ
- حسن سرور ″ — ہے
- دیول دیوی — ہہ
- گورا — ہہ
- نیل کا سانپ — ۸ر
- جعفر و عباسہ — ۹ر
- قہر حسینہ (کامل) — ے

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — عمر
- الصدیق — عر
- المرتضیٰ — عہ
- سیاحت ہند مجلد — عار
- عربی بول چال ۲ حصہ — عہ
- کتاب الصرف — ۸ر
- کتاب النحو — ۵ر

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق — [illegible]
- ریاض الاخلاق — ۱۰ر
- سراج الاخلاق — ۱۰ر
- فن شاعری — عہ
- فنون لطیفہ — عہ
- خیالات — ہہ
- امثال — ہہ

منشی [illegible] الحسن فرید آبادی
- معلم سیاست — ۸ر
- تاریخ مصر جدید — ۸ر

منشی محمد حسن خاں
- ہاجرہ — عار
- ترکوں کی معاشرت — عار

مولانا عبداللہ العمادی
- تاریخ عرب قدیم — ہر
- علم الحدیث — ہر
- صناعۃ العرب — ۳ر

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ — عہ
- حیات جامی — ۱۲ر
- علوم عرب — عہ
- خواتین — عہ

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہؓ — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر
- کیوپڈ اینڈ سائیکی — ۶ر

سیماب اکبرآبادی
- سیرۃ خدیجۃ الکبریٰ — عہ
- بنت الرسول — ۵ر
- جام کوثر — ۵ر
- بہشتی جھومر — ۱۲ر

پروفیسر شہباز مرحوم
- کلیات نظیر اکبرآبادی — عار
- زندگانی بے نظیر — عہ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مرزا رجب علی سرور
- فسانۂ عجائب علی قلم ۱۲ر
- گلزار سرور ۸ر
- انشائے سرور ۶ر

مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی ۸ر
- ابوبکر شبلی عہ
- خواجہ معین الدین ۲ر
- عصر قدیم ۱۲ر
- دولت سپانیہ عرب ۸ر
- حروب صلیبیہ ۶ر
- مسیح اور مسیحیت ۱۲ر
- محذرات مجلد ۶ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم ۱۲ر
- مقدس نازنین ۱۲ر
- قیس و لبنیٰ ۱۲ر
- ایام عرب ۱۲ر
- فلورا فلورنڈا ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو ۱۲ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- خوفناک محبت ۱۲ر
- الفانسو ۱۲ر
- قلپاترا ۱۲ر
- فاتح مفتوح ۱۲ر
- جویائے حق ۱۲ر
- ایک خراب حصہ ۱۲ر
- تاریخ بغداد ۱۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۶ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۱۰ر
- طلسمی فانوس ۱۲ر
- طرحدار لونڈی ۱۲ر
- میٹھی چھری ۱۲ر
- کایا پلٹ ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- جشو ۲ر
- بچھڑی دلہن ۸ر
- کرم دھم ۱۲ر
- پی کہاں ۵ر
- کامنی ۱۲ر
- خدائی فوجدار ۱۲ر
- فسانۂ آزاد
- الف لیلہ
- سیر کہسار
- جام سرشار ۱۲ر

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا مئی ۱۰ر
- ارائتیں ۱۰ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۶ر
- بروگ ۵ر

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا
- لیلیٰ مجنوں ۸ر
- نوبہار ۲ر
- مثنوی امید و بیم ۴ر

منشی احمد علی مرحوم
- تاریخ تمدن ۱۲ر
- شباب لکھنؤ ۱۲ر
- مرقع اودھ ۸ر
- حرمان نصیب ۱۲ر

مسٹر عبد الماجد بی اے
- تاریخ اخلاق یورپ
- فلسفۂ جذبات ۲ر
- فلسفۂ اجتماع
- غذائے انسانی ۳ر
- فلسفہ کی تعلیم ۲ر
- زود پشیماں (ڈراما) ۸ر

پنڈت چکبست لکھنوی
- صبح وطن ۸ر
- گلدستۂ [illegible] ۱۲ر
- کملا ۸ر

مسٹر انیس احمد عباسی
- ہاجرہ کی کامیابی ۸ر
- بحری جنگ ۸ر

جلال مرحوم
- مضمون ہائے دلکش عہ
- نظم نگاریں عہ
- افادۂ تاریخ ۸ر
- تذکرۂ تانیث ۴ر
- منتخب القواعد ۴ر

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۱۲ر
- مسدس [illegible] ۶ر
- مسکفرن دلوسی ۲ر

منشی امیر حسن کاکوروی
- فسانۂ لارنس رتھ
- ورگزونسیڈا
- الدین لیلی

منشی رضا علی کاکوروی
- یادگار شرر ۲ر
- خیابان ۴ر
- ہفت گلشن ۸ر
- صبح وصل ۸ر
- تصویر عبرت
- بھولی ۸ر
- دو پھول ۲ر

منشی امیر [illegible]
- ہوا باز عاشق ۸ر

مولانا عبد الشکور
- اسد الغابہ عہ
- علم الفقہ ۲ حصے عہ

علامہ سید احمد
- حمایت اسلام حصہ اول عہ
- حصہ دوم ۱۲ر
- فن ہیئت ۹ر
- فن کیمسٹری ۶ر

مسٹر شبیر حسین قدوائی
- ذکر طیب عربی ۱۰ر
- مشیر
- عرض حال ار
- تعلیم نسواں ۳ر
- جذب دل ۸ر
- حاکم و محکوم ۴ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی ۱۲ر
- اصلاح زبان اردو ۴ر
- تذکرۂ آب بقا عہ
- گلدستۂ ظرافت

مطبوعات الناظر پریس
- [illegible]
- عبارات صلیبی ۱۲ر
- تسخیر فرانس ۸ر
- واقعات کربلا ۱۲ر
- الاحسان ۸ر
- سیلاؤ ابن زہی ترجمہ ۴ر
- حیات نظامی ۴ر
- تذکرۂ حزیں ۴ر
- مسکفرن دلوسی ۲ر
- ایکٹ دان [illegible] ار
- مصنوعی شوہر ۲ر
- زود پشیماں ۸ر
- نوبہار ۲ر
- کنولا (۲ جلد)
- مثنوی صبح امید ۴ر
- اصول نسخ ۸ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں ۴ر
- عورتوں کی انشا عہ
- اساس التعلیم
- شعر العجم حصہ اول
- حصہ دوم
- کلام شبلی ۱۲ر
- [illegible] ۴ر
- [illegible] عہ
- مقالات ارسطو ار
- جمیل و [illegible] ار

ناظم کتب [illegible] لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر		بسم اللہ الرحمن الرحیم		ل ۴۷۸

قیمت سالانہ ۵ روپے		قیمت فی پرچہ ۸/

الناظر

ایڈیٹر ــ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۰	یکم اگست سنہ ۱۹۱۸	جلد ۱۹

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

اُردوئے معلّٰی	۱۲ر
عود ہندی	۱۰ر
دیوان غالب قسم اعلٰی	۱۲ر
" متوسط	۶ر
" مع شرح حسرت موہانی	عہ

مولانا حالی مرحوم

یادگار غالب	عہ
حیات سعدی	۱۲ر
مضامین حالی	۱۲ر
مجموعہ نظم حالی	۱۲ر
مسدس حالی	۴ر
شکوہ ہند	۲ر
مثنوی حقوق اولاد	۲ر
رباعیات حالی	۲ر
قطعات حالی	۲ر
مرثیہ مرزا غالب	ار
بیوہ کی مناجات	۲ر
الدین یسر	۳ر
تحفۃ الاخوان	۵ر
رحم و انصاف	ار
چپ کی داد	ار
تنگ خدمت	ار
جھوٹ اور ایک کا ناظر	ار
حب وطن	ار
تعصب اور انصاف	ار
تدبیر	۲ر

سر سید احمد خاں مرحوم

مضامین تہذیب الاخلاق مجلد	۱۲ر
تفسیر القرآن (۶ جلد)	عہ
تبیین الکلام (۳ جلد)	۱۲ر
آثار الصنادید	۱۲ر
خطبات احمدیہ	۱۲ر
مکمل مجموعہ لکچر مجلد	۱۲ر
سیرۃ فریدیہ	۱۰ر
اسباب بغاوت ہند	۶ر
مقالات سرسید	عہ
آخری مضامین سرسید	۱۲ر
النظر فی بعض مسائل	۱۲ر
تحریر فی اصول التفسیر	۸ر
احکام طعام اہل الکتاب	۶ر
ترقیم فی قصہ اصحاب کہف	۶ر
ازالۃ الغین	۵ر
تفسیر السموات	۸ر
جواب امہات المومنین	۴ر
الدعاء والاستجابہ	۳ر
کاشتکاری	ار
ایک نادان خدا پرست	ار
انشاء اللہ	ار
خلق الانسان	۲ر
الجن والجان	۵ر
مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی	۲ر
مہدی آخر الزماں	۲ر
مکاتبات الخلان	۱۲ر
ابطال غلامی	عہ

مولوی نذیر احمد مرحوم

ترجمۃ القرآن کلاں مجلد	[illegible]
" متوسط	[illegible]
ترجمہ حمائل شریف	۱۲ر
ادعیۃ القرآن	۶ر
دُہ سورہ	۸ر
مطالب القرآن	عہ
الحقوق والفرائض ۳ جلد	[illegible]
اجتہاد	۱۲ر
امہات الامہ	۱۲ر
مرأۃ العروس	۸ر
بنات النعش	۸ر
توبۃ النصوح	۸ر
مجموعہ نظم بے نظیر	عہ
چند پند	۶ر
منتخب الحکایات	۶ر
مبادی الحکمۃ	۱۰ر
مواعظ حسنہ	۱۲ر
رویائے صادقہ	عہ
ابن الوقت	عہ
ایامیٰ	۱۴ر
فسانۂ مبتلا	عہ
لکچروں کا مجموعہ	عہ
لکچر نمبر ۲۳ و ۲۴	۳ر
لکچر نمبر ۲۵ مع ترجمہ سپاسنامہ	۴ر
لکچر نمبر ۲۶، لکچر تعلیم	۲ر
نصائح المسلمین ۴ر، آزادیٔ نسواں	ار
رسم خط ۲ر، اتمام حجت	ار

مولانا شبلی مرحوم

الفاروق	۱۲ر
الغزالی	۱۲ر
المامون	۱۲ر
سیرۃ النعمان	۱۲ر
سوانح عمری مولانا روم	۱۲ر
بیان خسرو	۱۰ر
علم الکلام	۱۲ر
الکلام	۱۲ر
سفرنامہ مصر و شام و روم	۱۲ر
رسائل شبلی	عہ
مقالات شبلی	۱۲ر
مضامین عالمگیر	۱۰ر
شعر العجم جلد اول	عہ
" جلد دوم	۱۲ر
" جلد سوم	۱۲ر
" جلد چہارم	۱۲ر
مثنوی صبح امید	۴ر
آغاز اسلام	۱۲ر
اسلامی حکومت	۲ر
زیب النسا	ار
جہانگیر	۲ر
مجموعہ کلام شبلی	۱۲ر
دیوان شبلی فارسی	۸ر
بوئے گل "	۴ر
دستۂ گل "	۴ر
برگ گل "	۴ر
قصیدۂ امرتسر	۲ر

مولانا آزاد مرحوم

آبحیات	۱۲ر
دربار اکبری	[illegible]
سخندان فارس	۱۲ر
نیرنگ خیال	۹ر
نظم آزاد	۱۲ر
قند پارسی	۱۰ر
قصص ہند	۸ر
نصیحت کا کرن پھول	۸ر

نواب محسن الملک مرحوم

مضامین تہذیب الاخلاق مجلد	۱۲ر
مسلمانوں کی تہذیب	۴ر
مکاتبات الخلان	۱۲ر
تقلید و عمل بالحدیث	۸ر
مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب	۸ر
کتاب المحبۃ والشوق	۸ر
فطرت اور قانون فطرت	۳ر
اسلام	۲ر
آیات بینات ۳ جلد	عہ
مجموعہ لکچر مجلد	۱۲ر

مولانا اسلم جیراجپوری

حیات حافظ	۱۲ر
حیات جامی	۱۲ر
علوم غرب	عہ
خواتین	عہ

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

تاریخ ہندوستان ۹ جلد	[illegible]
تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ	[illegible]
آئین قیصری	۸ر
کرزن نامہ	۱۲ر
فلسفۂ تمثال	۱۲ر
صحیفۂ فطرت	۱۲ر
تقویم اللسان	۶ر
تعلیم الانتظام	۹ر
جغرافیہ ریاضیہ	۱۲ر
معاون النصاب	۱۲ر
رسالہ علم ساخت	۱۱ر
محاسبات عظیم	۸ر
رسالہ علم تناسب	۶ر

مولانا شرر مرحوم

حیات ذہین	۱۲ر
ایشیائی شاعری	عہ
ادیب	۸ر
نور جہاں	۸ر
ٹیپو سلطان	۸ر
حیدر علی سلطان	۱۱ر
اُردو کی ڈالی	۳ر
قومی نظم	۴ر
مرقع تاجپوشی	عہ
مکالمہ مرد و عورت	۳ر
دُرِ شاہوار	۸ر
لغات النواتین	۱۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

افراد کا سبہ - از مولانا سید کرامت حسین مرحوم سابق جج ہائیکورٹ الہ آباد ۴ر کلیات اکبر خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کا کلام حصہ اول قیمت ۲ر

مطبوعات جدیدہ

مبادی علم انسان

یعنی انگلستان کے نامور فلسفی برکلے کی سب سے معرکۃ الآرا کتاب "پرنسپلس آف ہیومن نالج" Principles of human Knowledge کا ترجمہ جس میں مادیت کا ابطال ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ذہن سے باہر مادہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ از مولوی عبد الباری ندوی اسسٹنٹ پروفیسر دکن کالج پونہ۔ آخر کتاب میں ایک ۱۳ صفحے کی فرہنگ مصطلحات اضافہ کی گئی ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ

یعنی مولانا سید سلیمان ندوی کے اُن مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے اہل السنۃ والجماعت کی لغوی، معنوی تشریح، تاریخی بیانات، اُنکے مذہب کے اصول اولین کی تحقیق اور معقول و منقول کے اصول تطبیق پر رسالہ معارف میں لکھے تھے۔ قیمت ۱۰ر

جاہ و ثروت کی کش مکش

از منشی محمد اسلم عظیم آبادی۔ یہ افسانہ ۱۹۱۶ء میں الناظر میں چھپا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ اب کتابی صورت میں علٰحدہ چھاپا گیا ہے۔ قیمت ۳ر

داغ حسرت ۔ مصنفہ شاہزادہ شاہرخ میرزا تیموری گورگانی۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ ناول ہے جو دہلی کے قلعۂ معلی کی پاکیزہ زبان میں ہندوستان کی اس رسم قبیح کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے لکھا ہے جسکے رو سے بزبان لڑکیاں والدین کے رجحانات اور خاندانی تعلقات کی بنا پر بسا اوقات ایسے شوہروں کے حوالے کر دی جاتی ہیں جو طبعی طور پر لڑکی کے لئے نا مناسب ہوتے ہیں۔ قیمت ۸ر

آئینی اصلاحات ہند

۲۰ راگست ۱۹۱۷ء کو پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کا مطمح نظر یہ ہے کہ ہندوستان میں ذمہ دار آئینی حکومت قائم کیجائے۔ اس غرض کے لیے کہ ذمہ دار حکومت کی بنیاد ڈالی جائے وزیر ہند نے گذشتہ سال موسم سرما میں ہندوستان آکر مختلف فرقہائے آبادی کے ایڈریس لیے اور ملکی لیڈروں اور تمام فرقوں اور طبقوں کے نمایندوں سے ملاقاتیں کی تھیں اور اب اسکے متعلق ایک بڑی رپورٹ معہ اُن جدید تجاویز کے جو اُنکی رائے میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کیلیے اس ملک میں نافذ کرنا ضروری ہیں، گورنمنٹ کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں تھی جس سے اُردو خواں اصحاب مستفید نہیں ہوسکتے تھے لہذا اردو میں اسکا ترجمہ شایع کیا گیا ہے۔ جو صاحب چاہیں فوراً ایک جلد منگالیں ایسا نہ ہو کہ بعد کو نہ ملے۔ قیمت ۱۲ر

اسرار خودی

ڈاکٹر اقبال کی یہ مثنوی اب دوبارہ چھپکر تیار ہوئی ہے شائقین فوراً فرمایشیں بھیجیں ورنہ پھر تیسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت ۱۲ر

صرف تین نسخے

لارڈ بیکن ۔ یعنی اُسکے حالات زندگی اور اُسکا فلسفہ مصنفہ مولوی محمد عبد الستار فرنگی محلی مرحوم و مغفور۔ جسے مولوی عبد الحلیم شرر نے عرصہ ہوا ترتیب دیکر شایع کیا تھا۔ اسکے تین نسخے اتفاق سے ہاتھ لگے ہیں جن اصحاب کی فرمایشیں پہلے وصول ہونگی اُنھیں کو بھیجی جائیگی۔ قیمت ۸ر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار اور تلی کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے

آجکل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کا آپ دیکھتے ہونگے ان میں عموماً کونین رہتی ہے اسلیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک روک تو دیتی ہیں۔ لیکن آرام نہیں کر سکتی ہیں ایسے بخار کے سلیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار کی دوا چند روز میں ایکدم آرام کردینے کا دعوی خاص رکھتی اور عوام کا فائدہ مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت ہی کم رکھی گئی ہے اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) یہ ملیریا کے کیڑوں کو مارتی ہے اس سلیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے۔ (۳) یہ تلی کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۴ر شیشی خورد ۸ر محصولڈاک ۵ر دو شیشی ۶ر

قوت کی گولیاں

۴۳ سال سے تمام ہندوستان میں شہور ہو رہی ہیں طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس ٹلنکیا ڈانیا ملاکر یہ گولیاں بنی ہیں اس لیے مغز۔ ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعوی رکھتی ہیں۔ زیادہ محنت جوانی کی خرابی بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے چہرہ پر رونق اور جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ٹوٹتے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔ قیمت ۳۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتہ کی خوراک کا عہ ر محصولڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵ر

داد کا مرہم

ہر وقت کھجلانے سے آرام کرنا بہتر ہے۔ دیکھیے جناب مہاراجہ صاحب ریاست نشکر پور ضلع بھاگلپور سے کیا لکھتے ہیں یہ دوسرا موقع ہے کہ آپکے داد کے مرہم نے جادو کا اثر دکھلایا۔ جس سے میں نے ہر وقت کی پریشانی سے نجات پائی میں آپکا نہایت درجہ ممنون اور مشکور ہوں۔ اسکے استعمال کرانیوالے سبھی جناب مہاراجہ صاحب کیطرح سے مداح ہیں کیونکہ دو ہی تین مراتب کے استعمال سے بغیر کسی تکلیف کے ایکدم اچھا کر دیتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۴ر محصول ۵ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵۔ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

مطبوعات انجمن ترقی اُردو

انجمن ترقی اُردو کی کتابوں کی جس قدر زیادہ اشاعت ہوگی اُسی قدر انجمن اُردو زبان کی خدمت کرسکے گی۔ اسلیے جن بہی خواہان اُردو نے ابھی تک یہ کتابیں نہ منگائی ہوں وہ ایک ایک نسخہ کم سے کم انجمن کی اعانت کے خیال سے خرید کریں۔ یہ کتابیں بھی بجائے خود اُردو زبان کی بہترین علمی کتابیں ہیں۔

دورِ قدیم کی کتابیں

فلسفۂ تعلیم - حکیم ہربرٹ اسپنسر کی لاجواب کتاب جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کن بنیادی اصولوں کے ماتحت دینا چاہیے۔ قیمت ۸ر

القول الاظہر - علامہ ابن مسکویہ نے فلسفیانہ دلائل سے صانع عالم کا وجود اور نبوت کی حقیت ثابت کی ہے ۱۲ر

القمر - چاند کی ماہیت و حقیقت علوم سائنس کے رو سے، طرز بیان نہایت دلکش ہے۔ قیمت ۸ر

رہنمایانِ ہند مذہب ہنود کی اصل اور اُس میں جو جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُنکو بیان کرکے ہندوؤں کے اعاظم رجال اور باکمال شعرا کا تذکرہ لکھا ہے۔ قیمت عمر

امرائے ہنود - عہد مغلیہ کے ہندو علما و وزرا۔ اکابر مشاہیر عہدہ داران کے حالات۔ مسلمانوں کی کشادہ دلی اور بے تعصبی کا آئینہ۔ قیمت عہ

نپولین اعظم - اس حیرت انگیز انسان کی مکمل سوانحعمری کا مطالعہ قوموں کے انقلاب اور یورپ کی موجودہ جنگ کی بہترین تفسیر ہے۔ قیمت ۵ جلد ع‌عہ

تاریخ تمدن (حصہ اول) سر ہنری طامس بکل کی یہ فلسفۂ تاریخ جدید علمی دور کی بہترین تصنیف ہے جس کا ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ علامہ شبلی نے مصری ترجمہ پر ہندی ترجمہ کو علانیہ فضیلت دی ہے۔ قیمت ۱۲ر

دورِ جدید کی کتابیں

تاریخ تمدن (حصۂ دوم) حصہ اول کے مترجم منشی احمد علی بی اے ایل ایل بی مرحوم کے انتقال کے باعث دوسرے حصہ کی تکمیل مسٹر عبدالماجد بی اے سے کرائی گئی ہے قیمت عہ

مبادی سائنس - اس میں حیوانات۔ نباتات۔ حجریات و معدنیات کے بنیادی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ قیمت عہ

فلسفہ جذبات - علم النفس کے شعبۂ جذبات پر مسٹر عبدالماجد کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اُردو کیا معنی فارسی، عربی و ترکی کسی زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ حالانکہ معیشت کامل کے جتنے عناصر ہیں سب کیلیے اس علم کی تحصیل لازمی ہے۔ قیمت عہ

فلسفۂ اجتماع - مسٹر عبدالماجد کی دوسری تصنیف۔ فلسفۂ جذبات میں افراد کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے اور اس میں جماعات کی نفسیاتی حالت دکھائی گئی ہے۔ قیمت عہ

تاریخ اخلاق یورپ - قدیم زمانہ کے حکما نے قوموں کے اخلاق کو اپنے فلسفیانہ نظریات کے سانچے میں ڈھالکر کیسے کیا

بنا دیا تھا۔ قوموں کے عروج و تنزل میں ان حکما کا جو حصہ تھا اُسکی تاریخ کا مطالعہ اُن اقوام کی زندگی پر بہت کچھ اثرانداز ہوسکتا ہے جو آج ارتقائی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ قیمت ۱ے ر

طبقات الارض - اس علم پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ماہر فن سے لکھوائی گئی ہے۔ قیمت عہ ر

مقدمات الطبیعیات - علوم طبیعی اسوقت دنیائے تمدن پر حکمرانی کر رہے ہیں، مگر اُردو زبان میں کوئی مبسوط و جامع کتاب اس فن کی نہ تھی۔ یہ لاجواب کتاب انگلستان کے مشہور عالم ہکسلے اور بعض دیگر ماہرین فن کی کتابوں سے اخذ کرکے لکھی گئی ہے۔ عہ ر

البیرونی - علامہ حکیم ابوریحان بیرونی کی قابل دید سوانح عمری اور اُنکی تصانیف پر تبصرہ۔ قیمت عہ ر

مشاہیر یونان و روما - حکیم پلوٹارک یونانی کی زندہ جاوید کتاب جس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انگریزی زبان میں جس شخص نے اسکا ترجمہ کیا اُسے حکومت برطانیہ کی طرف سے "نائٹ" کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں نے قوموں کی زندگی میں انقلابات پیدا کر دیے ہیں۔ انقلاب فرانس کا بانی روسو اسے پڑھکر وجد کرتا تھا۔ ملک الشعرائے انگلستان ولیم شیکسپیر اسی کا ذلہ ربا ہے۔ قیمت ۱۲ ر

دریائے لطافت - سید انشاء اللہ خاں انشا کی لاجواب کتاب مناسب ترمیم و اختصار کے بعد دوبارہ شایع کیگئی ہے اُردو زبان کے متعلق اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے قیمت ۱۲ ر

علم المعیشت - پولیٹکل اکانومی پر ایک عرصہ ہوا ڈاکٹر اقبال نے ایک کتاب لکھی تھی۔ گو جب یہ جامع اور مبسوط کتاب شایع ہوئی تو انھوں نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کو طبع کرانے سے انکار کر دیا۔ اس علم پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ جس میں اکانومکس کے تمام اصول کو ہندوستان کے حالات سے خاص طور پر بذریعہ امثلہ تطبیق دیگئی ہے۔ قیمت ۸ ر

تاریخ یونان قدیم - یونان و روما کی داستان عروج گو اب قصۂ پارینہ ہوچکی ہے مگر حق یہ ہے کہ دنیا کا موجودہ تمدن انھیں نامور قوموں کی اولوالعزمیوں کا نتیجہ ہے اسلیے اقوام موجودہ انکی تاریخ سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتی ہیں۔ یہ تاریخ اسی نقطہ نظر سے مرتب کرائی گئی ہے۔ اور اپنی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے دور حاضرہ کی بہترین تالیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ قیمت عہ ر

خلافت اندلس - یعنی عربوں کی ہشت صد سالہ حکومت اندلس کی تاریخ - از نواب ذوالقدر جنگ ایم اے بیرسٹرایٹ لا - اس لاجواب کتاب کے تھوڑے ہی نسخے رہ گئے ہیں۔ قیمت صہ ر

اُردو کا نیا قاعدہ - جو انجمن ترقی اُردو نے ملک کے اہل الرائے اصحاب کے مشورہ سے تیار کرایا ہے۔ اپنے بچوں کی تعلیم اگر عمدہ اصولوں کے مطابق کرنا منظور ہے تو دوسرے مروجہ قاعدوں کے بجائے اس قاعدہ کو پڑھائیے جس سے طلبا کی ذہنی و دماغی ترقی میں خاص مدد ملے گی قیمت ۲ ر

کلید قاعدہ - جو معلمین انجمن کا شایع کردہ قاعدہ پڑھائیں اُنکی ہدایت کے لیے یہ کلید مرتب کی گئی ہے۔ قیمت ۲ ر

المشتہر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

شریف بیبیوں کے مطالعہ کی کتابیں

بنت الوقت - شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم نے "ابن الوقت" لکھا تھا اب زمانہ نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ مولوی عبدالراشد الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت کو "بنت الوقت" لکھنا پڑی۔ جدید تہذیب تمدن نے ہماری خواتین کو جن بربادیوں میں مبتلا کردیا ہے اُسکی اصلاح کے لیے یہ کتاب تریاق ہے۔ قیمت ۸ر

بچیوں سے دو دو باتیں - یہ آج اب کتاب شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم کی بہو صاحبہ نے خاص طور پر شریف مسلمان لڑکیوں کے لیے لکھی ہے۔ جس میں ضروری معلومات کا قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو الف لیلہ کے تتبع میں اُنیس راتوں (حصوں) میں تقسیم کیا ہے تاکہ ہر رات کو ایک حصہ پڑھا جائے۔ تعلیم یافتہ گھرانوں میں اسکی ایک ایک جلد ضرور رہنا چاہیے۔ قیمت ۱۲ر

بچوں کا پہلا سال - بچوں کی ابتدائی زندگی غیر معمولی توجہ اور احتیاط کی محتاج ہے۔ اکثر بچے بے توجہی یا بے احتیاطی سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اُنکے عوارض سے واقف ہونا اور انکو مناسب طور پر دفعہ کرنا ہر ماں کا اولیں فرض ہے انکی غذا۔ انکی پوشش، انکے سونے، جاگنے، رونے غرضکہ ہر بات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مختصر رسالہ اسی مقصد کیلیے نہایت آسان زبان اور سلیس پیرایہ میں لکھا گیا ہے جسے کل شریف بیبیوں کو زیر مطالعہ رکھنا چاہیے قیمت ۴ر

ازواج الانبیا - آں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سوا دیگر انبیا علیہم الصلوۃ والسلام کی ازواج مطہرات کے حالات۔ قیمت ۸ر

نظربندوں کی اعانت کے لیے

دہلی میں انجمن نظربندان اسلام کے نام سے ایک مرکزی مجلس قائم ہوئی ہے جو مختلف طریقوں پر سرمایہ فراہم کرکے نظربندوں کو ماہ بماہ روپیہ بھیجتی ہے تاکہ یہ فدایان ملت کم سے کم ضروریات زندگی آسانی سے فراہم کرسکیں۔ اس انجمن کی طرف سے جو رسائل وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں انکا مقصد دوگونہ خدمت ہے ایک تو نظربندوں کے حالات سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ دوسرے اُنکے فروخت سے جو نفع ہو اُس سے نظربندوں کی اعانت کرنا۔

مندرجہ ذیل کتابیں انجمن نظربندان کے دفتر سے ہمارے پاس بغرض فروخت آئی ہیں:

شیخ الہند - یعنی حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح و حالات اسیری۔ قیمت ۴ر

مجموعہ کلام جوہر - یعنی مسٹر محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کا وہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام جو زمانہ نظربندی میں کہا گیا۔ قیمت ۲ر

چند اہم خطوط - جن میں مسٹر محمد علی و مسٹر شوکت علی کی نظربندی کے مفصل حالات درج ہیں۔ قیمت ۴ر

مندرجہ بالا خطوط کا انگریزی ترجمہ۔ قیمت ۴ر

دیوان حسرت موہانی حصہ چہارم - اسکی کُل غزلیات جیل خانہ میں کہی گئی ہیں اور مولانا حسرت کے خاص انداز شاعری کا تازہ نمونہ ہیں۔ یہ دیوان انجمن کی طرف سے اُن لوگوں کو مفت دیا جائے گا جو مولانا حسرت کے قرضہ کی ادائی کیلیے تین روپیہ عنایت کریں اور مولانا حسرت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آزاد ہونے کے بعد ۱۲ کی قیمت کی کتابیں اُن لوگوں کو ہدیۃً دیں گے۔ اس طرح آپ ہم خرما و ہم ثواب کے پورے مصداق بنجائینگے۔ لہذا تین روپیہ بھیجکر ایک جلد فوراً منگائیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۱ جلد ۱۹ — یکم اگست ۱۹۱۸ء

مذہب اور فلسفہ کا تعلق

تمہید دنیا اگرچہ ایک سیدھی سادی سرا ہے لیکن اعجوبہ نما ہے۔ یہاں پر ہر جگہ اجتماع ضدین نظر آتا ہے۔ یہ جمع المتناقضین بادی النظر میں صادق معلوم ہوتا ہے اور اسکی معقولی محالیت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر گل کے پہلو میں خار نمایاں ہے تو سر گنج پر مار میاں ہے۔ اگر اسوقت سورج کی روشنی سے عالم منور ہے تو پیش خیمہ شام تاریکیِ شب کا مخبر ہے۔ وہی نوجوان جنکے بال سیاہ آبدار دام بلا ہوتے ہیں ضعفِ پیری کا شکار ہو کر برف نما ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی نظر کو وسعت دیتے ہیں تو ہزاروں اقسام کی متضاد اشیا دکھائی دیتی ہیں اور مدرسہ سقراطیس کے تعلیم یافتہ تو ایسے وسیع النظر ہو گئے ہیں کہ انکو میدان گیتی میں کوئی چیز ہی ایسی نظر نہیں آتی جسکی نقیض دوسری چیز موجود نہ ہو بلکہ اسی مشاہدہ پر انکے اس نتیجہ کا استخراج مبنی ہے اور یہی انکی تحقیقات کی بنیاد ہے کہ "حقائق الاشیاء کا علم معرفت ضد سے حاصل ہوتا ہے"۔ فی الواقع یہ ایک نہایت معقول اصول ہے اور انسان و حیوان کی زندگیوں پر اسکا اطلاق پورے طور سے ہو سکتا ہے!! اس جہاں کے لامحدود وسیع میدان میں جس قدر جاندار پائے جاتے ہیں اُن میں ایسی خواہش پائی جاتی ہے جو ہر فرد و جزو میں یکساں پیوستہ ہے۔

اسکے امثالِ عقلی

آسایش کی خواہش عالمگیر ہے کوئی ہو خواہ انسان خواہ حیوان سب آرام کے لیے بیقرار ہیں اور

اور تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سانپ جب طاؤس کو دیکھتا ہے تو اپنے بامی میں جا چھپتا ہے اور جب کوئی اُسپر لکڑی مارتا ہے تو پیچ وتاب کھاتا ہوا بھاگ جاتا ہے کہ کہیں دوسری لاٹھی نہ پڑجائے یہی سانپ اپنی آتش اشتہا فرو کرنے کے لیے حشرات الارض کا شکار کرتا ہے، اپنے سونے کی جگہ ملائم باریک خاک بچھاتا ہے۔ بیا جو ایک مشہور چھوٹا پرندہ ہے اپنے آرام کے لیے گھونسلا بنا کر درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جگنو کو چونچ میں پکڑ کے لاتا ہے اور اپنے گھونسلے میں اس سے شمع کا کام لیتا ہے۔ آرام کے لیے ایک جھولا بھی اُسکے گھونسلے میں پڑا ہوتا ہے۔ وہ تکلیف سے بچنے کی یہ فکر کرتا ہے کہ گھونسلے میں آمد و رفت کا دروازہ نیچے کی طرف رکھتا ہے تاکہ بارش کے قطرے اُسکی خوابگاہ کو تر نہ کردیں۔ نیز وہ خاردار درختوں پر اپنا آشیانہ آویزاں کرتا ہے تاکہ سانپ وغیرہ درخت پر چڑھ کر اُسکو اذیت نہ دے سکیں۔ غرضکہ آرام کے حصول اور تکلیف سے نجات کے لیے عالمگیر خواہش ہے۔ درندے، پرندے، چرندے، اور خزندے ہر جانور آسایش کا متمنی اور رنج و تکلیف سے نجات پانے کا مستدعی ہے۔ بالخصوص انسان تکلیف سے بچنے کی فکر اور راحت کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے اور اسکی سرگردانی درست بھی ہے کیونکہ واہب العطایا نے انسان میں وہ جوہر عقل اور وہ جوہرِ نطق تفویض کیا ہے جسکی وجہ سے اشرف المخلوقات کی دستارِ فضیلت انسان کے سر پر بندھی ہے تمام قلوب انسانی کی یہی کوشش رہتی ہے کہ عیش و سرور حاصل ہو اور تمام دوراندیش تدابیر انسان اسی لیے بروے عمل لاتا ہے کہ درد و رنج سے خلاصی ہو لیکن ان ہر دو مقاصد کے لیے لازمی اور لابدی ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو سابقہ ہوتا ہے وہ اُنکی پوری پوری حقیقت و ماہیت اور نفع و نقصان سے واقف ہو جائے کیونکہ آرام انسان کے لیے طبعی نہیں بلکہ مکتسبی ہے لیکن چیزوں کے طریقۂ استعمال جاننے کے لیے آلات یا وسائل کی ضرورت ہے۔ پہلے وسائل جو اُسکو حاصل ہیں جسمانی اوزار ہیں اور یہ اوزار اُسکو ابتدائے ولادت سے اللہ تعالیٰ کے فضل و نوال سے عطا ہوے ہیں۔ نشانی جسمانی

حواس خمسہ کے ذریعہ تحصیل علم یہ پانچ قوتیں ہیں جو جسم انسانی پر پانچ مختلف عضووں میں صورت پذیر ہیں۔

پہلی قوت لمس ہے اور یہ تمام پوست بدن میں پھیلی ہوئی ہے لیکن ہاتھ اور انگلیوں میں اسکی قوت زیادہ ہے۔ لامسہ

دوسری قوت ذوق ہے اور یہ قوت زبان میں وجود رکھتی ہے۔ تیسری قوت شم ہے اور یہ قوت ناک میں رہتی ہے۔ چوتھی قوت سمع ہے اور یہ قوت کانوں میں موجود ہے۔ پانچویں قوت بصر ہے ذائقہ شامہ سامعہ باصرہ

اور یہ قوت آنکھوں میں قیام رکھتی ہے۔

محسوساتِ لمس | قوتِ لمس سے بارہ قسم کی چیزیں محسوس ہوسکتی ہیں (۱) گرمی (۲) سردی (۳) خشکی (۴) تری (۵) درشتی (۶) نرمی (۷) سختی (۸) سطبری (۹) سبکی (۱۰) گرانی (۱۱) باریکی (۱۲) سستی۔ لامسہ

محسوساتِ ذوق | قوتِ ذوق سے ہمکو نو قسم کی چیزیں محسوس ہوتی ہیں یعنی ہم اپنی زبان سے چکھکر نو طرح کے مزوں کا ادراک کرسکتے ہیں (۱) شیرینی (۲) تلخی (۳) شورئی (۴) چرپی (۵) ترشی (۶) تیزی (۷) قبوضت (۸) عفوصت (۹) دوائی۔ ذائقہ

محسوساتِ شم | قوتِ شم سے ہم صرف بو کا ادراک کرسکتے ہیں۔ اور بو کی اسوقت تک دو قسمیں ہی وضع ہوسکی ہیں۔ البتہ حکماے ہند نے بعض مزوں کو سونگھا جانے کے قابل لکھا ہے اور ترشی و تیزی وغیرہ کا نام رکھ لیا ہے مگر دوسرے حکما اسوقت تک خوشبو اور بدبو ہی بو کی قسمیں بتاتے ہیں۔ شامہ

محسوساتِ سمع | قوتِ سمع ہر قسم کی آواز محسوس کرسکتی ہے اور آواز کی دو قسمیں ہیں ایک حیوانی دوسری غیر حیوانی اور غیر حیوانی کی دو فروع ہیں طبعی اور آلتی۔ اور حیوانی کی دو نوعیں ہیں منطقی اور غیر منطقی۔ پھر منطقی کی دو شاخیں ہیں بربانی اور غیر بربانی۔ سامعہ

محسوساتِ بصر | قوتِ بصر سے دس طرح کی چیزوں کا احساس ہوسکتا ہے یعنی دس طرح کی چیزیں ہماری آنکھ دیکھ سکتی ہے (۱) نور (۲) ظلمت (۳) لون (۴) جسم (۵) سطح (۶) شکل (۷) وضع (۸) بُعد (۹) حرکت (۱۰) سکون۔ دنیا میں جسقدر چیزیں نظر آتی ہیں اُنکا علم ان حواس سے ہوجاتا ہے کیونکہ کوئی محسوس چیز ہو اُسکا علم دراصل اُسکی صفات کا علم ہے۔ باصرہ

انسانی علم کی وسعت | اس طرح انسانی علم کا زیادہ حصہ علم صفاتِ اشیا ہے۔ کیونکہ ہم جو چیز بھی محسوس کرتے ہیں وہ صفت ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک نارنگی میز پر رکھی ہے اب ہماری آنکھوں سے جو ہم محسوس کرتے ہیں وہ صرف اُسکی سرخی رنگ اور گولائی اور ایک خاص شکل ہے۔ اور ہم اپنے ہاتھوں میں صرف اسکے احساس کی قوت پاتے ہیں کہ اسکا چھلکا ملائم اور متخلل ہے اور سرد و تر ہے۔ اور اسی طرح دوسرے حواس سے نارنگی کے دوسرے صفات کا علم حاصل کرتے ہیں لیکن اب اگر ہم فرض کریں کہ سرخی رنگ اور گولائی وغیرہ اور ملائمت اور سردی اور تری اور شیرینی وغیرہ اس نارنگی میں نہیں تو فرمایئے کہ پھر کیا چیز باقی رہگئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز صرف اعراض کا مجموعہ ہے اور ہمارے

حواس صرف اعراض ہی کا علم حاصل کرسکتے ہیں۔ اور اس علم کے حصول کے واسطے شرط یہ ہی کہ چیز محسوس حواس کے مقابلہ میں عین انکے خارج موجود ہو۔ اگر کوئی چیز حاضر الوقت نہیں ہے تو اُسکا خیال یا علم بذریعہ حافظہ ممکن ہے لیکن حواس ظاہری اُسکے متعلق نفس کو خبر دینے سے متقاصر ہیں۔ جب ہم کسی صفت یا عرض کا تصور دل میں کرتے ہیں تو اُسکے ساتھ ہی موصوف یا محل عرض کا ہمرکاب تصور ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سفیدی ایک صفت یا عرض ہے گر کوئی سفیدی کو سفید چیز سے الگ کرکے نہیں بتا سکتا۔ لہذا عرض کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ وہ ہر موجود جو اپنے وجود کے لیے دوسرے کا محتاج ہو عرض کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ ہر صفت کے لیے موصوف ہونا ضروری ہے تو ایسے موصوف کو ماننا لازمی ہوا جو صفت سے مبرا ہو۔

ذات شے کا خیال

ایسے موصوف کا خیال جو صفت سے مبرا ہو بادی النظر میں محال معلوم ہوتا ہے مگر نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کاغذ کی سفیدی زائل ہو جاتی ہے ایک مربع کاغذ کو مثلث بنا دیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کاغذ کاغذ ہی رہتا ہے۔ جب ایک صفت مٹ کر دوسری صفت بھی مٹ جاتی ہے تو پتہ لگتا ہے کہ ایسی چیز کا وجود ضرور ہے جس میں یہ صفات وجود پذیر رہتی ہیں۔ اسلیے حکماء نے متفقاً اس وجود بغیر صفت کا نام جوہر رکھا ہے اور اُسکی تعریف یہ ہے کہ جوہر وہ موجود ہے جو اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو بلکہ بالذات قائم ہو۔ یہ بالکل سچ ہے کہ حواس ظاہری سے صرف صفات کا علم ہوتا ہی لیکن اسکا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ جو چیز حواس ظاہری سے مُدرک نہ ہوتی ہو وہ معدوم ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جو حواس سے دریافت نہیں ہوسکتیں لیکن دوسرے قوائے انسانی اُنکو معلوم کرتے ہیں مثلاً علم حساب کو صفات سے اخذ کیا گیا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اسکو ہم بغیر امداد حواس ظاہری معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ ضرور ہی کہ اگر پہلے محسوسات کے علم سے مقدمات قائم نہ کیے جائیں تو ہرگز کسی معقول کا علم نہیں ہوسکتا تاہم اس سے یہ نتیجہ برآمد ہونا غلط ہے کہ جوہر چونکہ حواس سے محسوس نہیں ہوسکتا اسلیے جوہر نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ عرض کی نسبت جب کہا جاتا ہے کہ وہ بالذات خود قائم اور موجود نہیں ہوسکتا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مجموعۂ اعراض بالذات موجود ہو جائے۔ جو علمائے یورپ اس امر پر حجت کرتے ہیں اُنکی بات بالکل ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ دس صفر ملکر ایک بنتا ہے۔ چونکہ صفر خود کوئی چیز نہیں اسلیے تاوقتیکہ وہ اعداد کے ساتھ نہ استعمال کیا جائے اُس سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح عرض دراصل خود کوئی چیز نہیں ہے لیکن جب جوہر میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو ضرور وجود رکھتا ہے لیکن وجود

محتاج بالغیر۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جوہر عن الخارج وجود نہیں رکھتا بلکہ جس چیز میں تمام اعراض وجود رکھتے ہیں وہ جسم انسانی ہے یا ذہن انسانی ہے تو یہ امر سراسر مغالطہ دینا ہے کیونکہ ذہن انسانی اور چیز موجود عن الخارج کے درمیان بعد مسافت اس قدر حائل ہے کہ عرض اور محل عرض میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دنیا کی اشیا دیکھنے سے مترشح ہوتا ہے کہ ایک جوہر میں کئی کئی عرض ہوتے ہیں یعنی جوہر کی مقدار یا تعداد تھوڑی ہوتی ہے اور عرض کی تعداد یا مقدار زیادہ۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ زید کا ذہن انسانی " ج " تعداد اور مقدار کی اشیاء عن الخارج کیلیے جوہر ہے تو ہم فی الحال یہی فرض کیے لیتے ہیں مگر جب بکر زید کے ذہن کا تصور کرتا ہے تو آپ کے قول کے مطابق زید کا ذہن انسانی عرض ہوجاتا ہے بکر کے نفس ذہن کے لیے جو زید کے ذہن انسانی کے لیے اب جوہر ہے اس طرح جو پہلے جوہر فرض کیا گیا تھا اب عرض ہوگیا اور یہ محال ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نفس ذہن تمام اشیاء کے لیے جوہر نہیں ہے بلکہ نفس کُل تمام اشیاء کے لیے جوہر ہے۔ خیر میں اسکو بھی فرض کیے لیتا ہوں لیکن نفس کُل اللہ تعالیٰ ہے اور وہ محیطِ کُل اور لامحدود ہے اور ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اعراض کی تعداد جوہر سے زیادہ ہوتی ہے لہذا جب اللہ تعالیٰ کو جوہر تسلیم کیا تو لامحالہ ماننا پڑیگا کہ ماسوا اللہ ذاتِ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہے اور جب زیادہ ہے تو چھوٹی چیز بڑی چیز پر محیط ہو نہیں سکتی۔ اور چھوٹی چیز لامحدود بھی نہیں ہوسکتی۔ پس اس طرح نعوذ باللہ باری تعالیٰ لامحدود اور محیطِ کُل نہیں رہا۔ اور یہ محال ہے۔ لہذا لابدی ہے کہ جوہر عن الخارج موجود ہو۔ اور واضح ہو کہ جوہر یا حال ہے یا محل، یا حال و محل سے مرکب ہے یا نہ حال ہے نہ محل۔ جو جوہر کہ محل ہے اُسکو ہیولیٰ کہتے ہیں اور جو حال ہے اُسکو صورت، اور جو مرکب ہے وہ جسم ہے اور جو نہ حال ہے نہ محل نہ مرکب۔ پس اگر اجسام سے تعلق رکھتا ہے تو اُسکو نفس کہتے ہیں ورنہ عقل۔ مگر حکماء ہند نے نو جوہر تسلیم کیے ہیں پانچ تو عناصر یعنی خاک اور آب اور باد اور آتش اور مکان اور زمان اور جہت اور عقل اور نفس۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی محققین زیادہ ترقی کر گئے تھے۔

جوہر کا ادراک اور اُسکا معقول ہونا | ان جواہر متذکرۂ بالا سے کوئی بھی ہو ہم اُسکا وجود اپنے حواس ظاہری سے مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ حواس صرف صفات یا اعراض کا احساس کر سکتے ہیں اور ان جواہر کو جاننے والی تو ایک دوسری ہی چیز ہے جسکو عقل کہتے ہیں۔ جیسے آنکھ پر اگر دوربین لگایا جائے تو وہ دور تک ساحت کا نظارہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح عقل اگر حواس سے کام لیتی ہے

تو حواس اُسکے لیے دوربین سے زیادہ نہیں - اسلیے کہ ظاہر اگرچہ حواس سے دریافت ہوتا ہے - مگر

عشق ظاہر کو نہیں دیکھتی چشم انصاف کیا تکلف کہ بُری تیغ کا اچھا ہو غلاف

اس طرح جوہر کا ادراک عقل سے ہی ہوتا ہے -

حواس باطنی | علم حاصل کرنے کے اوزار حواس ظاہری کے سوائے اور کچھ بھی ہیں جنکو عقل کہتے ہیں۔ اُنکی بھی پانچ قسمیں ہیں اور یہ قوٰی دراصل کسی گذشتہ واقعہ کو پیش نظر کرنے کے لیے یا اور دوسری تدبیر کرنے کے کام میں آتے ہیں لیکن حواس باطنی بھی حواس ظاہری کی طرح پانچ ہی ہیں - حس مشترک - خیال - حافظہ - واہمہ - اور متصرفہ - تمام حواس ظاہری کا تعلق حس مشترک سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر ہر قسم کے جذبات محسوسات اور دلی خیالات کا انکشاف نفس کو ہو جاتا ہے اور حس مشترک کا خزانہ خیال ہے - حافظہ کا یہ کام ہے کہ جتنے امور خیال میں جمع ہوں اُنکو بحفاظت رکھے اور نفس کی خواہش پر جیسبہ اُسکے روبرو پیش کرے - متصرفہ کا یہ کام ہے کہ حافظہ کی ان باتوں پر غور کرکے تصرف عمل میں لائے - اور واہمہ میں ایک خلاقیت کی قوت ہے کہ جب حس مشترک کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا اُسوقت واہمہ دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے اور طرح طرح کی صورتیں نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے علاوہ ازیں واہمہ میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اُسکی مدد سے اپنے دشمن کو خواہ دیکھا ہو یا اُسکو نہ دیکھا ہو پہچان لیتے ہیں - زمانہ ماضی کی مشاہدہ کی ہوئی تمام چیزیں ہمارے حافظہ میں معکوس ہوتی ہیں اور اب آنکھوں سے جو چیزیں دیکھتے ہیں تو پہلی کی صورت اور اب کی صورت دونوں کا موازنہ دماغ کے اندر کرتے ہیں اور ایک نتیجہ پر پہونچتے ہیں - اسی کو استنباط عقلی کہتے ہیں - لیکن حکماے ہند ان دماغ کی قوتوں کے قائل نہیں ہیں - وہ کہتے ہیں کہ معقولات کا ادراک قلب سے ہوتا ہے یعنی قوتِ حفظ قلب میں موجود ہے اور جب انسان کسی چیز کا ادراک کرتا ہے تو قلب کا رُخ اگر نفس دیکھنا چاہتا ہے آنکھ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اگر سننا چاہتا ہے تو کان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور قلب کے ذریعہ حواس اپنے محسوسات کی خبر نفس کو پہونچاتے ہیں - چنانچہ مذہب اسلام وغیرہ میں پیروان تصوف کے خیال میں بھی قلب پر ہی پرتو انوار الٰہیہ پڑتا ہے اور دماغ سے بدرجہا زیادہ اشرف دل کو خیال کیا جاتا ہے -

حواس ظاہری اور باطنی سے تقسیم موجودات | ہر چیز کے معلوم کرنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا بذریعہ حواس ظاہری یا بذریعہ حواس باطنی - ہمنے اوپر بیان کیا ہے کہ محسوسات کو حواس ظاہری سے محسوس

کہہ سکتے ہیں لیکن غیر محسوسات کا علم صرف حواس باطنی کے ذریعہ سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ مقدمات تو مشاہدات پر قائم کیے جاتے ہیں مگر نتائج کا استنباط حواس ظاہری نہیں کر سکتے۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ حواس ظاہری جس چیز کو محسوس کرتے ہیں وہ صرف شے محسوس کی صورت یا صفات ہیں اور کوئی دوسری چیز نہیں مگر قاعدہ ہے کہ جو بات زیادہ عام اور محیط ہوتی ہے اُسکا ظاہر کرنا ضروری نہیں ہوتا اسلیے دوران گفتگو میں جوہر کہتے ہیں اور عرض مراد ہوتی ہے پس جن چیزوں کی صفات محسوس کیجا سکتی ہیں اُنکو محسوسات کہتے ہیں اور جن چیزوں کو حواس ظاہری سے نہیں جان سکتے اُنکو معقولات کہتے ہیں۔

موجودات عن الخارج | محسوسات کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حواس ظاہری سے علحدہ موجود ہوں یعنی حواس ظاہری کے اندر نہ ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ آنکھ صرف اُسی چیز کو دیکھ سکتی ہے جو اُسکے پیش نظر ہو مگر کسی طرح کے خیال کو دیکھنا اُسکی طاقت سے باہر ہے۔ پس ایسے محسوسات کو موجودات عن الخارج کہتے ہیں کیونکہ انکا وجود حواس کے اندر نہیں ہے بلکہ یہ حواس کے باہر وجود رکھتے ہیں۔

موجودات عن الباطن | برخلاف اسکے وہ چیزیں ہیں جنکو ہم حواس سے معلوم نہیں کر سکتے اُنکا علم ہمکو بذریعہ حواس باطنی ہوتا ہے۔ کیونکہ حواس کے محسوسات کی جو شکل و صورت ہمارے حواس باطنی میں موجود ہے اُسی کی ترتیب سے ہم کسی نئی چیز کے وجود کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً چار اور چار آٹھ ہوتے ہیں۔ اسکا علم ہمکو حواس ظاہری سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہماری آنکھ یا دوسرے حواس صرف چار چیزیں یا آٹھ چیزیں دیکھ سکتے ہیں مگر بغیر اُن چیزوں کی موجودگی کے وہ اسکا ادراک نہیں کر سکتے کہ چار اور چار آٹھ ہوتے ہیں پس جتنی ایسی چیزیں ہیں جنکا احساس حواس خمسہ ظاہری سے نہیں ہوتا ہے اُنکو موجودات عن الباطن کہتے ہیں۔ اس طریقہ سے دنیا کی تمام اشیا دو نوعوں پر منقسم ہوگئی ہیں ایک وہ جنکو حواس سے محسوس کیا جا سکتا ہے جنکو موجودات فی الخارج کہتے ہیں دوسرے وہ چیزیں جنکا ادراک حواس باطنی کرتے ہیں اور جو موجودات عن الباطن کے نام سے موسوم ہیں۔

موجودات عن الباطن میں اختلاف رائے کی وجہ | اللہ تعالیٰ نے حواس ہر انسان کو برابر عطا کیے ہیں لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی کو جاہل کہا جاتا ہے تو دوسرے کو عالم یا عاقل۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حواس ظاہری تو واقعی تمام انسانوں کو برابر برابر عطا کیے گئے ہیں لیکن حواس باطنی دراصل حواس ظاہری کے محتاج ہیں۔ اور جب حواس ظاہری کمزور ہوتے ہیں یا زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوتے تو لامحالہ حواس باطنی

بھی ضعیف ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مختلف العقل دنیا میں آدمی نظر آتے ہیں۔ میرے قول کی تصدیق اس مثال سے بخوبی پورے طور پر ہو جائیگی۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک آدمی ہے اور اُسکو گانوں میں نشو و نما پانے کا موقع ملا ہے نیز یہ بھی مفروض ہے کہ اُس نے کبھی کسی دوسرے گانوں کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے بلکہ بدقسمتی سے اپنے گانوں میں ہی رہکر تعلیم و تربیت پاتا رہا ہے۔ اور ایک دوسرا شخص ہے کہ اُس نے اپنے بچپن کا زمانہ ایک گانوں میں اور لڑکپن کا زمانہ دوسرے گانوں میں اور جوانی کا زمانہ ایک شہر میں گذارا ہے تو ہمکو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر آدمی گنوارپن کی باتیں کرتا ہے اور سراسر بیوقوف ہے لیکن یہ دوسرا بہت کچھ واقف ہے۔ پہلے آدمی کی رائے دوسرے آدمی کی رائے سے بالکل مختلف ہے مگر دوسرے آدمی کی رائے آگاہی اور تجربہ پر مبنی ہے اور پہلے آدمی کی رائے بیوقوفی اور جہل پر۔ اسکا سبب یہ ہے کہ حواس ظاہری پہلے شخص کے اس قدر چیزوں کا احساس نہیں کرنے پاتے ہیں جس قدر کہ دوسرے شخص کے حواس نے چیزوں کی حقیقت کا ادراک کیا ہے۔ اس طور سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے شخص کے دماغ میں واقفیت کا مادہ کم ہے اسلیے وہ جو کلیہ بناتا ہے اور جن نتائج کا استخراج کرتا ہے وہ ناواقفیت پر دال ہوتے ہیں برخلاف اسکے چونکہ دوسرے آدمی کے دماغ میں زیادہ واقفیت کا خزانہ ہے اسلیے اُسکی رائے بہت صائب ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حواس باطنی میں جو ترقی ہوتی ہے وہ حواسِ ظاہری کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن حواس ظاہری ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں کوئی رد و بدل ترقی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مٹھائی جیسی شیریں ایک گنوار کو محسوس ہوتی ہے ویسی ہی شیریں ایک عقلمند کو محسوس ہوتی ہے جو چیز مجھکو گول نظر آتی ہے وہ زید بکر عمرو خالد کو بھی گول ہی نظر آئیگی۔

قیام موجودات فی الخارج کے قوانین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حواس ظاہری جب تکہ اپنی اصلی حالت پر رہتے ہیں وہ وہی کام دیتے ہیں جسکے لیے وہ مخصوص ہیں اور ایک عقلمند بھی اُن سے وہی کام لے سکتا ہے جو ایک بیوقوف شخص۔ موجودات فی الخارج کے علم میں اسی لیے کوئی اختلاف نہیں ہے اور نہ اُن باتوں میں کوئی اختلاف پایا جاتا ہے جو اُنکے متعلق ہیں۔ انکے متعلقات میں ہی اُنکے قیام کے قوانین ہیں یہ وہ قوانین ہیں جنکا علم قیاس اقترانی سے فوراً ہی ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم زمین پر پانی برستا ہوا دیکھتے ہیں تو فوراً کہہ اُٹھتے ہیں کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں

حالانکہ محسوسات سے اسکا کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہم چھت کے نیچے بیٹھے ہوے سر پر بادلوں کو نہیں دیکھ سکتے گر ضرور اسپر یقین کرتے ہیں کہ بادل آسمان پر موجود ہیں پس اس قسم کے جتنے قوانین ہیں جن سے مشاہدات پر بحث کی جاتی ہے اور جنکا علم یقینی ہوتا ہے اُنکو موجودات عن الخارج کے قوانین کہتے ہیں۔

قیام موجودات عن الباطن کے قوانین لیکن وہ چیزیں جنکو ہم مشاہدہ نہیں کرسکتے اور جنکو ہم محسوس نہیں کرسکتے اُنکے بھی تو کچھ قوانین مقرر ہیں۔ مثلاً پچاس میں سے چالیس کم کیے جائیں تو دس باقی بچتے ہیں۔ اس بات کے لیے ایک تفریق کا قانون مقرر ہے جو ہر حساب کے طالب علم کو ابتدا میں ہی سکھلایا جاتا ہے لہذا ایسے جو قوانین ہیں اُنکو موجودات الباطن کے قوانین کہتے ہیں

قوانین موجودات عن الخارج موجب علم موجودات عن الباطن ہیں جس طرح محسوسات کے بغیر معقولات کا علم نہیں ہوسکتا اسی طرح قوانین محسوسات کے بغیر معقولات کے قوانین کا علم ہونا محال ہے جو باتیں ہم عن الخارج دیکھتے ہیں اُنھیں پر ہمارے تمام معلومات کا انحصار ہے۔ کوئی آدمی ایسی چیز کا ذکر نہیں کرسکتا جو اُسکے محسوسات سے باہر ہو۔ یہاں تک کہ خواب میں بھی ہمکو وہی چیزیں نظر آتی ہیں جنکو ہم محسوس کرچکے ہیں چنانچہ عن الخارج کے قوانین ہی عن الباطن کے قوانین ہوجاتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ کہ معلومات عن الباطن میں جو باتیں ہمکو معلوم ہوں اُنکے جاننے کو ہم کوئی نئے قوانین اختراع کرلیں لیکن ایسے قوانین کا موجب بھی قوانین عن الخارج ہونگے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اسکا علم ہمکو اُسی وقت حاصل ہوگا جب ہم دو اور دو چیزوں کو عن الخارج یکجا دیکھکر یہ معلوم کرچکے ہوں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ پس قوانین عن الخارج ہی علم عن الباطن کے موجب ہوتے ہیں۔ گر اسکا یہ ہرگز مطلب نہیں ہوسکتا کہ عن الباطن کی تمیز ہی نہ ہوسکے بلکہ جتنی عن الباطن کے متعلق ہم گفتگو کرتے ہیں اور اُسکے قیام کے واسطے جو قوانین ہمکو معلوم ہوتے ہیں اُنکو ہم عن الباطن کے قوانین کہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انکا انحصار قوانین عن الخارج پر ہے مثلاً علم حساب کے جتنے قواعد ہیں وہ سب عن الباطن کے قواعد کہے جاسکتے ہیں۔

فلسفہ کی تعریف مندرجۂ بالا تقسیم موجودات سے قوانین اولیٰ کی بھی تقسیم ہوگئی ہے اسلیے وہ قوانین اولیٰ متعلق موجودات عن الخارج جنکا اطلاق اشیاے عالم کے کون و فساد پر ہوسکتا ہے فلسفہ کے نام سے موسوم ہیں۔ لیکن ان قوانین سے بعض ایسے بھی ہیں جنکا اطلاق کون و فساد باطنی یعنی موجودات عن الباطن پر

پر بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ قوانین وہ کلیات ہیں جنکے جاننے سے دنیا کی ہر شے کی حقیقت سے واقفیت ہوسکتی ہے اور چونکہ تمام کلیوں کا تعلق دماغ سے ہے حواس ظاہری اُنکے محسوس کرنے میں قاصر رہتے ہیں اسلیے حکماے قرن جدید نے فلسفہ کو دماغی سائنس کہنا اختیار کیا ہے۔ علم فلسفہ کی مثال ایک مشعل سے دینا بہت مناسب ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک آدمی ہے اور تمام دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی ہے اور اُس آدمی کو دنیا کی کسی چیز کا علم نہیں ہے۔ اس آدمی کے نزدیک صرف (فلسفہ کی) مشعل ہے وہ جس طرف جانا چاہتا ہے اس مشعل کو ہاتھ میں لیے اسکی روشنی میں اُسی طرف بے خوف وخطر چلا جاتا ہے جس چیز کو دیکھنا چاہتا ہے دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ کے کلیوں کے جاننے سے ہر چیز کی حقیقت روشن ہوجاتی ہے۔

مذہب کی تعریف | موجودات عن الخارج کے قوانین کو تو فلسفہ کہتے ہیں مگر جو علم موجودات عن الباطن کے متعلق ہے وہ مذہب کہلاتا ہے۔ موجودات عن الخارج کے علم میں جیسا ہمنے بیان کیا کبھی کوئی اختلاف رائے مشکل سے ہوتا ہے اور انکے علم کو علم بدیہی سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر موجودات عن الباطن کے علم میں اکثر اختلاف ہوتا ہے اور اس اختلاف رائے میں جو مختلف رائیں ہوتی ہیں اُنکو آمنا وصدقنا تسلیم کرلینا اعتقاد کہلاتا ہے۔ مثلاً میرا جسم ہے تو میرے جسم کا جو علم حواس ظاہری سے ہوسکتا ہے وہ تو بدیہی ہے اور جو علم جسم کے اندرونی اعضا یا تشریح کے متعلق ہے وہ بھی اسی طرح بدیہی ہے اور ثبوت کا محتاج نہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جسم موجودات عن الخارج میں شامل ہے لیکن اب جان کیا چیز ہے؟ اسکا علم غیر بدیہی ہے کیونکہ جان حواس ظاہری سے محسوس ہونے والی چیز نہیں ہے اور جان کا تعلق موجودات عن الباطن سے ہے۔ اسی لیے جان کے بارے میں اختلافِ رائے واقع ہوگیا ہے کوئی کہتا ہے جان ایک قسم کا جسم ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نہ وہ جسم ہے نہ جسمانی۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک جسم لطیف ہے جو تمام اعضا میں سرایت کیے ہوے ہے بعض کہتے ہیں کہ لطیفۂ روح ہے جو دل کے بائیں جانب رہتی ہے۔ ایک گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ روح دماغی ہے دوسرا گروہ اسکا مدعی ہے کہ اخلاطِ اربعہ ہی جان ہیں کچھ لوگوں کا مقولہ ہے کہ خون ہی کا نام جان ہے کچھ لوگوں کا مقولہ ہے کہ مزاج کو جان کہتے ہیں۔ کسی کا یہ امر تسلیم کردہ ہے کہ انسان کی شکل ہی کو جان کہتے ہیں۔ اور بعض اُن

سے انکار کرکے کہتے ہیں کہ وہ صرف تالیف ہے۔ اس قسم کی ہر رائے کو ایک مذہب کہتے ہیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس جان کے متعلق یہ بات کہ یہ فانی ہے یا مرنے کے بعد کسی دوسری جگہ جاکر رہے گی یا اسکا سزا و جزائے اعمال دینے والا کوئی اللہ تعالیٰ ہے اور تمام باتیں جو موجودات عن الباطن سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب مذہب کہلاتی ہیں۔

مذہب میں فلسفہ لیکن جیسا کہ ہم کئی بار کہہ آئے ہیں کہ موجودات عن الباطن کا علم فلسفہ پر مبنی ہے فلسفہ سے ہماری مراد علم موجودات عن الخارج ہے کیونکہ جب کوئی مذہب جان کے متعلق کسی علم حاصل کرنے کا مدعی ہوتا ہے وہ ضرور ہے کہ کسی قانون فلسفہ سے ہی اسپر تدلیل کرے۔ بلکہ اسکا تدلیل کرنا تو دور، جان کے متعلق خیال بھی علم موجودات عن الخارج پر مبنی ہے اور منحصر۔ کیونکہ جب کوئی آدمی دوسرے لوگوں کو مرتے اور مٹتے دیکھ لیتا ہے تب ہی اسکو اپنی جان کے فانی یا باقی ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا انحصار سارا کا سارا فلسفہ پر ہے اور چونکہ انکا انحصار فلسفہ پر ہے اُسکے تمام قوانین اور اُسکے متعلقات کے علم میں جب تدلیل اور تعلیم کیجاتی ہے تو لامحالہ فلسفہ کی احتیاج ہوتی ہے

فلسفہ میں مذہب تقریر بالا سے واضح ہوتا ہے کہ مذہب کی علت فلسفہ ہے لیکن اس سے ہرگز اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا چاہیئے کہ فلسفہ کا مذہب معلول ہے۔ کیونکہ معلول اُسکو کہتے ہیں جو علت مادی سے ظہور پذیر ہوا ہو۔ کم سے کم اس جگہ تو ہماری یہی مراد ہے۔ موجودات عن الباطن کا وجود موجودات عن الخارج کے وجود کا محتاج نہیں ہے بلکہ آخرالذکر سابق البیان کے علم کی علت کہا جا سکتا ہے۔ ہر طرح سے علت میں معلول کا ذکر اور معلول میں علت کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ یہی حال فلسفہ اور مذہب کا ہے کہ فلسفہ یہاں پہ محتاج ہو جاتا ہے علم عن الباطن کا تو وہاں پہ مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح تمام علوم فلسفہ جب حد غائی کو پہونچتے ہیں تو مذہب کے استمداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلسفہ کا کوئی بھی علم ہو مگر چونکہ تمام علم موجودات کی علت غائی یہی ہے کہ اپنے نفس اور اللہ تعالیٰ اور معاش اور معاد کا علم حاصل کیا جائے اس لیے فلسفہ کی مدد سے مذہب کی باتیں سمجھنا لازمی ہے کیونکہ فلسفہ کا مقصود یہی ہے کہ ہر چیز کی علت غائی

کا علم دریافت کیا جائے - بعض لوگوں کو ہمارا یہ دعویٰ لایعنی معلوم ہوگا کیونکہ عوام کے خیال میں سب علوم "دنیا پرور" دن" کے لیے ہیں صرف علم الٰہی ہی ایک ایسا علم ہے جس سے خدا تعالیٰ کی معرفت مقصود ہے۔ لیکن اُنکا یہ خیال بالکل غلط ہے - اسی بات کے ثابت کرنے کے لیے میں چند علوم کی مثال پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہر علم کی علت غائی یہی ہے کہ اُس سے معرفت واجب الوجود حاصل ہو اور ہمارے ہر کام کے انجام دینے کی یہی غرض ہوتی ہے کہ آرام روحانی حاصل ہو گو ہم کسی وجہ سے یہ امر فراموش کردیں اور جسمانی صفات کا ہم پر غلبہ ہو جائے۔ لیکن اگر ہم غور سے ہر علم کو پڑھیں تو ضرور ہے کہ اُس سے دنیا اور عقبیٰ دونوں کے فوائد بے بہا اخذ ہو سکیں - یہ جنکا قول ہے کہ مذہب کی باتوں میں علم کا کیا کام ہے بالکل غلط ہے کیونکہ ع بے علم نتواں خدا را شناخت ٭ جاہل شخص ہرگز خدا کو نہیں پہچان سکتا - اظہر من الشمس ہے کہ ایک گنوار کے سامنے اگر کوہ نور ہیرا رکھدیا جائے تو چونکہ وہ جواہر شناسی کے علم سے واقف نہیں ہے وہ اسکی کچھ بھی قدر نہ کریگا بلکہ اُسکو صرف شیشہ کا ٹکڑا سمجھ کر عجب نہیں کہ پھینکدے لیکن اسی کوہ نور کو کسی جوہری کے نزدیک بھیجا جائے تو وہ اسکی بیحد قدر اور وقعت کرے گا کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے گا - اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے صفات علوم کے ذریعہ عالم شخص کے دل پر ظاہر ہوتے ہیں تو خدائے جل شانہٗ کی عظمت جیسی اُسکے قلب پر رونما ہوتی ہے ویسی ہرگز جاہل کے دل میں نہیں ہو سکتی اور اسی عظمت کی وجہ سے عالم عبادت الٰہی کو فرض خاص الخاص شمار کرتا ہے - چنانچہ جن لوگوں نے علوم اختراع کیے ہیں اور اپنے تجربات تحریر کیے ہیں اُنھوں نے خدا کی عظمت اور احترام کو دیکھا اور عبادتِ الٰہی میں معروف ہوکر رتبہ پر پہونچے - میں مضمون طویل ہو جانے کے خوف سے چند علوم سے ہی مذہب کے تعلق کو بیان کرتا ہوں - جسکو زیادہ مشرح تحریر دیکھنا منظور ہو وہ میری مولفہ کتاب آفتابِ حکمت مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ملاحظہ کرلے - مگر اس سے ہرگز کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف میرا رقم کردہ علم خداشناسی کا ذریعہ ہے اور دوسرے علوم سے خداشناسی حاصل نہیں ہو سکتی - بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ ذرہ ذرہ میں صنعت ایزدی آشکار ہے

علم العدد اور اسکا علم یقینی ہونا شلاً علم العدد ایک ایسا علم ہے جسکے بغیر دنیا کا معمولی کام بھی نہیں چل سکتا - ذرا ذرا سی باتوں میں ہمکو حساب کی حاجت ہوتی ہے - سلطنتوں کی آمدنی اور خرچ، گھر کے مصارف، کاروبار کے لین دین، بازار کا سودا سب اسی پر منحصر ہے لیکن اس علم کے اسقدر مقبول ہونے کی وجہ کیا ہے

اسکا سبب صرف یہ ہے کہ یہ علم یقینی ہے دوسرے علوم میں تو شکوک پیدا ہو سکتے ہیں اور اختلاف رائے ہوتا ہے مگر یہ وہ علم ہے جو کبھی غلط ہوتا ہی نہیں - جو حساب آج لگایا جائے وہ اگر پچاس برس کے بعد بھی لگایا جائے تو وہی کا وہی رہیگا خواہ لندن میں ٹھیکر اُسکو جانچو یا نیویارک جاکر اُسکی تنقیح کرواہیں کبھی اختلاف نہ ہوگا - دو اور دو چار ہوتے ہیں - اسکو ایک بچہ بھی کہے گا کہ ہاں دو اور دو چار ہوتے ہیں اور فریب سے فریبی بھی نہیں کہے گا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے - اکثر حکماے متأخرین مثلاً کینٹ وغیرہ اس علم کو اولیات سے شمار کرتے ہیں - القصہ اسکے مقبول عام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حساب میں کبھی غلطی نہیں ہوتی -

مذہب سے علم العدد کا تعلق اور خدا اور ماسوا پر اُسکا اطلاق | جن لوگوں نے علم العدد کی تعلیم پائی ہے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ علم العدد کیا چیز ہے اور اُس سے کتنے بڑے بڑے فائدے ہوتے ہیں تاہم اگر عوام علم کی باتوں سے واقف نہیں تو اسکے فوائد سے ضرور بہرہ یاب اور آگاہ ہیں - علم العدد کی بنیاد در اصل اعداد پر ہے - اور معمولی سے معمولی خواندہ اشخاص سمجھتے ہیں کہ اعداد کل دس ہیں - انھیں اعداد پر دوسرے اعداد باقاعدہ ترتیب دینے سے لاکھوں اور کروروں تک کا حساب ہو جاتا ہے - مگر فی الحقیقت اعداد صرف چار ہی ہیں کیونکہ ۱ - ۲ - ۳ - ۴ کو اگر آپس میں جمع کرو تو دس عدد حاصل ہو جاتے ہیں اور انھیں چار عددوں پر مراتب کی بنیاد ہے - کیونکہ اکائی، دہائی، سیکڑہ اور ہزار کے بعد دہائی وغیرہ شروع ہوتی ہیں - اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان چار اعداد ہی سے سارے دوسرے اعداد مرکب ہیں - اللہ تعالیٰ ہر مذہب والا تسلیم کرتا ہے کہ واحد ہے اسی طرح ایک کا عدد بھی واحد ہے اور جس طرح ایک سے دو بنتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے اور تین چار کی طرح نفس اور ہیولیٰ کی آفرینش ہوئی ہے اور جس طرح ان اعداد سے تمام دوسرے اعداد بنتے ہیں اسی طرح تمام دنیا کی پیدایش ان چار چیزوں (اللہ تعالیٰ - عقل - نفس - ہیولیٰ) سے عرصۂ ظہور میں آئی ہے - اللہ تعالیٰ کی مثال ایک کے عدد میں اسقدر کامل ہے کہ اکثر اعتبارات سے اُنکا تطابق ہو جاتا ہے - چنانچہ جیسے ایک کا وجود دیگر اعداد میں ہونا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام عالم میں محیط ہے جس طرح ایک میں کوئی دوسرا عدد شریک نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے جس طرح ایک کا عدد قبولِ قسمت نہیں کرتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی جزو پذیر نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس - علم العدد سے ایک بڑا مسئلہ خدا تعالیٰ اور عالم کے نامتناہی ہونے کا سمجھ میں آجاتا ہے کیونکہ اعداد کی نسبت کوئی نہیں کہہ سکتا - دس پدم

(ایک تعداد مقررہ) سے آگے سدد نہیں بڑھائے جا سکتے

علم ہندسہ اور اسکا مذہب سے تعلق یہی حال علم ہندسہ کا بھی ہے۔ دنیا میں ہزار ہا قسم کی اشکال دیکھنے سے روشن ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ نقطہ، خط، سطح۔ اور جسم سے جس طرح تمام اشکال صورت پذیر ہوئی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ، نفس، عقل، اور ہیولیٰ سے آفرینش عالم عمل میں آئی ہے جس طرح نقطہ کے بغیر کوئی شکل قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ نقطہ کا ہر شکل میں موجود ہونا اس بات پر دال ہے کہ خدائے تعالیٰ محیط کل ہے۔ دائرے سے عالم کا کروی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلث سے انسان کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ایک بڑا مسئلہ الٰہیہ ہندسہ کی تعلیم سے چٹکیوں میں حل ہوجاتا ہے کہ جس طرح نقطہ ہمکو نظر نہیں آتا اور غیر محسوس ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ غیر محسوس ہے مگر اُسکے وجود سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ تمام علما اور فقہا نے صاف طور پر لکھا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک عارف باللہ نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ علم ہندسہ اور علوم سے کما حقہٗ واقفیت نہ پیدا کرلے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ہر چیز کے علم کے واسطے پہلے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ مجہول سے مجہول ہی نکلتا ہے مگر برخلاف اسکے معلوم کے ذریعہ مجہول دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ وہ معلوم جس سے مجہول کا علم ہوتا ہے معلوم یقینی ہونا چاہیے کیونکہ صحیح مقدمات کے بغیر صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے پس خدا شناسی کے لیے پہلے علوم مذکورہ سے آگاہی حاصل کرنا لازمی ہے۔

علم موسیقی اور اُسکا مذہب سے تعلق موسیقی کا مذہب سے اسقدر تعلق ہے کہ دوسرے علوم اس قدر گہرا تعلق نہیں رکھتے۔ ہر جگہ ہر ملک میں لوگ اس علم کے شایق نظر آتے ہیں اور نفس کو اس سے ایک خاص حظ حاصل ہوتا ہے اسی لیے یہ علم زندہ جادو کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔ علم الٰہیات کے اکثر اصول اس سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اللہ سے دعا مانگنے میں، دل خوش کرنے میں، ماتم میں اور جنگ میں ہر حالت میں اس علم کا ظہور پایا جاتا ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ موسیقی نے مذہب پر کتنا عکس ڈالا ہے اور مذہب اس سے کتنا متاثر ہوا ہے۔

علم موسیقی کی بنیاد حرکت پر ہے کیونکہ ہر آواز حرکت سبب۔ وتد۔ اور فاصلہ کی ترکیب سے بنتی ہے آواز دراصل ایک تموج ہوا کا احساس ہے جو ہمارے کان دریافت کرتے ہیں۔ دو جسموں کے رگڑنے سے یا یکایک مماس ہونے سے یہ تموج پیدا ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تموج حرکت سے پیدا ہوتا ہے پس اگر

آواز "دَم" پیدا ہوتی ہے تو اُسکو سبب کہتے ہیں۔ اور اگر آواز "دم" نکلتی ہے تو اُسکو وتد اور اگر آواز "دم دم" نکلتی ہے تو اسکو فاصلہ کہتے ہیں۔ انھیں سبب، وتد، فاصلہ وغیرہ پر موسیقی کی بنا ڈالی گئی ہے۔ انھی حرکات کو انسان نے مختلف طور پر ترتیب دے لیا ہے اور اسی سے زبان بنا کر شعبے اور مقام وضع کیے ہیں۔ اس علم میں حرکت بمنزلہ اللہ تعالیٰ کے ہے اور سبب بمنزلہ عقل اور وتد بمنزلہ نفس اور فاصلہ بمنزلہ ہیولیٰ اور مختلف قسم کی آوازیں بمنزلہ کائنات کے۔ اس علم سے نہایت باریک مسئلہ حل ہوتا ہے کہ جس طرح نفس میں یہ حرکت ایک خاص لذت پیدا کر دیتی ہے اسی طرح اگر نفس ریاضت کشی اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے متلذذ ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کا تصور نجات اس امر کی تفہیم سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

علم ہیئت اور اُسکا مذہب سے تعلق حقیقت تو یہ ہے کہ جس قدر عظمت اللہ تعالیٰ کی اس علم کی تحصیل سے دل میں پیدا ہوتی ہے اتنی اور کسی علم کی تحصیل سے ہرگز نہیں ہوتی۔ دو باتیں خاصکر قدرت الٰہی کی توقیر پیدا کرتی ہیں۔ اول تو اس قدر عظیم اجرام اور انکا بیشمار ہونا۔ دوسرے ان اجرام فلکی کا ایک قانون میل باہمی پر برابر قیام رکھنا۔ حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر عقد پروین بطور خود ایک نظام شمسی ہے بلکہ بعض تو ہمارے نظامِ شمسی سے بھی بڑے بڑے نظام ہیں۔ چنانچہ کہکشاں کی نسبت عام رائے ہے کہ یہ ستاروں کی سڑک ابتک زیر تعمیر ہے۔ جس طرح زمین آفتاب کے گرد پھرتی ہے اور چاند زمین کے گرد پھرتا ہے اور شمس کے گرد دَور بالعرض کرتا ہے اسی طرح شمس کا کل نظام شمسی کے ساتھ ایک دوسرے شمس کے گرد دَور ہوتا ہے اور وہ شمس اپنے کل نظاموں کے ساتھ ایک دوسرے شمس کے آس پاس گردش کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح ایک نظام دوسرے کے گرد پھرتا رہتا ہے۔ جب ان باتوں پر آدمی غور کرتا ہے تو دماغ چکر کھانے لگتا ہے اور خدا کی قدرت کاملہ یاد آتی ہے۔ علم ہیئت کا مذہب سے اتنا تعلق ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہ ہوگا جس میں خدا کی عظمت کو ستاروں کی مثالوں سے نہ سمجھایا ہو۔ اور خدا کا لامحدود ہونا اسی علم سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ نیز واجب الوجود کا قدیم بالذات ہونا اسی علم کی مدد سے معلوم ہوتا ہے۔

علم الاحکام اور اُسکا مذہب سے تعلق علم ہیئت کی موجودہ ترقی کا باعث زمانۂ جدید کی رفتار ہوئی۔ ورنہ میل باہمی کے دقیقہ سے حکماے متقدمین اتنے واقف نہ تھے تاہم حکماے متقدمین نے اس علم میں

بہت کچھ ترقی کی تھی۔ اور وہ ترقی اُنکی اس بات سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے تمام کواکب کی گردش اور نور کی تاثیرات جمع کرکے علم الاحکام ایجاد کیا۔ کرۂ ارض پر موسمی انقلاب آفتاب کے قرب و بُعد کا سبب ہے اور سمندر کا جوار بھاٹا قمر کی کشش کا مظہر ہے۔ چاند کی روشنی آنکھوں کی بصارت کو بڑھاتی ہے۔ نبات اور حیوان میں نمو کرتی ہے۔ سورج کی دھوپ پھلوں کو پکاتی ہے۔ حیوانات کے نشوونما میں مدد کرتی ہے۔ جب یہ تمام باتیں مسلّم ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ دُور کے کواکب بھی کرۂ ارض پر اثرات پیدا کرتے ہیں اور ضرور ہے کہ کرۂ ارض جس طرح چاند اور سورج سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح کواکب بھی اسپر مختلف کوائف پیدا کرتے ہیں۔ یہی امر علم الاحکام کی وضع کا باعث ہوا۔ کیونکہ جب گیہوں نومبر میں بویا جاتا ہے تو اپریل میں اُسکی فصل کاٹ لی جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک لڑکا کسی خاص مہینے میں پیدا ہوا تو اُس وقت کی آب و ہوا اور موسم اور ستاروں کی روشنی کی وجہ سے اُسکی نشوونما کے لیے ایک خاص صورت پیدا ہو گئی۔ نیز بعد میں جن اثرات سے وہ متاثر ہوتا رہیگا اُسکا حساب انھیں دوائر و کواکب سے لگا کر یہ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ لڑکا بدیں صفات موصوف ہوگا۔ اور انھیں دوائر و کواکب سے یہ پیشنگوئی کی جاتی ہے کہ آیندہ سالوں میں یہ واقعات ہونگے۔ اسی کو علم الاحکام کہتے ہیں اور مذہب میں مسئلۂ تقدیر اسی نجوم کی بدولت معلوم ہوا ہے۔

علم زیچ و تقویم اور اُسکا مذہب سے تعلق | علم الاحکام سے ایک دوسرا علم وجود میں آیا اُسکا نام زیچ و تقویم ہے دراصل یہ کوئی علٰحدہ علم نہیں ہے بلکہ علم الاحکام کے معلومات تحریر کرنے میں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اُنھیں کو زیچ و تقویم کا علم کہتے ہیں۔ ہندو اور پارسی مذہب میں زائچے وغیرہ بہت بنائے جاتے ہیں اور اکثر دوسری قوموں کے آدمی بھی اس علم پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

علم نجوم ہی فی الواقع مسئلۂ تقدیر کے رواجِ عام کا باعث ہوا۔ نیز اسی علم کی وجہ سے بہشت و دوزخ کا خیال قلوبِ انسانی پر پرتو فگن ہوا۔ کیونکہ جب کوئی نجومی کسی شخص کا زائچہ بناتا ہے اور علم الاحکام سے اُسکی آیندہ زندگی کے واقعات بتاتا ہے تو گویا جو کچھ نوشتۂ تقدیر ہوتا ہے اوسکو پیشِ نظر کر دیتا ہے اسی طرح جب لوگوں نے دیکھا کہ دوسرے ستارے روشن ہیں اور وہ ہمپر زیادہ فوقیت رکھتے ہیں تو اُنکے دلوں میں یہ خواہش ہوئی کہ کیا اچھا ہوتا اگر ہم عالم علوی میں رہتے۔ یہی خواہش بہشت کے خیال کا باعث ہوئی۔ اسی طرح زمین سے چھوٹے سیارے اور تاریک ستارے جو نہایت پستی کی حالت میں

ہیں اُنکو دیکھکر یہ دوزخ کا خیال پیدا ہوا - اس طریقہ سے عالمِ عقبیٰ کے اعتقادات ظہور میں آئے -

علم طبیعات اور اُسکا مذہب سے تعلق جیسا تعلق علوم ریاضی سے مذہب کا ہے ویسا تعلق علم طبیعات سے بھی ہے کیونکہ طبیعات ہی وہ علم ہے جو آفرنیش عالم پر بحث کرتا ہے - علم طبیعات کی سات اقسام ہیں اور ہم اُن سب سے مذہب کا تعلق ظاہر کرسکتے ہیں - لیکن چونکہ طولانیِ مضمون کا خوف ہے اسلیے چند قسمیں بیان کرنے اور اُنکا مذہب سے تعلق ظاہر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں -

کون و فساد کون و فساد کا ایسا دقیق مسئلہ ہے کہ ہر مذہب میں اسکا کچھ نہ کچھ ذکر پایا گیا ہے - پہلے حکماء عناصر اربعہ سے کائناتِ عالم کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر حال کے حکما نے چونسٹھ سے زیادہ عنصر دریافت کرکے قدیم اعتقاد کو غلط ثابت کردیا ہے - گو یہ حکماے جدید کی غلط فہمی ہے - کیونکہ اگلے لوگوں نے جب تمام دنیا کی چیزوں میں ایک ہی قسم کے صفات دیکھے تو ایک جنس چیزوں کو علیحدہ کرکے یہ کہا کہ ان چار اجناس سے تمام عالم کی ساخت ہوئی ہے - ورنہ دراصل اُنکے کہنے کا یہ مقصود نہیں ہے کہ جو عناصر ہمکو نظر آتے ہیں یہ قابلِ تحلیل نہیں - کیونکہ وہ تو خود مسئلۂ استحالہ کے قائل ہیں - جس طرح حکماے جدید نے تین قسم کے عناصر قرار دیے ہیں یعنی رقیق، ہوائی اور جسمی - اسی طرح وہ بھی چار قسم کے عناصر تسلیم کرتے تھے ان تین اقسام کو پانی اور ہوا اور خاک سے اُنھوں نے موسوم کیا ہے اور ایک عنصر آگ اور مانا ہے کیونکہ اگر یہی کہا جائے کہ جس میں وزن ہے وہی عنصر ہوسکتا ہے تو یہ درست نہیں - کیونکہ عنصر تو ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کائنات محسوس اور بسیط ہو - اس طرح آگ محسوس چیز ہے اور ہر چیز میں گرمی کی شکل میں پیوستہ ہے - بلکہ آگ میں بھی وزن ہونا ممکن ہے - کیونکہ وزن دراصل مقدارِ کشش (جو اصطلاح میں میل کہلاتی ہے) کو کہتے ہیں - اب وہ چیزیں جن میں خاک زیادہ آمیز ہوگئی ہے زمین کی طرف کھنچتی ہیں اور ان میں وزن پایا جاتا ہے مگر آگ چونکہ عالم علوی سے تعلق رکھتی ہے اور کرۂ اثیر یا آفتاب سے اُسپر کشش پڑتی ہے اسلیے اوپر کی جانب میل کرتی ہے - اور چونکہ اسوقت تک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا ہے کہ آفتاب کی کشش کی مقدار کو ناپ سکے اسلیے آگ میں وزن کا وجود لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے - خیر جو کچھ بھی ہو مذہب کے مطابق انھیں چار عناصر سے تمام کائنات کی آفرنیش ہوئی - کون و فساد سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز پہلے منتشر تھی وہ اب مجتمع ہوگئی ہے (اسکو کون کہتے ہیں) اور جو چیز مجتمع تھی اب وہ منتشر ہوگئی (اسکو فساد کہتے ہیں) چنانچہ جس طرح دنیا کی چیزیں بنتی ہیں اسی طرح بگڑ بھی جاتی ہیں - کون و فساد سے

ہی قیامت کا اعتقاد جو ہر مذہب کا ایک ممتاز جزو ہے پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دنیا کی موجودہ حالت جب دائرۂ فساد میں داخل ہوگی اُسوقت قیامت برپا ہوگی۔ کون و فساد کے پڑھنے سے اور دوسرے ایسے ہی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ ہم بخوف طوالت زیادہ تحریر نہیں کرسکتے

آثار علوی علم طبعیات کی ایک اہم شاخ یہ بھی مذہب سے متعلق ہے۔ کیونکہ علم آثار علوی نے مذہب کی باتوں میں ایک خاص حصہ لیا ہے۔ پانی کا برسنا، بجلی کا چمکنا، صاعقہ کا گرنا اور ایسی باتیں ہر مذہب کی کتاب میں ایک اہم پہلو لیے ہوئے مندرج ہیں۔ مسقط النطفہ خاصکر اسی علم سے سمجھ میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ مسقط النطفہ کے مسائل نے مذہب پر کیا اثرات ڈالے ہیں۔ اکثر مذاہب متفق الرائے ہیں کہ نفس انسانی مینھ یا شبنم کے ذریعہ یا آفتاب کی دھوپ کے ساتھ خوردنی اشیا میں مل جاتا ہے اور اُن اشیا کے ذریعہ آدمی میں آکر نطفہ پیدا ہوتا ہے جس سے مخلوقات ظہور میں آتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس علم سے کئی اور مسائل مذہبی متعلق ہیں ؎ عاقلاں را اشارتے کافیست۔

ترکیب جسد ترکیب جسد یعنی وہ علم جس سے جسم انسانی کی ساخت معلوم ہوتی ہے اور آجکل کی زبان میں اسکو تشریح ابدان کہتے ہیں۔ علم طب اسی سے متعلق ہے۔ اس علم میں خصوصاً دو باتیں مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اول تو العالم انسان الکبیر اور الانسان عالم الصغیر کی تشریح۔ دوسرے مقام نفس کی بحث۔ پہلے مسئلہ میں چونکہ بہت اختلاف فہمی واقع ہوا ہے اسلیے ہم اُسپر رائے زنی نہیں کرنا چاہتے بلکہ علم المذاہب کے جاننے والوں کو اسکے فیصلہ کا اختیار دیتے ہیں وہ ضرور ہماری بات کی تائید کرینگے کہ اس مسئلہ نے مذہبی دنیا میں کس درجہ احاطہ کیا ہے اور نفس اور ارواح نیز اللہ تعالیٰ پر اسکا کیسے اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اور مقام نفس بھی جو مذہب کا ایک خاص اصول ہے اسی علم سے متعلق ہے لیکن مقام نفس صرف مختلف رائیں ہیں۔ ایک تو یہ کہتے ہیں کہ جان دل میں قیام پذیر ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں دماغ میں اسکا قیام ہے اور تیسرے اسپر ہیں کہ جان تمام جسم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس علم کا مذہب سے تعلق زیادہ مضبوط اسلیے اور ہوگیا ہے کہ علم طب جس سے قیام صحت اور دفع امراض ہوتا ہے اسی علم کی شاخ ہے۔

ہیولیٰ و صورت مذہب میں ہیولیٰ اور صورت کا بھی بہت کچھ حصہ ہے کیونکہ مادۂ دنیا سمجھنے کے لیے اس علم کی حاجت ہوتی ہے۔ دنیا کن چیزوں سے پیدا ہوئی اور دنیا کا مادہ کیا ہے۔ یہ صورتیں کہاں سے آئیں اور یہ جوہر ہیں یا عرض؟ یہ تمام باتیں مذہب کے متعلق ہیں۔ کیونکہ بغیر ان چیزوں کے جانے ہوے

نفس اور اللہ تعالیٰ کے تعلقات کو پہچاننا دشوار ہے۔ بعض مذاہب والے کہتے ہیں کہ دنیا کی پیدائش چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہوئی ہے اور یہ ذرّے پہلے ایسی حالت میں تھے کہ انکے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ان ذروں کو جوہر فرد یا جزو لا یتجزیٰ کہتے ہیں۔ مگر اسکے برخلاف دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کے ذرّے موجود نہیں جن کا انقسام ناممکن ہو۔ کیونکہ اول تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ فلاں ذرّہ اتنا چھوٹا ہے اور پھر وہ ذرہ اتنا چھوٹا اور ہوگیا۔ سو لے اس وہمی انقسام کے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذرے قابل تقسیم ہیں۔ کیونکہ ایک شمع کی لَو میں اگر ایک جوہر فرد فرض کیا جائے تو جب اُسکی روشنی زیادہ وسیع جگہ پر پڑیگی اُس روشنی کے بقاعدہ نسبت ٹکڑے کرنے سے اس جوہر فرد کے ٹکڑے ہو جائیں گے اسلیے دنیا ایک ایسے مادّہ سے بنی ہے جو سب کی اصل ہے اور اس میں صورت قبول کرنے کی استعداد ہے پس دنیا کی آفرینش ہیولیٰ اور صورت سے ہوئی ہے۔

زمان و مکان زمان و مکان مذہب کی بات بات میں پیدا ہے کیونکہ بغیر علم زمان و مکان کے نفس کی معرفت خدا کا علم اور انکے باہمی تعلقات ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہے نفس ابدی ہے۔ بغیر علم زماں کے کس طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جب تک مکان کا علم نہ ہو جائے یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح تمام دنیا میں محیط ہے اور مرنے کے بعد نفس کو کس طرح نجات حاصل ہوتی ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ زمان و مکان کے علم سے ہی نامتناہی کا علم حاصل ہوا ہے اور عالم کو نامحدود کہنا، اللہ تعالیٰ کو نامحدود ماننا سب اسی علم پر مبنی ہے۔ اسی طرح ازل اور ابد کے دقیق مسائل اور قدامت کی بحث اسی علم سے سمجھ میں آتی ہے۔ غرضکہ یہ علم سراسر مذہب کے متعلق ہے۔

اکثر متعصب مذہبی اصحاب کہتے ہیں کہ مذہب میں دلیل اور حجت کا تلاش کرنا امر نازیبا ہے لیکن اگر یہ لوگ ذرا بھی غور سے کام لیں تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ خود اپنی معمولی سے معمولی گفتگو میں دلائل طلب کرتے ہیں۔ پھر مذہب کے باریک مسائل میں کس قدر دلائل کی احتیاج ہے۔ منطق کی بنیاد صرف چند اصول متعارفہ پر ہے اور علمائے جدید کی رائے میں صرف تین اصول کا تسلیم کرلینا بغیر دلیل کے نہایت ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک چیز بیک وقت موجود اور غیر موجود نہیں ہو سکتی۔ تیسرے یہ کہ ہر چیز یا موجود ہے یا غیر موجود۔ مگر اکثر علمائے متقدمین کا قول ہے کہ موجودات عن الخارج کے ایسے قوانین جنکو ہر خاص و عام باستثنائے اطفال و مجانین قبول کرتے

اصول متعارفہ کے طور پر بے دلیل تسلیم کرنے کے قابل ہیں۔ بلکہ کنیٹ تو یہاں تک بضد ہیں کہ انسان کی فطرت میں ہی اولیات کا علم کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے اور علم اولیات اُسکا پیدائشی اور جبلّی ہے۔ آجکل یہ مسئلہ اعلیٰ طبقے کے حکما میں زیر بحث ہے اور اکثر اسکے مؤید اور معتقد نظر آتے ہیں لیکن حکمائے ہند اس مسئلہ کو ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں وہ اسکو مانتے تو ضرور ہیں مگر دوسری ہی روشنی میں۔ انکا مقولہ ہے کہ انسان پہلے بھی ایک دوسرے قالب میں رہ چکا ہے اور جو تجربات اُس نے قالب سابقہ میں انجام دیے تھے اُنکا خواب کے مانند علم اس قالب موجودہ میں مثل یادداشت کے موجود رہتا ہے۔ اور ایسے معلومات میں اولیات بھی شامل ہیں۔ اسکندر اعظم نے یہی دریافت کرنے کے لیے کہ آیا انسان کو کوئی علم پیدائشی ہوتا ہے یا نہیں ایک نوزائیدہ بچہ کو کوٹھری میں بند کر کے رکھا تھا اور آٹھ سال تک اُس لڑکے کو جو لوگ غذا پہونچاتے تھے اُنکو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہرگز زبان سے کوئی بات نہ نکالیں۔ چنانچہ کتب سیر سے واضح ہوتا ہے کہ جب اُس لڑکے کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ کوئی بات نہیں سمجھتا تھا نہ کوئی اشارہ کرتا تھا اور نہ پاؤں پر کھڑا ہو کے چل سکتا تھا۔ اسی تجربہ کو جلال الدین اکبر نے بھی مکرر کیا تھا مگر اُسنے نوزائیدہ بچہ کو کوّوں کے ساتھ ایک تاریک حجرہ میں بند کر دیا تھا۔ یہ لڑکا جب اکبر کے سامنے حاضر کیا گیا تو کوّوں کی بولی البتہ بولتا تھا اور جیسی کوّوں کی حرکات و سکنات تھے اُنھیں کے موافق وہ بھی جنبش کرتا تھا۔ کلکتہ میں سنہ ۱۸۹۳ء میں ایک جنگلی آدمی لایا گیا تھا جو چارپایوں کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل چلتا تھا اور اُسکے جسم پر بندروں کی طرح بال نکل آئے تھے۔ اس آدمی کو ایک مشہور عالم نے تعلیم دی تھی اور وہ تعلیم پاکر بی اے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ ایسے مشاہدات اکثر سننے اور دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو جو کچھ علم ہوتا ہے وہ پیدائش کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ تاہم قائلین تناسخ ایسے دلائل ثاقب پیش کرتے ہیں کہ اُنسے قطع نظر کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب گائے کے بچھڑا پیدا ہوتا ہے تو فوراً گائے کے تھنوں میں مُنہ ڈالکر دودھ پینے لگتا ہے۔ علم مرایا و مناظر سے دریافت ہوتا ہے کہ دونوں آنکھوں میں کوئی ایسا تعلق نہیں جسکی وجہ سے پتلیاں جب ایک چیز کو دیکھیں تو ایک جانب ہی متوجہ ہو جائیں کیونکہ اگر کوئی تعلق باریک رگوں کے ذریعہ ہوتا تو جب ایک آنکھ کی بصارت جاتی رہتی تو دوسری آنکھ کی روشنی میں بھی فرق آ جاتا یا اریک آنکھیں موجود نہ ہوتیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ اسلیے پتلیوں کا ایک سمت پھر جانا اُسی عادت کے باعث ہے جو قالب سابقہ میں ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ سہی مگر انسان علوم سے کس طرح بہرہ ور ہوا؟ اس سوال کا حل کرنا ضروری ہے۔ آفرینش عالم کی ابتدا میں جب انسان کو صحبت ہمجنس کی میسر نہیں تھی اُسوقت انسان کی کیا حالت تھی۔ اتنا آمنا وصدقنا تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نفس کو اپنے اور محسوس کے وجود کا یقین پیدائشی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان پیدا ہوا تو اُس نے محسوسات کا ذخیرہ اپنے حافظہ میں جمع کرنا آغاز کیا اور ایک مدت کے بعد یہی محسوسات علم انسانی ہو کر دوسرے انسانوں میں پھیل گئے۔ تاریخ سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلے انسان جنگلی زندگی بسر کرتے تھے اُسوقت جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا تو اُسکو جنگل میں پڑا رہنے دیتے تھے جوں جوں تمدن کی ترقی ہوتی گئی یہ لوگ بھی مُردوں کو گاڑنے اور جلانے لگے۔ پہلے پہل جن مردوں کو گاڑا گیا اُنکو اُنکی اولاد یہ سمجھنے لگی کہ یہ مُردے گہری نیند سو رہے ہیں اور اکثر اُنکی قبر پر جاکر کھانا وغیرہ رکھ آتے تھے اور بعد میں صرف پھول وغیرہ انکے مرقد پر چڑھا کے اپنا دل بہلانے لگے۔ یہ قبر پرستی کی ابتدا تھی۔ اسی طرح جو لوگ مُردوں کو جلا دیتے تھے اُنکے دل میں متوفی کی اگلی عظمت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ جان دوسری چیز ہے اور جسم دوسری چیز ہے اور مرنے کے بعد بھی آدمی زندہ رہتا ہے۔ پس وہ مردے کو بھوت سمجھنے لگے۔ اور ضعیف الاعتقادی اور دیو پرستی کا اس طرح آغاز ہوا۔ اب اُن لوگوں کا یہ خیال کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے یہاں تک بڑھا کہ وہ (متوفی) بھوت کو انسانی طاقت سے زیادہ تصور کرنے لگے اور جیسے آدمیوں میں سردار اور سرگروہ ہوا کرتے تھے اسی طرح اُن لوگوں کے دلوں میں خیال ظاہر ہوا کہ یہ سردار مرنے کے بعد بھوتوں کے سردار ہوا کرتے ہیں۔ غرضکہ ہوتے ہوتے اُنھوں نے یہ تصور شروع کیا کہ یہ لوگ جس طرح اپنے مکانوں میں زمین پر رہتے ہیں اسی طرح یہ بھوت ہم سے اچھی جگہ رہتے ہیں اور یہی خیال بڑھتے بڑھتے جنت کے تصور میں آگیا ورنہ ؎

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پھر اس بھوت کی ضد میں ایک فرشتوں کا گروہ مان لیا اور اُسکے سردار میں بڑی طاقتوں کا ہجوم قرار دیا۔ جوں جوں اُن لوگوں کے معلومات میں ترقی ہوتی گئی اُن لوگوں نے اس میں زیادہ عظیم طاقتوں کا مجمع تصور کیا اور آخرکار لوگوں کا تمدن تکمیل کو پہونچ گیا تو اُنھوں نے اپنے تخیل سے لامحدود اوصاف کا مجمع تصور کیا۔ یہی خدا کا بنیادی خیال تھا جو بنی آدم کے دلوں پر عکس پذیر ہوا۔ یہ ہے مذہب کی بنیاد اور اُسکی ارتقا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور معقولات کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب میں بھی

اختلاف ہوتا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے ارتقاے مذہب کا قائل ایک قلیل گروہ فلاسفہ ہے۔ کثرتِ رائے اسپر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود قدرتِ کاملہ سے انسان کی آفرینش کی اور الہام کے ذریعے اُسکو دنیا کی باتوں اور زندگی کے قوانین سے آگاہ کیا۔ اور اس طرح خدائے تعالیٰ کے احکام مذہب کا باعث ہوے۔ اب یہ بات کہ انسان پہلے کہاں پیدا ہوا ان علما سے پوچھی جاتی ہے تو وہ مختلف جواب دیتے ہیں۔ اہل ہنود پیدایش انسان کو ہمالیہ پہاڑ پر تبت کے میدان میں قرار دیتے ہیں اور انکی تائید علماء فلاسفہ یوں کرتے ہیں کہ زمین دراصل ایک جزوِ آفتاب ہے جو آتشِ شمس کے غلیظ ہو جانے پر اُس سے علٰحدہ ہو کر گر پڑا تھا۔ اسمیں سخت گرمی تھی۔ پہلے پہلے سب سے اونچی زمین سرد ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ تبت سے رفیع و بلند کوئی اور خطہ نہیں اسی لیے یہ "بامِ دنیا" کے نام سے مشہور ہے۔ پس پہلے یہیں نباتات اور حیوانات کی پیدایش ہونا قرینِ قیاس ہے۔ لہذا یہی وہ جگہ ہے جہاں انسان کے مورثِ اعلیٰ کا وجود ہوا۔

پہونچی نظر کسی کی نہ اُسکے جمال پر ہر خیرہ چشم کھیل رہا ہے خیال پر

القصہ ہر پہلو سے روشن ہوتا ہے کہ فلسفہ کا مذہب سے تعلق ایسا مستحکم ہے کہ اگر ایک علت ہے تو دوسرا معلول۔ مگر میرے خیال میں فلسفہ اور مذہب کے درمیان جو تعلق ہے وہ بجنسہ ایسا ہے جیسے کوئی سڑک منزل مقصود پر پہونچنے کی ہو مگر بغیر راہنما کے ہم اُس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے ہوں۔ لیکن جب مذہب کی سڑک پر فلسفہ کا راہنما ہمراہ ہو تو منزل مقصود پر بہت آسانی سے پہونچ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

رائزادہ گوبند پرشاد ورمن (کیننگ کالج لکھنؤ)

انتباہ۔ جن الفاظ پر + نشان بنا ہوا ہے اُن کو قابل اصلاح سمجھیے۔ یہ مضمون بھی آگرہ کی انجمن ترقی اُردو کے مضامین مقابلہ میں سے ہے۔ اور جن بزرگ نے اسکی جانچ کی تھی اُنھوں نے ان الفاظ پر یہ نشان اسی غرض سے بنا دیا تھا۔ بعض جگہ اُنھوں نے اصلاح بھی کر دی ہے ہم نے اُسکو حاشیہ پر الگ درج کر دیا ہے۔ تاکہ ناظرین کرام اور خود لائق مضمون نگار اُن کی اصلاح سے مستفیض ہو سکیں۔

ایڈیٹر

جولیس سیزر مترجم

(تبصرہ)

بروٹس شریف النفس مگر غیر عامل | بروٹس کی ذات میں عمل کی محک پر کس کر ایک ایسے شخص کی ناکامی واضح کی گئی ہے جو حقیقتاً سیرت تو شریف رکھتا ہے، لیکن وہ اپنے علوے علم میں غرق ہے اور دریاے عمل کا شناور نہیں ہے۔ بروٹس ایک فیلسوف اور متصور[1] شخص ہے۔ حیات و فطرت بشریہ کی نسبت اُسکے اصول نہایت بلند ہیں، لیکن وہ اُنکی حقیقتوں کو اندر سے دیکھنے کے لیے سچی بصیرت نہیں رکھتا۔ نیز اُسکے جذبات[2] اور اخلاق[3] بھی کچھ انوکھی وضع کے ہیں، جن پر مذہب جبریہ کی اُس خود ضبطی کا پردہ پڑا ہوا ہے، جو عموماً اُسے دوسروں سے ممتاز کردیتی ہے کتابوں پر اُسے کامل عبور ہے؛ لیکن جب گردشِ تقدیر اُسکو کتب خانہ سے نکالتی اور ہدایت دیتی ہے کہ اصول طرازی کی فضاے لطیف سے اُتر کر کثافت زارِ عمل میں گام فرسا ہو، تو ابناے نوع سے نبھانے اُنکے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور حادثاتِ زندگی سے سربر ہونے میں اُسکی ناقابلیت صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ جہاں دوست دشمن اُسکی نیک نفسی اور علوے شرف کے معترف ہیں، وہاں اُنکو یہ تکلیف دہ اقرار بھی کرنا پڑتا ہے کہ وہ متصور محض ہے، جسکو متوسط انسانیت کے جذبات اور دلچسپیاں چھو تک نہیں گئیں۔ شامتِ تقدیر یہ کہ وہ بُرے زمانہ میں پیدا ہوا ہے اور بزعم خود اپنے کو مکلف سمجھتا ہے کہ اسکی اصلاح میں جہاد کرے۔

اُسکے علوے سیرت کا ثبوت | اُسکے شریف النفس ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ بعض انسان اپنی نیک نہادی کو بلا قصد فاش کردیتے ہیں۔ بروٹس کا شمار ایسے ہی انسانوں میں ہے۔ وہ تمام لوگ جنکو اُس سے سابقہ پڑتا ہے، اُسکی تعریف میں بے اختیار "شریف بروٹس" پکار اُٹھتے ہیں۔ کاشیس، سیرت کا زبردست مبصر اپنے آپ سے کہتا ہے: "بروٹس، بیشک تو شریف ہے (ایکٹ ۱۔ سین ۲ سطر ...) ربنا خواہش کرتا ہے

---

[1] متصور۔ بکسرو اُو مشدد و سکونِ راے مہلہ، با خود صورت کنندہ چیزے را و صورت بندیدہ۔ یہاں (Idealist) کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر راقم کو اسکی صحت میں شبہ ہے۔

[2] مثلاً اسکو پورشیا کے انتقال کا ذکر کرنے کی تاب نہیں ہے۔

[3] ملاحظہ ہو بروٹس اور پورشیا کی گفتگو (۱/۲ ...)۔ نیز اول سے آخر تک لوسیئس کے اُسکا مشفقانہ برتاؤ۔

"کیا اچھا ہو، کاسیس جو تم شریف بروٹس کو بھی اپنے جتھے میں ملا لو" (۱/۲ …) کلائیطس اپنے شکست خوردہ اور دل شکستہ سردار کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے: "… اب یہ ظرفِ عالی غم سے بالکل لبریز ہو چکا ہے۔" (۵/۵ …) شریف ترین رومی، اینتونی کا قول فیصل ہے (۵/۵ …) سازشی ابتدا ہی سے محسوس کرتے ہیں کہ وہ بغیر بروٹس کے کچھ نہیں کرسکتے

سازشیوں پر اسکا اثر کاسیس اور کاسکا اور سِنا، سب اُسکی شدید ضرورت کے مقر ہیں - اگر وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو بروٹس کے نام کی پناہ لیکر کریں (۳/۱ …) کیونکہ: "وہ تمام لوگوں کے کاشانۂ دل کا صدر نشیں ہے اور اسکی صورت اُس چیز کو جو ہم میں سراسر خطا و عصیاں نظر آئے گی، مثل ایک پُرتاثیر کیمیا کے خیر و خوبی میں بدل دے گی۔"

کاسیس کو اپنے صحیح تدبر کے خلاف دوبار بروٹس کے مقابل طرح دینی پڑتی ہے۔ لیفا ریس آنکھیں بند کرکے اُسکی پیروی کرتا ہے (۱/۲ …)۔ جب سازش کا مقصد پورا ہوجاتا ہے، تو اصل ذمہ داری کا سہرا اُسی کے سر باندھا جاتا ہے: "بروٹس عرشہ[۱] پر جائے۔" (۱/۳ …) نیز "بروٹس آگے آگے ہوگا۔" (…) مختصر یہ کہ اُسکا اثر سب پر حاوی ہے۔ اور یہ وہ اثر ہے جو سیرت کے سلسلہ شرف سے لبند ہوا ہے۔ اور دوسروں کی گردنوں کو وفادارانہ اطاعت گزاری میں جھکا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ فخر کرسکتا ہے کہ: "ہم وطنو، میرا دل نازاں ہے کہ زندگی بھر میں کوئی شخص میں نے ایسا نہیں پایا، جو میرے حق میں وفادار ثابت نہ ہوا ہو۔" (۵/۵ …)

اُسکے خیالات اس قماش کے شخص کی نیت میں ذاتیات کا وزن کیا، لگاؤ تک نہیں ہوتا۔ فقط اصول ہی اُسکا دلیل راہ ہوتا ہے۔ کاسیس اور دوسروں کو جذبۂ حسد نے اُبھارا ہے۔ (۵/۵ …) بروٹس کو سیزر سے ذاتی پرخاش تو کچھ ہے نہیں، جو اُسکی پامالی کے درپے ہو، بلکہ وہ سیزر کا دوست ہے، اور اس لیے مخالف جذبات کی کشاکش میں گرفتار ہے (۱/۲ …) لیکن اگر وہ سیزر کو بہت دوست رکھتا ہے تو روما کو کہیں زیادہ تر دوست رکھتا ہے (۲/۳ …) بہبودیِ جمہور کی ہمدردی سیزر کی ہمدردی کو دل سے نکال دیتی ہے، جس طرح

مخالف جذبات کی کشاکش میں لوہا لوہے کو کاٹ ڈالتا ہے (۱/۳ …) بحیثیت ایک رومی کے روما اور رومی ہمیشہ اُسکے ہونٹوں کو بوسہ دیتے رہتے ہیں۔ بحیثیت بروٹس کے یعنی اُس شخص کی نسل سے ہو کر جس نے طارقون کی بادشاہی کو خاک میں ملایا تھا، اُس کا فرض ہے کہ شخصی جذبات کا ایثار کرکے حبِ وطن کی صدا پر لبیک کا نعرہ لگائے۔ پھر نہ اپنے کسی دوست سے درگذر کرے اور نہ خود اپنے سے۔ فرماں فرمائے[۲] ملک کی خود مختاری

[۱] عرشہ پلیٹ (منبر Pulpit) [۲] فرماں فرما، یا مختار السلطنت (dictator)

اُس حریت کے منافی ہے جسے بروٹس روما کی بہتری کے لیے لازم سمجھتا ہے۔ اور سیزر اگر تاج چھین لے تو بدتر خرابیوں کے رونما ہونے کا اندیشہ ہے (۲/۱ ...)۔ کیونکہ اس سے اُسکی خو بدل جائیگی اور وہ ظلم کی فلاں افراط اور فلاں تفریط میں مبتلا ہو جائیگا۔ پس دوستی کو قربان کر ڈالنا چاہیے۔ ایک متصور باہمی استرضاء اور قرار داد کچھ نہیں جانتا۔ اور بروٹس جو جتنا بے غرض ہے، اُتنا ہی غیر متزلزل ہے، پھر یہ گوارا نہ کرے گا کہ کسی کام کو ہاتھ میں لیکر ادھورا چھوڑ دے۔

فطرۃ بشریہ سے ناواقفیت اسکی ناکامی کا سبب ہے

بگڑی کو بنانے کی تدبیریں البتہ اُسکے حیطۂ دسترس سے باہر ہیں۔ اُسکی سعی میں مشکوریت کی صلاحیت نہیں ہے اور اس عدم صلاحیت کا بھید فطرۃ بشریہ سے اُسکا واقف نہ ہونا ہے۔ وہ نہیں جانتا دوسرے لوگ کیونکر عمل کرینگے، یا خود اُسکے افعال و اقوال کا اُنپر کیا اثر ہوگا۔ وہ ہر شخص کی سیرت کے پڑھنے میں جو اُسکے سامنے پیش ہوتی ہے غلطی کرتا ہے۔ انتونی کی نسبت اُسکی تشخیص غلط ہے (۲/۱ ...) اُسے نہیں سوجھتا کہ انتونی کے "لہو و لعب" اور "رنگ رلیوں"

اُسکی ناواقفیت کی بعض مثالیں

میں عملی جد و جہد کی سرگرم قوت چھپی ہوئی ہے، بروٹس کی فقط ایک ٹھوکر اہلِ سازش کی کامل بیخکنی کے لیے کفایت کرتی ہے۔ وہ کاسکا کو نہیں پہچانتا (۲/۱ ...) وہ مجمع کو نہیں پہچانتا اور اس سے ایک منطق و مدلل لہجہ میں خطاب کرتا ہے (۲/۳ ...) گویا ہر فرد ایک فیلسوف کی سی تربیت یا نکتہ طبع سلیم لیکر اسکی تقریر سننے کو آیا ہے۔ تماشہ تو یہ ہے کہ وہ خود اپنی بیوی کو نہیں پہچانتا اور سادہ دلی سے سمجھتا ہے کہ اپنے اضطراب کو اُس سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے (۲/۱ ...) اور وہ نہیں دیکھتا کہ کاسیس اُسے بنا رہا ہے (۲/۱ ...) اور سیزر پر اپنا ذاتی بغض نکالنے کے لیے اُسکے اثر سے آلہ کا کام لے رہا ہے۔ جو شخص فطرۃ بشریہ کے مشاہدہ میں اسقدر بے بصر ہو، مطالعہ گاہ سے اُٹھکر جب وہ میدانِ عمل میں قدم رکھے گا تو اُسے ناکامی سے دوچار ہونا لابدی ہے۔ اسپر بتدریج کھلتا جائیگا، کہ اصلی دنیا اُسکی خود ساختہ دنیا سے کوئی نسبت نہیں رکھتی اور نیز اُسکے نظریے انسان کے بارے میں سراب نما فریب کا حکم رکھتے ہیں۔

پس لازم آتا ہے کہ بروٹس کی ملکی کارگزاریوں کو جہاں تک کہ اُنکا سازش اور انجام سازش سے

سازش کو عملی طور پر انجام دینے میں اُسکی غلطیاں۔

تعلق ہے۔ غلطیاتِ عملیہ کا سلسلہ قرار دیا جائے۔ وہ اس تجویز میں مزاحم ہوتا ہے کہ سیزر کے ساتھ انتونی بھی قتل کر دیا جائے (۲/۱ ...)۔ وہ انتونی کو لوگوں سے خطاب کرنے دیتا ہے (۲/۳ ...) طرفہ یہ کہ "آخر میں" اور پھر اپنی تقریر کے ختم ہوتے ہی انتونی کے اس وعدہ پر

بھروسہ کرکے چلا جاتا ہے (۲/۳ ...) کہ وہ اہل سازش کو ملزم نہ ٹھیرائیگا (۲/۳ ...) اپنے ہی رفیق کے خلاف اُسکی خفگی ناشائستہ کے درجے تک جا پہنچتی ہے (۳/۴ ...) وہ فلپی کی جانب یلغار کرنے پر مُصر ہوتا ہے، (۳/۴ ...) دھاوے کا حکم دینے میں عجلت کرتا ہے، سپاہیوں کو لوٹ میں مشغول ہونے دیتا ہے اور اس طرح اپنے ہمردیف جنرل کو کمک پہنچانے میں قاصر رہتا ہے (۵/۳ ...) غرض اُسکا کارنامہ غلطیوں کی ایک پُردرد داستان ہے۔

گریا در ہے، ان میں سے اکثر غلطیاں ایک نیک نفس گو ضرورت سے زیادہ نازک مزاج انسان کی غلطیاں ہیں، جس نے ایک خاص کام کا نتائج پر غور کیے بغیر بیڑا اُٹھایا ہے۔ بروٹس کو ابتدا ہی میں طے کر لینا چاہیے تھا کہ اگر سیزر کا قتل روا ہے تو ظلم و جبر کی مزید کارروائیاں بھی واجب ہونگی، جو اس قتل کا لازمہ ہیں۔ برخلاف اسکے وہ قتل کے مہیب کام کی جسارت کرتا ہے، لیکن کوشاں ہے کہ اسکی تکمیل میں عدل و راستی کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھٹنے پائے۔ یوں کچھ تو بے ضرورت جھجک سے اور کچھ عملی تدبر کے نقدان سے ایک ٹھوکر کھا کر سنبھلتا نہیں ہے کہ دوسری کھاتا ہے اور جو کام قدرت نے اُسے تفویض کیا ہی اسکی انجام دہی میں اپنی ناقابلیت ہر ہر قدم پر زیادہ وضاحت سے نمایاں کرتا جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سیزر کا قتل سراسر سفیہانہ اور بے معنی تھا، سفیہانہ اسلیے کہ اسکی بنا محض حسد پر تھی، اور بے معنی اسلیے کہ وہ لوگ بھی جنکی نیت خالص تھی، روما کی سابقہ جمہوریت کو بحال کرنے میں گویا درپے محال تھے۔ اسلیے بروٹس کے انجام سے ہماری ہمدردی جزوی ہے۔ باینہمہ اُسکی شخصی سیرت پر انٹونی کی حسب ذیل مدح سرائی اعتراض سے ہمیشہ پاک رہے گی:

اس سے ہماری ہمدردی بعض جزوی ہے

"اُسکی زندگی نہایت شائستہ تھی اور اخلاط نے اُسکی خلقت میں وہ ترکیب پائی تھی کہ نطرۃ ساری دنیا کے سامنے کھڑی ہو کر دعوی کر سکتی تھی کہ 'انسان ایسا ہوتا ہے'۔"

کاسیئس غیر محتاط مگر قابل

اسکی سیرت کو شاعر نے نہایت ہنرمندانہ کاسیئس کی سیرت سے سہارا دیا ہے:

کاسیئس سر سے پاؤں تک عملی انسان، دنیا کے ساتھ ہمیشہ اُسی کے ہتھیاروں سے لڑنے کے لیے تیار اور قابل، نیکی جذبات سے نہ رکنے والا، جیسا کہ ان وسائل کے دیکھنے سے مترشح ہوتا ہے جو اُسنے روپیہ وصول کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔ (۴/۳ ...)

بروٹس سے اسکا تقابل

ان ہر دو سیرتوں میں مابہ الامتیاز فرق اس حقیقت سے نمایاں کیا گیا ہے کہ اصل جذبہ

جو کاسیس کو سازش برپا کرنے پر اُکساتا ہے وہ سیزر سے اُسکا ذاتی عناد ہے اور یہ جذبہ شروع ہی میں عریاں کر دیا گیا ہے: مثلاً، بروٹس سے پہلی ہی ملاقات میں اپنی فرومائگی اور سیزر کی بڑائی کا تقابل کرتا ہے (۱/۲ ...) اور یہی شخص اب خدا بنگیا ہے، اور کاسیس ایک ذلیل غلام کہ اگر وہ شانِ بے نیازی اپنے سر کو ذرا جنبش دے تو مجھے اپنے تئیں سجدہ میں گرا دینا پڑے" اس گفتگو سے صاف حسد کی بو آرہی ہے اور وہ ایسے ہی حسد کو بروٹس میں پلٹنے یا سلگانے کا متوقع ہے (۱/۲ ...) کاسیس ہی کی نسبت تو سیزر کہتا ہے (۲/۱ ...):

حسد کاسیس کا خاص محرک ہے "ایسے لوگوں کے دلوں کو جب وہ کسی کو اپنے سے برتر دیکھتے ہیں، ہرگز صبر نہیں آتا، ہاں، درست ہے۔ ایک اور جذبہ بھی کاسیس کو تحریک دینے والا ہے، یعنی حریت اور مساوات کی محبت جو غلامی کے اُس طوقِ گراں کو نکال پھینکنا چاہتی ہے جسے سیزر کے ظلم نے اُن کی گردنوں میں پہنا رکھا ہے (۱/۲ ...)۔ "تیز" میں راضی ہوں کہ دنیا سے اُٹھ جاؤں، مگر ایک اپنی جیسی چیز کے قہر و غلبہ میں نہ رہوں" اگر اُسے فرماں فرمائے شخصی طور پر نفرت ہے، تو ظالم ہونے کی جہت سے بھی نفرت ہے۔ مگر یہ زیادہ تر خالص جذبۂ جمہوریت (میرے خیال میں) تقریباً اس قدر قوی نہیں ہے جس قدر کہ دوسرا یعنی ذلیل و مکروہ حسد۔

درحالیکہ بروٹس اعلیٰ اصولوں کا حامل ہے، ذکاوت علمی اور سیرت شناسی کا ملکہ کاسیس کا حصہ ہے۔

اُسکی علمی ذکاوت ایک بہت بڑا مبصّر جسکی" نظر لوگوں کے افعال و حرکات کی تہ تک جا پہنچتی ہے" (۱/۲ ...)۔ یہ اوصاف اُسکے انیتونی کے مقابل والی روش سے خاص طور پر واضح ہوتے ہیں۔ کون انیتونی؟ وہ جسکی سیرت کے مطالعہ میں بروٹس اس غضب کا دھوکا کھا رہا ہے۔ اولاً کاسیس کو انیتونی کے درگزر کرنے میں خطرہ دکھائی دیتا ہے (۲/۱ ...) پھر سازش کی مقصد برآری کے بعد وہ نہیں بھولتا کہ ابھی انکو انیتونی سے بھگتنا ہے (۲/۱ ...) اور "سیزر کے دوست" کی نسبت مکرر اپنے خدشہ کا اظہار کرتا ہے (۳/۱ ...)۔ لیکن چونکہ اب بھی اُسکی جان لینا مقصود نہیں ہے، اسپر ایک ایسی تحریص کو آزماتا ہے، جسکا اثر امید ہے کہ وہ قبول کرلیگا (۲/۱ ...)۔ پھر انیتونی سے دانشمندانہ اپنے گروہ کے متعلق اُسکی دوستی یا دشمنی کا بھید اُگلوانے کی کوشش کرتا ہے (۳/۱ ...) آخر میں بروٹس کی اس مہلک خطا کو پکڑتا ہے، جسکا وہ انیتونی کو سیزر کی میت پر تقریر کرنے کی اجازت دیکر مرتکب ہوتا ہے۔ ہر قدم پر کاسیس کی حکمت عملیہ بروٹس کی رہنمائی کرتی اور اُسکی غیر عملی سیرت کو سہارا دینا چاہتی ہے، مگر بروٹس ہے کہ اُسے کوئی صلاح سوجھتی ہی نہیں اور اگر سوجھتی ہے تو ناقص۔

اور مثالیں اور مثالیں بھی ہیں: کاسیس کا سکا کی بناوٹی مجہولیت سے فریب نہیں کھاتا (۱/۲ ...) سازش کی تمام و کمال تنظیم کرنے والا کاسیس ہے، نہ بروٹس۔ بروٹس فقط ایک سرگروہ کی ضروری حیثیت رکھتا ہے وہ سیسرو کے ملانے کی رائے دیتا ہے (۱/۲ ...) جسکی طاقت بیانی لوگوں پر موثر ہو سکتی اور انیٹونی کی تقریر کا توڑ کر سکتی تھی۔ اسکی پیش بینی اُسے بتاتی ہے کہ شاید سیزر دارالامارہ میں نہ آئے (۲/۱ ...) واقعی اُس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ اور اگر نہ آتا تو سازش کے درہم و برہم ہونے کا قوی احتمال تھا۔ بحیثیت فوجی افسر کے اُسکی رائے صائب ہے۔ یعنی انھیں دشمن کے حملہ کا منتظر رہنا چاہیے اور ایسا موقع چھوڑ کر جہاں وہ باستحکام قائم ہو سکتے ہیں، ایک اجنبی ملک میں اپنی تمام امیدوں کو واحد لڑائی پر قربان نہ کر دیں (۴/۳ ...) الحاصل، کاسیس خود کو بہمہ وجوہ قابل ثابت کرتا ہے، پہلے بطور سازشی کے اور بعدہ بطور سپاہی کے۔ برعکس اسکے بروٹس محض کتب کا ایک طالب علم ہے۔

بروٹس کا شخصی اثر کاسیس پر باوجود اسکے جب وہ دونوں یکجا ہوتے ہیں، تو بروٹس کا اثر غالب رہتا ہے۔ کیسا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو۔ نہ ڈگنے والے بروٹس کی رائے ور رہتی ہے۔ کاسیس اپنے رفیق کی فائق تر سیرت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ مفعولیت کا احساس لگام کا کام کرتا ہے۔ بروٹس کی خاموش موجودگی، اُسکے پست جذبات کو شرم میں دبا دیتی اور اُسکی طبیعت میں سے بہترین عناصر کو نچوڑ کر نکال لیتی ہے۔ اس کیفیت کی جھلک آخر ڈراما میں بطور خاص دیکھی جاتی ہے (۴/۳ ...) نوشتیں قلا کے تصفیہ میں جبکہ کاسیس کا جوش و خروش اور غیظ و غضب جو غالبًا اپنے قصور کا احساس چھپانے کے لیے کھسیانی عاجزی میں بدل جاتا ہے۔ اور پھر الوداعی مین (۵/۱ ...) میں وہ تمکنت اُس سے ٹپکتی ہے جو خود بروٹس کے شایاں ہے۔ ایسے اوقات میں برتر طبیعت کا اتصال اپنے غیر محسوس تاثر سے کمتر طبیعت کو مرتفع کر دیتی ہے۔ بحقیقت امر کہ کاسیس ایسے تاثرات کو قبول کر لیتا ہے، نیز بروٹس سے اُسکی مخلصانہ عقیدت، حُریت سے اُسکی والہانہ محبت، اُسکی متہورانہ جرأت اور عاملانہ قابلیت ہم سے اُسکے لیے کچھ نہ کچھ خراجِ تحسین وصول کر ہی لیتی ہے۔

انیٹونی جو خدمت وہ انجام دیتا ہے، اُسکے لحاظ سے ضروری نہیں ہے کہ انیٹونی کی سیرت نگاری بھی اُسی احتیاط اور جامعیت کے ساتھ کیجائے، جیسی کہ بروٹس کی، جسکا وہ بین متضاد، یا جیسی کاسیس کی جسکا بعض صفات میں وہ مشارک ہے، اُسکی سیرت قلم برداشتہ مگر موثر پیرایہ میں کھینچی گئی ہے۔ اُسکے عیوب

کھلے ہوئے ہیں۔ اعلیٰ نظریوں کی پابندی اور جزئیات کی پرمعنہ کرنے میں وہ کاسیس کاہم طریقت ہے دیکھو وہ لیفی دس کے بارے میں کیسے خیالات ظاہر کرتا ہے (۳/۲ ...) وہ انطونیس سے صاف صاف کہدیتا ہے کہ اُسکا ارادہ کاربرآری تک لیفی دس سے بطور ایک لدیجان کام لینے کا ہے۔ لیفی دس کو فقط اُنکی روش کے مطاعن میں حصہ لینا ہے، ثمرات میں نہیں۔ بس اُنکی ظالمانہ اور ناسزا خدمت بجالائے اور نکالدیا جائے۔ ایک حلیف کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا کمینہ برتاؤ ہوسکتا ہے۔ پھر وہ شخص جو نہ صرف اپنے دل ہی میں ایسا خیال باندھتا ہے بلکہ اُسکا برملا اظہار بھی کرتا ہے، ضرور ہے کہ اُسنے تمام جزئیات کو دل سے نکال پھینکا ہو۔ اسکی مثال کہ انطونی کی نظر میں اصول کی کیا وقعت ہے، اسی سین میں موجود ہے

غیر اصولی | اپنے مجمع والی تقریر میں اُسنے سیزر کے وصیت نامہ کو کسقدر سراہا اور کیرات وثمرات سیزر کے شاہانہ اوقاف کا جوش انگیز ذکر کرکے اہل سازش کے خلاف لوگوں کو کس کس طرح مشتعل کیا ہے۔ اب (۳/۲ ...) وہ اسی وصیت نامہ کو بالائے طاق رکھنے اور متروکات میں کتر بیونت کرنے کی فکر کر رہا ہے ع
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا! نیز اسی موقع پر وہ بلا تاسف ومعذرت بھتیجے کی جان کا سودا چکا کر اپنی شقاوتِ قلبی کا ثبوت بھی دیتا ہے۔

بیرحم گر قابلِ تحسین وصاف سے متصف | تاہم بے اصول، بیرحم اور نفس پرست ہونے پر بھی انطونی میں بہت سی باتیں قابلِ تعریف ہیں، اُسکی بے جگری، فتوت اور خود اعتمادانہ خوش تدبیری میں عجب دلربائی ہے۔ وہ کبھی چوکتا ہی نہیں۔ مثلاً جبکہ سازشی قتل کے بعد اُسے دارالامارۃ میں واپس طلب کرتے ہیں، وہ جھجھکتا ہے، مبادا اب میرے قتل کی باری ہو (۳/۱ ...) لیکن بروٹس کی پُرانفعال تقریر اور کاسیس کی زیادہ تر عاملانہ رشوت سے اندازہ کرلیتا ہے کہ وہ سازشیوں کے ساتھ سردست سمجھوتہ کرسکتا ہے اور اپنی جان بچا سکتا ہے
العاقل تکفیہ الاشارۃ۔ وہ فی الفور اس اشارہ سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اُنکے جرگہ میں شامل ہونے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ ورنہ ایسی ہوشیاری کے ساتھ احمق بنا تا ہے۔ جس ہوشیاری سے بعدہ مجمع کو رام کرتا ہے اس پُر جگری اور ہوشمندی کی دوسری آزمائش سیزر کی تجہیز وتکفین کا موقع ہے اور یہاں بھی وہ امتحان میں پورا اُترتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ شہری بروٹس کے طرفدار ہیں۔ وہ اُنکو "زندہ باد بروٹس، زندہ باد!" کے نعرے لگاتے ہوئے سنتا ہے، مگر وہ بجا باعرشہ پر جاتا اور مخالف سامعین سے آنکھیں چار کرتا ہے۔ وہ اُنکے دلوں کو مٹھی میں لے لینے اور اُنکی مخالفت کو سازشیوں کی جانب پھیرنے کی ٹھان لیتا ہے اور

اس کامل مہارت سے اپنا مدعا حاصل کرتا ہے، جس سے خطرہ کی موجودگی میں صرف غیر متزلزل استقلال ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ فطرۃ بشریہ کے پہچاننے کے لیے اس تجسس بالغ نظری کا ثبوت بھی ملتا ہے جس سے

انٹونی کی تقریر کا مقابلہ بروٹس کی تقریر سے

بروٹس بالکل بے بہرہ ہے، بروٹس نے لوگوں کو معقولات یعنی دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی ہے، جسکا خطاب دماغ سے ہے۔ انٹونی اُنکے دلوں سے استغاثہ کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ معمولی انسان کی نظر میں کسی مجرد اصول کی نسبت ایک شخصیت زیادہ دلکش ہوا کرتی ہے۔ وہ سیزر کی شخصی خدمات کو جو اُس نے روما کے حق میں انجام دی ہیں، اہل روما سے اُسکی شخصی محبت کو جو وصیت نامہ سے ظاہر ہوتی ہے اور اُسکے دردناک انجام کو یاد دلاتا ہے۔ بس جوش کی ایک لہر اُٹھتی ہے اور بروٹس کی تقریر کے تمام اثر کو بہا لیجاتی ہے۔ آنکھوں اور دماغوں کو خیرہ کرنیوالی ہی، یہ خود اعتمادی، دلیری، اور تیز ذکاوت جو اتنے مخالفین کے مقابلہ میں ایسی فتح حاصل کرتی ہے۔ گویا ایک مثالی، جید اور پُر حوصلہ شخص آنکھوں کے سامنے ہے، جو جانتا ہے، اُسے کس چیز کی ضرورت ہے، اور وہ اُسے کیونکر پا سکتا ہے، کیسی ہی کٹھن مشکلات درپیش کیوں نہ ہوں، واقعات بروٹس اور انٹونی دونوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ اور یوں مرد فلیسوف اور مرد عامل باہمی تخریب کا موجب ہوتے ہیں۔

سیزر کے سامنے اُسکی عقیدت مندی جو اُسے ہماری ہمدردی کا مستحق ٹھیراتی ہے۔

سب سے زیادہ ہمکو سیزر کے ساتھ انٹونی کی ارادتمندی پسند آتی ہے جس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ صادق و راسخ (۲/۱ ...) محبت قاتلین سیزر کی موجودگی میں بھی نہیں چھپائی جاتی (۳/۱ ...) اور جب انٹونی لہولہان لاش کے کے ساتھ تنہا رہ جاتا ہے، تو یہ اور بھی صاف لہجہ میں بولتی ہے (۳/۱ ...) فرماں فرما انٹونی کے ساتھ اب کوئی سلوک نہیں کر سکتا۔ اسکے دشمن غلبہ پا چکے ہیں اور مقتضائے مصلحت یہ ہے کہ اُنکی دعوت دوستی کے جواب میں سر جھکا دیا جائے۔ لیکن مقتول کی محبت مصلحت کو زیر کر لیتی ہے، انتقام کا حکم دیتی ہے اور وہ اس حکم کی تعمیل میں اپنے تئیں جھونکدیتا ہے۔ انٹونی کی یہی عقیدت سیزر کے ساتھ ہمیں اُسکی طرف کھینچتی ہے اور ہم اُسکے عیوب کی طرف سے کسی قدر اندھے ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ہم اپنے دل میں کاسیس کے لیے محسوس کرتے ہیں بوجہ اُس عقیدت کے جو اُسے بروٹس کے ساتھ ہے۔ وہ جو دوسرے کی بڑائی کی معرفت رکھتے ہیں اور اس سے صدق و وفاداری برتتے ہیں، خود بھی بڑائی کے لگاؤ سے خالی نہیں ہوتے

جولیس سیزر

شکسپیر نے جولیس سیزر کی سیرت نگاری کا حق بہت کم ادا کیا ہے، شاید اس خیال سے کہ

اہل سازش کہیں بالکل ہی کسی ہمدردی کے مستحق نہ سمجھے جائیں - اس میں کلام نہیں کہ فرماں فرما کی ذات کو ایک قسم کی عظمت سے جلوہ دیا گیا ہے، لیکن یہ ایک ایسی عظمت ہے جو جلد جلد زائل ہو رہی ہے - اسکی جسمانی طاقت کو کبرسنی نے توڑ ڈالا ہے اور طبیعت کو حصول اختیار نے خراب کر دیا ہے۔ "جولیس سیزر" میں وہ مغربی یورپ کا بہادر فاتح نہیں ہے بلکہ بوڑھا اور ضعیف سیزر جسکو جسمانی اور دماغی طاقتیں جواب دے رہی ہیں -

مغرور اور مشیخت پناہ | غرور اور مشیخت تو اُسکی ملاحظہ ہو: وہ اپنے کو خطرہ سے بھی زیادہ خطرناک بتاتا ہے (۲/۲ ...)۔ دنیا بھر میں وہ ایک ہی ثابت قدم اور غیر متغیر شخص کو جانتا ہے یعنی خود بدولت (۳/۱ ...)۔ وہ اکثر اس طرح کلام کرتا ہے، گویا سیزر کسی خدا کا نام ہے (۲/۱ ...، ...، ...) وہ خطا سے محفوظ ہے۔ "سیزر خطا نہیں کرتا (۳/۱ ...)" مجلس شوریٰ اُسکی اپنی مجلس ہے (۳/۱ ...)۔ حالانکہ اسی کا ایما ہے کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے لیکن اسکی اطلاع مجلس کو لائق عنوان میں نہیں بھیجتا (۲/۲ ...) - نائبین شہر کو سرکاری عہدوں سے اس لیے برطرف کر دیتا ہے کہ وہ اُسکی شخصی اہانت کے مرتکب ہوئے تھے (۲/۱ ...)۔ وہ میٹلس سمبر کی درخواست کو توہین آمیز حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے (۳/۱ ...)

متلون مزاج | اس میں کمزوری کی تمام تلون مزاجیاں موجود ہیں۔ پہلے کلفورنیا کے سامنے ڈگمگاتا ہے بعدہٗ ڈسیس کے سامنے - اسپر بھی اپنی ثابت قدمی کی ڈینگ مارتا ہے (۳/۱ ...)۔ خوشامد سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، اگرچہ اُسیوقت خوشامد کا حربہ اُسپر کارگر پڑتا ہے (۲/۱ ...)۔ ارا کین مجلس (پیران نابالغ) کو حقیر سمجھتا ہے اور پھر اُنکے تمسخر سے بھی ڈرتا ہے (۲/۲ ...)۔ بہادری کے دعوے اتنے کرتا ہے کہ خواہ مخواہ بھی شبہہ ہونے لگے - اپنی مردم شناسی پر اتنا گھمنڈ ہے، کہ ایک نجومی کو ایک ہی نگاہ غلط انداز میں وہمی کا خطاب دیکر سامنے سے ہٹا دیتا ہے، مگر سازشیوں کو کبھی نہیں پہچانتا - ایک کاسیس کے سوا (۲/۱ ...)۔ وہ مسلمہ اعتقادات کے خلاف توہم پرست ہوگیا ہے (۱/۲ ...)۔ وہ ڈسیس سے کلفورنیا کے خواب کی تعبیر سنکر بہت خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خود اُسکی تعریف سے مملو ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس میں اسکے خون کا بہنا جو اصل بدشگونی ہے، حذف کر دیا گیا ہے۔ اُسکے گریبان کھول ڈالنے پر بھی ہنسی آتی ہے (۲/۱ ...)۔ تاج پہننے کی خواہش کرنا اور قبول نہ کرسکنے پر طیش کھانا (۲/۱ ...) یہ دونوں باتیں اُسکی کمزوری اور عدم ضبط و ضبطی پر دال ہیں۔ شیکسپیر نے اصل میں ہمارے لیے ایک عظیم الشان سیرت اور زندگی کی شفق کا سماں کھینچا ہے، جو گذشتہ عظمت کے جلووں سے صرف گاہ بگاہ جھلملا اُٹھتی ہے، یہ دکھا کر کہ اسکی شخصیت اور اثر کو موت بھی زیر نہیں کرسکتی، وہ ہمیں محسوس کرا دیتا ہے کہ سیزر کا ال

اختیار میں کیا کچھ رہ گیا یہ کیا کچھ حاصل کر چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مضمحل ڈھانچہ مار کر گرا دیا گیا ہے، مغرور آواز خاموش کر دیگئی ہے، لیکن سیزر کی روح فاتحانہ بلند ہوتی ہے، اور اس طرح اُسکی کمزوریاں گویا لاشئی ٹھیرتی ہیں اُسکی ناقابل مزاحمت قوت کے سامنے جبکہ وہ جسمانی قیود سے چھوٹ گئی ہے۔

پورشیا پورشیا بروٹس کا مثنیٰ ہے، اُسکا لطیف عکس، جس طرح وہ نہیں بھلا سکتا کہ وہ بروٹس ہے، اُسکا دل بھی اس احساس سے لبریز ہے کہ وہ بروٹس کی بیوی اور قیطو کی بیٹی ہے۔ یہ احساس کہ وہ ایسے باپ کی بیٹی اور ایسے شوہر کی بیوی ہے، اُسے ایک قسم کی خود ضبطی مستعار دیدیتا ہے، گو اتنی نہیں، جتنا وہ خیال کرتی ہے، کیونکہ شوہر کی طرح اُسکی طبیعت بھی حقیقتاً نہایت اثر پذیر واقع ہوئی ہے، وہ نسوانی نزاکت سے پُر ہے، جیسا کہ بروٹس کے بارے میں اُسکی تشویش سے ظاہر ہوتا ہے (۲/۱ ...) اور سطحی ضبط قوی جذبہ کے غلبہ سے دب جاتا ہے، دیکھو اُسکا نہ چھپنے والا جوش اُس روز کی صبح کو، جو سازش کے عمل میں لانے کے لیے مقرر ہوا ہے۔ اور اُسکا اعتراف: "اُف مرے اللہ! عورت کا دل بھی کیا ہی کمزور شئی ہے"۔ چنانچہ سازش کا انجام دیکھنے کے لیئے وہ آخر تک تاب نہیں لا سکتی۔ بوجھ طاقت سے زیادہ ثابت ہوتا ہے اور خودکشی کر لیتی ہے (۲/۴ ...)

"جولیس سیزر کی نہایت دلکش قلمکاریوں میں سے ایک صنعت زن و شو کے مقصورانہ تعلقات کا مرقع ہے، جو شیکسپیر نے دوسرے ایکٹ کے پہلے سین میں دکھایا ہے، اس کامل روحی اختلاط کا سیزر اور کلفورنیا کے بودے رشتہ سے تقابل کیجیے۔ فرماں فرما کی بیوی اُسکے نزدیک مثل ایک بچہ کے ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے اُسے بہلائے۔ مگر پورشیا دعویٰ کرتی ہے، کہ وہ اپنے منصب کی حیثیت اور حق کی بنا پر شوہر کی پوشیدہ ترین خیالات میں حصہ لینے کی مستحق ہے۔ بروٹس اُس پر اپنا راز کھول دیتا ہے جو اُسکے سینہ کے لیے اتنا گراں تھا اور اُسی کو ہم دیکھتے ہیں کہ پورشیا کی تحویل میں بالکل محفوظ و مصئون رہتا ہے۔ (ماخوذ و مترجم)

سید تفضل حسین ناشر (حیدرآباد دکن)

تاریخ انتقال

عبدالباقی صاحب مرحوم مالک کمپنی عتیق اینڈ برادرس امین آباد پارک لکھنؤ

(از فکر محمد ارتضا علی صاحب علوی شرر کاکوروی انسپکٹر آبکاری ملیح آباد)

مرگِ بے ہنگام ہے باقی کی موت تھا بہت قابل مدبر نوجوان

چھپ گیا مہرِ سعادت ہائے ہائے ہوگیا تاریک آنکھوں میں جہاں

فکر ہے تاریخ رحلت کی مجھے لکھ شرر- باقی ہے ترت میں نہاں ([illegible])

طلوعِ قمر

(سفرِ شب کے مشاہدات)

بستی سے تھا دور، ایک فراموشی کا عالم   اور تاروں بھری رات کی خاموشی کا عالم
چھائے ہوئے جنگل میں سب آثارِ سکوں تھے   اشجار بھی سہمے ہوئے پابندِ سکوں تھے
اک گھاس کی پتی کو بھی حرکت نہ ذرا تھی   سناٹا کچھ ایسا تھا کہ مسحور ہوا تھی
اک امنِ حقیقی تھا کہ تھا طاریِ صحرا   تھا خواب کا عالم بیداریِ صحرا
چپ چاپ یہ منظورۂ نظارگیاں تھا   انداز سکوتِ دلِ شاعر کا گماں تھا
کچھ دیر میں اک اور ہی نقشہ نظر آیا   مہتاب سے انوار کا جلوہ نظر آیا
تاریکیِ نزدیک، کہ تھی ممنونِ کواکب   منت کشِ فیاضیِ گلگونِ کواکب
بچپن سے جوانی ہوئی اک شوخ حسیں کی   یا طلعت کیا چاند نے وسعت پہ زمیں کی
سیمیں سیال ہیں تھاں تھیں شعاعیں   گویا ارمِ نور کی پریاں تھیں شعاعیں
تابانیاں حصہ میں جو آئی تھیں زمیں کے   ذرات بھی افشاں تھے کسی ماہ جبیں کے

وہ میں کہ نظر آتا ہوں اک پیکرِ خاموش   سینہ میں لیے پھرتا ہوں اک محشرِ خاموش
اس ظلمتِ ہستی سے ہراساں نہیں ہوتا   آزردہ و حیران و پریشاں نہیں ہوتا
ملتا جو نہیں کوئی شناسائے حقیقت   کرتا ہوں شکیبائی سے اخفائے حقیقت
دل کو مگر اپنے کبھی گھٹنے نہیں دیتا   اس جنسِ گراں مایہ کو لٹنے نہیں دیتا
مایوسیوں میں شوق مرا راہ نما ہے   تاریکیِ مطلق میں ستاروں کی ضیا ہے
احساسِ سیہ بختی سے پُر غم نہیں ہوتا   حسرت کشِ ناکامیِ پیہم نہیں ہوتا
امید کو رکھتا ہوں چراغِ رہِ مقصود   رہتی ہے مرے سامنے منزلگہِ مقصود
ہے منتظرِ تابانِ جہاں زندگیِ عشق   محتاجِ مئے حسن ہے تابندگیِ عشق
اُس جلوۂ پنہاں کے مظاہر ہیں نظر میں   مستقبلِ رخشاں کے مناظر ہیں نظر میں
حاصل مجھے ہر وقت طمانیتِ دل ہے   جس میں کوئی حارج ہے مرا اور نہ مخل ہے

ارشد تھانوی

حسن آرا

عنوان بالا کے تحت میں "الناظر" کے اپریل نمبر ۱۸ء میں ایک نظم صفحہ ۲۳ پر نظر سے گزری - معزز ایڈیٹر صاحب کی اجازت سے اسکے متعلق نقیر عاجز اپنے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہے - زبان کے اعتبار سے یہ نظم ہر طرح قابلِ تعریف پائی جاتی ہے -

"شوہرِ نیک دل - گیا آیا مولوی کو مکان پر لایا"

ایک مختصر سے شعر کے ذریعہ سے پوری داستان بیان کر دی ہے - یہی اختصار ہے جسکے لیے مثنوی گلزار نسیم ایک خاص شہرت رکھتی ہے -

"ایک خوش ہو کے جان لیتا ہے ایک خوش ہو کے جان دیتا ہے"

دو ہی لفظوں "لیتا" اور "دیتا" کے اُلٹ پھیر میں واقعہ نگاری اور انسانی جذبات کی تصویر نہایت دلکش اور دلنشیں پیرایہ میں کھینچ دی گئی ہے - اس نظم کا ہر ہر لفظ بول رہا ہے کہ مضمون نگار صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں -

یہ سب کچھ تو ہے مگر بیسویں صدی کی ترقی کرنے والی دنیا صرف اتنا ہی نہیں چاہتی، محض اتنے ہی پر کمالاتِ شاعری کا خاتمہ نہیں سمجھ لیا گیا ہے - بلکہ برعکس اسکے اس حد سے بہت دُور تک آپ آگے بڑھنا پڑیگا اگر بیسویں صدی کے مستند شعرا کی صف میں جگہ لینا منظور ہے - یہی خامی ہے جو معزز ڈاکٹر اقبال صاحب کی راہ میں حدِ فاصل بنی سامنے کھڑی ہے - اور یہی خامی ہے جو حضرت شوق قدوائی کے سے مستند فاضل، باکمال ادیب اور قابلِ عزت شاعر کو بھی منزلِ مقصود تک پہونچنے نہیں دیتی - مسٹر نائڈو اور سر رابندرو ناتھ ٹیگور میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ اُنکا نام سنتے ہی یورپ اور امریکہ تعظیم دیتا ہے - شوق یا اقبال میں کیا خامی ہے کہ اُنکا کلام کوئی کان دھر کر نہیں سنتا؟ ٹیگور کا نام یورپ اور امریکہ کا بچہ بچہ جانتا ہے، شوق اور اقبال کو نہ کسی نے آج تک جانا کہ کون ہیں اور نہ شاید آیندہ جاننے کی کوئی کوشش کریگا اگر یہی لیل و نہار قائم ہے - شوق اور اقبال اب تک بیسویں صدی کی زندہ شاعری سے کم سے کم دو صدی پیچھے ہیں - دونوں اب تک فارسی اساتذہ کی بوسیدہ ہڈیوں سے چمٹے ہوئے ہیں -

اور جو سڑک فردوسی، انوری، خاقانی اور مولانائے رومی نے کوٹ کر طیار کی تھی اُس سے ایک انچ آگے بڑھکر کوئی نئی راہ تلاش کرنا پسند نہیں کرتے۔ حضرت شوق اگر بڑھتے بھی ہیں تو ایسے کوچہ میں قدم پڑتا ہے جسکے نشیب و فراز کا اُنھیں بالکل کوئی علم نہیں ہے۔ "قاسم وزہرہ" میں اس اجمال کی پوری پوری تفصیل ملتی ہے۔

یہی حال "حُسن آرا" کا بھی ہے۔ بیسویں صدی کے شاعر کے لیے جو یہ چاہتا ہو کہ ہماری آیندہ نسلیں بھی اُسکی عزت کریں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ گلزار نسیم یا زہر عشق لکھ سکے۔ اُسے اس حد سے بہت دُور تک آگے بڑھنا پڑے گا۔ اگلے زمانہ میں ایک بلند پایہ شاعر کے لیے اتنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ معشوق کا سراپا اچھا لکھ سکے۔ عشق کو آتش جہاں سوز کہے برق کہے اور عاشق کے دل کو خرمن بنا کر اُس برقِ بلا کی نذر کردے۔ معشوق کے حُسن کی ایک دل آویز تصویر کھینچ سکے۔ عاشق کی بیقراری اور گریہ وزاری، اُسکی بیکسی، اُسکی بےخودی کی ایک جیتی جاگتی تصویر درد سے بھرے الفاظ میں کھینچدے وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب زمانہ نے اس حد سے بہت آگے تک ترقی کی ہے اور جب تک آپ بھی اُس حد تک نہیں پہونچتے ہیں آپ اُس صف میں کیونکر جگہ پا سکتے ہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ حسن آرا ایک بیاہی ہوئی لڑکی تھی جسکا شوہر وطن سے دُور تھا۔ خط لکھانے کے لیے مولوی صاحب بُلائے گئے۔ اتفاق سے پردہ گر پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ اور دیکھتے ہی ایک دوسرے کے عاشقِ زار بنگئے۔ شوہر سفر سے واپس آیا۔ حُسن آرا نے شوہر کو بھیجکر مولوی صاحب کو بُلایا۔ تاکہ حُسن آرا کو دیکھکر اُنھیں تسکین آجائے۔ گویا حسن آرا کی پاک نظری کا یہ ثبوت تھا۔ مولوی صاحب آئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں گرے اور مرگئے۔ اس کے بعد آپ نوحہ خواں ہیں کہ

"جان لینے پہ عشق ہے مجبور اس کی سرکار کا ہے یہ دستور
ایک خوش ہو کے جان لیتا ہے ایک خوش ہو کے جان دیتا ہے"

مگر ذرا غور سے دیکھیے تو اول سے آخر تک آپ کے قصہ کی کوئی چول سیدھی نہیں ہے۔ یعنی بیسویں صدی کی ترقی کرنے والی دنیا کے معیار سے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بیاہی عورت یورپ اور امریکہ کی شاعری میں عشق کرنے یا عاشق ہونے

یا معشوق بننے کے قابل باقی ہی نہیں رہتی۔ یورپ اور امریکہ کی شاعری میں ہمیشہ ایک کنوارا لڑکا ایک کنوارا لڑکی پر عاشق ہوتا ہے۔ وہاں کی شاعری میں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ بیاہی عورت سوا اپنے شوہر کے کسی غیر مرد سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔ میاں بیوی کی محبت کا نام صرف محبت ہے۔ یہ عشق سے بالکل ہی مختلف چیز سمجھی گئی ہے۔ اگر اسکا ذکر کہیں آتا ہے تو محبت کی ذیل میں نہ کہ عشق کی مد میں داخل کر کے۔ بیسویں صدی کی تعلیم یافتہ دنیا بالکل ہی سمجھ نہیں سکتی کہ ایک بیاہی لڑکی کو ایک اجنبی مولوی سے محبت رکھنے یا عشق پیدا کرنے کا کیا موقعہ پیش آسکتا ہے۔ اگر آپ جواب دیں کہ یہ سچا قصہ ہے۔ تو اُسکا یہ جواب ہوگا کہ ایسے سچے قصوں پر خاک ڈال دی جاتی ہے اور کوئی شخص جو شاعر بنا چاہتا ہو اُسکے لیے یہ بات از حد شرمناک ہے کہ ایسا مضمون اپنی نظم کے لیے منتخب کرے۔ پھر آگے چلیے۔ بیوی پاک نظر تھی۔ مانا کہ تھی اُسنے شوہر سے مولوی صاحب کے عشق کا حال کہا۔ تقاضائے فطرت تو یہ تھا کہ شوہر یہ حال سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا مگر برعکس اسکے حسن آرا کا شوہر خود ہی مولوی کو بلانے بھی دوڑا جاتا ہے۔ کیا ایسا کوئی شوہر ساری خدائی میں چراغ لیکر ڈھونڈھنے پر بھی مل سکتا ہے! زمانۂ حال میں فطرتِ انسانی کا مطالعہ شاعر کا سب سے پہلا درس ہے۔ مگر یہاں پہلی ہی بسم اللہ غلط ٹھیرتی ہے۔

فقیر نے جو کچھ اوپر عرض کیا ہے ایک اہم قومی خدمت سمجھکر اُسے انجام دینا چاہا ہے۔ نہ اس سے اظہار ہمہ دانی مطلوب ہے اور نہ خواہ مخواہ کسی کی حرف گیری اور دل آزاری۔ مگر ادب کے ساتھ اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہے کہ عاجز کی رائے ناقص میں زبان کی ترقی اور اسکے ساتھ ہی ساتھ قومی ترقی کی بھی راہ ہے یہی۔ چاہے ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔

میری معروضات کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنے بلند پایہ شعرا اور اُستادانِ فن کی توہین کریں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ برعکس اسکے وہ ہر حال میں مستقل عزت کے حقدار ہیں۔ اور ہمارا فرض اولیں ہے کہ ہر طرح اُنکی عزت کریں۔ میرا یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ حشو و زوائد کو بوچھار اور انگریزی یا فارسی عربی الفاظ کی غیر ضروری بھرمار سے زبان بچائی نہ جائے یا متروکات کا استعمال زبردستی جائز قرار دیدیا جائے۔ ایسا کرنا دراصل خودکشی کے ہم معنی ہوگا۔ زبان کا تمام آلائشات سے پاک رہنا سب باتوں پر ہر حال میں مقدم ہے۔ اگر یہی نہیں ہے تو ہر ترقی ترقی معکوس ہوگی۔ اور ترقی کے معنی تنزل ہی ٹھیرینگے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام میں فارسی الفاظ، فارسی محاورات اور فارسی طرزِ ادا کے خلاف عاجز نے ہمیشہ صدا بلند کی ہے

اسی موجودہ حد پر قائم رہکر ہر حال میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ جس حال میں گردوپیش کی دنیا سرعت کے ساتھ ترقی کررہی ہے ہمارا ہمیشہ اسی موجودہ حد پر قائم رہنا اور آگے نہ بڑھنا بھی ایک ناقابلِ برداشت نظارہ ہے۔ اُردو زبان زندہ نہیں رہ سکتی اگر وہ ایک مدت دراز تک موجودہ حدود کے اندر محدود رکھی گئی۔ جب تک ہماری شاعری بیسویں صدی کی ترقی کرنے والی شاعری کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے یہ کیونکر ممکن ہو سکے گا کہ ہمارے شعرا بھی اُسی صف میں جگہ پا جائیں جہاں زندہ قوموں کے شعرا صدر نشین ہیں۔ بیسویں صدی کی ترقی کرنے والی دنیا ہمارے بلند پایہ شعرا کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہے۔ کیا یہ بات ہماری قومی ہستی کے لیے ایک خطرۂ عظیم نہیں ہے؟ مگر آخر اس کا کیا علاج ہے؟ اگر کوئی علاج ہے تو کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے؟ یہ نکات ہیں جن پر ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرکے کوئی رائے قائم کرنا چاہیے۔ کوئی قطعی فیصلہ کرنا چاہیے۔

فقیر اظہر علی آزاد (ایم۔آر۔اے۔ایس۔لنڈن)
ادبی نقاد "پیام اُمید"

پارۂ دل

دل نہیں ہے کیا کوئی ملکِ ستم آباد کی
جسکے ہر گوشہ سے آتی ہے صدا فریاد کی

دل سے عہدِ ضبط لیکر اُسنے وہ بیداد کی
بے زباں ہوکر زبانِ حال سے فریاد کی

یوں مٹا یا صفحۂ ہستی سے تونے اسے فلک
خاک تک باقی نہیں اک خانماں برباد کی

ہستیٔ موہوم اور پھر اُسپہ امیدِ ثبات
پائداری تا بکے ایوانِ بے بنیاد کی

ہل گئے دل قدسیوں کے عرش و کرسی کانپ اُٹھے
رو کے یہ کس بے گنہ نے حشر میں فریاد کی

جو یہاں سے آیا وہ یہیں کا ہو رہا
کسقدر دلچسپ ہے دنیا عدم آباد کی

اب تو آزادی اسیری دوسرے کے ہاتھ ہے
چُپ رہ اے مرغِ قفس مرضی جو کچھ صیاد کی

نشتر آنسو دیکھنے والوں کے جاری ہوگئے
ایسی بیدردی سے اُس بیدرد نے بیداد کی

نشتر (سندیلوی)

موت کا جزیرہ

بحرِ ناپیدا کنار کی قہار موجیں ایک سنگلاخ جزیرہ کی اونچی نیچی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر خود کو سفید جھاگوں، بڑے بڑے حبابوں، اور منتشر چھینٹوں میں فنا کر رہی تھیں۔ سہمناک آبی منظر میں سخت طوفان خیز مواجی تھی۔ سینۂ آب سے اُٹھنے والی موجیں پہاڑی کی بلندی تک اُٹھکر قعرِ سمندر تک پہونچ رہی تھیں۔ منجمد برف کے عریض و طویل سخت ٹکڑے موجوں کے ساتھ آسمان تک جاتے اور تحت الثریٰ کی خبر لے رہے تھے آبی مخلوق ان تباہ کن ٹکروں سے پریشان ہو رہی تھی، مر رہی تھی۔

ہر لحظہ بڑھنے والا طوفان خوفناک صورت اختیار کر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے آندھی کے جھکڑ بنکر سیاہ بادلوں کی فوج لیے ہوئے ساری فضا پر محیط ہو گئے۔ اور آسمان نے پانی اُگلنا شروع کر دیا۔ بجلی کی چمک رعد کی کڑک نے سمک سے سماک تک ذرہ ذرہ کو ہلا دیا۔ اندھیرے کی تاریک چادر نے ساری موجودات کو چھپا لیا۔ بھیانک گھٹا ٹوپ اندھیری نے زہرہ ریز گرج اور شدتِ باراں کے ساتھ مل کر منظر کی ہولناکی کو اور بھی المضاعف کر دیا تھا۔ مینھ کی بڑی بڑی بوندیں گولیوں کی باڑھ کی طرح سینۂ موج کو پاش پاش کر رہی تھیں۔ سمندر کا پانی آسمان کے پانی سے ملنے کے لیے اُبال لے رہا تھا۔ آبِ باراں سمندری پانی کے معانقہ کے لیے جھکا پڑتا تھا اور سما کا کہیں پتہ نہ تھا بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات کو سمندر نے ہضم کر لیا ہے۔ اگر روشنی تھی تو برقِ جہاں سوز کی اور آواز تھی تو رعد جگر دوز کی۔

چند انسانی ہستیاں ایک شکستہ ستولوں اور پھٹے بادبانوں کے جہاز پر موت و زیست کی حالت میں امید و بیم کے ساتھ مبتلائے تلاطم تھیں۔ جہاز ایک خس نیم جاں کے مانند اپنے ناتوان بادبانوں کی کمزوری سے شناورِ ظلمت و طوفان تھا۔ طوفانی تھپیڑوں کی پُر زور ٹکر اسکو مشرق سے مغرب بنا دیتی۔ بحری اُبال جہاز کو پہاڑی کی بلندی تک لیجاتا اور آبِ باراں کا دھکا اُسکو قعرِ بحر میں ڈھکیل دیتا تھا۔ ان فلاکت زدہ اور غریب الوطن راکبوں کی پذیرائی نہ آسمان پر تھی اور نہ زمین پر۔ اس کشمکشِ جانستاں و گیر و دار میں ایک اور مصیبت بلا کی طرح ان غریبوں پر نازل ہوئی ـــــ جہاز برف کے ایک تودہ سے ٹکرایا جس نے اُسکے جوڑ جوڑ کو ہلا دیا تختوں کو پرزے پرزے کر دیا۔ اور اس ستم رسیدہ طائفہ کی اِس چھوٹی اُمید کو بھی کہ

"شاید یہ طوفان رک جائے شاید ہم کسی جزیرہ کے پاس جا پہونچیں" بے رحمی سے توڑ دیا۔ زندگی کا یہ شکستہ سہارا بھی نہ رہا۔ اگلے حصہ میں جس جگہ جہازی جال رکھا جاتا ہے کوئی ۶ گز مربع شگاف کھل گیا پانی نے تیزی سے اُسکے زیریں حصہ میں پہونچکر جہاز کو ایک طرف جھکا دیا۔ راکبانِ جہاز کا دل یاس سے ڈوبنے لگا۔ عرشۂ جہاز پر ورطۂ ہلاکت میں جانے والی ہستیاں مشغول تگ و تاز تھیں اور کوئی راہ کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ ہوش گم، حواس پراں تھے۔ خدا معلوم کب سے وہ اس طوفان بلا کا مقابلہ کر رہے تھے اور کیا کیا کر چکے تھے۔ بدن جہاز کے ہچکولوں، موجوں کے تھپیڑوں، بارش کی مار اور اولوں کی بوچھار سے زخمی و چکنا چور تھا۔ لباس پھٹے ہوئے اور بھیگے ہوئے۔ ہائے! افسوس کہ سمندر نے راکب مرکب دونوں کو نگل لینے کے لیے منہ پھاڑ دیا۔ گو جسم میں جان اور اعضا میں سکت نہ تھی لیکن پیاری زندگی کے بچانے کے لیے ایک اور آخری تدبیر کی گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جلدی جلدی رسیاں کاٹ کر ناہموار پانی پر چھوڑ دی گئیں راکبانِ جہاز خوف آمیز گھبراہٹ کے ساتھ بدحواسوں کی طرح ان میں کودنے لگے۔ زبوں طالعی نے یہاں بھی اپنا سایہ ان خفتہ بختوں کے سر سے نہ ہٹایا۔ کئی کشتیاں تو لوگوں کے بے تحاشہ کودنے سے اُلٹ گئیں اور کئی کو پانی کی بیچین کروٹوں نے منتشر کرکے، خدا جانے کدھر پہونچا دیا۔ ہاں خوش قسمتی کہو یا سمندر کی مہربانی کہ دو چار صحیح سلامت بھی رہیں جنمیں بمشکل چار آدمی اپنی عزیز جانیں بچا سکے۔ جہاز نصف سے زیادہ ڈوب چکا تھا۔ تختوں کے ٹوٹنے کی چرچراہٹ برفیلی ٹکڑوں کی ٹکروں سے جو آواز پیدا ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کی ہولناک انتقام گیر دیوی موت کا گیت الاپ رہی ہے۔

سبک رفتار کشتیاں پانی کے بیچین انتشار سے تہ و بالا ہو رہی تھیں۔ بیٹھنے والے خوف و ہراس سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ جہاز مستول تک غائب ہو چلا تھا۔ کوئی گھڑی جاتی تھی کہ تازہ دم اُٹھنے والی موج اسکو بھی لے ڈوبتی۔ طوفانی حالت میں ایک شمہ بھر کمی نہ تھی۔ موجوں کا غصہ، ہوا کا شور، بارش کا زور بدستور تھا۔ بہت دیر ہوئی کہ جہاز مع تین کشتیوں کے جو زد سے نہ بچ سکیں غرق آب ہو چکا تھا۔ صرف ایک منہوئی یچی جو ایک مسافر کی کمزور امیدوں کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھی۔ ایک جھلک تھی۔ مسافر کمزور تیوار کے جھوٹے سہارے پر ڈوبتا اُچھلتا۔ توکل بخدا، طبیعت کی ہاری یا بخت کی یاوری سے جزیرہ کی پتھریلی ڈھلوان سے جا لگا۔ خوفناک طوفان اپنے انتہائی کمال کو پہونچکر رُکا۔ آسمان نے آنکھیں کھولیں، خورشید تاباں نے جو حاملِ لیل و نہار ہے" بادلوں کے پردہ سے جھانکا۔ اور اپنی تیز رنگیلی شعاعوں سے سرکش و قاتل

موجوں کو چھید ڈالا، زخمی کیا اور مغلوب کرکے سطح آب کے برابر کر دیا۔ اب معلوم ہوا کہ اس موذی و کشتی شناس سمندر کا یہ ہیجان و اُبال اس بےکس جہاز کے نگل جانے کے لیے تھا۔ سو وہ ہو گیا!!

طوفان زدہ مسافر پتھر کی بے ڈھنگی چٹان پر پانی کی دستبرد سے دُور تکان کے سانس لے رہا تھا۔ نیم باز آنکھیں نہ معلوم کس کس کے ماتم میں اشکبار تھیں۔ جسم برہنہ، اعضا میں سُستی، اور حوصلہ میں پستی تھی۔ چھوٹی کشتی ننگی ساحل پر پتھر کی چٹانوں میں رُکی ہوئی تھی۔

یہ سرزمین جہاں غریب الوطن مسافر پڑا تھا "موت کا جزیرہ" کہلاتی تھی۔ اس میں نہ آبادی تھی نہ خوبصورتی۔ دراصل یہ کوئی جزیرہ نہ تھا کیونکہ اسکی شکل ایسی ہی تھی جیسے اکثر سمندروں میں پہاڑیاں نکل آتی ہیں۔ اور اسکی سیاہ چٹانیں خوفناک صورت سے چپ چاپ راست پھیل کر سطح بحر پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ بعینہٖ یہی صورت اس خطۂ ارض کی تھی۔ اس ہولناک نام کا باعث جو دنیا والوں نے اس ٹاپو کا رکھا تھا یہ تھا کہ اکثر جہاز اسکی سیاہ و ناسوروں والی قرینہ چٹانوں سے ٹکرائے اور تباہ ہوئے تھے۔ اسکے آس پاس کا سمندر ہمیشہ متلاطم و طوفانی ہی رہا کرتا تھا۔ جہازراں اس جزیرہ کے نام سے کانپتے تھے۔ ملاح اُس طرف دیکھتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ مسافروں کا اسکے نام سے خون خشک ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اکا دُکا جہاز یہاں سے بخیریت گذر جاتا تو اُسکے راکب و ملاح، کپتان و خلاصی سبھی ملکر شکر کے دوگانے ادا کرتے، ترانہ سپاس گاتے اور پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھتے۔

ساکت و صامت پڑے پڑے شاید وہ گھبرا گیا۔ اُس نے ایک انگڑائی لی اور مضطرب نیند سے چونکا۔ آنکھیں کھولیں خاموش و سنسان منظر پر نظر ڈالی۔ دائیں بائیں گردن کو حرکت دی اور ناتوانی کے ساتھ اُٹھ بیٹھا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور پھر گردن جھکا لی۔

سازِ محویت کو شیر کی دل ہلا دینے والی گرج نے چھیڑ دیا ——— توڑ دیا۔ اگرچہ طاقت نہ تھی لیکن پیاری جان کے خوف سے اعضا برق صفت سرعت سے ہلے۔ اُس نے کھڑے ہو کر پیشانی پر ہاتھ رکھا کہ سورج کی چمک نگاہ کو خیرہ نہ کر دے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی سو گز کے فاصلہ پر شہنشاہِ حیوانات کو ایک ٹیلے پر کھڑے ہوئے دیکھا اور جلد معلوم کر لیا کہ شیر اُسی کی طرف دیکھ کر غرا رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ اُسکی زبردست جھپٹ مسافر کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دے۔ اُفتاں و خیزاں شاہ بلوط کے ایک درخت پر چڑھنے کے لیے لپکا۔ اس طرح کہ شیر اُسکے تعاقب میں اور وہ پیڑ کی تمنا میں۔ شکر ہے کہ شیر کا وار خالی گیا۔ مسافر ایک مضبوط ٹہنی پکڑ کر پھرتی سے اوپر اُچک گیا ——— ایک سیلا و بھیگا ہوا پستول نکلا۔

جنکی دو گولیاں شیر کے جسم میں تیر گئیں۔ پے در پے کئی اور آوازیں ہوئیں۔ پُرہیبت درندہ ہاؤ ہاؤ کا شور مچاتا پتھروں پر اور پتھروں سے سمندر میں جا رہا۔

فی الحقیقت یہ ایک بڑی جیت تھی۔ مسافر کا دل خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ جوشِ مسرت میں اُسنے اپنی وفادار ساتھی یعنی پستول کو چوما آنکھوں سے لگایا۔

بھوک کی تکلیف نے تلاشِ غذا کے لیے پیڑ سے اُترنے پر مجبور کیا۔ تن تبقدیر اُترا۔ چونکتا۔ دیکھتا بھالتا، پھونک پھونک کر قدم۔ رکھتا آگے بڑھا۔ شاہ بلوط اور چنار کے گھنیرے درختوں کا گنجان سایہ اُسکے سر پر تھا۔ جھاڑیاں اور کمسن پودے جھنڈوں کی صورت میں سدِ راہ تھے۔ اُسکے سوا نہ وہاں کوئی انسان تھا اور نہ انسانی نقشِ قدم۔ بلکہ درندوں، ہرنوں، بارہ سنگھوں کے کھروں اور پنجوں کے نشانات تھے۔ ہر لحظہ اگرچہ کسی تازہ بلا کا خوف دل کو سہمائے دیتا تھا لیکن قوتِ حیات کی تلاش سب پر فائق تھی، غالب تھی۔ بھولا بھٹکا مسافر ایک ایسے راستہ پر ہو لیا جو ایک صاف و شفاف ندی کے کنارے پر اُسکو لے پہونچا۔ جسپر ہری ہری گھانس کا سبز حاشیہ تھا اور جہاں بہت سے درخت اخروٹ کے تھے۔ شاہ بلوط کی ایک لمبی شاخ اس ندی پر سے ہو کر نکل گئی تھی، گویا وہ ایک معلق پل تھا۔ اگر کوئی اُسپر سے ہو کر جانا چاہتا تو اِدھر اُدھر جا آسکتا تھا۔

ندی کا موتی جیسا مصفا پانی پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں چمکدار ریت کے ذروں سبز گھاس ناکائی پر ہلکے ہلکے بہ رہا تھا۔ جا بجا چشمے اُبل اُبل کر اُسکی روانی میں گر کر ایک لطیف آواز پیدا کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کی خوبصورت ملکہ نازک انگلیوں سے ارگن بجا رہی ہے۔ ہیرے۔ لعل۔ یاقوت۔ زمرد۔ جواہرات سچے موتی بے قدری سے ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ مسافر کا دل جب نظارت سے ذرا سکون پذیر ہوا تو اُسنے اخروٹ اور جنگلی پھلوں سے شکم پُری کی ٹھیرائی۔ دونوں ہاتھوں کو ملا کر چلّوؤں سے سرد و صاف پانی پیا اور سبزہ پر لیٹ رہا۔ نیند گویا اُسکے استقبال کے لیے تیار ہی کھڑی تھی چپکے سے اُسکی خوبصورت آنکھوں میں آگئی اور ہلکے سے اُسکی گھنی پلکوں کو آپس میں ملا دیا۔ کہاں کا خوف، کیسی بھوک، کیا تکان۔ مسافر عالم خواب میں پہونچکر خیالی دنیا کی سیر کر رہا تھا۔

خدا معلوم اُس نے خواب میں کیا دیکھا کہ جسنے اُسکی پیاری نیند کو اُچاٹ کر دیا۔ چونکا دیا۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ حسرت کے ساتھ پُرنم آنکھوں سے، مسترحم نگاہوں سے آسمان کو دیکھا۔ اس طرح کہ ایک ہاتھ تو

دل پہ اور دوسرے سے سبزہ پر سہارا لیے ہوئے۔ دردناک "ہائے" کی آواز اسکے مُنہ سے نکلی۔ گردن پیچھے کو جھک گئی وہ بے سہارے ہو کر گھانس پر گرا۔ چند کلمے لکنت زدہ زبان سے بدشواری نکلے

میری —— پیاری —— محبوبہ —— میرے —— بچے۔ اور روح کا طائر خاکی و قفسِ عنصری سے ملاءِ اعلیٰ کو پرواز کر گئی۔ وہ اور اُسکا غم دونوں خاک میں مل گئے۔ واقعی یہ جزیرہ موت ہی کا جزیرہ تھا۔ (پہلا حصّہ ختم) عبدالحی ہالک، بنادیپ

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا — وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے — کہ مستغنیِ ماسوا ہو گئے ہم
انھیں رنج اب کیوں ہوا ہم تو خوش ہیں — کہ مر کر شہیدِ وفا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ مُنہ سے مانگا — تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
تری فکر کا مبتلا ہو گیا دل — مگر قیدِ غم سے رہا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

حسرت موہانی

ہر ادائے ناز کی اک تیغِ قاتل اُن میں ہے — ہر نظر پیکانِ اثر زہرِ ہلاہل اُن میں ہے
سرمہ کش آنکھیں بھرا ہے جن میں سحرِ سامری — عشوہ گر دو پتلیاں جادوے بابل اُن میں ہے
دل کو حیرت ہے مگر تصویرِ حیرت ہیں وہ آپ — حسنِ بے پروا مثالِ ماہِ کامل اُن میں ہے
دل گرفتارِ بلا مرغولۂ گیسو میں ہے — نکلے کیا، ہر تارِ زلف اک راہِ مشکل اُن میں ہے
سادگیِ گل، پریشانیِ سنبل، زلف و رخ — وقتِ گلگشتِ چمن تحصیلِ حاصل اُن میں ہے
روئے رنگیں پہ جھلکتا ہے جو یہ آبی نقاب — اے نگاہِ منتظر، اک برقِ بسمل اُن میں ہے
نشۂ ذوقِ خود آرائی فزوں ہے دمبدم — تازہ ایجادِ ستم ہر لحظہ شامل اُن میں ہے
قشقہ بالائے جبیں اور لب پہ لاکھا پان کا — صبحِ گلشن کی فضا اور شامِ ساحل اُن میں ہے
نزدِ گاہِ معرفت ہے جلوۂ نازِ بتاں — پیکرِ صوری مگر اک حدِ فاصل اُن میں ہے
نکہ ہائے ابرویں جیسے رخ گرداں ہوں ہزار — قیس دیکھے تو کہے رفتارِ محمل اُن میں ہے

آنسوؤں سے ہے وضو اپنا نمازِ عشق میں
آنکھیں چھنتی ہیں سفیرؔ اور آپ حائل اُن میں ہے

سفیر کاکوروی

جذباتِ قدسی

کہاں تک ضبطِ غم دل کب سے آمادہ ہے شیون پر
گریں گی آک نہ اک دن بجلیاں میرے نشیمن پر

چمن والوں کی خاطر سے ابھی تک دم بخود ہوں میں
ادھر لب تک فغاں آئی کہ برسی آگ گلشن پر

جلا کر خاک کرنے کو نگاہِ ناز کیا کم تھی
جو بجلی بھی گرائی آسماں نے میرے خرمن پر

یہ فصلِ نو بہار اور یہ مرے گلشن کی بربادی
لہو روتی ہیں آنکھیں جب نظر پڑتی ہے مسکن پر

بلائے گردشِ ایام میں نے اپنے سر لے لی
جلا میرا نشیمن۔ پر نہ آنچ آنے دی گلشن پر

نظر آئے بہت بے اعتبار اہلِ جہاں مجھکو
دلِ ناداں تجھے بھی دوست کا دھوکا ہے دشمن پر

نہ لی میری خبر تک اور مجھے بے خانماں دیکھا
بھروسہ تھا بہت مجھکو نواسنجانِ گلشن پر

پریشاں خاطروں سے ربط ہے آوارہ گردوں کو
گگولے اُڑکے مٹی ڈالتے ہیں میرے مدفن پر

زمانہ دل جلوں کے خاک کرنے پر ہے آمادہ
کبھی جب برق گرتی ہے تو میرے ہی نشیمن پر

سمجھتی ہے مری آہ و فغاں کو بے اثر دنیا
گرا سیر بھی میں خوش ہوں دلِ نالاں کے شیون پر

مرے کس کام کی پھر یہ جنوں انگیزیاں میری
گریباں پر نہ اپنا دسترس جب ہے نہ دامن پر

مرے دل نے تو مجھ سے سب سے بڑھکر بیوفائی کی
زمانہ دوست کو ترجیح کیوں دیتا ہے دشمن پر

جو ملتے ہیں بہارِ عیش میں کیا اعتبار انکا
چمن والے نہ پھر ٹھہرے خزاں جب آئی گلشن پر

میں اب کچھ دیر میں قلب و جگر بھی چاک کرتا ہوں
جنوں کا ہاتھ قابو پا چکا ہے جب وہ دامن پر

اگر دردِ محبت سے وہ چار آنسو بہا دیتے
چراغاں خنجرِ مژگاں سے ہوتا میرے مدفن پر

کسے گھائل کیا۔ کس کو شہید ناز کر آئے
ادائیں خود فدا ہیں آج اُنکی چشم پُرفن پر

وہ ظالم کر لے اب جی بھر کے مشقِ ناوک اندازی
سرشکِ خوں کی اک اک بوند اک اک دل ہے دامن پر

مرے ہر داغِ دل سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں
سحابِ فیض کب برسے گا یارب میرے گلشن پر

قدسی جالسی

رموزِ بیخودی (ریویو)

(۱)

کئی سال ہوئے جب ایک بالغ نظر ادیب نے ایک ایسی کتاب پر ریویو لکھتے ہوئے، جس میں اسلامی تعلیم کو عقلی دلائل سے منوانے کی کوشش کی گئی تھی، یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جن لوگوں کی ہدایت و تشفی کے لیے خود خدا کا کلامِ پاک کافی نہیں اُنکے خیالات کی اصلاح اس کتاب سے کیا خاک ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے جسپر اگر غور کیجیے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی اصلی حالت کا عبرت انگیز نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ وہ مذہب جسکے دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ آج ہم میں سے ہر شخص بیانگِ دہل کرنیکو تیار ہے کیا دنیا میں اسی لیے آیا تھا کہ اُسکے متبعین اُسکی سادہ اور حکیمانہ تعلیم کو بکلیتہً فراموش کردیں۔

اسباب جو کچھ بھی ہوں لیکن اس سے قطعاً انکار نہیں ہوسکتا کہ باوجودیکہ مسلمانوں کی تعداد غالباً جتنی مذہب کا دم بھرتی اور مذہب کے نام پر جان دینے اور جان لینے کو آمادہ نظر آتی ہے، اسلامی تعلیم کے مطابق عمل کرنے اور احکامِ مذہبی کے بجا لانے والوں کی تعداد روز بروز محدود ہوتی جاتی ہے۔ ایک کثیر التعداد طبقہ اُن جہّال کا ہے جو اسلام کو گائے کا گوشت کھا لینے یا رسمِ ختنہ ادا کرنے کا مرادف جانتا ہے اور اسکے آگے کسی عمل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ایک دوسرا طبقہ ہے جو اُس پہلے طبقہ سے تعداد میں اگرچہ کم ہے مگر اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے قلت کے باوجود ان جہلا کی اکثریت پر بھاری ہے۔ وہ اسلام کو دینِ فطرت کا لقب دیتا، مذہب کو کمالاتِ انسانی کا منتہا تصور کرتا، اور ہر قسم کی ترقی کے لیے بطور لازمۂ حیات کے سمجھتا ہے لیکن اسلام کی تلقین کی ہوئی باتوں پر عمل کرنا اُسے نہیں آتا۔ اسی طبقہ کی اصلاح کے خیال سے وہ کتاب لکھی گئی تھی جسکے ریویو سے مذکورۂ بالا قول نقل کیا گیا ہے۔ اور یہی طبقہ ہمارے قومی شاعر اقبال کا (رموزِ بیخودی میں) دراصل مخاطب ہے۔

رموزِ بیخودی کے مختصر دیباچہ میں اقبال نے اپنا مقصد تحریر جو ظاہر کیا ہے اُسے ہم اُنھیں کی عبارت میں یہاں درج کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :—

”جس طرح حیات افراد میں جلبِ منفعت، رفعِ مضرت، تعینِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ احساسِ

نفس کے تدریجی نشوونما۔ اسکے تسلسل۔ توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل واقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی انا" کی حفاظت۔ تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔

افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لیے بمنزلہ قوت حافظہ کے ہے جو اسکے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کرکے "قومی انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔

علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مد نظر رکھکر میں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اسکے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امتِ مسلمہ کے حیات کا صحیح ادراک اسی نقطہ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

ہمیں اسکا کوئی حق نہیں ہے کہ اُس اثر و قبول کے متعلق ابھی سے کوئی پیشین گوئی کریں جو رموز بیخودی کو اس طبقہ میں حاصل ہوگا۔ تاہم یہ کہنے میں کچھ اندیشہ نہیں کہ ہم کو اقبال کے مشن میں کچھ زیادہ کامیابی کی امید نہیں نظر آتی۔

قبل اسکے کہ نفس مثنوی کے مطالب سے ناظرین کو روشناس کرائیں ہم اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ڈاکٹر اقبال نے فارسی زبان میں خطاب کرکے اپنے مخاطبین کی تعداد کو خود محدود کر دیا ہے اور مسلمانانِ ہند کی جماعتِ کثیر کو یہ شکوہ کرنے کا موقع دیا ہے کہ

زبانِ یارِ من چینی و من چینی نمیدانم

بے شبہہ ابھی ہم میں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو فارسی پڑھتے اور سمجھتے ہیں، لیکن وہ تعلیم یافتہ جماعت جو عمومیت کے ساتھ اس خطاب کی سزاوار ہے اور جو اقبال کی رمز شناسیوں کی درباتہ طور پر داد دیتی ہے اُسکے اکثر و بیشتر افراد فارسی سے بے بہرہ ہیں۔

نظرے خوش گذرے

آل انڈیا مسلم لیگ کے آنریری سکرٹری، آنریبل سید وزیر حسن بی اے ایڈوکیٹ لکھنؤ نے بالآخر ایک اعلان عام کے ذریعہ سے آیندہ دسمبر میں لیگ کی عنان انتظام قطعی طور پر دوسرے ہاتھوں میں سپرد کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ عامۂ مسلمین اور نیز تعلیم یافتہ طبقہ کی کثیر تعداد مدت سے اس قسم کے انقلاب کی متمنی تھی اور اب جبکہ کسی قسم کے شور و شغب اور بے لطفی کے بغیر ہمارا منشائے دلی پورا ہو رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ جماعت جو ہماری طرح مسلم لیگ کی اصلاح و انضباط کو قومی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری خیال کرتی ہے ان حالات کا پُرجوش خیر مقدم نہ کرے اور اس زرّیں موقع سے پورا فائدہ نہ اُٹھائے۔ جسکی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آیندہ انتخاب کے موقع پر صرف ایسے اصحاب کو منتخب کرنے کی کوشش کی جائے جو ہمارے معتمد علیہ بھی ہوں اور قومی خدمت کا ذوق بھی رکھتے ہوں۔ سید وزیر حسن صاحب کا انتخاب جس وقت کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کے شدید اضطراب و انتشار کا زمانہ تھا اس وجہ سے کہ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ نے مزاج قومی میں ایک خاص قسم کی برہمی پیدا کر دی تھی۔ پھر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے عین اجلاس سالانہ کے قریب انتقال کر جانے کی وجہ سے اسکا موقع بھی نہیں تھا کہ انتخاب کے وقت کافی چھان بین کی جا سکے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے وہ صورتِ حالات نہیں رہی ہے۔ بے شک موجودہ جنگ کے ایام اہل ہند کے لیے عموماً اور ہم مسلمانوں کے لیے خصوصاً نہایت نازک ہیں اور چونکہ ہمارے بہت سے قابل ترین احباب جنگی قوانین کی بے پناہی کے بدولت اُس آزادی سے محروم ہیں جو ہر انسان کا اولیں فطری حق ہونے کے علاوہ قوم کی اجتماعی اور مجلسی زندگی کے بقا و قیام اور ترقی و استحکام کے لیے بمنزلۂ روح کے ہے اس وجہ سے جدید انتخاب میں ہمیں بہت احتیاط ملحوظ رکھنا پڑے گی۔ تاہم انتخاب کے لیے کافی فرصت بھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے اندر ہمیں تعلیم یافتہ جماعت کے اکثر افراد کی افتادِ طبیعت۔ رجحانات قلبی اور طریق کار کا اچھا خاصہ تجربہ ہو گیا ہے اور اب پیشتر کی سی حالت نہیں رہی ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھکر کسی کا ہاتھ تھام لیا جائے گا۔

اگرچہ اُن تمام اسباب حالات کا اعادہ بے سود ہو گا جو سید وزیر حسن صاحب کے اس اعلان کا باعث

ہوئے ہیں تاہم یہ لکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں کہ سکرٹری صاحب لیگ نے اپنے عہد کے بقیہ چند ماہ کے اندر ہماری پیش کردہ تجاویز کے مطابق دفتر لیگ کی اصلاح و تنظیم کر ڈالنے کا وعدہ کیا ہے اور ہمیں یقین واثق ہے کہ اگر یہ مواعید روبہ تکمیل ہوئے تو انشاء اللہ اسکے مفید نتائج چند ہی ماہ میں ظاہر ہو جائیں گے۔ جو تجاویز ہم نے پیش کی ہیں کچھ ہماری ایجاد کردہ نہیں ہیں بلکہ عام طور پر زمانۂ حال کی تمام منضبط اور کام کرنے والی مجالس میں اُنھیں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ البتہ چونکہ کارفرمایانِ لیگ ایک سالانہ میلہ کے انعقاد کے سوا سال کے گیارہ مہینے میں کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس وجہ سے اُنکے لیے یہ تجاویز ضرور نئی ہیں۔

ہماری تجاویز کیا ہیں؟ ان کے جواب میں کسی تمہید کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم صرف چار باتیں چاہتے ہیں۔

(۱) دفتر لیگ ایک لائق۔ ذمہ دار۔ فرض شناس۔ مستعد اور قومی درد رکھنے والے شاہرہ یاب سکرٹری کے سپرد کر دیا جائے۔

(۲) اس جدید سکرٹری کے ماتحت چند نائب مقرر کیے جائیں جو اُسکی رائے اور ہدایت کے مطابق مختلف صوبجات میں دورہ کرکے مقاصدِ لیگ کی اشاعت کریں۔ ارکانِ لیگ کی تعداد بڑھائیں اور صوبجات و اضلاع کی شاخوں کی تنظیم میں مدد دیں۔

(۳) دفتر لیگ میں ایک صیغۂ خاص اس غرض سے قائم کیا جائے جو مسلمانوں کی سیاسی تعلیم و تنظیم کے لیے ضروری اور مفید سیاسی لٹریچر کی اشاعت کرتا رہے۔

(۴) لیگ کے پاس کوئی مستقل سرمایہ نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اسکی وجہ سے قدم قدم پر کیسی شدید دشواریوں کا سامنا ہوتا ہوگا۔ بے شک ہز ہائنس آغا خاں صاحب اور راجہ صاحب محمود آباد کی زر پاشیوں نے لیگ کو اب تک بہت کچھ مستغنی بنائے رکھا ہے مگر اب وقت آگیا ہے کہ لیگ کو شخصی غلامی سے قطعاً آزاد بنایا جائے اس لیے کُل دفتر لیگ اور جملہ ذمہ دار عہدہ داران و ارکانِ لیگ کا اولیں فرض یہ ہونا چاہیے کہ لیگ کے واسطے ایک مستقل سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کریں۔ اور اسکے لیے جس قسم کی منضبط مگر خاموش کوشش درکار ہے اُسکا بہت کچھ انحصار دفتر لیگ کی تنظیم و اصلاح پر ہے۔

جس وقت ان تجاویز پر عمل ہونے لگے گا انشاء اللہ قوم کا سیاسی نظام صحیح اصولوں کے مطابق تعمیر کرنا دشوار نہ رہے گا۔

اب یہ قوم کے بہی خواہوں اور ہمارے حریت دوست احباب کے اختیار میں ہے کہ وہ لیگ کو صحیح اصولوں کے مطابق ایک کارآمد و مفید مجلس بنانے کے مواقع سے فائدہ اٹھائیں یا اس زریں موقع کو اپنی بے اتفاقی اور سردمہری سے رائیگاں کرکے آئندہ کے لیے لیگ کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔
ایک جماعت ہے جو یہ سمجھتی اور کہتی ہے کہ کارفرمایانِ لیگ کا یہ تزلزل نتیجہ ہے اُنکی سیاسی پالیسی سے عامۂ مسلمین کی بیزاری کا - اور کلکتہ - الہ آباد - علیگڈھ و لاہور کے بعض افراد نے جو ایک نئی مجلس سیاسی کی طرح ڈالی ہے اُسکی آئندہ مقبولیت کے لیے وہ اسے ایک فالِ نیک جانتی ہے - مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے احباب کی یہ رائے بالکل ناقابلِ اعتبار اور اُنکی یہ توقعات یقیناً مایوسیوں میں مبدل ہوجانے والی ہیں۔ کیونکہ تعلیمیافتہ جماعت کی تعداد کثیر کارفرمایانِ لیگ کے طرز عمل سے ناخوش ہونے کے باوجود لیگ کے سیاسی مطمحِ نظر سے بدل متفق ہے اور جن اصحاب نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناکر مسلمانوں میں نفاق و افتراق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اُنکے لیے ایسی صورت میں کوئی امید کامیابی نہیں ہے۔
کیا تماشے کی بات ہے کہ خود حکومتِ انگریزی، برٹش پارلیمنٹ، اور ہندوستان کی حکومتِ اعلیٰ تو اسے تسلیم کرچکی ہے کہ ہندوستان میں ایک ذمہ دار آئینی حکومت قائم ہونا چاہیے - مگر بعض وفادارانِ حکومت ہیں کہ ابتک کانگریس اور لیگ کے اس مطمحِ نظر سے اختلاف کیے جارہے ہیں —— کیا خودغرضانہ جہالت و نادانی کی ایسی روشن تر مثال دنیا میں کہیں تلاش کیجا سکتی ہے -

---

اصلاح لیگ کے جدید ولولوں کو افسوس ہے کہ قدرت کی انتقام کاریوں نے پہلی ہی منزل میں ایک حد درجہ صبر آزما مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے - ہمارے عزیز دوست شیخ ولایت علی قدوائی بی اے ایل ایل بی وکیل جو "بموق" کے نام سے کامریڈ - نیوایرا اور بعض اُردو جرائد میں نہایت ہی قابلیت کے ساتھ مضامین لکھا کرتے تھے اصلاح طلبی اور حریت دوستی میں راجہ غلام حسین مرحوم ایڈیٹر نیوایرا کے پورے ہم خیال تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہاں کی مجلس احرار کی تمامتر چہل پہل انھیں دونوں کی ذات سے تھی۔ راجہ غلام حسین مرحوم کے حادثہ کو ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا کہ ۸ جولائی کی رات کو "بموق" نے بھی تین دن ہیضہ میں مبتلا رہ کر داغِ مفارقت دیا - انا للہ و انا الیہ راجعون -
مرحوم اپنے ترقی پذیر خیالات اور کمال انشاپردازی کے لحاظ سے جس قدر قابلِ عزت و محبت تھے

اُس سے زیادہ اپنی سیرت کی خوبیوں کی وجہ سے ہر طبقہ میں عزیز و مکرم تھے۔ تعلیم یافتہ نوجوانان قوم میں شاید ہی کوئی شخص ان خوبیوں کا جامع ہو۔ اور اس بنا پر اُنکی وفات حقیقت میں آئی قوم کے لیے ایک عظیم الشان اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

مرحوم کی بیوہ اور یتیم بچے ابھی زندہ ہیں۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ جملہ مسلمانوں کو دلی ہمدردی ہے۔ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور اُنکے پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشیں۔ آمین

جولائی نمبر میں "فغانِ حسرت" کے عنوان سے جو نظم صفحات ۲۴ - ۲۶ پر چھپی ہے اُس میں حسب ذیل کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں:-

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴	۷	گرجاتیں	گڑ جاتیں	″	۷	[illegible]	لوز یا وہم
″	۲۱	روشنائی	روشنائی	″	″	چشم عنصری	جسم عنصری
″	″	گزارو	گذارد	۲۰	۹	سترِ حق	سترِ حق
۲۵	۸	اشیان	آسیان	″	۱۲	پانیاو	پا نیا ورد
″	۱۴	...ت بارکنت	عذوبت بارکنت	″	۱۹	شہرت ام	شہرت تام
″	۲۰	بامسرت	بامسرت	۲۸	۱۴	باخیالت	باخیالات
″	۲۱	پوشند	می پوشند	۲۹	۲	بعد ساوت	بعد ساعت
۲۶	۱	بے پایان حسن	بے پایانِ حسن	-	-	-	-

منبع حصول مراد انسانی

معدن تندرستی جاودانی

مخزن نعمت دو جہانی

آتنک نگرہ گولیاں

اگرچہ آپ اس زمانہ میں حد سے زیادہ مبالغہ آمیز لفاظی اشتہاروں میں ملاحظہ فرمائینگے مگر ہم اس امر سے برکنار ہوکر صرف اتنا ہی کہنے کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ تندرستی کے خواہاں ہیں یا کہ آپ یا آپکے دوست کو کمزوری اعضائے رئیسہ یا کہ دوران سر یا کہ مرض نسیان جریان احتلام ضعف یاد یا کہ رقت سرعت وغیرہ وغیرہ امراض خبیثہ نے بجد تنگ کرکے ہر چار طرف سے گھیر لیا ہے اور علاج سے تنگ آکر مایوس ہو رہے ہیں تو ہماری نو ایجاد عالم تقویت بخش **آتنک نگرہ گولیاں** استعمال کرکے اپنی دلی مراد حاصل کریں اسوقت آپ کو ہماری راست گفتاری کا بصدق جان یقین ہوجائیگا۔ بڑے بڑے نامی گرامی مشہور ومعروف ڈاکٹروں ویدوں طبیبوں نیز ویہمین صاحبوں نے مذکور گولیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ تجربہ فرما کر انکو پُر اثر اکسیر نافع تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گولیاں نہایت درجہ کی مقوی باہ و مصفی خون ہونے کے علاوہ بچپن کی تمام غلطکاریوں کے نقائص کو دور کرکے حالت شیب میں عالم شباب کا ظہور بتلاتی ہیں۔ مرد و عورت دونوں کو مفید ہیں۔ ان میں رسائن مطلق نہیں۔ بلکہ جڑی بوٹیوں سے ہماری نگرانی میں تیار کی جاتی ہیں۔ ہر موسم میں انکا استعمال ہو سکتا ہے

قیمت ۳۲ گولیونکا ڈبیہ ایک روپیہ علاوہ محصول

مزید آگاہی کے لیے ہماری کتاب کام شاستر جو اٹھارہ زبان میں ترجمہ شدہ ہے اور تخمیناً ۱۱ لاکھ کے ہم مفت تقسیم کر چکے ہیں ہم سے مفت طلب کرکے ملاحظہ فرماویں ملنے کا پتہ

وید شاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر کاٹھیاواڑ

لوکل ایجنٹ :- اندر چند اینڈ کو۔ چوک لکھنؤ

میں شریک ہوئے تھے سو بہت سے پرجوش فقہا کے پھانسی دیدی گئی۔ اس سے بھی انھیں عبرت نہیں ہوئی اور سترہ برس تعصبیوں کے بھڑکانے سے لوگ پھر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن کچھ بھی نہ ہوا پہلے کی طرح سے دبی چپ ہی سروں پر کھیلے اور ان کا بھی سرسری فیصلہ ہو گیا۔ طلیطلہ کے امرا کا (جنھوں نے اپنی عادت کے موافق بغاوت کی اور اس دغا فریب سے دل عرب کے قبضے میں دیدیے گئے اور ایک ایک کر کے قتل ہوئے) عبرت انگیز واقعہ بھی قرطبہ والوں کو ایک اور بغاوت کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔

ہاں اس میں شبہہ نہیں کہ سات سال تک "یوم الخندق" (جو طلیطلہ کے قتل عام کا نام رکھا گیا تھا) کی یاد نے قرطبہ کے متعصبان مذہب کو اپنی حد پر رکھا۔ لیکن جیسے جیسے اس ہیبتناک کھائی کی یاد جس میں طلیطلہ کے کل مقتول امرا کی لاشیں ڈال دی گئی تھیں ضعیف ہوتی گئی دارالخلافہ میں ایک تازہ ہنگامے کے اسباب و علامات پیدا ہوتے گئے۔ لوگوں کا جوش بہت بڑھ گیا۔ یہ جوش صرف سلطان ہی کے خلاف نہ تھا کہ وہ موٹے کپڑے نہیں پہنتا اور بدن پر بھبوت نہیں ملتا اور اپنے آپ کو نفس کش ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اُسکے محافظوں کی بڑی بھاری جماعت کے خلاف تھا جنکو وہ لوگ عجم یعنی گونگا اس وجہ سے کہتے تھے کہ وہ حبشی اور انھیں کے مثل تھے اور عربی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ یہ عجم قرطبہ کی گلیوں میں تن تنہا نکل نہیں سکتے تھے۔ اگر کوئی سپاہی اکیلا باہر نکلتا تو یقین تھا کہ عوام اُسکو دق کرتے اور ممکن تھا کہ قتل کر ڈالتے۔ ایک دن ان محافظوں میں سے ایک نے کسی شخص کو دل لگی سے ایک گھونسا مارا۔ اس سے سارے لوگ اکدم سے بگڑ کھڑے ہوئے۔ سب ایک دل ہو کر ایوان شاہی کی طرف جھکے اور ہزار در ہزار دینیات کے طلبہ جو شہر کے جنوبی حوالی میں سکونت رکھتے تھے اُنکے سرگروہ بنے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ باوجود شہر کے قلعہ بند اور فوج سے معمور ہونے کے یہ سب حملہ کر کے اُسپر قبضہ کر لیں گے۔ سلطان حکم نے انسانی صورتوں کے اڑتے ہوئے سمندر کی طرف نظر کی اور متنبہ ہوا انھوں کو حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اُسکے تجربہ کار سوار دن کے

حملوں کو رد کر رہے ہیں۔ لیکن اس جانکاہ خطرے کے وقت بھی اُسکے اوسان خطا نہ ہوے اور کیوں خطا ہوتے یہ تو بڑے لوگوں کی فطرت میں داخل ہے۔ اپنے بڑے کمرے میں جاکر اُس نے یاسمین نام اپنے شاگرد پیشہ سے زباد کا شیشہ منگوایا اور اطمینان سے سر اور داڑھی کے بالوں کو معطر کرنے لگا۔ اُس شاگرد پیشہ کو ایسے وقت میں کہ بلوائیوں کا گروہ پھاٹک پر حملے کر رہا تھا سلطان کے ایسے کام سے سخت حیرت ہوئی اور اُس سے یہ حیرت و تعجب ضبط نہ ہو سکا۔ لیکن حکم نے جسکو خطرے کی پوری حالت معلوم تھی اُسکو جواب دیا "خاموش حرامی! اگر میرا سر معطر نہیں رہے گا تو بلوائی اُسکو اور سروں سے کیونکر تمیز کریں گے"۔ اسکے بعد اُس نے افسروں کو بلوایا اور حفاظت کے لیے اپنی تدبیریں عمل میں لائیں۔ یہ تدبیریں بالکل سیدھی سادی تھیں مگر بکار آمد نکلیں۔ اُس نے اپنے چچا زاد بھائی کو سواروں کی ایک فوج کے ساتھ پھیر کے راستے سے جنوبی حوالی شہر کی طرف بھیجا۔ اس نے وہاں پہونچکر وہاں آگ لگادی اور جب سب لوگ خوف زدہ ہوکر ایوان خلافت کا محاصرہ چھوڑکر اپنی بیبیوں اور بچوں کو اپنے شعلہ فشاں گھروں سے نکالنے کو دوڑے تو حکم اور باقی قلعہ داروں نے پیچھے سے اُنکی خبر لینی شروع کی۔ ان دوطرفی حملوں سے کمبخت باغیوں کے ٹکڑے اُڑ گئے مہیب صورت عجم گھوڑوں پر سوار اُنکے غول میں گھس گئے اور سیکڑوں کو کاٹتے چلے گئے اور اگر کسی نے گڑگڑاکر رحم کرنے کو کہا تو یا تو سمجھے ہی نہیں اور اگر سمجھے بھی تو مطلقاً اُسکا خیال نہیں کیا۔ حکم کی اس چال نے ایوان خلافت و خاندان خلافت دونوں کو بچالیا اور بغاوت عام بدل کر پورا قتل عام بن گئی۔

تاہم اپنی فتح کے وقت بھی سلطان نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وہ اپنی کامیابی کو کھینچکر انتہائی حد تک نہیں لیگیا بلکہ اسی پر قناعت کی کہ بیرون بلدہ کی جس آبادی سے بغاوت کی آگ پھیلی تھی وہی خاک میں ملادی جائے اور اُسکے باشندے جلا وطن کر دیے جائیں۔ چنانچہ وہ جبراً نکالے گئے۔ کچھ تو اسکندریہ چلے گئے جنکی تعداد عورتوں اور بچوں

کے علاوہ پندرہ ہزار تھی اور بعد کو سمندر سے پار اُتر کر کریٹ پہونچے اور کچھ فارس کو سدھارے جو افریقیہ میں ہے - ان لوگوں کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار تھی - جو لوگ جلا وطن ہوئے اُن میں بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی تھی جو ہسپانیہ کے قدیم باشندوں کی اولاد تھے اور اسلام لائے تھے لیکن عربوں کی حکومت سے جو قومی نفرت انکو تھی اُسکے اظہار کے لیے حیلہ ڈھونڈھتے تھے - لیکن اصل بانیِ فساد دینیات کے طلبہ یعنی فقہا بے سزا چھوڑ دیے گئے - جسکی وجہ بیشبہہ کچھ تو یہ تھی کہ اُن میں سے اکثر عرب تھے - اور کچھ یہ تھی کہ اُنکی فقاہت کی عزت کی گئی - ان فقہا کا ایک افسر کشاں کشاں حکم کے پاس لایا گیا اور اُس نے حرارتِ دینی کے غیظ میں سلطان سے کہا کہ تجھسے نفرت کرنے میں میں نے خدا کے حکم کی تعمیل کی - حکم نے یہ یاد رکھنے کے قابل جواب دیا: "وہی اللہ جسکی نسبت تو مدعی ہے کہ تجھے مجھسے نفرت کرنے کا حکم دیا ہے اُسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ تجھے معاف کر دوں - جا اور خدا کی حفاظت میں رہ"

بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی اَحسِن اِلیٰ من اَسا

پانچواں باب

عیسائی جاں نثارانِ مذہب

چھبیس سال سلطنت کر کے سلطان حکم نے ۸۲۲ء میں وفات پائی - اس نے باعتبارِ سابق کے سلطنت کو امن و امان کی حالت میں اپنے بیٹے عبد الرحمٰن ثانی کے لیے وراثت چھوڑا - قرطبہ کے نومسلم مغلوب جلا وطن ہو چکے تھے - متعصبوں کو ایسا سبق دیا جا چکا تھا جسکو وہ غالباً بھول نہیں سکتے تھے - صرف عیسائی سرحدوں پر پرانے ہنگامے رہ گئے تھے جنکے فرو کرنے کی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی تھی - عبد الرحمٰن ثانی نے وراثت میں اپنے باپ سے تعیش تو لیا مگر اُسکا وہ قابو اپنے زورِ بازو پر جو آرام طلبی کو مجبوراً ضعف ہونے سے محفوظ رکھتا تھا

اسکے حصّے میں نہیں آیا۔ عبدالرحمٰن ثانی نے قرطبہ کو بغدادِ ثانی بنا ڈالا۔ اور ہارون الرشید اعظم کی فضول خرچیوں کی نقل کی۔ جو اُس زمانے کے قریب ہی اپنے بیہودہ دل لگیوں کی تماشاگاہ کو چھوڑ کر ملکِ آخرت کو سدھارا تھا۔ عبدالرحمٰن نے بہت سے محل بنوائے۔ باغ لگوائے۔ اپنے دارالخلافہ کو مسجدوں، عالیشان عمارتوں، اور پُلوں سے زیب زینت دی۔ کُل تعلیمیافتہ مسلمان بادشاہوں کی طرح اسکو بھی نظم سے عشق تھا اور خود بھی عالی رتبہ شاعر ہونے کا دعوے کرتا تھا۔ گو بعض اوقات اُسکے اشعار اوروں کے کہے ہوئے ہوتے تھے جنکو اُجرت دی جاتی تھی۔ اسکا مذاق بگڑا ہوا تھا اور اُسکی طبیعت نرم تھی اور آسانی سے قبضے میں آجاتی تھی۔ اُسکے سارے زمانۂ حکمرانی میں چار آدمیوں کی حکومت اُسپر رہی۔ ایک تو گَوَیا تھا، دوسرا فقیہ، تیسری ایک عورت، اور چوتھا ایک حبشی غلام۔ ان میں سب سے زیادہ اقتدار فقیہ کا تھا۔ یہ فقیہ وہی بزرگ یحییٰ نام تھے جنھوں نے طلبہ کو حکم کے خلاف میں اُبھارا تھا۔ اور اب نئے سلطان کے دل پر پورے قابض و دخیل ہوگئے تھے۔ لیکن طروب ملکہ اور نصر غلام کا بھی ملکی معاملات میں کچھ کم زور نہیں چلتا تھا۔ مگر زریاب مغنی (گَوَیا) نے اپنے اغراض کو مذاق وفنون ہی تک محدود رکھا تھا اور گنواری مُلکی جھگڑوں میں دخل دینے سے انکار کرتا تھا۔ یہ شخص فارس کا رہنے والا اور بغداد کے مشہور مغنی اسحاق موصلی کا شاگرد تھا۔ زریاب اپنے اُستاد کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک دن اسکی شامت جو آئی تو ہارون الرشید کے سامنے گانے میں سبقت لیگیا۔ حاسد اُستاد سے بھلا یہ کہاں برداشت ہوسکتا تھا فوراً ہی اُس نے اپنے شاگرد سے کہا کہ یا تو تم اس ملک کو چھوڑ کر اور کہیں کی راہ لو یا ملکِ عدم جانے کے لیے تیار ہو بیٹھو۔ اُس نے جلا وطن ہونا قبول کیا اور جب اندلس پہونچا تو تعلیم یافتہ سلطان نے اُسکی بڑی قدر کی۔ اُسکا معقول وظیفہ مقرر ہوا اور خوراک، مکانات اور دوسرے عطیے اور انعام اسکے علاوہ ملے۔ یہاں تک کہ اس خوش نصیب مغنی کی بجا آمدنی ہوگئی — سلطان زریاب کی ذہانت و فطانت کی اسقدر قدر کرتا تھا کہ اُسکو اپنی محفل میں بٹھاتا اور اپنے خلوت میں اُسکو شریک کرتا اور اُسکے راگ اور قدیم زمانے کی تحریر یا

کہانیاں اور دانشمندی کے مقولے جو وہ بے انتہا کتابوں کے مطالعے کی وجہ سے بیان کر سکتا تھا گھنٹوں سنتا رہتا تھا۔ اسکو ایک ہزار سے زیادہ گیت (غزلیں؟) زبانی یاد تھے اور ہر ایک کی لَے جداگانہ تھی جنکی نسبت وہ کہتا تھا کہ گانے کے مؤکلوں نے مجھے سکھلائے ہیں۔ اس نے طنبورے میں اک پانچواں تار بڑھایا تھا۔ اور اس شخص کے بجانے کا طریقہ کسی شخص سے نہیں ملتا تھا اس لیے جو کوئی ایک مرتبہ اسکو سُن لیتا تھا وہ پھر اور کسی کو نہیں سن سکتا تھا۔ وہ اپنے موسیقی کے شاگردوں کے ساتھ عجیب غریب طریقہ برتتا تھا۔ وہ نوآموز گویے کو بٹھا کر کہتا تھا کہ جسقدر زور سے تم گا سکتے ہو گاؤ۔ اگر اُسکی آواز کمزور ہوتی تو اُس سے کہتا کہ اپنی کمر پر ایک تسمہ باندھ تاکہ آواز کی ضخامت زیادہ ہو جائے۔ اگر وہ ہکلاتا یا اُسکے بولنے میں کوئی نقصان معلوم ہوتا تو زریاب لکڑی کا ایک ٹکڑا اُسکے مُنہ میں رکھواتا تاکہ اُسکے جبڑے ٹھیک طور پر پھیل جائیں۔ اسکے بعد جب وہ نوآموز اس قابل ہو جاتا کہ آہ کو نہایت زور سے کہنے لگتا اور اسپر اپنی آواز کو قائم رکھ سکتا تو وہ اُسکو شاگرد بنا تا اور جی لگا کر اُسکو تعلیم دیتا ورنہ اُسکو نکال دیتا تھا کبھی کوئی شخص ایسا سنجیدہ۔ ایسا ذہین وفطین، ایسا دل خوش کن نہ ہوا جیسا زریاب تھا۔ یہ بہت جلد اُندلس میں نہایت ہی مشہور آدمی ہو گیا۔ اور پٹرونیس یا بیو برمل کی طرح وضع وطرز (فیشن) کا تصفیہ کرنے والا ٹھہرا۔ اس نے لوگوں سے بالوں کے رکھنے کی وضع بدلوادی اسی نے اُندلس میں مارچوبہ (تاگ ڈون) اور مصالحہ دار کوفتہ کھانے کا رواج نکالا۔ اور ایک کھانا بہت زمانہ بعد تک زریابی قلیہ کہلاتا رہا۔ اسی نے بجائے فلزات کے ظروف کے شیشے کے ظرف میں پانی پیا۔ چرمی توشکوں پر سونا، چرمی دسترخوانوں پر کھانا اور بہت سی ستھرائیاں لوگوں کو سکھلائیں۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سکھلایا کہ درجہ بدرجہ باعتبار موسم کے لباسوں میں تبدیلی کی جائے یعنی بجائے اسکے کہ دفعۃً لباسوں میں تبدیلی کریں جیسا کہ اُس وقت تک لوگ کیا کرتے تھے، آہستہ آہستہ جاڑوں کے بہت موٹے کپڑوں کو بدلتے ہوئے گرمیوں کے باریک کپڑوں تک پہونچائیں۔ جو کوئی وضع وہ ایجاد کر دیتا تھا

وضعدار دنیا اُسی کی پیروی کرتی تھی۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جسکی نسبت یہ فرحِ ندخوش مذاق حکیم لوگوں کو اسکا یقین نہیں دلا سکتا ہو کہ یہ شے ضروری اور دلربا دونوں ہی ہے۔

لیکن جس زمانے میں کہ ایوانِ خلافت نئے کھانوں کے مزے لے۔ ہا یا نئی قطع کے بالوں میں اُلجھا ہوا تھا سلطان کی رعایا میں خود قرطبہ کے اندر کچھ ایسے سنجیدہ لوگ بھی تھے جو زیادہ تر گہرے خیالوں میں ڈوبے ہوے تھے۔ وہ کوئی بیرونی دشمن نہ تھا جس نے اس اسلامی سلطنت کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا تھا ہمیں بھی کوئی شبہہ نہیں ہے کہ عبد الرحمٰن ثانی جس میں ذاتی جرأت اور فوجی ناموری کی محبت کی کمی نہ تھی بہت مرتبہ اپنی فوجوں کو شمال کے عیسائیوں کے مقابلے پر جو لُوئی۔ دی۔ ڈیبونیر کی۔ دستے برابر سرحدوں پر ہنگامے و فسا دمچایا کرتے تھے لیگیا اور کامیابیاں حاصل کرکے مظفر ومنصور واپس آیا تھا۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اس وقت تک ایسی سنگین نہیں ہوئی تھیں کہ اسلامی حکومت کی بنیاد کو ہلا دیں۔ لیکن جس واقعہ کا ذکر کرنا ہم چاہتے ہیں وہ قرطبہ کے تھوڑے سے عیسائیوں کی حد سے باہر لبند حوصلگی سے پیدا ہوا تھا۔ اکثر عیسائی حقیقت میں کسی طرح اس کے دلدادہ نہ تھے کہ اپنی دینداری کا بہت زیادہ اظہار کریں۔ وہ دیکھتے تھے کہ اُنکے ساتھ عمدہ برتاؤ ہوتا ہے، اُنکو آزادی ہے کہ جسکی چاہیں پرستش کریں۔ حکمرانوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوتی ہے۔ اور اُنکو اسکی بھی آزادی ہے کہ تجارت کریں اور اپنے مسلمان پڑوسیوں کی طرح مالدار ہو جائیں۔ اس سے زیادہ اور کس بات کی خواہش ہوسکتی تھی۔ بجز اسکے کہ اپنی پُرانی سلطنت کو واپس لینا چاہتے؟ اور چونکہ یہ امر اُس وقت امکان سے باہر تھا۔ وہ اسپر قانع تھے کہ اپنی حالت میں چین کریں اور اپنے نرم دل وبے تعصب فرمانرواؤں سے جہاں تک ہوسکے متمتع ہوں۔

طبیعت کا یہ انداز اندلس میں عام تھا لیکن خال خال اولوالعزم یا پُرجوش طبیعتیں بھی تھیں جو بقول اُنکے "کافروں" کی حکومت سے اس طرح قانع ہو جانے پر داشت نہیں کرسکتی تھیں۔ وہ

وہ اپنے کلیساؤں کے اگلے اقتدار و فارغ البالی کو یاد کرتی تھیں اور پادری خاصکر اُس نفرت کو ضبط نہیں کر سکتے تھے جو اُنھیں مسلمانوں سے اس سبب سے تھی کہ اُنھوں نے اُنکے ہاتھوں سے اُنکی سلطنت چھین لی تھی۔ اور عیسیٰ مسیح کے دین کی جگہ اک جھوٹا مذہب لاکر قائم کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی خود بے تعصبی نے اسی جوشیلی طبیعتوں کو اور غصہ دلا دیا تھا۔ وہ اسکو اچھا سمجھتے تھے کہ قدیم زمانے کے فدائیان مذہب کی طرح دق کیے جائیں۔ وہ آرزو کرتے تھے کہ شہید ہوں اور اُنکو مسلمانوں پر اس بات کا غصہ تھا کہ وہ ہمکو پابندی مذہب کی خاطر تنگ کیوں نہیں کرتے ہیں۔ ان با اخلاص لوگوں کے نزدیک مسلمانوں کی کھلی ہوئی خوشخوئیاں اور نفس پرستی کی ستھرائیاں خاصکر نفرت انگیز تھیں۔ اِنکا زندگی اور اُسکی ساری مسرتوں سے حظ اُٹھانا۔ اِنکی موسیقی اور انکا گانا۔ بلکہ اُنکے علوم اور اِنکا پڑھنا پڑھانا۔ ان رہبانوں کے لیے نفرت خیز تھا۔ اُنکے خیال میں سچے دیندار کی زندگی کے معنی صرف یہ تھے کہ تازیانے کھائے اور روزے رکھے۔ توبہ و استغفار کیا کرے۔ تکلیفیں سہکر صفائی حاصل کرے۔ گوشت و پوست کو ذلیل و خوار کرے اور روح کی تنزیہ و تقدیس کرے۔ جو کچھ واقع ہوا سچ تو یہ ہے کہ محکوم لوگوں نے عیسائیت کی رہبانی صورت کا اظہار و اعلان کیا تھا۔ اُس وقت تک ہسپانیہ کی عیسائیت کا جو خاصہ بے پروائی و بے تعلقی کا عام طور پر مروج تھا۔ اُسکی جگہ میں دفعۃً اک ہولناک گرمجوشی قائم ہوئی اور شہادت کی سابقت شروع ہوگئی۔

نیکوکار لوگوں کو فقط اک خواب خیال پر خود اپنی جانیں اور دوسرے لوگوں کی جانیں گنواتے ہوے دیکھکر سخت افسوس آتا تھا۔ اُندلس کی یہ خودکشیاں بعل کے پوجاریوں کی مصیبت انگیزیوں سے جو چھریوں سے اپنے آپ کو کاٹ ڈالتے ہیں، یا ہندوستان کے جوگیوں کی نفس کشیوں سے جو اپنے ناخنوں کو اپنی ہتھیلیوں کے اندر بڑھنے دیتے ہیں واقع میں ذرہ برابر بھی زیادہ عقل کے موافق یا سچے مذہب کے مطابق نہ تھیں۔ یہ واقعہ کہ اندلسی شہداء ایک بہتر چیز کے دیوانے تھے اُن سے دیوانہ پن کے الزام کو کچھ اٹھا نہیں سکتا

عیسائیت اپنے پیروں کو یہ نہیں سکھاتی ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ اذیت دیئے جانے یا قتل کیے جانے میں تمکو خوشی ہوتی ہے بستی سے اپنی جانوں کو برباد کرو۔ یہ اس سبب سے نہ تھا کہ عیسائی اپنے مذہبی امور کے انجام میں تنگ کیے یا روکے جاتے تھے۔ یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ مسلمان عیسائیت سے ناواقف تھے اور اسکی ضرورت تھی کہ انکے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ یہ لوگ الہامی کتابوں کو خود بہت سے عیسائیوں سے زیادہ جانتے تھے اور کبھی حضرت عیسیٰ مسیح کا نام بغیر "علیہ السلام" کے نہیں لیتے تھے۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کے مُلہم مِن اللہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں اور اُنکی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں۔ مسلمان عیسائیت سے ناواقف نہ تھے بلکہ وہ اپنے مذہب کو اُسپر ترجیح دیتے تھے اور جب اُن لوگوں نے عیسائیوں کو اپنی حالت پر رہنے دیا تھا تو انھیں کوئی وجہ نہ تھی کہ مظلوم دینداروں کا شجاعانہ رویہ اختیار کریں۔ فی الواقع شہادت کے درجے تک پہونچنے کی کوئی قرین عقل راہ نہ تھی۔ اس لیے کہ جب عیسائیوں کو اجازت تھی کہ اپنے مذہب کی تعلیم و تلقین بےروک ٹوک بے مزاحمت کریں تو اُنکو کوئی جائز بنیاد اپنے آپ کو مظلوم قرار دینے کی نہیں مل سکتی تھی تاوقتیکہ یہ نہ کہا جائے کہ اُن لوگوں نے انجیل کی راہیں چھوڑدی تھیں اور حضرت عیسیٰ کی اس بڑی ہدایت کو پس پشت ڈال دیا تھا" اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ اُن لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جو تمکو برا سمجھتے ہیں۔ اور اُنکے لیے دعا کرو جو عداوت کا برتاؤ تم سے کرتے ہیں اور تمکو ایذائیں دیتے ہیں"۔ انکے ساتھ عداوت کا برتاؤ ہوتا تھا نہ اُنکو ایذائیں دی جاتی تھیں۔ عیسائی من حیث المجموع بےخلش تھے اور اگرچہ بعض اوقات گلیوں کے لونڈے اور عوام الناس پادریوں کی ہنسی اُڑاتے تھے لیکن اعلیٰ طبقے کے مسلمان کبھی اس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ باینہمہ یہ ذلیل عیسائی اپنے ان نرم مزاج دشمنوں کو دوست رکھنے کی کوشش تو کیا کرتے اپنی راہ سے اسقدر دور جا پڑے کہ اُنپر لعن اور اُنکے مذہب پر طعن کرنے لگے جس سے صاف طور ہی انکے ساتھ یہ نیت تھی کہ وہ رنجیدہ ہوکر انکو شہید کرڈالیں گے۔ اور اسلامی ملکوں کا ایک مشہور قانون ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اُنکے مذہب کو برا کہے اسکو فوراً مار ڈالنا

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد — ۱۲ر
- البرامکہ " — ۲ر

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — ۱۵ر
- میڈیکل جورس پروڈنس — ۲ر
- عربوں کا فن تعمیر — ۴ر
- سفرنامہ سیوتھیونو — عہ
- جنگ ٹرنسوال — عہ

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۱ر
- شمع و شاعر — ۴ر
- بلال — ۴ر
- شکوہ — ار
- جواب شکوہ — ۳ر
- کمل ترانہ — ۲ر
- رموز بیخودی — ۱۲ر
- نالہ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۴ر
- تصویر درد — ۳ر
- اکبری اقبال — ۳ر

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ۱۲ر
- روزنامہ با تصویر — ۲ر
- " بلا تصویر — ۱۲ر
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قہر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۱ر
- اسلام کا انجام — ۴ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ
- میلاد نامہ — ۶ر
- کرشن بیتی — عہ
- اردو دعائیں — ۶ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۱۲ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۸ر
- جگ بیتی — ۶ر
- بچوں کی کہانیاں — ۶ر
- اسرار — ۴ر
- کم ٹوموٹ — عہ
- قبروں کے غیبی نوشتے — ۸ر
- یورامیگرس (۵ رسالے) — ۴ر
- محرم نامہ — ۱۴ر
- یزید نامہ — ۱۲ر
- عقل نامہ — ۸ر
- فرام قبلہ نوشملہ — ار

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — ۱۱ر
- حسن سرور " — ۱۲ر
- دیول دیوی — ۱۲ر
- گورا — ۸ر
- نیل کا سانپ — ۱۲ر
- جعفر و عباسہ — ۱۲ر
- اختر و حسینہ (کامل) — ۲ر

مولانا راشد الخیری
- صبح زندگی — ۱۲ر
- شام زندگی — عہ
- طوفان حیات — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- ستاروں کے آنسو — ۶ر
- الزہرا — ۱۲ر
- لڑکیوں کی انشا — ۸ر
- بنت الوقت — ۸ر
- سنجوگ — ۸ر
- گوہر مقصود — ۴ر
- شہید مغرب / شہید بیداد — ۴ر

منشی محمد حسن خاں
- ہاجرہ — ۱۲ر
- ترکوں کی معاشرت — ۱۲ر

صفدر مرزاپوری
- بزم خیال — عہ
- مرقع ادب — عہ
- نشاط سخن — عہ

مولانا اشرف علی صاحب
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب — ۱۲ر
- تعلیم الدین — ۴ر
- اکسیر فی اثبات التقدیر — ۸ر
- الانتباہات المفیدہ — ۱۲ر
- اصلاح الرسوم — ۴ر
- مناجات مقبول — ۶ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے — ۱۲ر
- بہشتی گوہر — ۶ر

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق — ۱۲ر
- فنون لطیفہ — ۱۲ر
- خیالات — ۱۲ر
- امثال — ۱۲ر
- فن شاعری — عہ

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ رض — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر
- کیوپڈ اینڈ سائکس — [illegible]

سیماب اکبرآبادی
- سیر خدیجۃ الکبریٰ رض — ۱۲ر
- بنت الرسول — ۵ر
- زیب النساء بیگم — ۴ر
- نورجہاں بیگم — ۸ر
- جام کوثر — ۵ر
- بہشتی جھومر — ۱۲ر

مولانا عبداللہ العمادی
- کتاب المعارف — ۱۲ر
- حکمیات — ۱۲ر
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- مناحۃ العرب — ۳ر
- فلسفۃ القرآن — ۲ر
- فلسفہ ابن عربی — ۲ر
- کتاب الزکاۃ — ۲ر
- محرم کی بدعتیں — ۳ر

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق — ۱۲ر
- تحقیق الجہاد مجلد — ۲ر
- اعظم الکلام ۲ جلد — ۲ر
- مجموعۂ رسائل — ۲ر
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۸ر
- حضرت سلیمان — ۴ر
- حضرت ہاجرہ — ار
- حقیقۃ السحر — ۲ر
- حضرت عیسیٰ کا صلیب — ار
- یورپ و قرآن — ۳ر
- احسان عام — ار

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام — ۱۲ر
- یاسمین — ۸ر
- نیلی چھتری — ۱۲ر

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — ۲ر
- نشاط عمر — عہ
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال دلہن — ۱۲ر
- حسن معاشرت — عہ
- اصلاح معیشت — ۱۲ر

مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن — ۱۲ر
- حیات امام مالک — ۱۲ر
- لغات جدیدہ — عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — ۱۲ر
- مسلمان عورتوں کی بہادری — ۲ر
- اہل السنت والجماعت — ۸ر

خواجہ غلام الحسنین
- فلسفۂ تعلیم — ۱۲ر
- دستور المعلمین — ۸ر
- معیار الاخلاق — ۶ر
- تنقید بعیث — ۵ر
- تربیت اولاد — ۴ر

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ۱۲ر
- الصدیق رض — عہ
- المرتضیٰ رض — عہ
- سیاحت ہند — ۱۲ر

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری — ۱۲ر
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۱ر
- امرائے ہنود — ۱۲ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرآۃ — عہ
- المدنیۃ والاسلام — ۱۲ر
- سجل جمعیۃ ام القریٰ — ۸ر

منشی ابوالحسن فریدآبادی
- معلم السیاست — ۱۲ر
- تاریخ مصر جدید — ۱۲ر

المیزان مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر کا جواب۔ متانت، قابلیت اور انصاف پسندی کے ساتھ۔ کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت ۲ر
ازواج الانبیاء — ۱۲ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین
- عصر قدیم
- آغا صاحب
- دولت ہسپانیہ
- حروب صلیبیہ
- مسیح اور مسیحیت
- مخدرات (مجلد)
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مقدس نازنین
- قیس و لبنیٰ
- ایام عرب
- فلورا فلورنڈا
- ملک العزیز ورجنا
- فردوس بریں
- شہید وفا
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- خوفناک محبت
- الفانسو
- فلپانا
- فاتح مفتوح
- جویائے حق
- بابک خرمی ۲ حصہ
- تاریخ بغداد
- حسن بن صباح

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- طلسمی فانوس
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- کایا پلٹ

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو
- بچھڑی دلہن
- کڑم دھم
- پی کہاں
- کامنی
- خدائی فوجدار
- فسانۂ آزاد
- الف لیلہ دنیا زاد
- سیر کہسار
- جام سرشار

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزا غنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- پرتاب
- معشوقۂ فرنگ
- برہ روگ

مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا
- لیلیٰ مجنوں
- نوبہار
- مثنوی امید و بیم

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن (۲ جلد)
- خیابان لکھنؤ
- مرقع ۱، ۲
- حرماں نصیب

مسٹر عبدالماجد بی اے

- تاریخ اخلاق یورپ مجلد
- فلسفہ جذبات ”
- فلسفہ اجتماع ”
- تنزل انسانی
- فلسفہ کی تعلیم
- زود پشیماں (ڈراما)

پنڈت چکبست بی اے

- صبح وطن
- گلدستۂ پنچ
- کملا

انیس احمد عباسی بی اے

- ہاجرہ کی کامیابی
- بھوری جنگ

جلال مرحوم

- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- افادۂ تاریخ
- رسالہ تذکیر و تانیث
- منتخب القواعد

منشی احمد علی شوق

- ترانۂ شوق
- عالم خیال
- قاسم و زہرہ
- مسدس لیلیٰ دلہن
- سیکفرن و لوسی

منشی ارتضا علی شرر

- یادگار شرر
- خیاباں
- ہفت گلبن
- صبح وصل
- تصویر عبرت
- دو پھول

خواجہ عشرت

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- تذکرۂ آب بقا
- گلدستۂ ظرافت
- ہمجولی

منشی سید برکات احمد

- جمیلہ
- [illegible]
- یادگار سلف حصہ ۲

علامہ سید احمد

- حمایت الاسلام حصہ اول
- ” حصہ دوم
- فن ہیئت
- فن کمسٹری
- التناسخ

مسٹر مشیر حسین قدوائی

- ذکر طیب محمد عربی
- مشیر
- عرض حال
- تعلیم نسواں
- جذب دل
- حاکم و محکوم

منشی امیر حسن کاکوروی

- فسانۂ لارنس ورتھ
- وگیز و نسیڈا
- الہ دین و ملیکا

مرزا فدا علی خنجر

- محل خانۂ شاہی
- بے زبان عورت

[illegible]

- قواعد اردو
- کلیات نعت
- محاربات صلیبی
- تسخیر فرانس
- واقعات کربلا
- الاحسان
- میلاد ابن جوزی مترجم
- حیات نظامی
- تذکرہ حزیں
- سیکفرن و لوسی
- ایک دن خدا پرست
- مصنوعی شوہر
- زود پشیماں
- نوبہار
- کنولا (۲ جلد)
- مثنوی صبح امید
- اصول نسخ
- تاریخ ہند کی کہانیاں
- عہد ترقی انشا
- اساس تعلیم
- شعر العجم حصہ اول
- ” حصہ دوم
- مجموعۂ کلام شبلی
- ترقی زبان
- عہد ترقی انشا
- اتفاقات زمانہ
- تخیل و بخیہ ۲ر شوکیہ

[illegible]

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

جلد ۱۹	یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۸ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

مشہور مصنفین اُردو کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

کتاب	قیمت
اُردوی معلی	ع۲ر
عود ہندی	۱۰ر
دیوان غالب مجلد اعلیٰ	عہ
″ متوسط	۶ر
″ مع شرح حسرت موہانی	عہ

مولانا حالی مرحوم

کتاب	قیمت
یادگار غالب	عہ
حیات سعدی	عہ
مضامین حالی	۱۲ر
مجموعہ نظم حالی	۱۲ر
مسدس حالی ۸ر	۴ر
شکوہ ہند	۲ر
مثنوی حقوق اولاد	۲ر
رباعیات حالی	۶ر
قطعات حالی	۸ر
مرثیہ مرزا غالب	ار
بیوہ کی مناجات	۲ر
الدین یسر	۳ر
تحفۃ الاخوان	۵ر
رحم و انصاف	ار
چپ کی داد	ار
ننگ خدمت	ار
پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ	ار
حب وطن	ار
تعصب اور انصاف	ار
تدبیر	۲ر

سرسید احمد خاں مرحوم

کتاب	قیمت
مضامین تہذیب الاخلاق مجلد	ہے
تفسیر القرآن (۶ جلد)	عسہ
تبیین الکلام (دو جلد)	ہے
آثار الصنادید	سہ
خطبات احمدیہ	عہ
مکمل مجموعہ لکچر مجلد	ہے
سیرۃ فریدیہ	۱۰ر
اسباب بغاوت ہند	۶ر
مقالات سرسید	عہ
آخری مضامین سرسید	عہ
النظر فی بعض مسائل	۱۲ر
تحریر فی اصول التفسیر	۸ر
احکام طعام اہل الکتاب	۲ر
تحریر فی قصۃ اصحاب کہف	۶ر
ازالۃ الغین	۵ر
تفسیر السموات	۸ر
جواب امہات المومنین	۳ر
الدعاء و الاستجابہ	۳ر
کاشتکش	ار
ایک نادان خدا پرست	ار
انشاء اللہ	ا
خلق الانسان	۲ر
الجن و الجان	۵ر
مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی	۲ر
مہدی آخر الزمان	۲ر
مکاتبات الخلان	عہ
النعال غلامی	عہ

مولوی نذیر احمد مرحوم

کتاب	قیمت
ترجمۃ القرآن اعلیٰ مجلد	ہے
″ متوسط ″	للعہ
ترجمہ حمائل شریف ″	ہے
الحقوق و الفرائض	۶
ادعیۃ القرآن	۸ر
مطالب القرآن	عہ
الحقوق و الفرائض ۳ جلد	صعہ
اجتہاد	عہ
امہات الامہ	۱۲ر
مراۃ العروس	۸ر
بنات النعش	۸ر
توبۃ النصوح	۸ر
مجموعہ نظم بے نظیر	عہ
چند پند	۶ر
منتخب الحکایات	ار
مبادی الحکمۃ	۱۰ر
موعظہ حسنہ	۱۲ر
رویائے صادقہ	عہ
ابن الوقت	عہ
ایامیٰ	۱۴ر
فسانۂ مبتلا	عہ
لکچروں کا مجموعہ	عہ
لکچر نمبر ۲ و ۳ و ۴	۳ر
لکچر نمبر ۳ مع ضمیمہ سید	۴ر
لکچر ضمیمہ ۴ لکچر تعلیم	۲ر
نصاب المسلمین ۴ر آزادی نسواں ۲ر	
رسم خط ۲ر اتمام حجت ار	

مولانا شبلی مرحوم

کتاب	قیمت
الفاروق	عہ
الغزالی	عہ
المامون	عہ
سیرۃ النعمان	عہ
سوانح مولانا روم	عہ
موازنہ انیس و دبیر	۱۰ر
علم الکلام	عہ
الکلام	عہ
سفرنامہ مصر و شام و روم	عہ
رسائل شبلی	عہ
مقالات شبلی	عہ
مضامین عالمگیر	۱۰ر
شعر العجم جلد اول	ہے
″ جلد دوم	عہ
″ جلد سوم	عہ
″ جلد چہارم	عہ
مثنوی صبح امید	۳ر
آغاز اسلام	۱۲ر
اسلامی حکومت	۲ر
زیب النسا	ار
جہانگیر	۲ر
مجموعہ کلام شبلی	۱۲ر
دیوان شبلی فارسی	۸ر
بوئے گل ″	۴ر
دستہ گل ″	۴ر
برگ گل ″	۴
قصیدہ امرتسر	۲ر

مولانا آزاد مرحوم

کتاب	قیمت
آبحیات	عہ
دربار اکبری	للعہ
سخندان فارس	ہے
نیرنگ خیال	۹ر
نظم آزاد	۱۲
قند پارسی	ر
قصص ہند	۸ر
نصیحت کا کرن پھول	۸ر

نواب محسن الملک مرحوم

کتاب	قیمت
مضامین تہذیب الاخلاق مجلد	عہ
سلطنت انگلیشیہ اور مذہب	۳ر
مکاتبات الخلان	عہ
تقلید و عمل بالحدیث	ار
مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب	۸ر
کتاب المحبۃ و الشوق	۸ر
نظرت اور قانون فطرت	۳ر
اسلام	۲ر
آیات بینات ۳ جلد	سہ
مجموعہ لکچر تعلیم	ہے

مولانا اسلم جیراجپوری

کتاب	قیمت
حیات حافظ	عہ
حیات جامی	۱۲ر
علوم عرب	عہ
خواتین	عہ

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

کتاب	قیمت
تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد	عہ
تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ	صعہ
آئین قیصری	عہ
کرزن نامہ	عہ
فلسفۂ تمثال	۱۲
صحیفۂ فطرت	عہ
تقویم اللسان	۶ر
تعلیم الانتقام	۸ر
جغرافیہ ریاضیہ	۱۲ر
معادن الحساب	۱۲ر
رسالہ علم ساحت	۱۲ر
محاربات عظیم	۸ر
رسالہ علم تناسب	۶ر

مولانا شرر مرحوم

کتاب	قیمت
حیات انیس	عہ
ایشیائی شاعری	عہ
ادیب	۸ر
نوجہاں	۸ر
ٹیپو سلطان	۸ر
حیدر علی سلطان	۱۲ر
اُردو کی ڈالی	۳ر
قومی نظم	۴ر
مرقع تاجوشی	عہ
مکالمہ مرد و عورت	۲ر
دُرِ شاہوار	۸ر
نغمات الخواتین	عہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

پادو ورثت کی کلفت ۲ر ... اودھ فضا ... بچوں کی نظم ... اصول ... فطرت ... قافر ...

اکبر الہ آبادی کا سہہ ... خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کا کلام حصہ اول ... کلیات اکبر ...

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۱۱ جلد ۱۹ — یکم ستمبر ۱۹۱۸ء

صنعتی و حرفتی سرگذشتِ ہندوستان

انسان کے لیے پیٹ کا مسئلہ ہمیشہ نہایت اہم رہا ہے، اسی کی بدولت قوموں میں جنگیں ہوتی چلی آرہی ہیں، لکھوکھا بندگانِ خدا کا کشت و خون ہوتا رہا ہے، اور نہ جانے کب تک حرص و آز کے شیدائی، خودغرضی و خودآفرینی پر مرنے والے انسان اس انقلاب پسند عالم میں ایک دوسرے کو محض پیٹ کی خاطر چیرتے اور پھاڑتے رہیں گے۔ نصف صدی سے وحشیانہ اور بہیمت آسا جنگیں رُکی ہوئی تھیں اور جدید تہذیب و شائستگی کی اشاعت سے چند ایسے حنظل صفت طریقے اور ملمع کار اصول سادہ لوح اور بھولے انسانوں کو دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے ہوشیار اور چالاک دماغوں سے نکلکر رائج ہوگئے تھے جن سے سانپ مرجاتا تھا اور لاٹھی نہیں ٹوٹتی تھی۔ ان اصول اور نظریوں کے اختراع کرنے والے دماغ یورپ نژاد تھے اور اُنکے تختۂ مشق بننے والے غریب ایشیائی اور افریقی باشندے جنگیں ہوتی تھیں لیکن توپ تفنگ اور گولہ بارود سے نہیں، بلکہ بساطِ سیاست پر شطرنج کے مُہروں کی سی چالیں چل کر اور عملی جنگ آزمائی سے کوسوں دُور رہکر۔ اور اس تمام مدت میں یورپ کی ڈپلومسی نے جسے نیم مہذب اور کمزور اقوام کے مکر و خدع اور فریب و زور سے تمیز کرنا دشوار ہے، تمام امور کو ہمیشہ اس خوش اسلوبی سے اختتام کو پہونچایا کہ جنکو انکا بیہ پر وبال کرکے نیم بسمل کر دیا۔

جب دنیا اس درجہ متمدن نہ بھی تھی اور لوگوں کی ضروریات اس قدر کثرت اور غیر ضروری ضرررسا

کی حد تک نہ پہونچنے پائی تھیں اُسوقت بھی ہر ملک کی آبادی کا بڑا حصہ محض صنعت و حرفت پر گذران کرتا تھا - لوگوں کو اپنی ضروریات کے لیے کپڑا درکار ہوتا تھا تو جُلاہوں کا پیٹ پلتا تھا - جوتے کی ضرورت ہوتی تھی تو اس سے چماروں کی روزی چلتی تھی - لیٹنے کو پلنگ، کھانے کے لیے ظروف گلی و فلزاتی، غرضکہ ہر قسم کی ضروریات کے لیے ایک دوسرے کو دیہونچا کر ملک کی عام خوشحالی کے معین و مددگار ہوتے رہتے تھے - ایک کا پیسہ دوسرے کی جیب میں جا کر اہل ملک ہی کو فائدہ پہونچا رہتا تھا -

موجودہ زمانہ میں جس قدر وقعت صنعت و حرفت کو دیگئی ہے اور انسانوں کی بسر اوقات کا جس درجہ دار و مدار صنعت و حرفت پر رہ گیا ہے اسکے لیے جرمنی، فرانس، آسٹریا، امریکہ، جاپان کی اقتصادی جد و جہد کی تاریخ پیش نظر رہنا چاہیے - ان ممالک کے باشندوں کے دلوں میں جس قدر عزت و عظمت صنعت و حرفت کی ہے ویسی ہرگز ملازمت سرکاری کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں تک کی نہیں ہوتی اور اصل پوچھو تو ذہانت و دماغی قابلیت کے سمند کی جولانی کے لیے جس قدر صنعت و حرفت کا میدان کشادہ رہتا ہے وہ کسی مدبر کی شاطرانہ چالبازیوں اور مغالطہ انداز سحر طرازیوں کی وسیع مملکت سے ہرگز کم نہیں لیکن ہماری تعلیم اس درجہ ناقص طریقے پر ہو رہی ہے کہ ہمارے بچے صنعتی و حرفتی کاموں کی اہمیت کو خیال میں بھی نہیں لا سکتے - جسکے باعث انکو صنعتی و تجارتی کاروبار میں داخل ہوتے وقت ایک طرح کی شرم دامنگیر ہوتی ہے - ایک بیرسٹر خواہ کیسی ہی قلیل آمدنی رکھتا ہو لیکن اُسکی عزت ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سوسائٹی میں ایک دولتمند تاجر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی - حالانکہ اول الذکر کی حالت جرمنی کے نقلی آویزوں کی سی ہوتی ہے جن کی روشنی سطحی چمک دمک تک ختم ہو جاتی ہے اور آخر الذکر کنول یا لعل سے مشابہ ہوتا ہے جو اپنی روشنی سے دوسروں کو ضیا بخشتا ہے - حقیقی خودداری اور ایمانداری کے ساتھ محنت کر کے روزی یہی لوگ کماتے ہیں -

ہمارے یہاں کے تعلیم یافتہ اگر بنظر غور دیکھیں تو سو میں ننانوے ایسے نکلیں گے جنھوں نے اپنی ذہانت و قوت کو کتابوں کے رٹنے اور غیر عملی تعلیم حاصل کرنے میں برباد کر دیا ہے - ان میں اجتہادی کیفیت ہرگز باقی نہیں رہتی بلکہ وہ دوسروں کے لکیر مقلد بنجاتے ہیں - زمانہ شناسی سے کوسوں دور راہ و رسم منزل سے کوئی سروکار نہیں، اور پیر مغاں کے اشارے پر سجادہ کو مے رنگین کرنے پر طیار، تعلیم محض کتابی، معلومات بالکل محدود - سائنس کے انکشافات اور کیمیاوی تحقیقاتوں کو طلسمی قلعہ سمجھکر

ان میں ہاتھ ڈالنے سے ترساں و لرزاں۔ پھر اس پر لطف یہ کہ ہمارے یہاں کا طریقۂ تعلیم ایسا ناقص اور قوائے عمل کے صحیح نشو و نما کے لحاظ سے تو اتنا بیکار ہے کہ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ یا تو محض سرکاری ملازمت میں داخل ہو جائیں یا کسی محکمہ میں بھرتی قبول کریں یا اگر بہت زیادہ آزادہ روی اور بلند خیالی کو کام میں لائے تو وکالت، ڈاکٹری، اور انجینیری کی طرف توجہ کی۔ لیکن صنعت و حرفت سے ایسی دشمنی کہ گویا صنعت و حرفت کے قریب جانا اور ذلت و بے آبروئی کا ٹوکرا سر پر رکھنا برابر ہے۔

آج جرمنی کو جو اس درجہ فروغ حاصل ہوا ہے وہ محض صنعتی و حرفتی تعلیم کی بدولت سے۔ اگر ہمارے بچوں کو عمدہ طور پر اور مکمل تعلیم صنعت و حرفت کی دیجائے تو اُنکو وقت کی پابندی کا خیال ہونا لازمی ہے۔ پھر اگر وہ کوئی کام کرنا چاہینگے تو پہلے اسکے حسن و قبح کے جملہ پہلوؤں پر نقادانہ نظر ڈالیں گے تب کسی میدان عمل میں قدم بڑھائیں گے اور جب وہ ایک دفعہ اُس میں ہاتھ ڈال دیں گے تو اُسکو ثابت قدمی اور دلسوزی کے ساتھ انجام دیں گے اور یہ بیتاب آسا بیقراری و غیر استواری نہ ہوگی آج ایک کام شروع کیا اور کل ہی اُسکو چھوڑ کر دوسری طرف دوڑ پڑے، جیسا کہ آجکل عام طور پر ہمارے یہاں دستور ہے۔ صناع اور دستکار ایک شے کی حقیقت کو دریافت کرنے میں پوری دلچسپی لیتا ہے۔ وہ موجوداتِ عالم اور اس خالق ازلی کی بنائی ہوئی اشیاء کی غایت دریافت کرکے اُنکے سبب پیدائش کی کُنہ تک پہنچکر خود تو فائدہ اُٹھاتا ہی ہے لیکن دوسروں کے لیئے بھی اُنکی کامیابی کی شاہراہ کھول جاتا ہے۔ چیزوں کی کیمیاوی تحقیقات کے بعد اُنکے اجزا کو سائنٹفک اصول پر جمع کرکے نئے نئے اور حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ ایسی تعلیم کے حصول کے لیے کیمسٹری (علم کیمیا) اور فزکس (علم طبیعات) کی تحصیل لازمی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ کیمیا اور طبیعیات سے واقفیت رکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ واٹ (۱۷۶۹ء) نے بھاپ کے افعال و خواص کو دریافت کیا اور چونکہ اسکو کلوں کے استعمال پر بھی عبور حاصل تھا اسلیے ان دونوں علوم کو کام میں لاکر اُسنے اسٹیم انجن تیار کر دیا۔ انہیں علوم کی واقفیت سے ہچ چوڈ نے کلا توین بننے کا آلہ ایجاد کیا۔ شیل نے سمندر کے کھاری پانی سے تیزاب تیار کیا اور بھتولٹ نے اُسکو پارچہ شوئی کے لیے رواج دیا۔ غرضکہ دریافت کردہ کیمیائی طریقوں سے دباغت کے نہایت آسان طریقے معرض وجود میں آئے اور اسی نوع کی دیگر اختراعات

وایجادات انسانی محنت کے نقائص کو رفع کرکے اور اُسکی زندگی کی تکالیف کو ہلکا کرکے اُس صانع مطلق اور حکیم برحق کے منشا کو تکمیل کی شاہراہ پر پہونچانے کی بانی ہوئیں اور اسیلیے اُنکی عظمت وبزرگی سے کسی متنفس کو انکار نہیں ہوسکتا۔ آج یوروپ کو جو اسدرجہ خوشحالی حاصل ہے اور وہاں سامان آسائش اسقدر وافر نظر آتے ہیں وہ محض صنعتی و حرفتی تعلیم اور تجارت کے باعث ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس وقت سے یوروپ میں بااصول طریقے پر مدارس صنعت و حرفت کھولے گئے اُسی وقت سے گویا اہل یوروپ نے کتابِ ترقی کا صفحۂ اول اُلٹا۔

تعلیم کی غایت ہی یہ ہے کہ علم حاصل کرکے اسکو کسی طور پر عملی شکل میں لایا جائے تاکہ اُس سے سوسائٹی اور مخلوق عالم کو فائدہ پہونچ سکے۔ فلسفہ ہمکو بتلاتا ہے کہ ادراک ذہنی کا انحصار حواس (senses) پر ہوتا ہے اور مظاہر خارجی (objective phenomena) کا انعکاس محض ذہن ہی میں ہوسکتا ہے اسلیے دونوں لازم و ملزوم ہیں: بلا حواس کے قابلیتِ ذہنی بیکار اور بلا قابلیت ذہنی کے حواس بالکل فضول۔ چنانچہ صنعتی و حرفتی ترقی کے لیے تربیت یافتہ ہنرمندی اور سائنس دانی لازمی چیزیں قرار پا گئی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں کے صناع بُری طرح مصائب و آلام کا شکار ہو رہے ہیں اور بین الاقوامی صنائع کی آزاد درآمد کے مقابلے میں اگر معدودے چند ہستیاں چراغ سحری کی طرح بادِ مخالف کے جھونکوں کا مقابلہ کربھی رہی ہیں تو اُنکی بے استقلالی اور تزلزل کی حالت ظاہر ہے۔ وہ جاہل مطلق ہیں اور سائنٹفک اصول سے بالکل نابلد۔ اور بعینہٖ اُس مسافر کی طرح قدم زن ہیں جو تھک تھک کر بیٹھ جاتا ہو۔ ضعف نے قوائے ذہنی کو اپنے فعل سے معذور کردیا ہے اور غیر ملکی مصنوعات کا عفریت سر پر جان لینے کو سوار رہتا ہے۔ بہتوں کا کوچ ہوچکا ہے جو باقی ہیں وہ بھی رخت سفر باندھے کوسِ رحلت کی آواز پر کان لگائے بیٹھے ہیں۔ بھلا تبلائیے ان حالات اور اس ناسازگاریِ زمانہ کے ہوتے ہوئے کیونکر ملکی مصنوعات کو کامیابی نصیب ہوسکتی ہے۔ لکھنؤ کی چکن، ڈھاکے کی ململ، بنارس کی کمخواب، مچھلی پٹن کی چھینٹ، یہ سب چیزیں ایک زمانہ میں مشہور تھیں۔ آگرے کے ریشمی کپڑے کا ذکر اسکاٹ نے بھی اپنی ایک معروف نظم میں کیا ہے۔ نیل کی تجارت ابھی کل کی بات ہے، لیکن باوجود ایک "مہربان"، "روشن خیال"، اور "مہذب گورنمنٹ" کی حکومت کے اہل ہند جس طرح مصنوعات کی تباہی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

یورو پین ممالک نیز امریکہ و جاپان میں ابتدائی تعلیم جبری و مفت دی جاتی ہے اور اسکے بعد صنعتی و تجارتی تعلیم کا ایسا نفیس طریقہ وہاں کے بہی خواہان ملت نے قائم کر دیا ہے جس سے اُنکی فراست اور طبائع انسانی کو کار آمد بنانے کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کا کورس کُل افرادِ قوم کے لیے یکساں مقرر ہے اس سے نکلکر جب وہ ثانوی مدارس میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں دو راستے اسکے لیے کھلے ہوتے ہیں: ایک جمنیشیا کی راہ ہے جس میں علم ادب یعنی آرٹ کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبا یونیورسٹی کی ڈگری لینے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ جو اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ روشولن (Rea-Shulen) اسکولوں میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں تجارتی اور صنعتی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صنعتی تعلیم کے ساتھ ہی عام تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ تاکہ طلبہ میں ادبی قابلیت بھی آسکے، اور وہ سیاسی و تمدنی مسائل کو بھی بخوبی سمجھ سکیں یہاں سے نکل کر لڑکے اسپشل اسکولوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن میں خاص خاص شعبوں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ ثانوی مدارس میں تجارتی اور صنعتی تعلیم ساتھ ساتھ چلتی ہے تاکہ آگے چل کر پالیٹکنک اور ٹکنولاجیکل درسگاہوں کے داخلہ کے لیے لڑکے تیار ہو سکیں۔

اس طریقۂ تعلیم میں دو امور پر خاص لحاظ رکھا جاتا ہے: اول یہ کہ ذہن ایک خاص اور باقاعدہ نظام کے تحت میں آجائے، دوسرے یہ کہ دماغ کی نشو و نما صحیح طریق پر ہو۔ فرانس میں بھی یہی طریقہ رائج ہے اور وہاں کے کمرشل (تجارتی) اسکولوں میں ذیل کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، زبان، تاریخ، جغرافیہ، قانون، اکونامکس (اقتصادیات)، بک کیپنگ، اور آفس پریکٹس۔

اس قسم کی درسگاہوں میں اکولی ماٹمنی سب سے پرانی درسگاہ ہے۔ کورس تین برس کا مقرر ہے، لڑکے ۱۳- اور ۱۵ برس کے درمیان کی عمر والے داخل کیے جاتے ہیں۔ خاص پیرس میں اس قسم کے دو اسکول موجود ہیں، ایک اکولی کمرشل جسکو ۱۸۶۳ء میں ایوان تجارت نے قائم کیا تھا اور ۱۸۹۰ء میں ایک دوسرا اسکول بنام انسٹیٹیوٹ کمرشل سوداگران نے اپنے ذاتی مصارف سے قائم کیا تھا۔ اسکے علاوہ اس شہر میں دو بڑے تجارتی کالج بھی موجود ہیں، جرمنی میں ریل شوس (Real shus) اسکول گویا کاروباری اور تجارتی تعلیم حاصل کرنے کی بہترین درسگاہیں تصور کیجاتی ہیں۔ وہاں تجارتی اور صنعتی تعلیم پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ ہر شہر (ٹاؤن) میں ایک اسپشل اسکول ضرور

ہوتا ہے اور عام اسکولوں میں بھی بلا استثناء تجارتی تعلیم لازمی طور پر دی جاتی ہے۔ ۱۷ اسپیشل اسکول و کمرشل اور ۹ ہی مڈل اسکول تجارتی تعلیم کے واسطے موجود ہیں۔ ملک آسٹریا میں کل ۲۸۵ کمرشل اسکول اور ۹۹ مرکنٹائل ٹریننگ اسکول قبل از جنگ موجود تھے۔ وائنا کی ہنڈی اکاڈمی تو گویا کمرشل یونیورسٹی کا رتبہ رکھتی ہے۔ اس درسگاہ سے جو لڑکے ڈگری لیکر نکلتے ہیں وہ بڑے بڑے کارخانوں کے منیجر، بنکرز، سوداگر، صناع، اور علمائے اقتصادیات نکلتے ہیں۔ اسی طرح اٹلی میں ۵۶ ٹکنیکل اسکول ہیں جن میں کمرشل ڈپارٹمنٹ بھی ہیں ان میں سے کوموکا انسٹیٹیوٹ زیادہ مشہور ہے۔ اینٹورپ کی کمرشل اکاڈیمی بھی قبل از جنگ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔

اس طریقہ تعلیم کو جو تمام متمدن ممالک میں صنعتی و تجارتی تعلیم کو ترقی دینے کی غرض سے رائج ہے۔ مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں: ابتدائی تعلیم جبریہ طور پر ملک کے ہر بچے کو دی جاتی ہے۔ ابتدائی نصاب کو ختم کرنے کے بعد ثانوی دار میں عام تعلیم کے دوش بدوش تجارتی یا صنعتی تعلیم کا نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے اسکے بعد اگر لڑکا چاہے کہ وہ ادیب بنے یا قانونی تعلیم کی تکمیل کرے تو آرٹ کالجوں میں داخل ہو جاتا ہے اور جو صنعتی و تجارتی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صنعتی یا تجارتی اعلیٰ درسگاہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اسی طور سے جن کو زراعتی تعلیم حاصل کرنا ہے وہ زراعتی کالجوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ڈگریاں کمرشل، صنعتی، زراعتی، غرضکہ جملہ شعبہ جاتِ تعلیم کی عطا کی جاتی ہیں۔ اور انکی وقعت کسی حالت میں ادبی ڈگریوں سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ کمرشل تعلیم کے نصاب میں ذیل کے مضامین عموماً مقرر ہوتے ہیں:

(۱) السنۂ رائج الوقت (۲) غیر ملکی زبانوں میں خط و کتابت کرنا (۳) قانون تجارت اور علم الاقتصاد (۴) تجارتی جغرافیہ (۵) مصطلحاتِ تجارت۔ ان درسگاہوں سے خام پیداوار کے عجائب خانے، کتبخانے، اور لیبوریٹریز ملحق رہتی ہیں جن میں تمام دنیا کے ممالک کی پیداوار کے نمونے اور معدنی اشیاء کے نمونے بغرض استفادہ رکھے ہوتے ہیں۔

ان درسگاہوں میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انکے بانی عموماً ایوانہائے تجارت (چیمبرز آف کامرس) کے ممبران ہوتے ہیں۔ شاید عجیب و غریب خاک پاک ہندوستان کے رہنے والوں کو ممالک متمدنہ کے ایوانہائے تجارت کے ممبروں کی اس قومی ہمدردی اور فراخ حوصلگی پر تعجب ہو کیونکہ یہاں کے

غیرملکی تجار کا شیوہ سوائے ہوم رول کی مخالفت اور تمام فائدہ بخش امور کی تحریکات پر اظہار ناراضگی کے اور کچھ نہیں۔ وہ عموماً بیشمار دولت کے مالک ہوتے ہیں۔ انکی کمائی کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ ہندوستانیوں کے جائز مطالبات کے خلاف ہندوستان و انگلستان میں ایجیٹیشن پھیلانے میں صرف کیا جائے۔ اور باوجود فوق ہمدردیِ انسانی کے ادعا کے کلبوں اور جمخانوں میں بیٹھکر میونشی کیا کرتے اور لہو و لعب میں مشغول رہتے ہیں۔ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہندوستانی عوام (ماسز) کے حقوق کو تعلیم یافتہ اقلیت" کی دستبرد سے بچانے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہی لوگ ہیں لیکن عوام کے ایک فرد کی ہستی کا سودا پچیس روپے میں طے ہو جاتے کبھی کبھی نظر آ جاتا ہے۔ کانگرس سے انکو نفرت، ہوم رول لیگ سے انکو بغض و عناد، اور اصل تو یہ ہے کہ جب وہ ہندوستانی ہیں نہیں تو اُنھیں ہندوستان سے محبت کی وجہ؟ کیا لطف کی بات ہے کہ ایسے لوگوں کی تجارت کو ہر طرح کی مدد پہونچا کر ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ آریہ ورت کی صنعت و دستکاری کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ہمارا پیارا ملک ہندوستان مرصع کاری، سادہ کاری، مینا کاری، کوفت گری، تُسکہ سازی، ریشم بافی، سوا کاری، زرکوبی، و دیگر نادرالوجود صنعتوں اور دستکاریوں کے لیے شہرۂ آفاق ہو رہا تھا۔ یہاں کے صناع اور سلیقہ در ہنرمند پارچہ بافی اور صنعتِ چرم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں کے ظروف گلی و برنجی، ہاتھی دانت و آبنوس کے صندوقچے اور قلمدان روما کے تاجداروں کے لیے بطور تحفہ پیش کیے جاتے تھے جو سارے دربار کو محو حیرت کر لیتے تھے۔ ابھی دو ہی صدی کی بات ہے کہ یہاں کی چھینٹیں، گنگیں، شجر، شیریں باف، جھولے، محمودی، شبنم، آبِ رواں، شلات ناگپوری و لاہوری، ڈھاکے کی ململ، اور کشمیر کے پٹو، لوئی، تافتہ، خاتم شال، شاہ پسند، یا بوتہ محمد شاہی، چینی کار یا مختلف قسم کی جامے واریں شل طاقہ زمہ، خطابر مطبق قلمدانی وغیرہ لاکھوں روپیوں کی قیمت کے ہندوستان سے باہر جا کر یورپ کی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے رہتے تھے اور ہر سال لاکھوں روپیہ غیر ملکوں سے آکر ہمارے صناعوں کی جیبوں میں جاتا تھا۔ لیکن اصل تو یہ ہے کہ محکومیت بدترین بدقسمتی ہے، ہندوستان کی قسمت میں سیاسی غلامی سے پہلے ہی اقتصادی مجبوریوں کا طوق گردن میں پڑا لکھا تھا۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا ہی میں انگلستان کے صناعوں کو ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کے مقابلہ میں بازی لے جانے کی پہلی ہی کوشش میں سخت ہزیمت ہوئی۔ اور وہ آزاد تجارت کے اصولوں کے ماتحت اپنے میں مقابلہ کی قوت نہ دیکھکر پارلیمنٹ سے یہ درخواست

کرنے پر مجبور ہوئے کہ ہندوستانی صنعت کی درآمد کو ہر ممکن طریقہ سے روکنا چاہیے ورنہ ملکی صنعتیں مفقود ہو جائیں گی اور صناع بھوکوں مرنے لگیں گے۔ قوم کی یہ متفقہ صدا جس وقت ایوان پارلیمنٹ سے ٹکرائی تو اس فریاد کو حق بجانب سمجھکر ۱۱۔اپریل ۱۷۰۰ء کو ایک ایکٹ پارلیمنٹ نے پاس کیا جسکا نفاذ ۲۹ ستمبر ۱۷۰۱ء کو مکمل طور پر ہوگیا۔ اس ایکٹ کی رو سے یہ قرار دیا گیا کہ تاریخ مقررہ کے بعد سے جس قدر مال خالص ریشم یا مخلوط ریشم کا تیار کیا ہوا ہندوستان سے برطانوی بندرگاہوں میں داخل ہوگا اور چین وایران سے جو طرازانی مصنوعات داخل ہونگی اُنپر بقول مسٹر ل ۵۰۔ اور ۶۰ فیصدی لیکن دیگر مورخین کے بیان کے موافق ۷۰۔اور ۸۰ فیصدی کے درمیان محصول درآمد بحری وصول کیا جائے گا۔ اور بعض بعض حالتوں میں خاص اشیاء کی درآمد قطعاً ممنوع قرار دے دی گئی اور کہا گیا کہ اگر تاریخ مقررہ کے بعد سے کسی قسم کا مال انگریزی بندرگاہوں میں آئے گا تو وہ نیلام کر دیا جائیگا۔ اُنھیں دنوں اڈنبرا میں ایک سوسائٹی قائم کی گئی تھی اُس نے یہ قرار دیا تھا کہ اگر کوئی لیڈی ہندی مصنوعات میں سے کوئی شے استعمال کرتی پائی جائے تو اُسکو فوراً بائیکاٹ کر دیا جائے یعنی اُس سے بھائی برادری کے جملہ تعلقات منقطع کر دیے جائیں۔ مسٹر تھارن نے ایک جگہ لکھا ہے

"جس وقت ہم نے (قوم انگلش نے) ہندوستان میں قدم رکھا ہے ہندوستان اپنی جملہ ضروریات کو خود پوری کرتا تھا اور کسی دوسرے ملک کی مصنوعات سے بالکل مستغنی تھا۔ سب سے قبل ہمنے آئینی محصول تحفظ تجارت کی پالیسی کی بنا ڈالی لیکن جب اس میں حسب منشاء کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو تمام برطانوی بندرگاہوں پر ہندوستانی مال کی درآمد قطعی طور پر روکنے کے احکامات صادر کیے گئے۔ اور ہندوستان کو مجبور کیا کہ وہ انگلینڈ کے ساختہ پارچہ جات کو ٹیکس و محصول درآمد سے آزاد ہوکر اندرون ملک میں داخل ہونے دے۔ آزاد تجارت کا اُسوقت تک اعلان نہیں کیا گیا جب تک کہ ہندی مصنوعات کو ہم نے بالکل کچل نہیں ڈالا۔ ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کو نیچا دکھانے کا خیال قومی پارلیمنٹ میں ۱۸۱۳ء سے لیکر ۱۸۳۲ء تک اس طرح جاری و ساری رہا اور ہر آن یہی فکر دامنگیر رہی کہ ہندی مصنوعات پر محصول اس طور سے عائد ہوتا رہے کہ ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی برطانوی صنعت سے مقابلہ نہ کر سکے۔ کچھ محصول درآمد اس مال پر جو برطانیہ سے بنکر آتا تھا مقرر بھی [illegible] وہ صرف برائے نام تھا محض اس قدر کہ سرکاری مالیہ کو کچھ رقم مل جایا کرے اور ایک وقت

یعنی ۱۸۷۹ء میں تو یہ بھی منسوخ کردیا گیا اور پارلیمنٹ نے یہ اعلان کیا کہ اس محصول کے اٹھادینے سے بڑا فائدہ ہندوستانیوں کو پہونچانا مقصود ہے"

اس داستان کو لارڈ کرزن نے بھی بیان کیا ہے اور ہم اُسکے بیان کا اقتباس بھی دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ لارڈ موصوف لکھتے ہیں

"۱۸۸۲ء میں ہندوستان کی گورنمنٹ نے برطانوی مصنوعات پر محصول بحری صادر موقوف کردیا جو ۱۸۹۴ء میں دوبارہ عائد کیا گیا - جس وقت لارڈ سالسبری نے ۱۸۷۹ء میں محصول موقوف کردیا تو لارڈ لٹن نے جو اسوقت وائسرائے ہند تھے نہایت ہی اطمینان و مسرت کے اظہار کے ساتھ اس فیصلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا - یہ وہ زمانہ تھا جب سرجان اسٹریچی فنانشل ممبر تھے"

جب گورنمنٹ ہند کو مالی ضروریات نے مجبور کیا کہ درآمد پر محصول بحری دوبارہ عائد کرے تو سارے لنکاشائر اور منچسٹر میں ایک تلاطم مچ گیا - اس طوفان بے تمیزی کا ذکر لارڈ کیمبلی وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں کیا - اسکے بعد سر ہنری فاولر نے یہ شکل مصالحت نکالی کہ برطانوی پارچہ جات پر ۵ فی صدی محصول بحری لگایا جائے اور بمبئی و دیگر مقامات کے کارخانہ جاتِ پارچہ بافی پر ایک غیر فطری ٹیکس یعنی محصول اکسائز (ملکی پیداوار پر محصول) لگایا جائے - البتہ نمبر ۲۰ سے لیکر ۲۴ نمبر تک کے ہندوستانی سُوت کو معاف کردیا گیا - اس اکسائز محصول کی مقدار جو گورنمنٹ کو وصول ہوئی ۱۹۱۸ء میں ۴۹ لاکھ تھی -

تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ نے اپنی دیسی مصنوعات اور تجارت بحری کو ترقی دینے کی خاطر ہر ممکن ذرائع سے کوشش کی اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا - کرامول کے زمانہ میں ۱۶۵۱ء والا قانون بحری (نیویگیشن ایکٹ) کا مقصد کیا تھا؟ صرف یہی کہ انگلستان کی بحری تجارت کو عروج حاصل ہو - اس ایکٹ نے یہ قرار دیدیا تھا کہ برطانوی بندرگاہوں میں جو سامان تجارت افریقہ یا ایشیا سے لایا جائے وہ محض برطانوی جہازوں پر آنا چاہیے - اسٹورٹ خاندان کے عہد میں ڈچ قوم سے جنگ آزمائی کی غایت بھی یہی تھی کہ اہل ہالینڈ (ڈچ) مشرقی تجارت کے بلاشرکت غیرے اجارہ دار بنے بیٹھے تھے انکو زک دے کر برطانیہ کو یہ عزت حاصل کرنا چاہیے - اور یہی پالیسی برطانیہ کی اٹھارہویں صدی میں بھی برقرار رہی - چارلس دوئم نے گو کرامول کے ایام کے جملہ قوانین اُلٹ پلٹ دیے لیکن تجارتی قوانین جیسے کے تیسے برقرار رکھے بلکہ مناعوں کی ہمت افزائی کی غرض سے ۱۶۲۲ء کے ایام میں ہمکو پتہ چلتا ہے کہ ریشم سے علیحدہ

کی ہوئی اشیاء کی برآمد پر فی پونڈ ۶ شلنگ (تھا) بطور امداد سرکاری کے ہر صناع کو ملتا تھا اور جس کپڑے میں سنہرے تاروں کا کام ہوتا تھا اُس پر فی پونڈ (آدھ سیر) تین روپیہ اور ریشمی موزوں پر فی جفت ۱۲ ان طریقوں سے جب انگلستان نے اپنے یہاں کی دیسی مصنوعات کو ترقی دے لی اور نفیس وارزاں مال وہاں کی صنعت گاہوں میں تیار ہونے لگا اور ہندوستان جسکی قسمت میں شاید پہلی مرتبہ دوسروں کا دست نگر ہونا تھا، برابر اپنی مصنوعات کی تباہی کے کرشمے دیکھتا رہا تو کاڈن اور جان برانٹ کے مشورے پر آزاد تجارت کا اعلان برطانیہ نے کر دیا۔ وہ زمانہ انگلستان کے فتوحات کا زمانہ تھا۔ ملک کے ملک طاقتور قوم کے زیر نگیں آتے جا رہے تھے۔ لوگوں میں حُب ملی و جوش قومی کی لہر موجزن تھی۔ قوم کی خاطر جانیں قربان کر دینا اُنکے لیے کھیل سا ہو رہا تھا۔ برطانیہ کے باشندوں میں ہر فرد زرین کارنامے دکھلانے اور نیکنامی کی شہرت حاصل کرنے کی فکر میں سرگرداں تھا۔ سیاسی فتوحات روز افزوں ترقی پر تھیں۔ سیاح اور ملاح ساتوں سمندروں میں لکڑی کے بادبانی گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے۔ علمی چرچے گھر گھر ہونے لگے تھے اور سائنٹفک اصول بھی قدرے قلیل مروج ہو چلے تھے۔ نئی تحقیقات اور ایجادوں کا خیال تو بچہ بچہ کو دامنگیر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برک، جان برائٹ، جیسے لوگ سرزمین برطانیہ سے پیدا ہوئے اور یہی وہ ایام تھے جب وہ تمام صفات اہل برطانیہ میں موجود ہو گئے تھے جو ایک نوخیز قوم میں ہونا چاہیئے گو ایجادوں کا ابتدائی زمانہ تھا تاہم انھیں ایجادات کی دھن میں لگے رہنے سے اصل یہ ہے کہ انگلستان کو وہ معراج ترقی نصیب ہوا جو بہت کم قوموں کے حصہ میں آیا ہے۔ اسوقت اہل ہند آپس کے جھگڑوں، خانہ جنگیوں، اور عیش و عشرت میں پڑے ہوئے تھے اور حریف چپکے چپکے اپنی فکروں میں لگے ہوئے تھے۔

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب　　　بیدرد دعائے خود اندر میانہ ساخت

دل و دماغ کو ایک نظام کے تحت میں لاکر اس سے با اصول طرز پر کام لینے کے لیے تربیت گاہیں قائم ہوتی جا رہی تھیں تاکہ لوگ کاروبار کے باقاعدہ اصول قائم کرکے اُنپر عمل پیرا ہوں۔ صناع تربیت صالح پاکر تنظیم و تقسیم عمل کے اصول پر چل سکیں، پانی اور بھاپ کی قوتیں دریافت کرنے کے لوگ درپے ہو رہے تھے۔ اگلے زمانہ سے لوگ پارچہ بافی، فلزات کے ڈھالنے کے طریقوں، کیمیاوی ادویات و تیزابات کی کشیدسے گو واقف چلے آرہے تھے تاہم مفید ترمیموں اور سود مند اختراعات کا آفتاب اب مطلع انگلستان سے طلوع ہونے کو تھا۔ چنانچہ ۱۷۳۸ء میں سب سے پہلے فلائنگ شٹل (flying shuttle)

کا ظہور انگلستان میں ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل تک وہاں کی کرگاہیں ہندوستان کی کرگاہوں سے ملتی جلتی ہوتی تھیں۔ اسی سال کوئلہ کانوں سے نکل کر بجائے لکڑی کے استعمال ہونے لگا۔ چار سال بعد ہارگریوز نے اسپنگ جینی (Spinning ginny) ایجاد کی اور دو ہی سال بعد کرامپٹن نے میول (Mule) ایجاد کیا اور یہ کارٹ رائٹ کے حصہ کے لیے رہ گیا تھا کہ وہ (۱۷۸۵ء میں) پاورلوم (اسٹیم سے چلنے والی کرگاہ) ایجاد کرے کیونکہ ۱۷۶۸ء میں واٹ اسٹیم انجن ایجاد ہی کر چکا تھا۔ دخانی کرگاہوں کا ایجاد ہونا تھا کہ صنعتِ پارچہ بافی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔

ہندوستانی صناع اپنے فرسودہ آلات ہی پر اکتفا کیے بیٹھے رہے اور جہالت اور قدامت پرستی کے سبب سے کسی قسم کا ردوبدل نہ کر سکے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ فرض گورنمنٹ کا تھا کہ وہ صنعتی دنیا میں جو تغیرات رونما ہو رہے تھے ان سے اپنے ملکی صناعوں کو فائدہ پہونچاتی لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ہر شخص اپنے فائدہ کی کوشش میں تھا۔ جو معمولی تاجرانہ حیثیت سے آئے تھے وہ اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے کشورستاں بن رہے تھے۔ اہل ہند ملک کو غیروں کی دستبرد سے بچانے کی فکر میں پڑے ہوئے تھے صنعت و حرفت کی ترقی کا ذکر کہاں؟ اتفاق سے انھیں دنوں میں (۱۷۵۷ء) انگلستان نے جنگ پلاسی میں فتح پاکر ہندوستان پر اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس مشہور جنگ کے بعد ہی سے طلا و نقرہ کے خزانے انگلستان کو منتقل ہونے لگے اور تمام مورخ متفق الرائے ہیں کہ انگلستان میں حقیقی ترقی کی بنیاد جب ہی سے مضبوط ہو پائی جب وہاں دولت کی فراوانی ہوئی۔ غریب ہندوستان کچھ تو اپنی بے توجہی اور کچھ ان مجبوریوں کے باعث جس کا اُسکو شکار ہونا پڑا! اپنی صنعتوں کو خیرباد کہہ بیٹھا اور افلاس تو یہاں کے لیے اسی طرح ضرب المثل ہو گیا جیسے کبھی یہاں کی دولت کے افسانے مشہور تھے۔

صناع اور دستکار اپنے پیشے کو چھوڑ کر زراعت پر جھک پڑے۔ ایک تو یوں ہی زراعت میں تقلیل حاصل کا مسئلہ کمی ہی کی طرف لوگوں کو لیے جا رہا ہے دوسری بلا یہ نازل ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں جو اعداد نکالے گئے تھے ان میں مشکل سے ۱۳۔ ایسے لوگ تھے جنکا پیشہ کاشتکاری تھا اور ۲۔ ایسے تھے جو کسی دوسرے پیشہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ انگلستان میں اگر ایک آدمی زراعت میں معروف ہے تو آٹھ صنعت میں۔ آئرلینڈ بھی بہت کچھ زراعت پر قناعت

کرنے کو مجبور کیا جاتا رہا ہے لیکن وہاں بھی چار کے مقابلہ میں تین صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ مسٹر مورلینڈ نے جو اعداد ہندوستان کی صنعت کے متعلق پیش کیے ہیں ان میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان میں کل آبادی میں سے مشکل سے ڈیڑھ فی صدی صنعت و حرفت میں لگے ہوئے ہیں۔ ذیل کے اعداد سے واضح ہوگا کہ اب ہندوستان کی صنعتی ترقی کا کیا حال ہے :۔

کل آبادی کا ۶،۶ فی صدی صنعت میں لگا ہے،

شہری یا قصباتی آبادی کا ۷،۱۱ فی صدی صنعت میں لگا ہے

دیہی آبادی ۶،۲ " " " "

زرعی آبادی کا ۱۲،۸ " " " "

تحقیقاتی کمیشن قحط نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان کی اصل وجہ افلاس صنعت و حرفت کے زوال اور زراعت کی ترقی کو قرار دیا تھا اور اس بات پر گورنمنٹ کو توجہ دلائی تھی کہ قحطوں کا باب اُسوقت تک ہرگز نہیں بند ہو سکتا جب تک کہ ملک میں صنعت و حرفت کی سرپرستی گورنمنٹ اپنے ذمہ نہ لے لیگی اور ٹکنیکل و انڈسٹریل اسکول بڑی تعداد میں ملک کے ضلع ضلع میں نہ کھولے جائیں گے۔ ایسے کمیشنوں کی تحقیقاتیں اور انکی سفارشات آئے دن گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن ع کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ بیوروکریسی (حکمراں جماعت) کی ایک حد تک خود مختارانہ کارروائیوں اور سیاسیات کی کی چلمن کی اوٹ کمیشنوں کو کون دھیان میں لاتا ہے۔ بیوروکریٹک گروہ کو ایک ایوان فلک فرسا کہنا چاہیے۔ اس قسم کی سفارشات آوازِ بازگشت کی طرح آہنی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتی ہیں بھلا ان میں اعجاز داؤدی کہاں سے پیدا کیا جائے کہ ان آہنی دیواروں کو موم سا نرم کرسکیں۔

اہل ہند کو جب دخانی آلات سے کام لینے کی طرف توجہ ہوئی تو پانی سر سے گذر چکا تھا۔ بازار دوسرے ملک کے ہاتھ میں تھا۔ جو اشیائے ضروریہ یورپ سے آ آکر ہمارے مکانوں اور کمروں کو زینت دیتی تھیں اسلیئے مُلّا کی دوڑ مسجد تک ہوکر رہ گئی یعنی اس توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ محض خام اجناس کو صاف کرنے کے کارخانے بہت سے قائم ہوگئے اور ایک دو کارخانے کسی قسم کی صنعت کے قائم ہوئے بھی تو سرمایہ کی کمی کے باعث نہایت ہی چھوٹے پیمانے پر، جو نہ تو خود ہی اتنا مال پیدا کرسکتے ہیں کہ ملکی ضروریات پوری ہوسکیں اور نہ بازار میں ولایتی مال کا مقابلہ ہی کرسکتے ہیں۔ اگر کامیابی ہو بھی سکی تو ایسی چیزوں میں جنکی

طرف یا تو ولایت والوں سے توجہ ہی نہ کی تھی یا وہ مال ولایت سے یہاں تک پہنچ نہ سکتے تھے۔ مثلاً برف بنانے کے کارخانے، آٹا پیسنے کے کارخانے، لمنیڈ اور سوڈا واٹر کی فیکٹریاں، چونا، تماکو، سرخی کوٹنے کے کارخانے، یا دو چار چمڑہ رنگنے کے کارخانے۔ البتہ ان سب میں آدم جی پیر جی کی ویسٹرن انڈیا اکیوپمنٹ فیکٹری کا درجہ معزز خیال کیا جا سکتا ہے۔ کپاس اوٹنے اور روئی پریس کرنے کے کارخانے بیشک بہت قائم ہوئے جو روئی کی گانٹھیں باندھکر غیر ممالک کو روانہ کرتے ہیں۔ بمبئی اور احمدآباد کے پارچہ بافی کے کارخانے بھی منافع کے ساتھ چل رہے ہیں اور زیادہ اُنکے مالک ہندوستانی ہی ہیں۔ اتفاق سے گذشتہ جنگ امریکہ چھڑی جس نے ان کارخانوں کو اور بھی چمکا دیا۔ لیکن اسپر بھی یہ کارخانے اپنا مال منچسٹر اور لنکا شائر کے مقابلے میں ارزاں فروخت نہیں کر سکتے کیونکہ محصول متوازی لگایا جاتا ہے۔ لطف یہ کہ کلکتہ اور اُسکے جوار میں جو جوٹ کے کارخانے ہیں اُنکے مالک کُل کے کُل یوروپین حضرات ہیں۔ اسی طرح سے اس قسم کے کارخانے جو خاطر خواہ منافع حاصل کرتے ہیں مثلاً چاے کے جو آسام، دارجلنگ اور نیلگری میں ہیں، کوئلہ اور دیگر کان کنی کے کارخانے جو زیادہ تر بنگال میں ہیں، نیز ریلوے لائنیں، پوسٹ، اور ٹیلیگراف، وولن ملز (اُون بافی کے کارخانے) پیپر ملز، کشید شراب کی فیکٹریاں، اور ڈاک یارڈ (بحری گھاٹ) کُل کے کُل یوروپین حضرات کی بلا شرکت غیرے مِلک ہیں۔ جوٹ ملز اور پارچہ بافی کے کارخانوں کی ترقی ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگی۔

	کارخانہ جات جوٹ	تعداد مزدور و کارگر	کارخانہ جات پارچہ بافی	تعداد مزدور
سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء	۵۵	۳۸۰۰۰	۲۲	۲۷۵۰۰۰
سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء	۲۳۳	۲۶۱۰۰۰	۷۰	۲۳۸۰۰۰

دخانی کارخانے جنکے مالک غریب ہندوستانی ہیں وہ بھی ایسے ہیں جنکو حوصلہ مند اور صنعتی کاروں کو ترقی دینے والے دلدادہ و شیدائی لوگ محض ایک دوسرے کی تقلید میں آنکھ بند کرکے کھول دیتے ہیں اور اگر سچ پوچھو تو ایسے کاموں میں عقل آرائی، جدت طرازی اور صنعتی معلومات کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے البتہ کارخانہ قائم کرتے وقت بطور پیشکش و نذرانہ کے ایک معتدبہ رقم انگلینڈ کے کارخانہ داران مشنری مثل ٹنکر شینٹن، بیلاک ولکاک، ڈائی سکیمین، فرینڈ انیڈ شا مرز وغیرہ کی نذر کرنا پڑتی ہے۔ کارخانہ قائم کرنے والے غریب ہندوستانیوں کی جیب ٹٹولنے کو خود ہندوستان ہی کے اندر ایک بڑا گروہ دلالوں کا

موجود ہے - دیواروں پر یہ ایسی تیلیاں پکڑنے کو لگی ہیں کہ دام اُمید ہو پہونچا ہی محال ہو جاتا ہے اور اگر بعض خوش قسمت پہونچ بھی جاتے ہیں تو وہ ایسے بے پر وبال ہو جاتے ہیں کہ پھر جان بچانا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے - یہ دلال ہرنئے شکار کو جال میں پھانسنے کے لیے دست آز دراز کیے بیٹھے رہتے ہیں بمبئی کی چرچ گیٹ اسٹریٹ، بلارڈ روڈ، مارتس اسٹریٹ ان ایجنٹوں شل برڈبری بریڈی، کرامپٹن گریوز کاٹن، اور کلکتہ کی کلایوڈ اسٹریٹ، ڈلہوزی اسٹریٹ مثل الیگزنڈر نیگ، جیسپ اینڈ کو وغیرہ سے پُر ہیں البتہ بمبئی کی ہمزنڈ اسٹریٹ سے گزرنے میں ایک سائن بورڈ نظر آجاتا ہے جسپر ٹھاکر داس جمنا داس مشنری سپلائرز لکھا ہوا ہے لیکن انکی دوکان پر وہ چہل پہل کہاں جو انگریزی ایجنٹوں کے یہاں پائی جاتی ہے - پھر ابتدائی مصارفِ خریداریِ مشین ہی تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کارخانہ قائم کرتے ہی سالانہ بطور خراج کے انگریزی فرموں کو برابر ادا کرتے رہنا پڑتا ہے کیونکہ مشنری میں شکست و ریخت ہوتی ہی رہتی ہے اور ہندوستان اس قابل کبھی نہیں ہو پایا ہے کہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بھی تیار کر سکے۔

جاپان کو ابھی صنعتی میدان میں قدم رکھے مشکل سے بیس برس گذرے ہوں گے وہاں بوائلر اور انجن تیار ہونے لگے ہیں - ٹوکیو کا اشیا سیڈو، کیوشکی کیشا، اور کیمی کا کوشی کیشا - ان کارخانوں کے بوائلر اور ننگاساکی کا کارخانہ مٹسو آئرن ورکس، اور لٹن کیپی کا کارخانہ جو کیمبی میں ہے اس قابل ہو گیا ہے کہ اسکے انجن برابر کام دینے لگے ہیں - جائے حیرت ہے کہ ہندوستان سا وسیع ملک جہاں ہزارہا اقسام کے تخم موجود ہیں جن سے لیوبریکیٹنگ انجن کے پُرزوں میں ڈالنے والا تیل نکل سکتا ہے اور یہیں سے بھیجے ہوئے تخموں کا تیل نکلکر پھر واپس آتا ہے۔ اور لطف یہ کہ اسقدر ارزاں کہ قبل از جنگ چار سیر فی روپیہ یہاں کے دوکانداروں کے یہاں فروخت ہوتا تھا اور رینڈی کا تیل اسوقت ڈھائی سیر اور تین سیر فی روپیہ مشکل سے پڑتا تھا - گو رینڈی کا تیل پرزوں کے لیے مفید ہوتا ہے لیکن ارزانی کی وجہ سے کارخانہ دار مجبور ہوتے تھے کہ غیر ملکی تیل خریدیں - اسکا سبب دریافت کرنے کے لیے ہم کو زیادہ کاوش کی حاجت نہیں - مسٹر مورلینڈ نے اپنے حال کے مضمون میں یہ رمز عیاں کردیا ہے کہ گورنمنٹ نے محصول برآمدگی روغن والے تخموں پر موقوف کر دیا - جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی صنعت روغن کو ترقی نہ ہو سکی اور یہاں کے کارخانے دار غیر ملکی روغن کا مقابلہ نہ کر سکے۔

غیر ملکوں میں ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے جو طریقے برتے گئے ہیں اور جن جن طریق پر

وہاں کی حکومتیں دیسی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی تدابیر نکالتی ہیں وہ نہایت سادہ ہیں۔ لیکن بغیر انکے محض لفظی جمع خرچ سے اگر کوئی ملک چاہے کہ اُسکو صنعتی و کاروباری دنیا کے مجلس میں قدم رکھنے کا اذن مل سکے تو یہ غیر ممکن ہے۔ سب سے قبل ان ممالک میں ابتدائی تعلیم جبری و مفت کردی گئی اسی کے ساتھ ہی ٹکنیکل، کمرشل اسکول، کالج، یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جنکا ذکر ہم مختصراً اوپر کر چکے ہیں۔ دیسی صنعتوں کو ملک میں کامیاب بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ صنعتیں عموماً ابتدا میں ناواقف اور غیر ہوشمند کاریگروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں انکی ناواقفیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ابتداءً چیزیں نفیس اور ارزاں نہیں ہوتیں لیکن ان چیزوں کی ملک ہی میں کھپت کے لیے اور غیر ملکی مال کے مقابلہ کے واسطے محصول بحری تامینی لگاتے ہیں چنانچہ فرانس ایک صنعت میں اُسوقت تک ترقی نہ کرسکا جب تک کہ اُسنے ۱۹۲۰ء میں تامینی پالیسی پر عملدرآمد نہ کیا۔ نئی نئی صنعتوں کے کارخانے نمونے کے طور پر حکومت خود قائم کرتی ہے جس وقت تک وہ آزمائشی حالت میں رہتے ہیں نفع و نقصان گورنمنٹ خود برداشت کرتی ہے۔ اگر کام منفعت خیز نظر آتا ہے تو قوم یا کسی ملکی کمپنی کے ہاتھ فروخت کرڈالتی ہے تاکہ اُس سے لوگ فائدہ اُٹھائیں اور دوسرے اہل حرفہ کو اس طرز کے اور کارخانے قائم کرنے کا حوصلہ بڑھے اور ترغیب ہو۔ تجارت ایک قلب ہے اور سرمایہ اُسکی روح، بلا سرمایہ کے کسی تجارت یا کارخانے کو ہرگز فروغ نہیں حاصل ہوسکتا۔ گورنمنٹ صنعتی بنک یا تو خود قائم کرتی ہے یا سرمایہ داروں سے قائم کراتی ہے اور کچھ میعاد کے لیے منافع کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے نیز بعض بعض بڑی بڑی صنعتوں کے منافع کی ذمہ داری بھی خود لے لیتی ہے۔ خام پیداوار کے بحری محصول اور ریل کے کرایہ میں خاص خاص رعایتیں کرادیتی ہے۔ غرضکہ انہی طریقوں سے گورنمنٹ صناعوں اور سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی ہر صورتِ ممکنہ میں کرتی رہتی ہے۔ غیر ملک سے تجارت کرنے کے لیے سرکاری امداد پانے والی جہازی کمپنیاں قائم کیجاتی ہیں تاکہ اُنپر خام اجناس غیر ممالک سے آسکیں اور ملک کا بنا ہوا مال بآسانی کم شرح کرایہ پر غیر ممالک کی منڈیوں میں جاکر فروخت ہوسکے۔ گورنمنٹ بڑے بڑے بنک قائم کراتی ہے اور اُسکی شاخیں حکومت کی ساکھ پر غیر ملکوں میں کھولی جاتی ہیں تاکہ زرِ فلزاتی کے بار کرنے اور اُتارنے میں ہنڈیوں، زرِ کاغذی اور چیکوں سے کام نکل جائے۔ تجارتی اور صنعتی ترقی ہی میں نہیں بلکہ اگر سچ پوچھو تو قومی اور انفرادی ترقی تک میں موقع (اپرچونیٹی) کو بڑا دخل رہتا ہے۔ چنانچہ ہمکو علم ہے کہ موجودہ

جنگ یورپ سے پیشتر کارخانے تو ہر قسم کے جاپان میں کھلے ہوئے تھے لیکن ان میں بہت سے نہایت خستہ حالت میں تھے بلکہ بعض بعض تو دم توڑ رہے تھے لیکن جنگ سے ممالکِ یورپ کا رنگ ہی بدل گیا

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند ؛ جرمنی - فرانس - بلجیم - انگلستان - اٹلی - آسٹریا سب برسر پیکار ہیں ہر ملک کو سیاسی اور تجارتی اقتدار حاصل کرنے کی دُھن ہے - اُنکے کاروبار بند ہوگئے - جاپان جسکے لفظی معنی جائے طلوع آفتاب سکے ہیں آج اپنے آفتاب تجارت کو نصف النہار پر درخشاں دیکھ رہا ہے - روپیہ پانی کے جھاگ کی طرح اُمنڈا چلا آرہا ہے دولت کا ریلا ہے اور مشرقی ممالک تو صنعتی ضروریات کے لیے کُل کے کُل آج جاپان ہی کے دستِ نگر ہو رہے ہیں کیا چین کیا ہندوستان کیا سیام اور کیا خود اسٹریلیا - ہندوستان میں جو تمام طرح کی معدنی و نباتاتی دولت سے مالا مال ہے اگر حکومت توجہ کرتی تو کیا کچھ نہ ہوجاتا - لیکن

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

جاپان خود اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا تھا اسلیے دیدۂ لیلیٰ پر جتنا کچھ فخر کرے حق بجانب ہے لیکن ہم تھے دوسروں کے محتاج کسی کے دستِ طلا پاش سے زرباری کے منتظر، کعبۂ فرنگ کے سنگ ابیض پر سربسجود، پھر بھلا تبلائیے کہ جاپان ترقی اور معجزنما ترقی حاصل کرسکتا تھا یا ہم؟

(باقی آیندہ) عزیز اسیونی

جو حق پوچھو کتاب آرزو کا حرفِ باطل ہوں
مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھکو مٹا دینے کے قابل ہوں
خفا تم جرم الفت پر خجل میں جرم الفت سے
نہ تم ملنے پہ آمادہ نہیں ملنے کے قابل ہوں
گرہ ان ابرووں کی مجھکو کب مایوس کرتی ہے
تبسم تیرا کہتا ہے کلیدِ عقدۂ دل ہوں
مری حیرت نتیجہ ہے تری رنگیں ادائی کا
تری محفل میں اک تصویر ہوں اور زیبِ محفل ہوں
خیالِ خام سے ہے پختگی بنیادِ الفت کی
سراپا شوق، ممنونِ فریبِ سعیِ باطل ہوں
نظر جس نے اُٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو مری جانب
عجب مشکل میں ہوں کیونکر کہوں میں اُسکا بسمل ہوں
جرس نالاں ہے اپنے نالۂ پیہم سے، کہتا ہے
خدا جانے میں کس کمبخت کا ٹوٹا ہوا دل ہوں
تبسم ہونٹوں ہونٹوں میں مُکر جانے کو کہتا ہے
نگاہِ ناز لیکن صاف کہتی ہے کہ قاتل ہوں
تڑپتا ہوں جو میں تو لوٹ جاتا ہے مرا قاتل
شکار افگن کا منظورِ نظر وہ صیدِ بسمل ہوں
سراپا آرزو تھا ایک دن، اُسکی سزا یہ ہے
مرقع یاس کا ہوں، داستانِ حسرتِ دل ہوں
غزل اپنی کہاں ہے قابلِ بزمِ طرب وحشت
کہ ہر ہر شعر کہتا ہے صدائے گریۂ دل ہوں

رضا علی وحشت

بیوہ

یہ عجیب دلخراش لفظ ہے جس کے سننے سے نہایت حسرت انگیز سماں نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ایک بیکس بیوہ کی حسرت بھری صورت اور اداس چہرہ سے دل میں جاتا ہے۔ اُسکے دلی خیالات کا اندازہ اور بیدیاس و ناامیدی اور رنج والم اور اُسکی تباہی و بربادی سب اس ایک لفظ میں بھری ہوئی ہیں۔ الفاظ کا اثر جذبات اور خیالات پر ایک عجیب و غریب پڑتا ہے۔ معشوق کے لفظ سے ہمیشہ ایک حسین و مہجبین کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ دُلھن کے لفظ سے اک دلفریب صورت بنی سنوری مورت حیا و شرم کی تصویر نظر آتی ہے۔ اسی طرح پر بیوہ۔ غریب، محتاج مصیبت زدہ ! ان تمام الفاظ کے مصداقات کی جو صورتیں آئینہ خیال میں مرتسم ہوتی ہیں اُنکے ساتھ اُنکے لوازمات کا بھی تصور پیدا ہوتا ہے۔ انھیں جذبات و خیالات کو الفاظ کا اک مزین لباس پہنا دینا ایک شاعر کا کام ہے اور وہ چھپی ہوئی دل کی باتیں اور پوشیدہ راز اور خفیہ بھید جو کسی حس سے دوسروں کو محسوس نہیں ہوتا ہے اُسکو وہ الفاظ کی اک خوشنما ترکیب کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ اک بیوہ کے لیے جو امور تباہی اور بربادی کا موجب ہیں اور وہ حالات جو اُسپر گذرتے ہیں اور وہ جگر دوز صدمہ جو اُسکی صورت سے ظاہر ہوتا ہے اُسکو سب ہی دیکھ لیتے ہیں لیکن جن امور کا اندازہ اُسکا دل کرتا ہے اور جو جو خواہشیں اور تمنائیں پوشیدہ طور پر اُسکے دل میں اُٹھکے بجھ جاتی ہیں اور جس آرزو کا اُس کی خون ہوتا ہے نہ اُسکو کوئی بیان کر سکتا ہے نہ کسی کو اُسکا اندازہ ہوتا ہے اور وہ غریب دل مسوس مسوس کر رہ جاتی ہے اور منہ سے نہیں نکالتی ہے۔ ایک شاعر الفاظ کے مصداقات کو بدل کر ایک دلچسپ پہلو سے دکھا دیتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ظلم و ستم بیدادگروں کا کام ہے اور بیداد کوئی خوبی نہیں سخت بیدردی کا کام ہے۔ لیکن شاعر عاشق جانباز کے لیے اولے معشوقانہ کے اثر کو بیداد کہتا ہے۔ اور اسکو اس خوبی سے بیان کرتا ہے جس سے ہو بہو تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے

کیا مزے ہیں ستم کشید دل کو ہر جفا کو ادا سمجھتے ہیں

معشوق کے عشوہ کو جو عاشق کے دلپر ایک گہرا اثر پیدا کرتا ہے جفا کہتا ہے : در حقیقت جفا کے لفظ سے

ناگواری دور کرنے کے لیے ایک دلفریب لفظ سے تعبیر کرتا ہے کہ یہ بھی ایک ادا ہے اور پھر اس کے لطف کے دوبالا کرنے کے لیے تعجب ظاہر کرتا ہے "کیا مزے ہیں ستم کشیدوں کو"

آنکھ کیا ہے موہنی ہے سحر ہے اعجاز ہے		اک نگاہِ لطف سے سارا گلہ جاتا رہا

ایک اور شاعر کہتا ہے

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا		بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

الفاظ کے ہیر پھیر اور خیالات اور جذبات کے تغیر اور تبدل کو دیکھیے - جفا و ظلم و ستم جس کسی طرف منسوب ہوتے ہیں وہ ظالم کہلاتا ہے - اور ظاہر ہے کہ ایک ظالم ہر شخص کے خیال میں ایک خوفناک شخص معلوم ہوتا ہے لیکن یہ الفاظ جب ایک معشوق جفا پیشہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو کس قدر خوشگوار کس قدر دلچسپ کتنا دلفریب سین نظر آتا ہے - واہ! ایک ادنیٰ اشارے میں اسکی ناگواری جاتی رہی سبحان اللہ، اتنے گلے اتنے شکوے - اک ذرا سی بات میں سارا گلہ جاتا رہا - صل علیٰ - شاعر نے ایک نئے انداز سے الفاظ کے اثر کو کیسا بدلا ہے اور ایک پُر حسرت دل کی تمناؤں کے جذبات کو کس عمدہ پہلو سے دکھایا ہے - ہجراں نصیبوں کے پُر درد دل میں ایک یہ بھی تمنا ہوتی ہے کہ ہم اپنے درد دل کو ایک مرتبہ تو کہدیں ایک دفعہ تو اپنی شکایتیں پیش کر دیں مگر کبھی موقع نہ ملا - ع - اک نگاہِ لطف سے سارا گلہ جاتا رہا - اس موہنی آنکھ نے ایسا جادو کیا کہ زبان بند ہو گئی -

غرضکہ شاعر اُن کیفیتوں کو ظاہر کرتا ہے جو ایک پُر درد دل میں کس کس طرح سے پیدا ہوتی ہیں حسرتوں کا فوٹو کھینچتا ہے، تمناؤں کی تصویر اُتارتا ہے، مگر پھر بھی وہ جگر دوز تیر ایسے نہیں ہوتے ہیں جیسی ایک بدنصیب بیوہ کی اُداس صورت! وہ تو جیتی جاگتی حسرت بھری تصویر ہے - وہ تو رنج و غم کی اصلی مصداق ہے، وہ تو یاس و ناامیدی کی مجسم صورت ہے وہ تو درد و الم کا پورا فوٹو ہے عاشقوں کی حسرتیں اور تمنائیں تو دلخوش کُن چوچلے ہیں - عاشقوں کی دلچسپ حسرتوں سے اور اُس غمزدہ کے غم و الم سے کیا مقابلہ؟ اُسکی حسرت بھری آرزوئیں جنکا خون ہو گیا، اُسکی ناامیدی جسکی حد نہیں رہی، اُسکے ارمان جو اب کبھی نہیں نکلیں گے، اُسکی امید جو اب کبھی نہ بر آئیگی، سب کا خاتمہ ہو گیا - اُسکی سوگوار صورت ایک دلگداز سین پیدا کرتی ہے - وہ نازک اندام مہوش، وہ لالہ فام دلربا، جنکے باغ حُسن کے شگفتہ اور تر و تازہ پھول ایک سرسبز و شاداب منظر دکھا رہے تھے، اب

وہ اپنی گم شدہ بہار کی یاد میں اس طرح محو نوحہ ہے

ناشگفتہ رہا یہ غنچۂ دل ، نہ کھلی لے صبا کلی ہی تو ہے

اب وہ کرشمہ وناز، غمزہ و انداز، وہ دلربائی، وہ کج ادائی ، وہ ستم شعاری وہ جفاکاری کس کے ساتھ کرے اور کون ہے جو اُسکی ان اداؤں کو دیکھے گا؟ کیونکہ وہ اب "بیوہ" ہے۔ انقلاب زمانہ اور عبرت انگیز واقعات کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں، مگر یہ عجب عبرت انگیز اور پُر حسرت مرقع ہے جسکے اثر سے ہر شخص کے دلی جذبات میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو جاتا ہے وہ دلکش ادا اور وہ لگاوٹ انداز اور وہ شوخی و شرارت اور خرام ناز ان سب کا خاتمہ صرف ایک لفظ سے ہوگیا۔ وہی ناگوار لفظ بیوہ ہے۔ اسے تُرک من نازک تر کی تمام شدہ۔

ایک بزرگوار فرماتے ہیں

دل دے کے لئے پری تجھے دلبر بنا دیا اپنے ستم سہے کہ ستمگر بنا دیا

یعنی ستم پسندوں کی بدولت اے پری تجھ میں یہ معشوقانہ انداز آئے۔ گویا جب ہم عاشق بنے تو تجھ میں معشوقیت پیدا ہوئی" مگر اب وہ ستم سہنے والا نہ رہا تو وہ معشوقیت کے انداز بھی تشریف لے گئے

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

جس روشنی میں یہ نازو انداز کے ذرّے چمکتے تھے وہ شعاعیں عاشق کے سینۂ سوزاں کی تھیں، شعلے اب نہ رہے وہ شرارے اب کس دل سے اُٹھیں ایک نوجوان اور حسین عورت کی نسبت جب یہ خیال پیدا کیا جائے کہ وہ بیوہ ہے تو حسرت نصیب دل میں وہ رعنائی اور زیبائی نہ پیدا ہوگی ہمارے خیالوں میں ایک پژمردہ صورت، اُداس شکل، کملایا ہوا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ یہ وہ اثرات ہیں جو ایک بیوہ کے لفظ نے اک پری تمثال معشوق کی نسبت پیدا کر دئے دوسروں کے دلوں پر اُسکا عکس پڑتا ہے۔ ایک شاعر کسی معشوق سے کہتا ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے یہ یاد رہے ہمکو بہت یاد کروگے

شاعر نے جس قدر اپنی نازبرداریوں کا حق ثابت کیا ہے اُسی قدر اُسکی معشوقیت کا بھی پایہ بلند کردیا ہے صرف اُسکی اس تعریف کے اثر نے دلوں پر یہ اثر قائم کیا ہے کہ گویا ہمارے سامنے ایک حور وش، پری تمثال اور ایک نازک ادا اور نازو انداز کا مجسم معشوق ہے جس سے ہمارا دل مزے لے رہا ہے۔

عاشق کا یہ کہنا بتارہا ہے کہ عجب ناز و انداز کا معشوق ہے۔ وہ دلربا صورتیں وہ حسن کی دیویاں، وہ پری نژاد عورتیں جنکی خیالی تصویروں کو الفاظ کے ذریعہ سے دلچسپ بنا دیا ہو۔ ان کی تمام کیفیات میں ایک ہی لفظ سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ شوق و ذوق اور جذبات اور خیالات باقی نہیں رہتے جو عام طور سے کسی معشوق کے تذکرہ سے پیدا ہوتی ہیں وہ "بیوہ" ہے۔ ایک پھڑکتا ہوا شعر ہے

سر مرا کاٹ کے پچتایئے گا		جھوٹی پھر کس کی قسم کھایئے گا

کیوں صاحب! جب ہم نہ ہونگے تو یہ تمھارے ناز و انداز بھی نہ ہوں گے اور یہ ہمارا مشق ناز سر بھی نہ ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ اب پچتایئے کہ جھوٹی قسمیں اب کس کے سر تھوپیں۔ ہزاروں فقرے ہمارے سر کے بدولت چل گئے۔ سیکڑوں وار اسی سر کی وجہ سے آپ نے خالی دیے۔

شاعر نے اس معشوق کی کوئی تصویر نہیں کھینچی مگر جن اداؤں کے ساتھ یہ زاہد کش عابد فریب ہمارے خیال میں ہے وہ اک عجب پُرلطف سین ہے۔ انھیں جذبات کی نسبت ہماری بحث ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے کہ عاشقوں کی ادا پرستی اور ستم زدوں کی بیقراریوں کا جو عکس معشوقوں کے دل پر پڑتا ہے وہ کیا اثر پیدا کرتا ہے وہ بے پروا معشوق غرور حسن سے اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

غرور حسن اجازت گر نداد اے گُل		کہ پرسشے نہ کُنی عندلیب شیدا را

مگر یہ اسی وقت تک ہے جب تک فدائیوں کا ہجوم حسینوں کے در دولت پر رہتا ہے یہ تصدق ہونے والے سرکیف جب دنیا کو الوداع کہ دیتے ہیں تو اُنکے مفارقت کے دلخراش صدموں سے مہروشوں کے حسن میں وہ تازگی نہیں رہتی ہے۔ اس حالت کا اندازہ ایک بیوہ عورت سے پوچھنا چاہیے کہ اُسکے دل پر ان خیالات کا کیا اثر پڑتا ہے اور کیا کچھ اُسکے دل پر گذر جاتی ہو ایک بات ہو تو کہی جائے اپنی ہر ادا یاد آتی ہوگی اور اُسپر اپنے عاشق زار کی بیقراریاں، ذوق و شوق اور نگاہ لطف کا وہ اثر جسکے مزے وہ اٹھا چکی ہو کیا کیا بجلیاں گراتا ہوگا اور پھر یہی سماں آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہوگا۔ گھنٹوں یہ ہی نقشہ نظروں میں پھرتا ہوگا۔ آہ محبت میں کیا کیا وہم پیدا ہوتے ہیں۔ اک عاشق زار کا یہ کہنا

نظر کہیں نہ لگے اُسکے دست و بازو کو		یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ہاے کیا انہارِ محبت ہے باوجودیکہ زخمِ جگر کی تکلیف سے تڑپ رہا ہے مگر یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس گہرے زخم کو لوگ دیکھکر اسکے معشوق کے دست و بازو کی قوت کو نظر لگائیں۔ یہ ہی اک بات ہے۔ کیا اُس بیوہ کا دل جو کبھی کسی کی معشوقہ تھی اپنی اداؤں اور عاشق کی اُس محبت کا خیال کرکے پاش پاش نہ ہوتا ہوگا اور کیا اُسکو یہ نازبرداریاں یاد نہ آتی ہونگی۔ یہ چھیڑ چھاڑ

نازیبا نہ اُٹھیں گے ہمسے | بار مزدور سے اُٹھوائیے گا

غضب کے تیور دکھائے ہیں۔ غالبًا جس موقع پر یہ نوک جھونک ہوئی ہوگی اُسکا پورا جواب تو نازک ہاتھوں سے دیا گیا ہوگا۔ ایسے موقعوں کا دلچسپ لطف کیا تمام عمر بھولنے کے قابل ہے۔ ان وقتوں کی یاد کیا کیا ستم ڈھاتی ہوگی۔ اور محبوں کے دل اس جگر دوزی سے خالی ہونگے۔ اور یہ لطف واقعات کی یاد اُن نازک دلوں پر تیر و خنجر کا کام کرتی ہوگی۔ ایک شیدا کا یہ کہنا

کوئی قاتل نہیں اُس ترک جفا جو کی طرح | تیغ ہر وقت کھنچی رہتی ہے ابرو کی طرح

یہ تو نہ ہوا ہوگا کہ سُن کر کوئی معشوق چُپ رہ جائے۔ ایک طرف اُس نیم بسمل کو نوکِ خنجر کا ٹھوکا دیا ہوگا دوسری طرف مسکرا کے یہ کہا ہوگا کہ "بس بس زبان روکے ہوے۔ ان گستاخیوں پر انسان کی زبان کھینچ لیجاتی ہے" کوئی بات نہیں ہے مگر جب وقت گذر جاتا ہے تو یہ ہی باتیں یاد آآکر انسان کو بے قرار کرتی ہیں اور دل بےچین ہو جاتا ہے۔

نازک اداؤں کے ہر ہر نکتہ کو دیکھنے والے، معشوقوں کی ہر حس و حرکت کے نگراں خواہ مخواہ بھی ان پیارے پیارے بھولے بھولے معشوقوں کو ادا پرستی کا عادی بنا دیتے ہیں اور اس ذریعہ سے اپنی یاد اُنکے دل میں بٹھا دیتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں

آپ نازک ہیں جو چلیے تو سنبھل کر چلیے | بل نہ کھا جائے کمر دیکھیے گیسو کی طرح

دوسرا شعر ہے،

بل ہے کمر کہ زلفِ مسلسل کے بیچ میں | کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

انھیں باتوں سے دونوں گھائل ہوتے ہیں، ادھر اداؤں کا وار خالی نہیں جاتا ہے اُدھر ادا پرستی کا انداز شاہدوں کو بھی گھائل کیے دیتا ہے۔ کیا ہی بات ہے۔

الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بیقرار | دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

ان ادا پرستیوں کی یاد نے جو بجلی اُن ہوشوں پر گرائی وہ کیا افسوسناک موقع ہے۔ تاشاگاہِ عالم کے خیالات کو اب ایک دوسرے رخ سے دیکھیے۔ اب ان خیالات پر ایک اور نیا پردہ گرتا ہے اک اور دلچسپ سین نظر آتا ہے۔

اب اسی لفظ کے اثر کو دیکھیے "بیوہ"! سننے والے کے دل میں اس پریزاد کا فوٹو اک پُرحسرت فوٹو نظر آئیگا۔ لیکن حُسنِ خداداد میں شاید کوئی کمی نہیں ہوتی۔ تاہم ہمارے خیال میں وہ شوق و ذوق اور ہمارے دل میں وہ کشش جو کسی پریجمال کے تذکرہ سے پیدا ہوتی۔ اس بیوہ کے لفظ سے پیدا نہ ہوئی۔ اس اندازہ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے عجب حیرت معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیا طلسمی کرشمہ ہے کہ ابھی وہ الفاظ جو ہماری رگ رگ کو جنبش دے رہے تھے اب وہ کیوں سرد ہوگئے؟ "بیوہ" اس لفظ نے ایک پریجمال کے تصور کو کس قدر پھیکا کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس پُرحسرت اور اُداس صورت کے ساتھ اور بہت سے دلشکن خیالات بھی پیدا کر دیے۔ اب ایک اور موازنہ کیجیے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

سبز پوشے بلبِ بام نظر می آید ۔۔۔ نہ بزاری نہ بزور و نہ بزر می آید

اس شعر کے مضمون نے جو خیالی پیکر ہماری نظروں کے سامنے پیش کر دیا اور جو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے کس قدر نازآفریں ہے۔ بار بار ہم اس شعر کو پڑھتے ہیں اور اپنی خیالی جولانگاہ میں ایک حسین مہ جبین کے تصور سے دلچسپی اُٹھاتے ہیں یہ اسکا اثر ہے جو ایک شاعر نے الفاظ کو دلچسپ ترکیب دے کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے وہی الفاظ ہیں جو کس زور شور سے اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ حور وش اور پریزادوں کے مختلف فوٹو جو اپنے اپنے موقع پر عجب دلچسپی پیدا کرتے ہیں اور اس سے آئینۂ خیال میں جو عکس پڑتا ہے اور اُسکے اثر سے جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اُسکے محسوس کرنے کے بعد ہمکو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ پری تمثال نوجوان عورتیں جنکی ابھی اُٹھتی جوانی ہے جنکا ابھی شباب کا عالم ہے جو ابھی نوخیز و کمسن ہیں۔

کمسن، اُلڑھ بھولے بھالے ۔۔۔ جو چاہے راہ پر لگا لے

قطع نظر اور بہت سے غم اندوز خیالات کے صرف اس لفظ کا کیا اثر پڑتا ہوگا کہ "وہ اب بیوہ ہے"۔

دلی جذبات کے مختلف پہلو دکھانے کے لیے شعرا کی وہ نظمیں قابل توجہ ہیں جو بعض بعض موقع پر وہ اثر پیدا کر دیتی ہیں اور وہ سماں بندھ جاتا ہے جس سے تھوڑی دیر کے لیے اچھا خاصہ آدمی بدحواس ہو جائے۔ ایک شوخ مزاج شاعر کہتا ہے۔

ناک میں نیم کا فقط تنکا — شوخی بالا کی مقتضا سن کا
برگ گل سی کمر لچکتی ہوئی — چوٹی ایڑی تک لٹکتی ہوئی

ایک اور صاحب فرماتے ہیں۔

مہ جبیں سرو قد سراپا ناز — خوش قد و خوش ادا و خوش آواز
دونوں رخسار ایسے تابندہ — جس سے ہوں مہر و ماہ شرمندہ
صورت برگ گل وہ لب نازک — عضو جتنے تھے سب کے سب نازک
رس بھری آنکھ مست متوالی — خون کرتی تھی پان کی لالی

یہ کونسی برقی قوت ہے کہ رگ رگ میں خون جوش مارنے لگا۔ دل ہے کہ ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے طبیعت ہے کہ بےچین ہوئی جاتی ہے۔ خیالات میں ہلچل پڑ گئی۔ تصور ہے کہ عرش پر پہونچ گیا۔ چند معمولی لفظوں نے ستم ڈھا دیا۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامنے لگا۔ کوئی تسکین قلب کے لیے پانی مانگنے لگا۔ مگر ستم تو یہ ہے کہ جب انھیں دلربا گلرخوں کو اس ناگوار لفظ سے یاد کرتے ہیں تو وہی پیاری صورت پرحسرت و یاس نظر آتی ہے الفاظ کا اثر جذبات پر کیا قیامت کا پڑتا ہے کہ وہی صورت وہی شکل ہے، مگر کیا چیز ہے کہ جاتی رہی؟ کونسی نعمت ہے کہ چھن گئی؟ اب نہ وہ عشوہ گری اور نہ وہ کرشمہ و انداز ہیں۔ اب نہ وہ جگر دوز نگاہیں اور نہ وہ چشم فسوں ساز ہے۔ درد دل اسکا ہمدم اور غم و الم سے راز و نیاز ہے۔

درد دل درد آشنا جانے — اور بیدرد کوئی کیا جانے

اب انھیں نازنینوں کا مقابلہ اُس نازنین گلرخ سے کرنا چاہیے جو انھیں صفاتِ معشوقانہ سے ممتاز ہو، مگر زمانہ کے بیدرد ہاتھوں سے وہ بیوہ ہوگئی ہے تو وہ اُمنگ دلوں میں باقی نہیں رہتی ہے۔ اک سرد مہری سے کسی وقت افسوس تو ضرور کر لیتے ہیں کہ ابھی اُٹھتی جوانی اور شباب کا عالم تھا۔ ان جذبات کا مقابلہ اشعار ذیل سے ہو سکتا ہے۔

دیکھتا کیا ہوں کھڑی ہے بام پر اک مہ لقا
ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہے چہرہ ہے اُترا ہوا

کرتی تھی اپنے رنڈاپے کا یہ گردوں سے گلا — ہائے یارب وہ زمانہ اب مرا کیا ہوگیا
کیا ہوئی پھولوں کی وہ سیج اور وہ کمرہ بسا — بھینی بھینی انکی خوشبو ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا

یا الٰہی کیا ہوئے وہ دن وہ راتیں کیا ہوئیں
ولولے وہ کیا ہوئے وہ میٹھی باتیں کیا ہوئیں

اب اہل مذاق اپنے جذبات کا خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ اُنکے دلوں پر ان اشعار سے کیا کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ خیالی تصویریں دل شکن تو ضرور ہیں مگر کچھ خوش کُن نہیں ہیں۔ کوئی دلچسپ سماں ان مضامین نے پیدا نہیں کیا۔

ہم نے اپنے ناظرین کو وہ مایوس صورت دکھلاکے اُسکی حسرت نصیبی کا قصہ بھی سنوا دیا۔ اب اسکی چشم فتاں سے وہ تیر نہیں نکلتے ہیں جو جگر کے پار ہوں بلکہ چشم خوں بار سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ آہ۔ اب تو دل پُر درد سے جگر کے لختے نکل رہے ہیں۔ یہ تو سینۂ سوزاں سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　　جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

وہ دُرِ ابلق نہیں ہے جو کسی گلعذار کی چشمِ سرمہ سا سے رخِ تاباں پر ڈھلک آئے۔

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود　　　مگر از اشکِ چشمِ سرمہ آلود

اب وہ نرگسیں آنکھیں حسرت و عبرت کا نمونہ ہیں۔ آہ۔ اب وہ اپنی چشم فسوں ساز کے کرشمے کس کو دکھائے اور وہ نگاہِ غلط انداز کے تیروں کا نشانہ کس کو بنائے۔ جس طرف آنکھ اُٹھاتی ہے حسرت ہی حسرت نظر آتی ہے۔ اُسکے نازوانداز کا قدرداں اُٹھ گیا۔ اب کون ہے جو کہے گا۔

ہے دہن پر غنچہ صدقے برگِ گل لب پر نثار　　　سرمگیں آنکھوں پہ نرگس جان سے قربان ہے

اب وہ لبِ لعل گوں مسی مالیدہ نہیں نظر آتے۔

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے　　　تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

وہ وقت گیا، وہ زمانہ نہیں رہا۔ حسن و عشق کے چرچے کچھ عالمِ بہار ہی میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اب اس ماتم کدہ میں ایک بیوہ اُداس صورت پر نظر پڑتی ہے۔ چشم تر، خشک لب، حیران پریشان عجیب عالم یاس ہے۔

چشم پُر آب ہے اور سینہ جگر جلتا ہے　　　کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

غرضکہ اب وہ دونوں فوٹو آپ کے سامنے ہیں، تصویر کے دونوں رخوں پر آپ کی نظر پڑ رہی ہے اب اُس شعر کو ہم ایک مرتبہ پھر پڑھتے ہیں:

سبزپوشتے لب بام نظر می آید   نہ بزاری نہ بزور و نہ بہ زر می آید

آپ کے خیال نے اس دلفریب صورت کا جسکو قوت تخیلہ نے خود ہی آراستہ کیا ہے کسقدر دلچسپی سے استقبال کیا ہوگا اور یہ دلربا صورت کن کن اداؤں سے آپ کی خیالی جولاں گاہ میں پھر رہی ہوگی۔ دوسری مرتبہ پھر یہ شعر پیش نظر کیے دیتے ہیں

دیکھتا کیا ہوں کھڑی ہے بام پر اک مہ لقا   ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہے چہرہ ہے اُترا ہوا

ظاہر ہے کہ سبزپوش سے مہ لقا کا لفظ و مصداق بدرجہا بہتر اور بڑھا ہوا ہے مگر وہ کون شے ہے جسکی وجہ سے آپ کی خیالی جولاں گاہ میں اُس دلچسپی کے ساتھ اس مہ لقا کا استقبال نہیں ہوتا۔ وہ مہ لقا اک شوخ و شنگ معشوق کی دلکشی نہ پیدا کرسکی دلی جذبات نہایت سردمہری سے اُبھرے۔ آہ۔ وہ بیوہ کا خطاب تھا جو زمانہ کی پرزور قوت نے عطا کیا تھا۔ جس نے اُسکے حُسن دل افروز کی مٹی خراب کردی۔ اب ہماری خیالی نظروں کے سامنے یہ پُرحسرت و یاس تصویر گو ہمدردی کے قابل ہو مگر دلچسپی کے لائق نہیں رہی۔ غرضکہ یہی وہ جذبات ہیں جو اک حسین مہ جبین عورت کو بتا دیتے ہیں کہ دنیا میں بیوہ عورت ہر حیثیت سے لوگوں کے خیالوں میں ذلیل ہو جاتی ہے۔ جسکو ہمارے دوست مولوی حبیب اللہ صاحب حبیب نے نہایت پُرسوز و گداز پیرایہ میں شاعرانہ رنگ اور تغزل کی شان دکھلا کے عجب پُرتاثیر نظم لکھی ہے۔ مگر افسوس اب ہم ایسے وقت میں ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جب اُس نوجوان صاحب کمال نے دفعتًا اس دنیا کو خیرباد کہدیا۔ اور ہمیشہ کے لیے سرزمین حیدرآباد دکن کو اپنا خواب گاہ بنا دیا۔ اب اُس شہر خموشاں میں آرام کر رہا ہے جہاں دنیا کا آخری فیصلہ ہے کل نفس ذائقۃ الموت۔ مولوی حبیب اللہ صاحب حبیب لکھنوی مولانا قطب الدین شہید سہالوی کی اولاد میں ہیں جو علمائے فرنگی محل کے مورث اعلیٰ ہیں اُنکے نامور بیٹے ملا سعید کے سلسلہ میں آٹھویں پشت ہے اس نظم کو میں نے اُنکی حیات میں خود مصنف کی زبانی سنا تھا ظاہر ہے کہ تصنیف رہ مصنف نکو کند بیاں" جس ولولے اور شوق سے اور سوز و گداز کے لہجہ میں مرحوم نے سنایا تھا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ رسم عقد بیوگاں کے منکرین سے کس قدر نفرت مرحوم کو تھی۔ مگر افسوس مرحوم کے انتقال سے خود مرحوم ہی کے گھر میں وہی معاملہ پیش آیا۔ اب مرحوم کا ایک خوردسال صاحبزادہ ہے جو علیگڈھ کالج میں پڑھ رہا ہے غالبًا انٹرنس پاس ہوگیا۔ خدا عمر دراز کرے آمین ثم آمین۔ جو اس مسافرت اور تنہائی میں مرحوم

کے ہمراہِ رکاب تھا اور انتقال کے وقت وہی تنہا تیماردار تھا۔

اس نظم کی نسبت میں بھی اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر اُنکی حیات میں مجھے موقع نہ ملا۔ مرحوم کے لائق بھائی مولوی نجیب اللہ صاحب نجیب لکھنوی نے پھر ایک مرتبہ اُس نظم کی زیارت کرائی اور دیکھنے کا مجھے موقع دیا۔ مرحوم نے اس نظم کو ایک مرتبہ لکھ کے پھر کبھی اُسپر نظرثانی نہیں کی تھی بعض بعض شعروں پر نشانات تھے جو شاید کسی وقت اور موقع پر درست کیے جاتے۔ مولوی نجیب اللہ صاحب خود بھی شاعر ہیں اور نہایت قابل ہیں مولانا نے میرے اصرار پر اُس نظم کو نہایت توجہ سے درست کر دیا جو اب ان دونوں باکمالوں کی طباعی کا مجموعہ ہے۔

اس نظم کی خصوصیات سے یہ ہے کہ شاعر نے صرف جذبات کا نقشہ دکھایا ہے دنیاوی معاملات کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ کیونکہ امراء کے لیے جوابات مخالفینِ عقد وہی دیا کرتے ہیں کہ باپ ماں بھائی اور دوسرے ہمدردان قوم اُسکی کفالت کرتے ہیں اور خصوصاً امرا کے یہاں اسکا ذکر ہی کیا ہے۔ دنیاوی مصیبت اور مشکلات ایسی بیوہ عورتوں کو کیوں ہونے لگی جو صاحب دولت و ثروت ہیں۔ ان معاملات کی طرف شاعرِ خوش فکر نے توجہ نہ کی بلکہ وہ لاجواب بات کی طرف متوجہ ہوا جسپر کوئی زبان نہیں کھول سکتا ہے۔ اور یہ ہی سب سے زیادہ کٹھن مصیبت ہے جسکا کوئی علاج نہیں اور یہ ہی بات داد طلب ہے جس میں مصنف منفرد ہے اور بہت زور کے ساتھ مخالفین کو ساکت کر رہا ہے۔

زخم جگر۔ درد دل

یعنی

نالۂ بیوہ

من تصنیف مولوی حبیب اللہ صاحب لکھنوی فرنگی محلی وکیل حیدرآباد دکن اللّٰھم غفر

چودھویں تھی رات کل اور چاندنی کا تھا سماں　　تختِ شاہی پر شہ مہتاب تھا جلوہ کناں
ٹھنڈی ٹھنڈی تھی ہوا سڑکوں پہ جو فرحت رساں　　سیر کرنے کے لیے میں بھی گیا تھا ناگہاں
دیکھتا کیا ہوں کھڑی ہے بام پر اک مہ لقا

ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہے چہرہ ہے اُترا ہُوا

۳۲ کرتی تھی اپنے رنڈاپے کا یہ گردوں سے گلا ہائے یارب وہ زمانہ اب مرا کیا ہو گیا
کیا ہوئی پھولوں کی وہ سیج اور وہ کمرہ بسا بھینی بھینی اُسکی خوشبو ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا

یا آلٰہی کیا ہوے وہ دن وہ راتیں کیا ہوئیں
ولولے وہ کیا ہوے وہ میٹھی باتیں کیا ہوئیں

۳۳ کیا ہوا وہ میرا جوبن کیا ہوا میرا نکھار کیا ہوئی وہ میری رنگت کیا ہوئی میری بہار
کیا ہوا وہ آئینہ اور کیا ہوا میرا سنگھار کیا ہوا وہ دیکھنا بن ٹھن کے میرا بار بار

ہائے یارب کیا وہ صورت کیا وہ سیرت ہوگئی
دو ہی دن میں کیسی میری غیر حالت ہوگئی

۳۴ اے فلک اب ہوگئی کیا وہ مری زلفِ دوتا کیا ہوا اب وہ چمکتا چاند سا چہرہ مرا
کیا ہوے رخسار گلگوں اور لب معجز نما کیا ہوئی شیریں دہانی وہ مری اب یا خدا

کیا ہوا میرا سخن وہ تھا جو اکسیرِ ممات
کیا ہوا چاہِ ذقن کا میری وہ آبِ حیات

۳۵ وہ نشیلی آنکھیں اور پیکانِ مژگانِ دلفگار خنجر ابرو مرے وہ تھے جو مثلِ ذوالفقار
وہ مری ترچھی نگہ اور سُرمۂ دنبالہ دار وہ مری بانکی ادا جس پہ کہ گھر بھر تھا نثار

وہ مرا اندازِ غمزہ بانیِ جَور و جفا
وہ مرا پیکانِ عشوہ ہمسرِ تیرِ قضا

۳۶ کیا ہوا وہ روپ میرا کیا ہوئی میری صفا کیا ہوا وہ رنگ میرا تھا جو کُندن سے کھرا
یا آلٰہی وہ مرا دستِ حنائی کیا ہوا پنجۂ خورشید سے خوبی میں جو کچھ کم نہ تھا

ہائے یارب کیسی گلشن میں چلی بادِ خزاں
پھول کیسا کوئی پتّہ بھی نہیں باقی جہاں

۳۷ کیا ہوا وہ ناز و غمزہ کیا ہوا وہ میرا رنگ کیا ہوئیں وہ شوخیاں اور کیا ہوئی دل کی اُمنگ
کیا ہوا جوشِ جوانی کیا ہوئی میری ترنگ کیا ہوے وہ عیش کے سامان وہ رحمت کے ڈھنگ

کیا ہوئی اب وہ ادا چوٹی کی بل کھائی ہوئی
کیا ہوئی اب وہ مری رفتار اٹھلائی ہوئی

۹
کیا ہوئی وہ جامہ زیبی جسپہ مجھکو ناز تھا — وہ دوپٹہ تھا گلابی جسپہ رنگ گل فدا
اگرئی ہوتا کبھی اور گاہ ہوتا لہریا — چمپئی ہوتا کبھی اور گاہ دھانی رنگ کا
یا الٰہی تار تار اب تو مری پوشاک ہے
دامنوں کی دھجیاں ہیں اور گریباں چاک ہے

۱۰
کیا ہوے وہ میرے کنگن کیا ہوے جوشن مرے — کیا ہوے وہ اگلے بازو کے وہ میرے نونگے
کیا ہوی وہ میری چھاگل کیا ہوے توڑے چھڑے — کیا ہوئی پازیب میری کیا ہوے میرے کڑے
ہاے یارب کیوں مری بجلی پہ بجلی گرپڑی
کھو گئی میرے گلے کی ہاے کیونکر پھلجڑی

۱۱
کیا ہوئیں وہ بالیاں جنکے کہ حلقے دام تھے — کیا ہوے میرے کرن پھول اور وہ مالے مرے
کیا ہوا جگنو مرا وہ جس کو سورج دیکھ کے — جھلملا جاتا تھا ان آنکھوں کے اکثر سامنے
کیا ہوا وہ چاند سورج کیا ہوا ٹیکا مرا
یا الٰہی کون جھپکا میرے سر سے لے گیا

۱۲
ہیں کہاں ہجولیاں وہ مہ جبین و سیمتن — وہ ادائیں انکی بانکی اور وہ ان کی پھبن
وہ نزاکت انکی اور وہ پھول سا انکا بدن — کھلکھلانا انکا وہ پھولا پھلا میرا چمن
یا الٰہی کس لیے سونا مرا کاشانہ ہے
آج یہ عشرت کدہ کیوں ہو گیا ویرانہ ہے

۱۳
ہائے وہ برسات کی رت اور وہ ٹھنڈی ہوا — ننھی ننھی بوندیاں اور کالی کالی وہ گھٹا
وہ گرجنا رعد کا اور وہ برسنا ابر کا — دے رہا تھا وہ چمکنا برق کا کیا کیا مزا
ہاے یارب جو موافق تھیں ہوائیں کیا ہوئیں
وہ مزے وہ لطف وہ اودی گھٹائیں کیا ہوئیں

۱۴
وہ اندھیری رات اور وہ اس میں بجلی کی چمک — وہ برسنا مینہ جھما جھم اور وہ بادل کی کڑک

وہ مرا ڈرنا لرزنا اور وہ میری جھجک   وہ مرے ارمان وحسرت وہ مرے دل کی کھٹک
اس مری اُٹھتی جوانی پر قیامت آگئی
پھول بھی کھلنے نہ پائے تھے کہ آفت آگئی

۱۴ ہائے یارب کیا ہوا بن ٹھن کے جانا باغ میں   وہ جھڑی ساون کی اور اُسمیں نہانا باغ میں
جھولنا سکھیوں کا اور گانا سجانا باغ میں   ہائے ہنسنا میرا اور سب کو ہنسانا باغ میں
یا الٰہی عیش و عشرت کے وہ ساماں کیا ہوے
وہ طبیعت کیا ہوئی وہ دل کے ارماں کیا ہوے

۱۵ دو ہی دن میں خاک سب وہ بزم عشرت ہوگئی   حسن سارا اُڑ گیا اور پھیکی صورت ہوگئی
بیٹھے بیٹھے اپنی تنہائی میں وحشت ہوگئی   زیست سے بیزار آخر کو طبیعت ہوگئی
ایک کے مرنے سے سب آرام اپنا کھوگیا
سارا عالم میری آنکھوں میں اندھیرا ہوگیا

۱۶ ساتھ ہی اُس مرنے والے کے مری آتی اجل   اس مرے تن کے قفس سے مرغ جاں جاتا نکل
کس لیے درد و الم کا دل میں رہتا پھر عمل   جاکے میں بھی زیر تربت اُسکے ہوتی ہم بغل
عمر کیوں پھر اس مصیبت میں گزرتی حیف ہے
جان کیوں آفت میں پھر اسطرح پھنستی حیف ہے

۱۷ نالۂ وشیون نہ ہوتا کیوں لبوں پر باربار   ناوکِ فرقت نہ ہوتا دل کے میرے آرپار
کس لیے مقتول تیغ ہجر ہوتی میں نزار   خنجرِ درد و الم کرتا نہ سینے کو فگار
ساتھ ہی اُسکے اگر میرا بھی ہو جاتا سفر
یوں تڑپتی دردِ فرقت سے نہ میں خستہ جگر

۱۸ لطف ایسی زندگی میں کچھ نہیں میرے خدا   کھانے پینے میں بھی اب ملتا نہیں مجھکو مزا
ہائے اب سب ذوقِ نعمت شوقِ لذت اُٹھ گیا   کچھ نہیں ارمان میرے دل میں اب باقی رہا
خونِ دل پیتی ہوں اور لختِ جگر کھاتی ہوں میں
کسلیے دنیا سے یارب اُٹھ نہیں جاتی ہوں میں

۱۹
کیا مزا اُس زندگی میں لے مرے پروردگار پاس میرے بیٹھنے میں بھی ہے جب لوگوں کو عار
کوئی کہتا ہے مجھے منحوس منہ پر بار بار ہے کسی کے لب پہ کمبخت اور لفظیں ناگوار

ایسے جینے سے ہے اس عالم میں کیا حاصل مجھے
اس رنڈاپے نے کیا مردوں میں جب شامل مجھے

۲۰
کیا کہوں کس طرح بولوں کچھ کہا جاتا نہیں چپ بھی رہتی ہوں تو کمبخت اب رہا جاتا نہیں
روز کا درد و الم مجھسے سہا جاتا نہیں ضعف ایسا ہے کہ بستر سے اُٹھا جاتا نہیں

کب تلک میں نیم بسمل تڑپوں گی پروردگار
کب تلک بےچین قالب میں رہیگی جان زار

۲۱
ہائے یارب ناتواں پر یہ ستم اب کب تلک دردِ دل اب کب تلک یہ رنج و غم اب کب تلک
حسرت و ارمان و حرمان و الم اب کب تلک یہ مصیبت کب تلک یہ چشمِ نم اب کب تلک

طاقت اب باقی نہیں صدمے کہاں تک میں سہوں
سب سے بہتر ہے کہ اب تربت میں جاکر سو رہوں

۲۲
دفعتاً سب ٹلگئی وہ نوجوانی ہائے ہائے عیش و عشرت کی نہ پائی کچھ نشانی ہائے ہائے
کوئی اب سنتا نہیں میری کہانی ہائے ہائے کہہ نہیں سکتی ہوں یہ دردِ نہانی ہائے ہائے

دل کا ارماں دل میں اپنے رہ گیا افسوس ہے
ہو کے خوں آنکھوں سے وہ سب بہ گیا افسوس ہے

۲۳
اب بجز مرنے کے کوئی اور صورت ہی نہیں اقربا سے مجکو امید رفاقت ہی نہیں
ہو علاجِ دردِ فرقت ایسی قسمت ہی نہیں رسم کی پابندی سے امّیدِ صحت ہی نہیں

ہے یہی لیل و نہار اک دن تو کچھ کھا جائینگے
بعد مرنے کے تو زیرِ قبر راحت پائینگے

۲۴
اے اجل اب تو کرم کر میرے حالِ زار پر بڑھ گیا ہے حد سے زائد یہ مرا دردِ جگر
رات دن بیتاب ہوں مضطر ہے یہ دل اسقدر ہو گئی بجلی کی خاصیت کہ پارہ کا اثر

روح تو بےچین ہے تن سے نکلنے کے لیے

کیوں رہی میں زندہ یارب ہاتھ ملنے کے لیے

۲۵ پہلے تو رہتی تھی دل میں تھوڑی سی کھٹک — اب تو رگ رگ میں ہے میرے چٹکیاں لیتی کسک
اُٹھتی ہے رہ رہ کے سینے میں قیامت کی چمک — ایک ساعت بھی نہیں میری جھپکتی ہے پلک
نیند میری دردِ فرقت نے اُڑا دی حیف ہے
زندگی میں یوں مری ہستی مٹا دی حیف ہے

۲۶ دن کو راحت ہے نہ مجکو رات کو آرام ہے — ہر گھڑی ہر لحظہ دل میں کاوشِ آلام ہے
جینے کو جیتی ہوں میں پر زندگی کا نام ہے — رات دن ہے لب پہ نالہ آہ اپنا کام ہے
جس طرح میری گذرتی عمر ہے صبح و مسا
اس طرح دشمن کی بھی گذرے نہ یارب بمزا

۲۷ اب نہیں باقی ہے مجھ میں طاقتِ صبر و قرار — ہوں بہت میں ناتواں اُٹھتا نہیں فرقت کا بار
میں ترے قربان اب مجکو اُٹھا پروردگار — گھر سے بہتر ہے مرا شہر خموشاں میں مزار
جائے آرام اپنی اب میں نے وہی ٹھیرائی ہے
جان دے دونگی یہی بس جی میں میرے آئی ہے

۲۸ بین یوں کرتی ہوئی آخر وہ بیوہ نیم جاں — ہو گئی فوراً مری نظروں سے غائب ناگہاں
آج تک ہے دل میں میرے صدمۂ دردِ نہاں — یاد آتی ہے مجھے رہ رہ کے وہ آہ و فغاں
کس طرح یہ ظلم بیوہ پر روا ہے بھائیو
کچھ ذرا سا دل میں بھی خوفِ خدا ہے بھائیو

۲۹ صاف ہے قرآں میں یہ اور وید میں لکھا ہوا — کردو ثانی عقد بیوہ کا کہ راضی ہو خدا
اب بھلا کیا شبہہ تم کو عقدِ ثانی میں رہا — مان لو کہنا مرا للہ بھائیو تم برملا
ختم کر اب اے حبیب اپنا کلام دلنشیں
آفریں ہے تیرے جوشِ طبع پر صد آفریں

تمت بالخیر

الفاظ السنہ

میرا اپنا مذہب یہ ہے کہ دنیا کی کل زبانوں میں ایک قسم کی شمولیت بالذات پائی جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سب انسانوں کی ایک ہی زبان ہے یا مختلف اوقات میں مختلف زبانوں میں اس قدر اتصال اور الحاق ہو تا گیا ہے کہ اُن میں ایک قسم کا جزئی اشتراک پیدا ہو گیا۔ اگر ہم مختلف زبانوں کے الفاظ پر تنقیدی نظر ڈالیں تو ہمیں رفتہ رفتہ پتہ لگ جائے گا کہ بعض زبانوں کے الفاظ میں ایک ایسی نسبت موجود ہے جس سے وہ تھوڑے سے تغیر کی وجہ سے ایک دوسری زبان کے لفظ شمار ہوتے ہیں ورنہ دونوں لفظ ایک ہی تھے اور اُنکی اصل بھی ایک ہی تھی۔

اگرچہ اسوقت بعض ممالک کے اندر جیسے ہندوستان مین مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اگر اُنکے بعض الفاظ کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہو سکتا ہے کہ اُن زبانوں میں ایک حد تک شارکت اور مجانست پائی جاتی ہے۔ البتہ یہ قرار دینا باقی رہ جائے گا کہ جن ایسی السنہ میں الفاظ اس قسم کی یکسانیت رکھتے ہیں اُن میں سے کون سی زبان اصل ہے اور کون سی کسی دوسری زبان کا عکس ہے اور آیا وہ زبان کلیتہً اسکا عکس ہے یا اُسکے چند ہی الفاظ ایسی شکل اور ایسی شباہت رکھتے ہیں۔

ہم مثال کے طور پر چند الفاظ کا مقابلہ کر کے دکھاتے ہیں کہ ان میں کہاں تک مشابہت اور شارکت ہے۔ سب سے اول ہم پنجابی اور اُردو کے الفاظ کی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس مقابلہ سے معلوم ہو سکے گا کہ مختلف زبانوں کے الفاظ میں کہاں تک شباہت اور شارکت پائی جا سکتی ہے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہو سکے گا کہ ایسی اشکال ارتقائی سلسلہ میں متشکل ہو سکتی ہیں یا انحطاطی سلسلہ میں جس طرح عمل ارتقا سے بعض اشکال میں فرق آ جاتا ہے یا انحطاطی وجوہ کے تحت صورتیں اور تلفظ بدل جاتے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ اسکے اسباب کیا کچھ خیال میں لائے جا سکتے ہیں۔ ایسے اسباب کی کہانی بھی ہم بعد میں سنائیں گے بالفعل ایسی چند مثالیں ہی پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جن جن الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے یا جنکی شکلیں نہیں بدلی ہیں یا جن کے حروف اور حرکات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے وہ بھی ان مثالوں میں لیے جاتے ہیں تاکہ یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ان دو زبانوں

میں کہاں تک یکسانیت اور اشتراک پایا جاتا ہے۔ (دانشلہ)

اُردو	پنجابی	کیفیت	اُردو	پنجابی	کیفیت
آپ	آپ	دونوں زبانوں میں ایک ہی لفظ ہی	انگوٹھا	انگوٹھا	بدستور
اپنا	اپنا	ایک ہی صورت ہے۔	کہا	کہیا	یے زیادہ کردی گئی۔
ہاتھ	ہاتھ	"	سونپنا	سونپنا	بدستور
بہت	بہت	" "	جانتا	جاندا	ت سے دال بدلا گیا۔
بدلا	بدلا	" "	اکٹھا	اکٹھا	بدستور
کام	کم	الف گرادیا گیا	کھیل	کھیل	"
نام	نان	میم کے بجائے نون رکھا گیا۔	بٹھیو	بہیو	ٹ اُڑادی گئی۔
دو	دوے	واو کے بجائے "ے" لگادی گئی	ہنستا	ہسنا	ایک نون اُڑادیا گیا
مجکو	میکو	ملتانی ہے۔	مانتا	منا	الف اُڑادیا گیا
میں	میں	بدستور	تجھ	تیتھوں	مختلف
میرا	میرا	"	کون	کون	بدستور
تیرا	تیرا	"	بھوی	بھوں	م۔ی اُڑاکرن رکھدیا
تب	تد	بجائے ب کے "د" رکھا گیا۔	جو	جون	"ن" زیادہ کردیا گیا
تو	تو	بدستور	اوپر	اپر	واو اُڑادی گئی
جنجال	جنجال	"	دھواں	تھواں	"د" سے "تا" بدلی گئی
بیچ	وچ	ب سے واو بدلی گئی	سوگند	سوں	"گ" اور دال اُڑادیا گیا
بند	بند	بدستور	سمان	سمان	بدستور
بولو	بول	واو ترک کردیا گیا۔	ہوا	وا	"ہ" اُڑادی گئی۔
بیج	بی	میم دُور کردی	آگ	اگ	ہمزہ اُڑادیا گیا
مُرڈ	مُرڈ	بدستور	پانی	پانی	بدستور
اُنگلی	انگلی	"	مٹی	مٹی	"

		کیفیت	اُردو	پنجابی	کیفیت
		بدستور	لاج	لج	الف اُڑا دیا گیا
	کل	الف اُڑا دیا گیا	کچھ	کجھ	چ کے بدلے ج رکھا گیا
ہ	ہت	"	بوجھ	بجھ	واؤ اُڑا دی گئی
منہ	منہ	بدستور	روگ	روگ	بدستور
جان	جند	الف ہٹا کر آخر پہ 'د' رکھ دیا گیا	ٹھنڈ	ٹھنڈ	"
سوچ	سوچ	بدستور	بھوک	بھک	واؤ اُڑا دی گئی
پیچھے	پچھے	درمیانی 'ی' اُڑا دی گئی	ٹپ ٹپ	بک بک	بدستور
آگے	اگے	ہمزہ الف اُڑا کر 'گ' کو مشدد کر دیا گیا	سکہ	سکہ	"
پاس	پاس	بدستور	لکھا	لکھیا	یے زیادہ کر دی گئی
			پڑھا	پڑھیا	بشرح صدر

یہ چند الفاظ نمونے کے طور پر لکھے گئے ہیں قارئین کرام ان سے خیال کر سکتے ہیں کہ کبھی 'ب' سے واؤ بدلا جاتا ہے اور کبھی کوئی حرف اُڑا دیا جاتا ہے اور کبھی کوئی زیادہ کیا جاتا ہے کبھی کسی کو مشدد بنایا جاتا ہے ورنہ الفاظ وہی ہیں جو اُردو میں بولے جاتے ہیں مثلاً 'جب' کو پنجابی میں 'جد' بولا جاتا ہے اور 'تب' کو 'تد'۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ایک ہی زبان کے یہ الفاظ ہیں تلفظ کی وجہ سے ان میں کچھ کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور ساتھ اسکے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اُردو دراصل بھاشا یا پنجابی کی ایک اصلاح یافتہ صورت ہے۔ یا وہ بھاشا اور وہ پنجابی ہے جس میں کچھ کچھ فارسی عربی اور انگریزی الفاظ کا خلط ملط ہو چکا ہے۔ پنجابی بھی دراصل بھاشا ہی تھی بعض تصرفات کی وجہ سے بھاشا ایک جدید صورت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ اُسکے اکثر الفاظ بالکل ایک جدید شکل اور جدید تلفظ میں منتقل ہوتے گئے۔ ان اشکال متبدلہ سے پتہ لگ سکتا ہے کہ زبانیں کس طرح بدلتی رہتی ہیں اور کس طرح اُنکے الفاظ میں ارتقا اور انحطاط ہوتا رہتا ہے۔ بولنے والوں کو اُسوقت پتہ لگتا ہے جبکہ بالکل سورتیں اور تلفظ بدل جاتا ہے۔ عام لوگ تو اسپر خیال نہیں کرتے۔ وہ لوگ اس نکتہ تک پہونچ جاتے ہیں جو فلسفۂ زبان جانتے ہیں۔ جس طرح مختلف نسلیں خلط ملط

ہو جاتی ہیں اُسی طرح زبانیں بھی ایک دوسری سے مِل جُل جاتی ہیں۔

الفاظ محولہ بالا کا مقابلہ کر کے دیکھو کہ کس کس طرح اُن میں رفتہ رفتہ ادل بدل اور کمی وبیشی ہوتی گئی ہے اگر آپ مزید غور سے کام لیں گے تو بہت سی زبانوں میں اس قسم کی مثالیں پائی جائیں گی۔ فارسی اور بھاشا اور اُردو و پنجابی میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے الفاظ سے خلط ملط ہو کر ایک جدید تلفظ اختیار کرتے ہیں اور باوجود اسکے کس طرح اُن میں پھر بھی ہم معنیت باقی رہتی ہے۔ اس مقابلۂ الفاظ اور مقابلۂ لسنہ سے نہ صرف السنہ اور الفاظ کی ارتقائی اور انحطاطی صورتوں پر ہی روشنی پڑتی ہے بلکہ اسپر بھی غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ انسانی نسلوں کا آپس میں کیا کچھ واسطہ اور تعلق ہے اور کس طرح ایک نسل دوسری نسل سے شارکت رکھتی ہے اور اُنکی مختلف زبانیں باوجود اختلاف کے بھی کس طرح اُنکو آپس میں ملاتی اور ایک ہی سلسلہ سے ثابت کرتی ہیں۔

اب ہم ان الفاظ کے ساتھ ہی پنجابی اور اُردو زبان کے چند فقرات بھی لکھکر دکھاتے ہیں کہ ان دونوں میں کس قسم کی شارکت ہے اور کہاں تک انمیں ساویت کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(فقرات پنجابی)

میں چاہناہاں کہ توں میرے پاس پرسوں تیک آویں میرے نال گل بات کریں کس طرح ایہ کم پورا ہووے جدتک توں اس وچ کوشش نہیں کریں گا تدتک ایہ گل پوری ہونا اوکھا ہے میں سوچ وچار کے تیہوں لکھاہاں جیسے ایہہ ویلا تھوں نکل گیا پھیر ایہ کم بنا سوکھا نہیں کم اوہو ہوندا ہے جیہڑا ویلے سر کرلیے ویلے دی نماز کویلے دیاں ٹکراں جے توں آونا ہے تے مینوں سدھی نیت نال دس ناں میں تیہوں اُس دن اوڈیکاں ایہ ناں ہووے جے میں تینوں اڈیک اڈیک کے ہاوا ہو کے گھر نوں مرجاواں بھائی میرے شرع وچ شرم کی تینی تالوں شوم بھلا جو ترت دے جواب۔

(فقرات اردو)

اب ہم اُردو میں ان پنجابی فقرات کا ترجمہ کرکے دکھاتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم پرسوں تک میرے پاس آؤ۔ مجھسے بات کرو کہ کس طرح یہ کام پورا ہو جب تک تم اس میں کوشش نہیں کروگے یہ بات پوری ہونا مشکل ہے۔ میں سوچ بچار کے نہیں لکھتا ہوں

ہاں اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا پھر یہ کام بنا آسان نہیں کام وہی ہوتا ہے جو وقت پر کیا جائے وقت کی نماز بے وقت کی ٹکریں۔ اگر تمھیں آنا ہے تو مجھے سیدھی نیت سے بتا دو تاکہ میں اُس دن تمہارا انتظار کروں۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہارا انتظار کر کر کے اور تھک کر گھر کو مڑ جاؤں۔ بھائی میرے شرع میں شرم کیا سخی سے شوم بھلا جو فوراً دے جواب"۔

پنجابی کے فقرات میں دس الفاظ ایسے آئے ہیں جو اسوقت اُردو میں شمار نہیں ہوتے یا متروک ہیں

	پنجابی	اُردو		پنجابی	اُردو
۱-	نال	ساتھ	۲-	گل	بات
۳	اوکھا	مشکل	۴	جے	اگر
۵-	ویلا	وقت	۶-	سوکھا	آسان
۷-	جیہڑا	جو	۸-	اڈیک	انتظار
۹-	ہاوا	تنگ ہو کر تھک کر	۱۰-	ترت	جلدی - فوراً

اس سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ پنجابی اور اُردو میں کیا کچھ نسبت ہے۔ یہی یہ نسبت اس کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ پنجابی بھاشا کی شاخ یا بھاشا کی بگڑی ہوئی یا مشبہ لہ صورت ہے اور اُردو زبان ایک اصلاح یافتہ پنجابی یا مخلوط پنجابی۔ دونوں زبانوں کی عبارت ملا کر پڑھنے سے ناظرین کو معترف ہونا پڑے گا کہ زبان کس طرح ایک نیا روپ اختیار کرتی جاتی ہے اور کس طرح یہ صورت ارتقاء ایک زبان اصلاح پاتی ہے۔ جب ایک زبان کی ثقالت رفتہ رفتہ لطافت سے تبدیل ہو جاتی ہے تو رفتہ رفتہ اُسکو کسی دوسرے نام سے تعبیر کرتے ہیں یا جب اُس میں زیادہ تر حصہ کسی اور زبان کے الفاظ کا داخل ہو جاتا ہے تو اُسکی صورت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اگر پنجابی کے ٹھیٹ الفاظ میں کچھ فقرات لکھکر انکا مقابلہ اُردو کے ٹھیٹ الفاظ سے کیا جائے گا تو دونوں میں ایک مناسبت اور مشارکت پائی جائے گی اور جب پنجابی کے فقرات کا اُس قسم کی بھاشا کے فقرات سے مقابلہ کیا جائے گا تو پتہ لگ سکے گا کہ بھاشا کے الفاظ اور پنجابی کے الفاظ میں کس قدر مناسبت اور مماثلت ہے۔ یہی فلسفۂ زبان ہے جس سے زبانوں کے باہمی تعلقات اور وابستگیوں کا پتہ چلتا ہے کہ وہ

کیونکر تغیر پذیر ہوتی ہیں اور کیونکر اُنکے بعض الفاظ رفتہ رفتہ دوسری زبانوں میں جاملتے ہیں اور کیونکر اُن کا تلفظ بدل جاتا ہے۔

جو طبائع فلسفۂ زبان سے مس رکھتی ہیں اُن کا فرض ہے کہ اس میں مہارت پیدا کریں اور اپنے معلومات کا تنقیدی رنگ میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کس قدر لگنگیاں اور الحاقات ہیں اور اُنکا اثر دنیا کے تمدنی سلسلوں پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اور کہاں تک انسانی جماعتوں کی ضروریات کا اُن سے انضباط ہے۔ فتدبر

سلطان احمد (گوجرانوالا)

وہ شمعِ بزمِ خوبی پھر یاد آرہا ہے
سوزِ تپِ جدائی دل کو جلا رہا ہے

جو دم گذر رہا ہے سمجھو اُسے غنیمت
کوسِ رحیل ہردم ہردم بجا رہا ہے

ٹھنڈی نہ ہو الٰہی شمعِ غمِ محبت
ہم دل جلوں کو اس سے اک لطف آرہا ہے

منصف ہو اپنے دل میں اتنا ہنسایا بھی تھا
اے چرخ جس قدر تو مجھکو رلا رہا ہے

کیونکر نہ خون روؤں آنکھوں سے دیکھتا ہوں
پاؤں میں تیرے دشمن مہندی لگا رہا ہے

بدنام ہو چکا ہوں الفت میں تیری پیارے
جو دیکھتا ہے مجھکو اُنگلی اُٹھا رہا ہے

نقشِ قدم کی صورت خود ہی مٹا ہوا ہوں
اے آسمان مجھکو اب کیا مٹا رہا ہے

ہردم خیالِ جاناں بہلا رہا ہے دل کو
فرقت میں اک یہی تو کچھ کام آرہا ہے

بے چھیڑ چھاڑ تیری لے نیشِ غم غضب کی
ہم لوٹتے ہیں ظالم دل تلملا رہا ہے

دل میں ہمارے ہر دم رہتی ہے یادِ جاناں
آئینہ اُسی کی صورت دکھا رہا ہے

تعریف میں دہن کی گم عقل ہو رہی ہے
وصفِ کمر عدم کا رستہ دکھا رہا ہے

اُس بت کے در پہ کرکے آفاق جبہہ سائی
بختِ سیہ کا اپنے لکھا مٹا رہا ہے

آفاق (بنارسی)

بنگال میں عہد مغلیہ کے دار الضرب

سلطنت مغلیہ کا آفتاب عروج محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر غازی بادشاہ کے عہد میں نصف النہار پر تھا۔ اسکی تخت نشینی کے قبل افغانستان کا ایک بڑا حصہ خاندان صفوی (ایران) کی مدد سے خود مختار ہو چکا تھا لیکن گولکنڈہ اور بیجاپور کی فتح سلطنت کی ایک نمایاں کامیابی تھی جس سے نہ صرف افغانستان کا نعم البدل مل گیا بلکہ دکن کے ایک وسیع رقبہ پر مغلوں کی سطوت و جلالت کا سکہ بھی بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت کی وسیع فتوحات کے علاوہ مابہ الامتیاز شئے وہ اصلاح ہے جو اُس نے ملکی انتظامات میں کی اور جو زیادہ تر اُسکی اپنی دماغی کوشش کا نتیجہ تھی۔

اُسکی اصلاحی اسکیم میں ٹکسال کی اصلاح بھی تھی۔ اسوقت سونے، چاندی، اور تانبے کے سکے، سکے ٹکسالوں میں ڈھالے جاتے تھے۔ اسکے زمانہ میں بنگال میں ذیل کی جگہوں میں ٹکسالیں تھیں

(۱) اکبر نگر۔ جب اکبر نے بنگال فتح کیا تو "راج محل" کو اپنے نام پر اکبر نگر کا نام عطا کیا۔ یہاں کا ٹکسال شاید اکبر ہی نے قائم کیا تھا لیکن عہد اورنگ زیب میں اسکی اہمیت اور بڑھ گئی اور سکوں کے ڈھالنے کا کام وسیع پیمانہ پر ہونا شروع ہوا۔ لیکن شاہ عالم اول کے دور حکومت میں چند وجہوں سے بند کر دیا گیا۔

(۲) اسلام آباد:۔ یہ "چٹاگانگ" کا اسلامی نام تھا۔ عہد اورنگ زیب میں سلطنت مغلیہ میں ملحق ہوا۔ جسکی مختصر تاریخ یہ ہے:۔ شائستہ خاں جو دکن میں سیواجی سے بھی برسر پیکار ہوا تھا، میر جملہ کی وفات کے بعد بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اسنے ایک مہم "ارکان" کے خلاف روانہ کی اور وہاں کے راجہ کو چٹاگانگ کا صوبہ حوالہ کرنے پر مجبور کیا تاکہ وہ پرتگالی اور دوسرے بحری ڈاکوؤں کا انسداد کر سکے جو اس طرف کے ساحلی علاقوں میں ڈاکہ ڈالکر امن عامہ کو ہمیشہ خطرہ میں رکھتے تھے۔ اُسنے اس شہر کا نام "اسلام آباد" رکھا اور شاہ عالم ثانی تک یہاں کا دار الضرب کام کرتا رہا۔

(۳) کٹک :۔ یہ اڑیسہ کا مشہور شہر ہے۔ یہاں کا ٹکسال شاہجہاں کے زمانہ میں کھولا گیا تھا، اور احمد شاہ کے عہد تک تھا،

(۴) جہانگیر نگر:۔ یہ ڈھاکہ کا وہ نام ہے جو اسکو عہد مغلیہ میں ملا۔ یہ اس زمانہ میں بہت مشہور تھا

اور روئی کے کپڑوں کے اعلیٰ و نفیس تیاری کے سبب دور دراز حصوں تک مشہور تھا - یہاں کے ٹکسال کا بانی جہانگیر ہے ، اور سلطنت کے زوال کے ساتھ اسکا بھی زوال شروع ہو گیا -

(۵) گور :- یہ شہر ضلع مالدہ میں واقع ہے اور اُس زمانہ میں بنگال کا ہی دار السلطنت تھا یہاں اکبر کے سکّے مضروب ہوتے تھے ، اور بعد میں یہی ٹکسال جہانگیر کے عہد حکومت میں ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا -

(۶) عظیم آباد یا پٹنہ :- یہاں کا ٹکسال عہد اکبر سے اُسوقت تک موجود تھا جبکہ شاہ عالم ثانی نے بنگال ، بہار ، اُڑیسہ کے حقوقِ دیوانی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو عطا کیے اور اُسنے کلکتہ میں سکّے مضروب کرنا شروع کیے -

(۷) مرشد آباد :- مرشد قلیخاں کو ڈھاکہ چھوڑ کر مرشد آباد آنا پڑا تھا - کہا جاتا ہے کہ مرشد قلی سے اور اورنگ زیب کے پوتے "عظیم الشان" سے جو اُسوقت صوبہ دار تھا کوئی جھگڑا ہو گیا - اور اسی تنازع کا نتیجہ تھا کہ مرشد قلی کا ڈھاکہ آنا ہوا - یہاں اُس نے شہنشاہ دہلی کی منظوری سے ایک دار الضرب قائم کیا - یہ ۱۷۳۵ء کا زمانہ ہے - بعد میں یہ ٹکسال بخیالِ حفاظت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ نگرانی کلکتہ منتقل کر دیا گیا - لیکن اُنپر "مرشد آباد" ہی کندہ ہوتا تھا - اور تمام سکّے شاہ عالم ثانی کے ہوتے تھے -

(۸) عالمگیر نگر :- مسٹر آر - ڈی - بنرجی جو ایک مشہور جرنلسٹ اور سکوں کی تاریخ میں کمال رکھتے ہیں ایک سکہ کا ذکر کرتے ہیں جسمیں "اورنگ زیب" کا نام کندہ ہے اور سکہ پہ زبان "بنگلہ" ہے (یہ ہے مسلمانوں کی بے تعصبی) ہمکو کوئی دوسری مثال تاریخ کے صفحوں میں ایسی نہیں ملتی جسمیں بجز فارسی کے کیرکٹر کے اور کسی زبان میں حروف سکہ کا کندہ ہونا معلوم ہو - مسٹر بنرجی کے بیان کے مطابق وہ سکہ کوچ بہار کے ٹکسال میں ڈھالا گیا ہے کیونکہ اس میں "عالمگیر نگر" تحریر ہے - یہ نام اورنگ زیب نے کوچ بہار کا رکھا تھا - اس سکہ کی تاریخ مختصر الفاظ میں یہ ہے :-

سولھویں صدی میں کوچ بہار کے راجہ "راجہ نرونرجن" نے اپنے سکّے جاری کیے ، یہ سکّے "نرونرجنی سکّے" کہلاتے تھے - اور سونے ، چاندی ، تانبے اور پیتل کے ہوتے تھے وہ سکّے جو دستیاب ہوے ہیں وہ نرونرجن ، اُسکے بیٹے لکشمی نرجن ، اور ایک اور راجہ رگھدیو نرجن کے نام کے ہیں - [illegible] میں جب شاہ شجاع شاہجہاں کی خبر علالت سنکر دہلی کی طرف روانہ ہوا تو کوچ بہار

کے راجہ "پریم نرنجن" نے مغلوں کے سفیر کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ اور اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ اس ریاست کو جو پہلے اسکی ماتحت تھی لیکن اب مغلوں کے زیر اثر ہوگئی تھی سزا دے۔ اس فوج کے ساتھ آسام کا راجہ بھی مل گیا اور اس متحدہ فوج نے حدودِ مغلیہ میں بے امنی پیدا کردی۔

جب دہلی میں تخت نشینی کا جھگڑا اورنگ زیب کے حق میں فیصل ہوگیا تو اُسنے میر جملہ کو کوچ بہار کی طرف روانہ کیا۔ پروفیسر جے۔ ان۔ سرکار اپنی مشہور و معروف "تاریخ اورنگ زیب" میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں :۔ "میر جملہ ایک غیر معروف و متروک راستہ سے کوچ بہار پہونچا۔ رفتار سست تھی، کیونکہ بانسوں کے جنگلوں کو کاٹ کر راستہ صاف کرنا پڑتا تھا۔ چھ دن میں شاہی فوج کوچ کے دار الحکومت میں پہونچی جسکو راجہ اور رعایا نے خالی کر دیا تھا۔ شہر کا نام بدل کر عالمگیر نگر رکھا گیا۔"

۱۶۶۱ء میں میر جملہ کوچ بہار کی طرف روانہ ہوا اور ایک سال وہاں رہکر ۱۶۶۲ء میں ڈھاکہ جو اب صوبہ کا دار السلطنت ہوگیا تھا واپس آگیا۔ میر جملہ کی واپسی پر کوچ بہار کے راجہ نے اپنی منتشر فوج کو جمع کرکے باقی شاہی فوج کو بھی واپسی پر مجبور کیا۔ کوچ بہار صرف ایک سال کے لیے عالمگیر کے قبضہ میں رہا اور اسی زمانہ کا وہ سکہ ہے جو بنگالی زبان میں اورنگ زیب کے نام کا ہے۔

(ماخوذ از انڈین ریویو) سید نجیب اشرف ندوی

(متعلم پٹنہ کالج)

دورِ جام

اے جام تیری ہستی اسرار سے بھری ہے
آمد ہر انجمن میں باشانِ دلبری ہے

ہر ہاتھ تجھکو بڑھ کر کس شوق سے ہے لیتا
ہوش اور حواس اپنے قیمت میں تیری دیتا

مستِ خمار بادہ تیری ہوں جستجو میں
اور داغ تو لگائے زاہد کی آبرو میں

دیتا ہے بوسہ لب کا اک نازنین تجھکو
کس شوق سے ہے لیتی گہ اک حسین تجھکو

ہوتا گذر ہے تیرا شاہوں کی انجمن میں
بدنام گو کہ ہے تو بد فعلی بد چلن میں

شیرین و تلخ ہے سے نسبت مدام تجھکو
عیش نشاط مستی حاصل دوام تجھکو

ہے ظرف تیرا اوچھا گو تو چھلک بھی جاتا
غصہ سے جھاگ اُٹھتے ہیں تو بہک بھی جاتا

اک نازنیں سے بڑا اسی ٹکرا کے چور ہونا
اچھا نہیں ہے سر میں اتنا غرور ہونا

قاضی ثناء احمد خاں کاکوروی

گورِ غریباں کا عبرتناک منظر

یوں تو، حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں، دل و جگر کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دینے والی حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں، نشیلی نشیلی سحرکار آنکھوں کی سحر طرازی، دلگیری اور دلداری کے قصے، روز ازل سے ہوتے چلے آ رہے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے رہیں گے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ دل، جن میں عشق کی، محبت کی آگ بھری ہوئی ہے، اور جنکے انداز فراموشی میں بیتابی کے پہلو نکلتے ہوں، جستجوے محبوب اور تلاش کوئے یار میں در در کی خاک چھانتے ہیں اور پھر بھی اُنکی سعی گرم اُنکو بیتاب رکھتی ہے۔

ایک روز رات کو، اسی وحشت اور پریشانی میں اُٹھا۔ چلا۔ سامنے والی نہر کے کنارے کنارے ہو لیا۔ لہروں کی اضطرابی اور بےچین کر دینے والی تڑپ، اُس نہ ٹھہرنے والے دل کی طرح جو کسی تغافل کیش بت عیار کے ہجر میں فراق کی شکیب فرسا گھڑیاں گزارنے کا عادی ہو گیا ہو، مجھے اپنا گرویدۂ خیال بنائے ہوئے تھیں۔ حالانکہ چاند کی شعاعیں اُنکی گود میں مچل رہی تھیں۔ اور ہر پہلو سے اُنکی ہمدرد ہو کر تسکین دے رہی تھیں۔ لیکن افسوس۔ تسکین کی آرزو اب بھی پوری نہ ہوئی۔ لہریں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بانسوں اُچھل رہی تھیں۔ گویا آسمان کی ستم پردازیوں سے رحم کی ملتجی تھیں۔ مگر ہر طرح بے التفاتی دیکھ کر ناامیدی کی حالت میں پھر سرنگوں ہو جاتی تھیں۔

اسی اثنا میں ایک ابر کے سیاہ ٹکڑے نے مہ نو کی چمکتی ہوئی شعاعوں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور رخ ماہ کی جلوہ پاشیاں، فضائے دنیا کو چمکا دینے والی چاندنی، یکایک تاریکی سے مبدل ہو گئی۔ دل کی وحشت دو چند اور ایک عجیب حالت طاری ہو گئی۔ خدا جانے میں کس عالم میں تھا۔ اور اسی طرح ٹہلتا ہوا ایک نو آباد بستی کی طرف۔ دنیا کے لاتعداد بسنے والے انسانوں کے اصلی مسکن کی طرف نکل گیا۔ ایک عجیب و غریب عبرتناک منظر تھا، چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ سائیں سائیں کی آواز ہر طرف سے بلند تھی۔ اندھیری بلا کی اندھیری تھی۔ درخت بالکل ساکن و خاموش دم بخود کھڑے تھے۔ مگر کبھی کبھی اس دل و جگر کو ہلا دینے والے اس سبق آموز منظر کی تاب نہ لا کر، لرز جاتے تھے، کانپ اُٹھتے تھے۔ طیور، اُس وحدہ لاشریک کے قادر مطلق ہونے کا ہر روز ایک نیا ثبوت پیش کرنے والے طیور اپنے

اپنے آشیانوں میں بیٹھے ہوے، اپنے مالک کو دلوں میں یاد کر رہے تھے۔ شبنم اس حسرتناک منظر پہ آنسو بہا بہا کر اُن خاک آلود ہستیوں پر افسوس ظاہر کر رہی تھی۔ مگر یہ شہر خموشاں کے بسنے والے، اس حسرتناک منظر، اس اضطراب خیز نظارہ کی کشاکش سے آزاد، اطمینان و میٹھی نیند کا مزا لے رہے تھے۔

آہ۔ ان خاموش اور بیچارہ ہستیوں میں وہ نفوس بھی شریک ہیں، جو اس جلوہ گاہ دہر میں رونق دہِ بزمِ تمنا، اور آرایشِ محفلِ سوز و گداز رہے ہیں۔ مگر آج اُنھیں نورانی چہروں کو، حسرت اور بے بسی کی خاک اپنے گرد آلود دامن میں چھپا رہی ہے۔ قبر کا گوشۂ تاریک، انکی بزمِ عیش ہے۔ حسرت نصیبی کا مرثیہ، انکا نغمۂ جاں نواز بن رہا ہے۔

آہ۔ انھیں خاک نشینوں میں، اُن معصوم اور لا پروا ہستیوں کی محافظ، جنھیں قدرت کا آئینہ دار سمجھنا چاہیے۔ ایسی بیکس اور مجبور مائیں بھی ہونگی جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو، آنکھوں کے تاروں کو، اس کمسنی کے عالم میں بلکتا، سسکتا، چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ جنکو وہ اپنی زندگی میں، ایک لمحہ کے لیے بھی تنہا چھوڑنا گوارا نہ کرتی تھیں۔ اُنکی ذرا سی تکلیف سے دل نیر آرے چل جاتے تھے، بیتاب ہو جاتی تھیں، بیقرار ہو جاتی تھیں۔ اور اب اِنھیں پر اُنکی زار و نالی، اضطراب و بےچینی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اور آہ۔ انھیں مردہ ہستیوں میں وہ عاشق جاں باز بھی ہوں گے جنکی دلدوز صدائیں، جنکے رُوح کُش نالے دلوں کو تڑپا دینے والے، قیس و فرہاد کے قصہ کو تازہ کرنے والے تھے۔ آج اس عالمِ خاموش میں، سکون خیز فضا میں ساکت اور مُہر بلب پڑے ہوے ہیں۔ انھیں خیالات کی رَو میں سرگرداں ہو کر، اس عبرتناک مقام کی ایک پگڈنڈی پر جا رہا تھا۔ دائیں قبر تھی، بائیں قبر تھی۔ آگے قبر تھی پیچھے قبر تھی۔ غرض کہیں پختہ، کہیں خام تمام قبریں ہی قبریں تھیں۔ وسطِ قبرستان میں جا کر دیکھا کہ ایک قبر پر ایک شمع روشن ہے۔ کچھ تازہ پھول بھی پڑے ہوے ہیں۔ سرہانے ایک پتھر کھڑا تھا اُسپر پھولوں کا ایک بڑا ہار لپٹا ہوا تھا۔ جو مدفون کے حسرت زدہ ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ قبر پانی سے تر بھی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی گھنٹے گذرے ہونگے کہ اس مٹی کے پتلے کو اسکے عزیز و اقارب زمین کے سپرد کر کے چلے گئے۔ اس وحشتناک منظر پر میں نے حسرت و افسوس کے آنسو بہائے۔ جا کر قبر کے قریب کھڑا ہو گیا، کھڑا ہوا تھا کہ یکایک، ایک آواز، دلوں کو ہلا دینے والی آواز قبر کے گوشہ سے بلند ہوئی۔

جو ادھر سے گذرے تھے صبا تو یہ کہنا اُس سے رو کر
مگر ایک تیر شکستہ پا تیرے باغِ تازہ میں خار تھا

اس دلوں کو ہلا دینے والی آواز سے، اس کلیجوں کو تڑپا دینے والی آواز سے، مجھپر ایک با ہوش فرسا اثر طاری ہوگیا۔ مبہوت تھا، بیخود تھا۔ اور اُس گوشہ نشینِ قبر کی صحیح حالت کا اندازہ میرے امکان سے باہر تھا۔ قبر سے آنے والی آواز کیا تھی، ایک سحرِ بیقرار تھا۔ جس نے دل و جگر کو تڑپا دیا، روح کو گرما دیا۔ اور خیالات کی شورشوں نے قلب کو ہنگامہ زار بنا دیا۔ حیرت کی فسوں کاری نے بیخودانہ تاثرات کی تہ میں لبوں کو خاموش، اور چشمِ نظارہ کش کو مبہوت کر دیا تھا۔ میں متحیر تھا، خاموش تھا، اور اس انتہائے خاموشی کے دلدوز نظارہ سے متاثر ہو ہو کر کہتا تھا کہ اے، زمین کے بسنے والے، اے شہرِ خموشاں کے ساکن، اور ہنگامہ زارِ دنیا کی شورشوں سے بیخبر سونے والے! اے کسی کے ناوکِ ناز کے شکار، اے کسی کی تیغِ ابرو کے گھائل، اے حسرت نصیب نامراد عاشق! تیری آواز نے قلب کو ہلا دیا، جگر کو تڑپا دیا۔ اے شہرِ خموشاں کے رہنے والے، کیا میں تیری زبان سے تیرے درد کا افسانہ سُن سکتا ہوں۔ کچھ تجھے خبر ہے؟ میری حیرانی، میرے سکوت اور میری پریشانی کی وجہ معلوم ہے؟ نہیں تو بیخبر ہے تو اپنی آسایش پناہ گوشۂ عافیت میں راحت کی میٹھی نیند کے مزے لے رہا ہے۔

اے جادہ نوردِ راہِ فنا، بے بقا دنیا کی آلودگیوں سے پاک اور معرا عالم کے رہنے والے سُن۔ وہ دن قریب ہے کہ میں بھی اس دنیا، فنا ہو جانے والی اور محض دھوکہ کی ٹٹی دنیا کو خیرباد کہکر اُس عالمِ جاودانی کو رخصت ہوں اور تجھ سے تیری ہی زبانی تیرے درد کا افسانہ، تیری حسرت نصیبی اور نامرادی کا قصہ سنوں۔

خیالات نے یکبارگی پلٹا کھایا اور میں انھیں خیالات کی رو میں سر بگریباں ہوکر روتا ہوا گھر کو چل دیا۔ فقط

نجم الغنی

از دفتر تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد۔ دکن

کلامِ سفیر

نہیں گو ہم شریکِ بزم دُکھڑا کیوں ہو قسمت کا　　تصور دل میں تیرا ہے مداوائے داغِ حسرت کا
پڑا رہتا ہے آنکھوں پر یہ پردہ اپنی غفلت کا　　وگرنہ رنگِ کثرت سے ہے مرقع عینِ وحدت کا
یہ شیوہ آپ نے سیکھا ہے خوب الہامِ فطرت کا　　کسی اُستادِ کامل نے سکھایا ہے بھری گت کا
خلیق، اعجاز و صادق، ہوش، اور انجم کی فکرت کا　　حجاب و قطب و زیبا اور دلا، توفیق و شہرت کا

سفیر

نظرے خوش گذرے

اگست کے آخری ہفتہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ خاص کی شرکت کے لیے مجھے بمبئی چلا آنا پڑا۔ روانگی سے قبل پرچہ مرتب کرکے کتابت کے لیے دیدیا تھا، صرف رموز بیخودی کا ریویو اور اس عنوان کے تحت متفرق نوٹ لکھانے تھے۔ مگر بمبئی میں دفعتاً سخت بخار آگیا۔ جسکی وجہ سے اتنا ضعف ہے کہ یہ چند سطور بھی لیٹ کر لکھ سکا ہوں۔ امید ہے کہ ہفتہ عشرہ میں بالکل تندرست ہوجاؤں گا۔ مگر اس پرچے کو زیادہ دنوں کے لیے روکنا نہیں چاہتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگلے نمبر میں اسکی تلافی کردی جائیگی۔

چاہیے - یہ ایک سخت اور وحشیانہ قانون ہے - لیکن ہم جس زمانے کا حال لکھ رہے ہیں اُس سے بہت بعد کے زمانے میں دنیا نے ایسے ہی بُرے اصول کی سمتھ فیلڈ اور آکسفورڈ کے لکڑی کے ڈھیروں پر اپنی آنکھوں سے تعمیل ہوتے دیکھی ہے - قصداً مذہبی نزاع برپا کرنا اور عمداً کسی مسلم مذہب کو بُرا کہنا عیسائیوں کا کام تو ہے نہیں - اپنی خوشی سے ایسے قانون کی خلاف ورزی کرنا جس میں سزائے موت ہے شہادت نہیں بلکہ خودکشی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا ہے - اور جو رحم وافسوس ہم کو قرطبہ کے "شہیدوں" پر بیساختہ آتا ہے وہ اُسی قسم کا ہے جو لوگوں کو بہت سے مجنونوں اور مالیخولیا والوں کی حالت پر آ سکتا ہے - یہ مظلوم واقع میں شہید تو ہوئے مگر بیماری کے ہاتھوں سے - اور انکی قسمت اُسی قدر قابلِ رحم ہے جس قدر کہ اُس وقت ہوتی جب یہ حقیقت میں دین کے لیے شہید ہوئے ہوتے -

اِن خودکشیوں کا اصل بانی یُولوجی آس تھا - یہ قرطبہ کے ایک پُرانے خاندان کا جو ہمیشہ سے عیسوی جوش میں نام آور تھا پادری تھا - یُولوجی آس نے سالہا سال نماز و روزہ اور سخت مجاہدہ و ریاضت میں صرف کیے تھے - اُس نے اپنے آپ کو ایسی بیخودی وجذبے کی حالت پر پہونچا دیا تھا جو اس قسم کے افعال کا باعث ہوا کرتا ہے کہ گمراہی کے تو ہوتے ہیں مگر جاں نثارانہ عقیدت سے خالی نہیں ہوتے - اُس میں کوئی دنیاوی بات باقی نہیں رہی تھی نہ اُسکو اپنی ذات کا خیال تھا اور نہ کسی ذاتی حوصلے کا - اُسکے مقاصد صرف یہ تھے کہ مسلمانوں کے جھوٹے دین پر سبّ وشتم کی بوچھاریں کریں اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان اعلیٰ درجے کی عقیدت کی آگ کو بھڑکا دیں - اِن مقاصد میں اُسکو ابتدا سے انتہا تک قرطبہ کے ایک دولتمند نوجوان سے جسکا نام اَلوِیَرو تھا - اور پادریوں کی ایک جماعت سے جسکی تعداد کم اور سرگرمی زیادہ تھی - اور رُہبانوں اور عورتوں اور معدودے چند دینداروں سے مدد ملی - اُن لوگوں میں سے جو اس خوش عقیدہ جوان پادری سے بہت مماثلت رکھتے تھے ایک خوبصورت لڑکی فلوریا (زہرا) نام تھی - وہ مسلمان و عیسائیہ کی شادی کا ثمرہ تھی اُسکی عیسائیہ ماں سے

خفیہ طور سے اُسکو اپنے مذہب کی تعلیم دی تھی۔ بہت زمانے تک فلورا ظاہراً ہر طرح سے مسلمان
رہی۔ لیکن آخر کار شہادت وگرمجوشی کے ویسے ہی جوش سے جس نے یولوجی اُس کو بھڑکایا تھا
اور بائبل (کتاب مقدس) کی ایسی عبارتوں سے جیسی کہ یہ ہے "وہ شخص جو لوگوں کے سامنے
مجھ سے انکار کریگا، اُس سے میں بھی اپنے اُس باپ کے سامنے جو آسمان میں ہے انکار کرونگا"
برانگیختہ ہوکر وہ اپنے بھائی کے مکان سے (اُسکا باپ مرچکا تھا) بھاگ گئی اور عیسائیوں میں جاکر
پناہ گزیں ہوئی۔ اُسکے بھائی نے جو مسلمان تھا اُسکو بہت ڈھونڈھا گر کچھ نتیجہ نکلا۔ بہت سے
پادری اس الزام میں قید کیے گئے کہ بھگا لیجانے میں شریک تھے۔ اور فلورا چونکہ نہیں چاہتی تھی
کہ اُسکے قصور سے اور لوگ مصیبتیں جھیلیں، گھر واپس آئی اور اپنے عیسائی ہونے کی مُقر ہوئی
اُسکے بھائی کے امکان میں جہانتک تھا اُس نے کوئی سخت تدبیر اُسکے اسلام میں واپس لانے
کی اُٹھا نہیں رکھی اور آخر کار اُسکی ہٹ سے غیظ میں آکر اُسکو قاضی کے پاس لے آیا۔ اور اُسکو
مرتدہ ہوجانے کی مجرم ٹھہرایا۔ مسلمان کی اولاد گو اُسکی ماں عیسائیہ ہو اسلامی قانون کے
روسے پیدائشی مسلمان سمجھی جاتی ہے۔ اور مرتد ہوجانے کی سزا ہمیشہ سے موت ہے ۔ اس زمانے
میں بھی ٹرکی میں یہ قانون جاری ہے۔ گو بغیر کہے سُنے چالیس برس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ
اسپر عملدرآمد نہ ہوگا لیکن ایک ہزار برس پیشتر کی نسبت ہم کو ضرور یہ امید رکھنا چاہیے کہ مرتدوں
پر اب سے کم نرمی کی جاتی ہوگی۔ اسپر بھی اُس قاضی نے جسکے سامنے فلورا حاضر کی گئی تھی
اس کمبخت لڑکی پر کچھ رحم کھایا۔ قاضی نے اُسکے قتل کا حکم نہیں دیا۔ جیسا کہ شرعاً اُسکو کرنا
واجب تھا۔ بلکہ اُسکے قید کرنے کا بھی حکم نہیں دیا۔ اُس نے اُسکو خوب دُرّے لگوائے اور اُسکے
بھائی سے کہا کہ اُسکو گھر لے جاؤ اور دین اسلام کی تلقین کرو۔ لیکن وہ پھر بھاگ نکلی اور اپنے کسی
عیسائی دوست کے پاس جاکر اُس نے پناہ لی۔ یہاں پہلے پہل یولوجی اُس سے اُسکی ملاقات
ہوئی۔ جسکو اس حسین وبدنصیب کمسن مذہب کی فدائی سے ویسی پاک وبےلاگ محبت ہوگئی جیسی
فرشتوں کی آپس میں ہوسکتی ہے۔ اُسکی بڑھی ہوئی حقانیت، صوفیانہ معرفت، اور مغلوب ہونے والی

محبت

جرأت نے اس لڑکی کو اُسکی آنکھوں میں ولایت کی صورت میں جلوہ گر کیا۔ اور اس پہلی ملاقات کی ذرا ذرا سی باتیں بھی چھ برس تک اُس پادری کو نہیں بھولی تھیں۔ جبکہ اُس نے اُس لڑکی کو یہ الفاظ خط میں لکھے تھے: "تو نے اے میری مقدس بہن اسکو روا رکھا تھا کہ مجھے اپنی وہ گردن دکھانے جو دُودھ سے پاش پاش تھی اور جسکے اوپر سے وہ خوبصورت زلفیں کاٹ لیگئی تھیں جو کبھی اسکے اوپر لٹکتی تھیں اسکی وجہ یہی کہ تو نے مجھے اپنا روحانی باپ سمجھا اور مجھے بھی اپنا ہی سا پاک دیا رسا یقین کیا تھا۔ ملکے سے میں نے اپنا ہاتھ تیرے زخموں پر رکھا۔ میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا تھا کہ انھیں اپنے لبوں سے اچھا کرنے کی کوشش کروں بشرطیکہ مجھے اسکی جرأت ہوتی کہ ....
جب میں تجھ سے جدا ہوا تو میری حالت اُس شخص کی سی ہوگئی جو خواب میں چلتا پھرتا ہے۔ اور میں برابر ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا"

فلورا اور ایک اور دینی بہن جو گرجوشی میں اُسکی شریک تھی اک محفوظ جگہ میں رکھی گئیں اس لیے یولوجی اس نے اسکو پھر کچھ عرصے تک نہیں دیکھا۔

اس اثنا میں قرطبہ کے عیسائیوں کی سرگرمی گُل کھلا رہی تھی۔ ایک احمق پادری کو جسکا نام پرفکٹس تھا لوگوں نے بہکا کر تنا ہی مذہب کو بُرا کہلوایا۔ اور جس دن وہ قتل ہوا مسلمانوں کی عید کا دن تھا جبکہ ساری دنیا سینہ بھر کے سخت روزوں کے تمام ہونے کی خوشیاں منا رہی تھی مسلمان مردوں و عورتوں سب نے اس عید کو اک خاص موقع خوشیاں منانے کا قرار دیا تھا اور اُس مجرم پادری کے قتل نے اُن مجمعوں کو جو گلیوں میں بھرے ہوے اور روبایمیں خوش فعلیاں کر رہے اور شہر کے باہر بڑے میدان میں اُدھم مچا رہے تھے اور بھی برانگیختہ کر دیا۔ یہ غریب پادری بہادری کے ساتھ محمد صلعم اور اُنکے مذہب کو اخیر سانس تک گالیاں دیتا ہوا نفریں کرنے والے اور رحم نہ کھانے والے مسلمانوں کے بڑے غول سے گھرا ہوا اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ قرطبہ کا بشپ جسکے پیچھے پیچھے پادریوں اور مریدوں کی ایک فوج تھی اُسکی لاش کو اٹھا لیگیا۔ اور سینٹ ایس کلس کے تبرکات کے ساتھ اُسکو دفن کیا اس لیے کہ ڈاؤ کِ لیشین کے زمانے

کا وہ شہید تھا اور اُسی کے گرجا میں یہ مقتول عبادت کرانے کو مقرر تھا۔ اور فوراً اسکو اک ولی قرار دے دیا۔ اُسی شام کو دو مسلمان ڈوبے۔ اسکو ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ خدا نے پرفکٹس کے قاتلوں کو سزا دی۔ اور حبشی غلام نصر نے جسنے اُسکے قتل کی نگرانی کی تھی اُسی سال کے اندر وفات پائی اور نصرانیوں نے تفاخر کے ساتھ اعلان کیا کہ پرفکٹس نے اُسکی علالت کی نسبت پیشینگوئی کی تھی" یہ اک دوسرا بدلا تھا!"

اسکے بعد ہی ایک رُہبان آئزک (اسحاق) نام نے قاضی سے اس بہانے سے ملاقات کی کہ میں دینِ محمدی قبول کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جوں ہی اُس ذی علم قاضی نے اسلام کے عقائد بیان کیے اُس رُہبان نے آنکھیں بدل دیں۔ اور اُس مذہب پر سب وشتم کی بوچھاڑیں شروع کر دیں جسکے سکھانے کی اُس نے درخواست کی تھی۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ قاضی نے اسس کے ایک گھونسا رسید کیا۔ اور کہا کہ "تو جانتا ہے یا نہیں کہ ہمارا قانون ایسے لوگوں کو موت کی سزا دیتا ہے جو ایسی باتیں کرنے کی جرأت کرتا ہے جیسی تو نے کہیں"۔ اُس رُہبان نے جواب دیا کہ "میں جانتا ہوں۔ مجھے موت کی سزا دو۔ میں تو اسکی آرزو رکھتا ہوں اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا نے کہا ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو نیکوکاری کے لیے ستائے جاتے ہیں اس لیے کہ اُنھیں کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے"۔ قاضی کو اس شخص پر افسوس آیا اور سلطان سے التجا کی کہ اُسکے جُرم سے چشم پوشی کیجائے مگر بذریعہ نہیں آئزک (اسحاق) کا سر اُڑا دیا گیا اور اس بنا پر وہ ولی ہو گیا۔ اور قطعی طور پر ثابت کیا گیا کہ اس سے نہ صرف اُسکی طفولیت ہی کے زمانے سے بلکہ اس دنیا میں آنے سے بھی پہلے ہی بہت سی کراماتیں ظہور میں آئی تھیں۔

اسکے قریب ہی سلطان کے ایک پہرے والے نے جسکا نام سینکو تھا اور جو یُولوجی اَس کا شاگرد تھا محمد صلعم کو گالیاں دیں اور اپنے سر پر کھیل گیا۔ دوسرے اتوار کو چھ رہبان قاضی کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور چلا کر کہنے لگے "ہم بھی وہی کہتے ہیں جو ہمارے مقدس بھائیوں

آئزک وسینکو نے کہا تھا" اور فوراً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینی شروع کردیں اور کہنے لگے "اپنے .... پیغمبر کا انتقام لو! ہمارے ساتھ اپنا سارا جنگلی پن صرف کرو!" انکے سر بھی اڑا دیے گئے۔ تین پادری پادریان اور بھی اس خودکشی کی متعدی تپ سے متاثر ہوکر اس لیے دوڑے آئے کہ اپنے سروں کو جلاد کی نذر کریں۔ اس طرح سے ۸۵۱ء کے موسم گرما کے اندر دو مہینے سے کم کے عرصے میں گیارہ آدمی طعمۂ اجل ہوگئے۔

عیسائیوں کی بڑی جماعت اپنے بھائیوں کی احمقانہ مذہبی سرگرمی سے پریشان تھی۔ اس امر کو بھولنا نہیں چاہیے کہ ہسپانیہ والے مذہبی گرمجوشی میں کچھ ایسے سربرآوردہ نہ تھے۔ انکے مذہب نے اُنپر خفیف سا تسلط کر رکھا تھا اور ان میں سے اسقدر لوگوں نے دین محمدی قبول کرلیا تھا کہ دونوں مذہب اور دونوں قومیں بہت کچھ دوستانہ طور پر شیر و شکر ہوگئی تھیں۔ نصرانی اپنی قدیم لاطینی زبان اور علم ادب سے نفرت کرنے لگے تھے اُنھوں نے عربی سیکھ لی اور جلد ویسی ہی عربی لکھنے لگے تھے جیسی خود عرب لکھتے تھے۔ خود یولوجی اس اس تبدیلی پر روتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیسائی بجائے کتب مقدس اور پیشوایان مذہب کی تصنیفات کے عربی اشعار اور حکایات سے دلبستگی کرتے ہیں۔ نئی پود صرف عربی ہی جانتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی کتابیں، اُنکے بڑے بڑے کتبخانوں سے لیکر شوق سے پڑھتی اور اُنھیں کو مرغوب سمجھتی ہے اور کسی عیسائی کتاب کو ترچھی نگاہوں سے بھی نہیں دیکھتی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ خود اپنی زبان بھولتی جاتی ہے اور ہزار میں ایک آدمی بھی لاطینی میں درست خط شاید ہی لکھ سکتا ہو اور تاہم عربی میں عمدہ اشعار کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عیسائیوں کو عرب کے قلندرانہ کہانیوں اور اُنکے اشعار کلیسا کے پیشواؤں کی تصنیفات سے بہت زیادہ دلآویز و دلچسپ معلوم ہوے۔ وہ زیادہ سے زیادہ عرب بنتے، زیادہ شائستہ ہوتے، زیادہ تہذیب اختیار کرتے جاتے تھے۔ اور مذہبی تفرقوں سے بھی زیادہ بے پروائی کرنے لگے تھے۔ وہ مسلمانوں کے شکرگزار تھے کہ اُنکے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اُنکے برگشتہ مزاج بھائیوں نے جو دفعۃً عداوت ظاہر

کی اس سے وہ متحیر و متوحش ہوے۔ ان لوگوں نے اس مخوف طوفان کو اپنے بھائیوں پڑانکی کارروائی کا بے نتیجہ ہونا ثابت کرکے ٹالنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے اُنھیں سمجھایا اور یاد دلایا کہ دیکھو مسلمانوں نے ہمیشہ عیسائیوں کے ساتھ کیسی بے تعصبی ظاہر کی ہے اور انجیل کی صلح جو تعلیمات اور حواری کے یہ الفاظ کہ "بدزبانیاں کرنے والے آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہونے کے"۔ اُنھیں یاد دلانے اور اُن سے کہا کہ مسلمان ان موتوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ وہ استدلال کرتے ہیں کہ "اگر تمھارا مذہب سچا ہوتا تو خدا اپنے شہیدوں کا انتقام لیے ہوتا۔"

عام قسم کے ان لایق عیسائیوں نے جو یہ جانتے ہی نہ تھے کہ روحانی عروج کا نیکی یا پابری پر کیا زور ہوتا ہے اور صرف اپنے پڑوسیوں کا حق ادا کرتے اور اپنی نمازیں سادہ پرانی وضع کی طریقے پر پڑھ لیا کرتے تھے۔ سرگرم مذہب لوگوں کو دبا دینے کی کوشش کی گر محض بے ثمرہ۔ ان لوگوں کو صاف نظر آتا تھا کہ اِن لگاتار توہینوں اور اُنکی فوری سزاؤں کا نتیجہ آخر میں ضرور اصلی صعوبتیں ہونگی۔ اور برعکس اسکے یولوجی اس جو اُنکے اعتراضوں کا جواب کتاب مقدس اور اپنے اولیا کے سوانحمری سے دینے کو مستعد ہو بیٹھا تھا ایسے ہی نتیجے کی طمع رکھتا تھا اور سرگرمانِ مذہب مذہبی تعذیب کی آگ کو سب سے زیادہ بھڑکا تے کے آرزومند ہو رہے تھے۔ کلیساؤں کے اہل حکومت جن پر اعتدال پسند جماعت اور نیز اسلامی سلطنت نے اثر ڈالا تھا اسکو جائز نہیں رکھ سکتے تھے کہ بغاوت کا جوش کچھ زیادہ عرصے تک بلا سرزنش جاری رہے۔ اور بشپوں نے اشبیلیہ کے بڑے کلیسا کے پادری کی صدارت سے ایک مجلس منعقد کی اور اگرچہ پہلے مقتولوں کی "شہادتوں" کو ٹھیک طور سے منسوخ نہیں کر سکے اس لیے کہ کلیسا اپنی رسم کے موافق ان مصیبت زدوں کے نام شہیدوں کی فہرست میں داخل کر چکا تھا، تاہم ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اب اس طرح کا اظہارِ مذہب نہ کیا جائے۔ اور اس فیصلے کے نفاذ کے لیے سرگرم لوگوں کے سرغنہ قید خانے بھیجے گئے۔ یہاں یولوجی اس کی ملاقات فلوراسے

پھر ہو گئی۔ جسکی صورت یہ ہوئی کہ فلورا ایک دن کسی کلیسا میں تہ دل سے دعا مانگ رہی تھی کہ اُس نے اپنی بغل میں اپنی ہی سی ایک مذہب کی فدائی کو دیکھا۔ یہ اُس آئزک (اسحاق) نام رُہبان کی بہن تھی جو اوائل کے "شہدا" میں سے تھا۔ اور اسکا نام میری (مریم) تھا۔ میری چاہتی تھی کہ اپنے بھائی سے آسمانی بادشاہت میں جا ملے۔ فلورا نے کہا میں بھی تیرا ساتھ دونگی۔ دونوں قاضی کے پاس پہونچیں اور محمدؐ اور اُنکے مذہب پر لعن وطعن کرکے قاضی کو اپنے مقدور بھر غصہ دلانے لگیں۔ دو نوجوان حسین لڑکیاں نہایت خلوص کے ساتھ "زمین پر امن اور لوگوں کی خیر خواہی" کے مذہب کی ماننے والیاں قاضی کے سامنے گالیوں اور تلخ کلامیوں سے آلودہ لبوں کے ساتھ اُسکے مذہب کو "شیطانی کام" کہتی ہوئی کھڑی تھیں۔ لیکن وہ نیکدل قاضی اس آسانی کے ساتھ بھڑکایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ان سب مجنونانہ حرکتوں سے بتنگ آ گیا تھا۔ اور جب لوگ زبردستی موتیں خریدتے آتے تھے تو وہ بہت دفعہ اپنے آپ کو بہرا ظاہر کرتا تھا۔ اُس نے اُن دونوں لڑکیوں سے کہا کہ مجھے تمہاری حالت پر افسوس آتا ہے۔ تم کیوں باؤلی ہو گئی ہو۔ اُس نے چاہا کہ کوشش کرکے اُنھیں اس بات کی ترغیب دے کہ اپنے قول سے مُکر جائیں۔ یا ایسا کرے کہ گویا اُس نے سنا ہی نہیں۔ مگر اُن دونوں نے اپنے بہادرانہ مقصد پر ہٹ کی اور اُسکو مجبوراً انھیں قید خانے بھیجنا پڑا۔

یہاں زمانۂ دراز کی قید میں ان بانی بھولیوں کے دل دبے اور قریب تھا کہ اپنی جانوں پر کھیل جانے کے جوش کو خیرباد کہیں کہ یولوجی اس اُنکی ڈھارس بندھانے اور اُنکو خاک میں ملانے کو آموجود ہوا۔ اسکا کام دنیا بھر کے کاموں سے زیادہ سخت تھا۔ یعنی اُن عورتوں کو جنھیں وہ جان ودل سے پیار کرتا تھا جانیں گنوا دینے پر آمادہ کرتا۔ تاہم ہر فطری وانسانی جذبے کے علی الرغم اس لوہے کے بنے ہوئے شخص نے دل کڑا کرکے یہ ارادہ کر لیا کہ ان دونوں کی حمیتِ مذہبی کو بھڑکا کر شوقِ شہادت کا شعلہ بنا دے۔ اس مصیبت زدہ پادری کے لیے یہ خیال روزانہ کا سوہانِ روح تھا۔ لیکن جس امر کی نسبت اُس نے یقین کر لیا تھا کہ نیک کام ہے

اسکے لیے کوشش کرنے میں اس نے کبھی کوتاہی نہ کی۔ بلکہ اس نے ایک پرارسا فلورا کو (جس کے تئیں اسکی بہت ہی کم ضرورت تھی) یہ یقین دلانے کے لیے لکھا کہ جو شہادت مذہب کے لیے ہوتی ہے وہ غایت درجے کی دلربا، دلکش اور پرشان وشوکت ہوتی ہے۔ وہ شب وروز اس خیال سے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا تھا کہ جو خیالات رحم ومحبت کے اسکے دل میں تھے وہ دفع ہوجائیں اس لیے کہ ان سے اسکے ارادے میں فرق آجانے کا اندیشہ تھا۔ گروہ حد سے زیادہ مضبوط تھا۔ فلورا اور میری (مریم) باوجود اسکے کہ قاضی نے انھیں بچا نے کی تہ دلی سے کوششیں کیں مستقل وغیر مضطرب رہیں اور آخری ملاقات کے بعد جب حکم موت سنا دیا گیا تھا یولوجی اس فلورا سے ملا۔ اور بعد کو روحانی فتح کے تفاخر میں اُسنے یہ لکھا:

" مجھے فرشتہ معلوم ہوئی۔ اک آسمانی روشنی اُسکو گھیرے ہوے تھی۔ اُسکا چہرہ مسرت سے دمکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسی وقت آسمانی وطن کی مسرتوں کے مزے لے رہی تھی.... جب میں نے اُسکے شکریں لبوں کے الفاظ سُنے میں نے چاہا کہ اُسے وہ تاج دکھلا کر جسکا وہ انتظار کر رہا تھا اُسکے ارادے پر مستقل کر دوں۔ میں نے اُسکی پرستش کی۔ میں نے اس فرشتے کے سامنے سجدہ کیا۔ اور اُس سے التجا کی کہ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھے۔ اور اُسکی گفتگو سے قوی دل ہو کر اپنے حجرے کو لوٹ آیا"۔

بالآخر فلورا اور اُسکی ساتھی میری (مریم) ۲۴ نومبر ۸۵۱ء کو قتل کی گئیں اور یولوجی اس نے اس واقعے کو جسکو اُسنے کلیسا کی اک بڑی فتح خیال کیا شہرت دینے کے لیے مبارک باد کا اک گیت تصنیف کیا۔

اسکے بعد فوراً یولوجی اس اور دوسرے پادری قید خانے سے رہا کر دیے گئے اور دوسرے سال عبدالرحمن ثانی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اُسکی جگہ اُسکا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔ یہ شخص مزاج کا سخت اور سنگدل وخود بیں تھا اسکے وزراء کی تنخواہوں میں سے جو پس انداز ہوتا تھا اُسکو بھی وہ ضبط کر لیتا تھا اور اسکی دنائت ونالائقی کی وجہ سے ساری دنیا اس سے نفرت کرتی تھی

مذہب، علم، تہذیب

دین و دنیا دونوں کی فلاح مذہب - علم اور تہذیب پر منحصر ہے - اور ان شعبوں مین خلوص کے ساتھ قلمی خدمت انجام دینا داخل عبادت ہے بنابران ہم نے بتوکلاعلی اللہ سہ رسالہ تمدن کے مقاصد کو جو معاشرتی

تمدنی ادبی فلسفی اخلاقی تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن ہے - اور جو جولائی ۱۹۱۵ء سے ہماری ہاتھون مین ہے وسیع کر دیا ہے تفصیل حسب ذیل ہے - (۱) رسالہ تمدن: اردو کا یہ ماہوار ممتاز رسالہ جو مزید تعارف کا محتاج نہین ہے بجائے لکھنو کے پھر پہلے کیطرح دہلی سے شائع ہوا کریگا: تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی پہلی قیمت سالانہ سے: نمونہ کی پرچہ کی قیمت ۴ر (۲) رسالہ بیگم اس ماہوار رسالہ کا واحد مقصد نظم و نثر مین خواتین کیلئے مفید اور دلچسپ مہذب معلومات فراہم کرنا ہے یہ رسالہ انشا اللہ عنقریب دہلی سے جاری کیا جائیگا، تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی ۱۰ - قیمت سالانہ عہ نمونہ ۳ر رسالہ **مذہب** یہ رسالہ والد ماجد قاری محمد سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان و پرائیویٹ سکرٹری آف اسلام کی خاص سرپرستی مین عنقریب دہلی سے جاری کیا جائیگا - اس رسالہ مین ایسے مضامین درج ہونگے جنمین مذہب کی خوبیان، فلسفہ عقلی، سائنس اور دیگر علوم کے رو سے بیان کیجائینگی، اور تعصب فرقہ بندی اور دل آزاری کی رکیک باتون سے قطعا احتراز کرکے خلوص کے ساتھ یہ کوشش کیجائیگی کہ جدید معلومات کی روشنی مین عقل و نقل کو جمع کرکے انسانون مین اعلی روحانی اور اخلاقی جذبات پیدا کئے جائین محاسن و فضیلت اسلام کا ظاہر کرنا اس رسالہ کا ممتاز فرض ہوگا - مگر دیگر مذاہب کی خوبیون سے ہرگز ہرگز چشم پوشی نہ کیجائیگی، اور جزا و پاداش دلائل کے ساتھ کماحقہ انصاف کیا جائیگا، تاریخ اشاعت انگریزی مہینے کی ۲۰ قیمت سالانہ سے نمونہ کا پرچہ ۳ر خریداری کی درخواستین اور جملہ خط و کتابت و ترسیل زر بنام منیجر رسالہ جات مذکورہ و مضامین وغیرہ بنام ایڈیٹر آنے چاہیئں المشتہر خاکسار محمد عباس سرفراز خلف اکبر قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان

پتہ قاری سرفراز محل دہلی

پُرتاثیر خطیب

اخباری منبر کے اردو خطیب کے خطبے سنو جو ہر ہفتے دین و دنیا کی بھلائی کے پُرتاثیر وعظ سناتا ہے - اُردو زبان اسکے زور بیان پر جھومتی ہے - کھوئے راستے اس خضر کے سامنے ہاتھ باندھے چلے آتے ہین - مشہور ماہوار رسالہ نظام المشائخ کے دفتر سے نکلتا ہے - حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے مضامین اب زیادہ تر اسی مین چھپتے ہین - چندہ سالانہ تین روپیہ ششماہی ایک روپیہ دس آنے سہ ماہی پندرہ آنے - خریداران نظام المشائخ سے سالانہ ۲ ششماہی ۱ سہ ماہی ۱۳ر نمونہ مفت

المشتہر منیجر خطیب دہلی

ہندستان کی صنعتی نمائشون مین طلائی و نقرئی تمغہ جات حاصل ہوچکے ہیں

ملیریا و تپ لرزہ و بخار اور معمولی طاعون میں باٹلی والا کی بخار کی دوائی کلاں یا بخار کی گولیاں استعمال کرنا چاہیے - قیمت عہ ر

باٹلی والا کا بالم روت - بچوں اور کم طاقتوں کا روح پرور ہے - قیمت عہ ر

دوسری مشہور ادویہ

باٹلی والا کی خالص کونین کی گولیاں - ایک یا دو گرام والی ہر شیشی میں سو گولیاں -

بخار کی دوا (خورد) قیمت ۸ر

کالیرول - ہیضہ اور قے و دست کے واسطے قیمت عہ

مقوی گولیاں (امبرال ملکہ) کمی خون اور اعضائے رئیسہ کی ضعف و انتقال کے لیے - قیمت عہ

ایرڈس کا مرہم - کیموں کے لیے ۴ر - دانتوں کا منجن ۳ر

یہ ادویات ہر جگہ ملتی ہیں اور نیز پتہ ذیل پر بھی مل سکتی ہیں

ڈاکٹر ایچ ایل باٹلی والا سنز اینڈ کمپنی لمیٹڈ وارلی لیبوریٹری بمبئی

تار کا پتہ: - باٹلی والا - وارلی - بمبئی -

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد — صہ
- البرامکہ — ۸ر

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق — ۶ر
- تحقیق الجہاد مجلد — ہے
- اعظم الکلام ۲ جلد — سے
- مجموعہ رسائل — ے
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۸ر

حضرت سلیمان — ۱۴ر

- حضرت ہاجرہ — ۲ر
- حقیقۃ السحر — ۲ر
- حضرت عیسیٰ و صلیب — ۱ر
- یورپ و قرآن — ۳ر
- احسان عام — ار

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد — ہے
- نشاط عمر — عہ
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال دولھن — ۶ر
- حسن معاشرت — عہ
- اصلاح معیشت — ۸ر

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری — لگار
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۲ر
- امرائے ہنود — لگ

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — ۸ر
- میڈیکل جیورس پروڈنس — ے
- عروج تکافی تعمیر — ۱۴ر
- سفرنامہ مسیو ٹیمونو — عہ
- جنگ ٹرنسوال — عہ

مولانا عبداللہ العمادی
- کتاب المعارف — ۶ر
- محکمات — ۶ر
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- مناقۃ العرب — ۳ر
- فلسفۃ القرآن — ۲ر
- فلسفہ ابن عربی — ۲ر
- کتاب الزکاۃ — ۲ر
- محرم کی بدعتیں — ۳ر

مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن — لگار
- حیات امام مالک — ۱۲ر
- لغات جدیدہ — عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — ہے
- مسلمان عورتوں کی بہادری — ۲ر
- اہل السنت والجماعت — ۸ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرآۃ — عہ
- المدنیۃ والاسلام — ۶ر
- سجل جمعیۃ ام القریٰ — ۸ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۴ر
- شمع و شاعر — ۴ر
- بلال — ۳ر
- شکوہ — ار
- جواب شکوہ — ۳ر
- مکمل ترانہ — ۲ر
- رموز بیخودی — ۶ر
- نالۂ یتیم — ر
- فریاد امت — ۴ر
- تصویر درد — ۴ر
- اکبری اقبال — ۳ر

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام — لگہ
- یوسمین — ۸ر
- نیلی چھتری — ۱۲ر

خواجہ غلام الحسنین
- فلسفہ تعلیم — لگہ
- دستور المعلمین — ۶ر
- معیار الاخلاق — ۶ر
- تنقید لطیف — ۵ر
- تربیت اولاد — ۴ر

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ۶ر
- الصدیق — عہ
- المرتضیٰ — عہ
- سیاحت ہند — لگ

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ۶ر
- روزنامہ باتصویر — سے
- " بلاتصویر — ۶ر
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قمر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ر
- اسلام کا انجام — ۴ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ
- میلاد نامہ — عہ
- کرشن بیتی — لگار
- اردو دعائیں — ۲ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۸ر
- جگ بیتی — ۶ر
- بچوں کی کہانیاں — ۶ر
- اسرار — ۴ر
- کم ڈموت — عہ
- قبروں کے غیبی نوشتے — ۸ر
- پیرا اینگرس (۵ رسالے) — ۴ر
- محرم نامہ — ۱۴ر
- یزید نامہ — ۶ر
- مقفل نامہ — ۸ر
- فرام قبلہ و شعلہ — ار

منشی ابوالحسن فرید آبادی
- معلم السیاست — لگہ
- تاریخ مصر جدید — لگہ

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — للعہ
- حسن سرور " — ہے
- دیول دیوی — ۶ر
- گورا — لگہ
- نیل کا سانپ — ۶ر
- جعفر و عباسہ — ۶ر
- اختر و حسینہ (کامل) — ے

مولانا راشد الخیری
- صبح زندگی — ۶ر
- شام زندگی — عہ
- طوفان حیات — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- سات روحوں کے اعمالنامے — ۲ر
- الزہرا — ۱۲ر
- ازالہ و ملکی انشا — ۸ر
- بنت الوقت — ۸ر
- سنجوگ — ۸ر
- گوہر مقصود — ۴ر
- شہید بیداد — ۴ر

منشی محمد حسن خاں
- ہاجرہ — لگار
- ترکوں کی معاشرت — لگہ

صفدر مرزاپوری
- بزم خیال — عہ
- مرقع ادب — عہ
- نشاط سخن — عہ

مولانا اشرف علی صاحب
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب — ۶ر
- تعلیم الدین — ۴ر
- اکسیر فی اثبات التقدیر — ۸ر
- الانتباہات المفیدہ — ۱۲ر
- اصلاح الرسوم — ۴ر
- مناجات مقبول — ۶ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے — لگہ
- بہشتی گوہر — ۴ر

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق — لگار
- فنون لطیفہ — ۶ر
- خیالات — ۶ر
- امثال — ۶ر
- فن شاعری — عہ

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ رضی — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر
- کیوپڈ اینڈ سائکس — ۸ر

سیماب اکبرآبادی
- سیر خدیجۃ الکبریٰ — ۶ر
- بنت الرسول — ۵ر
- زیب النساء بیگم — ۴ر
- نورجہاں بیگم — ۸ر
- جام کوثر — ۵ر
- بہشتی جھومر — ۱۲ر

المیزان [illegible]

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبد الحلیم شرر

- عزیز مصریٰ / عزیزہ مصری
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین
- عصر قدیم
- آغا صادق / آغائی صاحب
- دولت ہسپانیہ
- حروب صلیبیہ
- مسیح اور مسیحیت
- مخدرات (مجلد)
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مقدس نازنین
- قیس و لبنیٰ
- ایام عرب
- فلورا فلورنڈا
- ملک العزیز ورجنا
- فردوس بریں
- شہید وفا
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- خوفناک محبت
- الفانسو
- فلپانا
- فاتح مفتوح
- جویائے حق
- بابک خرمی ۲ حصہ
- تاریخ بغداد
- حسن بن صباح

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- کایا پلٹ

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- بچھڑی دلہن
- کرم دھم
- پی کہاں
- کامنی
- خدائی فوجدار
- فسانۂ آزاد
- الف لیلہ و نیاز
- سیر کہسار
- جام سرشار

منشی جوالا پرشاد برق

- مرتا لنی
- ماہ ارشتیں
- بنگالی دولہن
- پرتاب
- مشتوقہ فرنگ
- بروگ

مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا
- لیلیٰ مجنوں
- نوبہار
- مثنوی امید و بیم

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ
- مرقع ادب
- حرمان نصیب

مسٹر سید لماچہ بی اے

- تاریخ فلاسفۂ یورپ
- فلسفہ جذبات
- فلسفہ اجتماع
- تمدن انسانی
- فلسفہ کی تعلیم
- زردنشینان ڈراما

پنڈت چکبست بی اے

- صبح وطن
- گلدستۂ پنچ
- کملا

انیس احمد عباسی بی اے

- راجہ کی کامیابی
- بچہ کی جنگ

جلال مرحوم

- مضمون ہائے دلکش
- نظم نگارین
- افادۂ تاریخ
- سرمایۂ زبان
- منتخب القواعد

شاہ احمد علی شوق

- عالم خیال
- قاسم و زہرا
- سکھراج / ملکہ چاند
- سلفران ولاسی

منشی ارتضائی شرر

- یادگار شرر
- خیابان
- ملفوت گلشن
- صبح وصل
- تصویر عبرت
- دو پھول

خواجہ عشرت

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- تذکرۂ آب بقا
- گلدستۂ ظرافت
- بجولی

منشی محمد احمد ...

- جمیلہ
- شیدۂ وفا
- یادگار صلاحیت

علامہ سید احمد

- مجالس الاسلام حصہ اول
- حصہ دوم
- فن ہدایت
- کشمیری
- امثال

مسٹر محمد صدیق ...

- ذکر طیب محمد عربی
- مثنوی
- عرض حال
- تعلیم نسواں
- حجاب ...
- نالۂ ...

منشی محمد حسین کاکوروی

- فسانۂ لارنس ورتھ
- وگیز ...
- الہ دین دہلوی

مرزا فدا علی خنجر

- محل خانہ شاہی
- بے زبان دوست

متفرق

- قواعد اردو
- کلیات نعت
- مکاتبات صالحین
- تسخیر فرانس
- واقعات کربلا
- الاحسان
- میلاد ابن جوزی مترجم
- حیات نظامی
- تذکرہ حزیں
- سلفران ولاسی
- ادائی دن خدا پرست
- مصنوعی شوہر
- زرد نشینیاں
- نوبہار
- کنولا (۲ جلد)
- مثنوی صبح امید
- اصول شیخ
- تاریخ ہند کی کہانیاں
- عروج فکر انسان
- اساس التعلیم
- شعر العجم حصہ اول
- ایضاً حصہ دوم
- مجموعۂ کلام شبلی
- ترقی زبان
- عروج فکر انسان
- اتفاقات زمانہ اور مساوات
- عقیل و جنبہ ۲ شوکیہ

الناظر کمپنی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

نمبر ۱۱۲	یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء	جلد ۱۹

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

مشہور مصنفین اردو کی کتابیں

افراد کا سہرہ — از مولانا سید کرامت حسین مرحوم سابق جج ہائیکورٹ الہ آباد ۲/ — کلیات اکبر خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کا کلام حصہ اول قیمت ۲/

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلیٰ
- ” متوسط
- ” مع شرح حسرت موہانی

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مضامین حالی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی
- شکوہ ہند
- مثنوی حقوق اولاد
- رباعیات حالی
- قطعات حالی
- مرثیہ مرزا غالب
- بیوہ کی مناجات
- الدین یسر
- تحفۃ الاخوان
- رحم و انصاف
- چپ کی داد
- ننگ خدمت
- جھوٹ اور ایکے کا مناظرہ
- حب وطن
- تعصب اور انصاف
- تدبیر

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد
- تفسیر القرآن (۷ جلد)
- تبیین الکلام (۲ جلد)
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر مجلد
- سیرۃ فریدیہ
- اسباب بغاوت ہند
- مقالات سرسید
- آخری مضامین سرسید
- النظر فی بعض مسائل
- تحریر فی اصول التفسیر
- احکام طعام اہل کتاب
- رقیمہ فی قصہ اصحاب کہف
- ازالۃ الغین
- تفسیر السموات
- جواب امہات المومنین
- الدعاء والاستجابۃ
- کاشنش
- ایک نادان خدا پرست
- انشاء اللہ
- خلق الانسان
- الجن والجان
- مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی
- مہدی آخر الزماں
- مکاتبات الخلان
- ابطال غلامی

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد
- ” متوسط ”
- ترجمہ حمائل شریف ”
- ادعیۃ القرآن
- ذرہ سورہ
- مطالب القرآن
- الحقوق والفرائض ۳ جلد
- اجتہاد
- امہات الامہ
- مراۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم بے نظیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- مبادی الحکمۃ
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ
- لکچر نمبر ۲ و ۳ و ۴
- لکچر نمبر ۶ مع ترجمہ سکسٹی
- لکچر تنبیہ ۳ — لکچر تعلیم
- قضا السلمین ۳ — آزادی نسواں
- رسم خط ۲ — اتمام حجت

مولانا شبلی مرحوم

- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانح عمری مولانا روم
- بیان خسرو
- علم الکلام
- الکلام
- سفرنامہ مصر و شام و روم
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر
- شعر العجم جلد اول
- ” جلد دوم
- ” جلد سوم
- ” جلد چہارم
- مثنوی صبح امید
- آغاز اسلام
- اسلامی حکومت
- زیب النسا
- جہانگیر
- مجموعہ کلام شبلی
- دیوان شبلی فارسی
- بوئے گل ”
- دستہ گل ”
- برگ گل ”
- قصیدۂ ماتمیہ

مولانا آزاد مرحوم

- آبحیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نیرنگ خیال
- نظم آزاد
- قند پارسی
- قصص ہند
- نصیحت کا کرنپھول

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق مجلد
- مسلمانوں کی تہذیب
- مکاتبات الخلان
- تقلید و عمل بالحدیث
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب
- کتاب المحبت والشوق
- فطرت اور قانون فطرت
- اسلام
- آیات بینات ۳ جلد
- مجموعہ لکچر مجلد

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ
- حیات جامی
- علوم عرب
- خواتین

مولانا ذکاء اللہ

- تاریخ ہندوستان ۹ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- کرزن نامہ
- فلسفۂ تمثال
- صحیفۂ فطرت
- تقویم اللسان
- تعلیم الاستقلام
- جغرافیۂ ریاضیہ
- معاون الحساب
- رسالہ علم ساحت
- محاربات عظیم
- رسالہ علم تناسب

مولانا شرر مرحوم

- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- ادیب
- نورجہاں
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- اردو کی ڈالی
- قومی نظم
- مرقع تاجپوشی
- مکالمہ مرد و عورت
- دربار شاہجہان
- لغات الخواتین

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

انتخاب کلام میر

معہ ایک مفید اور دلچسپ مقدمہ کے - جس میں میر صاحب کے کلام کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے - از جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو - حجم ۱۲ جزُ

قیمت عہ

شاعری کی پہلی کتاب

از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی - یہ اُردو زبان میں فن عروض کی عام فہم کتاب، شاعری کی معلم، شعر گوئی کا قانون، تقطیع کرنے کا آلہ، میزان سخن، معلومات شاعری کا آئینہ، اوزان کی کسوٹی اور سخن سنجی کا زینہ ہے جس میں تقطیع شعر کے صحیح اور مستند قاعدے ایسی عمدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ بغیر اُستاد کی مدد کے محض اس کتاب کے مطالعہ سے آدمی شاعر بن سکتا ہے - قیمت ۸ر

کالا شکاری

یہ ایک دردناک فرانسیسی ناول کا ترجمہ ہے جسے آغا رفیق صاحب بلند شہری نے زبان اُردو کا لباس پہنایا ہے - قیمت مہ

حیات مولانا کرامت حسین

از

مسٹر حامد علی خاں بیرسٹرایٹ لا

مولانا سید کرامت حسین صاحب مرحوم بیرسٹرایٹ لا و سابق جج ہائیکورٹ کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے - علوم مشرقیہ و مغربیہ میں آپ کو جو مہارت و دستگاہ کامل حاصل تھی اُسکی نظیر مشکل سے ملیگی اور اگر ہندوستان بھر میں ہندو اور صاحبان کمال اس پایہ کے مل بھی آئیں تو بے شبہ اُنکی سی سادگی، دیانت، راستبازی اور کمال ایثار کی نظیر تو قطعاً نہیں مل سکتی - مولانا سید کرامت حسین مرحوم نے نہایت درجہ کفایت شعاری کی زندگی بسر کرکے دو لاکھ روپیہ جمع کیا تھا - اور یہ کل رقم تعلیم نسواں پر صرف کرنے کی غرض سے قوم کے نذر کر دی - جس شخص نے ایسی قابل قدر ایثار کی مثال قائم کی ہے اُسکے حالات خالی از دلچسپی نہیں ہو سکتے - لہذا اس کتاب کو ہر صاحب ذوق اور ہر خواہ ملک کو مطالعہ کرکے آپکی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے - قیمت ۱۲ر

بیان خسرو

یعنی حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور اُنکے کلام پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا محققانہ ریویو - جسے حال ہی میں الناظر ایجنسی نے طبع کیا ہے - قیمت مہ

خُلق مجسم - ایک نیک اور کریم النفس لیڈی کی شائستہ زندگی کا فوٹو - ہے جسے انگریزی کے ایک مشہور ناولسٹ نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اگر اخلاق کو درست کرنے اور نوع انسان کے اندر اعلیٰ جذبات پیدا کرنے میں ناولوں سے کوئی مدد مل سکتی ہے تو یہ ناول [illegible] ہے - قیمت عہ

مولانا عبدالبدھو - آج اس ملک کے کتنے نونہال اور عالیخاندان رئیس ہیں جو اپنی سادہ لوحی کے باعث رنڈیوں کی مکاری اور ایک فریبی کے جال میں پھنس کر دین و دنیا برباد کرتے ہیں - یہ ناول جہاں ایک دلچسپی کا موجب ہو گا وہیں اُن خطرات سے بھی آگاہ کریگا [illegible]

الناظر ایجنسی لکھنؤ

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی مشہور دوائیون کا اشتہار

تار کا پتہ		پوسٹ بکس
کیفر	جینا کیا ہے جو ایک دوسرے کو آرام نہ پہونچا سکے۔ اسی خیال پر ڈاکٹر ایس کے برمن کی دوائیاں بنی ہیں۔ اور انکے انمول فائدہ کے حساب سے بہت سستی بکتی ہیں۔	نمبر ۱۴۲ ۵ ۵

نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت
عرق کافور ہیضہ کی دوا	۱۲ر	گھیگھے کھانسے کی دوا	۱۲ر	ہیضہ اور بدہضمی کے دست کی گولیاں	ٹھر	پیپرمنٹ کامت	۶ر
دمہ کی دوا	عہ	پین ہیلر اندرونی اور بیرونی درد کی دوا	۱۴ر	دردسر کی دوا	۶ر	روغن پیپرمنٹ	۱۰ر
بخار کی دوا شیشی کلاں	۱۴ر	کھانسی کی دوا کلاں شیشی	عہ	طاعون کی گولیاں بڑی ڈبیہ	۱۲ر	روغن رینڈی	۶ر
بخار کی دوا شیشی خورد	۸ر	کھانسی کی دوا شیشی خورد	۸ر	طاعون کی گولیاں چھوٹی ڈبیہ	۸ر	روغن صندل	۶ر
سالسہ۔ خون صاف کرنے کی دوا	۶ر	کان بہنے کی دوا	۱۴ر	عرق پودینہ بدہضمی کی دوا	۸ر	روغن اجوائن	۱۴ر
سینی لاین۔ جوں بند کرنیکی دوا	ٹھر	داد کا مرہم	۱۴ر	کلوروڈائن	۶ر	روغن سونٹھ اورک	۸ر
پرانا سوزاک	عہ	زخم کا مرہم	۵ر	پیچش کی دوا		روغن سوفت	۱۳ر
گرمی آتشک	عہ	زخم دھونے کی ٹکیہ	ار	لال شربت بچوں کی		روغن دارچینی	۶ر
کولا ٹانک۔ طاقت کی دوا	عہ	مقوی باہ کی گولیاں	عہ	طاقت کی دوا	۱۲	روغن لونگ	۱۴ر
گھیگھا کے لگانیکی دوا	۱۴ر	پرانے ملیریا بخار کی گولیاں	۱۴ر	خارشت کھجلی کی دوا	۸ر	روغن لیمو	۱۴ر
		کونین کی ٹکیہ	۸ر	امراض مستورات کی دوا	ٹھر	روغن الائچی	۶ر
				امراض دندان	۱۴ر	روغن لیونڈر	۶ر
						جلاب کی گولیاں	۵ر
						نمونہ کا بکس	ٹھر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۲ جلد ۱۹ — یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء

صنعتی و حرفتی سرگذشت ہندوستان

(بسلسلۂ ماہ گذشتہ)

مغربی تہذیب نے جہاں شخصی حکومتوں کے بجائے جمہوری و آئینی حکومتیں قائم کر دیں وہاں صنعتی ترقی کا انحصار بھی انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی طریق کار پر منحصر کر دیا۔ اور حکومت وقت چونکہ مثل والدین کے تصور کی جاتی ہے اس لیے نوخیز صنعتوں کی پرداخت بھی حکومت کا ویسا ہی فریضہ ہے جیسے اطفال کی پرورش والدین پر لازم ہے۔ ہندوستان میں جب سودیشی کا غلغلہ بلند ہوا تو گورنمنٹ نے بھی شرما شرمی دو تین کام اپنے ذمہ لیے جس میں سے صوبہ مدراس کے مسٹر چیٹرٹن کی تجربہ کارانہ مساعیٔ جمیلہ بار آور بھی ہوئیں یعنی دباغت کروم اور المونیم کی صنعت کو انھوں نے منفعت بخش دکھایا۔ تیسرا کام شکر سازی کا کہا جا سکتا ہے جس کے موجد بننے کے متمنی سید محمد ہادی صاحب تھے لیکن انکی تمنا دل کی دل ہی میں رہی اور اس کام میں سوائے اخراجات کے اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور لطف یہ کہ اگر صرف گورنمنٹ ہی کا روپیہ برباد جاتا تو زیادہ افسوس نہ تھا کیونکہ گورنمنٹوں کے فرائض میں سے ہے کہ اس قسم کے تجربات اپنے صرف سے کریں۔ غضب تو یہ تھا کہ سیکڑوں غریب ہندوستانی جن کو صنعتی تربیت اور استعداد کافی نہ تھی۔ فائدے کے لالچ میں آکر ہزارہا روپیہ کے مقروض ہوگئے یا کم از کم سالہا سال کی محنت و جانفشانی اور

حد درجہ کی کفایت شعارانہ زندگی بسر کرنے سے جو قلیل سرمایہ فراہم ہوا تھا وہ انکی گرہ سے نکل گیا۔ ہاں ان میں سے دو چار رائے بہادر اور خان بہادر البتہ ہوگئے۔

کیا جرمنی یا کسی ملک میں جہاں ہوشیار سائنس داں اور تجارتی کاروباری تعلیم حاصل کیے ہوئے صلاح کار و مشورہ دینے والے موجود رہتے ہیں وہاں بھی ممکن تھا کہ اس طور سے سیکڑوں بیچارے زمینداروں و روسا کا لکھوکھا روپیہ رائگاں جاتا؟ یہ تو معلوم ہی تھا کہ ہندوستان میں بڑے بڑے قطعات اراضی پر نیشکر کی کاشت نہیں ہوتی بلکہ کاشتکار مشکل سے بیگھہ دو بیگھہ کاشت کر لیتے ہیں۔ البتہ جہاں نہری آب پاشی کا بندوبست ہے وہاں چھ سات بیگھہ تک کاشت کر لیتے ہیں۔ اسلیے کسی ایک موقع میں ایک کارخانے کے لیے کافی مقدار میں رس یا نیشکر لینا دشوار تھا اور دور دراز سے لانے میں مصارف باربرداری بہت پڑ جاتے تھے۔ برعکس اسکے ہمکو معلوم ہے کہ کیوبا میں ایک نیشکر کی اسٹیٹ کم از کم پندرہ سو ایکڑ کی ہوتی ہے۔ خیر زمینداروں کی کوششوں سے نیشکر ایک معتد بہ مقدار میں جو کسی طرح کافی نہیں کہی جا سکتی جمع بھی ہو جاتی تھی۔ تو جو کولھو رس پیرنے کے لگائے جاتے تھے وہ ترقی یافتہ طریقوں پر عمل کرنے کے باوجود بھی مشکل سے ۶۰ فی صدی رس نکال پاتے تھے گو اس طریقہ سے بہ نسبت لکڑی کے کولھوؤں کے ۱۰ فی صدی کا اضافہ ضرور ہو جاتا تھا لیکن امریکن پریسنگ مشینوں سے آگے سب پیچ تیز ہیں جن سے ۹۵ فی صدی تک رس نکلتا ہے۔ البتہ ہادی سسٹم میں راب بنانے کا طریقہ بہت اچھا تھا اور راب صاف اور عمدہ تیار ہوتی تھی لیکن کل سامان کی قیمت تقریباً پانچسو روپیہ رکھی گئی تھی جو بلا امداد باہمی یا سرکاری امداد کے کسی طرح گاؤں والے نہ خرید کر سکتے تھے کیونکہ ایسے زمینداروں کا استطاعت کم ہے جو اس طرح کے مصارف برداشت کر سکیں۔ اسکے بعد اس طریقے میں محض ایک سنٹری فیوگل لگائی جاتی تھی اور ہاتھ سے موٹا کے چھینٹے دیکر راب سے شکر اور شیرہ جدا کیا جاتا تھا جسکا پرتہ ۲۱/۲ فی صدی سے زائد نہ آتا تھا گو دعوے یہ کیا جاتا تھا کہ ۵ا فی صدی تک شکر نکالی جاتی ہے لیکن راز درون پردہ سے جو لوگ واقف تھے وہ خوب سمجھتے تھے کہ اصل حقیقت کیا تھی بھلا ادھورے طریق پر کہیں مطلب برآری ہو سکتی تھی۔ بالآخر یہی طے پایا کہ سنٹرل فیکٹری سسٹم کے بغیر کام چلنا اور کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کاش پیشتر ہی سے کسی تجربہ کار اسپشلسٹ اور سائنٹفک مشیر کار کی رائے حاصل کر لیجاتی اور بغیر اسکے کہ اُن کی رائے

کے مطابق عمل کرکے ابتدائی تجربات میں پوری کامیابی نمودار ہوجاتی ہے محض خیالی باتوں پر رخت سفر باندھ کر روانہ ہوجانا اور دوسرے غریب زمینداروں کو جو لنگوٹی پر پھاگ کھیل گئے اور بھولے سادہ لوح رؤسا کو زلفِ یار کی پیچ و پیچ و خطر منزل میں رہبر خود راہ گم کردہ کی دعوت پر قدم ڈالدینے کی ترغیب و تحریص دینا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا۔ مثالاً ہم نے شکر سازی کا جو حشر ہوا بتفصیل بیان کیا۔ کاش اگر کوئی سبیل شکر سازی کی نکل آتی تو ۱۴ کروڑ ۹۵ لاکھ روپیہ ہندوستان سے باہر جانا رک جاتا۔ لیکن بھلا گئیں تھوکوں ستو سنے ہیں۔

ایک بزرگ انھیں دنوں اور پیش پیش ہو رہے تھے یعنی مسٹر ہاول جنھوں نے اُلٹی گنگا بہانی چاہی یا یوں کہو کہ موجودہ زمانے کے آتشیں ہتھیار کرپ کی ہاوٹیزروں، مشین گنوں، اور لمبی مار کی توپوں کا مقابلہ کرنے کو وہ تیر و کمان لیکر آموجود ہوئے۔ منچسٹر اور لورپول کے لاتعد و لاتحصی کارخانوں کے مقابلے کے واسطے آپ کی تجویز تھی کہ دستی کرگاہوں اور جولاہوں کی صنعت کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ اُنھوں نے دھواں دھار لکچر دیے، شعلہ بار مضامین لکھے اور چونکہ وہ سنہ ۱۹۰۵ء کی سودیشی تحریک کا زمانہ تھا ہر بنگالی اُن تمام تحریکوں کو سرسبز کرنے کی کوشش میں جان کھپانے کو تیار رہتا جن سے کچھ بھی ملک کو فائدہ پہونچ سکتا تھا۔ اسلیے سیکڑوں بنگالی اسپر ٹوٹ پڑے اور ایک وقت میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب ولایت کے کارخانوں کی خیر نہیں اور وہاں کی دخانی لبس (کارخانے) بالکل بیکار ہوجائیں گی۔ صاحب موصوف نے یہ دلیل پیش کی کہ باوجودیکہ بمبئی میں ساٹھ برس سے زائد زمانے سے روئی کے کارخانے موجود ہیں لیکن اب تک ہندوستان میں کئی لاکھ جولاہے کپڑا ہی بنکر اپنی زندگی بسر کرنے بھر کو پیدا کر لیتے ہیں۔ اسلیے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دستی کرگاہوں میں فائدہ نہ ہو۔ غرضکہ سرکار نے بھی اس جانب بہت کچھ توجہ کی۔ کارخانے بھی جابجا صنعت و حرفت کے شیدائیوں نے کھول دیئے لیکن قسمت میں جب بگاڑ لکھی ہوتی ہے تو بڑے بڑے صاحبان عقل و فہم کی بھی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ سواد شام کی تاریکی سفیدۂ صبح نظر آتی ہے۔ شب ظلمات کو روز روشن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غرضکہ ساری تدبیریں اُلٹ گئیں۔ اور اصل تو یوں ہے کہ جب کوئی کام بےعقلی سے کیا جانے لگا اور جان بوجھکر کجروی اختیار کی جائیگی تو ہمیشہ نقصان ہوگا۔ دستی کرگاہوں کے موجدوں کو انعام تقسیم ہوئے۔ سالویشن آرمی اور جاپانی دستی کرگاہوں کے نام زبان زد عوام ہوگئے۔ اسی ہنگامہ میں مسرز ہٹرسلی اینڈ سنز کی آہنی کرگاہ اچھا کام دینے والی دستی

کرگھا ہوں کی بھی مانگ بہت بڑھ گئی۔ اکثر مقامات پر مدارس پارچہ بافی بھی کھولے گئے جنھوں نے یا تو ڈسٹرکٹ بورڈوں کی امداد کے سہارے دو چار سال کی شبنم آسا زندگی کے دن پورے کرکے عدم کی راہ لی یا جو کسی مقامی راجہ یا تعلقدار کے دست کرم کی زرپاشیوں کی بدولت کچھ عرصہ تک کامیابی کے ساتھ چل سکے۔ ہم اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں بقول سٹرچے۔ این سرکار ایک کروڑ ۵۰ لاکھ گز کپڑا جولاہوں نے تیار کیا تھا۔ لیکن خود مسٹر سرکار کو ان اعداد کی صحت میں شبہہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ غریب جولاہے کیونکر اپنی ہستی قائم کیے ہوئے ہیں؟ اس سے وہی لوگ واقف ہیں جو ہرشئے کا مطالعہ نظر غائر سے کرتے ہیں۔ ہر جولاہے کا سارا گھر یعنی بوڑھے مرد، عورتوں سے لیکر چھوٹے بچے تک سب کے سب اس کام میں لگے رہتے ہیں اور اگر ہر یا ہر یومیہ کے حساب سے انکو اجرت مل بھی گئی تو قلیل بقدا ارزانی ہی میں ان غریبوں کا پیٹ پالنے کو تا کافی تھی نہ کہ آجکل گرانی میں۔ گھر میں ایک ٹین کے ڈبے چند مٹی کے برتنوں اور کچھ سامان پارچہ بافی کے سوا اللہ کا نام ہی نام ہوتا ہے۔ کاشکے اس کجروی کو ترک کرکے ایسی دیسی مصنوعات کی جانب توجہ کی جاتی جن میں خاص کامیابی کی امید ہے تو اہل ہند کا بہت کچھ فائدہ ہو جاتا۔ آگرہ کے سنگی ظروف، نظام آباد اور چنار کے ظروفِ گلی، نگینہ کا آبنوس کا کام بنارس کی برنجی مصنوعات، کٹک کی سنگتراشی، اور صوبۂ مدراس کے شہروں کا چوبی کام، یہ اور اسی قسم کے دیگر مصنوعات کی طرف اگر توجہ کی جاتی اور ایک عالمانہ غائر نظر سے انکو مطالعہ کیا جاتا تو بہت کچھ فائدہ کی امید تھی لیکن سچ دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی۔

اسی طور سے خانگی صنعتوں کو رواج دیا جا سکتا تھا۔ موزہ سازی و بنیا ئن بافی، ریشم کا کام، کپڑوں کا کاڑھنا وغیرہ نہایت کامیابی سے ترقی پذیر ہو سکتے تھے اور یہ کام باہمی امداد کے طریق پر بہت اچھی طرح چل سکتے ہیں۔ روس جیسے ملک میں جو دیگر یوروپین ممالک سے ہر کام میں پچھڑا ہوا تھا خانگی صنعتوں کو محض لوکل جماعتوں کے سبب سے جنکو زمس ٹووؤ کہتے ہیں بڑی ترقی ہوئی جن کی تعداد یورپی روس میں ۳۴ تھی۔ یہی لوکل کونسلیں اور جماعتیں امداد باہمی کے طریق پر کاشتکاران کو قرض بھی دیتی ہیں اور خام اشیاء بھی مہیا کرتی ہیں۔ مرکزی گورنمنٹ اور لوکل جماعتوں نے لکر ۲۰۵ سے زائد زائد اسکول وورکشاپ کھول رکھے ہیں جہاں ایسی دستکاریوں مثل نجاری، قیتون سازی، فرنیچر اور دیگر سامان آرایش تیار کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جاڑوں میں جب کاشتکار کھیتی باڑی سے نجات پا جاتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے

کہ اس زمانے میں عورتیں مرد اور بچے ۲۰ لاکھ پونڈ کا سامان تیار کر ڈالتے ہیں۔ محض اُن عورتوں کی تعداد جو ایسے کاموں میں لگی رہتی ہیں کم از کم پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض قالین، گڑیاں، فیتہ، نواڑ وغیرہ بھی بناتی ہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کا نظام موجود نہیں بجز اسکے کہ کاچھی اور کُرمی باندھ بٹ لیتے ہیں یا کچھ لوگ گوبر کے اُپلے پاتھ کر یا دہی دودھ بیچکر دو چار پیسے روزانہ کما لیتے ہیں۔

اسی نوع کی صنعتیں ہیں کہ جن کی بدولت سالانہ بڑی محنت سے کمایا ہوا کروڑوں روپیہ ہندوستان سے جاپان، امریکہ، اور دیگر یوروپین ممالک کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان اشیاء کی فہرست نہایت طویل ہے تاہم دو چار اعداد پیش کرکے ہم چشم عبرت کے لیے سامانِ تماشا فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ سنہ ۱۰-۱۹۱۶ء کے درمیان شیشہ آلات و ظروف گلی دو کرور ۵۹ لاکھ قیمت کے ہندوستان میں آئے۔ ادویہ کی قیمت میں دو کرور ۴۳ لاکھ ادا کیے گئے اور چاقو و قینچی استرے تین کرور ۹۴ لاکھ کے آئے۔ لیکن ایسی صنعتوں کے صناعوں اور اہلِ حرفہ کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ غیر ملکی اشیاء کا مقابلہ کر سکیں اور ایک ہی لکیر کے فقیر بنے رہنے کے بجائے نئی ایجادات و اختراعات کریں اور نفیس و دلکش چیزیں تیار کرکے مقابلہ میں فروخت کر سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو ٹکنیکل تعلیم دی جائے اور عام تعلیم اتنی کافی ہو کہ عقل آرائی اور قوانین سائنس اور اپلائڈ کیمسٹری کے اصولوں کو سمجھ سکیں اور انھیں کے تابع فرمان رہ کر اپنی کوششوں کو کامیاب بنا سکیں۔ خیالات صالح پیدا ہوں۔ دماغ تربیت یافتہ بن جائیں افعال و عقل آرائی کریں تو باقاعدہ اور انتظام کے ساتھ، نہ کہ اندھیری کوٹھری میں ادھر اُدھر ہاتھ مارتے پھریں۔ اوقات و عادات میں اصول ہو، کیرکٹر میں قوت، ذہن تیز ہو اور تیزی ذہن کے ساتھ موروثیت بھی آ جائے۔ صناعوں میں یہی اوصاف پیدا کرنے کی خاطر سویڈن میں سلوجل (Slojel) اسکول بچوں کو دستی تعلیم دینے کے لیے ہیں اور بلجیم میں اپرنٹیج (Appretesage) اسکول لوہاروں اور نجاروں کے لیے ہیں۔ نیز ناسکو کے اسپرل ٹکنیکل اسکول اور کولمبیا کے اسکول معدنیات جس میں علم معدنیات کی عملی اور مکمل تعلیم دی جاتی ہے اور آکسفورڈ کے اسکول آف آرٹس اور کنگسٹن کا اسکول جو فنون لطیفہ کے طالبعلموں کے لیے ہے اور فرانس و جرمنی کے پالی ٹکنکس اور ٹکنیکل یونیورسٹیوں اور رہیم کے کلرکوں کے اسکول موسومہ اِکولی پروفیشنل اور اِکولی سُپیریرڈی کمرس جس میں کہ بنکوں کے حسابات اور بحری تجارت کے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی (جو قبل از جنگ قائم تھے) ان سب کی ایک ہی غایت تھی یعنی جملہ مدارج اور شعبہ جات کے صناعوں، اہل حرفہ، اور

دستکاروں کو کاروباری لوگوں، تجارتی پیشوں سے تعلق رکھنے والوں، اور اس شاخ میں آئندہ داخل ہونے والوں کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ انکو اپنے اپنے پیشوں اور کاروبار میں ٹوٹا نہ آئے اور وہ مرد میدان بنکر غیر ممالک کے صناعوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اب ہندوستان کو دیکھیے۔ گورنمنٹ کی ضروریات پورا کرنے کو طبی، زراعتی، وٹرنیری، اور انجنیرنگ اسکولوں اور کالجوں کی ضرورت تھی۔ اسلیے اس قسم کی کئی کئی درسگاہیں مختلف مقامات پر قائم کر دی گئی ہیں اور بعض بعض عرصہ سے قائم ہیں جن سے طلبا ڈگری حاصل کر کے عموماً محکمہ جات سرکاری میں داخل ہو جاتے ہیں اور انگلستان کے تعلیم یافتہ افسران کی محنت طلب و تابع فرمان ماتحتی کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔ انڈسٹریل اسکول بقول مسٹر سرکار محض ۲۶ سارے برطانوی ہندوستان میں موجود تھے جن میں ۶۵۴ طالب علم زیر تعلیم تھے۔ طلبا کی صوبہ وار تقسیم یہ تھی۔ پنجاب میں پانچ اسکول تھے جن میں ۳۱۲ طالب علم تھے ممالک متحدہ میں ۴ اسکول اور ۲۲۶ طالب علم بنگال میں ۴ اسکول اور ۳۵۰ طالب علم۔ البتہ اس صوبہ میں کابینیٹ اسکولوں میں نقشہ کشی کے درجے بھی کھلے ہوئے تھے۔ صوبۂ متوسط میں ایک بھی خالص ٹکنیکل درسگاہ نہ تھی البتہ متعدد اسکولوں میں ڈرائنگ کی تعلیم دی جاتی تھی اور بعض بعض جگہ نجاری کے اسکول بھی کھلے ہوئے تھے۔ مدراس میں لڑکوں کے ۲۰ اور لڑکیوں کے لیے گیارہ اسکول موجود تھے ان اسکولوں میں صنعتی درجہ بھی شامل تھا جس میں نجاری اور تصویر کے فریم بنانے (Cabinet making) وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بمبئی میں علاوہ وکٹوریہ ٹکنیکل انسٹٹیوٹ کے بعض تجارتی اسکول موجود تھے۔ یہ ہے مکمل فہرست ہماری درسگاہوں کی اور تعداد تشنہ کامان صنعت، حرفت کی۔

اب سے تینتیس برس پیشتر گورنمنٹ ہند کا رزولیوشن (مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۸۸ء) شائع ہوا تھا جس نے نہایت پرشکوہ الفاظ میں اس بات پر زور دیا تھا کہ گورنمنٹ ہند ہندوستانی بچوں کی صنعتی تعلیم کے لیے نہایت دلیرانہ قدم رکھنا چاہتی ہے اور گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھی جائے گی۔ لیکن اس قسم کے رزولیوشن ہمیشہ وعدۂ وصل ثابت ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ نے صنعت و حرفت کے مسئلہ کو کبھی سنجیدگی کے ساتھ اٹھایا ہی نہیں۔ اور بظاہر محض طفل تسلی کی خاطر رزولیوشن پاس ہوتے اور تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوتے رہے۔

آخر میں سر جان ہیوٹ نے البتہ صنعتی تعلیم کی ایک مکمل اسکیم تیار کر کے سرکار کے حضور میں پیش کی تھی لیکن جیسا کہ ہمیشہ "طلب زر" باعثِ خاموشی ہوتا رہا اسوقت بھی روپیہ کا سوال دلیرانہ قدم بڑھانے میں حائل ہوا اور سارا زور شور محض چند اسکول قائم کرنے میں ختم ہو گیا جن کی فہرست مختصر لیکن ترقی پذیر ہے۔ لکھنؤ میں اسکول آف آرٹس اینڈ کرافٹ، کانپور میں صنعتی اسکول، بریلی اور گورکھپور میں نجاری و دباغت کے اسکول قائم ہونے پر سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور ٹکنولاجیکل کالج یا پالی ٹکنک درسگاہ تک نہ قائم کی گئی۔ اس قماش کے یا اس سے ملتے جلتے آرٹس اسکول لاہور، جے پور، پونا، وبمبئی وغیرہ میں موجود ہی تھے جن میں بمبئی کا وکٹوریہ جوبلی ٹکنیکل اسکول کسی قدر غنیمت تھا۔ ہمیشہ یادگار رہے گا مرحوم ٹاٹا کا نام جنھوں نے ۲۴ لاکھ روپیہ یکمشت قوم کی نذر کر دیا جس سے بنگلور میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا اور اب فخر ملک ڈاکٹر سر جگدیش چندر بوس اپنا ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کر رہے ہیں۔ خدا انکو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ ہندوستان میں تقریباً ۴ کروڑ باشندے آدھا پیٹ بھر کر دن رات کاٹ دیتے ہیں اسپر بھی وہ اپنی گاڑھی کمائی کا روپیہ ان کاموں کی نذر کر دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ جائے عبرت ہے کہ ہماری سرکار دس دس کروڑ روپیہ ریل لائینوں کے اجرا کے لیے اپنے شاہی خزانہ سے نکال سکتی ہے کروڑ دو کروڑ روپیہ ایسے کسی اعلیٰ انسٹیٹیوٹ کے لیے منظور کرنے پر کسی طرح تیار نہ ہو۔ بعض قدامت پرست تو اسکو قسمت کی خرابی اور رموزِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن مادرِ ہند کے سپوت فرزند یہی ہے کہ جسکے لیے نصف صدی سے برابر لڑتے جھگڑتے چلے آرہے ہیں اور ہندوستان کی متحدہ سیاسی جماعت یعنی انڈین نیشنل کانگرس اپنے سالانہ اجلاسوں میں اسکی ضرورت و اہمیت نہایت موثر و پرزور طریق پر دکھاتی رہی ہے۔

ہماری سرکار ایسے مفید کاموں میں امداد دیتے ہوئے جیسی احتیاط برتتی ہے اور جیسی کچھ آہستہ روی کا تہیہ کرتی ہے وہ ذیل کے بیان سے عیاں ہو جاتا ہے یہ خلاصہ ہے اُس امداد کا جو گورنمنٹ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے آغاز جنگ سے اس سال تک صنعتوں کو چمکانے کے لیے دی ہے۔ یہ بیان ایک ممبر [illegible] کونسل کے سوال کے جواب میں دیا گیا تھا۔

۱۹۱۵ء [illegible] کی یکمشت اور [illegible] کی سالانہ گرانٹ اور [illegible] بطور قرض چوڑیوں کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے امریکن پرسبٹیرین مشن ایٹہ کو دی گئی۔ مالگذاری میں سے [illegible] کی رقم تیل کی کاشت کے لیے ضلع جونپور میں دی گئی۔ [illegible] کی مجموعی گرانٹ مرزا پور میں جرابیں بننے کا ایک درجہ

کھولنے کے لیے اور [illegible] ر مرادآباد کے جولاہوں کو بطور امداد دیے گئے۔ پانچ ہزار روپیہ صاحب ڈائرکٹر محکمۂ کاغذات دیہی وزرعی کو اس غرض سے دیے گئے کہ صاحب موصوف نیل کی ٹکیوں کی بکری کو رواج دینے کی غرض سے ارزاں قیمت پر فروخت کرسکیں اور نقصان کو اس رقم سے پورا کریں۔

اس سارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ [illegible] ر کی رواں گرانٹ اور [illegible] ر نہ واپس ہونے والی مدیں اور [illegible] ر واپس ہو جانے والی مدیں دیے گئے۔

سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء میں ڈائرکٹر صاحب انڈسٹریز کو بیس ہزار کی رقم بغرض قیام نمائش دیہی مصنوعات جو کانپور میں منعقد ہوئی تھی دیے گئے انکو مالی گرانٹ مبلغ [illegible] ر کی منظوری ہوئی اور پچیس ہزار بطور قرض کے دیا گیا۔ مسٹر ڈی والڈی (اٹیہ سنٹر) کو دس ماہ کے لیے [illegible] ر ماہانہ کے حساب سے بائی کرومیٹ آف پوٹاش کی تحقیقات و تجربہ کرنے کو منظور کیے گئے۔ دس ہزار کی رقم ڈائرکٹر صنعت و حرفت کو اس غرض سے قرض دی گئی کہ وہ رنگ خرید کر فروخت کریں۔ عطریات کی صنعت میں سوگین اسپرٹ سے تجربہ کرنے کی غرض سے جو اسپرٹ لاکر صاحب ڈائرکٹر کو دی گئی اسکا کوئی محصول نہ دینا پڑا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں مبلغ [illegible] ر صاحب ڈائرکٹر صنعت و حرفت کو اوسر زمین سے سوڈا و دیگر قسم کے تجارتی نمک نکالنے کے تجربہ کے لیے دینا منظور ہوا اور دو ہزار روپیہ مجیٹھ کی خرید و فروخت کے لیے اعزازی مسٹر لے فاکس آنریری سکرٹری انڈین پولٹری کلب مظفرنگر کو بغرض خرید میجک لینٹرن دیے گئے۔ فیروزآباد کی پارچہ بافی کی سوسائٹی کو دو ہزار روپیہ ، فی صدی سود پر دیا گیا۔ فتحپور کے جولاہوں کو اعزازی خود سے چلنے والی کرگاہ پر کام سکھانے کو دیے گئے اور مبلغ تین ہزار روپیہ اسلیے منظور ہوا کہ بوتل بنانے والی مشین لاکر الہ آباد کے کارخانہ شیشہ سازی میں نصب کی جائے (از ہمدم ۲۴ دسمبر سنہ ۱۷ء)

بھلا اس امداد کا مقابلہ دیگر ممالک کی حکومتوں کی امداد سے کرو تو متذکرہ امداد جو برطانوی ہندوستان کے ایک زرخیز صوبہ کی گورنمنٹ نے صنعت و حرفت جیسے وقیع کام کو ترقی دینے کی خاطر دی ایک کھیل سی نظر آتی ہے۔ صنعت و حرفت کا محکمہ تو قائم ہے لیکن محکمہ کے مصارف اور ڈائرکٹر انڈسٹریز کی بیش قرار تنخواہ پر جو کچھ سالانہ صرف ہو جاتا ہے اسکے آگے صنعتی کارخانہ داروں کو جو کچھ رقمیں دی گئیں وہ ہیچ نظر آتی ہیں۔

ان عطیات خسروانہ کی فیض رسانی کے نام بھی قابل غور ہیں۔ بھلا یوں اوس چاٹنے سے اگر

پیاس بجھنے لگے تو لوگ کنوئیں کے پاس کیوں دوڑے جائیں۔ ہندوستان کی ایک ریاست بڑودہ ہے جہاں کا دارالفنون (کلا بھون) آج سارے ہندوستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور روشن خیال مہاراجہ کے ذرائع آمدنی کو دیکھتے ہوئے اُنھوں نے جتنے کارخانے ریاست کی امداد سے قائم کرادیے ہیں وہ بہت کچھ اربابِ بصیرت کے لیے سبق آموز ہیں۔ وہاں سامان تجارت کی نمائشیں اور حرفتی میلے بابجا ہوتے ہیں۔ عجائب خانے صنعتی مدرسوں کے ساتھ قائم ہیں۔ سفری کتبخانوں اور میجک لالٹینوں سے دیہاتیوں کو صنعتی کاروبار کا شوق دلایا جاتا ہے۔ اور بغرض حوصلہ افزائی امداد بھی کافی طور پر دی جاتی ہے نہ کہ برائے نام صرف قسم کھانے کو۔ گذشتہ ۳۰ دسمبر [illegible]ء کو کلکتہ کی آل انڈیا انڈسٹریل کانفرنس میں دیوان وی۔ پی۔ مادھوراؤ نے بحیثیت صدر اپنے ایڈرس میں گورنمنٹ کے فرائض صنعتی ترقی کے لیے اس طرح بیان کیے تھے:۔

"(۱) پورے ملک کی حرفتی حالت اور پیداوار کا مکمل سروے کیا جائے اور اسکے نتائج سے پبلک کو وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔ (۲) حرفتی کاموں کو کافی طور سے امداد دی جائے (۳) بیرونی مقابلہ کو روکا جائے (۴) دیسی بنکوں کے افتتاح کی ترغیب دی جائے اور حکومت ایک نوع کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیوے (۵) سرکاری ماہرین کی اطلاعوں کے بموجب امتحانی کارخانے کھولے جائیں اور کامیاب ہونے کی صورت میں انکو پرائیوٹ سرمایہ داروں کے حوالے کردیا جائے اور بصورت ناکامیابی بند کردیے جائیں۔ (۶) سرکاری ضروریات کی جس قدر اشیاء درکار ہوں وہ ملک ہی کی ساختہ اشیاء سے پوری کی جائیں اور ملکی بنی ہوئی چیزوں کو غیرملکی اشیاء پر ترجیح دیجائے گو وہ نفاست میں گری ہوئی کیوں نہ ہوں (۷) عجائب خانے اور سفری کتب خانے قائم کیے جائیں۔ تجارتی نمائشیں اور حرفتی میلے منعقد ہوا کریں"۔

حال میں جب انڈسٹریل کمیشن نے دوبارہ اپنی کارروائی زیر صدارت مسٹر ٹامس ہالینڈ شروع کی تو اسکے روبرو ملک کے سربرآوردہ لوگوں نے جوکچھ اظہارات دیے تھے وہ تقریباً سب انہی باتوں کی تائید کرتے ہیں۔ مسٹر سنو ہن اس نے اظہار دیتے ہوئے کہا کہ خاص اور ضروری صنعتوں کے لیے گورنمنٹ کو ایک مقررہ میعاد کے لیے تقسیم منافع کی ذمہ داری اپنے سر لینی چاہیے سرمایہ کی فراہمی کی شکل یہ ہے کہ ہر صوبہ میں انڈسٹریل بنک قائم کیے جائیں اگر گورنمنٹ شرکاء میں نہیں ہے تو اتنا تو ضرور کرنا چاہیے کہ صوبہ کی آمدنیوں کا جو کچھ پس انداز ہوا کرے وہ ان بنکوں میں رکھا کرے جیسا کہ

بنگال بنک یا دیگر پریسیڈنسی بنکوں میں گورنمنٹ رکھتی ہے اور سود کی خود ضمانت کرے۔ ہر صوبہ کے ضلعوں، تجارتی منڈیوں و صنعتی مقامات میں سفری نمائشیں ہوا کریں لیکن اس طرز پر نہیں جیسی کہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے اب ہونے لگی ہیں جو مشکل سے سال دو سال چل پاتی ہیں اور پھر روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہندی دستکاریوں اور صنعتی اشیاء کو غیر ممالک میں رواج دینے کی غرض سے تجارتی نمایندے و ایجنٹ جزائر متحدہ برطانیہ، اعظم یورپ و امریکہ و دیگر مقبوضات و نوآبادیات برطانیہ میں مقرر کیے جائیں جس طور سے کہ جرمن یا جاپانی ایجنٹ ہمارے ملک میں آ کر لوگوں سے آرڈر لیتے اور انکو نمونہ دکھاتے ہیں اور لوگوں کے مذاق طبیعت سے اپنے یہاں کے دستکاروں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ سرکار کو چاہیے کہ مصنوعات کی بار برداری کا خاص انتظام کرے اور ریلوے کمپنیوں اور سرکاری ریلوے لائنوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنا محصول کم کریں اور خاص خاص صنعتوں مثل شیشہ آلات وغیرہ کا محصول رعایتی وصول کیا کریں۔ گورنمنٹ ان کارخانہ داروں کے لیے زمین بسلسلہ تعمیر کارخانہ جات مالکان آراضی سے بہ آسانی و ارزاں قیمت پر دلا دیا کرے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ ہماری صنعتی ترقی کی راہ میں تین چیزیں حائل ہیں۔ اول ریلوں کی موجودہ پالیسی، دوسرے سرکاری امداد کی کمی، تیسرے غیر ملکی مقابلہ میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونا۔ علاوہ اسکے ابتدائی و جبری تعلیم پر بھی انھوں نے زور دیا اور ٹکنیکل و انڈسٹریل و کمرشل تعلیم کی درسگاہوں کی عدم موجودگی پر جن پر تجارتی ترقی کا اصلی دار و مدار ہے افسوس کا اظہار کیا۔ اسی طور سے مسٹر ارفنگاسٹ قائم مقام ڈیکل اسٹور کیپر نے بھی دوران اظہار میں کاریگروں اور دستکاروں کو ٹکنیکل تعلیم دینے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے زیادہ ضروری شئے تعلیم ہے۔ محض یہی نہیں ہے کہ جاہل لوگ ہوشیار کاریگر صناع نہیں بن سکتے بلکہ کاروبار کو پڑھے لکھے بہ نسبت جاہل لوگوں کے اچھے طور پر چلا سکتے ہیں۔ مسٹر جے۔ اے واڈیا نے جو اظہار دیا تھا وہ بھی متذکرۂ بالا تجویزات کی تائید کرتا تھا انھوں نے اسپر زیادہ زور دیا تھا کہ ہر صوبہ میں ایک انڈسٹریل بنک ضرور قائم کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ بحالت موجودہ اول تو بنک والے صنعتی کاروبار اور مشنری کی کفالت پر قرض دیتے ہی نہیں اور جو امداد دیتے بھی وہ نہایت سختی سے تخمینہ لگاتے ہیں کہنے کو تو یہ ہیں کہ انھوں نے ۲۵ فی صدی حق مختتم چھوڑا ہے لیکن حقیقت میں وہ پچاس فی صدی تک پہنچ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات بنک والے بڑا غضب

کرتے ہیں کہ ایک سال مثلاً ایک بنک نے کسی فرم کو ۲ لاکھ دیدیے اور سال آخر میں کل کا کل واپس لے لیا اس سے کارخانہ داروں کو بڑی دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں اور کاروبار ڈانواڈول ہو جاتا ہے ان بنکوں کے پوست کندہ حالات مسٹر پوچ خانہ والا منیجر سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ نے اظہار دیتے ہوئے خوب بیان کیے تھے۔ انھوں نے موجودہ بنکوں کو جو ہندوستان میں کاروبار چلاتے ہیں تین قسموں میں تقسیم کیا (۱) پریسیڈنسی بنک (۲) غیر ملکی بنک (۳) لوکل بنک۔ جن میں سے غیر ملکی بنک اپنے ہی ملکوں کی تجارت کو فروغ دینے کے ساعی رہتے ہیں اور پریسیڈنسی بنکوں کا یہ حال ہے کہ وہ تقریباً تجارتی کاروبار کے لیے بہت کم قرض دیتے ہیں زیادہ تر کفالت میں جائداد مکفول کرلتے ہیں اور بڑی دقت یہ ہے کہ پریسیڈنسی ٹاون کے مفصلات میں ان کا لین دین بہت کم ہوتا ہے۔ رہے لوکل بنک وہ بھی اکثر زمینداروں کو انکی جائداد کی کفالت پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔ کاروبار کے لیے شاذونادر ہی دیتے ہیں۔ بر اعظم یورپ کے سنٹرل بنک لوکل بنکوں کو اپنا رقیب نہیں سمجھتے بلکہ انکو پوری امداد دیتے رہتے ہیں اور سنٹرل بنکوں میں حکومت اپنا روپیہ پس انداز رکھتی ہے جس سے انکی مالی حیثیت کو بڑی تقویت پہونچتی رہتی ہے۔ مسٹر امبالال سارابھائی دمنگل داس پارکھ نے احمد آباد ملز ایسوسی ایشن کے نمایندوں کی حیثیت میں متذکرۂ بالا امور کو ضروری قرار دیتے ہوئے یہ طریقہ اچھا بتایا کہ ہر برطانوی کانسل ہوس میں جو غیر ملک میں قائم ہیں ایک ہندوستانی تجارتی اتاچی بھی رہا کرے جو ہر حال میں ہندوستانی ہو۔ ریلوے محصول کی زیادتی کو راہ ترقی میں حائل بتایا اور سرکاری امداد کو انھوں نے بھی صنعتی ترقی کا جزو لاینفک قرار دیا۔ اور اسپر بھی زور دیا کہ ہندوستانی کارخانہ داروں اور یوروپین فرموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ قائم کیا جائے اور گورنمنٹ کو آرڈر دیتے وقت دونوں کو ایک آنکھ سے دکھنا چاہیے۔ مسٹر آر ڈی چندر کا تال گانوں کے پیسہ فنڈ کارخانۂ شیشہ سازی نے اس بات پر زور دیا کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ نئی نئی صنعتوں کے آزمایشی کارخانے اپنے روپیہ سے قائم کرے۔ کارخانوں کو گورنمنٹ کے محکموں اور سرکاری ضرورتوں کے لیے جسقدر سامان کی ضرورت پڑا کرے وہ ملکی و دیسی کارخانوں سے خرید اکرے۔ نئے کارخانوں کا انکم ٹکس ایک عرصہ تک معاف رکھنا چاہیے۔ اگر کسی کارخانہ کو خام پیداوار ریل پر کسی قدر فاصلہ سے لانا پڑتا ہے تو محصول ریلوے میں رعایت کی جایا کرے مثلاً شیشہ سازی کے لیے سوڈا لانا پڑتا ہے؛

اس کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔ حاصل کلام یہ کہ کمیشن کے سامنے جس قدر شہادتیں اور اظہارات ہوئے ان سب میں اس قسم کے مطالبات کیے گئے تھے اور اگر سچ پوچھو تو جس وقت تک گورنمنٹ عملی قدم نہ بڑھائے گی زبانی جمع خرچ سے مطلب برآری ممکن نہیں اور وہ عملی امداد ذیل کی شکلوں میں دی جا سکتی ہے۔

(۱) ابتدائی تعلیم جبری و مفت کر دی جائے۔ (۲) ضلع وار آرٹیزن و کمرشل اسکول کھولے جائیں جن میں نجاری، آہنگری، پارچہ بافی وغیرہ کے عملی کام سکھائے جایا کریں، اور ہر ایک اسکول کے ہمراہ ایک عجائب خانہ بھی رہا کرے جس میں نمونہ جات وغیرہ موجود رہا کریں (۳) ہر صوبہ میں کم از کم ایک ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ ایک پالیٹکنک کالج اور ایک کمرشل کالج ضرور کھولا جائے (۴) نئی نئی صنعتوں کے آزمائشی و معیاری کارخانے گورنمنٹ قائم کرے۔ اگر وہ منفعت بخش نظر آئیں تو پرائیوٹ سرمایہ داروں کے ہاتھ کاروبار چلانے کے لیے فروخت کر ڈالے۔ بحالت ناکامی انکو بند کر دیوے تاکہ قوم کا روپیہ ایسے کاموں میں جن میں نقصان کا پہلو نکلتا ہو نہ پھنسنے پائے۔ خاص خاص حالتوں میں چند سال تک کسی خاص صنعت کو ترقی دینے کی خاطر نقصان برداشت کرے جیسا کہ جاپان، جرمنی اور فرانس وغیرہ میں کیا گیا اور اب بھی ہوتا رہتا ہے۔ (۵) ہر صوبہ میں کم از کم ایک انڈسٹریل بنک ضرور کھولا جائے جسکی شاخیں اضلاع اور دیگر صنعتی مرکزوں میں ہوں۔ چاہے گورنمنٹ کل سرمایہ نہ لگائے تاہم ایک مدت تک کے لیے سود کی ادائیگی کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیوے اور اپنی ساکھ پر گورنمنٹ اسکو قائم کراوے اور اپنا پس انداز شدہ و مدروان کا روپیہ بھی انہی بنکوں میں رکھا کرے اور یہ کوئی بیجا خواہش نہیں ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب وزیر ہند ہندوستان کا کیش یعنی زر د نقد محفوظ جو اُنکے پاس رہتا ہے اسکو دوسرے درجے کے لندن کے بنکوں کو ۲½ اور ۲¾ فی صدی سود پر دیتے ہیں تو اگر ہندوستانی صنعت کو تقویت دینے کی خاطر حکومت ہند ایسا کرے تو کیونکر غیر مناسب ہوگا۔ تجارتی کاروبار میں ساکھ ہی اصل شے ہے۔ اسی ساکھ کا نتیجہ ہے کہ ٹاٹا آئرن ورکس کے لیے کروڑوں کا سرمایہ فراہم ہوگیا اور اب ٹاٹا انڈسٹریل بنک کے لیے اکٹھا ہو رہا ہے۔ کیا گورنمنٹ نے قرضۂ جنگ میں ۹۰ کروڑ روپیہ محض اپنی ساکھ کی بدولت سال گذشتہ میں نہیں فراہم کر لیا۔ اور اب مزید ڈیڑھ ارب فراہم کیا جا رہا ہے۔ (۶) دیگر ذریعوں سے بھی گورنمنٹ کی امداد ضروری ہے مثلاً ریلوے کمپنیوں سے محصول باربرداری کم کرا دیوے۔ سرکاری

ضروریات کے لیے جو سامان خریدا جاتا ہے وہ دیسی کارخانوں سے خریدا جایا کرے۔ اکسائز ڈیوٹی، اکڑائی (چنگی) وکسٹم ڈیوٹیوں میں رعایت کی جائے۔ غیر ممالک میں ایجنٹ یا اتاچی رکھے جایا کریں اور گورنمنٹ اپنے صرفے سے مقامی اور سفری صنعتی نمائشیں صوبوں اور ضلعوں میں منعقد کرایا کرے۔ (۷) شائقین کاروبار کو نیک صلاح و مشورہ دینے کی خاطر آزمودہ کار لوگ مقرر کیے جائیں اور ماہرین مخصوص کی امداد تحقیقات کے کاموں کے لیے بہم پہونچائی جایا کرے جیسا کہ جرمنی میں طریقہ ہے کہ قبل اسکے کہ کوئی شخص کاروبار کی ابتدا کرے اُس کام کے جملہ پہلوؤں پر نقادانہ نظر ڈال کر ایکسپرٹ لوگ آخری رائے دیتے ہیں کہ آیا اس کام میں ہاتھ ڈالنا مناسب ہے یا غیر مناسب۔ اگر وہ غیر مفید قرار دیتے ہیں تو بنانے والے اس ارادہ سے دست کشی اختیار کر لیتے ہیں (۸) گورنمنٹ آزاد تجارت کی پالیسی اور اصول تجیر مداخلت کو اگر کلیتاً خیرباد نہ بھی کہے تاہم اسکو اپنی پالیسی میں لچک پیدا کرنا چاہیے مثلاً خام پیداوار کی برآمد پر محصول بحری زیادہ لگایا جائے تاکہ وہ مال غیر ممالک کو جا کر وہاں سے دوسری شکل میں جب پھر ہندوستان میں آئے تو دیسی مصنوعات کے مقابل گراں نرخ پر فروخت ہو۔ اور اسکے دوبارہ داخلہ پر محصول درآمد بحری بھی حسب ضرورت و موقع زیادہ لگایا جایا کرے۔ مثال کے طور پر ہم روغنی اجناس، روئی، چمڑے وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہی غریب کاشتکاروں کی عرق ریزی سے پیدا کیے ہوے اجناس اور یہیں کے جنگلوں کے چرے ہوے جانوروں کی کھالیں اس قدر دُور دراز منزل پر پہونچائی جاتی ہیں اور پھر وہی بوشک اور جرچ بوٹوں لیبر کلیکنگ روغنوں اور چھالیٹین نہیں سکھ اور تہذیب کی شکل میں آکر ہماری جیبیں ٹٹولتی ہیں۔ غرضکہ ان چند امور پر ہر ملک کی رفتی ترقی کا انحصار رہتا ہے :- (۱) قدرتی پیداوار (۲) سرمایہ (۳) حکومت کی امداد (۴) بازار اور منڈیوں کی سہولتیں (۵) باربرداری کی آسانیاں (۶) کاریگر۔ جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو قدرتی پیداوار کے سوا پانچ صورتوں میں حکومت کی امداد ضروری قرار پائی ہے۔ سرمایہ داروں اور ایسے لوگوں کو جن کی نسبت گمان ہے کہ انکا اندوختہ زمین کے اندر دفن ہے اس امر کی ترغیب دینا کہ وہ اپنا روپیہ کسی کاروبار میں لگا دیں گورنمنٹ کی امداد کے بغیر نا ممکن ہے۔ اور یہ روزمرہ کی بات ہے کہ حکومت کے خفیف سے اشارے پر لکھوکھا روپیہ آن واحد میں جمع ہو جاتا ہے۔ یہ کس لیے؟ محض اس وجہ سے کہ حکومت کی ساکھ بڑی ہوتی ہے۔ یوروپین کمپنیوں کی سرگرم کوششوں سے دیکھنے

لائینوں کا سارے ملک میں جال سا بچھ گیا ہے اور اب مزید لائینوں کے لیے اجراء کی قطعاً حاجت نہیں۔ سیکڑوں نئی نئی منڈیاں معرض وجود میں آگئی ہیں لیکن افسوس کہ ریلوں سے کام محض ملکی پیداوار کے تحسب (exploitation) کا لیا جاتا ہے حالانکہ صنعتی کاروبار میں انکو مددگار ہونا چاہیے۔ رہے کاریگر وہ بغیر صنعتی تعلیم حاصل کیے ناکارہ ہیں اور انکا قحط الرجال ہمیشہ رہے گا۔ سرکاری امداد کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سرکاری ضروریات کے لیے دیسی کارخانوں سے مال خریدا جایا کرے۔ لیکن اب تک اس طرف بظاہر بالکل توجہ نہیں کی گئی۔ اور ان کا غذی گشتیوں کو ماتحتین یعنی محکمہ جات کے افسران اعلیٰ محض رسمی خط و کتابت ہی سمجھا کیے اور در پردہ یوروپین فرموں کو امداد پہونچایا کیے چنانچہ حال کے انڈسٹریل کمیشن کے روبرو میجر مارتاؤم مقام ڈپٹی اسٹور کیپر سرکاری نے نہایت صاف بیانی سے اس امر کو تسلیم کیا اگر باوجودیکہ گورنمنٹ کے احکامات یہ ہیں کہ ہندوستانی ساختہ اشیا کو غیر ملکی اشیا پر ترجیح دی جایا کرے لیکن اصل میں ہوتا یہ ہے کہ بازار میں سامان جہاں ارزاں ملتا ہے وہاں سے خریدا جاتا ہے۔ مسٹر کے۔ سلے پیر بھائی نے بمبئی کی مشہور وسٹرن انڈیا آرمی بوٹ اینڈ اکویپمنٹ فیکٹری کے نمایندے کی حیثیت سے اضطراب افزا تحریری اظہار مسٹر ہالینڈ صاحب صدر انڈسٹریل کمیشن کے روبرو گذشتہ موسم سرما میں دلیرانہ و حقیقت افشا طور پر دیا تھا جسکو بمبئی کرانیکل نے نہایت جسارت کرکے اپنے ۲۰ نومبر کے پرچے میں شایع کرکے اس خفیہ قوم پرورانہ طریق عمل کا کچا چٹھا اہل ملک کے روبرو پیش کر دیا تھا اس سے تو یہ صاف عیاں ہے کہ شملہ کی بلندی سے لیکر اعلیٰ فوجی کوارٹر ماسٹر تک میں یوروپین فرم نوازی کا چلن رائج ہے۔ مسٹر پیر بھائی نے نہایت دریدہ دہنی سے اس طریق عمل پر حرف گیری کی تھی اور شملہ کی اس کلیک (جتھہ) کے قوم نوازانہ طریق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی جسکے باعث کانپور کے مسرز کوپر ایلن کو ۱۲ لاکھ روپیہ پر فوجی سامان چرم کا ٹھیکہ دیدیا گیا تھا حالانکہ مسٹر پیر بھائی کے فرم نے ۱۱ لاکھ سے کم کے ٹنڈر داخل کیے تھے۔ اسکے بعد انھوں نے موجودہ جنگ میں بھی اسی طریق کے برتے جانے کا حوالہ معہ ثبوت کے دیا کہ کانپور کے یوروپین فرموں کو فوجی خیموں کے بنانے کا ٹھیکہ اُنکی استعداد سے زائد دیدیا جاتا ہے اور اُنکے ایسے مشہور فرم کو جہاں سے بعض بعض چیزیں کانپور کے کارخانے والے خود خرید کر خیموں میں لگاتے ہیں اور ہر خیمہ کی قیمت ۱۰ مار چارج کرتے ہیں حالانکہ انکا فرم بجنسہ ویسا ہی مال لگا کر سا مدے ر میں دینے پر آمادہ ہے، نہایت قلیل پیمانہ پر

آرڈر دیے گئے"۔ ان واقعات کو پڑھکر تحریروں تقریروں اور عمل کے تضاد پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ گورنمنٹ کے تاکیدی احکامات ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء کو سرکاری ضروریات میں لانے اور دیسی کارخانہ داروں کو انکا مال خرید کر فائدہ پہونچانے کے برابر جاری ہوتے رہتے ہیں اور قوم نواز فرقہ بیروکریٹ کا تبدیل حالات و واقعات کی انقلاب پذیری کے علی الرغم جو رویہ ڈیڑھ سو برس پیشتر تھا اسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوے ہے: تمام عالم میں ڈیماکریٹک (جمہوری) اصول وخیالات زور پکڑتے جا رہے ہیں اور وہ ہیں کہ از سرتا پا مطلق العنانی میں ڈوبے ہوے۔ پنجاب کے زمانہ شناس اور وہاں کی کاروباری دنیا کے روح رواں لالہ ہرکشن لال نے کمیشن کے روبرو اظہار دیتے ہوے اور بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ دوران تقریر میں انھوں نے کہا کہ "سرکاری افسران وغیر سرکاری افسران میں ایک فوج کی سازش ہندوستانی بنکوں کے خلاف جاری تھی ..... جس وقت پیاپے بنک ٹوٹا ہے اسوقت گورنمنٹ نے ذرا بھی مدد نہیں دی بلکہ بجاے اسکے اور روڑے اٹکانا شروع کیے۔ جائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے رجسٹرار صاحب تو اینگلو انڈین بنکوں کے ہاتھوں میں گویا کھیل رہے تھے ...... حلقہ افسران میں بھی تفریق ذاتی کا خیال موجود تھا۔ جس روز بنک کا دیوالہ نکلا ہے اس روز اینگلو انڈین نہایت محظوظ ہو رہے تھے اور اسی مسرت کے اظہار کے لیے ایک ڈنر بھی دیا گیا تھا"۔ (از بمبئی کرانیکل ۱۲ دسمبر ۱۹۱۷ء)

سچ تو یہ ہے کہ حکومت کی اس قدر غیر التفاتی اور ارباب حل وعقد کی اسدرجہ بے توجہی اور غیر ملکی کارخانہ داروں کے اس قدر معاندانہ رویہ کے ہوتے ہوے ہندوستان کا صنعتی وحرفتی میدان میں ترقی کرنا محال معلوم ہوتا ہے لیکن گورنمنٹ کو ضرور اپنے ذرائع آمدنی کو ترقی دینے کی خاطر ہندی صنعت کو فروغ دینے کی کوشش کرنا چاہیے اور اپنا عملی قدم بہت جلد بڑھانا چاہیے۔ خدا کے فضل وکرم سے ہمارے ملک ہندوستان میں جملہ اقسام اجناس وخام پیداوار وافر طور پر پیدا ہوتی ہیں جن کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں روغنی اجناس کی برآمد پچیس کروڑ ساٹھ لاکھ کی ہوئی تھی۔ روئی کی گانٹھیں وزنی ۶۵ لاکھ ۸۶ ہزار ہنڈریڈ ویٹ (قیمتی ۲۶ کروڑ ۳۱ لاکھ) باہر روانہ کی گئی تھیں۔ چمڑے کی کھالیں (۱۶ کروڑ) ہڈی، سینگ، میگنی وغیرہ کی برآمد بھی بڑے پیمانے پر ہر سال ہوتی ہے۔ ہندوستان کے معدنی ذرائع بھی نہایت وافر ہیں۔ چنانچہ معدنیات کی دونوں قسموں یعنی (metalic اور

(nonmetallic) فلزاتی اور غیر فلزاتی کی کمی نہیں۔ قسم اول میں سونا، چاندی، تانبا، لوہا، جستہ، و میگنیز بکثرت ہندوستان کے مختلف قطعات میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً تانبے کی کانیں ضلع چاندہ اجمیر و راجپوتانہ میں پائی گئی ہیں۔ سیسہ جنوبی ہند اور بلوچستان میں۔ پارہ کنا نور و ٹلچری، ٹین و پلاٹینیم موضع ٹیر گھوٹم، ہزاری باغ، ضلع جموں کے دریائے تیر نوشہرا کے قریب اور میگنیز تو اسقدر صوبۂ متوسط میں حاصل ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی برآمد کا نصف سمجھا جاتا ہے۔ قسم دوم کے بارہ اقسام ہیں (۱) جواہرات (۲) کوئلہ کوک، پٹرولیم گیس (۳) عمارتی پتھر (۴) کنکر (۵) نمک، گندھک، جپسم۔ (۶) آب معدن (۷) اشیاء جو رنگ سازی کے کام میں آتی ہیں مثلاً کھریا و جستہ وغیرہ (۸) سن نما ریشہ دار اشیاء (۹) تیزابی نمک (۱۰) اشیاء مثل کرنج و تانڑہ وغیرہ (۱۱) اریٹھو نما چیزیں مثلاً میکا و دیپ اسٹون وغیرہ (۱۲) متفرقات مثل فلسپار وغیرہ

اگر ہمارے یہاں صنعتی و حرفتی تعلیم کا رواج کافی طور پر ہو جائے اور ابتدائی صنعتی و حرفتی اسکولوں سے لیکر اعلیٰ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ اور پالیٹیکنک کالج قائم ہو جائیں اور گورنمنٹ عملی طور پر اپنا دست امداد اہل حرفہ و کاروباری لوگوں کے لیے بڑھاوے تو اس قسم کے کاموں کے اجرا ہونے سے جنکے لیے سرمایہ کو بڑی مقدار میں فراہم کرنا پڑے گا تاجر سرمایہ داروں، تاجروں اور دستکاروں سب کی روزی کا باب کھل جائے گا اور ملک میں خوشحالی کا پھریرے اور دورہ ہو جائیگا۔ مثلاً تیل، ادویہ تیزابات و عطریات تیار کرنا، وارنش، موم بتیاں، صابون، دباغت، گھڑی سازی، اون، ریشم اور سوت کا صاف کرنا اور رنگنا، چھینٹیں چھاپنا، چاقو، قینچی و استرہ وغیرہ بنانا، پنسل، نب اور چاقو جاسلائی اور کھپرے بنانا۔ یہ اور ذیل کے کاموں کے لیے تو بڑے سرمایہ کی ضرورت بھی نہیں صرف سائنٹفک تعلیم اور دماغ اور ہاتھوں کی باقاعدہ تربیت و تعلیم سے مطلب حاصل ہو سکتا ہے مثلاً برقی روشنی، الکٹروپلیٹنگ اور مٹل اسٹیمپنگ، دودھ جما کر ڈبوں میں بھرنا۔ آموں، لیچیوں اور مچھلیوں کو ڈبوں میں بند کرنا۔ ٹوپیوں کے لیے فلٹ تیار کرنا، تیلوں کو صاف کرنا، کشیدہ کاری، سنگتراشی، جیسی کہ آگرے میں ہوتی ہے، ظروف گلی اور پیتل کے خوشنما ظروف بنانا، بانس کا کام، چوڑیاں، آبنوس، ہاتھی دانت کا کام، تاگا بنانا، ٹائپ ڈھالنا، قفل بنانا، آلات کیمیاوی سائنٹفک سگرٹ، بولٹ و نٹ، برش، چاکلیٹ، پنیر بنانا، مٹھائیاں، چٹنیاں، اچار اور مربے تیار کرنا۔ تصویروں کے چوکھٹے، لالٹینیں اور لیمپ وغیرہ تیار کرنا وغیرہ وغیرہ بھی بہترین پیشے

ملکوں اور قوموں نے ترقی کی ہے ورنہ گلِ بکاولی کا وجود کہاں سے آئے یا الہ دین کا موکل بلا اُسکے چراغ کے کیونکر قابو میں لایا جائے جو دولت سے ملک کو مالا مال کر دے۔ دولت کی دیوی جو لچھمی جی کے نام سے مشہور ہیں اور جنکے درشن کی امید میں دیوالی جگائی جاتی ہے اُسی وقت درشن دیتی ہیں جب ہم اسکے وسیلے سوچتے ہیں اور اُن پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔

اسی گئی گذری ہوئی حالت میں بھی اور مخالفانہ وغیر ہمدردانہ ماحول میں رکر بھی بمبئی کے الیمبک کیمیکل ورکس، بنگال کیمیکل و فارمیسیوٹکل ورکس کلکتہ کے تیزابات و عرقیات کھاگرا (مرشد آباد) کے بل ٹمل اور مدراس کے ایلومونیم کے ظروف۔ الگن ملز (کانپور) پدم دت پانڈے (الموڑہ)، لدھیانہ، مظفر نگر، میو آرٹ اسکول (لاہور) کے اوڑھنے اور بچھانے کے کمل، نارس، جے پور، مرشد آباد، گجرانوالہ پالن پور، براس ورکس، اور مراد آباد کے پیتل کے برتن، بوس کا ٹکری ورکس مظفر پور کے شیونگ برش، یونا ٹمین فیکٹری، نارسی، بمبئی، راجکوٹ، رت نگری کے سینگ تے، بنگلور کے ناریل کے چھلکے کے باسانٹ انڈسٹریز کے ہاتھی دانت، سیپ اور صندل کی لکڑی کے بٹن، مرزا پور، امرتسر، آگرہ، بریلی، سلیم پور کی شطرنجیاں، قالین اور دریاں۔ اسمٰعیل جی انارکلی لاہور اور سیالکوٹ کے، اور ملی بھائی والجی انڈسٹریز (ملتان) کے یہاں کے آفس ودیسک بکس، چاقو اور قینچیاں یونائیٹڈ بنگال کمپنی اور ہیرالڈ ویلش ٹریڈنگ کمپنی کی، وزیرآباد اور بریلی کے سروتے، کرشنا کٹلری ورکس کے قلم تراش چاقو، اور مظفر پور بوس کٹلری ورکس کے استرے تونی (ضلع گوداوری) راجہ فیکٹری کی قینچیاں، ڈاکٹر رمیجا کرراؤ، لکھنؤ، بنگال کیمیکل انڈ فارمیسیوٹکل ورکس کلکتہ وبھارت پرفیومری انڈ کو کی خوشبوئیں اور عطریات بالتخصیص معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ اہل ہند میں ذہانت و چابکدستی فطرۃً ضرور موجود ہے اور ہر قسم کا سامان وہ طیار کر سکتے ہیں اور غیر ملکی مصنوعات کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ انکو بھی ویسے ہی ذرائع حاصل ہو جائیں جو غیر ملکی صناعوں اور اہل حرفہ کو حاصل ہیں۔ حالات موجودہ میں ان ذرائع کا حاصل ہونا جوئے شیر لانے کے ہم معنی ہوگا۔ البتہ اگر دہلی کے ایوان حکومت اور لندن کے قصر ابیض میں ہماری آواز موثر اور طاقت ور بنجائے تو یہ عقدہ حل ہو سکتا ہے مسٹر گوکھلے نے اسی خیال کو ایک بار حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا تھا:-

"تاوقتیکہ ملکی حکومت میں تمہاری آواز زیادہ موثر اور طاقتور نہ بن جائیگی اور تم اپنے معاملات ملکی کے حل کرنے میں زیادہ آزاد نہ بنا دیے جاؤ گے اور محاصلات ملکی تمہارے مشورہ سے اور تمہارے حسب منشا نہ صرف ہوا کریں گے اُسوقت تک تم کسی نوع کی صنعتی ترقی ہرگز نہ کر سکو گے"

ہمکو مسز بیسنٹ کے ۱۰- اکتوبر ۱۹۱۷ء والے الفاظ بھی ابھی تک بھولے نہیں ہیں جو انھوں نے بمبئی کے شنتا رام واڑی میں وہاں کے تجار کے ایڈریس کے جواب میں کہے تھے :-

"آپ کی تجارت اور آپ کا کاروبار اُسوقت تک ہرگز مامون نہیں کہا جا سکتا جبتک کہ آپکو آزادی حاصل ہوجائیگی جبتک کہ آپ لوگ بجٹ (ملکی) پر قابو نہ پالیویں گے، جب تک کہ آپ لوگ ٹیکس عائد کرنے کے خود مجاز نہ بن جاویں گے اور آمدنی کو اپنے حسب منشا صرف کرنے کی اجازت نہ پا جاویں گے + . . . + جسوقت آپ لوگوں کو ہوم رول عطا ہو جاویگا تو اُسوقت ضرر رساں قوانین کو آپ مسترد کر سکیں گے اور جو غیر واجبی فضلیت غیر ملکیوں کو حاصل ہے وہ کم ہو جاوے گی"

عزیزؔ اسیونی

اَلمُلکُ لِلّٰہ

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بنگاہِ خرد خطاست

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟
ترکِ سبب[1] ز روئے شریعت کجا روا ست؟

خندید و دستِ خویش بشمشیر بُرد و گفت
ہر مُلک مُلکِ ما ست کہ مُلکِ خدائے ما ست

اقبال

سلہ ترک اسباب جہاں لائق شرح عقائد نسفی

سردار عثمان

بانیٔ دولت عثمانیہ

(ماخوذ از آٹومن ٹرک، مصنفۂ وان ہمر)

ارل طغرل کا بیٹا اور سردار سلیمان شاہ کا پوتا تھا۔ یہی ثانی بادشاہ سلطنت عثمانیہ کا بانی اور اُسکا پہلا فرماں روا تھا۔ ارل طغرل نے اپنے کارہائے نمایاں کے صلہ میں جو سلطان علاء الدین سلجوقی کے نائب ہونے کی حیثیت سے انجام دیے تھے ایک بڑا زرخیز علاقہ وسط ایشیائے کوچک میں حاصل کیا، جو اسکیچر کا علاقہ کہلاتا تھا۔ ایک عظیم الشان معرکہ کی یادگار ہیں جو یونانیوں اور مغلوں سے بروسا اور سیچر کے درمیان ہوا اور جس میں ارل طغرل ظفرمند رہا علاء الدین سلجوقی نے اس علاقہ کا نام سلطان اونی (محاذ سلطانی) رکھا اور ارل طغرل کو بطور جاگیر کے عطا فرمایا۔ اس صوبہ میں کثرت زرریز میدان، اور پہاڑی ڈھلوان پر سیکڑوں سرسبز چراگاہیں اور انگورستان تھے اسکے میدانوں کی زرخیزی، زمردیں سرسبزی وشادابی، قدرتی مناظر کی دلفریب خوبی آج تک سیاحوں کو محو حیرت کردیتی ہے۔

ارل طغرل (صحیح لقب) جب تک زندہ رہا اُس نے ہمیشہ اپنے آپ کو سلطان علاء الدین کا ماتحت ہی ظاہر کیا۔ لیکن زمانے نے پلٹا کھایا اور سلطان کی وفات کے بعد اُسکے نامور فرزند عثمان نے ماتحتی کا جُوا کندھے سے اُتار پھینکا اور اپنے آپ کو ایک آزاد حکمران بنا لیا۔ طغرل، سلطان سے قبل ہی اس دار فانی سے رخصت ہوچکا تھا۔ اب عثمان کی جنگجو اور بہادرانہ طبیعت کی جولانی کے لیے میدان کُھلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے علاقہ کی وسعت کے لیے بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ معرکے سر کیے۔ اور حدود کو روز افزوں ترقی دینی شروع کی۔ اگرچہ وہ پہلے ہی سے اپنی قوم کا ایک دلیر، ہوشمند، بہادر اور بیباک شجیع جوان تھا۔ اور جسکے باعث اُس نے ایک خاص امتیاز اپنے ہمسر سرداروں میں حاصل کرلیا تھا۔ لیکن اب وہ خودمختار بادشاہ کی حیثیت سے تاج شاہی سر پر رکھکر چوبیس برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوہ فگن ہوا۔

اسکی شادی ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جس کا بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ شیخ ادہ بالی، جو ایک برگزیدہ اور متبرک باخدا بزرگ تھے۔ علاقہ اسکیشہر کے قریب ایک گاؤں اتیونی میں سکونت پذیر تھے۔ انکا علم و تورع، زہد و تقویٰ اور بزرگی کا دور دور شہرہ تھا اطراف وجوانب سے لوگ انکی زیارت کرنے اور برکت لینے کیلئے آتے۔ یہی عقیدت مندی عثمان کو بھی ان بزرگ کی خدمت میں لے جاتی۔ روزمرہ کی حاضری میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ عثمان کی نظر شیخ کی مہ جمال لڑکی ملکہ خاتون پر پڑگئی۔ دل و جان سے شیدا ہوگیا۔ شان ارادت مندی میں عشق و محبت کی چاشنی کی آمیزش ہوگئی۔ ایک دفعہ موقع پاکر عثمان نے شیخ ادہ بالی سے اظہار محبت بھی کیا۔ لیکن شیخ نے یہ کہکر کہ وہ انکا ہم رتبہ نہیں ہے، شادی سے انکار کردیا۔ ظاہر ہے جو مایوسی عثمان کو شیخ کے اس جواب سے ہوئی ہوگی۔ لیکن محبت کا دھنی پامردی سے میدان محبت میں جما رہا۔ شیخ کے اس آرزو شکن جواب نے نہ اسکے عزم و استقلال اور ثابت قدمی میں ذرا کمزوری نہ پیدا کی رفتہ رفتہ شیخ کے دل پر اسکے قوت و ثبات کا اثر ہوا اور ایک عجیب خواب نے جسکی تعبیر خود شیخ نے بتائی دونوں دل فگان محبت کو ہمیشہ کے لیے ملادیا۔ ایک رات عثمان شیخ کا مہمان تھا۔ ہجوم مایوسی و محرومی اور اپنی محبوبۂ دلنواز کے تصور محویت میں اسکی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ شیخ ادہ بالی کے قریب سو رہا ہے۔ دفعتاً شیخ کے سینۂ فیض گنجینہ سے ایک چمکیلا چاند نکلا اور عثمان کے سینے میں اترکر غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں اسکے سینے سے ایک درخت نکلا جو نہایت خوبصورت اور پائدار معلوم ہوتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی مضبوط شاخیں و پتے، اور اس کی روح افزا سبزی کا سایہ دنیا کے تین حصوں پر محیط ہوگیا۔ اسی درخت کے نیچے چار عظیم الجثہ پہاڑ اس زمردیں سبز پتوں کے گنبد کو چار مضبوط ستونوں کی طرح سہارا دیے ہوے ہیں۔ یہ پہاڑ کوہ اطلس کوہ قاف، ٹارس، ہمیس، ہیں۔ درخت کی جڑوں سے چار دریا دجلہ، فرات، ڈینوب، نیل، رواں ہیں۔ اور جن میں بیشمار چھوٹے بڑے جہاز چل رہے ہیں۔ پہاڑی نشیب و فراز بلند تناور درختوں و سرسبز جھاڑیوں اور گلاب کے پھولوں سے ڈھکے ہوے ہیں۔ کھیتیاں اناج کی کثرت سے شمار و قطار سے باہر ہیں۔ وسیع میدانوں میں پرجلال شہر آباد ہیں جنکے گول گنبد۔ مینارے۔ اور برج جن پر ہلال درخشاں ہے بہت ہی پرشوکت معلوم ہوتے ہیں۔ مساجد سے موذنوں کی دلی

ہلا دینے والی آوازیں بلند ہیں - ہزاروں عندلیب اور رنگا رنگ کے خوش الحان پرند اور اُنکا شور و غوغا عجیب لطف دے رہا ہے - اُس درخت کی گنجان شاخوں میں سیکڑوں طرح کی پردار مخلوق چہچہا رہی ہو درخت کا ہر پتہ خنجر آبدار کی طرح ہے - یکایک تیز ہوا نے پتوں کو جنبش دی اور اُن خنجر نما پتوں کا رخ دنیا کے بہت سے شہروں کی طرف اور بالخصوص قسطنطنیہ کی جانب پھیر دیا - یہ رشکِ بلاد شہر قسطنطنیہ جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے درمیان واقع تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاتم سلطنت میں دو زمردوں کے درمیان ایک چمکدار ہیرا ہے - عثمان اس خاتم کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی -

اُس نے اپنا خواب شیخ کے سامنے دوہرایا اور تعبیر چاہی - اوبالی مسکرایا اور سمجھ گیا کہ اُسکے سینے سے نکلنے والا چاند خود اُسی کی بیٹی ملکہ خاتون ہے اور عثمان کے سینے سے نکلنے والا درخت اُسکی ذی اقتدار اولاد ہے جو ابرِ باد کی طرح دنیا پر مسلط ہو جائے گی اور زمامِ حکومت اپنے قبضۂ قدرت میں لیگی - اب جبکہ قدرت ہی کی طرف سے سامان ہو رہے تھے اوبالی نے زیادہ مخالفت لاحاصل سمجھی - اور عثمان کا نکاح مہ جمال ملکہ خاتون سے کر دیا -

ترکی مورخین اس خواب کو جو کبھی اُنکے بانیِ سلطنت سردار عثمان نے دیکھا تھا بڑی مسرت سے دوہراتے ہیں اور اُسکا بڑا پاس و لحاظ کرتے ہیں -

ہمارے ایشیائی مورخین نے سردار عثمان کے حسن صورت اور بہادرانہ زندگی کی بڑی تعریف لکھی ہے - واقعی اُس میں حیرت خیز قوت و سطوت تھی - اُسکے لمبے بازو جب وہ کھڑا ہوتا تو گھٹنوں تک پہونچتے - اپنے عہد جوانی میں وہ اپنے سیاہ بال، سیاہ داڑھی اور سیاہ ابرو کے باعث قرا یعنی سیاہ مشہور تھا - اور یہ خطاب اُس شخص کو ملتا ہے جو مردانہ خوبصورتی میں اعلیٰ پایہ رکھتا ہو -

عثمان کا لباس بالکل سادہ اور اُس زمانے کے سچے مسلمان بہادروں کی طرح لمبی چوڑی آستینوں کا ڈھیلا ڈھالا تھا - وہ ایک سرخ رنگ کی کلاہ پر سفید دستار باندھتا تھا - یہی اُس زبردست شخص کا حلیہ ہے کہ جو حسین مہ جبین ملکہ خاتون کا دلدادہ اور سلطنت عثمانیہ کا اول فرماں روا تھا اور جسکی اولاد اب تک تختِ عثمانی پر حکمراں ہے -

اب اس سردار کا مستقل دورِ حکومت شروع ہوا - اُسکے علاقے کے حدود سلطانِ اونی تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اُس نے اپنی قوتِ بازو سے یونانیوں کے بہت سے قلعے متعدد صوبے اپنی چھوٹی

سی سلطنت میں ضم کر لیے ۔ آخر تیرھویں صدی میں اُسکی حکومت کا دائرہ شمال مغرب میں نیسیجر تک پہنچ گیا جہاں سے مشہور شہر بروسا اور نیس کچھ زیادہ دور نہ تھے اور جن کا حاصل کرنا عثمان کا خاص نصب العین تھا۔

۱۲۹۰ء سے ۱۲۹۹ء تک وہ اپنی سلطنت میں پر امن وامان حکومت کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اُسکو بہت سی لڑائیاں اپنے ہمسر ترکی سرداروں سے جو اُسکی ترقیوں پر حاسدانہ نظر ڈالتے تھے، لڑنی پڑیں۔ لیکن اُس نے اپنی بے جگرانہ شجاعت دبسالت اور دانشمندانہ حکمت عملی سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے حریف کے قتل و غارت کے لیے کمزور نہیں ہے۔ ان چھوٹی جنگوں سے اُسکو یہ فائدہ پہونچا کہ بہت سے علاقے اور اُنکی نئی رعایا عثمان کے ظل حمایت میں آگئی۔ جسکو وہ منصف مزاج، سچا بہادر، پابند قانون اور ٹھیک فیصلہ کرنے والا خیال کرتے تھے۔ رعایا کے دلوں میں انہی صفات کے باعث عثمان کی بڑی عزت تھی۔ اُسکا دائرۂ حکومت مسلمان، عیسائی، یہودی، غرض یہ کہ سب کی حفاظت جان و مال کے لیے یکساں مشہور تھا۔

ایشیائی بادشاہوں کے نزدیک شان و اقتدار کی جو سب سے بڑی علامت ہے وہ اُسکے نام کا خطبہ اور سکہ ہے۔ عثمان بھی اس جذبہ سے معرّا نہ تھا چنانچہ ۱۲۹۹ء میں اُس نے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ ملک میں جاری کیا۔ آل سلجوق کا آخری فرماں روا سلطان علاؤالدین سلجوقی اپنی قبر میں پاؤں پھیلائے بآرام سو رہا تھا۔ اُس نے جس قدر سلوک ارل طغرل اور اُسکی اولاد کے ساتھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ایشیائے کوچک کے سارے حکمراں سرداروں پر بجز حاکم قرامانیہ کے عثمان کو فوقیت حاصل تھی۔ اگرچہ ایک بہت بڑی جنگ قرامانیہ کے شہزادوں اور عثمان سے ہوئی اور مدت تک اسکے مرنے کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن قرامانی شہزادے اس پُر قوت سردار سے نہ جیت سکے۔ حالانکہ عثمان کی تمام تر توجہ ان قرامانی میدانوں کی طرف نہ تھی۔ اسلیے کہ وہ شمال شرقی علاقہ کو جو بہت ہی دولت زا اور زرخیز تھے حرص و آز کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اور اُسکی زبردست کشش عثمان کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ چنانچہ اُسکی عمر کے آخری چھبیس سال یونانیوں ہی کے مقابلہ اور فتوحات میں گذرے۔

۱۲۹۹ء میں اُس نے ایک کونسل اس غرض سے جمع کی کہ وہ اُن سے یونانی مضبوط قلعہ کوپر حصار پر حملہ کرنے کی رائے لے۔ تو اُسکے بوڑھے چچا دندار نے جو اب تک زندہ تھا اس رائے سے مخالفت

کی اور کہا کہ اگرچہ یہ مہم عالی حوصلہ ہے لیکن قرب و جوار کے یونانی و ترک حاکموں کے بالاتفاق گڑ جانے کا سخت خطرہ ہے جس سے ہمارے قومی شیرازہ کو سخت صدمہ پہونچے گا۔ عثمان کے بعض شیر افسروں نے بھی بوڑھے دندر کی رائے سے اتفاق کیا اور اس پُرخطر مہم سے کچھ متامل معلوم ہوئے۔ یہ افسردہ کُن دور اندیشی عثمان کو ناگوار گذری اور اس اندیشہ سے متاثر ہوکر کہیں ساری فوج پر اُسکا اثر نہ پڑے اُس نے نہایت بیرحمی سے بوڑھے چچا کو تیر سے مار ڈالا۔ اس خونخواری نے سارے اختلافات کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا اور یہا دے عثمان کے دامن نیکنامی پر یہ بدنما دھبہ ابدالاباد تک باقی رہ گیا یہ بہت ہی مہیب اور عبرت خیز مشاہدہ تھا۔ اب کسی کو ہمت نہ تھی کہ ایسے سخت و مستقل الرائے حاکم سے مخالفت کا خیال بھی دل میں لائے۔

عثمان نے آخر کو پری حصار پر حملہ کر ہی دیا۔ اور جیت لیا۔ بہت سے اور مضبوط قلعوں کو جو الس کے اطراف واکناف میں تھے سر کرلیا۔ اوائل ۱۳۰۱ء میں ایک تجربہ کار و باقاعدہ یونانی فوج سے جو سردار میرزوس کے (شہنشاہ قسطنطنیہ کی اردلی فوج کا افسر تھا) زیر کمان تھی۔ عثمان کو نکومیدیا کے قریب کیون حصار کے میدان میں جنگ کرنی پڑی۔ فتح و ظفر اُسکے قدموں کے ساتھ یہاں بھی تھی۔ عثمان اس معرکے میں بھی مظفر و منصور رہا اور چھ سال تک کامیاب جنگوں اور تہلکہ انداز حملوں سے بڑے بڑے قلعوں پر تسلط جماتا نکومیدیا کے محکم شہروں کو یونانیوں سے چھینتا ہوا اپنے حدود سلطنت کو بحیرۂ اسود تک بڑھا لیگیا۔

قسطنطنیہ کا دربار اس جری دشمن کے نہ رکنے والے پیاپے کامیاب حملوں کو خوف و ہراس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسکے مشیر دن رات عثمان کی طاقت کو گھٹانے اور نقصان پہونچانے کے لیے گھات میں لگے رہتے۔ سب سے پہلی کارروائی دربار قسطنطنیہ نے یہ کی کہ مغلوں کو بھڑکا کر اور شبخون و غارت گری کے لیے اُکسا کر عثمانی سلطنت کے جنوبی حدود پر حملہ کر دیا۔ لیکن جیسا کہ شاہنشاہ کا خیال تھا وہ پورا نہ ہوا۔ کیونکہ عثمان کے نوعمر شہزادے آرخان نے ایک ہی ٹکر میں مغل حملہ آوروں کو تہس نہس کر دیا۔

اب جری و طاقتور عثمان کا بڑھاپا شروع ہوا اور فوج کی سپہ سالاری اُسکے جانباز ہونہار دلیر فرزند آرخان نے سنبھالی۔

باپ کی سی اُولوالعزمی اور پامردی سے اُس نے ۱۳۲۶ء میں شہر بروسا پر حملہ کرکے عثمانی قلمرو میں شامل کر لیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نامی گرامی فتح کی جس نے آرخاں کی بہادری و جنگ آزمائی میں چار چاند لگا دیے تھے بالکل خوشی نہ ہوئی۔ اسواسطے کہ اُسکا باپ عثمان شہر سند رد میں جو ارل طغرل کے مقبوضات کا ثمر اولیں تھا، مرض الموت میں مبتلا تھا۔ اگرچہ یہ خوشخبری اُسنے سُن لی اور نوجوان بہادر سورما کو مرحبا بھی کہا۔

اب اُسکی وفات کا وقت بالکل قریب آگیا۔ اُس نے اپنے دونوں بیٹوں آرخاں و علاؤالدین کو جو ملکہ خاتون کے بطن سے تھے مع چند آزمودہ کار افسروں اور مشیروں کے طلب کیا۔ جب سب جمع ہوگئے تو اُس نے آرخاں کی طرف متوجہ ہوکر کہا: "بیٹا۔ میرا وقت اب بالکل قریب ہے لیکن مجکو اپنے مرنے کا ذرا تاسف ورنج نہیں ہے۔ کیوں؟ اسلیے کہ تجھ جیسا جانشین میرے بعد تخت حکومت پر قدم رکھیگا۔ دیکھو منصف مزاجی، رحمدلی کو اپنا شعار بنانا۔ سب کے ساتھ مساوات و یکسانیت کا برتاؤ رکھنا۔ رعایا کے جذبات کا دل سے خیال رکھنا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ طرز کو ملک میں قوم میں رواج دینا۔ اگر ایسا کروگے جو تمھارا فرض ہے تو خدا کی قربت حاصل ہوگی اور بادشاہوں کے یہی کام ہیں۔" اُسکی آخری وصیت یہ تھی کہ وہ شہر بروسا میں دفن کیا جائے اور آرخاں اُسکو اپنا پایہ تخت بنائے۔ چنانچہ اُسکی وصیت پر پورا پورا عمل کیا گیا۔ اور ایک عالیشان مقبرہ اُسکی آخری آرامگاہ کے لیے تعمیر کیا گیا لیکن افسوس ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ آگ سے بالکل برباد ہوگیا۔ ترک اب تک سردار عثمان کا ادب کرتے ہیں اور اُسکا علم و تلوار جو آج تک خزانہ میں محفوظ ہے ہر عثمانی سلطان اپنی تخت نشینی و تاجپوشی کے وقت اُس تلوار کا کمر سے باندھنا اپنا فخر سمجھتا ہے۔ عثمان اپنی غیر متزلزل ہمت، بلند نظری، دوربینی اور مستقل قوت فیصلہ کے باعث اپنی قوم میں ہر دلعزیز سردار اور اُس فاتح خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ اگر اُسکا ہاتھ اپنے بوڑھے چچا کے خون سے نہ آلودہ ہوتا تو وہ ہیشل رحمدل اور فیاض مشرقی بادشاہ تھا۔ آلِ عثمان ابھی تک اُسکی یاد دلوں میں رکھتے ہیں۔ ہر سلطان کی تاجپوشی کے وقت یہ فقرہ ضرور کہا جاتا ہے کہ:-

"خدا کرے وہ بھی ایسا ہی نیکدل۔ فیاض و بہادر ہو جیسا کہ عثمان تھا۔"

لے۔ ایچ محتاج

ترجمۂ رباعیاتِ خیام

(بسلسلۂ الناظر ماہ مارچ ۱۹۱۸ء)

(۱۴)

این کوزہ چو من عاشقِ زارے بودست　　در بندِ سرِ زلفِ نگارے بودست
این دستہ کہ در گردنِ او مے بینی　　دستے ست کہ در گردنِ یارے بودست
یہ کوزہ بھی مجھ سا کوئی بیمار رہ ہوگا　　اسکو بھی اسی عشق کا آزار ہوگا
دستہ نہیں کوزے کا وہ ہاتھ اسکا ہے (ترجمہ) جو گردنِ جاناں میں کبھی ہار رہا ہوگا

(۱۵)

اے دل ز غبارِ جسم اگر پاک شوی　　تو روحِ مجردی بر افلاک شوی
عرش ست نشیمنِ تو شرمت بادا　　کائی و مقیمِ خطۂ خاک شوی
اے دل جو غبارِ جسم سے پاک ہو جائے　　اک دم میں ابھی بر سرِ افلاک ہو جائے
ہے شرم کی بات ہو کے تو عرش نشیں (ترجمہ) آئے اور مقیمِ خطۂ خاک ہو جائے

(۱۶)

این دہر کہ بود مدتے منزلِ ما　　نامد بجز از بلا و غم حاصلِ ما
افسوس کہ حل نگشت یک مشکلِ ما　　رفتیم و ہزار حسرت اندر دلِ ما
اس دہر جہاں عمر ہوئی ایک بسر　　پایا نہ بجز رنج و بلا کچھ بھی ثمر
مشکل نہ ہوئی کوئی بھی حل اس جا پہ (ترجمہ) چلتے ہوئے ارمان ہزاروں لے کر

(۱۷)

چون حاصلِ آدمی دریں شورستان　　جز خوردنِ غصہ نیست یا کندنِ جان
خرم دل آنکہ زیں جہاں زود برفت　　آسودہ کسے کہ خود نیامد بجہان
حاصل ہے جہان میں یہ انسان کے لیے (ترجمہ) غصے کو پیے یا کاہشِ جان سے

اچھے ہیں جو چلے گئے یہاں سے جلدی — آئے جو نہیں یہاں بہت خوب رہے

(۱۸)

زاں پیش کہ غمہات شبِ خوں آرند — فرمائے کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نۂ اے عاقلِ ناداں کہ ترا — در خاک نہند و باز بیروں آرند

قبل اسکے ہجوم غم کرے کام تمام — فرما کہ چلے بادۂ گلفام کا جام
تو زر نہیں اے عاقلِ ناداں کہ تجھے — (ترجمہ) دفنائیں ابھی خاک میں پھر لائیں کام

(۱۹)

تا کے ز غمِ زمانہ محزوں باشی — با چشمِ پُر آب و دلِ پُر خوں باشی
مے نوش و بعیش کوش و خوشدل می باش — زاں پیش کزیں دائرہ بیروں باشی

کب تک غم دنیا سے رہے گا محزوں — با چشمِ پُر آب و با دلِ پُر خوں یوں...
پی مے اور گذار عمر با عیش و نشاط — (ترجمہ) اب تک کہ ہوا اس دائرہ سے تو بیروں

(۲۰)

مے خور کہ بزیرِ گِل بسے خواہی خفت — بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت
زنہار بکس مگو تو ایں رازِ نہفت — ہر لالہ کہ پژمردہ نخواہد بشگفت

مے پی لے کہ سونا ہے بہت زیرِ زمیں — مونس کوئی ہوگا نہ جہاں دوست قریں
... از کسی غیر سے کہنے کا نہیں — (ترجمہ) ہر لالۂ پژمردہ بھی کھلتا ہے کہیں

(۲۱)

من ہیچ ندانم کہ مرا آنکہ سرشت — از اہلِ بہشت کرد یا دوزخِ زشت
قوتے و بتے و بادۂ بر لبِ کشت — ایں ہر سہ مرا نقد ترا نسیہ بہشت

کچھ بھی نہیں معلوم مجھے حالِ سرشت — جنت مری قسمت میں ہے یا دوزخِ زشت
قوت و بت و بادۂ لبِ سبزہ زار — (ترجمہ) کافی ہیں سبھے مجھے تجھے مبارک ہو بہشت

(۲۲)

کم کن طمع از جہان می زی خورسند — وز نیک و بدِ زمانہ بگسل پیوند

مے بر کفِ زلفِ دلبرے گیر کہ زود — ہم بگذرد و نماند ایں روزے چند
رہ چین سے دنیا کی طمع کم کر دے (ترجمہ) اور نایاب و بر نہ مانہ سے بھاگ پرے
لے ہاتھ میں جام زلفِ دلبر کو لیے — ہے وقت ابھی وگرنہ یہ دن بھی چلے

(۲۳)

ایں قافلۂ عمر عجب می گذرد — دریاب دمے کہ با طرب می گذرد
ساقی غمِ فردائے حریفاں چہ خوری — درده قدحِ بادہ کہ شب می گذرد
قافلۂ عمر عجب گذرے ہے — کس دھوم سے یا عیش و طرب گذرے ہے
ہوگا غمِ دنیا سے غرض کیا ساقی (ترجمہ) دے بھی قدحِ بادہ کہ شب گذرے ہے

(۲۴)

از خالقِ کردگار و از ربِّ رحیم — نومید مشو بجرمِ عصیانِ عظیم
گر مست و خراب مردہ باشی امروز — فردا بخشد بر استخوانہائے رمیم
رحمان ہے و رحیم ہے ذات اُسکی — مایوس گناہوں سے بشر ہو نہ کبھی
گر مست و خراب آج مر جائے گا (ترجمہ) کل دیکھنا ہڈیوں پہ بخشش ہوگی

(۲۵)

با دشمن و دوست فعل نیکو نیکوست — بدکے کند آنکہ نیکیش عادت و خوست
با دوست چو بد کنی شود دشمنِ تو — با دشمن اگر نیک کنی گردد دوست
نیکی کا ہر ایک سے ہے کرنا اچھا — کر تو نہ بدی وہ گو ہو دشمن ہی ترا
ہو جائے گا دوست بھی بدی سے دشمن (ترجمہ) دشمن نیکی سے دوست بن جائے گا

(۲۶)

با مردمِ پاک اصل و عاقل آمیز — وز نا اہلاں ہزار فرسنگ گریز
گر زہر دہد ترا خردمند بنوش — ور نوش رسد ز دستِ نا اہل بریز
عاقل ہیں جو لوگ اُن کی صحبت میں رہے — بچتا رہے دُور دور نا اہلوں سے
دے زہر عقلمند تو پی لے خوش خوش (ترجمہ) نا اہل جو شربت بھی اگر دے تو نہ لے

(۲۷)

هر جا که گلے و لاله زارے بودست — از سرخیِ خونِ شہریارے بودست
هر شاخِ بنفشه کز زمیں می روید — خالے ست که بر رخِ نگارے بودست

(ترجمہ)
کھلتے ہیں جو سامنے گلِ لالہ کے — ہیں سرخیِ خون سے شہِ والا کے
جو پھول ہیں شاخ پر بنفشے کے لگے — یہ خال ہیں یار کے رخِ زیبا کے

(۲۸)

هر سبزه که بر کنارِ جوئے رُستست — گوئی ز لبِ فرشته خوئے رُستست
تا بر سرِ سبزه پا بخواری ننهی — کاں سبزه ز خاکِ لاله روئے رُستست

(ترجمہ)
[illegible] پہ [illegible] دریا سبزہ — کہتا ہے یہ پاکیزہ زیبا را سبزہ
[illegible] پہ قدم بذلت و خواری سے — سبزہ ہے یہ خاکِ ماہ رو کا سبزہ

(۲۹)

با تو بخرابات اگر گویم راز — به زانکه بمحراب کنم بے تو نماز
اے اول و اے آخر خلقاں همه تو — خواهی تو مرا بسوز خواهی بنواز

(ترجمہ)
بہتر ہے خرابات میں پھر تجھ سے ساز — اس سے کہ ہو محراب میں بے تیرے نماز
اے ساری خدائی کے خداوندا خدا — خواہ جھونک جہنم میں مجھے یا کہ نواز

(۳۰)

در مدرسه و صومعه و دیر و کنشت — ترسنده ز دوزخ اند و جویائے بہشت
آنکس که ز اسرار خدا باخبر است — زیں تخم در اندرون دل ہیچ نکشت

(ترجمہ)
دوزخ سے ہر ایک کو لرزتا دیکھا — جنت کا طلبگار زمانا دیکھا
دیکھا ہر پھر کے دیر و کعبہ سب کچھ — پر کوئی نہ معرفت کا جویا دیکھا

(باقی آئندہ)

سید لطف علی ناگرامی

شاہ دولہ کے چوہے

پنجاب کے بعض اضلاع میں خصوصاً طبقۂ غربا میں چند ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جنکے مختصر سر دونوں طرف سے چپٹے اور کان غیر معمولی بڑے بڑے اور سامنے کی طرف نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے چوہے کی تشبیہ اُنپر صادق آتی ہے۔ انھیں ایک خاص بزرگ کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کی وجہ آگے چل کر بیان کی جائیگی۔ انکے حالات کو اس جگہ مختصراً سپرد قلم کرنا دو وجوہ سے قابل دلچسپی سمجھا گیا ہے اولاً ہم یہ دیکھیں گے کہ انسان کا کاسۂ سر چھوٹا ہونے سے اُسکی دماغی کیفیات ہوش و حواس میں کتنا عظیم تغیر واقع ہو جاتا ہے ثانیاً ہمیں یہ بھی ثابت ہوگا کہ توہمات عامہ ایک قدرتی مظاہرہ کو کس عجیب و غریب طریقے سے بعض روحانی تصرفات کا نتیجہ سمجھکر قبر پرستی شروع کردیتے ہیں جسکا اثر ہماری سوسائٹی کی تربیت خیالات و افعال پر جو کچھ ہے اظہر من الشمس ہے۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ شاہ دولہ کے چوہوں کی شکل و شباہت ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہوتی ہے۔ انکے قد عموماً چھوٹے ہوتے ہیں۔ کان بڑے۔ اور سر بلحاظ قامت نہایت چھوٹا اور ناموزوں۔ کھوپڑی کا دَور اگر ایک فیتہ سے ناپا جائے تو دراںحالیکہ ایک معمولی عقل والے بالغ شخص کا ۲۰ انچ سے کم نہ ہوگا۔ ان کا صرف ۱۳ انچ یا اس سے بھی کچھ کم نکلتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسکا محدب پن یا اُبھار کم ہو جانے کی وجہ سے وہ دو طرفہ چپٹا سا ہو جاتا ہے جس سے انکا چہرہ عجیب کھا سا کھا اور مختصر سا نظر آتا ہے۔ لیکن اُس سے حماقت نہیں برستی بلکہ چالاکی اور سیانے پن کا دھوکا ہوتا ہے انکی ناک اور نقشہ کی ترتیب میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ بالوں اور دانتوں کے نکلنے میں بھی کوئی نقص نہیں۔ تالو بھی شکل دوسرے احمقوں کے معمول سے بہت اونچا نہیں ہوتا۔ فقرات ظہر بھی سالم و غیر مبدل نظر آتے ہیں۔ قوائے باصرہ۔ لامسہ و شامہ میں بھی کسی قسم کا عیب نہیں پایا جاتا۔ ہاں البتہ سماعت و گویائی ایک تہائی سے کچھ زیادہ میں مفقود یا کالعدم ہوتی ہے اور ہر ایک کے قوائے ادراکیہ۔ ممیزہ۔ و متخیلہ میں کچھ نہ کچھ فتور ظاہر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جو گویائی کے قابل ہیں وہ بھی سلسلۂ گفتگو کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے اور معمولی سی بات تک کا اس طرح اُلجھاؤ کے ساتھ اور رُک رُک کر جواب دیتے ہیں کہ

انکی عقل و ذہن کے ناقص ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال کیا جائے کہ شاید یہ انکی تربیت کا قصور ہو لیکن تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ انکو خواہ کتنا ہی سکھانے پڑھانے کی کوشش کی جائے لیکن سوا سے نہایت آسان اور معمولی باتوں کے وہ اور کچھ سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے۔ اور روزمرہ زندگی کے کام کاج میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ظاہر کرتے۔ انکی یہ عادت ہے کہ گھنٹوں ایک ہی جگہ چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب کسی نے آکر زور سے ہلایا تو ادھر ادھر تاکنے لگتے ہیں۔ کسی نے کچھ کرنے کو کہا خواہ وہ کیسا ہی حکم ہو لیکن اسکی تعمیل انکا فرض۔ کوئی انکی گٹھری تک اٹھا کر لیجائے تو انھیں کچھ پرواہ نہیں۔ جن دونوں باتوں سے ظاہر ہے کہ تمیز نیک و بد و تحفظ ذاتی کا احساس ان میں کسقدر کم ہے۔ علیٰ ہذا، خواہشات و جذبات بھی نہایت محدود رکھتے ہیں۔ ذوق و شوق سے بھی طبیعت خالی ہے چنانچہ انکی عورتوں میں زیورات اور اچھے کپڑوں کی محبت جو عام طور سے فرقۂ اناث کا خاصہ ہے سراسر مفقود نظر آتی ہے۔ مگر بچوں یا اُن لوگوں سے جو مہربانی کے ساتھ پیش آئیں مو انست و الفت کا اظہار کرتے ہیں۔ قوت حافظہ گو ضعیف ہے لیکن معدوم نہیں۔ اسلیے آسان اور سادی سادی باتیں سکھانے سے کبھی سیکھ بھی جاتے ہیں۔ مثلاً کپڑوں کو صاف رکھنا، کھانا پکانا، اور تھوڑی سی گنتی گن لینا وغیرہ وغیرہ۔ مزید براں انکے مزاج میں مار دھاڑ یا چیزوں کو برباد کرنے کی خو بالکل نہیں ہے۔ نہ انکو مرگی کے حملے ہوتے ہیں نہ وہ دیوانوں کی طرح واہی تباہی بکتے ہیں۔ اسلیے انکو پاگل سمجھنا سخت غلطی ہے بلکہ صرف بے وقوف و کم عقل سمجھنا چاہیے۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ کاسۂ سر قدرتی طور پر اس قدر چھوٹا ہے کہ دماغ اُسکے اندر پورے طور سے نشو و نما نہیں پا سکتا۔ اسی بنا پر بعض لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ ایک لوہے کا شکنجہ صغر سنی میں انکی کھوپڑی میں لگا کر مصنوعی طور سے اُسے چھوٹا رکھا جاتا اور بڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن متعدد شہادات و امتحانات کے بعد یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیان سراسر غلط ہے۔ کیونکہ نہ تو انکے سر میں کہیں کجی ہے نہ دھنسا ہوا کوئی نشان ہے جو دبائے جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ درانحالیکہ جنوبی امرکہ کے باشندوں میں جہاں یہ طریقہ مروج ہے ایسے نشان صاف طور سے نظر آتے ہیں۔ الغرض "چوہوں" کی تصغیر راس کو قدرتی اور پیدایشی سمجھنا چاہیے۔ جسکا اثر صرف قوائے دماغی پر پڑتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انکی عمریں بھی بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ بلوغ سے آگے بڑھکر زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آج تک کسی نے انکو پیر کہن سال ہوتے نہیں دیکھا۔ اب ملاحظہ ہو کہ شاہ دولہ کے نام سے انھیں کیا نسبت، اور اُنکے مزار سے انکا کیا تعلق ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ بزرگ عہد اکبری میں بڑے اولیائے کرام میں سے تھے۔ سنہ ۱۶۱۲ء سے سنہ ۱۶۷۶ء تک حین حیات رہے۔ اور قریب ۲۲ سال کے سیالکوٹ میں بخیر و خوبی قیام پذیر ہو کر گجرات تشریف لائے۔ جہاں وصال ہوا۔ اور جہاں آپ کا مزار آج تک مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ علاوہ زہد و تقوٰے کے چند اور صفات بھی انکی ہردلعزیزی کا باعث ہوئے تھے وہ بہت بڑے فیاض، سیرچشم و ہمدرد خلائق تھے چنانچہ بکثرت کنوئیں، تالاب، نہریں، پُل اور رستے اپنے ہی پاس سے زر کثیر صرف کر کے بنوا ڈالے متعدد خانقاہیں اور لنگرخانے کھولے جہاں بھولے بھٹکے مسافر یا غربا کچھ دن آرام کے ساتھ بسر کر سکیں مگر خاصکر انکو ناداریتیموں اور ایسے بچوں سے بڑی محبت تھی جو بوجہ کسی نقص جسمانی یا دماغی کے اپنی خبرگیری نہیں کر سکتے اور جنہیں اُن فاترالعقل اور پیدائشی احمقوں کا بھی شمار ہو سکتا ہے جنکا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے انکو انکے والدین دور دور سے آپ کے پاس لاتے ہوں گے اور آپ انکی پرورش اور تربیت کا ذمہ اپنے سر لے کر اپنے ہی قریب کسی خانقاہ میں جگہ دیتے ہوں گے۔ علاوہ بریں ان بزرگ کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ انکو جانوروں سے بڑا اُنس تھا۔ صحرائی درندوں اور جنگلی وحوش و طیور کو رام کرنے اور قابو میں لانے کا عجب خداداد ملکہ رکھتے تھے۔ سیکڑوں ہرن، نیل گائیں، مور، کبوتر، کتے، بلی اور شاید چوہے بھی ایک احاطے کے اندر ادھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے ہونگے۔ اسلیے کیا عجب ہے کہ یہی باتیں آپ کی وفات کے بعد کرامات مشہور ہو گئی ہوں۔ اور ایک کو دوسرے کے ساتھ نسبت دیکر جہلا نے صغریٰ الراس اہل خانقاہ کا نام شاہ دولہ کے چوہے رکھ دیا ہو اور امتداد زمانہ کے بعد جیسا عموماً قاعدہ ہے مبالغہ کو کام میں لاکر کہنے لگے ہوں کہ شاہ دولہ کو مہیب و خونخوار درندوں کی تسخیر کا کوئی عمل ایسا آتا تھا کہ اُن کو انسان بنا سکتے تھے اور اسی طرح آدمیوں خصوصاً نوزائیدہ بچوں کو بھی ایک جانور یا چوہے کی شکل میں مبدل کر سکتے تھے۔ پھر اسپر مجاورین وغیرہ نے جن کو صرف اپنے جیب گرم کرنے اور حلوے مانڈے سے سروکار ہوتا ہے یہ حاشیہ چڑھا دیا ہو کہ جو شخص اپنی مراد برآنے پر مزار کے لیے کچھ نذر نہ لائے گا اُسکا نوزائیدہ بچہ چوہے کی شکل کا پیدا ہوگا۔ مثلاً کسی بانجھ عورت نے اولاد کی دعا مانگی اور حصولِ منت کے بعد درگاہ کے لیے کوئی چڑھاوا نہ لائی تو اس گستاخی کی سزا میں یا تو پہلا، نہیں تو دوسرا بچہ تو ضرور ہی چوہے کی طرح گوش دراز اور خارج از عقل پیدا ہوگا۔ یا اس بات میں بھی کچھ رد و بدل کر کے زوارین سے کہا گیا کہ مراد تو ضرور برآئے گی لیکن ایک بچہ کو صاحب درگاہ کی خدمتگزاری کے لیے مخصوص

کرنا ہوگا اسی لیے اُس میں دنیاوی باتوں کی عقل کم ہوگی اور چوہے سے مشابہت رکھیگا۔ اب اگر یہ عقیدہ درجۂ یقین تک پہونچ گیا ہو تو کیا عجب ہے کہ شاذ و نادر صحیح بھی نکل آئے۔ کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ حاملہ عورت کے خیالات و اوہام کا جنین کی پرورش و ساخت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ کسی زمانہ میں جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں شاہ دولہ کی فیاضی و خیر و برکت سے اس قدر جائداد اس درگاہ سے متعلق تھی کہ اس قسم کے لاچار غریب اپاہجوں کی پرورش و نگہداری بآسانی سرانجام پزیر ہو سکتی تھی لیکن اب کچھ عرصے سے سنتے ہیں کہ یہ حالت نہیں رہی اور متولیین اور مجاورین اس قدر لالچی اور مفلوک الحال ہوگئے ہیں کہ بجائے اسکے کہ ان بچوں کے اخراجات کا بار اُٹھائیں انکو اپنا ذریعۂ آمدنی و معاش تصور کرتے ہیں اور بڑے ہوتے ہی بعض خانہ بدوش فقیروں کے سپرد کرکے دو چار روپیہ ماہوار کرایہ وصول کرتے ہیں۔ یہ فقیران چوہوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیے "شاہ دولہ کی فتح" کے نعرے مارتے ہوے اور لوگوں کو ڈراتے ہوے کہ اگر نہ دوگے تو تمھارا بچہ بھی ایسا ہی ہو جائیگا، گانوں گانوں اور شہر شہر بھیک مانگ کر خوب روپئے بٹورتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ غریب چوہوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے بلکہ ادنی سے قصور پر گوشمالی و زد و کوب سے انکی اچھی طرح خبر لیتے ہیں۔

"مانی"

نیچی نظروں سے تمھاری راز افشا ہوگیا ہو گئے بدنام تم بھی میں بھی رسوا ہوگیا
خون میرا اُنکی پیشانی پہ قشقہ ہوگیا حُسنِ قاتل قتلِ بسمل سے دوبالا ہوگیا
پیار سے تم نے مری گردن میں بانہیں ڈالدیں بڑھ کے اب دو ہاتھ کا میرا کلیجا ہوگیا
سرکشی پہ ناز کرتا تھا بہت سروِ چمن صحنِ گلشن میں تمھیں دیکھا تو سیدھا ہوگیا
خالِ عارض کے تصور میں بجھا دل کا چراغ سارے گھر میں ایک نقطہ سے اندھیرا ہوگیا
تو نے چپکے سے جو میرے کان میں کچھ بات کی لے بت کافر زمانے بھر میں چرچا ہوگیا
اللہ اللہ کیا عقیدہ تیرے بیماروں کا ہے نام جسنے لیلیا تیرا وہ اچھا ہوگیا

بیخودی میں کیا کہیں اُس بت کو سجدہ کرلیا
تیکدہ پر اسے وفاؔ کعبہ کا دھوکا ہوگیا

وفاؔ صدیقی

"کرشمۂ محبت"

(یعنی)

"زیدی و احمدی"

(۱)

ابو صادق زیدی، جسے ہم آیندہ صرف "زیدی" کے نام سے یاد کریں گے، ایک بڑے معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ زیدی کے والد ایک عالم جید ہیں۔ پبلک میں ممتاز و ہر دلعزیز ہیں۔ ہر وقت جوق در جوق لوگ آکر مولانائے ممدوح کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ آپ کا زہد و تقوٰی مشہور ہے اور آپ نہایت سادگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زیدی ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور انکے بڑھاپے کی آس ہے۔ لاڈ پیار سے پل رہا تھا۔ اگر کبھی انگلی میں بھی درد ہوا تو والدین بے چین ہوگئے۔ ادھر بچہ نے مسکرایا اور ماں باپ خوش ہوگئے۔

(۲)

زیدی نے ماشاء اللہ پانچویں سال میں قدم رکھا ہے۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، دبلا پتلا جثہ، بھولی بھولی صورت، شوخ طبیعت، ہر شخص کو پیارا ہے۔ مولانا بچہ کو دیکھکر نہال ہوئے جاتے ہیں اور شکرِ خدا بجا لاتے ہیں۔ پانچویں سال یوم و تاریخ سعید دیکھکر ایک پُر تکلف دعوتِ احباب میں بچے کی بسم اللہ ہوجاتی ہے۔ اور درازیِ عمر کی دعائیں ہوتی ہیں۔

بچہ ہے لاڈلا۔ ماں باپ نے کبھی ترچھی نظر سے بھی نہ دیکھا۔ اُستاد کا رُعب نہ ماں باپ کا لحاظ۔ زیدی ایک شوخ بچہ کہا جانے لگا۔

(۳)

زیدی کی سوانح عمری لکھنے کی ضرورت نہیں ہے مختصراً سلسلۂ واقعات کا ذکر کرنا ہے۔ ساتویں ہی سال سے جب یہ اسکول میں داخل کیا گیا بُری صحبتوں نے اپنا رنگ جمایا۔ آزادی مزاج میں کافی موجود تھی اسکول کی صحبت میں اور چار چاند لگ گئے۔ مولانا بچارے پُرانے زمانے کے آدمی، ذرا خیال

بھی نہ کر سکتے تھے کہ لڑکا کس اُٹھان اُٹھ رہا ہے۔ دو ہی سال میں ہر سمت وہر گوشہ میں زیدی کے چرچے ہونے لگے۔ عام طور سے لوگ اُسے ناخلف، غیر مہذب، بدتہذیب، خود رائے اور نافرمان فرزند کہتے تھے۔ اکثر مولانا سے بحث کرنے لگتا۔ لوگ اُسکی بدتمیزی اور مولانا بیجا ہی خیال کرتے تھے۔ زیدی کی آزادی کی یہ حالت تھی کہ اکثر دوسرے مقامات پر بلا اطلاع والدین چلا جاتا اور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اُنکی تشفی کر دیا کرتا۔ یہ چھپنے والی باتیں کب تھیں، مگر لوگوں نے چھپایا اور مولانا کے کان عرصہ تک ان سے آشنا نہ ہونے پائے۔

(۴)

مس احمدی ایک طرز جدید کے دلدادہ نوجوان کی اکلوتی بیٹی ہے اور ناز و نعم میں پلی ہے۔ کسی معزز گھرانے کی خاتون کا حلیہ کتنا خلاف تہذیب ہے مگر ہاں اتنا عرض کیا جائے گا کہ احمدی نہ تو کوہ قاف کی پری ہے اور نہ حُسن کی دیوی۔ مگر لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ احمدی کے شباب کا زمانہ ہے۔ چودہ برس کا سن، بوٹا سا چھریرا قد، پتلی کمر، بھولی بھولی باتیں، مستانہ اکھڑ چال، سُریلی آواز، سادہ پوشاک۔ یہی باتیں تھیں کہ اکثر نظریں اُسپر پڑیں اور ناکام پلٹیں۔ احمدی نے کسی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی کسی خیال سے نہ دیکھا۔ مگر ہاں علیحدہ تھی اور اُسکے اخلاق پر لوگ گرویدہ ہوتے تھے۔ وہ بالکل ناواقف تھی کہ اُسکی ادائیں کس نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور لوگ اُسے کیا لطف اُٹھاتے ہیں۔ احمدی کے والد اگرچہ اپنی کسی رائے پر مستقل نہ تھے مگر "تعلیم نسواں" کے زبردست حامی اور "پردہ سسٹم" کے مخالف ضرور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ احمدی کبھی پردے میں نہ بٹھائی گئی اور ہر سوسائٹی میں آتی جاتی رہی۔ اُسکے لیے تین فصلوں کے جداگانہ ٹائم ٹیبل بنتے تھے اُن میں سے موسم گرما کا جبکہ یہ واقعات پیش آئے تھوڑا سا اقتباس ناظرین کی معلومات کے لیے درج کیا جاتا ہے۔

صبح ۵ بجے سے ۷ بجے تک ہوا خوری۔
۸ بجے سے ۱۱ بجے تک بالاخانے پر کتب بینی۔
۲ بجے سے ۵ بجے تک سبق وغیرہ۔
۷ بجے شام سے ۹ بجے تک تفریح و موسیقی۔

اس سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ احمدی کو کسقدر آزادی دی گئی ہے۔ ہندوستان کا سا ملک جس میں مختلف مذاہب و مختلف خیالات کے لوگ بستے ہیں اُس میں جوان بیٹی کی یہ بیباکیاں اکثر نظروں

میں بھلی نہ معلوم ہوتیں اور اکثر اوباشوں کی محبت بھری نظریں پڑنے لگیں۔ احمدی بھی انسان تھی پتھر نہ تھی، جوان تھی، شباب کا زمانہ تھا، ان باتوں سے عرصے تک بےخبر اور بےحس نہ رہ سکی۔

(۵)

اب زیدی مولانا کے ساتھ ایک اسٹیٹ میں رہنے لگا ہے۔ آزادی بڑھتی جاتی ہے۔ بزرگوں کا ادب، اعزا کا پاس و لحاظ نام کو نہیں ہے مگر پھر بھی اگر کچھ خیال ہے تو صرف مولانا کے غصہ کا۔ مگر وہ زیدی کی شرارتوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ تین سال تک متواتر امتحان میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے اسکول سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنے ساتھ ہی کچھ دنوں کے لیے رکھ لیا ہے۔ مگر زیدی سے آزاد شخص کو ہر وقت مولانا کے پاس رہنا اور حتی الامکان مودب رہنا کب پسند آسکتا تھا، اُسکے لیے یہ باتیں طوق و سلاسل سے کم نہ تھیں۔ اسے مجبوراً صبح اُٹھکر نماز کے لیے مسجد جانا پڑتا ہے، صبح اُٹھا، ہاتھ مُنہ دھو مسجد کی طرف چلدیا۔ مسجد تک گیا یا نہیں مگر ہاں مسجد سے سات بجے کے قبل کبھی واپس نہیں آیا۔ مسجد کے سامنے ہی ایک پُرلطف پارک ہے جسمیں اکثر مس احمدی بیٹھی ہوئی گلدستے بنایا کرتی ہے اور زیدی مسجد سے ہوکر پارک میں پھرتا ہوا اُس کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ کر شلِ پروانہ نثار ہوتا ہے۔

(۶)

مس احمدی اور مسٹر زیدی کا مکان بالکل قریب ہی واقع ہے۔ درمیان میں ایک کمبخت سڑک حائل ہوگئی ہے ورنہ دروازے بالکل سامنے ہی ہیں۔ اُسکا شباب، اِنکا شوق، ایک ہی مہینے میں زیدی اور احمدی کے چرچے ہونے لگے۔ آتشِ محبت نے دونوں کو جلا ڈالا تھا۔ ادھر صبح ہوئی اور احمدی اُٹھی۔ پہلے سڑک پر اُسوقت تک آہستہ آہستہ ٹہلی کہ نمازی مسجد سے واپس آجائیں۔ پھر یہ بھی ٹھٹکتی ہوئی مسجد کی طرف چلدی۔ جہاں اسکا عاشقِ زار زیدی اسکے لیے منتظر یا اکثر پھول چنتا ہوا ملتا اور بےاختیار گلے سے لگ جاتا تھا۔ ۷ بجے تک یہ عاشق و معشوق یکے بعد دیگرے واپس آتے۔ مگر زیدی کی تمنائیں کب پوری ہونے والی تھیں۔ ۸ بجے جوں ہی احمدی اپنے کوٹھے پہ سبق یاد کرنے گئی تو زیدی بھی پہونچ گیا اور میز کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ احمدی کتاب دیکھ رہی ہے مگر یہ بھی کسی کی اداؤں دیکھنے میں مصروف ہے۔ اگر کبھی احمدی نے سر اُٹھا کر ذرا مسکرا دیا تو بس زیدی

فوراً گلے کا ہار بن گیا۔

(۷)

ان دونوں کی کارستانیاں ایسی نہ تھیں کہ چھپ جاتیں، اُسپر طرہ یہ کہ دونوں معزز گھرانے کے نور نظر تھے۔ ہر شخص ایک عمیق نظر انپر ڈالتا تھا۔ اکثر احباب نے زیدی اور احمدی کو علیحدہ علیحدہ حبارت کرکے سمجھایا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ دیوانہ ہی کیا جو سمجھانے سے سمجھ جائے، انپر خاک اثر نہ ہوا۔ بلکہ آتش محبت اور بھڑک اُٹھی۔ مولانا کے بہی خواہ اور زیدی کے ایک سچے ہمدرد دوست نے بہت نشیب و فراز زیدی کو دکھائے۔ کچھ سمجھایا کچھ ڈرایا۔ پہلے تو وہ چپکا سنا کیا، اسکے بعد ایکدفعہ چونکا اور کہنے لگا " گریپس آر ساور (انگور کھٹے ہیں) آپ میرے رقیب بنا چاہتے ہیں؟ دیکھیے ایسی حرکت نہ کیجیے گا اور یہ خیالِ خام دل سے نکال ڈالیے "۔ ان بیچارے نے تو ہمدردی سے کہا تھا مگر زیدی نے اُنکا منہ ہی نوچ لیا۔ یہ غصہ میں اُٹھے اور چاہا کہ جاکر مولانا سے کُل حالات کہدیں، مگر پھر رُکے اور ان باتوں کو اُسکی بدتمیزیوں پر محول کرکے چُپ ہو کے بیٹھ رہے۔ زیدی اب تمام بدنامیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ جب تنہا گھر پر رہتا، چُپ، بے حس پڑا رہتا۔ اگر کوئی پکارتا تو چونک اُٹھتا۔ گویا اس عالم ہی میں نہ تھا۔ اُسکے سمجھانے کی تمام کوششیں بیکار ہوگئیں۔ صبح کو پارک، شام کو سیرگاہ اور دن کو احمدی کے بالاخانے پر صحبتیں گرم رہتیں۔ مگر زیدی کے لیے اب یہ بھی ناکافی تھا۔ کتنا ہی مجمع ہو احمدی زیدی کی اور زیدی احمدی کی خبر سنکر وہاں پہونچ جاتا۔ دور ہی سے سہی مگر آنکھوں اور اشاروں میں باتیں ہوجاتیں اور لبوں پر مسکراہٹ آجاتی۔

(۸)

جس روزِ بد کا دھڑکا تھا وہ آگیا۔ احمدی کے والد کسی قدر مشکوک ہوگئے۔ بالاخانے سے احمدی کی میز وغیرہ منگا کر اندر رکھادی اور بالاخانے پر جانے کی قطعاً ممانعت کردی۔ اب زیدی سے ملنے کے صبح اور شام کے صرف دو وقت احمدی کے لیے رہ گئے تھے۔ خاموشی اور اطمینان کا وقت دن کا تھا جسے خود ہی اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ مگر محبت ہو تو ایسی، الفت ہو تو ایسی ہو۔ اکثر دوپہر کو احمدی گھر سے نکل کر زیدی کی خوابگاہ تک کسی نہ کسی طرح پہونچ جاتی تھی۔ اور آدھ گھنٹہ تک اُسکے پہلو میں رہ کر دہکتے ہوئے شعلہ کو سرد کرتی تھی۔ ان چالوں کو بھی لوگوں نے دیکھا

Grapes are sour

اور سمجھے، مگر اب یہ بالکل بے شرم ہو گئے تھے اور بدتر سی بدتر بدنامیوں کے لیے طیار تھے۔

(۹)

ایک شام کو مجلس گرم تھی، مولانا لوگوں کو پند و نصائح کر رہے تھے۔ ناگاہ ایک تار مولانا کے نام آیا۔ مولانا نے لفافہ کھولا، زیدی کو بُلا کر پڑھنے کے لیے دیا۔ اُس نے پڑھا اور کہا "والدہ کی طبیعت سخت ناساز ہے، فوراً بُلایا ہے"۔ مولانا نے اُسی وقت روانگی کا انتظام کر کے زیدی کو حکم دیا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ زیدی کو یہ سنتے ہی سکتہ سا ہو گیا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ مولانا اسے چھوڑ کر تشریف لیجائیں گے اور وہ بالکل آزاد رہے گا مگر بدبخت زیدی کا خیال غلط نکلا اب وہ بالکل خاموش ہے۔ اُسکے لیے یہ بڑا سخت اور امتحانِ محبت کا وقت ہے، اودھر ماں کی بیماری، اُدھر احمدی کی عارضی جدائی، بیچارہ ایک آدمی اور دو اہم مرحلے۔ ماں کی حالت شنیدہ نہ تھی خود ہی تار پڑھ چکا تھا۔ ایک دفعہ ماں کا تصور کیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ رومال سے آنسو پونچھ کر تہیۂ سفر کیا۔ اور احمدی کے دروازے پر پہونچا۔ یہ تو غیر ممکن تھا کہ بغیر احمدی سے رخصت ہوے وہ ایک روز کے لیے بھی باہر جاتا۔ احمدی اُسوقت اندر تھی اور اسکی بدقسمتی سے سخت دردِ سر میں مبتلا تھی۔ ہرچند کوشش کی مگر ناکامیاب رہا اور احمدی سے ملاقات نصیب نہوئی اپنے فوراً ارادہ تبدیل کر دیا اور مولانا کو اس طرح سمجھا دیا کہ اُنھوں نے حکم دے دیا کہ "تم کل دن کی گاڑی سے اسباب لیکر آؤ میں تنہا جاتا ہوں"۔ مولانا اُسی وقت شب کی ٹرین سے زیدی کو بالکل آزاد چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

(۱۰)

مولانا کو گئے ہوے دو دن گذر گئے ہیں مگر زیدی کو اب گھر کی روانگی کا خیال بھی نہیں آتا۔ نہایت آزادی سے مس احمدی کے ساتھ گلگشت کرتا ہے۔ نہ مولانا کی خفگی کا خیال ہے نہ ماں کی بیماری کا۔ ہاں اگر کوئی خیال ستاتا ہے تو احمدی کے عارضِ گلگوں کا۔ تیسرے روز صبح کو مولانا مکان پہونچے تو مریضہ کو عجب کربِ اضطراب میں پایا۔ مُنہ پر ورم ہے۔ بولا نہیں جاتا۔ درد کی وہ شدت ہے کہ الاماں۔ مریضہ نے آنکھیں کھولیں، سرِ تسلیم خم کیا، اور چاروں طرف متجسسانہ نظر دوڑا کر کہنے لگی "بیوی میرا بچہ کہاں ہے؟"

مولانا: "وہیں چھوڑ آیا ہوں، کل آئے گا"
بیوی: "اے ہے۔ اُسے وہاں تنہا چھوڑ آئے۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ میری حالت کیسی ہے۔ کاش میں ایک نظر دیکھ لیتی"
مولانا: "وہ کل ضرور آ جائے گا۔ تم اس قدر پریشان نہ ہو"
بیوی: "میں مرض الموت میں گرفتار ہوں، ملک الموت میرے سامنے ہے، دنیا چھوڑ رہی ہوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ میری روح اُسوقت تک خوشی سے پرواز نہیں کرے گی جب تک کہ میں اُسکا آخری دیدار نہ کر لوں"

مولانا اب بے حد پریشان تھے۔ مریضہ کی حالت ابتر ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے روز تک زیدی کا اور انتظار کیا پھر بھی وہ نہ آیا تو پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ فوراً تار دیا۔ جواب ندارد۔ دوسرا تار دیا اُسکا جواب بھی نہ ملا۔ تیسرا تار دیا اور سختی سے لکھا کہ فوراً چلے آؤ۔ خدا جانے اس آخری تار میں کونسا جادو تھا کہ بغیر اثر کیے نہ رہا۔ اور زیدی اپنی معشوقہ کو نالاں و گریاں چھوڑ کر خود صدمۂ مفارقت لیے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

زیدی کی والدہ کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ اکثر غش میں پڑی رہتی تھیں۔ جب آنکھ کھلتی تو زیدی کو پوچھتیں، جب پاؤں کی آہٹ سنتیں تو شوق سے ہاتھ پھیلا دیتیں۔

(۱۱)

جس وقت زیدی مکان پہونچا ہے گھر کی عجیب حالت تھی۔ ماں بیہوش، باپ بدحواس، اعزا پریشان۔ جاکر سرہانے بیٹھ گیا۔ آواز دی مگر اب جواب دینے کا ہوش کسے تھا۔ پھر اُٹھا اور کچھ گلاب چھڑک کر پنکھا جھلنے لگا۔ ماں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو زیدی پنکھا جھل رہا تھا۔ جوشِ محبت سے بے چین ہو گئی۔ "ہاے میرے بچے" کہا اور سینے سے چمٹا لیا۔ خیریت پوچھی، دعا دی اور پھر آنکھ بند کر لی۔ زیدی کتنا ہی بے راہ سہی مگر پھر بھی انسان تھا، شریف تھا۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور رو دیا۔ تیمارداری کرنا اگرچہ اب تک وہ فضول سمجھتا تھا مگر اسوقت اُسکے خیالات میں ایک تغیرِ عظیم ہو گیا تھا۔ ماں کے پاس سے شاید ہی کسی وقت جدا ہوتا۔ خدا کے فضل اور لوگوں کی دعا سے مریضہ اب رو بصحت ہو چلی ہے۔ درد میں تخفیف ہے۔ غش بھی کم آتے ہیں مگر حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ دس پندرہ روز کے بعد ذرا طبیعت پھر سنبھلی اور یہ اُٹھکر بیٹھ گئی۔ ضعف اگرچہ

بعید تھا گر شکایات قریب قریب دفع ہو گئی تھیں۔ ماں کی طرف سے جو زیدی کو اطمینان ہوا تو پھر احمدی یاد آئی۔ اور اُسکے خیال نے زیدی کو بالکل مبہوت کر دیا۔

(۱۲)

زیدی ایسی حالت میں کہ احمدی سے کوسوں دور تھا کیونکر چین سے رہ سکتا تھا۔ اب ہر وقت وہ احمدی کے خیال میں بےچین رہتا ہے۔ کروٹیں بدلتا ہے۔ کوئی طریقہ اُس سے جلد ملنے کا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اُس نے یہ ارادہ کیا کہ ماں باپ سے اجازت لے کر پھر واپس چلا جاے۔ اُٹھا اور مولانا کے پاس گیا۔ موقع نہ ملا۔ واپس آیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر گیا اور والدین کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے ایک روز تیج کو بلا اطلاع اپنی کوٹھی پر آ گیا۔ یہاں پہونچکر اُس نے پہلا کام جو کیا وہ اُس احمدی کی ملاقات تھی۔ بچھڑے ہوے عاشق ومعشوق کی باتوں کو مناسب نہ سمجھکر نظر انداز کر دیا ہے مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ اس مرتبہ زیدی کچھ ریشمی، ومال اور اسی طرح کی چند چیزیں بھی ساتھ لایا تھا۔ جو احمدی کو بطور تحفہ دی گئیں اور اُس نے نہایت تشکریہ کے ساتھ قبول کیں۔ زیدی کی آزادی ظاہر ہے احمدی بھی آزاد تھی۔ اُسکے والدین دو روز سے بضرورت باہر گئے ہوے تھے۔ موقع غنیمت تھا۔ یہ زمانہ دونوں عاشق ومعشوق نے خوب ہی آزادی اور بےفکری سے بسر کیا۔ بڑے بڑے تحفہ وتحائف آتے جاتے رہے۔ کبھی احمدی نے کچھ پکایا اور زیدی کو اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ کبھی زیدی نے کوئی پارسل منگایا اور وہ احمدی کے ڈرائینگ روم میں دے دیا گیا۔ اس درمیان میں اکثر شرمناک حالات پبلک کے علم میں لائے گئے۔ اور آخر کار جو نہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو گیا۔

(۱۳)

کچھ عرصہ کے بعد مولانا مع الخیر واپس تشریف لائے۔ لوگوں نے مناسب طریقے سے تمام واقعات جو اب بہت زیادہ ہو گئے تھے مولانا سے کہہ دیئے۔ مولانا اول تو نہایت ہی عابد وزاہد تھے اُسپر مدورجے کے مغلوب الغضب۔ فوراً بگڑ گئے۔ مگر ساتھ ہی کسی خیال نے اُنھیں روکا۔ اور پھر بالکل ساکت ہو کر خو و تجسس نگاہوں سے دونوں کو دیکھتے رہے۔ آخر کار ایک روز مولانا نے زیدی کو احمدی کے ساتھ بےتکلفی سے اُٹھتے بیٹھتے دیکھ ہی لیا۔ پھر کیا تھا۔ شعلۂ غضب بھڑک اُٹھا۔ زندگی تھی جو بیچارہ زیدی زندہ بچا ورنہ زدوکوب تو ایسی نہ ہوئی تھی کہ وہ پھر اپنا منہ دنیا میں دکھا سکتا۔

(۱۴)

اُسی روز مولانا نے اپنے اکلوتے، پیارے اور لاڈلے فرزند زیدی کو ہمیشہ کے لیے سینہ پر صبر کی بھاری سل رکھکر عاق کر دیا۔ اب وہ اسوقت بیدیدی سے نکالا جا رہا ہے۔ اس نئی منزل میں اُسکے پاس چار جوڑے کپڑے، ایک دری، ایک لوٹا اور پندرہ روپئے ہیں۔ نہ کوئی ساتھی ہے نہ ہمدرد۔ زیدی کے لیے یہ عجب مصیبت کا وقت تھا۔ وہ کہاں جائے اور کہاں نہ جائے۔ اپنی علمی قابلیت ایسی نہ پاتا تھا کہ اُس سے کوئی ذریعۂ معاش نکالے نہ اور کوئی صورت اسکے ذہن میں آتی تھی۔ مگر تھا ہٹی، بجائے اسکے کہ باپ کے پاؤں پر گر کر توبہ کرتا، عاجزی کرتا، معذرت کرتا، نادم ہوتا، باپ کے قدموں کو نہ چھوڑتا۔ وہ اُٹھا اور سیدھا احمدی کے پاس چلا گیا۔ اپنا حال بیان کیا۔ جواب میں ہمدردی کے الفاظ سُنے۔ امام ضامن کا پیسہ بندھوایا اور اُسے سسکیاں بھرتا ہوا چھوڑ کر خود روتا ہوا روانہ ہو گیا۔

(۱۵)

زیدی احمدی کے درسے سر نیچا کیے ہوئے، آنسو پونچھتا ہوا جا رہا تھا۔ احمدی چوکھٹ سے لگی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی اور زیدی کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گر وہ اب اسکی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ زیدی اب اسکی نظروں سے چھپ رہا ہے۔ وہ جلدی سے کوٹھے پر چڑھ گئی اور اُسوقت تک ٹکٹکی لگائے دیکھا کی جب تک اُسکا پیارا دکھائی دیتا رہا۔ ادھر زیدی نظر سے اوجھل ہوا اُدھر احمدی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر پڑی۔

(۱۶)

آٹھ روز ہو گئے ان دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ معلوم ہوئی۔ زیدی کی تسلی کے لیے یہ کافی تھا کہ احمدی اپنے گھر میں خوش و خرّم اور آرام سے ہو گی گر احمدی کیا جانے کہ اُسکا عاقبت اندیش عاشق کس جنگل کی ہوا کھا رہا ہے۔ چلتے وقت اُسنے یہ بھی نہ بتلایا تھا کہ کدھر جائیگا۔ اور کس طرح اپنی زندگی کے دن گذارے گا۔ کہا تو یہی کہا کہ "جدھر تقدیر لے جائے"۔

اسوقت احمدی ایک کوچ پر لیٹی ہوئی زیدی کے خیالات میں غرق ہے۔ مینہ برس کر نکل گیا ہے چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ احمدی بےچین ہوئی جاتی ہے۔ یکایک اُٹھی۔ کوٹھے کے دروازے کھولے۔

چاروں طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ دروازہ بند کردیا اور مسہری پر ایک ٹھنڈی سانس لے کر لیٹ رہی ۔

(۱۷)

احمدی اُٹھی مگر پریشان ۔ سر میں زور کا درد ہو رہا ہے ۔ ہر چند دوا کی گئی مگر چار پانچ روز تک افاقہ نہ ہوا۔ اب وہ بیمار ہوگئی ہے ۔ قلب میں درد اور ورم ہوگیا ہے ۔ دن بھر بستر پر پڑی کروٹیں بدلا کرتی ہے ۔ روز بروز حالت ابتر ہوتی جاتی ہے ۔ علاج ہوتا ہے مگر بے سُود۔ کوئی دوا اثر ہی نہیں کرتی ۔ گھر بھر اسکی بیماری سے اگرچہ پریشان ہے مگر اس صابرہ نے کبھی اپنی تکلیفوں کو ظاہر نہ کیا۔

ایک روز صبح کو اُٹھی ۔ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے ٹکڑے نظر آرہے تھے ۔ ہوا سرد تھی ۔ طبیعت بھی کچھ بحال پائی ۔ گھر سے نکل آئی ۔ پارک سے ہوتی ہوئی مسجد تک آئی ۔ دروازہ بند تھا اُسے آہستہ سے کھول کر اندر داخل ہوئی ۔ کونہ کونہ متجسّانہ نگاہ سے دیکھا پھر قبلہ رخ ہوکر سجدے میں گر پڑی اور گڑگڑا کر زیدی کے صحت و سلامتی سے واپس آنے کی دعا مانگی ۔ پھر اُٹھی ۔ باہر آئی ۔ دروازہ بند کیا اور پشتِ مسجد کی طرف چلدی ۔ (یہ مسجد ایک بلند ٹیکرے پر واقع ہے ، سامنے ایک چھوٹا سا پارک ہے داہنی طرف چند شاہی عمارتوں کے بوسیدہ کھنڈر گر رہے ہیں ۔ پشت پر اور بائیں طرف ٹیلے اور نالے ہیں ۔ پتھریلی زمین ہے اور جابجا جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں جن میں اکثر درندے بھی دیکھے گئے ہیں) دو منٹ رُکی اور پھر قدم جمائے ہوئے ٹیکرے سے اُتری ۔ نالے سے گذری ۔ اور اسی طرح دور تک چلی گئی ۔ نازکبدن تھی ہی ، اُسپرطرہ یہ بیماری ۔ احمدی تھک گئی ۔ اب ٹیلے پر بیٹھ کر دم لیا اور پھر جلدی جلدی گھر واپس چلی آئی ۔

بیمار ہے ، کمزور ہے مگر اب اُسکا یہ طریقہ ہوگیا ہے کہ روزانہ صبح کو صحرا نوردی کرکے دل بہلا لیا کرتی ہے ۔

(۱۸)

جون کا مہینہ ہے ۔ ابھی پانی کے چھینٹے پڑ چکے ہیں ۔ موسم پُرلطف ہے ۔ ابر چھایا ہوا ہے ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے ۔ جھاڑیوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں ۔ اسی وقت احمدی اپنے بالاخانے پر مسہری پر تازہ ہوا کے ساتھ لیٹی ہوئی ایک ناول دیکھ رہی ہے ۔ کبھی کبھی کتاب سینہ پر رکھکر ایک سرد آہ بھر لیتی ہے اور آنکھوں کے ڈبڈبائے ہوئے آنسو پونچھ کر پڑھنے لگتی ہے ۔ بالاخانہ کے

دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ساعت بساعت تند ہوا کے جھونکے آکر اُسے پریشان کر دیتے تھے۔ اب وہ اپنی تمام اداؤں کو لیے ہوئے اُٹھی اور ایک کھڑکی بند کرنے لگی۔ ناگاہ سڑک پر بدبخت زیدی کو ادھر ہی سے آہستہ آہستہ جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ بے چین ہوگئی۔ سمجھی دعا نے اثر کیا۔ پکارنا شروع کیا، سیٹی بجائی اور پھر جلدی سے ہارمونیم پر یہ غزل چھیڑ دی:

دیکھ ادھر ادھر بے نازوں کے اُٹھانے والے

اپنے وعدے پہ نہ آنے نہ بُلانے والے

مگر زیدی نے منہ پھیر کر بھی پیچھے نہ دیکھا۔ وہ نیچے اُتری۔ چاہا کہ دوڑ کر گلے سے لپٹ جائے مگر اب وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس نے ایک آہ کی اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

(۱۹)

احمدی کی پریشانیوں کی اب کوئی حد نہ تھی۔ دن رات روتے گذرتی تھی۔ وہ گھر جس میں خوشیاں منائی جاتی تھیں اُسے آج احمدی آنسوؤں سے بھر رہی ہے۔ اس واقعہ کے چوتھے ہی روز ڈاک سے ایک خط زیدی کا احمدی کو ملا۔ لفافے کو جلدی سے سینے سے لگا لیا اور پھر کھول کر اس طرح پڑھنے لگی:

لکھتا ہوں فرطِ شوق میں اک اک کو میں خط

دیکھوں اُدھر سے لاتا ہے قاصد جواب کیا

میری پیاری احمدی بیگم

خدا تم کو تا قیام دنیا سلامت رکھے۔ میری حالتِ زار نہ پوچھو گر عرض حال سن لو۔ پندرہ ۱۵ روز تمہاری مفارقت کو ہوئے ہیں مگر مجھے پندرہ سال سے زیادہ معلوم ہو رہے ہیں۔ تمہاری بھولی بھولی پیاری پیاری باتیں یاد آ آ کر آٹھ آٹھ آنسو رُلا جاتی ہیں۔ اپنی خوش قسمتی کے ایام کا تصور کرتا ہوں اور آج کی موجودہ حالت کو دیکھتا ہوں تو چلا چلا کر رو دیتا ہوں۔ تم کو کیا معلوم کہ یہاں مجھ پر کیا گذرتی ہے مجھ سے نہ کہا جائے گا مگر اتنا سمجھ لو کہ وہ جانور جو میرے پاس سے گذر جاتے ہیں مجھ سے بدرجہا خوش قسمت ہیں۔ کاش میں بھی اُنھیں جانوروں میں سے ایک ہوتا۔ مجھ کو کسی سے گلہ نہیں ہے مگر ہاں صرف اپنی عقل سے۔ پیاری تمہاری محبت نے مجھ کو اندھا کر دیا اور میں اپنے اچھے بُرے کی تمیز نہ کر سکا۔ میں خود تو بدنام ہوا ہی تھا تم کو بھی بدنام کر دیا۔ اور پھر بھی یہ نخل محبت بارور نہ ہوا۔ میں تو دنیا چھوڑ کر چلا

مگر خدا تم کو زندہ رکھے ابھی دنیا میں رہنا ہے، پرائے گھر جانا ہے۔ مگر آہ یہ بدنامیاں تمہارے ساتھ ساتھ جائیں گی اور انکا بانی کمبخت میں ہی ہوں۔ مجھے بار بار تمہارا خیال ستاتا ہے اور میں تمہاری آیندہ زندگی کا تصور کرکے بیچین ہو جاتا ہوں اور عقل زائل ہو جاتی ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

محبت میں راز محبت چھپانا   جو مشکل کوئی ہے تو مشکل یہی ہے

اب ہو کیا سکتا ہے۔ مجبوری ہے۔

تمہاری یاد مجکو دیوانہ بنائے دیتی ہے اور کوئی صورت تم سے ملنے کی ظاہرا نظر نہیں آتی۔ ایک روز صبح کو میں جنگل میں اپنے پاؤں سے کانٹے چن رہا تھا کہ تم کو خرام ناز کرتے ہوے دیکھا۔ کتنا پکارا مگر تم نے نہ سنا۔ کل ڈرتے ڈرتے تمہارے مکان تک پہونچا۔ مگر بدقسمتی ساتھ ساتھ رہبری کے لیے گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارے دیدار سے آنکھیں شاد نہ ہوئیں۔ اور چند آدمیوں کو سرگوشیاں کرتے دیکھکر واپس آیا۔ جنگل میں قیام ہے ہو کا مقام ہے۔ صرف تمہاری یاد اور تمہاری محبت مجکو جلائے ہوے ہے ورنہ مردہ ہی سمجھو۔ اب سوا تمہاری یاد کے اور کیا کام رہ گیا ہے۔

بے نشانوں کا پتہ لے پوچھنے والے نہ پوچھ   کیوں بھلا اپنا پتہ اہل وفا دینے لگے

میں اب رخصت ہوتا ہوں مگر اتنا کہے جاؤں گا کہ اپنی خیریت اور اپنے اُن مفصل حالات سے اس پتہ پر مجھے مطلع کرنا ....

.... میں آکر ڈاکخانے سے خط لیجایا کروں گا۔ میرے جواب کا انتظار نہ کرنا کیونکہ مجکو سامان تحریر بمشکل دستیاب ہوا ہے

پیاری تمہارا بدنصیب عاشق، ابو صادق زیدی

(۲۰)

احمدی خط پڑھتی جاتی ہے اور روتی جاتی ہے۔ خط کو ختم کرکے آفس بکس میں مقفل کیا اور لیٹ رہی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلاکی اور پھر بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ اپنا منہ شیشے میں دیکھا۔ ہاتھ سے جا بجا بال کپڑے نوچ ڈالے اور میز پر آکر زیدی کو اس طرح خط لکھنے لگی:۔

فسانۂ جگر و قلب خون چکاں سن لو
جو سن سکو تو ہماری بھی داستاں سن لو

میرے پیارے پُرارمان زیدی

بیس منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہونگے کہ تمھارا پُراثر محبت میں ڈوبا ہوا محبت نامہ ملا۔ آنکھوں سے چوما سینے سے لگایا اور پھر ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا۔ اور یہ آخری خط تمھیں لکھنے کے لیے بیٹھ گئی ہوں

پیارے تم میرے لیے رنج نہ کرو، میرے لیے آہ وزاری نہ کرو۔ کیوں میرے لیے ہلکان ہوتے ہو۔ میں تو اپنا انتظام سوچ چکی ہوں صرف اس خط کا انتظار تھا۔ تمھاری خیریت نہ معلوم ہونے سے دل بےچین اور مضطرب تھا۔ بارے تمھاری خیریت معلوم ہو گئی۔ اب میری جان نہایت آرام و اطمینان سے نکلے گی۔ پیارے صادق تم میرے لیے رنج نہ کرنا گریہ نہ کرنا

جانے والی جان ہے میرا کوئی قاتل نہیں

دنیا تو ایک سرائے ہے۔ لوگ ادھر آئے اُدھر گئے۔ ہاں کسی کی حسرتیں نکل چکی ہوتی ہیں اور کسی کی حسرتیں اُسکے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں، سو میں آخرالذکر طبقے میں ہوں۔

آرزو یہ ہے کہ نکلے دَم تمھارے سامنے　　تم ہمارے سامنے ہو ہم تمھارے سامنے

مگر یہ ہماری بدقسمتی یہ آرزو نکلنے کا اب موقع نہیں دے گی اور میں پُرارمان ہی جاؤں گی۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ میں زیادہ بدنام نہ ہونے پائی اور ابھی پردہ پڑا ہوا ہے ورنہ مہینہ بھر میں آثار ظاہر ہو جاتے اور یہ پردہ بھی فاش ہو جاتا۔ تم نے اسوقت بھی میری مدد کی اور اب میں خوش جا رہی ہوں۔ آپ کو سنبھالنا۔ مایوس ہو کر دیوانے نہ ہو جانا۔ والد کو خوش کرو۔ معافی مانگو اور آکر گھر آباد کرو۔ قبر پہ آکر فاتحہ پڑھ دینا میں منتظر رہوں گی۔

تمھاری چاہنے والی　احمدی

احمدی نے خط بند کیا۔ لفافہ پر پتہ لکھا ٹکٹ لگایا اور گھنٹی بجائی۔ بیرا حاضر ہوا۔ حکم دیا خط ابھی لیجا کر پوسٹ کر آئے۔ بیرا اُدھر گیا۔ یہ ادھر اُٹھی۔ اپنے (Travelling medicine bag) ٹریولنگ میڈیسن بیگ سے نکوٹین (Nicotene) نکالی اور تھوڑی سی منہ میں ڈال کر ہمیشہ کے لیے گہری نیند میں سوگئی اور والدین کو داغ مفارقت دے گئی۔

(۴۴)

کم تعلیم اور بری تربیت کی بدولت دو نوخیزوں نے اس طرح ناجائز راہِ محبت میں قدم رکھا

اور آخر کو خود فنا ہوتے ہوئے دو معزز اور شریف گھرانوں میں صفِ ماتم بچھوا گئے۔ ہمارا پیارا ہندوستان لاکھ دعوے کرے مگر دراصل وہ راہِ ترقی میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہندوستان نے اپنی ترقیاں، اپنی عزت، اپنی آبرو، اپنی حشمت اور اپنا وقار غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ اسلاف کی یادگاریں قریب قریب ہر شہر میں کھڑی ہوئی ہم کو رو رہی ہیں اور ہم بے حس ہو کر رہ گئے ہیں۔ جدید تعلیم کا بجائے اسکے کہ ہم اچھا اثر لیتے بُرا اثر قبول کر رہے ہیں۔ اسوقت ہمارے غریب اور بیچارے ہندوستانی تین طرح کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔

ایک وہ ہیں جو قدیم طرزِ معاشرت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں اور اب تک اُسی پر قائم ہیں۔

دوسرے انگریزی طرز کے دلدادہ ہیں جو صرف رنگ میں میلے ہیں ورنہ فیشن میں یورپ والوں کو شرمندہ کر رہے ہیں۔

تیسرے وہ ہیں جو نہ یورپین طرزِ معاشرت رکھتے ہیں نہ ہندوستانی، بلکہ بین بین ہیں۔ یہی آخر الذکر طبقہ ہے جو اپنی عزت اہلِ یورپ کے ہاتھوں بیچ رہا ہے۔ ورنہ ان دونوں طبقوں کے لوگ اپنے اپنے حال میں خوش ہیں۔ مگر یہ ایسے ہیں کہ انپر ہندوستانی بھی ہنستے ہیں اور یورپین بھی ایک معمولی بیرے سے زیادہ وقعت نہیں سمجھتے۔

انگریزی تعلیم کے ساتھ ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اپنی عزتوں کو کچل ڈالیں۔ ہم کو اپنا وقار قائم رکھکر راہِ ترقی میں قدم رکھنا چاہیے۔ زیدی اور احمدی کی خرابی کا اصلی سبب خرابیِ تعلیم و تربیت ہی ہے۔ میں نہ انگریزی تعلیم کا مخالف ہوں اور نہ مغربی معاشرت کا۔ مگر موجودہ طرزِ زندگی کو کبھی بھی پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں اُس پردہ سسٹم کا بھی جو آج ہندوستان میں رائج ہے سخت مخالف ہوں۔ کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اُسکی عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ بچے کی تربیت عرصے تک ماں کی گود ہی میں ہوتی ہے۔ اگر ماں جاہل ہے تو یقیناً تربیت بُری ہوگی۔ اور پھر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی بمشکل اس خامی کو پورا کرے گی بلکہ شاید نہ کر سکے۔ پردہ بے حد بڑھ رہا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہتا کہ پردہ بالکل اُٹھا دیا جائے۔ نہیں۔ ہمیں اپنی عورتوں کو شرعی پردہ میں رکھنا چاہیے ہے۔ جیسا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بیبیوں اور بیٹیوں کا عمل تھا

شرعی پردہ محض برقعہ کے اندر نہیں ہو سکتا۔ انگریزی لباس میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے پردہ قائم رہ سکتا ہے۔ منہ چھپانے کے لیے سیاہ ریشمی رومال جو اکثر عورتیں گرد سے بچنے کے لیے ٹوپی میں لگا لیتی ہیں، کافی ہے۔ ہاتھ دستانوں سے بند رہ سکتا ہے۔ بہرحال اگر ہم چاہیں تو اس دورِ جدید میں بھی اپنا وقار قائم رکھ سکتے ہیں اور ذرا بھی مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہاں اگر ہم اسی خوابِ خرگوش میں رہے تو ترقی کا سودا فضول ہے۔ خدا وہ دن بھی آنکھوں سے دکھائے کہ ہم ایک عمدہ اور باوقار لوگ کہے جائیں، اہل یورپ ہم پر نہ ہنسیں اور ہم اُنکے غلام نہ رہیں۔ فقط

لوسیور بانیر

نظارۂ قاتل ہے میسر تہِ خنجر | کیوں شاد نہ ہو عاشقِ مضطر تہِ خنجر
یہ سُن کے کہ بے موت کوئی مر نہیں سکتا | آ آ گئے جانبازوں کو چکر تہِ خنجر
الفت کی بہاریں مجھے زخموں نے دکھائیں | پہنا ہے نئے پھولوں کا زیور تہِ خنجر
رحم آیا مری یاس بھری شکل پہ اُنکو | کام آیا یہ چلتا ہوا منتر تہِ خنجر
آئینہ سے ابرو کے اشارے جو یہی ہیں | آئے گا کسی روز سکندر تہِ خنجر
توڑا ہے یہ بلبل پہ ستم فصلِ خزاں نے | شاخیں ہوئیں گلزار کی خنجر تہِ خنجر

دیکھیں جو رضا یار کی ابرو کے تماشے
جانبازوں کا میلہ نہ ہو اکثر تہِ خنجر

رضا (فرنگی محلی)

مجھکو ہردم کوے جاناں کی تلاش | اور بلبل کو گلستاں کی تلاش
بوریا کافی ہے مجھ کو منعمو! | تم کرو تختِ سلیماں کی تلاش
اب خدا جانے ملا ہے کیا مزا | ہے جو دل کو دردِ نہاں کی تلاش
درد اُٹھکر میرے دل میں دمبدم | کر رہا ہے اُسکے پیکاں کی تلاش
ہر گھڑی ہے نشترِ غم کو ترے | جانِ من میری رگِ جاں کی تلاش
دے گئی تاریکیِ مرقد میں کام | روشنیِ نورِ ایماں کی تلاش
میں تصدق! اے خدنگِ نازِ یار | پھر ہوئی ہے دل کو پیکاں کی تلاش

آفاق دیباسی

بازارِ قوم فروشی

اب تک مسلمانانِ ہند اس بات کے بیے شکوہ سنج رہے ہیں کہ وہ اربابِ ثروت اور جدید تعلیمیافتہ اصحاب جن کو حقیقت میں خود مسلمان قومی رہنمائی کی رفعت و منزلت پر پہونچاتے ہیں، جب اس منصبِ جلیلہ پر پہونچتے ہیں تو بجاے اسکے کہ قوم کے لیے اپنا وقت، اپنا روپیہ، اپنا علم، اپنے عملی تولے، حتیٰ کہ ضرورت ہو تو اپنی جان تک نثار کر دیں، اُلٹے وقت و موقع کے منتظر رہتے ہیں کہ کس طرح اپنے دلی مدعا کو حاصل کرنے کےلیے وہ اغراض قومی کو پامال اور قربان کر دیں۔ ہز ہائنس آغا خاں، رائٹ آنریبل سید امیر علی، آنریبل سید علی امام، راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق، مولوی رفیع الدین، میاں محمد شفیع وغیرہ کے گذشتہ کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور گو ان میں سے بعض اب تک جماعت مستبدین کے سرگروہ اور اسی طرح بعض جمعیت احرار کے سالار قافلہ بنے ہوے ہیں لیکن صاحبانِ بصیرت اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے قلوب انکی حقیقی عظمت اور واقعی منزلت کے اعتراف سے یکسر خالی ہیں۔ یہاں صرف بڑے بڑے دیوتاؤں کے نام لیے گئے ہیں، ورنہ چھوٹے چھوٹے بت تو اس کفرستان کے ہر ہر شہر اور قریہ میں بکثرت ہیں۔ جو ذریتِ شیطانی کی طرح اپنے اپنے موقع پر مسلمانوں کی تخریب اور قوم کی منفعتوں کی تجارت میں مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سب وہ لوگ ہیں جن میں سے بعض اگرچہ حکام کی اصطلاح میں "فطری رہنمایانِ قوم" کے لقب سے موسوم ہیں پر دینِ فطرت کے معیار سے جانچیے یا دنیا کے اخلاقی ضوابط کے لحاظ سے غور کیجیے تو ہرگز منزلت سالاری کے سزاوار و مستحق قرار نہیں پا سکتے۔ بلکہ انکی رہنمایانہ حیثیت کی تمام تر بنیاد غریب اور سیدھے سادے مسلمانوں کی عقیدت و ارادت پر مبنی رہی ہے۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ یہ انکی قومی تحریکات میں چندے دیتے، انکی تعلیمی و سیاسی ضرورتوں کی کفالت کرتے اور حکومت کی بارگاہ میں انکے خیالات و جذبات کی ترجمانی و نمایندگی کی خدمت انجام دیتے ہیں تو انھوں نے اپنے سر انکے سامنے خم کر دیے، اپنی جبین نیاز انکے چوکھٹوں پر رکھدی اور انکی فریب کاریوں پر اعتماد کرکے انکی پرستش شروع کر دی۔ لیکن جب جب وہ انکی بدولت خواریوں اور ذلتوں کا شکار رہنے، انھوں نے علی الاعلان ان کے

بطلِ وابلہ فریبیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انکی غرضمندیوں اور قوم فروشیوں کو عالم آشکارا کر دیا۔ لیکن ان کے سوا ایک جماعت اور ہے جسکی سرداری و سالاری کو مسلمان اپنے آئین شریعت اور قوانین مذہب کی بنا پر نہایت دلی عظمت سے تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اور جو اگر دین فطرت کی حقیقی تعلیم کو پس پشت نہ ڈالیں تو واقعی طور پر مسلمانوں کے فطری رہنما کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے اُنکو انبیاے بنی اسرائیل کا مثیل کہکر ایک ایسا قابل احترام تقدس عطا فرمایا ہے جسکے مقابل دنیا کی تمام جاہ و ثروت اور مناصب و عزت ہیچ ہیں۔ مگر مسلمانوں کی شومیِ قسمت دیکھیے کہ یہ طبقۂ عالی یا تو ایک عرصہ تک ایسے جمود و سکون کی حالت میں رہا کہ اُسکی علٰحدگی اور بے التفاتی کی بدولت ہم مہذب ترین انسانوں کے درجہ سے گرکر ادنیٰ ترین حیوانوں کی منزلت پر پہونچ گئے اور یا اب جو کروٹ بدلی ہے تو ہماری تذلیل و بربادی کے ساتھ خود اسلام کے شجرِ وقار پر اپنے حرص و آز کی کلھاڑیاں چلا رہا ہے۔ گذشتہ سال نومبر میں فرنگی محل اور دیوبند کی جمعیت علما نے دوسروں کے اشارے پر میدان سیاست میں کود کر اپنے اور اپنے ساتھ مسلمانوں کے وقار کو جو صدمہ پہونچایا تھا اُسکے زخم ہنوز مندمل نہیں ہونے آئے تھے کہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو مولوی عبد الحی ناظم ندوۃ العلما۔ مولوی عبد الباری صدر انجمن سوید الاسلام اور شمس العلما مولوی محمد احمد مہتمم مدرسہ دیوبند کے اتحاد ثلاثہ نے ایک نئے بازار قوم فروشی کی طرح ڈالکر مسلمانوں کی کشتِ آرزو کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دینے کی کوشش کی ہے۔

۱۵ر جون ۱۹۱۸ء کو اخبار وکیل امرتسر میں ایک افتتاحیہ* اس مضمون کا شایع ہوا تھا کہ ریاستِ حیدر آباد دکن نے عہد ماضیہ میں حکومتِ برطانیہ کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں اور نیز موجودہ جنگ کے زمانہ میں جو بیش قرار امداد ریاستِ مذکور نے دی ہے اُسکے اعتراف کے طور پر اگرچہ ہز ہائنس میر عثمان علی خاں والی ریاست کو ہز اگزالٹڈ ہائنس کا لقب عطا کیا گیا ہے لیکن مسلمانوں کی یہ تمنا بر نہیں آئی کہ علاقہ برار حکومتِ نظام کو واپس ملتا اور ہز مجسٹی کا خطاب تاجدارِ دکن کو دیا جاتا۔ اس شکوہ سنجی کے بعد مسلمانانِ ہند سے خطاب کرکے پہلے اُن احسانات کا شمار کیا گیا جو ہز اگزالٹڈ ہائنس نے مختلف صورتوں میں مسلمانوں پر کیے ہیں اور پھر یہ تحریک پیش کی گئی کہ ان احسانات کے اعتراف

* یہ مضمون دراصل اڈیٹر وکیل کے قلم سے نہیں نکلا تھا بلکہ اُس شخص کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا جسکا تعارف اُسکے اقوام جرائم پیشہ" کے عنوان سے ۱۹۱۸ء میں بخوبی کیا جا چکا ہے۔

میں مسلمانوں کو چاہیے کہ حضور ممدوح کی خدمت میں "محی الملۃ والدین" کا لقب پیش کریں۔

قوم کے سنجیدہ طبقہ نے تو اس تحریک پر چنداں توجہ نہیں کی البتہ بعض غرضمند اخبارات نے جو ریاستِ حیدرآباد کی فیاضیوں سے تمتع اندوز ہو رہے ہیں یا ہونے کے آرزومند ہیں ہز اگز الٹڈ ہائنس کے جذبات خود پسندی کو مشتعل کرنے کی امید میں اُسکو خوب سراہا۔ اور بعض نے تو اسے یہانتک بڑھایا کہ اپنے کالموں میں جب حضور ممدوح کا تذکرہ کرتے تو حضور کو اسی لقب سے سرفراز فرماتے۔ گویا یہ کوئی اصطلاح ادبی تھی کہ روزانہ استعمال سے اسکو رواج دینا منظور تھا۔

وکیل کی تجویز پر اگر کافی بحث و غور کیا جاتا تو بہ ادنیٰ تامل اُسکے مفسدات پیش نظر ہو جاتے، لیکن یہ امر پسندیدہ نہیں معلوم ہوا کہ ایک ایسی تحریک کی بدولت جسکی ذمہ داری بظاہر کسی طرح بھی ہز اگز الٹڈ ہائنس کی ذات پر عائد نہیں ہوتی، حضور ممدوح کی ذات معرض بحث میں لائی جائے۔ اور بجاے اسکے کہ قوم کی طرف سے اُنکی فیاضانہ امداد کا اعتراف ہو، اُلٹے اُنکے شخصی و ذاتی عیوب کی پردہ دری ہونے لگے۔ خود محرک کا دماغ تو قطعاً اسکی صلاحیت نہیں رکھتا تھا کہ اسکے عواقب اور نتائج پر غور کر سکے، مگر افسوس ہے کہ غرضمندیوں نے دوسروں کے ہوش و حواس پر تصرف کرکے اُنکو بھی اس تحریک کے حُسن و قبح سے بے پروا بنا دیا۔

وہ لوگ جو اس تحریک سے اختلاف رکھتے تھے اس امید میں رہے کہ دوسری صدہا تجاویز کی طرح یہ تحریک بھی کچھ دنوں کے بعد مردہ تحریکات کے گورستان میں پہونچ جائیگی اور اسلیے بجاے اسکے کہ اسپر تنقید و تبصرہ کرنے کی ناخوشگوار خدمت انجام دی جاتی اسکی موت کا انتظار مناسب سمجھا گیا۔

محرک و موئد اخبارات میں ہنوز یہ بحث جاری تھی کہ ایک رات ناظم صاحب ندوۃ العلما نے عالم رویا میں دیکھا کہ دار العلوم ندوہ کی ناکمل عمارت پر ایک لکۂ ابر محیط ہے۔ رفتہ رفتہ بادل پھٹا اور اُس میں سے ایک لوحِ درخشاں نمودار ہوئی جسپر نہایت تابناک حروف میں لکھا ہوا تھا "محی الملۃ والدین" خوش قسمتی سے جس رات کو مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب نے یہ خواب دیکھا تھا اُسی کی صبح کو ایک مخبرِ صادق سے مولانا کی ملاقات ہو گئی جس نے مولانا کے خواب کی تصدیق کرکے اُنھیں یقین دلادیا کہ اگر اُنکی کوشش سے یہ تحریک پروان چڑھ گئی تو نہ صرف ندوہ کی عمارت مکمل ہو جائیگی بلکہ ندوۃ العلما اور خود ناظم صاحب کو ایک معقول مستقل امداد بھی مل جائے گی۔

دنیا کا کاروبار امید کے سہارے چلتا ہے۔ پھر امید بھی کیسی سنہری اور آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دینے والی تھی۔ ناظم صاحب نے اگر ان توقعات کے پھیر میں آکر تجویز کے دوسرے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی زحمت نہیں گوارا فرمائی تو کچھ مقام تعجب نہیں۔ بہرحال ادھر مخبر صادق مولانا سے رخصت ہوئے ادھر ناظم صاحب نے مقامی ارکان سے مشورہ کرکے باہر کے ممتاز اراکین ندوہ کی تائید حاصل کرنے کی غرض سے تائید تار اُڑانا شروع کیے۔ بیرونی ارکان تھے جو عموماً کسی تحریک پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کرنے کے عادی نہیں ہوتے، مولوی صاحب کی تجویز پر ہاں میں ہاں ملادی۔ بالآخر یہ طے پاگیا کہ ۲۹ ستمبر کو لکھنؤ میں ایک جلسہ منعقد کرکے حضور نظام کے لئے " نصیر الملۃ والدین " کا لقب منظور کرلیا جائے۔ لقب کی اس لفظی ترمیم میں غالباً صرف اُس احترام و عقیدت کی رعایت مدنظر تھی جو محی الدین عالمگیر اورنگ زیب شہنشاہِ ہندوستان کی طرف سے مسلمانوں کے قلوب میں عام طور پر جاگزیں ہے۔ مگر بعد کو خدا معلوم کیوں عین جلسہ کے وقت چند ارکان ندوہ و دیگر حضرات کی کانا پھوسی نے اس لفظی ترمیم کو ناجائز قرار دیا اور حسب قرارداد ایک صاحب نے نصیر الملۃ کے بجائے محی الملۃ کا خطاب دینے کی تجویز بطور ترمیم پیش کی اور مولوی عبدالحی صاحب نے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اسے منظور کرلیا۔

ناظم صاحب ندوۃ العلما یا دیگر ارکان ندوہ کے پیش نظر صرف ایک امر تھا۔ اور وہ یہ کہ اس ذریعہ سے بارگاہ آصفی کی عنانِ توجہ ندوہ کی ناکمل تعمیر اور دیگر مالی ضروریات کی طرف بآسانی منعطف ہو جائے گی اور ایک معقول امداد ریاست حیدرآباد سے ان اغراض کی تکمیل کے لیے وصول ہو جائے گی۔ اور جہاں تک اس آرزو کا تعلق ہے غالباً کسی فرد قوم کو اس پر حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہم یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اسکے صلہ میں تو ناظم صاحب یا بعض دیگر ارکانِ ندوہ اور اُنکے مؤیدین کسی ذاتی منفعت کے بھی متوقع ہوں تو کوئی محل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں ہر متنفس بعض حاجات و خواہشات لیکر آیا ہے اور اُنکی تکمیل کے لیے ساعی ہونا بالکل فطری اور اسلیے حق بجانب ہے اور مجلسی و اجتماعی تحریکوں کا نظم و نسق جن اصحاب کے ذمہ ہے وہ اگر ان تحریکات کے فروغ اور نشو و نما پانے کے لیے روپیہ کی فراہمی کی کوئی کوشش کریں تو نہ صرف وہ اسکے لیے حق بجانب کہے جائیں گے بلکہ سزاوار تحسین و آفریں اور مستحق تشکر و امتنان قرار پائیں گے۔

لیکن کسی شخص یا جماعت کو یقیناً یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے مالی فوائد کی غرض سے قوم کے دیگر حقوق کو زائل کرے یا خطرے میں ڈالے گروہ جو مشہور ہے کہ ع طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی -

جب خواہشاتِ حرص و آز کا غلبہ ہوتا ہے تو انسانوں کی عقل گم اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور تدبر و تفکر سے اُنکا دماغ کیسر تہی ہو جاتا ہے۔

مولانا سید عبد الحی صاحب نے یا اُنکے مشیران مقامی نے ایک لمحہ بھی تو اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے میں صرف نہیں کیا۔ اور جب دوسروں نے اُنکو توجہ دلائی تو اگرچہ اُنکو اپنی غلطی کے اعتراف میں دریغ نہیں ہوا تاہم جو امیدیں اس معاملت سے وابستہ تھیں وہ اُن سے دست بردار کیسے ہو سکتے تھے اور جو موقع حصول منفعت کا ہاتھ آگیا تھا اُسے وہ رائگاں کیونکر کر سکتے تھے۔

جس جلسہ میں یہ خطاب منظور کیا گیا ہے اُسکے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اسلیے کہ جس تحریک کو ۶۱ ارکان مجلس انتظامیہ ندوۃ العلما۔ ۸۶ علماے کرام و مشائخ عظام۔ ۶۴ اعیان و اکابر قوم۔ ۱۵ سربرآوردہ قومی اخبارات کی تائید حاصل ہو اُسکی منظوری کے لیے جو جلسہ کیا گیا تھا اگر اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کرسیاں خالی ہوتیں تب بھی کچھ مضائقہ نہ تھا۔ تحریری اسناد کا یہ بحر زخار مسلمانان ہندوستان کی پُرجوش تائید کے ثبوت کے لیے کافی سے کہیں زائد تھا۔ باوجود اسکے بقول ایڈیٹر صاحب ہمدم" دار العلوم ندوہ کا درمیانی وسیع ہال حاضرین سے بالکل معمور ہو جانے کے بعد لوگوں کو پہلوؤں کے کمروں میں کھڑا ہونا پڑا"۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ تمام مجمع بصرف ہندوستان کے دیگر حصص کے نمائندوں سے خالی تھا بلکہ خاص شہر کے معززین (ارکان ندوہ و مؤید الاسلام اور انکے متبعین کو چھوڑ کر) میں سے بھی دو ایک کے سوا کوئی وہاں نظر نہیں آتا تھا۔ خود ارکان ندوہ کے چہرے خجالت و انفعال، ندامت و شرمساری کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ناظم صاحب کی طرف سے اصل تحریک پیش ہوئی یا جب ہمارے دوست مولوی سید سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین نے اس تجویز کی تائید کی یا پھر جب ہمارے دوست مولوی مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین نے یہ ترمیم پیش کی کہ نصیر الملۃ والدین کے بجاے محی الملۃ والدین کا خطاب دیا جائے اور ہمارے نہایت ہی عزیز دوست ڈاکٹر ناظر الدین حسن رکن ندوہ خلف مولوی نظام الدین حسن صاحب سابق چیف جسٹس ریاست حیدرآباد نے اس ترمیم کی تائید کی تو انکی آوازیں نہایت ہی پست اور انکی تقریریں حد درجہ مختصر تھیں اور وہ تمام

سرمایۂ جوش و خروش جس سے ناظم صاحب کی رپورٹ لبریز تھی معلوم ہوتا تھا کہ ان اصحاب کی دسترس سے باہر تھا۔ جلسہ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی کہ دفعتہً ناچیز اڈیٹر الناظر پلیٹ فارم پر نمودار ہوا۔ مردہ ضمیر ارکان ندوہ کی ہوش باختگی اور سراسیمگی کا وہ عالم کبھی فراموش نہ ہوگا جبکہ اُنھوں نے نہایت بیکسی کے عالم میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ جلسہ کو بعجلتِ ممکنہ برخاست کرکے اڈیٹر الناظر کو اظہار رائے سے محروم کردیا جائے۔ پھر جب دو چار ملامت آمیز فقروں کے ذریعہ پریسیڈنٹ صاحب کو اپنے فرائض کا احساس دلایا گیا تو بالآخر مجبورانہ مایوسی کے عالم میں تقریر کی اجازت ملی مگر اس شرط کے ساتھ کہ پانچ منٹ کے اندر تقریر ختم کردیجائے۔ اس شرط کے بجائے اگر جناب صدر کی طرف سے یہ ہدایت ہو جاتی کہ تقریر کی جائے مگر اس طرح کہ کوئی بامعنی لفظ جس میں کچھ مفہوم ہو زبان سے نہ نکلے، تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔ بہرحال جو قلیل وقفہ تقریر کے لیے منظور کیا گیا تھا اُسمیں اڈیٹر الناظر کو کم سے کم اس تجویز سے اختلاف کرنے اور بایجاز و اختصار وجوہ اختلاف کا ایک نہایت اہم پہلو بیان کردینے کا موقع مل گیا۔ دوسرا پہلو ابھی پوری طرح بیان نہ کیا گیا تھا کہ وقت گذر جانے کی اطلاع دی گئی اور تقریر کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ اسکے بعد سید جالب صاحب اڈیٹر ہمدم جو میدان صحافت کے نہایت تجربہ کار پہلوان ہیں تقریر کرنے کے لیے آئے۔ انھوں نے پہلے تو ازراہِ ذرہ نوازی و قدردانی اڈیٹر الناظر کے قومی جوش کی ثنا و صفت فرمائی اور اُسکے دلائل سے اتفاق ظاہر کیا اور بعد ازاں ایک ناتمام حصۂ تقریر کا جواب دیتے ہوئے اصل تحریک کی تائید کردی۔ اور اس تمام واقعہ کی روداد کو اپنے اخبار میں یوں بیان فرماکر "سید جالب کی تقریر سے حاضرینِ جلسہ کا اطمینان ہو گیا" اُس تمام جماعت کو اپنا بندہ احسان بنا دیا ہے جو "ہزاگزالٹڈ ہائینس" کو مسلمانوں کی طرف سے محی الملۃ و الدین کا لقب دینے کے لیے کوشاں تھی۔ خدا کرے کہ خدام بارگاہ نے ہمدم کا یہ پرچہ اعلیٰحضرت خسرو دکن کے ملاحظہ میں پیش کردیا ہو تاکہ سید جالب صاحب کو اس اہم ترین خدمت کا کافی صلہ مل جائے۔ آمین۔

مگر جہاں تک حقیقت حال کا تعلق ہے سید صاحب کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اگر وہ اُسوقت تقریر کی زحمت گوارا نہ فرماتے، تب بھی خطاب کی تجویز پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اڈیٹر الناظر جانتا تھا کہ مجمع کس قسم کا ہے اور اسکی تقریر و بیان کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اور اگر ہمکو شائبۂ گمان بھی ہوتا کہ اُسکی بیان سے متاثر ہو کر حاضرین جلسہ کا کوئی خفیف سے خفیف جزو بھی تائید کرنے پر آمادہ ہو جائیگا تو قطعاً وہ صاحب صدر کے اس بے ضابطہ حکم سے انحراف کرتا کہ ۵ منٹ میں تقریر ختم کر دیجائے۔ غایت کلام تو صرف اس قدر تھی کہ ایک امر حق کا اظہار کردیا جائے سو الحمد للہ کہ بُری طرح یا بھلی طرح یہ حق ادا ہو گیا۔

اب اگرچہ اُن اسباب کا بیان کرنا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا جنکی بنا پر اس تجویز سے اختلاف کرنا ہماری رائے میں ہر مسلمان کا فرض تھا کہ یہ شت بعد از جنگ سے کچھ کم نہیں لیکن چونکہ اس جلسہ میں اول تو پورے طور پر اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا گیا دوسرے جو ایک بات بیان کی گئی تھی، ایڈیٹر صاحب ہمدم کے اختلاج قلب یا ضمیر زنگ آلود نے اسکو بھی اپنے اخبار میں تمامہ درج کرنے کی اجازت نہیں دی اسلیے باوجود بعض احباب و مخلصین کے شدید اصرار کے ناگزیر معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اُن خطرات سے آگاہ کر دیا جائے جو اس نہایت ہی بیجا اور نامناسب تحریک سے وابستہ اور اسکے نتائج کے طور پر آئندہ پیش آنے والے ہیں۔

اسباب اختلاف کے کئی پہلو ہیں - جو مناسب اختصار کے ساتھ ترتیب وار درج ذیل کیے جاتے ہیں:-

(۱) مذہبی پہلو سے تو سوائے اسکے کچھ کہنے کی حاجت نہیں کہ ہندوستان کے ایک نہایت مقدس متبحر عالم سے جب اس بارہ میں فتویٰ طلب کیا گیا تو انھوں نے تحریر فرمایا کہ "فی الدر المختار - ویکرہ تحریما وضعہ بالیس فیہ" البتہ گفتگو اس میں ہو سکتی ہے کہ جو رئیس مختلف انجمنوں، مدارس وغیرہ کو فیاضانہ امداد دے، علماء، فضلاء و مشائخ وغیرہ کو بیدریغ وظائف عطا کرے، علوم و فنون کی سرپرستی کرے، زلزلوں، سیلابوں اور دیگر مصیبتوں کے مارے انسانوں کی رفاقت کرے، اپنے دربار کی بعض بُری رسوم یا اپنے ملک کی بعض خرابیوں کے انسداد پر توجہ فرمائے، وہ اس قسم کے لقبوں کا مستحق ہو جاتا ہے یا اس میں کچھ اور خصوصیات بھی پائی جانا ضروری ہیں؟ قرآن پاک نے اسکے لیے ایک عام معیار قرار دیا ہے "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" قرونِ اولیٰ میں یا اسکے بعد جن سلاطین کیلیے اس قسم کے خطابات تسلیم اور رائج کیے گئے تھے اُن میں ایسے بھی تھے جو متقی و پرہیزگار اور اس بنا پر حقیقی معنی میں قابلِ تکریم تھے، اور اُن میں ایسے بھی تھے جو شرابیں پیتے، زنا کرتے اور صدہا قسم کے لہو و لعب و مظالم و مفاسد کے شکار رہتے تھے۔ گروہ اول الذکر کیلیے نہ صرف اُس عہد میں بلکہ ہر زمانہ میں اس قسم کے خطابات جائز قرار دیے جا سکتے ہیں اور اگر مفاد قومی و ملکی کے لحاظ سے اُنسے عمدہ نتائج کی توقع ہو تو یہی جواز لزوم کی حد تک پہونچ جائیگا۔ لیکن وہ سلاطین جو اس گروہ کے معیار پر پورے نہ اُتریں اور جنکی زندگی مختلف حیثیتوں سے ارتکاب معاصی کبیرہ کا سبب بنی ہوئی ہو اُنکے لیے درمختار کا فتویٰ موجود ہے۔ پھر زمانہ سابق میں جن فاجر بادشاہوں کیلیے کوئی خطابات تسلیم کیے گئے اُسکے ذمہ دار وہ تھے جو محکوم اور اس بنا پر مجبور تھے۔ اگرچہ جگر گوشۂ خاندان رسالت حضرت سید الشہداء کربلا امام حسین علیہ السلام نے یزید کی خلافت سے منکر ہو کر اور اسکی بدولت اپنے تئیں بعد دیگر اہل خاندان کو خاک و خون میں ملا کر اخلاقی جرأت کی جو عدیم المثال نظیر پیش کی ہے اُسکے لحاظ سے تو ایسے لوگوں کو بھی قابل معافی نہ ہونا چاہیے تاہم فقہائے اسلام نے انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں کے لحاظ سے تحفظات کو اسقدر اہمیت دیدی ہے کہ اگر اُنکے اس فعل سے چشم پوشی کی جائے

تو منافقہ نہ ہوگا - لیکن اُن لوگوں کے لیے جو برٹش انڈیا کے باشندوں کی طرح کسی رئیس کے محکوم نہ ہوں یہ حیلۂ شرعی بھی نہیں ہے - ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمان رئیسوں میں ایک علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال کی ذات کو مستثنیٰ کر کے اگر عام طور پر دیکھا جائے تو کم رؤسا و تعلقداران ایسے نکلیں گے جو شراب خواری، زناکاری، قمار بازی اور دیگر معاصیٔ کبیرہ میں مبتلا نہ پائے جائیں ---- اب اگر وہ راہ اختیار کرلی جائے جو ندوہ کے ارباب حل و عقد اور بعض دیگر غیرت مندہی خواہان قوم نے اس بدعت خطاب بخشی کے ذریعہ دکھائی ہے تو نواب رامپور - ہز ہائنس آغا خاں - راجہ محمود آباد وغیرہ ہندوستان بھر کے والیان ریاست اور رؤسا و تعلقداران خطابات کے مستحق قرار پائیں گے ---- اور جس طرح آج ایک جماعت نے ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام کو محی الملۃ والدین کا خطاب پیش کیا ہے دوسری جماعتیں دوسروں کو اسی قسم کے خطابات دیکر رہیں گی - نواب رامپور کے لیے شیعہ کانفرنس، ہز ہائنس آغا خاں کے لیے ایجوکیشنل کانفرنس اور راجہ صاحب محمود آباد کے لیے مسلم لیگ کی طرف سے اگر آگے چل کر اسی قسم کے خطابات منظور کردیے جائیں تو ذرا بھی تعجب انگیز نہ ہوگا - اور یہ سلسلہ کچھ یہیں پر ختم نہیں ہونے والا معلوم ہوتا بلکہ ہر وہ روپیہ کی تھیلی جو قومی و ملکی تحریکات کے لیے اپنا منہ کھلا رکھ سکے مسلمانوں کی طرف سے خطاب کی امیدوار ہو جائے گی - اور یہ امر صاحبانِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ روپیہ کی ان تھیلیوں کی قدر و قیمت مذہبی نقطۂ نظر یا اخلاقی زاویۂ نگاہ سے کتنی ہے -

(۲) ابھی تک مؤیدینِ خطاب کی طرف سے سوائے ایک دلیل کے کوئی دوسری بات اس بدعت خطاب بخشی کے متعلق ایسی نہیں سنی گئی جسے قرینِ عقل اور لائق پذیرائی کہا جاسکے - وہ کہتے ہیں کہ دولت آصفیہ کے سوا ہندوستان یا ہندوستان کے باہر کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو ہم مسلمانوں کے دکھ درد کی شریک رہتی اور ہماری ہر تحریک میں کمال دریا دلی کے ساتھ اور بغیر کسی قسم کا معاوضہ یا منفعت حاصل کیے ہوئے نہایت نمایاں حصہ لیتی ہو - لہذا ہمارا جذبۂ احسانمندی ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم حکومت آصفیہ کے بلند حوصلہ فرماں روا کا مناسب طریقہ پر شکریہ ادا کریں اور ہمارے پاس اظہار تشکر و امتنان کے لیے اسکے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں کہ ہم حضور نظام عالی مقام کو کسی قسم کا لقب نذر کریں

اوّلاً تو سرے سے یہ دلیل ہی غلط بیانیوں سے لبریز ہے - ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی تحریکات کی زندگی کچھ سنہ ۱۹۱۱ء سے نہیں شروع ہوتی - ندوہ، دیوبند، علیگڈھ کالج - انجمن حمایت الاسلام، مسلم لیگ

اور بڑی چھوٹی سیکڑوں مجالس کی بنیادیں اس سے بہت پیشتر پڑ چکی تھیں اور نہ صرف بنیادیں پڑ چکی تھیں بلکہ ان میں سے اکثر مجالس کی بلند و رفیع عمارتیں اُسوقت موجود تھیں جبکہ ہز اگزالٹڈ ہائینس ہنوز تخت حکومت پر جلوہ افروز بھی نہیں ہوئے تھے۔ ریاستِ حیدرآباد اور نہ صرف ریاست حیدرآباد، بلکہ بھوپال، رامپور، بہاولپور اور دوسری چھوٹی بڑی ریاستوں سے مسلمانوں کی جملہ اجتماعی تحریکات کو شروع ہی سے گراں قدر امدادیں ملتی رہی ہیں۔ ہز ہائنس میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد حکومت میں کون سی ایسی مسلمانوں کی تحریک تھی جسکو ریاست حیدرآباد سے بیدریغ امداد نہیں ملی یا ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ موجودہ والیۂ بھوپال نے گذشتہ سترہ سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی دستگیری کا کون سا طریقہ باقی رکھا ہے۔ رام پور، بہاولپور، محمود آباد و دیگر ریاستیں بھی اپنی حیثیت اور مواقع کے لحاظ سے کافی فیاضی اور ہمدردی کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ لیکن سرسید احمد خاں کے عہد سے آج تک کسی قومی لیڈر نے اس طریقۂ احسانمندی کو رواج دینے کی کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں کے سوا دنیا کی دوسری قومیں ہندوستان کے باہر اور نیز ہندوستان میں موجود ہیں جنکو یگانوں بیگانوں سے کروروں روپیہ کی امدادیں ملی ہیں۔ امریکہ کا مشہور مخیر اینڈرو کارنیگی دنیا کا مشہور ترین ہمدرد بنی نوع انسان ہے جسکی فیاضی کسی ایک قوم یا ملک کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ کم و بیش دنیا کا ہر حصہ اُسکا ممنون کرم ہے مگر وہ مسٹر کے سوا کسی دوسرے لقب سے دنیا میں پکارا نہیں جاتا۔ پھر علاوہ ہندوستان کے مشہور و ممتاز رجواڑوں کے ہندوؤں اور پارسیوں میں کتنے مخیر اصحاب ایسے گذرے اور آج موجود ہیں جنہوں نے بے دریغ زرپاشی کرکے اپنی قومی یا عام ملکی اور انسانی ہمدردیوں کے ناقابل انکار ثبوت دئیے ہیں۔ لیکن ان حضرات کی دلیل اگر صحیح مان لی جائے تو یہ سب قومیں اور نیز ستمبر ۱۹۱۱ء سے پیشتر کے جتنے مسلمان اہل الرائے تھے سب احسان فراموش قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے اظہار تشکر کی یہ نادر مثال آج تک پیش نہیں کی۔ لیکن یہ اصحاب ذرا غور فرمائیں تو انکی یہ دلیل خود اُنکے اپنے طرزِ عمل کی بنا پر ناقابل قبول قرار پا جاتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ خطاب بخشی فی الحقیقت جذبۂ احسانمندی و خواہش اظہار امتنان کے سبب واقع ہوئی ہے تو کیا مسلمانوں کا یہ فرض نہ تھا کہ سب سے پہلے اس تحفہ کو ہر ہائنس بیگم صاحبۂ بھوپال کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ ہز ہائنس کی ذاتِ بابرکات سے جو فیض عام مسلمانوں کو پہونچا ہے وہ اُن کی ریاست کی وسعت کے لحاظ سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔ حضور ممدوحہ نے یہی نہیں کہ علیگڈھ، دیوبند،

مدوح اور دیگر چھوٹی بڑی مجالس کو بیش قرار عطایا و وظائف سے مالا مال کر رکھا ہے بلکہ اپنے چھوٹے صاحبزادہ پرنس حمید اللہ خاں کو علیگڈھ کالج میں تعلیم کے لیے داخل فرما کر سب سے پہلے اور نہایت نمایاں طور پر اس حقیقت کو ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ بادشاہ و گدا، غریب امیر، حاکم و محکوم کے درمیان اسلام نے جو مساوات و اخوت کی بنا ڈالی تھی وہ ابھی تک دنیا میں موجود و قائم ہے۔ ہر ہائنس کے اسی طرز عمل سے یہ بھی مسلمانوں پر ظاہر ہو گیا کہ حضور ممدوح اگرچہ سیاسی حیثیت سے برٹش انڈیا کے مسلمانوں سے ایک بالکل جداگانہ ہستی رکھتی ہیں لیکن مذہبی و معاشرتی حیثیت سے اُنکا تعلق و رابطہ بالکل یگانوں کا سا ہے۔ پھر حضور ممدوحہ کی زندگی پاکیزہ سیرتوں اور مثالی نیکیوں کا کیسا دل آویز اور عقیدت پرور نمونہ ہے۔ اور سب سے آخر یہ کہ نہ صرف حضور ممدوحہ کا دور حکمرانی ہز اگزالٹڈ ہائنس کے عہد حکومت سے دو گونہ مدت رکھتا ہے بلکہ حضور ممدوحہ کے مقابلہ میں حضور نظام خلداللہ ملکہ کا آفتاب عمر ہنوز کمال عروج کو بھی نہیں پہونچا ہے۔ لیکن باوجود کہ خطاب بخش جماعت میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو ان باتوں کو ہم سے بہتر نہ جانتا ہو۔ حیف ہے ان کے جذبہ منت پذیری پر کہ وہ آج تک خوابیدہ رہا۔ اور اب جو ایک خود غرضانہ سازش نے بعض اصحاب کو اپنے جذبات منت پذیری کی تشہیر کا احساس دلایا ہے تو منزل مقصود پر جملہ دیگر رقیبان راہ سے پیشتر پہونچنے کی عجلت نے اس درجہ اضطراب و بیقراری کے آثار پیدا کر دیے ہیں کہ آئینِ شریعت یا قوانین مصلحت کسی کی عناں گیری کا پاس و لحاظ نہیں رہا۔

(۳) ہز اگزالٹڈ ہائنس کے متعلق بڑے شد و مد کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ وہ "ایک دیندار اور متشرع مسلمان ہیں"۔ یا اُنھوں نے "صرف چار نکاح کیے"۔ یا وہ "جمعہ کی نماز با جماعت عام نمازیوں کے ساتھ مکہ مسجد میں ادا کرتے ہیں یا اپنی رعایا کے امور مذہبی کے انصرام کے لیے اُنھوں نے ایک معین المہام امور مذہبی مقرر کیا اور "دین فطرہ کے بہترین نا لموں کو تلاش کرکے اس عہدے پر نامزد کیا"۔

ہر چند کہ صورت واقعہ کے لحاظ سے یہ بیان سر تا سر قابل قبول نہیں۔ لیکن بفرض محال اگر اس بیان کے ہر ہر لفظ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیش از یں نیست کہ خدائے قادر و توانا ان فرمانبرداریوں کا اجر و ثواب حضور ممدوح کو ملیگا مگر اسکی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ غریب مسلمانوں کے سر ان نکوکاریوں کا احسان تھوپا جائے۔ کیا حضور نظام خدا کے بندے اور امت محمدیہ کے ایک فرد نہیں؟ یا شریعت اسلامیہ اور قرآنی احکام کی تعمیل سے وہ مستثنیٰ ہو گئے ہیں؟ مقام حیرت ہے کہ جو قلم اپنے

ممدوح کی مدح سرائی کی غرض سے یہ لکھ چکا ہو:-

"یہ گھر اللہ کا ہے اسمیں ہم تم سب برابر ہیں		یہ وہ دربار ہے جسمیں گدا ہے شاہ کا ہمتا
کسی کو گر کسی پر کچھ فضیلت ہے تو اتنی ہے		کہ عند اللہ اکرم ہیں وہی جو ہم میں ہیں اتقیٰ
اُسی معبودِ برحق کو یہاں تعظیم کا حق ہے،		خداوندانِ عالم کا یہاں سکہ نہیں چلتا"

وہی ان امور کو اپنی فہرست احسانات کا طرازِ عنوان قرار دے۔

بیداری اور تشریح کا معیار وکیل کے افتتاحیہ نویس کی نظر میں جو کچھ بھی ہو لیکن اصطلاحِ شریعت میں یقیناً انکے حدود اس قدر وسیع نہیں کہ حضور نظام عالی مقام سے واقعاتِ حقیقی کی داستان طویل کے اُس میں داخل کیے جا سکتے ہوں۔ اسکے آگے

گفتن آئینِ ہوشیاری نیست		لیک دانستن اختیاری نیست

(۴) ہز اگزالٹڈ ہائینس کو مسلمانوں کی طرف سے محی الملۃ والدین کا خطاب دینا سیاسی نقطۂ نظر سے بہت کچھ آیندہ پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ موجودہ جنگ کے زمانہ میں بلا وجہ گورنمنٹ انگریزی کو مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی کا ایک نہایت ہی قابلِ افسوس موقع فراہم کیا گیا ہے بلکہ احتمال قوی یہ ہے کہ باوجود ہز اگزالٹڈ ہائنس کے جنگی ضروریات پر دو کروڑ روپیہ سے زائد صرف کرنے کے پان اسلامزم کے بھوت سے ڈرنے والے کہیں اس خطاب بخشی کو اسی بدنام تحریک کا نتیجہ نہ قرار دیدیں۔ حکومتِ ہند کے باخبر ارکان اور برطانیہ عظمیٰ کے ذمہ دار مدبرین کے متعلق اگرچہ یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ اس قسم کے فرضی اندیشوں سے وہ متاثر نہ ہوں گے لیکن گذشتہ تیس سال کے واقعات و حالات سے چشم پوشی کر لینا ممکن نہیں۔ زمانۂ موجودہ کی نزاکت اور خود مسلمانوں کی اہم اور لاینحل مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریک قطع نظر دوسری خرابیوں کے نہایت درجہ غیر دانشمندی پر مبنی ہے۔ اور ہمیں نہایت درجہ افسوس اس امر کا ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن بھی ان اربابِ غرض کی چالوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

بعض حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ظفر علی خاں کا ریاست حیدرآباد سے دوبارہ رخصت کیا جانا اور عبداللہ خاں کمشنری کو جو کچھ عرصہ سے سنا جاتا تھا کہ بارگاہ اعلیٰ کے مقربین شیران خصوصی میں داخل ہیں حیدرآباد جانے کی ممانعت ہونا ہر دو سانحات کا تعلق اسی سازش سے ہے۔ اور یہ

لوگ یہ باور کرنے کے کافی وجوہ رکھتے ہیں کہ ظفر علی خاں اس تحریک کے نباش الاول تھے اور عبداللہ خاں کسمنڈوی لکھنؤ میں اس شجر حنظل ثمر کے بارور ہونے کا ذریعہ بنے اُن کا یہ خیال ایک حد تک صحیح سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا ـــــ خطاب بخشی کو مرور ایام کے عمل درآمد نے اقتدار شاہانہ کا ایک جزو قرار دے رکھا ہے اور اگر حکومتِ ہند بعض مسلمانوں کے اس فعل کو ایک قسم کی مداخلت بیجا تصور کرے تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ خطاب بخشی ایک اور مہتم بالشان اور خطرناک اندیشہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہز امپیریل مجسٹی شہنشاہِ ہندوستان کے زیر نگیں مسلمانوں کی کس قدر کثیر آبادی ہے۔ پھر حکومتِ ہند مع اپنے تمام صوبہ داروں کے ہماری کتنی مجالس قومی کو مختلف صورتوں سے مالی امداد پہونچانے کا سبب بنی ہوئی، اور کتنے دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو ممنون کرم بنائے ہوئے ہے۔ اسکی تصدیق کرنا ہو تو ہماری قومی مجالس کی کارروائیوں کو پڑھیے اور ابتدا سے لیکر آج تک جو تجاویز ادائے شکریہ و اعتراف احسانات کی غرض سے ہم منظور کرتے رہے ہیں اُن کا ایک دفترِ بے پایاں آپ کے حسِ احسانمندی کو شرما دینے کے لیے کافی نظر آئیگا۔

مانا کہ یہ تمام فیاضیاں خود ہمارے جمع کردہ سرمایہ کی بدولت ہیں لیکن مالی فوائد سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو آپ کیا کہیں گے۔ اب اگر حکومت کے خوشنودی خواہ احباب اسی نظیر کی آڑ پکڑ کر اس بات کے محرک بنیں کہ ملک معظم کو ان احسانات کی شکرگزاری میں ناصر المسلمین یا اسی قبیل کا کوئی دوسرا خطاب مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جائے تو بحیثیت ایک دانشمند اور معاملہ فہم جماعت کے آپ کے پاس سوا اسکے کوئی چارہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس تحریک کو منظور کرلیں۔ حالانکہ آپ خوب جانتے ہیں کہ آپ کے مذہبی جذبات اسکی تائید کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہو سکتے۔

ایک قدم آگے بڑھکر اور نظر کو ذرا وسعت دے کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آپ کی اس روشِ خطاب بخشی کا اثر اُس نازک ترین مسئلہ تک بھی پہونچ جاتا ہے جسکے باعث دنیا کے تمام محکوم مسلمانوں کو عموماً اور ہم ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً سیاسی حیثیت سے سخت ترین امتحانات اور پیچیدگیوں کا آئے دن سامنا رہتا ہے۔ دوسری حکومتوں سے قطع نظر حکومتِ برطانیہ کے ذمہ دار مدبرین ہیں ایک سے زائد دفعہ یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مسئلہ خلافت سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے اور اسکا تصفیہ تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن واقعات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ ہولناک جنگ نے دنیا کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اور دنیا کے

نقشے میں تبدیلی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان اقوام کی حالت میں بھی انقلاب عظیم واقع ہوگیا ہے مملکتِ حجاز نے ترکی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرلی ہے اور اگر پریسیڈنٹ ولسن رئیس جمہوریہ ممالکِ متحدہٗ امریکہ کے شرائط کے مطابق صلح ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ عربوں کی ایک آزاد سلطنت قائم نہ ہو۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمان اس انقلاب کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ بلکہ ابھی سے یہ رائے قائم کرنا بھی قبل از وقت ہوگا کہ مصالحت کے بعد خدمتِ حرمین شریفین کس کے متعلق رہے گی۔ لیکن جو امکانات اس وقت معرضِ بحث میں ہیں اگر یہ امر واقعہ کی صورت اختیار کرلیں تو اس وقت تمام دنیا کے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ سلطان ٹرکی کو علیٰ حالہٖ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا جائے یا شاہِ حجاز کو آئندہ اس لقب کا مستحق قرار دیا جائے۔

مسلمان ہندوستان کے ہوں یا دیگر اقطاعِ عالم کے اُنکی خواہش یہ ہوگی اور اس خواہش کے حق بجانب ہونے سے کسی کو ایک لمحہ کے لیے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ اس نہایت ہی اہم اور نازک مسئلہ کا تصفیہ کامل آزادی، نہایت درجہ غور و خوض اور نہایت وسیع پیمانہ پر مشاورت کے بعد بڑی حزم و احتیاط، دانشمندی اور تدبر کے ساتھ کریں —— لیکن جلدبازی کا اگر یہی عالم ہے تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے اگر شرائط صلح کے مشتہر ہوتے ہی لاہور، الہ آباد، پٹنہ، مدراس اور کلکتہ کے نامی گرامی لیڈر محض اس بناپر کہ شاہِ حجاز ہماری حکومتِ برطانیہ کے حلیف تھے اپنے جلسے کرکے شاہِ مذکور کی خلافت کو تسلیم کرلیں اور خلیفۃ المسلمین و امیر المومنین کا لقب اُنکی بارگاہ میں پیش کردیں۔ بلکہ ہمارا قومی افتراق اور ہمارے لیڈروں کی گروہ بندیاں اور غرضمندیاں جس منزل پر پہونچ چکی ہیں اُنکے لحاظ سے تو یہ اندیشہ بھی بیجا نہیں کہا جاسکتا کہ دیوانہ را ہوئے بس است کے مصداق عجب نہیں جو یہ اصحاب اختتامِ جنگ اور اعلانِ شرائطِ صلح کا انتظار کیے بغیر اس قسم کی کوئی کارروائی کرنے پر آمادہ ہوجائیں

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہوجائیگا کہ اس تحریک کی وجہ سے جمہور مسلمانانِ ہند کو عام طور پر اور خود ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام حیدرآباد کو خاص طور پر کن دقتوں اور ترددات کا سامنا ہوگا۔

ایک مشرقی تاجدار کے جذباتِ خود پسندی و خود بینی کو مشتعل کردینے کے بعد انکی توقع نہ رکھنا

چاہیے کہ وہ عالم اسلامی کے فوائد عامہ کے خیال سے یا خود اپنے تئیں شکوک و شبہات کی کشمکش سے بچانے کے لیے ایک ایسا بڑا خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیں گے جو اورنگ زیب جیسے اولوالعزم اور رفیع القدر شاہنشاہ ہندوستان کی للہیت اور جوش دینی کے نشان امتیاز ہونے کی وجہ سے خاص احترام کا مستحق ہے۔ بر ایں ہمہ جس وقت تک خطاب وہندہ جماعت کے سربرآوردہ رہنما بارگاہ آصفی میں حاضر ہو کر اس ہدیہ کو باضابطہ طور سے پیش نہ کریں اور اس کے قبول کیے جانے کی خبر مشتہر نہ ہو مایوس و ناامید نہ ہونا چاہیے۔ کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شدید ترین گمراہیوں سے ایسے طور پر نجات بخشتے ہیں کہ اُس طرف کسی کا وہم و گمان بھی نہیں جاتا۔

شریعت اسلامیہ کے رو سے بعض معاصی ایسے ہیں جنکا ارتکاب فاعل و مفعول دونوں کو مجرم اور قابل تعذیر قرار دیتا ہے۔ مثلاً سود۔ رشوت۔ زنا وغیرہ۔ بعینہٖ یہی حالت اس بدعت خطاب بخشی کی نظر آتی ہے کہ خطاب دینے والے اور خطاب پانے والے دونوں اسکی وجہ سے طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا رہیں گے اور جو جو مفسدات زمانہ قریب میں یا آئندہ کسی عہد میں اسکی وجہ سے پیدا ہوں گے اُنکے بار گناہ سے دونوں کو کبھی سبکدوشی نہ ہوگی۔

خاتمہ پر حضرت الٰہ العالمین کی بارگاہ قدس میں بصد عجز و نیاز التجا ہے کہ خداوند ارحم الراحمین اپنے حبیب کریم حضرت خاتم النبیین سید المرسلین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے طفیل میں ہمارے دینی رہناؤں اور دنیاوی سرداروں کو توفیق نیک اور ہدایت کامل عطا فرمائیں تا کہ امت محمدیہ جو "کنتم خیر امۃ" کے ناز آفریں لقب سے مخاطب کی گئی تھی اپنے شرف و فضل سے محروم ہو کر (فالکم بہ دہن) ذلت و خواری کے اُس عمیق سمندر میں فنا نہ ہو جائے جس نے عاد و ثمود، ہامان و شداد اور نمرود و فرعون کی قوموں کو آخری پناہ دی ہے۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا۔ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا، ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ، واعف عنا، واغفر لنا، وارحمنا، انت مولانا، فانصرنا علی القوم الکفرین، آمین۔

نسخۂ حصول مراد انسانی

نسخۂ بےنظیر

آتنک نگرہ گولیاں

معدن تندرستی جاودانی

اگرچہ آپ اس زمانہ میں حد سے زیادہ مبالغہ آمیز لفاظی اشتہاروں میں لاحظہ فرماتے ہونگے مگر ہم اس امر سے برکنار ہوکر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر آپ تندرستی کے خواہاں ہیں یا آپ یا آپکے دوست کو کمزوری اعضائے رئیسہ یا کہ دوران سر یا کہ مرض نسیان جریان احتلام ضعف باہ یا کہ رقت سرعت وغیرہ وغیرہ امراض خبیثہ نے بیحد تنگ کر کے ہر چار طرف سے گھیر لیا ہے اور علاج سے تنگ آکر مایوس ہو رہے ہیں تو ہماری نو ایجاد عالم تقویت بخش آتنک نگرہ گولیاں استعمال کر کے اپنی دلی مراد حاصل کریں اُسوقت آپ کو ہماری راست گفتاری کا بصدق جاں یقین ہو جائے گا۔ بڑے بڑے نامی گرامی مشہور و معروف ڈاکٹروں ویدوں طبیبوں و نیز یورپین صاحبوں نے مذکور گولیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ تجربہ فرما کر انکو بہ اثر اکسیر نافع تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گولیاں نہایت درجے کی مقوی باہ و مصفی خون ہونے کے علاوہ بچپن کی تمام غلط کاریوں کے نقائص کو دور کر کے حالتِ شیب میں عالمِ شباب کا ظہور بتلاتی ہیں مرد و عورت دونوں کو مفید ہیں۔ ان میں رسائین مطلق نہیں بلکہ جڑی بوٹیوں سے ہماری نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں۔ ہر موسم میں ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

قیمت ۳۲ گولیوں کا ڈبیہ ایک روپیہ علاوہ محصول

مزید آگاہی کے لیے ہماری کتاب کام شاستر جو اٹھارہ زبان میں ترجمہ شدہ ہے اور تخمیناً گیارہ لاکھ کے ہم مفت تقسیم کر چکے ہیں ہم سے مفت طلب کر کے لاحظہ فرماویں۔

ملنے کا پتہ

وید شاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر کاٹھیاوار

لوکل ایجنٹ:۔ اندر چند اینڈ کو۔ چوک لکھنؤ

مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی مجلد — صہ
- البرامکہ " " — ہر

مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق — ۸ر
- تحقیق الجہاد مجلد — ہے
- اعظم الکلام ۲ جلد — سے
- مجموعہ رسائل — ے
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۸ر
- حضرت سلیمان — ۳ر
- حضرت ہاجرہ — ۲ر
- حقیقۃ السحر — ۲ر
- حضرت عیسیٰ و صلیب — ار
- یورپ و قرآن — ۳ر
- احسان عام — ار

مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۲ جلد — ے
- نشاط عمر — عہ
- عصائے پیری — ۱۲ر
- اقبال دولہن — ہر
- حسن معاشرت — عہ
- اصلاح معیشت — ۴ہر

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری — ۱۲ر
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۲ر
- امرائے ہنود — عہ

مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند — [illegible]
- سید علی کی تین پڑوسن — سے
- عربوں کا فن تعمیر — ۲ر
- سفرنامہ مسیو تھیونو — عسہ
- جنگ ٹرنسوال — عہ

مولانا عبداللہ العمادی
- کتاب المعارف — ہر
- محکمات — ہر
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- صناعۃ العرب — ۳ر
- فلسفۃ القرآن — ۲ر
- فلسفہ ابن عربی — ۲ر
- کتاب الزکاۃ — ۲ر
- محرم کی بدعتیں — ۳ر

مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن — ۱۲ر
- حیات امام مالک — ۱۲ر
- لغات جدیدہ — عسہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — ہے
- مسلمان عورتوں کی بہادری — ار
- اہل السنت والجماعت — ۸ر

مولوی رشید احمد انصاری
- تحریر المرأۃ — ۱۲ر
- المدنیۃ والاسلام — ۲ر
- سبل جمعیۃ الامم الغربی — ۸ر

ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا — ۲ر
- شمع و شاعر — ۲ر
- بلال — ۲ر
- شکوہ — ار
- جواب شکوہ — ۳ر
- کمل ترانہ — ۲ر
- رموز بیخودی — ہر
- نالۂ یتیم — ۳ر
- فریاد امت — ۴ر
- تصویر درد — ۴ر
- اکبری اقبال — ۳ر

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام — ۱۲ر
- پولیس مین — ۸ر
- نیلی چھتری — ۱۲ر

خواجہ غلام الحسنین
- فلسفہ تعلیم — ۱۲ر
- دستور المعلمین — ۸ر
- معیار الاخلاق — ۶ر
- تنقید معیشت — ہے
- تربیت اولاد — عہ

حافظ عبدالرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ۸ر
- الصدیق — عہ
- المرتضیٰ — عہ
- سیاحت ہند — ۱۲ر

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل — ہر
- روزنامچہ باتصویر — سے
- " بلاتصویر — ہر
- روزنامچہ — ہر
- تسخیر مہر و قمر — ۸ر
- رسول کی عیدی — ۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۸ر
- اسلام کا انجام — ۴ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ
- میلاد نامہ — عہ
- کرشن بیتی — ۱۲ر
- اردو دعائیں — ۶ر
- غدر دہلی کے افسانے — ہر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۸ر
- جگ بیتی — ۶ر
- بچوں کی کہانیاں — ۲ر
- " " — ار
- کم ٹوموت — عہ
- تہروں کے نبی نوشتے — ۸ر
- یورپ میں ۵ سال — ۴ر
- محرم نامہ — ۴ر
- یزید نامہ — ہر
- مغل نامہ — ۸ر
- فرام قبلہ ٹو شملہ — ار

منشی ابوالحسن فریدآبادی
- معلم السیاست — ہر
- تاریخ مصر جدید — ۱۲ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) — للعہ
- حسن سرور " — ہے
- دیول دیوی — ۸ر
- گورا — ۱۲ر
- نیل کا سانپ — ۸ر
- جعفر و عباسہ — ۸ر
- اختر و حسینہ (کامل) — سے

مولانا راشد الخیری
- صبح زندگی — ہر
- شام زندگی — ہر
- طوفان حیات — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- سات روحوں کے اعمال نامے — ۶ر
- الزہرا — ۱۲ر
- لڑکیوں کی انشا — ۸ر
- بنت الوقت — ہر
- سنجوگ — ہر
- گوہر مقصود — ۴ر
- شہید بیداد — ۴ر

منشی محمد حسن خاں
- ہاجرہ — ہر
- ترکوں کی معاشرت — ۱۲ر

صفدر مرزاپوری
- بزم خیال — عہ
- مرقع ادب — عہ
- مشاطۂ سخن — عہ

مولانا اشرف علی صاحب
- نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب — ہر
- تعلیم الدین — ہر
- اکسیر فی اثبات التقدیر — ۸ر
- الانتباہات المفیدہ — ۱۲ر
- اصلاح الرسوم — ۴ر
- مناجات مقبول — ۶ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے — ۱۲ر
- بہشتی گوہر — ۶ر

مرزا سلطان احمد
- اساس الاخلاق — ۱۲ر
- فنون لطیفہ — ہر
- خیالات — ہر
- امثال — ہر
- فن شاعری — عہ

نیاز فتحپوری
- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ رضی — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر
- کیوپڈ اینڈ سائکی — ۸ر

سیماب اکبرآبادی
- سیر خدیجۃ الکبریٰ — ہر
- بنت الرسول — ۵ر
- زیب النسا بیگم — ہر
- نورجہاں بیگم — ہر
- جام کوثر — ہر
- بہشتی جھومر — ۱۲ر

المیزان مولانا شبلی کے معترضین [illegible] کا جواب۔ شائستہ، ظریفانہ اور انصاف پسندی کے ساتھ۔ کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت ۸ر، ازواج الانبیاء ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مشہور مصنفین لکھنؤ کی کتابیں

مولانا عبدالحلیم شرر
- عزیز مصری — عمر
- ابوبکر شبلی — عمہ
- خواجہ معین الدین — ۸ر
- عہد قدیم — عمہ
- آغائی صاحب — عہ
- دولت ہسپانیہ عرب — ۱۲
- حروب صلیبیہ — ۱۲
- مسیح اور مسیحیت — عمہ
- مخدرات (۲ جلد) — ۱۲
- تذکرۂ مشاہیر عالم — ۱۲
- مقدس نازنین — عمہ
- قیس و لبنیٰ — ۱۲
- ایام عرب — ۱۲
- فلورا فلورنڈا — ۱۲
- ملک العزیز ورجنا — عمہ
- فردوس بریں — عمر
- شہید وفا — عمر
- حسن کا ڈاکو — عمہ
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — ۱۲
- الفانسو — ۱۲ر
- فلپانا — عمہ
- فاتح مفتوح — ۱۲
- جویائے حق — ۱۲
- بابک خرمی حصہ — عمہ
- تاریخ بغداد — ۴ر
- حسن بن صباح — ۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین — ۲ر
- حاجی بغلول — ۱ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس — ۱۲
- طرحدار لونڈی — ۱۲
- میٹھی چھری — ۴ر
- کایا پلٹ — ۱۰ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- مشو — ۲ر
- بچھڑی دلہن — ۸ر
- کڑم دھڑم — ۴ر
- پی کہاں — ۵ر
- کامنی — ۱۲
- خدائی فوجدار — ۱۲
- فسانۂ آزاد — عہ
- الف لیلہ دنیازادے — ۱۲
- سیر کہسار — عمہ
- جام سرشار — عہ

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنا منی — ۱۰ر
- ماتر آشیں — ۱۰ر
- بنگالی دولہن — ۱۲ر
- پرتاپ — ۲ر
- معشوقۂ فرنگ — ۸ر
- بروگ — ۵ر

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا — عمہ
- لیلیٰ مجنوں — ۸ر
- نوبہار — ۲ر
- مثنوی اُمید و بیم — ۴ر

منشی احد علی بی اے
- تاریخ تمدن (۲ جلد) — ۱۲
- شباب لکھنؤ — عمہ
- مرقع اودھ — ۸ر
- حرماں نصیب — عمہ

مسٹر علی ماجد بی اے
- تاریخ فلاسفۂ یورپ مجلد — عمہ
- فلسفہ جذبات — عمہ
- فلسفہ اجتماع — عمہ
- غذائے انسانی — ۳ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
- زود پشیماں (ڈراما) — ۸ر

پنڈت چکبست بی اے
- صبح وطن — عمر
- گلدستۂ پنچ — عمہ
- کملا — ۸ر

انیس احمد عباسی بی اے
- ہاجرہ کی کامیابی — ۴ر
- بھری جنگ — ۸ر

جلال مرحوم
- مضمون ہائے دلکش — عمر
- نظم نگارین — عمر
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالۂ تذکیر و تانیث — ۸ر
- منتخب القواعد — ۱۲ر

منشی احمد علی شوق
- ترانۂ شوق — عمر
- عالم خیال — ۱۲ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- سودس لیلیٰ دونہا — ۸ر
- سکیفرن دلوسی — ۱ر

منشی ارتضا علی شرر
- یادگار شرر — ۲ر
- خیاباں — ۴ر
- ہفت گلبن — ۸ر
- صبح وصل — ۲ر
- تصویر عبرت — ۱۲ر
- دو پھول — ۴ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی — ۴ر
- اصلاح زبان اردو — ۴ر
- تذکرۂ آب بقا — عمہ
- گلدستۂ ظرافت — ۲ر
- ہچولی — ۷ر

منشی سید برکات احمد
- جمیلہ — ۱۲ر
- تبلیغ وفا — ۱۲
- یادگار سلف صالحین — ۱۲ر

علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام حصہ اول — عمر
- ایضاً حصہ دوم
- فن ہیئت — ۸ر
- فن کمسٹری — ۶ر
- التناسخ — ۴ر

مسٹر شبیر حسین قدوائی
- ڈاکٹر طبیب محمود عربی — ۱۰ر

مشیر
- عرض حال — ۱ر
- تعلیم نسواں — ۳ر
- جذب دل — ۸ر
- حاکم و محکوم — ۲ر

منشی امیر حسن کاکوروی
- فسانۂ لارنس ورتھ — عمہ
- وگیزونسیڈا — عمہ
- الہ دین دیلمی — عمہ

مرزا فدا علی خنجر
- محل خانۂ شاہی — ۴ر
- بے زبان دلہن — عمر

- قواعد اردو — ۱۲
- کلیات نعت — عمہ
- محاربات صلیبی — عمہ
- تسخیر فرانس — ۸
- واقعات کربلا — عمہ
- الاحسان — ۸
- میلاد ابن جوزی مترجم — ۴
- حیات نظامی — ۲
- تذکرۂ حزیں — ۲
- سکیفرن دلوسی — ۴
- ایک ان دن خدا پرست — ۱
- مصنوعی شوہر — ۱
- زود پشیماں — ۶
- نوبہار — ۱
- کنولا (۲ جلد) — ۱
- مثنوی صبح امید
- وصول شیخ
- تاریخ ہند کی کہانیاں
- عہد ترکی انشا
- اساس التعلیم
- شعر العجم حصہ اول
- ایضاً حصہ دوم
- مجموعۂ کلام شبلی
- ترقی زبان
- عہد ترکی زنانہ
- اتفاقات زمانہ اور مساوات
- جمیل و جمیلہ — ۴ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۱	یکم نومبر ۱۹۱۸ء	جلد ۱۹

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر:- اسحاق علی علوی

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلی
- عود ہندی ۱۲؍
- دیوان غالب قسم اعلیٰ
- معہ شرح مستدامانی
- کلیات فارسی

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مجموعہ نظم حالی ۱۲؍
- مسدس حالی ۴؍ ۸؍
- شکوۂ ہند ۲؍
- مثنوی حقوق اولاد ۳؍
- رباعیات حالی ۴؍
- مرثیہ مرزا غالب ۱؍
- بیوہ کی مناجات ۲؍
- الدین یسر ۳؍
- تحفۃ الاخوان
- مناظرہ رحم و انصاف ۱؍
- چپ کی داد ۱؍
- نجگ خدمت ۱؍
- ٹھپو اور ایکے کا مناظرہ ۱؍
- حب وطن ۱؍
- تعصب اور انصاف ۱؍
- تدبیر ۱؍
- مضامین حالی
- قطعات حالی ۸؍

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- تفسیر القرآن جلد
- تبیین الکلام جلد
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- سیرۃ فریدیہ ۱۰؍
- اسباب بغاوت ہند ۲؍
- مقالات سرسید
- آخری مضامین سرسید
- ابطال غلامی
- النظر فی بعض مسائل ۱۲؍
- تحریر فی اصول التفسیر ۸؍
- احکام طعام اہل کتاب ۲؍
- ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف ۲؍
- ازالۃ الغین ۵؍
- تفسیر السموات ۸؍
- جواب امہات المومنین ۴؍
- الدعاء والاستجابۃ ۳؍
- کانشنش ۱؍
- ایک نادان خدا پرست ۱؍
- انشاء اللہ ۱؍
- خلق الانسان ۲؍
- الجن والجان ۵؍
- مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی ۲؍
- تنزل علوم دینیہ ۱؍
- مہدی آخر الزماں ۲؍

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد
- ترجمۃ متوسط
- ترجمۃ حمائل شریف
- ادعیۃ القرآن
- دو سورہ
- مطالب القرآن
- الحقوق والفرائض جلد
- اجتہاد
- امہات الامہ ۱۲؍
- مرآۃ العروس ۱۰؍
- بنات النعش ۹؍
- توبۃ النصوح ۹؍
- مجموعہ نظم بے نظیر
- چند پند ۲؍
- منتخب الحکایات ۲؍
- مبادی الحکمۃ ۱۰؍
- موعظۂ حسنہ ۱۲؍
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ ۱۴؍
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ
- لکچر نمبر ۲۲ و ۲۳ ۳؍
- لکچر نمبر ۲۴
- لکچر تسبیہ
- لکچر تسلیم ۲؍
- نصاب المسلمین ۴؍

مولانا شبلی مرحوم

- آزادی نسواں ۲؍
- نسیم خط ۲؍
- اتمام حجت ۱؍
- سیرۃ النبی صلعم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانح مولانا روم
- بیان خسرو ۱۰؍
- علم الکلام
- الکلام
- سفرنامہ مصر و شام و روم
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- مثنوی صبح امید
- آغاز اسلام ۱۲؍
- اسلامی حکومت ۲؍
- زیب النساء ۱؍
- جہانگیر ۲؍
- مجموعہ کلام شبلی (اردو) ۱۲؍
- دیوان شبلی فارسی ۸؍
- بوئے گل فارسی
- دستۂ گل ۱۲؍
- برگ گل
- قصیدہ امرتسر ۲؍
- الانتقاد (عربی) ۸؍
- توجہ اسحاق فارسی ۱؍

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- کرزن نامہ
- فلسفۂ امثال ۱۲؍
- صحیفۂ فطرت
- تقویم اللسان ۲؍
- تعلیم الانتظام
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲؍
- جغرافیہ طبعی ۸؍
- معادن الحساب ۱۲؍
- رسالہ علم مساحت ۱۲؍
- محاربات عظیم ۸؍
- رسالہ علم تناسب ۲؍

مولوی سید علی بلگرامی

- تمدن ہند
- میڈیکل جورس پروڈنس
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ موسیو تھیونو
- جنگ ٹرنسوال

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- تقلید و عمل بالحدیث
- مکاتبات الخلان
- مسلمانوں کی تہذیب
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب
- کتاب المحبت والشوق
- فطرت و قانون فطرت
- اسلام
- آیات بینات ۲ جلد
- مجموعہ لکچر

مولوی چراغ علی

- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- مجموعہ رسائل
- اسلام کی دنیوی برکتیں
- حضرت سلیمان
- حضرت ہاجرہ
- حقیقۃ السحر
- حضرت عیسیٰ اور صلیب
- یوسف و قرآن
- احسان عام

مولوی عبدا…

- نظام الملک طوسی مجلد
- البرامکہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

گنجینہ

یعنی شاعر قادر الکلام حضرت شوق قدوائی کی تین لاجواب اور بے مثال نظموں کا مجموعہ :- (۱) مثنوی حسن - پہلے دو بار چھپ چکی ہے اور جدید طبع میں ترمیمات کی وجہ سے بالکل نئی چیز ہو گئی ہے (۲) بہار - یہ بھی دوسری بار چھپی ہے اور موسم بہار کی دلچسپیوں کا بہترین نمونہ ہے (۳) سائنس اینڈ ریلیجن - یا طبعیات اور مذہب جس کا ایک جزو عرصہ ہوا رسالہ الناظر میں بطور نمونہ شایع ہوا تھا - اب یہ پوری نظم نکتہ سنجان ادب سے داد طلب ہے - قیمت ۸ر

صوفی جنتری سنہ ۱۹۱۹

جس میں روزانہ پنجگانہ نماز کے اوقات سحری و افطار، بزرگان اسلام کی تاریخہائے وصال، اسلامی تاریخ کے نہایت مشہور واقعات کے علاوہ آیندہ دس سال کی جنتری بھی درج کر دی ہے - ماسوا اسکے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان دعوت اسلام کا عکس، حیدر کرار حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی ذوالفقار کا خاکہ - مامون الرشید خلیفہ عباسی کے فرمان دعوت کا عکس - نجف اشرف کی تصویر - حضرت شیخ سلیم چشتیؒ - حضرت محمد غوثؒ - حضرت حضرت چراغ دہلویؒ - حضرت امیر خسرو دہلوی کے مزارات کے نقشے اور دیگر مفید و کارآمد باتیں ہیں - لکھائی - چھپائی کاغذ نہایت عمدہ - اور گرانی کے باوجود قیمت صرف ۱۲ر

کملا

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی ایڈیٹر صبح امید ایک مشہور انشا پرداز اور مقبول شاعر ہیں - یہ ناول انھیں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے - کئی سال ہوئے چھپا تھا - صرف تھوڑے ہی نسخے رہ گئے ہیں شایقین فوراً طلب کریں

قیمت ۸ر

صبح وطن

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کا مجموعہ نظم - صرف معدودے چند نسخے باقی رہ گئے ہیں - قیمت ۱۲ر

ماہ ربیع الاول قریب ہے

لہذا ذکر میلاد شریف حضرت خیر الانامؐ کا سامان منگایئے

میلاد نامہ - از خواجہ حسن نظامی - قیمت ۵ر

میلاد ابن جوزیؒ - مع ترجمہ اردو قیمت ۴ر

مولود شہیدی - از غلام امام شہید قیمت ۸ر

محامد خاتم النبیین - از منشی امیر احمد مینائی قیمت ۸ر

میلاد سرور انبیا ۸ر مولود شریف سعیدی ۸ر

کلیات نعت مولوی محسن کاکوروی - قیمت ۱۲ر

نعت ہی نعت - - قیمت ۸ر

نشر الطیب - از مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قیمت ۱۲ر

احیاء القلوب ۸ر مولد چراغ جہاں ۸ر

پیغمبر عرب ۱۲ر رسول عربی ۸ر

المشتہر منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنو

جس کا درد وہی جانتا ہے دوسرا کیونکر جان سکتا ہے

سخت سردی کے موسم میں تندرست انسان کا جان لب ہو رہا ہے۔ سردی ہٹانے کے لیے کتنے [illegible] کیے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس بدقسمتی سے دمہ کے مریض خاصکر ناقابل برداشت تکلیف دمہ سے [illegible] پریشان ہوتے ہیں اور رات و دن سانس پھولنے کی وجہ سے دم نکلے جاتے ہیں اور نیند تک حرام ہو جاتی ہے دیکھیے! آج انکو کسقدر تکلیف ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس لاعلاج مرض کی بازاری دوا زیادہ تر نشیلی اشیا اور دھتورہ بھنگ بلاڈونا پوٹاس اوڈائڈ دیگر بنتی ہے۔ اسلیے [illegible] ہوا تو [illegible] مریض بے موت مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی کیمیائی اصول سے بنی ہوئی ہے۔ دمہ کی دوا ایک انمول جوہر ہے۔ یہ صرف ہماری ہی بات نہیں ہے بلکہ ہزاروں اس مرض سے شفا پاکر مداح ہیں۔ آپ [illegible] کچھ خرچ کیا ہوگا۔ لیکن ایک مرتبہ اسے [illegible] آزمائیں۔ اس میں نقصان نہیں۔ قیمت فی شیشی محصولڈاک [illegible] اس دوا کے دو خاص فوائد ہیں (۱) ایک خوراک میں دمہ دبتا ہے (۲) اور کچھ روز کے استعمال سے جڑسے جاتا ہے اور جب تک استعمال میں ہے [illegible] دورہ نہیں ہوتا ہے۔

پلیگ سے کیوں ڈرتے ہو

سوائے اور سب بیماریوں کے اس سے ڈرنے کا سبب یہ ہے کہ آج تک لاکھوں انسان اس موذی عارضہ کے پنجہ ظلم سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ گانوں کے گانوں اوجاڑ ہو گئے شہر کے شہر تباہ ہوئے اسوجہ سے اسکے نام ہی سے دہشت معلوم ہوتی ہے۔ پلیگ میں مبتلا ہونے کے بعد پھر کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن بنظر حفظ ماتقدم ڈاکٹر ایس کے کی پلیگ [illegible] والی گولیاں منگوا کر ضرور رکھ لیں ان گولیوں کے استعمال سے جسم کے خون میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے جس سے پلیگ کے کیڑے نہ ٹھہر سکتے ہیں اور نہ زہر اثر کر سکتا ہے وقت پر ان گولیوں کے استعمال سے ہزاروں انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہیں آپ بھی غافل نہیں ہیں ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل جانا چاہیے۔ بچوں کو نصف یا چوتھائی۔ قیمت ۳۶ گولیوں کی ڈبیہ ۱ر ساٹھ گولیوں کی ڈبیہ ۲ر محصولڈاک ۲ ڈبیہ تک ۵ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ۔ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

چند نایاب کتابین

امیر اللغات

منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم کی لاجواب لغت کی دونون جلد دیکھے چند نسخے دستیاب ہوے ہین۔ جو شائقین اسکے قدردان ہون وہ فوراً منگالین قیمت ہر دو جلد عہ

حیات وارث

اعلیحضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کے مفصل حالات و واقعات قیمت عہ

ارشادات ہز آنر

ہز آنر سر جان ہیوٹ سابق لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ کی مختلف تقریرون کا مجموعہ قیمت عہ

آئینہ اودہ

اس لاجواب تاریخ مین نہایت تحقیق کے ساتہہ اودہ اور اُن شریف خاندانون کے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہین جسکی وجہ سے اودہ کو "باغ ہند" کا لقب ملا ہے۔ جن اصحاب کو تاریخی تحقیق کا ذوق ہو اُن کے لئے یہ کتاب ازحد کارآمد ہوگی قیمت عہ

انجینیرنگ بک

ٹھیکیدارون مستریون اور دیگر اشخاص کے لئے جنکو تعمیر عمارت کا کام رہتا ہو یہ کتاب بہت مفید ہوگی قیمت عہ

سیرۃ رسول

مولفہ مولوی فضل الدین صاحب واقفہ الہ تسری مطبع کشمیری چنی مقدمہ کتاب ... صفحے قیمت عہ

قومی مثنوی

از جناب حاجی مولوی احمد علی صاحب رئیس بہار شریف۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی مبسوط نظم ہے جس مین مسلمانون کی حالت بیان کرکے اُن کے نقائص دور کرنے کی مناسب تدبیرین بیان کی گئی ہین اور مصنف علام نے اپنی کمال شاعری سے اصلاح قوم کا کام نہایت خوش اسلوبی سے لیا ہے حجم ۶ جزو قیمت ۱۲/

مصباح الکلام فی طرق الاسلام

مؤلفہ مولانا محمد عبد الغفور فاروقی رئیس محمد آباد ضلع اعظم گڈہ۔ اس کتاب مین منافع عناصر اربعہ شان رزاقی، شان وحدت، خلقت انسانی، قوت عقلی، اسلامی عقائد، بعثت انبیا کے وجوہ، فرقہ ہنود کا تذکرہ، بت پرستی، الاسلام، اسلامی تعلیم کی خوبیان، ازدواج وتعدد ازدواج کے متعلق عقلی فیصلہ، طلاق کی حقیقت، تذکرہ ازدواج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، محاسن اخلاق کی تعلیم، راستبازی، رحمدلی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور حکومت، الجزیہ، اسلام پر زوال، مباحث متعلقہ بہ تقدیر، مجموعہ احادیث قرآن، معانی قرآن، اور تذکرہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ نہایت شرح وبسط کے ساتہہ آیات قرآنی و احادیث نبوی سے ثابت و بیان کئے گئے ہین۔ کاغذ ولایتی۔ لکہائی چہپائی اعلیٰ درجہ کی۔ ٹائیٹل بہت خوبصورت قیمت ؎

حدائق البیان فی معارف القرآن

مولانا محمد عبد الغفور فاروقی کی یہ دوسری لاجواب تصنیف ہے جسمین کلام الٰہی کے متعلق نہایت دقیق معارف وحقائق بیان کئے گئے ہین۔ اور نزول وحی، جمع قرآن، قرآن کریم کا رسم خط، دلائل اعجاز، فضائل قرات، تعلیم قرآنی، آداب تلاوت، فوائد آیات شریف وغیرہ تمام امور پر عالمانہ پیرایہ اور سلیس عبارت مین بحث کی گئی ہے کاغذ لکہائی چہپائی اعلیٰ درجہ کی۔ خوشنما سرورق قیمت عہ

دلائل فضائل اسلام

از مولوی شیخ محمد عبد الرؤف صاحب رئیس مؤ ائمہ۔ جسکی پہلی جلد مین مذہب کی ضرورت، اوسکی بزرگی، اوسکا معیار، مذہبی بے تعصب تحقیق کے فوائد، اسلام کا تمام مذاہب سے کمل ہونا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل ہدایت اور دوسری جلد مین نبوت و معاد اور عبادات کے متعلق قرآن وحدیث اور اقوال حکمائے قدیم وحال کی مدد سے بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے اور جابجا معقول و منقول کے ... قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ

شرع محمدی حصہ اول

علم الفرائض پر اردو مین اس سے بہتر تصنیف نہین شائع ہوئی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ چہہ بار چہپ چکی ہے اور آخری طبع کے بہی محدود نسخے رہ گئے ہین قیمت ۱۲/

حزب البحر

اعلیٰ حضرت حاجی شاہ امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے خاندان مین جس طریقہ پر رائج ہے اوسکے مطابق نہایت خوبی کے ساتہہ چہپی ہے قیمت ۲/

شہادت نامہ

جناب مولانا حافظ شاہ علی انور صاحب قلندر مرحوم کی نہایت اہتمام اور کوشش کے ساتہہ واقعات شہادت سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کو جمع کرکے نہایت سلیس اور دلکش پیرایہ مین لکہا ہے قیمت عہ

صراط مستقیم

از مولف دلائل فضائل الاسلام قیمت ۶/

(المشتہر منیجر ناظر بک ایجنسی لکہنؤ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۱۳ - جلد ۱۹ یکم نومبر ۱۹۱۸ء

فغان حسرت (یا) مرثیہ تھامس گرے

(سلسلہ ماہ جولائی ۱۹۱۸ء)

جولائی نمبر میں عرض کیا جا چکا ہے کہ گرے کی ایسی اقلیم شاعری میں اُسکے تاج شہرت کا دلآویز ترین طرۂ امتیاز ہے - مغربی خیال بندوں کو اس مشرقی فیضِ عمیم کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ ایشیا نے اپنی کرم گسترانہ نوازشاتِ عمومی دنیا جہان کی صلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیں۔ خطۂ عرب کا وہ حکیمانہ عالمگیر تمدن جو دنیاوی فیض و برکت کا بانی تھا صفحاتِ تاریخ پر روز روشن کی طرح اپنی دل آویز لمعانی سے نور کے ڈورے دوڑا رہا ہے - کوئی اس کائناتِ فطرت سے یہ تو سوال کرے کہ اس مشرقی تمدن کے اُسپر کیا کیا احسانات ہیں؟ علم زرعیات و نفسیات، علم الحیوان و ارضیات، علم جمادات و نباتات، جر ثقیل و کیمیا، علم ارتقا و الٰہیات، علمِ ہیئت و نجوم، فلسفہ و ریاضی - الغرض جتنے علوم و فنون کے میدان ہیں سب میں صحرا نشین عربوں نے گام زنی کی اور گراں قدر تصنیفات و تالیفات کی وجہ سے اپنی ہمعصر اقوام سے کوسوں آگے نکل گئے۔

فن شاعری تو گویا اس بادیہ گرد قوم کی گھٹی میں پڑا تھا - مرد تو درکنار لڑکیاں اور عورتیں تک فصیح و بلیغ شاعروں کی برابری کا دم بھرتی تھیں - منگو پارک اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتا ہے کہ

"دورانِ سفر میں ایک شب مجھے ایک بادیہ نشین عرب کے خیمہ میں فرودکش ہونے کا موقع پیش آیا جسکی کُل کائنات ایک چمڑے کا بستر، ایک گاڑھے کی چادر اور دو چار مٹی کے برتن وغیرہ تھی۔ اس غریب کے گھر میں چٹکی بھر آٹا بھی نہ تھا جوں ہی میں اسکے خیمہ کے قریب پہونچا اس صحرا نشین بدو نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور اپنی دہ سالہ لڑکی کو تھوڑے سے جو نکال کر پیسنے کے لیے دیے تاکہ اُسکے آٹے کی روٹی پکا کر میری ضیافت کی جائے۔ میں اُس بدو کے ساتھ مختلف باتیں کرتا رہا۔ اس اثنا میں لڑکی نے جو پیس لیے۔ عام ہے کہ عموماً کل عورتیں پیستے وقت گاتی ضرور ہیں تاکہ تکان نہ معلوم ہو۔ مگر جس چیز نے مجھے سخت تعجب میں ڈالا وہ یہ تھی کہ اُسنے جو گیت گایا وہ گویا میری عادات، اطوار، گفتار و رفتار کا آئینہ دار تھا۔ نہ قلم کی ضرورت پڑی نہ دوات کی۔ پیستے ہی پیستے میری تعریف میں ایک اچھا خاصہ قصیدہ بیان کر دیا۔ میں اس کمسن لڑکی کی طباعی اور بدیہہ گوئی دیکھکر محوِ حیرت ہو گیا۔ ؎ ایں سعادت بزورِ بازو نیست + تا نبخشد خدائے بخشندہ"

امرا القیس جو عرب کا ایک فصیح و بلیغ شاعر تھا اسے ایک مرتبہ دشمنوں نے آگھیرا۔ اور اپنی خون آشام تلواریں سونت کر اُسکے قتل کے درپے ہوئے۔ امرا القیس نے اپنے قاتلوں سے کہا کہ انسان تو صحرائے ہستی و نیستی کی درمیانی راہ میں گویا ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ اور اُسکی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر میں ہے۔ تم لوگ بخوشی تمام میرے آبِ گلو سے اپنی شمشیرِ تشنہ کی پیاس بجھا سکتے مگر قبل ازیں کہ میں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاؤں میری یہ التجا ہے کہ مجھے سپردِ خاک کر کے میری دونوں بیٹیوں سے جا کر صرف اتنا کہدینا (۱) یا ابنتی امرئ القیس ان اباکما قد قتل[1] جب ڈاکوؤں نے امرا القیس کی بیٹیوں کے سامنے یہ مہمل مصرعہ پڑھا تو ان نصیب زدہ لڑکیوں نے مصرعہ پر غور کیا چونکہ فن قوافی کے بحرِ ذخار پر کامل عبور حاصل تھا فوراً تاڑ گئیں۔ اور دل ہی دل میں خیال کیا کہ "اباکما" کا ہم قافیہ لفظ صرف "لدا کما" موزوں ہوسکتا ہے۔ اور معاً شعر کو اس طرح پورا کیا

یا ابنتی امرئ القیس ان اباکما
قد قتلاہ[2] وقاتلاہ لدا کما

شعر کا موزوں ہونا تھا کہ فرطِ وحشت سے دونوں نے اک چیخ ماری۔ قبیلہ کا قبیلہ ان قاتلوں پر ٹوٹ پڑا اور چشم زدن میں اُنھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

---

[1] اے امرا القیس کی بیٹیو تمھارے پدرِ بزرگوار نے قتل کیا ہے۔ [2] دونوں قاتلوں نے اُسے تہِ تیغ کیا ہے اور وہ تمھارے سامنے

اس قسم کے صدہا واقعات ہیں جن میں سے ایک حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے۔ یعنی ایک شب کہیں جناب فاروقؓ اعظم مدینہ کی گلیوں میں خفیہ طور سے گشت لگا رہے تھے آپ نے کسی سپاہی کی بیوی کو فراق و ہجراں نصیبوں کی کشمکش میں چند مناسب حال اشعار پڑھتے ہوے سنا۔ اُنکے دل پر اس واقعہ نے اتنا گہرا اثر کیا کہ فوراً ممالک اسلام میں بدیں مضمون حکم نافذ فرما دیا کہ "چار مہینے سے زیادہ کوئی سپاہی اپنی اہلیہ سے جدا نہ رہنے"۔ کسی فطرتی خوشگو شاعر نے خوب کہا ہے

ٹپک پڑتے ہیں آنسو باغ میں چشمِ عنادل سے ۔۔۔ اسیرانِ چمن جب رات کو فریاد کرتے ہیں

اسوقت عربی شاعری پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ موجودہ انگریزی شاعری کی داغ بیل عربی نیچرل شاعری ہی نے ڈالی ہے اسلیے اسکا بیان اختصاراً کرنا بھی لازمی تھا۔ اس بات کو اہلِ یورپ تسلیم کیے ہوے ہیں کہ عربی شاعری سچے واقعات کا مرقع ہے اور جذباتِ باطنی نے اسے موزوں الفاظ کا جامہ پہنا کر گویا فطرتی قالب میں ڈھال دیا ہے۔

عہد ہارون و مامون کے شاندار کارنامے روزِ روشن کی طرح صاف طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ ان ہر دو فرماں روایانِ جلیل القدر کی نظرِ عاطفت نے صحرا نشین بدوؤں کو اتنا علم دوست بنا دیا تھا کہ اُنھوں نے شاعری کے علاوہ فارسی، سنسکرت، مصری اور یونانی زبانوں کی سنگلاخ کتابوں کو پانی کر کے بہا دیا اور اس آبِ مصفا سے اپنے چمنستانِ علم و فضل میں بوقلموں گُل بوٹے کھلائے۔

عربوں کی ہمہ گیر عقلِ رسا نے یہاں تک معلومات حاصل کر لی تھی کہ امام غزالیؒ نے علم الکلام میں ایک مدلل کتاب لکھی۔ علاوہ ازیں امام فخر الدین رازیؒ نے ایک انسائیکلو پیڈیا موسوم بہ "سِتّینی" تالیف کی جس نے مغربیوں کے دلوں میں مختلف اقسام کی، انسائیکلو پیڈیائیں لکھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ زمانۂ ماسبق کے عرب اس بات کے خواہاں تھے کہ اپنے آتشبار صحراؤں کی جھلسا دینے والی بادِ سموم کی لپٹوں کو علمی چشموں اور تمدنی فواروں کی مدد سے سیراب کر دیں۔ خدا کی شان ہے کہ چند صدیوں پیشتر جن عربوں میں انتہا درجہ کی آزادی اور شوخ چشمی تھی، بعثت حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ دنوں بعد اُنکا یہ حال ہو گیا کہ حلم و مروت، تہذیب، ذکاوت، بردباری و صلاحیت میں وہ جہان بھر میں ضرب المثل مانے جانے لگے۔

نکل سکتا نہیں دریا کبھی آغوشِ ساحل سے ۔۔۔ بنا لیتی ہے آزادی بھی اپنی حدِ آزادی

لے ثبوت آگے بیان ہوگا۔

دکن کی شاہی لائبریری ہے جس میں صدہا نفیس و نایاب قلمی کتابیں مختلف علوم و فنون میں موجود ہیں جو شاہان بہمنی اور مغلوں کا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

جبلہ ابن الایہم کے قصہ سے قارئین کرام واقف ہوں گے کہ عہدِ خلافت فاروقی میں کسی کا پَیر جبلہ کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس شخص کے منہ پر ایسی بے رحمی سے طمانچہ مارا کہ اُسکے دانت ٹوٹ پڑے۔ جناب فاروقؓ نے مدعی کو قصاص لینے کا حقدار ٹھیرا کر جبلہ سے فرمایا کہ تو ہرگز اس جُرم سے بَری نہ ہو سکے گا۔ ہاں اگر قصاص دیدیا جائے تو تجھپر کسی قسم کا الزام باقی نہ رہیگا۔ جبلہ نے یہ سنکر کہا کہ "میں ایسے اسلام ہی کا حلقہ بگوش ہونا پسند نہیں کرتا جو امیر و غریب کے حقوق و مراعات میں کوئی فرق امتیازی نہ رکھے"۔ یہ کہکر رات ہی رات جبلہ مدینہ سے فرار ہوگیا اور روم جاکر قیصر روم کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی۔ قیصر روم نے اسکی خوب آؤ بھگت کی اور اسکے لیے دنیا بھر کے عیش و عشرت کے سامان مہیا کر دیے۔ صحابہ میں سے ایک شخص کو پھرتے پھرتے روم جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ جبلہ کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "جبلہ ہمہ تن عیش بنا ہوا تھا اُسے آٹھوں پہر خوبصورت کنیزیں گھیرے ہوے رہتیں۔ ایک شب مجلس رقص منعقد ہوئی۔ کنیزوں نے پہلے رومی پھر ارمنی، بعد ازاں عبرانی زبان میں نغمہ سنجی کی اور ایک راگ اس قسم کا نکالا کہ جبلہ بے تحاشا رو پڑا۔ اسکے بعد جب عربی زبان کے چند اشعار پڑھے گئے جبلہ کھلکھلا کر ہنسا اور عربی شاعری کی موزونیت کی بہت تعریف کی۔

اسوقت قیصر روم عیسائی تھا، جبلہ بھی عیسائی ہوگیا تھا مگر چونکہ عربی زبان کے چٹخارے سے لذت یاب ہوچکا تھا۔ جب کبھی عربی اشعار کسی مغنّی یا رقاصہ کی زبان سے سنتا اتنا خوش ہوتا کہ فرطِ مسرت سے اُسے اپنی خبر نہ رہتی۔ یہ حالت تھی مشرقی عیسائیوں کی۔ اور انھیں لوگوں میں سے چند مشنری یورپ میں مذہبی مشن لیجایا کرتے تھے جو عربی داں ہوا کرتے تھے۔ اسلیے ممکن ہے کہ ان لوگوں نے بھی اہل مغرب کو عربی شاعری کی عذوبت و سنجیدگی سے آگاہ کر دیا ہو۔

جب عرب و عجم میں علم کے چشمے بہنے لگے اور حکایات الصالحین اور مولانا فریدالدین عطار کی تذکرۃ الاولیا لکھی گئی اس کا تتبع یورپ میں بھی کیا گیا اور ۱۲۸۰ء میں رابرٹ آف گلوسٹر نے ایک کتاب موسوم بہ "سوانح و حکایات اولیاے برطانیہ" لکھی۔ جسکی بڑی قدر کی گئی۔ جب

ف ل ہسٹری آف انگلش لٹریچر مصنفہ ڈاکٹر میکلفرسن صفحہ ۲۱۵۔

اہل یورپ کو یقین واثق ہوگیا کہ واقعی میں مشرق علوم و فنون کا مخزن ہے اور وہاں کے علم و ہنر اور تمدن سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنا منفعت سے خالی نہ ہوگا تو ۱۳۲۲ء میں ایک شخص جان مانڈویلی[۵۱] نامی نے "سفرنامۂ ممالک مشرقی" لکھا۔ اس کتاب کا شایع ہونا ہی تھا کہ اہل مغرب جوق جوق مشرق کی جانب آنے لگے۔ اور ہر ایک کا دامنِ شوق گلہائے مراد سے بھر ہی گیا

شاہان یورپ کے ظلم و تشدد کی اصلاح کے لیے اہل مغرب کی مجال نہ تھی کہ کوئی کلمۂ نصیحت زبان سے نکالتے کیونکہ ہومر یونانی کا شعر[۵۲]:۔

یہ کہنا بادشہ سے قبلۂ عالم ہیں غلطی پر — بنا دیتا ہے شیروں کے دلوں کو خوف سے مضطر

انھیں از بر تھا اور وہ اسکی خلاف ورزی کے لیے مطلق[۵۳] آمادہ نہ تھے مگر جس وقت سعدی کی گلستاں لکھی گئی اور اسکا بابِ عدل انکی نظر سے گذرا تو ایک باہمت شخص تھامس سیاکولی نامی ڈرتے ڈرتے اٹھا۔ اور ۱۵۵۹ء میں ایک کتاب موسوم بہ مرأۃ الاولین[۵۴] لکھی جس نے منصفوں اور مجسٹریٹوں پر بہت کچھ اثر کیا

سر تھامس رو جب دربار جہانگیر میں تھا تو اہل یورپ سے ہمیشہ سلسلۂ رسل و رسائل جاری رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار آرچ بشپ آف کنٹربری کو خط کے ذریعہ سے اطلاع دی تھی کہ جہانگیر مختون نہیں ہے۔" جب ادنی ادنی باتیں یورپ پہونچ جایا کرتی تھیں تو کیا علمی حالات سے آگاہ ہونا بعید از خیال بات ہے؟ اکبر کے شغف علمی نے سیکڑوں یوروپین مشنریوں کو آگرہ میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ اور عہد اکبری کا گرجا اب تک آگرہ میں موجود ہے جو زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ وہ صدہا افراد کے ترانہائے مسیحی کے دلچسپ نغموں سے گونج اٹھتا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ عہد اکبری میں کئی سو عیسائی ہونگے ورنہ دو ایک افراد کے لیے کون گرجا تعمیر کرتا۔ انھیں یوروپین لوگوں کی وساطت سے فرانس اور اٹلی کی صدہا چیزیں ہندوستان میں آیا کرتی تھیں لاطینی اور یونانی زبان کے تراجم بھی انھیں لوگوں کی جگرکاوی کا نتیجہ ہیں۔ شراب پرتگالی اکبر کے

---

۵۱ ہسٹری اف انگلش لٹریچر مصنفہ ڈاکٹر میکفرسن صفحہ ۲۱۸۔

۵۲ اصل شعر یہ ہے: "Bold is the task when subject grown too wise: To instruct a monarch where his error lies.

۵۳ ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ ۲۲۰۔

۵۴ رسالۂ العصر ماہ مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۴ ۵۵ مخزن فارسی لکچر ۲ صفحہ ۶۸

زمانہ ہی سے آنا شروع ہو گئی تھی اور اسکے مبادلہ میں صہبائے معانی اہلِ مغرب کے جام و سبو کی نذر ہوا کرتی تھی۔ ہندوستان کے تمول اور علم و فضل کا چرچا یورپ میں زبان زدِ خاص و عام ہو چکا تھا۔ کم سے کم شیکسپیئر مشرقی علوم و فنون اور تمول سے ضرور واقف تھا ورنہ وہ ہرگز نہ کہتا کہ

My crown is in my heart, not on my head,[ٹہ]
Not decked with diamonds and Indian stones,
Nor to be seen: my crown is called Content
A crown it is that seldom Kings enjoy.

دیکھیے تشبیہ کے لیے ہندی جواہرات کا ذکر کیا ہے اور جس طرح مشرقی جواہرات کا حال بیان کیا ہے اسی طرح پورا قطعہ بھی مشرقی رنگ میں ڈھال دیا ہے۔ گویا سعدی کی کریما اور عطار کے پندنامہ کے بابِ قناعت کا نچوڑ ہے۔ شیکسپیئر ہمیشہ مشرقی خیالات کو اپنے قلم سحر نگار کے دائرہ میں اس خوبی سے لیا کرتا تھا کہ سامعین پر اُسکا فوری اثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

دو چار یا دس پانچ چیزوں کا ذکر کرکے اُنکا نتیجہ ایک ہی فعل سے نکالنا خاص مشرقیوں کی ایجاد ہے۔ ہند میں کبیرؔ اور تلسی داس کے اس رنگ میں بیسیوں دوہے ہیں۔ فارسی میں سعدی کو اس فن میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ مثلاً فرماتے ہیں

قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

یا کسی دوسری جگہ بیان کرتے ہیں

دو چیز طیرۂ عقلست دم فرو بستن بوقتِ گفتن و گفتن بوقتِ خاموشی

اسی رنگ میں شیکسپیئر بھی اپنی جولانیٔ طبع دکھاتا ہے اور اہلِ یورپ کو محوِ حیرت بنا کر جدت طرازی کا لقب پاتا ہے۔ فارسی میں ایک مصرعہ ہے "حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را" اسکے ثبوت میں شیکسپیئر نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ہے۔ سحر طرازی اور رنگ آمیزی کی انتہا کر دی ہے۔ کہتا ہے :—

لہ رسالہ اسرار ماہ مارچ ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۰

ٹہ (ترجمہ) میرا تاج میرے دل میں ہے وہ زیبِ سر نہیں۔ نہ تو وہ ہیروں سے مرصع ہے نہ ہندی جواہرات سے مزین ہے وہ چشمِ ظاہر سے پوشیدہ ہے۔ آخر وہ ہے کیا؟ تاجِ قناعت و سیر چشمی ہے جو ایسا گراں بہا تاج ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی تاجِ شاہاں اُس سے فیضیاب ہوتا ہو۔

To gild refined gold to paint the lily
To throw a perfume on the violet.
To smooth the ice or add another hue
Unto the rainbow, or with taper light
To seek the beauteous eye of heaven to garnish
Is wasteful and ridiculous excess.

(ترجمہ) زر جعفری کو آب طلا میں غوطہ دینا، یا گُل سوسن کو مصنوعی رنگ و روغن سے آراستہ کرنا، گُل بنفشہ کو عارضی عطر بیزی سے نکہت بیز بنانا، یا برف کو چکنا بنانے کی کوشش بیجا کرنا، قوس قزح میں کسی دوسرے رنگ کا اضافہ کرنا یا خلاق عالم کی رسیلی اور دلفریب چشم باریک بیں کی زیب و زینت بڑھانے کے خیال سے شمع کافوری لیے ہوئے اندھیرے اُجالے اُسکی ٹوہ میں پھرنا، یہ جملہ باتیں فضول اور قابل تضحیک خرافات سمجھی جاتی ہیں)

شکسپیر نے اگرچہ باضابطہ تعلیم قابل تعریف حاصل نہ کی تھی تاہم فطرت نے اسے اس بلا کا اخاذ دماغ عطا کیا تھا کہ صغر سنی میں جتنے قصے اور کہانیاں سُنی تھیں وہ سب کی سب لے ازبر تھیں۔ اس نے اپنے خیالات کی توسیع کے لیے یونانی کتابوں کے ترجموں سے بھی مدد لی اور ہمیشہ نئی باتیں اور تعجب خیز خیال بندیوں کی ٹوہ میں لگا رہتا۔ اس نے جو کچھ پایا بن جانسن کی بدولت[1] پایا۔ جس طرح بن جامین ابن یمین سے بنا ہے اسی طرح بن جانسن کو بھی سمجھ لیجیے۔ بن جانسن کے نام کے ساتھ لفظ 'بن' زبان حال سے کہ رہا ہے کہ مجھ سے مشرقی رنگ ٹپک رہا ہے۔ یہ بن جانسن ایک مشاق ڈراما نگار اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا وہ پختہ مشق سخنداں ہونے کے علاوہ ہمہ داں سیاح بھی تھا۔ اسکے سوانح و حالات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بغرض معلومات یونان تک پہونچا تھا اور مشرقی خیالات اور قصہ جات کا ایک بڑا بھاری ذخیرہ اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا[2]۔

شکسپیر کے غالباً کل ڈراموں سے مشرقیت ظاہر ہوتی ہے۔ رومیو اور جولیٹ میں ایک خواب آور دوا کے ایک گھونٹ پلا کر جولیٹ کو مردہ ظاہر کر دینا۔ اور بعد میں اُسکا خود بخود ہوش میں آجانا۔ ہملیٹ کے محترم باپ کے کان میں اسکی بیرحم ماں کا زہر ڈالنا۔ اور بعد مرگ ہملیٹ کے متوفی باپکا

[1] سٹینس لائیوز آف گریٹ مین شکسپیر
[2] " " " بن جانسن

روحانی مجسمہ راتوں کو نظر آنا - یہ جملہ خیال بندیاں بالکل ایشیائی رنگ لیے ہوے ہیں۔ ڈلسمر نائٹس ڈریم میں ٹیٹان کی آنکھوں میں ایک قسم کا عرق ٹپکا کر اُسے عالمِ غیب کے مناظر دکھا دیا - جسکے طلسمی اثر سے وہ ایک کریہ المنظر خر بار بر کو اپنا مونس و ہمدم سمجھتی ہے - حقیقۃً ایشیائی خیال ہے اسمیں ایک بے نام و نشان پھول سے کام لیا ہے - گر ایشیائی لمید پردازوں نے تو اس قسم کی حیرت فزا چیز کے نام بھی گڑھ لیے ہیں - اہل ہند الوپ انجن کہتے ہیں تو اہل فارس سرمۂ سلیمانی کے نام سے یاد کرتے ہیں - جسکے تعجب خیز اثر کو دیکھکر ایک بار مرزا صائب نے حلقۂ اربابِ صفا میں جھوم جھوم کر یہ معنی خیز شعر پڑھا تھا :—

دلے کہ روشنی از سرمۂ سلیماں یافت سرابِ بادیہ را جلوۂ پری داند

یہودیوں کی بد اخلاقی، ظلم و تشدد اور انتہا درجہ کی ربٰو خواری ضرب المثل ہے - اور ملتِ بیضا کے عصا بردار وں نے ان ربٰو خواروں کی گراں باری و خونخواری مشاہدہ کرکے " لاتاکلواالربٰوا " کے گراں قدر نصیحت آمیز الفاظ سے اس فعل شنیع کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا - یہ دیکھکر شیکسپیر کا اشہبِ خیال بھی اس میدان خاص میں گرم جولاں ہوتا ہے اور وہ شائی لاک (یہودی) کے ظلم و ستم کے اظہار کے لیے ایک ڈراما تیار کرتا ہے - جسکے فوری اثر سے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ناظرین شائی لاک پر دشنام و نفریں کی بوچھار کر دیتے ہیں گر تعجب ہے کہ یہ فعلِ نا مطبوع آج تک یورپ ترک نہ کر سکا!

ایک اور موقع پر شیکسپیر نے کہا ہے کہ " جب مفلس و قلاش لقمۂ اجل ہوتے ہیں اُسوقت بھی دُمدار ستارہ میدان فلک میں جاروب کش رہتا ہے " - مراد یہ کہ جب کوئی صاحبِ ثروت و حشمت جہان سے اُٹھ جاتا ہے تو طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں اور اگر یہ واقعہ دُمدار ستارہ کے دَور میں ہوتا ہے تو قدامت پسند خیال پرستوں کی جماعت متفق اللفظ ہو کر یہی کہتی ہے کہ دمدار ستارہ ہی کا سبب تھا کہ فلاں فلاں نواب صاحب پر آفتِ ناگہاں نازل ہوئی - اور اگر کوئی مفلس اُسی دَور میں پیوندِ خاک ہو جائے تو کسی کے مُنہ سے بھولے سے بھی یہ نہیں نکلتا۔

چو آہنگِ رفتن کند جان پاک چہ بر تخت مردن چہ بر روے خاک

دیکھیے ہمارا مغربی تاجدار سخن (شیکسپیر) بخوبی واقف ہے کہ عام لوگوں کے اعتقاد میں دمدار ستارہ

منحوس ہے۔ اور یہ تخیل مشرقی واہمہ پرداز خیال کے ہمدوش نظر آتا ہے۔ جناب مولوی صدیق حسن خاں صاحب حجۃ الکرامہ فی آثار القیامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع ذمدار ستارہ شاہان روی الارض اور اہل شہر کے لیے سخت منحوس ہے اور تشریح فرماتے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ میں جبکہ دمدار ستارہ کا دَور دورہ تھا، نادرشاہ نے دہلی کو تاراج کیا اور بیگناہوں کے کشت وخون سے لہو کی ندیاں بہادیں۔ شاہ دہلی نے صدہا تکلیفیں جھیلیں۔ مرزا صائب بھی اس اعتقاد کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک روز کہیں انھیں زلف معشوق کے قریب خالِ سیاہ دکھائی دیا۔ فوراً گھبرا اٹھے۔ اور اسی حالت وحشت میں زبان سے کچھ الفاظ نکل پڑے جنکو بحرو قوافی نے اپنی معجزنمائی سے اس طرح موزوں کر دیا۔

زخالِ گوشۂ ابروے یار می ترسم　　ازیں ستارۂ دنبالہ دار می ترسم

فن ہجونگاری میں بھی ہم شیکسپیر کو مرد میدان پاتے ہیں۔ اس نے پہلی ہجو جو لکھی وہ سرتھامس لوسی کی تھی۔ اور اسی ہجو کے باعث شیکسپیر کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا تھا اور لندن پہونچکر قسمت آزمائی کرنا پڑی تھی۔ یہی حالت محمود کی ہجو لکھنے کے بعد فردوسی کی ہوئی تھی۔ شیکسپیر کا ایک مصرعہ ہے، Uneasy lies the head that wears the crown

"آما جگاہِ فکر سر تاجدار ہے"

اس رنگ میں ہمارے مشرقی سخنداں ایسے رنگے ہوئے ہیں کہ ثبوت کے لیے ایک چھوڑ تین شعر ہیں بغیر تلاش کیے مل گئے۔ ابوطالب کلیم کہتا ہے:

تا بود این تاج زریں بر سرش آسودہ بود　　شمع افتاد از ہوسلے سرفرازی در گداز

مخلص کاشی نے بھی طبع آزمائی کی اور یہ گرماگرم شعر نکالا ہے

پاس دولت جمع کے با خواب راحت می شود　　شمع دایم از برائے تاجِ زر جاں بر سرست

مرزا صائب تو اس قسم کی خیال بندیوں میں درجہ کمال پر پہونچے ہوئے ہیں وہ کیونکر اس قسم کا پیش پا افتادہ مضمون بغیر چھوے چھوڑ سکتے تھے۔ انھیں خیال کو جولانی دیتے ہی خامہ نے یہ شعر اُگل دیا

نیست سوئے جز زیان زیں دولت دنیا سے دول
تاجِ زر تا ہست بر سر شمع را لرزہ بود

چاسر جدید انگریزی شاعری کا موجد اور شیکسپیر اُس انجمن کی شمع تاباں ہے اسلیے سلسلۂ کلام شیکسپیر ہی سے شروع کیا گیا ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو شیکسپیر ہی پہلا شخص ہے جسکے کلام میں مشرقی رنگ جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسکے بعد جتنے شاعر ہوے وہ غالباً اسی کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ مابعد کے شعرا میں ملٹن، گولڈ اسمتھ، گرے، اسکاٹ، ورڈس ورتھ، ٹینی سن اور لانگفیلو کی نظموں میں کہیں کہیں مشرقی رنگ نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ شاید اسی بنا پر مولانا ظفر علی خاں صاحب نے ایک مرتبہ ہفتہ وار ستارۂ صبح میں نظم حافظ کے انگریزی ترجمہ پر تبصرہ کرتے ہوے تحریر فرمایا تھا کہ "کبھیتیہ الالامی کے ناول، مسرفٹیمر کے افسانے، والٹیئر کا فلسفہ، نیوٹن کی ہرنیپیا، شیکسپیر کے ڈرامے، ان سب میں عربی دماغ کی معجز نمائی صاف نظر آرہی ہے"

جب مولانا ممدوح کا مندرجۂ بالا مضمون پہلے پہل میری نظر سے گذرا تو مجھے کچھ حیرت سی معلوم ہونے لگی اور اُسے انشا پردازانہ تخلبندی کی کرشمہ سازی کا شگوفۂ ارغوانی سمجھکر سکوت اختیار کیا۔ مگر آخر گھر کے بھیدی ہی نے لنکا ڈھا دی یعنی دوران مطالعہ میں مجھے اسکا کافی ثبوت مل گیا کہ فی الواقع اہلِ یورپ اور علوم کی طرح فن شاعری میں بھی اہل عرب کو اپنا اُستاد مانتے ہیں چنانچہ پروفیسر ہٹّن نے اپنی گراں قدر" لغات معلوماتِ جہاں" میں کشادہ دلی سے اس طرح گہرباری کی ہے: "اہل عرب[1] نے اگرچہ اپنا تمام تر زور علوم و فنون کو معراج کمال پر پہونچانے میں لگا دیا تھا۔ تاہم انھوں نے فن شاعری کی توسیع میں جو بیش بہا کوششیں کیں وہ قابل داد ہیں۔ عربی شاعری نے موقعہ محل، وقت اور زمانہ کے لحاظ سے مختلف پہلو بدلے ہیں اور جسوقت انکے تمدن اور بیش بہا علمی کارناموں نے باشندگان عالم کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ اسوقت انکی شاعری بھی معراج کمال کے انتہائی زینے پر صعود کر چکی تھی اور بحر ڈراموں کے جملہ اصنافِ سخن میں صنائع بدائع، تضاد، صنعت ذوالبحرین اور استعارے کے ایسے ایسے نفیس اور آبدار موتی پروئے ہیں کہ انکی لعافی دورخشانی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کیے دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی شاعری نے یورپ کے موجودہ خیال بندوں کو جدت طرازی اور رنگ آمیزی کے صدہا بیش بہا گُر بتا کر اس قدر ممنون احسان کیا ہے کہ مغربی نیچرل شاعری تا قیامِ دنیا اس بارگراں سے سبکدوش نہ ہوسکے گی۔

[1] ہٹنس ڈکشنری آف یونیورسل انفرمیشن دربیان عربی زبان۔ تا اختتام فقرہ اصل کتاب کا ترجمہ ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مشرقی خیالات نے یورپ میں عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اسکاٹ نے لیڈی آف دی لیک میں استعارات کا زیادہ تر استعمال کیا ہے اور مشرقی شاعری کا شیدائی اسکاٹ کے ہر ہر مصرع پر تحسین و آفریں کے گلہائے تر کا انبار کیے بغیر نہیں رہتا۔ اٹھارویں صدی میں پہلے پہل جس شخص نے دفتر نصائح ارباب معانی کے سامنے پیش کیا وہ گولڈ سمتھ تھا۔ اسکی ڈیزرٹیڈ ویلیج اور ٹراولر کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایئے دونوں میں قریب قریب یکساں خیالات ہیں۔ وہی عیاشی اور کاہلی کا رونا ہے۔ فضول خرچی کی تحقیر ہے۔ دہقان کی زندگی کو سراہا ہے غربا اور مساکین کی دلجوئی کی ہے اور بے ثباتیِ دنیا کا دلاویز طرز میں نقشہ کھینچا ہے۔ وہی رنگ گرے کی ایلجی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

گولڈ سمتھ نے کنج عزلت کو بہترین ذریعہ سلامتی بتایا ہے اور اپنی بقیہ عمر ایک شمع سوزاں کی طرح آہستہ آہستہ اختتام کو پہونچانے کا متمنی ہے۔ اسی طرح گرے نے بھی کنج عزلت کی تائید میں جنبشِ قلم کی کرشمہ سازی دکھا کر اپنی ایلجی میں انتہا درجہ کی مدح سرائی کی ہے۔ جس طرح عیش و عشرت۔ مال و متاع۔ تزک و احتشام۔ عزت و ناموری گولڈ سمتھ ہیچ سمجھتا ہے اور فلاح و بہبودی خلائق کو اپنا فرض عین خیال کرتا ہے، اسی طرح گرے نے اپنی ایلجی میں یہی منشا مدنظر رکھا ہے۔ کسانوں کی خوشدلی اور مزارع کی نظرفریب سرسبزی کا سین جس طرح گولڈ سمتھ نے کھینچا ہے اسی طرح گرے نے بھی اپنے جادو نگار قلم کی طاقت لہلہاتی ہوئی کھیتوں کی وصف نگاری میں صرف کی ہے۔

صدیوں پیشتر اوستادِ سخن سعدی شیرازی جہان بھر کے تجربہ کے بعد ایک شعر کہہ گئے ہیں جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔ ع "سفر مربی مرد است و اوستادِ ہنر" اسکا پیرو ہر ایک مغربی شاعر نظر آتا ہے اور اہل مغرب کے یہاں یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ پختہ شاعروں کے لیے سفر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ گولڈ سمتھ اور گرے کے سوانح و حالات دیکھنے سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک عرصہ تک صدہا ممالک کی کوچہ گردی کی ہے۔ دونوں نے سپین کے کتبخانوں سے علمی اور تاریخی معلومات کی فراہمی میں جو سعی بلیغ کی ہے وہ چشم اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دونوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے یونان کو شرف بخشا۔

جیسا امیر مینائی کے بارے میں مشہور ہے کہ اُنھوں نے مقبولیت کے لحاظ سے آخری عمر میں

داغ کا رنگ اختیار کیا یہی حالت گرے کی ہوئی۔ جس وقت گرے کے سامنے ڈیز رٹیڈ ولیج پڑھی گئی تو وہ اچھل پڑا اور کہہ اٹھا کہ "کتنی نفیس بندش ہے"[1] "حقیقت میں گولڈ سمتھ پورا شاعر ہے اور فن شاعری کی باریکیوں پر اُسے پورا عبور حاصل ہے"[2]

گرے نے ۱۷۱۶ء میں آغوش مادر دیکھی اور ۱۷۷۱ء میں اجل نے اُسے آغوش گور میں تھپک کے سلا دیا۔ گولڈ سمتھ نے ۱۷۲۸ء میں پہلے پہل دنیا کی روشنی ملاحظہ کی اور ۱۷۷۴ء میں جام رحلت نوش کیا۔ دونوں ہمعصر تھے اسلیے دونوں کے اشعار میں توارد ہونے میں کوئی شک نہیں ڈاکٹر جانسن بھی انکا ہمعصر تھا۔ اس نے گولڈ سمتھ کے بارے میں اس طرح رائے زنی کی ہے کہ گولڈ سمتھ جب کوئی حکایت یا واقعہ لکھتا ہے تو اُسے فارسی حکایت کی طرح دلچسپ اور شیریں بنا دیتا ہے۔ اس سے یہ خیال پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ جانسن اور گولڈ سمتھ فارسی اشعار اور حکایات کی عذوبت اور رنگینی سے واقف تھے اور چونکہ گرے گولڈ سمتھ کا پیرو تھا اسلیے یہ بات قرین قیاس ہوسکتی ہے کہ وہ بھی مشرقی رنگ سے ضرور واقف تھا۔ گرے ایک زمانہ تک تواریخ کا پروفیسر رہ چکا ہے اور تمام تواریخ کائنات پر عبور کامل حاصل کیے بغیر انسان پروفیسری کے لایق نہیں سمجھا جاتا۔ اسلیے ہمارا یہ کہنا کہ اسکی ایلجی اگرچہ مغربی قالب میں ڈھلی ہوئی ہے مگر مشرقی رنگ و روغن اور ایشیائی خال و خط اسکے نکھرے ہوئے ارغوانی چہرہ پر صاف ظاہر ہیں۔ بعید از قیاس نہ ہوگا۔

یورپ کی مقلدانہ صنعت گری نے شیکسپیر، گولڈ سمتھ اور گوئٹے کی نظموں کو روحانیت، یزداں شناسی، اخلاق و تواریخ کے لطیف ترین تفہیم و تلقین کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے کلام کو مشرقی رنگ میں رنگا ہے۔ مشرقی رنگ اس قدر مقبول عام ہے کہ یہ جس قالب میں ڈھلتا ہے اپنی شانِ دلاویزی اور بانکپن میں کسی نوع کا فرق نہیں ہونے دیتا۔

اسلیے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں پہنا جو تو نے رنگ وہی رنگ ہوگیا

اُنیسویں صدی کے شعرا میں سے ورڈس ورتھ، ٹینی سن اور لانگفیلو نے کھلم کھلا فارسی نظموں کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ورڈس ورتھ نے ایک قطعہ قوس و قزح کی تعریف میں لکھا ہے جس میں وہ قوس و قزح سے اس طرح خطاب کرتا ہے "جب میں قوس و قزح کی بوقلموں محراب فضائے فلکی میں دیکھتا ہوں

---

[1] دیباچہ ڈیزرٹیڈ ولیج۔ [2] دیباچہ ڈیزرٹیڈ ولیج

تو میرا دل فرطِ مسرت سے اُچھلنے لگتا ہے۔ اے نظر فریب خوش رنگ دھنک! ویسی تیرا بانکپن میری خُرد سالی میں بھی اسی طرح تھا جیسا اب ہے۔ میں نے اپنے عنفوانِ شباب میں بھی تیری وہی عشوہ گریاں اور دلفریبیاں دیکھی ہیں۔ اب کہ کبرسنی کی برف باری نے میرے سر و ریش کو نقرہ گوں بنا دیا ہے میری بوڑھی آنکھیں بغور دیکھ رہی ہیں کہ تیری رنگ ریزیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوئی اور میرے بعد بھی تیری رنگ پاشیاں اسی طرح قائم رہیں گی"۔ گویا یہ تمام قطعہ مولانا حسین یزدی کے مندرجہ ذیل معنی خیز فرد کا ماخذ ہے:۔

صد گو نہ ہم گزند گرت میرسد زخلق   در صبغِ خویش باش چو قوس و قزح مدام

ایک بار نیچرل شاعری کے مردِ میدان مرزا صائب نے کسی سائل کو ہر کس و ناکس کا کفش بوس اور خار دامن ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ دماغ نے رسائی کی اور زبان نفرت آمیز لہجہ میں اس طرح گویا ہوئی۔ کسے کز شکستی می زند دستے بدامانے   ندیدم چرا دامان شب محکم نمی گیرد

اس سبق آموز تخیل نے انگلستان کے ملک الشعرا ورڈس ورتھ کے اخاذ دماغ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ اس نے اپنی جنبش قلم کی سحر نگاری کے فوری اعجاز سے یہ بیت موزوں کر لی جس نے جدت طرازی اور بلند پروازی کا سہرا اپنے مصنف کے سر باندھا اور شہرت کے چار چاند لگا دیئے:۔

Up to the throne of God is borne [1]
The voice of praise at early morn.

اُنیسویں صدی کی سائنس کی معلومات اور ایجادات نے اربابِ حل و عقد کے دماغِ جنات و ارواحِ خبیثہ کے بعید از قیاس تخیل سے پاک کر دیے مگر اربابِ معانی کے لآلی آبدار اس واہمۂ پیدا وار تخیل کی عدم موجودگی میں بے رونق نظر آنے لگے۔ اسلیے ورڈس ورتھ کو مجبوراً لوسی گرے کی بیانیہ نظم میں متوفی (لوسی) کے بارے میں خیال آرائی سے کام لینا پڑا اور مشرقی تتبع میں اسکی روح کو ایک بچۂ آہو کی دلآویز شکل میں ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نوکِ قلم کی حرکتِ مستانہ نے یہ شعر موزوں کر دیا

لوسی برفت آہ گرمی تو نعشش و ید [2]
خرگوشش وار گاہ گہے بچۂ آہو سے

---

[1] ترجمہ۔ بوقت صبح حمد حق کی ہمیشہ یاد کرتا ہے ، وہ گویا عرش اعظم پر خدا کو ثنا کرتا ہے۔ [2] ترجمہ بر صفحۂ آئندہ۔

ویں صدی کے بہترین شعرا میں سے ٹینیسن کا نام قابل فخر ہے۔ جس نے سلاست زبان رنگین بیانی اور سوز و نیت الفاظ کے علاوہ فن قوافی میں اس خوبی کے ساتھ شیر و انگبیں کے دریا بہائے ہیں کہ سکیارڈی سا نقادِ سخن اسکی توصیف میں رطب اللسان ہے۔ ٹینی سن نے جب دیکھا کہ زمانہ محاورات کا شیدائی ہے تو اُس نے اپنے کلام میں سلاست کا رنگ بھر دیا اور محاورات کے استعمال سے اختصار پیدا کیا۔ اس نے ایک نظم بعنوان "Ring out wild Bells" لکھی۔ جس نے پبلک میں انتہا درجہ کی مقبولیت حاصل کی۔ اُس میں اس باکمال اور ہر دلعزیز شاعر نے یہ صنعت ملحوظ رکھی کہ Ring out اور Ring in کے جہاں جہاں الفاظ آئے ہیں ان کا مختلف ترجمہ ہوتا ہے۔ صدیوں پیشتر ہمارے مشرقی شعرا اس رنگ میں اپنے اشہب خیال کی تعجب خیز جولانی دکھا چکے ہیں۔ چنانچہ خدائے سخن حضرت افضل الدین خاقانی فرماتے ہیں

یری جو بجو گیتی ندارد جو دریں خرمن — تحزچوں ترک جو گفتی بیک جو ناقد و مقانش

افتخار الشعرا جناب مولانا محمد قہستانی نے بوقت سربازی یہ شعر کہا تھا:۔

منصور وار گر ببرندت بپائے دار — مردانہ پائے دار جہاں پائے دار نیست

شہسوارِ سخن جناب سعدی شیرازی نے بھی اس صنعت میں جودتِ طبع دکھائی ہے۔ ایک کاسۂ سر کی زبان سے آپ یہ الفاظ دوہراتے ہیں:۔

گماں کردہ بودم کہ کرماں خورم — ولیکن بخوردند کرماں سرم

حافظ اور عمر خیام کے کلام میں جو حکمت اور فلسفہ کی جھلک مستور ہے اُس نے اہل مغرب کو اس قدر محو حیرت بنا رکھا ہے کہ ان دونوں اُستادان فن کے دواوین کی متعدد شرحیں غالباً یورپ کی ہر زبان میں کی گئی ہیں۔ ٹینی سن سا باکمال شاعر کیوں پچھلا بیٹھنے لگا۔ آخر اس نے بھی طبع آزمائی کی اور حافظ کے ایک شعر کا ترجمہ انگریزی قالب میں اس طرح ڈھالا ہے:۔

حافظ
ہر کہ بے عشق بمیرد بے شبہ مردار است
نیست بر مردۂ مردار روا بسم اللہ

سے (حاشیہ صفحہ ۱۵) اصل فقرہ ہے:۔
You yet may spy the fawn at play — The hare upon the green
But the sweet face of Lucy Gray — Will never more be seen.

I hold it true whatever befall,
I feel it when I sorrow most
It is better to have loved and lost
Than never to have loved at all.

ٹینی سین کے علاوہ لانگ فیلو نے بھی مشرقی رنگ میں اعجاز دکھائے ہیں۔ اس نے ایک نظم "سیوا انڈ سام آف لائف" لکھی ہے جو تمام و کمال مشرقی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شہر فسطاط اور عمرو ابن عاص کی بداگستری کا واقعہ بیانوی سیاہی اور اہل صحرائی کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور شائقین سے خراج تحسین و آفریں حاصل کیا ہے۔ اگرچہ اہل مغرب یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ اس جدت طرازی کے سہرے کا مستحق لانگ فیلو ہی کا سر ہے۔ تاہم ایک بیں نگاہوں نے تاڑ ہی لیا اور یہ راز طشت از بام ہوگیا۔

خون ناحق نہ چھپانے سے چھپیگا اے امیر کیوں وہ بیٹھے ہیں مری لاش پہ دامن ڈالے

جس طرح جان کو جسم سے، بصارت کو روشنی سے، گویائی کو زبان سے اور ہوا پرستی کو نفس سے تعلق ہے اسی طرح عاقلانہ خیالات اور دانشورانہ حکایات و نکات کی ترتیب و تنظیم کا راز خاص مشرقی دل و دماغ سے وابستہ ہے۔ گرے نے زمین ایشیائی لی ہے اور اسکی بوقلموں مٹی میں مختلف الالوان گلہائے نظر فریب کی چھوٹی بڑی قلمیں مغربی گملوں میں موزونیت کے ساتھ لگائی ہیں۔

بند اول میں گرے نے منظر شام، سکوت اشیا، دہقان خستہ اور مویشی کی بازگشت کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ صحیفۂ ربانی کی آیت " ولکم جمال حین تریحون وحین تسرحون" کا نقشہ نظر کے سامنے کھینچدیا ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعر کا یہی کمال ہے کہ الفاظ میں واقعات کا مرقع کھینچدے اور یہی فن محاکات کا بدیہی ثبوت سمجھا جاتا ہے۔

بند دوم و سوم میں کہتا ہے کہ شب کی خاموشی میں بجز طنین زنبور سیاہ (بھونرا) اور غمہائے خفتہ کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی رسیلی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یا کبھی عشق بیچاں کا برقع اوڑھے ہوئے برج سے چغد ویراں کی سامعہ خراش آواز آجاتی ہے اور رات کے سکوت عالمگیر میں خلل انداز ہوتی ہے۔ دیکھیے زنبور سیاہ کی بھنبھناہٹ کا تخیل اہل یورپ کے لیے بالکل نیا ہے۔ اور گرے کے علاوہ

اورکسی نے اسے نہیں باندھا۔ بھونرے کی تعریف میں بھاشا اورسنسکرت میں سیکڑوں اشعار ہیں سنسکرت کے اشلوک ثبوت کے لیے پیش کرنا شاید ناظرین پر بار ہو۔ اسلیے صرف بھاشا ہی کے دوہوں پراکتفا کیجاتی ہے

(دوہا) رَسا مَسا آت رَس مَسا بَسا کیُو لَن سُوبھ
رَہت اَلی آلِ کَمل میں پھنسا سُوربھ کی لُوبھ

یعنی رخسارِ تابانِ یار پر تالیں سیاہ نے غضب کی زیبایش پیدا کر دی ہے اور اب وہ دفع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ زنبورِ سیاہ جب بطمعِ نکہتِ گل کنول میں جاتا ہے تو اکثر پھنسکر رہ جاتا ہے۔ اس دوہے میں "اَلِ" کے معنی زنبور سیاہ (بھونرا) کیے گئے ہیں۔

(دوہا) ڈگر ڈگر تو بگر کی کنجت مدھکر پنج
کنیھو تو کُھ باس نی بھون کُنج بَن کُنج

یعنی اے گلشن خوبی تیرے گھر کی راہوں پر زنبورِ سیاہ کے جُھنڈ کے جُھنڈ اپنے ترنم خیز نغموں سے سامعین کو مسرور کر رہے ہیں اور تیرے دہن کی مشکبار خوشبو نے اس مکان کو تختۂ باغ ارم بنا دیا ہے۔ اس دوہے میں "مدھکر" سے مراد زنبورِ سیاہ ہے۔

زنبور سیاہ کے بعد ہمارے مشرق پسند شاعر نے عشق پیچاں کا ذکر کرنا بھی قرین مصلحت سمجھا۔ عشق پیچاں ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم مانی جاتی ہے۔ ایک ہندی شاعر کہتا ہے" درختوں کو کہا تا ہی لپٹنا عشق پیچاں کا" اور فارسی شعرا میں سے ملا فخر الدین حاذق اپنی بلند پروازی کے جوہر اس طرح دکھاتا ہے :۔

صید نخچیر بیاباں تا کند در دامِ زلف شاخِ آہو بر سرش چوں عشق پیچاں سبز شد

بند پنجم و ششم میں کیفیت بعد مرگ کا نقشہ کھینچا ہے اور زندگی [illegible] پر مرور زمانہ کے بعد کوئی چار آنسو بھی نہیں بہاتا، اسکا اشارہ کیا ہے

شکوہ ہے رفتگان مقام بعید کا ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

بند ہشتم و نہم میں ظاہر کیا ہے کہ شاہ و گدا کو پیوندِ خاک ہونا لابدی امر ہے۔ علاوہ خاندان اور زر و مال کام نہ آئے گا۔ گویا "لا ینفعکم مال و لا بنون" کی تفسیر کی ہے

ہر انکہ زاد درین خاکداں چشید آخر ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

بند یازدہم میں لکھا ہے" نہ کتابات سبق آموز، نہ فلزاتی مجھے، نہ چاپلوسی اور نہ خوشامد درآمد خستگان کو

کو اُٹھا سکتی ہے ؛ آواز عزت اُنھیں برانگیختہ کر سکتی ہے۔ اب صرف انکا نام رہ گیا ہے آنکھیں انھیں مطلق نہیں دیکھ سکتیں۔

زندہ ہست نامِ فرخِ نوشیرواں بہ عدل　　گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر　　زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

بند ہفدہم و ہجدہم میں قضا و قدر کے دقیق مسئلہ کو سلجھایا ہے اور مشرقی خیال کے مطابق بتا دیا ہے کہ تقدیر برحق ہے اور جو کچھ ہوتا ہے تقدیر ہی سے ہوتا ہے

اگر قسمت ہے سیدھی ہو صد سال پُردین گھر میں　　اگر اُلٹا نصیبا ہے تو مثلِ آسیا اُگلے

بند نوزدہم کے آخری شعر میں ابن یمین کی مندرجۂ ذیل بیت کا رنگ جھلک رہا ہے

اے دل ازیں جہانِ دل آزار درگذر　　وزتنگنائے گنبدِ دوار درگذر

بند بستم میں ؎ کہدو اُنسے جو ہیں اس رہ سے گذرنے والے + فاتحہ مرقد ویراں پہ بھی پڑھتے جانا۔ کا نقشہ کھینچا ہے۔

بند بست و یکم میں جو تخیل ہے وہ بعینہ شرقی خیال ہندی کی ہمدوش ہے۔ مشرقی شعرا صدیوں پیشتر سے یہ بات مانے ہوے ہیں کہ شبنم آفتاب کی عاشق ہے۔ اسی لیے فارسی میں اسے خورشید پرست کہتے ہیں۔ محمد اسحق شوکت شبنم کے بارے میں اس طرح مدح سرا ہے :۔

ساقی وحدت بہر جا طرح عشرت افگند　　بادۂ خورشید را در ساغر شبنم کند

بند بست و ششم و بست و ہفتم میں ہمارے پاک نفس شاعر نے خود کو ایک عاشقِ دل باختہ تصور کر کے جو عاشقانہ اضطراب کا نقشہ کھینچا ہے وہ بعینہ مولانا جامی کی مثنوی "یوسف و زلیخا" کے مندرجۂ ذیل ابیات کے مشابہ نظر آتا ہے۔ مولانا جامی نے عاشق ہجراں نصیب کی بیقراریوں کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :

دلے کز دلبرے ناشاد باشد　　ز ہر شادی و غم آزاد باشد
غم دیگر نگیرد دامنِ او　　نگردد شادی پیرامنِ او

کہاں تک لکھوں۔ خوفِ طوالت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام موجودہ ثبوت کو زمانہ کے لحاظ سے کافی و وافی تصور فرمائیں گے۔

بشیر احمد (برہان پوری) پنشین ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول تھانہ

حضرت عمروؓ بن العاصؓ

اے عمروؓ بن عاص کیا پُر رعب تیرا نام ہے
روح بھی قیصر کی جس سے لرزہ براندام ہے
کارنامے تیرے عالم میں رہیں گے آشکار
تختۂ دنیا پہ جب تک ارضِ مصر و شام ہے

حکمرانی جس جگہ صدیوں سے تھی تثلیث کی
کر دیا تم نے وہاں جھنڈا نصب اسلام کا
بوعبیدہؓ گر سپہ لشکر نہ ہوتے شام کے
فاتحِ بیت المقدس تم کو کہنا تھا روا

حضرتِ فاروقؓ کو تھا خوفِ ناکامی جہاں
مدعیِ کامیابی تھی شجاعت آپ کی
پرچم اسلام لہراتا نہ ارضِ مصر پہ
کار فرما گر نہ ہوتی استقامت آپ کی

جس میں شامل حضرتِ صدیقؓ اور فاروقؓ تھے
آپ اُس فوجِ الٰہی کے رہے ہیں سرگروہ
اس سے زیادہ اور کیا ہوگی فضیلت کی دلیل
اس سے زیادہ اور ہو سکتی ہے کیا شان و شکوہ

معترض تعریضِ بیجا لاکھ کرنے کو کریں
اس سے کم ہوتی نہیں زنہار عزت آپ کی
آیۂ قرآن و اقوالِ رسولؐ اللہ سے
بالوضاحت ہوتی ہے ثابت فضیلت آپ کی

خادمانِ دین میں حاصل ہے تجھ کو امتیاز
تیری خدماتِ گراں کا معترف اسلام ہے
کر نہیں سکتا کبھی تجھ سے مجالِ سرکشی
گردنِ مُسلم میں احسانوں کا تیرے دام ہے

(حافظ) امام الدین۔ حافظ رام نگری

ایجاداتِ جنگ

طیارے اور لاسلکی

از مارکونی اطالوی موجد لاسلکی

آج سے ساٹھ برس پہلے ایک نامور امریکی جنرل جنرل شرمن نے جنگ کی خلاصہ تعریف ان تین لفظوں میں کی تھی "جنگ جہنم ہے" جو اب تک زبان زدِ عام ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو دیکھ لیتا کہ خلقِ خدا جس طرح جرمنی کے پنجۂ قہر میں گرفتار ہے۔ اسکی تعبیر اس مختصر سے فقرے کے سوا کسی لفظ یا جملہ سے نہیں ہوسکتی۔ آج ہم ابنائے بستم صدی کے لیے بھی جنگ جہنم ہی ہے۔ غولِ پرشیا نے اسے قتل وغارت، سیہ کاری۔ تباہی و بربادی کا ایک جہنم بنا رکھا ہے۔

مگر شرمن کے اس سہ حرفی مقولہ کے علاوہ اس جنگ کی تعبیر ایک اور سہ لفظی فقرہ سے ہوسکتی ہے یعنی "جنگ بربادی ہے"۔ بربادی لکھوکھا خلق اللہ کی۔ بربادی اُن جذبات کی جو کبھی ان لاکھوں دلوں میں موجزن ہوں گے، بربادی اُس طباعی وذہانت کی جو ہزاروں دماغوں میں مخفی کی مخفی رہ گئی اور دنیا اُس سے مستفید نہ ہونے پائی، بربادی بے حساب پیداوار کی جس سے یورپ کے فاقہ کش غریب پیٹ بھرتے، بربادی صنعت وحرفت کی، تجارت کی، ترقی کی، محنت ومشقت کی، بربادی راحت وشادمانی کی، غرض بربادی ہر اُس چیز کی جس سے حیات انسانی خوشگوار ہوسکتی ہو۔

مگر چشم بصیرت کو حسرت ویاس کی ان اندھیریوں میں امید کی جھلکیاں بھی نظر آہی جاتی ہیں تھوڑے سے غور وفکر کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ تباہی وبربادی عمومی عالم کی سرسبزی وترقی بنی نوع انسان کے حقیقی رفاہ کا باعث ہوسکتی ہے۔

ضرورت جو کبھی تاخیر کی متحمل نہیں ہوتی تیزی کے ساتھ برابر ایجاد کراتی رہی۔ ضرورتِ جنگ کے حکم ناطق کے مطابق حریفانِ جنگ کے بہترین دماغوں نے ایجادات میں دو تین سال میں ترقی کے وہ مراحل طے کرلیے ہیں جو ہنگامِ صلح میں شاید پچاس برس میں طے ہوتے۔ یہ ایجادات جن طریقوں سے

برتے گئے ہیں ان کا سرسری تذکرہ بھی کرنا چاہیں تو سخت دشوار ہے۔

یہ بات عام طور پر شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ باستثنا ے چند عارضی واقعات کے جنکا کوئی خاص تعلق براہ راست اس جنگ سے نہیں، علی العموم سائنٹفک و صنعتی حقائق کی دریافتیں اب سے تین سال قبل کی ہیں۔ مگر اس جنگ میں ان دریافتوں کے عجیب و غریب استعمال نے انکی قدر و قیمت میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ اب وہ جدید ایجادات کے برابر ہیں۔ اگرچہ موجودہ فوجی قوانین ایجادات جنگ کی تفصیلات کے اظہار سے مانع ہیں، تاہم ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے اکثر جو ضرورت جنگ کے زبردست ہاتھوں سے وقوع میں آئے ہیں صلح کے لیے بھی ویسے ہی عظیم الشان ہیں جیسے جنگ کے لیے۔

ان تمام ایجادات و اختراعات میں سب سے زیادہ عظیم الشان ہوائی مرکب (طیارے) اور شعاعی سلسلۂ پیغام رسانی (لاسلکی) ہیں۔ ایسے تیز رو اور بلند پرواز طیارے تیار کیے گئے کہ جنگ سے پہلے کبھی خواب میں بھی خیال میں نہ آئے ہوں گے۔ ہوائی نقل و حرکت اور دوسری اغراض کے لیے لاسلکی سے عجیب و غریب کام لیے جاتے ہیں۔ ان دونوں اختراعات جدیدہ نے موجودہ طریق حرب میں تو ایک انقلاب عظیم پیدا کر ہی دیا ہے، جنگ کے بعد بھی ایام صلح میں ان سے ہماری سیر و سفر اور نامہ و پیام کے طریقے قطعاً بدل جائیں گے۔ طیارے لاسلکی کی اعانت کے بغیر فوج کی نقل و حرکت، غنیم کی صورت وقوع اور زمین کے سارے تماشے اور ہر قسم کی خبر لے سکتے تھے، مگر جب تک زمین پر اپنے رفقاء کو اپنی معلومات کی اطلاع نہ دے سکتے انکے معلومات چنداں سود مند نہ ہوتے۔ لاسلکی نے اس کمی کو پورا کر کے تماشاگاہ جنگ میں سب سے نمایاں اور بلند جگہ حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اب یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ دیکھ بھال، گرد آوری اور گولہ باری کی سمت وغیرہ کی رہنمائی کے لیے لاسلکی سے آراستہ طیاروں سے زیادہ کوئی شے مفید نہیں۔

آغاز جنگ میں اتحادیوں کے پاس طیاروں سے لاسلکی خبریں بھیجنے کے نہ سامان تھے، نہ کاردان لوگ، نہ تجربہ۔ اسلیے ابتداءً ہر طیارے میں طیارہ راں کے ساتھ ایک دیدبان ہوتا تھا جو غنیم کے مورچوں، توپ خانہ کی تصویریں کھینچتا اور انکو اپنے احاطے میں گرا دیتا۔ لیکن آج کل دیدبان اپنی جگہ سے توپ خانہ کی آتشباری دیکھکر لاسلکی سے اشارہ کرتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں بہت کم۔

"داہنی طرف تین"۔ "دو بائیں طرف"۔ اور از یں قبیل۔ لاسلکی پیام رساں جو اپنے توپ خانے کی ہدایت کے لیے دیدبانی کرتا ہے اسکے پاس پورے خطہ کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو مربع خطوط میں بٹا ہوتا ہے ہر مربع پر نمبر لگا ہوتا ہے۔ جہاں وہ کوئی گولہ گرتا دیکھتا ہے فوراً اس مقام کے مربع کا نمبر اپنے رفقاء کو بتا دیتا ہے اور اگر نشانہ غلط ہو تو اسکی صحیح سمت بتا دیتا ہے۔ اس طرح توپ خانے طیاروں کی لاسلکی ہدایت کے موافق کام کرتے ہیں۔

اسی طرح سمندر پر بھی لاسلکی کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اتحادیوں کے پاس ہی ایک لیز جس سے آبدوزوں کا سراغ ملتا ہے۔ فضا میں اُڑنے والے طیارے آبدوزوں کا کھوج لگاتے اور لاسلکی سے تجارتی جہازوں کو اطلاع دیکر خطرے سے متنبہ کر دیتے ہیں اور جنگی جہاز ہو تو اسے خبر کر دیتے ہیں کہ جب موقع ملے اسے تباہ کر دے۔ پس یہ دو چیزیں طیارے اور لاسلکی جو خشکی اور تری پر یکساں کام دیتے ہیں اس جنگ کے عجائبات سے ہیں باقی اور چیزیں جنکو لوگ عجائب کہتے ہیں اور جن کے چرچے ہو رہے ہیں یعنی آبدوز، ٹینک (ایک آہن پوش موٹر جو نشیب و فراز اور ہر قسم کی زمین پر یکساں دوڑ سکتا ہے اور اسپر گولوں کا اثر نہیں ہوتا۔ اسکے اندر سپاہی چھپے ہوتے ہیں جو سوراخوں سے غنیم پر گولے برساتے جاتے ہیں)، دستی گولے، زہریلی گیس، نقاب مانع زہر، آتش انداز، وغیرہ میں سے بجز ایک کے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ قدیم ترکیبوں کی ذرا زیادہ مکمل و مہذب صورتیں ہیں۔ اب سے کئی سو برس پہلے انگلستان کی خانہ جنگی میں ایک آبدوز غنیم کا جہاز ڈبو چکی ہے۔ قدیم یونانی اپنی جنگوں میں اُس آگ کا استعمال کرتے تھے جسے گریک فائر کہتے ہیں زہریلی گیس بھی قدیم چینی طریقے کی موثر تر صورت ہے۔ خود قدیم چینی طریقہ بعض حیوانات کے تحفظ ذات کے قدرتی طریقوں کی نقل تھا۔ مگر ہوا بازی اور اسکے ساتھ لاسلکی کا استعمال جو اگرچہ جنگ کے پہلے صلح کے کاموں میں بھی کثرت سے جاری ہو چکا تھا جنگ کے زبردست آلات ہیں۔

لاسلکی سمندر میں ابتداءً گولوں کی زد کا پتہ لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اسی جد و جہد نے لاسلکی کو اتنی ترقی دی کہ بحری طیارے اسکی بدولت جہازوں کی آنکھوں کا کام دیتے ہیں۔ جہاز انکی آنکھوں سے دیکھتے اور انکے اشاروں کے موافق اپنی توپوں کا نشانہ درست کرتے ہیں۔ سب سے پہلے بحری طیاروں میں لاسلکی کے استعمال میں ایک بڑی دقت یہ حائل تھی کہ ان میں ہلکے سامان لاسلکی حاصل نہ تھے

جو بحری طیاروں پر رکھے جا سکتے گر ۱۹۱۶ء تک صرف یہی نہیں ہوا کہ بحری طیاروں کی ساخت میں اتنی ترقی ہوگئی کہ لاسلکی کا زیادہ وزن برداشت کرنے لگے۔ بلکہ خود سامان لاسلکی میں مسلسل ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ ان کا وزن بہت گھٹ گیا۔ گریہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کامیابیاں بڑی محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوئی ہیں، اندھوں کی طرح ٹٹولنا اور صرف تجربوں سے سبق سیکھنا پڑے ہیں، صرف فکروتدبر سے حاصل نہیں ہوئیں۔ طیاروں کی نت نئی وضع و قطع اور روز روز کی ترمیم و تغیر سے بھی ماہرین لاسلکی عاجز رہتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر سامان لاسلکی کی تیاری ایک دوسری دقت ہے۔ کیونکہ لاسلکی کے چھوٹے بڑے سارے سامانوں اور پرزوں میں سے سوواں حصہ بھی عام بازاروں میں دستیاب نہیں ہوتا۔

زپلن اور دوسرے ہوا سے سبک تر طیاروں میں بھی لاسلکی سے اس جنگ میں حیرتناک فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ جرمنوں نے اپنے بحری زپلنوں سے گردآوری اور دیدبانی کی جو بیش بہا خدمت لی ہے اس سے انکار ناممکن ہے۔ یہ طیارے بڑی بڑی بلندیوں پر عرصہ دراز تک ٹھیر سکتے ہیں۔ سارا سمندر اور سواحل جغرافی نقشے کی طرح انکے زیر نظر ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے اور غنیم کے جہازات کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا پورا موقع حاصل رہتا ہے۔ چونکہ یہ زپلن زبردست لاسلکی سامانوں سے آراستہ ہوتے ہیں وہ اپنے جہازوں اور بحری مرکزوں کو ہر واقعہ کی ذرا ذرا خبر دے دیتے ہیں جو بہت قیمتی ہوتی ہے۔

لاسلکی جہاں سمندر کی جہازرانی کے لیے مفید ہے وہاں فضا میں ہوائی جہازرانی کے لیے بھی بہت اہم بلکہ لابدی ہے۔ بحری معرکہ آرائی کے لحاظ سے لاسلکی کے تین اہم فوائد ہیں۔ بحری صدر مقام سے تمام بحری شاخوں اور فوجوں کو احکام پہونچانا، ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں خبر پہونچانا، گردآوری یا جاسوسی یا کسی حملے کے نتائج سے بر وقت اور بآسانی اطلاع دینا۔

بحری معرکوں میں لاسلکی کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ واقعے بیان کر دیے جائیں جن سے واضح ہو جائے کہ لاسلکی کی موجودگی سے کیسی کیسی المناک بلائیں سر پر آتے آتے رک گئی ہیں اور انکی غیر موجودگی سے کیا کیا مصیبتیں جھیلنا پڑی ہیں۔ عام دلچسپی کے لیے ہم ایک مشہور واقعہ لے لیتے ہیں۔ پچھلے سال ۱۷۔ اکتوبر کو ناروے اور جزائر شٹلینڈ کے درمیان جرمنوں کے دو تیز کروزروں نے انگریزی بیڑہ (حفاظتی بیڑا) پر حملے کر کے تباہ کر دیا۔ یہ بحری بیڑہ بارہ جہازوں پر

فستل تھا جن کی حفاظت کے لیے دو تباہ کن سٹرانگبو اور میری روز نامی اور تین چھوٹے چھوٹے مسلح جہاز ساتھ تھے۔ ان میں سے صرف ایک پر لاسلکی کا سامان تھا۔ ۱۷۔ اکتوبر کو ان تینوں مسلح جہازوں میں سے ایک جسپر لاسلکی تھی ایک بیڑے کے جہاز کو آرڈر کرنے کے لیے ذرا پیچھے ٹھیر گیا۔ آخرالذکر جہاز کا بار دوسرے پر منتقل کرنا تھا اسلیے اسے رکنا پڑا تھا۔ اسکے بعد دونوں تباہ کن سٹرانگبو اور میری روز جو لاسلکی سے آراستہ تھے اور دو چھوٹے مسلح مگر لاسلکی سے معرا جہاز بھی اسکے ساتھ ہولیے۔ سترہویں تاریخ کو صبح کے چھ بجے دو تیز رو جرمن کروزر چھپٹے اور برطانوی تباہ کن پر حملہ آور ہوے۔ انکے پہلے ہی گولے نے سٹرانگبو کے خانۂ لاسلکی کو تباہ کر دیا۔ افسروں اور جہازیوں نے بہتیرا مقابلہ کیا اور ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ غرق آب ہوکے رہا۔ اسی اثنا میں ایک گولہ میری روز کے میگزین (باروت خانہ) میں آلگا۔ اور لگتے ہی وہ غرق ہوگیا۔ اسکے بعد ان جرمن کروزروں نے اصل بیڑے پر حملے کیے اور نو جہاز ڈبو دیے باقی ماندہ جہازوں کے لیروک (ساحل برطانیہ) پہونچنے کے بعد اس حادثہ کی خبر عام ہوئی۔ اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوے وزیر بحریہ نے یکم نومبر کو دارالعوام میں فرمایا تھا:۔

"چند در چند واقعات اور وجوہ سے اس حملے کی کوئی لاسلکی اطلاع کسی جہاز سے وصول نہ ہوسکی۔ ۱۷۔ اکتوبر کو ہماری جو فوجی حالت تھی اسکا لحاظ کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمیں لاسلکی اطلاع ملتی (اور تین جہاز مکمل طور پر لاسلکی سے آراستہ رہتے ہوے اطلاع ہونا ضرور چاہیے تھی) تو برطانوی بحریہ کو ان تاخت آور کروزروں کا واپسی میں راستہ روکنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔"

وزیر بحریہ نے لاسلکی سے آراستہ تین جہازوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ایک جہاز کی نگرانی کے لیے پیچھے رہ گیا تھا جو بیڑے کے ساتھ جانے کے لائق نہ رہا تھا۔ جرمن کروزروں نے جو ہر طرح سے زبردست تھے اور انگریزی لاسلکی کے سوا کسی چیز کا اندیشہ نہ کرسکتے تھے، یہ موقع پاتے ہی ان دونوں تباہ کن جہازوں کو تباہ کر دینے میں پورا زور لگا دیا۔ تاکہ وہ لاسلکی پیام بھیجکر کمک طلب نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ ایک کے لاسلکی خانہ ہی پر گولہ مارکر اسے مرکزی بیڑے سے پیام و کلام کے لائق نہ رکھا، اور دوسرے کے میگزین میں گولہ مارکر اُسے غرقابی سے پہلے مرکزی بیڑے تک خبر رسانی کا موقع نہ دیا۔ رہے بیڑے کے جہاز، سو ان میں سے ایک پر بھی لاسلکی کے سامان نہ تھے جن سے انگریزی مرکزی بیڑے یا مرکز بحریہ کو خبر بھیجی جاسکتی۔ اور اگر ان جہازوں کو ڈوبنے سے بچانا ممکن نہ ہوتا تو کم از کم تاخت آوروں کو

سزا تو دی جا سکتی ۔

دوسری مثال میں ہم وہ واقعہ پیش کیا چاہتے ہیں جس میں ایک جہاز اینگلو کیلیفورنین لاسلکی کی بدولت یوبوٹ (آبدوز) کی دست برد سے بچ گیا۔ جب یوبوٹ (آبدوز) اسکا پیچھا کر رہا تھا اس نے لاسلکی سے ہر طرف امداد کی فریاد بلند کی، مختلف سمتوں سے [illegible] جنگی جہازوں نے جو نظر سے اوجھل تھے اس "صدا العجوا" پر لبیک کہی۔ حلیہ، سمت، رفتار دریافت کی۔ اینگلو کیلیفورنین نے جواب دیا "خدا کے لیے دوڑو آبدوز آتشباری کر رہی ہے!" جنگی جہاز (جو نظر سے دور تھا) کے حوصلہ افزا پیغاموں کے بھروسے پر کپتان آبدوز کے مقابلہ میں ڈٹا رہا۔ آبدوز کی آتش باری لحظہ لحظہ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اینگلو کیلیفورنین کا سامان لاسلکی [illegible] گولہ باری سے خراب ہو گیا۔ اسپر بھی جوں توں کر کے اُس نے پیغام بھیجا:-

"آپ کی گفتگو سمجھ میں نہ آئی!- دھماکا! فرشِ جہاز پر پڑا ہوں۔ چاروں طرف شیشوں کے ٹکڑے پڑے ہیں"

جنگی جہاز نے جواب دیا "اسپر گولہ باری کرتا ہوں۔ مرد آدمی ذرا جرأت [illegible] کام لے اور نتیجے سے آگاہ کر" چنانچہ اینگلو کیلیفورنین کی لاسلکی نے [illegible] بن آیا [illegible] پیام جاری رکھا۔ آخر [illegible] یہ پیام بھیجا:-

"جلدی! جلدی! جلدی! آبدوز تارپیڈو چلنے کو ہے۔!"

مگر جب آبدوز کی نظر دور سے افق میں جنگی جہاز پر پڑی جو عقاب کی طرح [illegible] جھپٹا چلا آتا تھا تو اسنے غوطہ لگا لیا۔ اس طرح آئی ہوئی بلا لاسلکی کے صدقے میں ٹل گئی۔

آغازِ جنگ ہی میں یہ بات محسوس ہوئی کہ پر آشوب علاقوں میں ٹیلیفون ٹیلیگراف کے تاروں پر بالکل بھروسا نہیں کیا جا سکتا زبردست توڑ شکن گولوں کے مقابلے میں ان تاروں کا ٹھکانا کہاں۔ اسلیے تمام حریفانِ جنگ کو لاسلکی ہی سے کام لینا پڑا۔ آجکل جب ہنگامہ کارزار گرم نہ ہو تو تم کسی محاذ پر خندقوں کی اول صف میں جا کر دیکھو۔ تمام توقع کے خلاف اسے سپاہیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا نہ پاؤ گے بلکہ وہاں گنتی کے چند سپاہیوں کو دیکھو گے جو کئی ٹولیوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ہر ٹولی کے پاس کلدار توپیں ہوتی ہیں۔ لاسلکی والا بھی اپنے سامان لیے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ جہاں پیدل حملے کے آثار

نظر آئے اُس نے پیغام بھیجکر پچھلی محفوظ خندقوں سے فوج منگوا بھیجی اور آن کی آن میں اولیں صفیں فوج سے بھر گئیں۔

مگر لاسلکی کی کثرت استعمال سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تاروں والے ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہوگی۔ پچھلی صفوں اور فوجی صدر مقاموں کے درمیان سلسلۂ مراسلت کی اہم خدمت اب بھی یہی تار انجام دیتے ہیں۔

لاسلکی کے سامان ایک بڑے موٹر پر رہتے ہیں۔ جنکو اُتار کر آراستہ کرنے اور کام کے لیے تیار کرنے میں صرف بیس منٹ لگتے ہیں۔ بات کی بات میں چھوٹے چھوٹے پھونکنے ڈنڈوں کو پیچ پر جوڑ جوڑ کر ستر فٹ کا ایک ستون کھڑا کر لیتے ہیں۔

آلہ جتنا عظیم الشان ہو اُسکے استعمال میں اُتنی ہی احتیاط درکار ہوتی ہے۔ انقلاب روس کا یہ ایک مسلّم واقعہ ہے کہ لاسلکی آلات کی بدولت لینن اور اُسکے کارپردازوں کو پٹروگراڈ کے انقلاب کی رتی رتی خبر مقامی حکام سے کم از کم ۲۴ گھنٹے پہلے مل گئی تھی۔ اور لاسلکی ہی کے ذریعہ سے یہ تمام خبریں باغیوں کو انکے آلات لاسلکی کے ذریعہ سے پہنچا دی گئی تھیں۔ اٹلی اور ریاستہاے متحدہ امریکہ جیسی حکومتیں جہاں لاسلکی کا نظم مکمل ہے باغیوں اور جاسوسوں کو لاسلکی کے ناجائز استعمال سے روکنے کی قدرت بھی رکھتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ روس جیسی حکومت میں جو جرمن مفسدہ پردازوں، جاسوسوں اور غداروں سے بھری تھی ایسی کارروائی ناممکن تھی۔

کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں صحراے شام میں بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے جا بجا ستون ہوتے تھے جن سے دن کو دھواں نکلتا رہتا تھا اور رات کو روشنی۔ پچھلے برس اقدام فلسطین میں برطانوی فوج کے کمانیر سر آرچیبلڈ مرے کی رپورٹ کے مطابق اس صحرا میں لاسلکی نے انگریزوں کو وہی کام دیا جو ان ستونوں سے نکلتا تھا۔ اسی لاسلکی کی مدد سے انگریز اس لق و دق ریگستان کی صعوبتوں پر غالب آ گئے۔

لاسلکی کا سب سے بڑا فائدہ ایسے مواقع پر اُٹھایا گیا ہے جہاں دو حکومتوں کے درمیان غنیم کا ملک حائل ہے اور اس لیے برقی سلسلۂ مراسلت محال محض ہے۔ مثلاً اٹلی اور روس کے درمیان۔ زوال روس کے قبل انکے درمیان برابر لاسلکی پیام و کلام جاری رہا۔

۔۔ یہیں لاسلکی کے وہ برکات جو صرف اس جنگ میں حربی ضرورتوں سے حاصل ہوئے ایام صلح میں امن و اطمینان کی حالت میں اس سے جو فائدے متصور یا متوقع ہیں انکا مشاہدہ ہماری آئندہ نسلیں بہت جلد کرلیں گی۔

محمد مسلم (عظیم آبادی)

فصل بہار اور یاد یار

(۱)

یاد تازہ کرکے لیتا ہے جگر میں چٹکیاں
اے پپیہے ہے بہت دلسوز تیری "پی کہاں"

لطف عیش۔ آرام سارے ہوگئے خواب خیال
اب نہ وہ پہلے کی باتیں ہیں نہ وہ دلچسپیاں

پھول پھل دونوں سے مالامال اشجار چمن
آم کے پتوں پہ کیا شبنم کے قطرے ہیں عیاں

کیا گھٹا گھنگور ہے چھائی ہوئی چاروں طرف
بیچ میں کیا موجزن ہے چشمۂ آبِ رواں

ننھی ننھی بوندیں ساون کی یہ پھولوں کی مہک
ہو مبارک تجھکو یہ دلکش فضائے بوستاں

میری نظروں میں فضائے بوستاں سب خاک ہے
پاس جب دلبر نہیں بیکار ہے سارا سماں

فصل گل بیکار ہے لطفِ چمن بیکار ہے
لطفِ فصل گل کہاں کیسی بہارِ گلستاں

(۲)

اے پپیہے چہچہانے سے تجھے کیا فائدہ
اس صدا سے آ کہیں سکتا ہے میرا دلستاں

اور بھی بھڑکا رہا ہے آتش فرقت مری
اے پپیہے کہہ کے میرے سامنے تو "پی کہاں"

مور کی آواز کو سن کر تلاش یار میں
اور تڑپاتا ہے اٹھ اٹھ کر مجھے دردِ نہاں

چہچہے بلبل کے کوکو کوئلوں کی چار سو
اور پھر دلسوز یہ تیری صدائے "پی کہاں"

ہو مبارک سب کو جشنِ شادیِ فصل بہار
گیت گائیں بلبلیں کرتے ہیں ہم آہ و فغاں

ہوں فراہم لاکھ سامان عیش کے پھر ہمکو کیا
دفترِ طومارِ غم ہے اپنے دل کی داستاں

اسے وفا "پی کہاں" ہمکو ذرا بھاتی نہیں
دلجلوں کی اس سے ہو سکتی نہیں تسکین جاں

(ماخوذ از نظم سروجنی نائڈو صاحبہ)

وفا۔ صدیقی

شہری زندگی

تہذیب یا سویلزیشن کے تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے عالم سے جبکہ دنیا تہذیب و تمدن کے موجودہ مدارج پر نہ پہونچی تھی اور انسان کے حرکات و سکنات کے لیے قوانین و قواعد نہ مقرر ہوئے تھے۔ جب کہ سوسائٹی کا وجود بھی نہ تھا اور جبکہ انسان اپنی حرکات ارادی کے حرکات بہایم سے مشابہ ہونے کی وجہ سے وحشی کہلاتا تھا اسوقت انسان مثل دیگر بہائم کے اپنی فطری خواہشات کو رفع کرتا تھا اور جس طرح بہائم ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ ہر ایک اپنے رہنے کے لیے ایک سنسان جگہ تجویز کرکے اپنا ماند وغیرہ بناتا ہے۔ اسی طور اور طریق سے انسان اپنی تہذیب کے ابتدائی مدارج میں ایک دوسرے سے علٰحدہ رہنا پسند کرتا تھا۔ اور ہر ایک خاندان اپنے رہنے کے لیے بالکل علٰحدہ اور جنگل اور پہاڑ کے اُن مقامات میں اپنا مکان بناتا تھا جہاں کسی دوسرے انسان کا مکان اور مسکن نہ ہو۔ اُنکے لحاظ سے سب سے بڑی اور اعلی تہذیب یہی تھی کہ انسان ایک دوسرے سے علٰحدہ زندگی بسر کرے اور ہر فرد اپنی قوت بازو سے اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرے۔ یعنی جس طرح جانوروں میں باہمی امداد کے خیالات مفقود ہوتے ہیں اسی طرح اُن لوگوں کو بھی یہ نہ معلوم تھا کہ باہمی امداد کس چڑیا کا نام ہے۔ اور باہمی امداد کا خیال اُسوقت تک نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ مختلف خاندان اور قبائل ایک دوسرے سے مل کر تبادلۂ خیالات کریں اور وہاں تو یہ حالت تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ملنا بھی پسند نہیں کرتا تھا ایسی حالت میں باہمی امداد کے خیال کا نشو و نما بالکل نا ممکن اور محال تھا۔ اسی زمانے میں علٰحدگی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر ایک قبیلہ یا خاندان کا شخص دوسرے قبیلہ یا خاندان میں بلا اجازت مالک قبیلہ کے چلا جاتا تھا تو وہاں سے اُسکا آنا محال ہوتا تھا۔ یہ بات اُنکی تہذیب اور سوسائٹی کے بالکل خلاف تھی۔ چنانچہ تاریخ داں حضرات پر اور اُن لوگوں پر جنھوں نے عرب، چین اور ہندوستان کی تاریخوں کا بہ نظر تعمق مطالعہ کیا ہے مخفی نہیں کہ اُس زمانے کی تہذیب کے اِس قانون کے توڑنے پر کس قدر خوں ریز جنگوں کا وقوع ہوا ہے۔ پھر یہ جنگیں دو یا تین سال میں ختم نہیں ہو جاتی تھیں بلکہ اُن کا اثر اسوقت تک

رہتا تھا جب تک کہ اُن قبیلوں کا وجود تھا حتیٰ کہ تناصیعین میں سے ایک قبیلہ بالکل نیست و نابود ہو جاتا تھا۔

یہ حالت اور کیفیت اُسوقت کی تھی جبکہ انسان عالم وجود میں آکر بہائم کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اسکے احساسات، اُسکے جذبات وخواہشات اور اسکے حرکات وسکنات سب مثل بہائم کے تھے۔ لیکن جس وقت انسان جہد للبقا کے چکر میں پڑا اُسوقت اُسکے خیالات میں ایک قسم کا ہیجان اور تغیر پیدا ہوا اور خود بخود یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمکو کچھ ایسے اسباب مہیا کرنا چاہئیں جن سے ہم اس ہولناک چکر سے کامیابی کے ساتھ نکل کر خلافۃ الاوفق کے دائرہ میں داخل ہو سکیں۔ چنانچہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی بقا کو قائم رکھنے اور اپنے غیر موافق ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف ذرائع مہیا کرتا ہے۔ وہی انسان جو کسی زمانے میں درختوں اور ماندوں میں قیام کرتا تھا اسوقت نکل کر اپنے رہنے کے لیے ذرا اچھے اور نفیس مکانات تعمیر کرتا ہے۔ وہی انسان جو دیگر بہائم سے مقابلہ کرنے میں اپنے دانتوں اور پنجوں سے کام لیتا تھا اسوقت پتھر کے اور بعدہٗ مختلف معدنیات کے اوزار تیار کرتا ہے۔ اور وہی انسان جو درختوں اور جڑوں اور پتیوں کو کھا کر اپنی بھوک رفع کرتا تھا اسوقت تہذیب اور تمدن کی روشنی سے متاثر ہو کر عمدہ اور قوت بخش غذا کا استعمال کرتا ہے۔ اور وہی انسان جو کسی زمانے میں بالکل مثل بہائم کے تھا جسکا ثبوت اب تک یہ ملتا ہے کہ جس وقت انسان غصہ میں ہوتا ہے اُسکے دانت کھل جاتے ہیں۔ بھویں چڑھ جاتی ہیں۔ جو اس بات کی بین اور واضح دلیل ہے کہ انسان کسی زمانے میں اپنے دانتوں کو اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے میں استعمال کرتا تھا۔ اسکی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسوقت جو اقوام کہ غیر مہذب ہیں یا نیم مہذب ہیں۔ اُنکے منہ بہت چوڑے ہوتے ہیں۔ اور جو مہذب اقوام ہیں مثلاً اقوام یورپ، انکے منہ کم چوڑے ہوتے ہیں جو اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ انسان ابتدائی مراحل تمدن میں کچا گوشت وغیرہ استعمال کرتا تھا۔ لیکن جب غذا اور خاصکر گوشت کو کھانے کے دوسرے طریقے ایجاد ہوے اُسوقت یہ عادت ترک کر دی گئی اور رفتہ رفتہ منہ کا چوڑا پن جاتا رہا۔ بہرحال وہ انسان جو وحشی تھا اب انسان کے نام سے موسوم ہونے لگا۔ اور ان میں باہمی امداد اور یگانگت کے خیالات رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے انسان اپنی مدافعت کے بہتر سامان مہیا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے قبیلے اور

اور خاندان مل جل کر کسی خاص مقام پر قیام کرتے ہیں۔ اپنی مدافعت کے ذرائع اور اسباب پر غور کرتے ہیں۔ اپنی فلاح وبہبود کے وسائل مہیا کرتے ہیں اور اپنے تئیں انتخاب فطری سے بچانے کے لیے اپنے لیے مستحکم مکانات بناتے ہیں اور بعدہ جب مزید تجربے سے بھی یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ مقابلہ کے لیے ایک باقاعدہ فوج وغیرہ کی ضرورت ہے اسوقت ان مختلف بستیوں میں جو اب مواضع یا گاؤں کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں ہر کام کی انجام دہی کے لیے مخصوص افسر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ایک حاکم کا انتخاب ہوتا ہے جو اپنے گاؤں کا حکمراں ہوتا ہے اور خطرہ کے وقت نہایت ہی باقاعدہ اور بااصول افواج کے ساتھ اسکا مقابلہ کرتا ہے۔ یعنی اسوقت انسان بہائم کے خصائل چھوڑ کر تہذیب وتمدن کے اثرات سے موثر ہو چکا ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی۔ یگانگت۔ تدبیر منزل۔ وسیاست مدن کے خیالات پیدا ہو چکے ہیں اور تہذیب کی ہلکی ہلکی روشنی ضوفشاں ہے۔ اب ہر فرد کا کام خودغرضی سے مملو و ملبوس نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر شخص کے خیالات وجذبات ایک جماعت خاص کے اثرات سے مؤثر ہوکر اپنے ماحول کی مطابقت میں تغیر پذیر ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ جو کام کرتا ہے وہ خواہشات انفرادی کے پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمام قوم وقبیلہ کے لیے کرتا ہے۔

بہرحال اسی طور وطریق سے لوگوں کے یا چند خاندانوں اور قبیلوں کے ایک جگہ پر مدافعت کرنے کے لیے یا کسی دوسری غرض سے قیام پذیر ہو جانے سے مواضع کا وجود ہوا۔ اور ان ابتدائی مراحل تمدن وتہذیب میں ہم سوائے مواضع اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کے کسی جگہ پر بھی شہروں کا وجود نہیں پاتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کسی ایسے مقام پر جہاں خوشنما منظر کا وجود تھا۔ دوسری جگھوں سے آبادی زیادہ ہوگئی یا یہ ہوا کہ کسی ایسے مقام پر جو کسی دریا وغیرہ پر اس طرح واقع ہو کہ قرب وجوار کی بستیوں سے آسانی کے ساتھ آمدورفت ہو سکے تو البتہ وہاں کی آبادی کثرت آمدورفت سے یا لوگوں کے وہاں پر اسلیے کثرت سے آباد ہونے کی وجہ سے کہ وہاں ضروریات زندگی آسانی سے حاصل ہوسکتی ہوں بڑھ گئی ہو۔

اب مندرجہ بالا بیانات سے ناظرین خود اخذ کرسکتے ہیں کہ شہروں کا وجود کیونکر ہوا۔ واقعی جس طرح مواضع کا وجود ہوا اسی طرح شہروں کا بھی وجود ہوا۔ یعنی جوں جوں تہذیب وتمدن بڑھتا گیا اور ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگوں کو دوسرے ہم جنسوں کی امداد کی ضرورت ہوئی اسی طرح اُن خاص مواضع کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا جسمیں ماحول ناموافق کا آسانی کے ساتھ مقابلہ ہوسکتا تھا

اور رفتہ رفتہ یہ مواضع قصبات اور بعدہ شہروں کے نام سے موسوم ہونے لگے۔ اب یہ بات مسلم ثبوت اور اظہر من الشمس ہے کہ انسان نیچر کی حالت چھوڑ کر تمدن کے پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہی قواعد ضوابط کا محتاج ہوتا ہے۔ اسکو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ ایسے قواعد وضع کرے جو اُسکے حقوق کی کافی طور پر حفاظت کر سکیں۔ اور یہ خیال انسانوں میں اُسوقت قوی ہوتا ہے جبکہ تہذیب تمدن کے آثار اُن میں ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں۔ اور اُن کو ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کریں جو افراد سوسائٹی کے حقوق کی تعیین و حفاظت کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کرے جو بعدہٗ قوانین ملک یا شہر کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ اور اس شخصیت کا نام بادشاہ سے تبدیل ہو جاتا ہے

پس شہر کے وجود کی تاریخ پر نظر غائر ڈالنے سے یہ بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ شہر مخزن تہذیب تمدن ہونے کے علاوہ ایک ایسا مقام ہے جہاں مدافعت کے سامان عمدہ اور اعلیٰ پیمانے پر موجود ہوتے ہیں۔ مدافعت سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ جس وقت کوئی دشمن باہر سے کسی شہر پر حملہ آور ہو اُسوقت اہالیان شہر ماحول غیر موافق کا نہایت ہی کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انتخاب فطری سے اپنی حفاظت کا پورا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں اسپتالوں اور شفاخانوں کی موجودگی اسکی شاہد ہے جو اُن لوگوں کے وجود کو قائم رکھتے ہیں جن پر فطرت کی یہ ڈگری پاس ہو چکی ہے کہ عالم بقا میں اُنکا وجود محض بیکار ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ پیر خراب گئے ہیں یا جنکی قلبی حرارت و حرکت اسکی مقتضی نہیں ہے کہ وہ عالم بقا کی جد و جہد میں کامیابی کے ساتھ حصہ لے سکیں وہ لوگ مصنوعی طریقے سے اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ وہ بسا اوقات اُن لوگوں سے زیادہ قابلیت کے ساتھ فطرت کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو فطری طور سے اس قابل بنائے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سامنے ولیم پٹ انگلستان کے مشہور وزیر اعظم کی عمدہ مثال موجود ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جس وقت پٹ سترہ برس کے تھے اُسوقت اس قدر کمزور و ضعیف تھے کہ انکے والد کو مجبوراً کالج کے بورڈنگ میں انکے ہمراہ ایک نرس رکھنا پڑی۔ لیکن یہی ولیم پٹ تھے جنھوں نے بعدہٗ اس کامیابی کے ساتھ انگلستان کی پارلیمنٹ وغیرہ کی اصلاح کی کہ انکا نام زبان زد خاص و عام ہو گیا مورخ کے خود الفاظ یہ ہیں "انکی ابتدائی حالت سے کسی کو یہ گمان نہ تھا کہ ولیم پٹ آیندہ اتنے بڑے

وزیر اعظم ہونگے" اور واقعی یہ ایک حیرت خیز بات تھی لیکن ہم کو اس سے اسقدر پتہ تو ضرور چلتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بڑھنے نے جو شہر میں مختلف افراد انسانی کے کثیر میل جول سے پیدا ہوتا ہے یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ہر شے ایک عمدہ اور خوبصورت شکل اختیار کرلیتی ہے اور ہر شخص اپنی مدافعت کا انتظام کرتے کرتے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ہر شے کو عمدہ اور اچھی حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو خراب و خستہ ہو اسکو وہ تنفر و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی جد و جہد سے ہر شے کو اس قابل بنا دے کہ وہ مدافعت کے قابل ہو جائے چنانچہ شہروں میں عمدہ عمدہ مکانات کا وجود اس بات کی شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور جس شہر میں کثرت سے عمدہ مکانات ہونگے وہ شہر بالضرور کسی نہایت ہی متمدن و مہذب ملک میں واقع ہوگا چنانچہ پیرس کا وجود اس بات کا شاہد ہے۔ فرانس تمام ممالک یورپ میں سب سے زیادہ مہذب ملک ہے پس ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں عمدہ سے عمدہ شہر و عمارات موجود ہیں۔ آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے ہی ملک میں مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ دیہات، قصبات، اور شہروں کے باشندوں، انکے طرز بود و باش، انکی زبان، اُنکے مکانات پر غور کرنے سے صاف طور سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ دیہات میں جہاں مہذب اشخاص کثرت سے آباد نہیں وہاں عمدہ عمارات کا وجود بھی نہیں۔ اور وہاں عمدہ عمارات کا وجود ہی کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ وہاں کے لوگوں کو فن تعمیر ہی سے واقفیت نہیں۔ یہ تو شہروں میں ہوتا ہے جہاں انجینرنگ کے اسکول خاص اس غرض اور مقصد کے لیے قائم ہیں کہ یہاں کے پاس شدہ طلبا فن تعمیر میں مدد دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت ایک "دیہاتی" جسکے معنی عام طور سے "وحشی"۔ "جنگلی" اور "غیر مہذب" کے سمجھے جاتے ہیں، کسی بڑے شہر میں جاتا ہے تو اُسکو وہاں کی ہر بات پر حیرت معلوم ہوتی ہے اور وہاں کی پُرشکوہ عمارات پر وہ ایک مستعجبانہ نگاہ سے نظر کرتا ہے۔ وہاں کی ذلیل سے ذلیل عمارت اسکی نظروں میں عمدہ نظر آتی ہے۔ کیوں؟ یہ اسلیے کہ اہالیان دیہہ تہذیب و تمدن کے اُس زینے پر نہیں پہونچے جہاں وہ اس قسم کی عمارات خود تعمیر کرسکتے اور اُنکے تعجب و تحیر کی یہی وجہ ہے۔ اسی طور اور طریق سے جب ایک کم تہذیب یافتہ شہر کا باشندہ ایک دوسرے مہذب و متمدن شہر میں جاتا ہے تو اسکو بھی وہاں کی صنعت و حرفت، وہاں کے طرز معاشرت پر حیرت و استعجاب ہوتا ہے۔ اور اسکی وجہ اوپر بیان ہو چکی کہ ابھی یہ شہر تہذیب و تمدن کے اس اعلیٰ

وارفع مقام پر نہیں پہونچا۔ چنانچہ مثال کے طور پر آپ ایک ہندوستان کو لے لیں جو ابھی تہذیب کے اُن قواعد وضوابط سے بے بہرہ ہے جن کا فی زمانا اقوام یورپ میں دوردورہ ہے۔ جس وقت یہ ہندوستانی اپنے ملک کے شہروں سے نکلکر یورپ کے کسی شہر مثلاً پیرس یا لندن میں داخل ہوتا ہے اُسپر اسقدر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے وہ اپنے میں اپنے اظہار خیالات کے لیے طاقت گویائی مفقود پاتا ہے۔ وہاں کی زمین دوز ریلیں، وہاں کے بس اور تین منزل کے مکانات، وہاں کی صاف اور ستھری گلیاں، وہاں کا تلغرافی انتظام اسکے لیے بالکل جدید اور نئی بات ہوتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ لاسلکی پیغام رسانی کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اسکے لیے یہ بالکل بے معنی شے ہے کہ انسان کے تمام کام تار برقی یا الکٹریسٹی کے ذریعہ سے نہایت آسانی کے ساتھ ہوسکتے ہیں۔ یہ اسکے فہم سے باہر اور بالاتر ہے کہ انسانی طاقت سے فوق العادت امور کا ظہور بھی ممکن ہے۔ ان مشاہدات سے وہ اسقدر مضطرب اور پریشان ہوجاتا ہے کہ اسکو اپنی طاقت بصارت پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اُسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے اسکو یقین کرے یا نہ کرے۔

بہرحال اب یہ بین اور واضح ہوگیا کہ انسانی مدافعت اور انسانی ضروریات کو بطریق احسن حاصل کرنے کے لیے شہر نہایت ہی عمدہ اور بہتر مقام ہے۔ یہاں پر ہر شے عمدہ اور پاکیزہ موجود ہوتی ہے اور اسکے علاوہ اسکا بھی خاص انتظام کیا جاتا ہے بلکہ ضروریات و ماحول اسکی تعلیم دیتی ہیں کہ انسان جو کام کرے وہ نہایت عمدہ طریقے سے اور نہایت ہی قلیل عرصے میں انجام پذیر ہوجائے۔ لیکن یہ تمام کے تمام قواعد وضوابط خود بخود تشکیل پذیر نہیں ہوجاتے۔ اسکے لیے اس بات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ جس وقت ضرورتِ مدافعت نہ رہے تو آئندہ خطروں سے حفظ ماتقدم کے خیال سے حفاظت کا سامان بھی مہیا کیا جائے۔ چنانچہ اسکے لیے تعلیم کی ضرورت ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مہذب متمدن ممالک اور شہروں میں اسکول اور کالج وغیرہ اسی غرض سے قائم ہیں۔ یہ اسکول اور کالج موجودہ نسل انسانی کو گذشتہ تجرباتِ انسانی کا سبق دیکر اس بات کے لیے تیار اور آمادہ کرتے ہیں کہ وقتِ ضرورت وہ میدان جہد للبقا میں ماحول غیر موافق کا مقابلہ کرکے کامیاب ہوسکیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اسی غرض وغایت سے پڑھائی جاتی ہے کہ انسان گذشتہ تجرباتِ نسل انسانی سے فائدہ اُٹھاکر موجودہ حالت کا اس سے مقابلہ کرکے اپنے ماحول کے مطابق اسپر عمل پیرا ہو۔ اسی طور اور طریق پر سائنٹفک

انکشافات کی تعلیم بھی انکشافات جدیدہ میں ممد ہونے کے علاوہ اُن تجربات کو بھی موجودہ نسل کے سامنے پیش کرتی ہے جن کا حصول گذشتہ نسل کر چکی ہے۔ چنانچہ موجودہ جنگ میں روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کہ گذشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر موجودہ نسل ایسے جدید اور عمدہ طریقے سے زخمیوں کا علاج کرتی ہے کہ ایک جہان انگشت بدنداں ہے۔ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ جناب کیمبرج صاحب مدرجہ میں فلسفہ کے بعض امور پر لکچر دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے لگے کہ میدان جنگ میں ایک سپاہی کے ہاتھ میں گولی لگی اور ایک طرف سے دوسری طرف نکل گئی۔ سپاہی کا ہاتھ بالکل بیکار ہو گیا تھا اور وہ کوئی کام انجام نہ دے سکتا تھا۔ انگلستان کا ایک مشہور ڈاکٹر اتفاق سے اُسوقت ریڈ کراس (ہلال احمر) کے زمرے میں میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ اُس نے اس سپاہی کے ہاتھ کو دیکھا اور اپنے جدید تجربات اور اپنی جدید تعلیم سے فائدہ اُٹھا کر ایک مردہ سپاہی کے ہاتھ کی ہڈی نکال کر اس زخمی سپاہی کے ہاتھ میں لگا دی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ سپاہی بالکل تندرست ہو گیا اور اپنے ہاتھ سے پہلے کی طرح کام کرنے لگا۔ جو کچھ یہ مشہور ڈاکٹر کر سکا یہ اُس تعلیم کا نتیجہ تھا جو اُسکو ایک متمدن شہر میں حاصل ہوئی تھی۔ اگر وہ شہر مہذب و متمدن نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ تعلیم حاصل نہ کر سکتا۔ یہ تو تہذیب و تمدن کے بڑھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ اسکے اثر سے متاثر ہو کر انسان عہد عتیق کے کارناموں کی تدوین میں مشغول ہوتا ہے۔ مذہبی۔ ملکی یا قومی تعصب کی عینک اسکی نظروں سے ہٹ جاتی ہے۔ اور جس ملک و قوم میں جو عمدہ اور مفید بات ہوتی ہے وہ اُسپر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اہل شہر کو اُنکی اس کوشش میں زیادہ مشکلوں اور دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ جو شہر جس قدر زیادہ مہذب ہوگا اسی قدر اطراف و جوانب سے لوگ یہاں حصول تعلیم کی غرض سے مجتمع ہونگے۔ اور اس طرح ایک شہر کے باشندے کو دوسرے شہر کے باشندوں کے جذبات و خیالات کا اندازہ کرنے کے علاوہ اُنکے تجربات سے بھی فائدہ حاصل ہونا لازمی اور لابدی ہے۔ چنانچہ عہد عتیق میں قرطبہ کو لے لیجیے مسلمانوں کے عہد سلطنت میں یہ شہر ترقی کے ایسے مدارج پر پہونچ گیا تھا کہ یورپ کے مختلف ممالک سے ہزاروں باشندے یہاں تعلیم کی غرض سے موجود رہتے تھے۔ عربوں کو عیسائیوں کے گذشتہ تجربات سے فائدہ ہوا۔ عیسائیوں نے عربوں سے کچھ حاصل کیا اور رفتہ رفتہ یہ شہر دنیا کا سب سے زیادہ مہذب و متمدن شہر شمار کیا جانے لگا۔ یعنی شہر کے وجود سے دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کو تعلیم یافتہ بنانے کے علاوہ ملک کو مہذب و متمدن بنا دیتا ہے

لیکن یہاں پر اب وہ لوگ جنھوں نے اپنی تمام زندگی دیہات اور قصبوں میں صرف کی ہے یہ اعتراض کرسکتے ہیں کہ گو شہر میں یہ تمام خصوصیات اور لوازم موجود ہیں لیکن وہ خوش فضا مناظر، وہ فرحت بخش ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، وہ نیچر کی دلفریبیوں کا لطف جو دیہات میں حاصل ہوتا ہے اس سے اہل شہر بالکل بے بہرہ رہتے ہیں۔ انکو نہیں معلوم کہ صبح صادق کے وقت آفتاب عالمتاب جسوقت پر توفگن ہوتا ہے اور ہلکی ہلکی روشنی لہلہاتی ہوئی گھاس اور کھیتوں کی ہلتی ہوئی بالیوں پر پڑتی ہے تو کیا لطف پیدا کرتی ہے؟ انکو نہیں معلوم کہ جاڑے کے موسم میں جسوقت کسان صبح کو اپنا ہل کندھے پر رکھکر اور اپنے بیلوں کو ہنکاتا ہوا کھیت پر پہونچتا ہے اور جسوقت کھیت کے کنارے چند اور کسانوں کو آگ کے گرد اپنے بدن کو گرماتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُسکے دل میں خوشی کے کن خیالات اور جذبات کا ہجوم ہوجاتا ہے؟ انکو نہیں معلوم کہ کھیت اور جنگل کی زندگی میں کیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ انکو کیا پتہ کہ دیہاتی زندگی کیا ہے۔ واقعی اہل شہر دیہاتی زندگی سے بالکل بے بہرہ ہیں اور حتی الوسع اس زندگی سے بے بہرہ رہنے کی کوشش کرینگے۔ کیونکہ عقل انسانی اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ نوع انسانی کا ایک ترقی یافتہ جزو بغیر کسی بیرونی وجہ کے اپنے حرکات ارادی سے رجعتِ قہقری اختیار کرکے ترقی یافتہ ہونا پسند کرے۔ دیہاتی زندگی کیا ہے؟ دیہاتی زندگی اُس زندگی کا نام ہے جو انسان کو اپنے ابتدائی مراحلِ تہذیب میں بسر کرنا پڑی ہے۔ اور جسوقت ضروریاتِ انسانی میں ماحول کے اختلاف سے زیادتی ہوئی اُسوقت اُن ضروریات کے دفعیہ کی جد وجہد میں یہ بات عیاں ہوگئی کہ دیہاتی زندگی اسکے لیے کافی نہیں۔ اور اُسی وقت سے شہری زندگی کا نشو ونما ہوا۔ پس جس آسانی سے ضروریات انسانی کا دفعیہ شہروں میں ہوسکتا ہے دیہات میں ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کون نہیں جانتا کہ دیہات میں پوسٹ آفس۔ مینوسپلٹی۔ ریلوے۔ اسپتالوں اور پولیس کی قلت سے کیا خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ پوسٹ آفس کی قلت سے مہینوں اور مہینوں خط وکتابت بند رہتی ہے۔ اسپتالوں کی قلت سے بہت سے نوجوان اور مفید افراد انسانی کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ پولیس کے انتظام کی کمی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ زمینداران موضع خود مختار حاکم بنکر رعایا پر طرح طرح کے مظالم کرتے ہیں اور ایسے مظالم جنکا بیان کرتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور ایسے مظالم جنکا صرف ذاتیات تک اختتام نہیں ہوجاتا بلکہ جن کا اثر رعایا کی مالی اور اقتصادی حالت سے گذر کر اُنکی خودداری پر بھی پڑتا ہے۔ زمینداران موضع رعایا

کی منفعت کے خیال کے بغیر اپنے فائدہ کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اُنکی سب سے بڑی غرض اور غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ زر کثیر سے اپنی تھیلیوں کو بھر کر اپنی نہ رفع ہونے والی خواہشات کو رفع کریں۔ ایک زمیندار صاحب کا قصہ ہے کہ طمع زر نے اُنکو اس بات پر مجبور کیا کہ ایک دن یہ اعلان کر دیا گیا کہ بھئی ہم ایک ہاتھی خریدنا چاہتے ہیں جو رعایا کے چندہ سے خریدا جائے گا۔ چندہ اس سختی سے وصول کیا گیا کہ غریب مفلس رعایا جو سالانہ لگان ادا کرنے کے بعد اس قابل نہ تھی کہ کسی قسم کا مالی بار برداشت کر سکتی۔ دیگر مواضع میں پناہ گزیں ہوئی اور بالآخر جب چندہ وصول کر لیا گیا تو ہاتھی تو نہیں خریدا گیا گر ہاں اتنا ضرور ہوا کہ زمیندار کی بیوی صاحبہ سونے اور چاندی کے زیورات سے خوب آراستہ اور پیراستہ ہو گئیں۔

یہ تھوڑی سی وہ تکلیفیں ہیں جو انسان کو دیہات میں رہکر برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اور مجھکو یقین کامل ہے کہ وہ اصحاب جنھوں نے عملاً دیہاتی اور شہری زندگی کا تجربہ حاصل کیا ہے وہ ضرور بالضرور شہری زندگی کے بہتر ہونے کے شاہد ہونگے۔ اب یہ بات کہ دیہات کی آب و ہوا اچھی ہوتی ہے بے شبہ دیہات کی آب وہوا اچھی ہوتی ہے لیکن یہ اچھائی اور بہتری صرف قلت آبادی پر منحصر ہے۔ وہاں کی آب وہوا صرف اسلیے اچھی ہے کہ وہاں آبادی قلیل ہے اور مثل شہر کے وہاں تنگ گلیاں اور بلند و بالا عمارتیں نہیں ہوتیں۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کی لطیف ہوا کثافت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ طاعون اور دیگر وبائی بیماریاں زیادہ تر دیہات ہی میں ہوتی ہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے دیہات طاعون سے بالکل صاف ہو گئے ہیں۔ خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو کر اُنکے نام و نشان تک باقی نہیں رہے لیکن لندن میں گو وہ اتنا بڑا شہر ہے کہ دنیا کا کوئی شہر اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ طاعون وغیرہ کوئی بیماری نہیں آتی۔ اسکی واضح اور بین وجہ یہ ہے کہ دیہات کے باشندے اصول حفظان صحت سے ناواقف ہیں۔ اور شہروں میں کثرت آبادی ہی اہل شہر کو ان اصولوں سے واقف کرنے کا باعث ہو جاتی ہے وہاں کی سوسائٹی اُن کو اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ وہ اپنی حفاظت مناسب طور پر اور اعلیٰ درجہ کے اہتمام کے ساتھ اصول حفظان صحت کے مطابق کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شہروں میں عمارات و مکانات تک اصول حفظان صحت کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔ اور گورنمنٹ پارک اور دیگر مقامات تفریح

بنا کر رعایا کی کافی مدد کرتی ہے۔ باشندگان دیہات میں اور شہروں کے پارکوں میں تفریح کریں اور پھر انکی زبان سے بیاختہ نکل جاوے کہ

اگر فردوس بر روے زمین است   ہمین است وہمیں است وہمیں است

تو بیرا ذمہ۔ دیہات کی سیزی و مناظر اس کے سامنے بالکل ہیچ۔ دیہات کی آب و ہوا شہری آب و ہوا سے مقابلہ کرنے سے بالکل قاصر۔ جو ضروریات کہ شہروں میں بطریق احسن پوری ہوکر ہماری آرام کا باعث ہوتی ہیں، انھیں ضروریات کے دیہات میں نہ پورے ہونے سے ہمکو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ مریض جو شہروں میں دو دن میں اچھا ہو جاتا ہے وہ دیہات میں مہینوں اڑیاں رگڑتا ہے اور پھر بھی کامل شفا کا منہ نہیں دیکھتا۔

بہر حال شہروں میں ہر طرح کا آرام اور آسایش موجود ہے۔ اگر ہم کو اخلاقی۔ معاشرتی۔ اقتصادی۔ تمدنی فوائد حاصل کرنا ہیں تو شہری زندگی ہمارے لیے سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ شہروں میں ہماری دنیاوی ضروریات پوری ہونے کے علاوہ ہماری مذہبی اور روحانی ضروریات بھی اچھی طرح سے پوری ہوجاتی ہیں۔ مذہبی معاملات میں تبادلۂ خیالات کی وجہ سے استبدادیت کے دائرہ سے نکل کر حریت کے دائرہ میں داخل ہو جاتے ہیں جو قومی اور ملکی ترقی کے لیے لازمی اور لابدی ہے۔ فقط

سید محمد حسین (تیرگانوی)

ہجوم شاعراں ہے امتحاں ہے طبع موزوں کا
الہ العالمین جگر رہے رنگ اپنے مضموں کا

ملی تھی یوں ازل میں طبع موزوں لے لیے قسمت
مجھے دیوانہ ہونا تھا کسی کے قد موزوں کا

اسی سے لیلی و شیریں کے ابتک نام روشن ہیں
الٰہی حشر تک چرچا رہے فرہاد و مجنوں کا

رخ تاباں ہے کس کا صبح وصلت جسکا خاکہ ہے
الٰہی شام ہجراں نقشہ ہے کس زلف شبگوں کا

فلک گردش میں ہے بدلی ہے ہیئت اے یری
بنا خود کاسہ واژوں نصیبا بخت واژوں کا

ہوا ثابت یہ سیاروں کی گردش سے ہمیں آخر
کشش ہے مہر کی چکر میں ہونا ربع مسکوں کا

حیات جاوداں ملتی ہے کب اس بادہ نوشی سے
خیال خام ہے اک۔ بیٹھنا خم میں فلاطوں کا

جہاں جاتا ہے مجنوں شکل مجنوں ساتھ ہے اسکے
اڑا پھرتا ہے اچھا آشیاں ہے مرغ مجنوں کا

(شاعرہ خورجہ ستمبر ۱۹۲۲ء)
وہ گر ممتاز آجائیں مرادیں دل کی بر آئیں
ہمیشہ پھر رہے خفتہ نصیبہ بخت واژوں کا
ممتاز (خورجوی)

پختہ و خام

آتش است ایں بانگِ نائے و نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد!

حسینہ۔ نو عمر، بھولی چشم و ابرو والی، اسم بامسمیٰ حسینہ۔ ایک خاص کیفیت میں ڈوبی ہوئی اُس سے دوچار تھی؛ اُس سے۔ جو سامنے والی بید کی تکیہ دار کرسی پر نظر نیچی کیے، پاؤں پر پاؤں رکھے بیٹھا تھا، جو اپنا جملہ۔ ناقابلِ برداشت جملہ ابھی ابھی ختم کر چکا تھا!

"کیا میں یہ سُن سکتی ہوں کہ اس قصہ کا راوی کون ہے؟" حسینہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے مدِ مقابل نوجوان سے پوچھا۔

لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے اپنی سفید پڑ جانے والی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس پسینہ کو چاہے کچھ بھی کہا جائے مگر یہ عرقِ ندامت نہ تھا۔ وہ حسینہ سے مخاطب ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں راوی کا نام نہیں بتا سکتا۔ میں قسم کھا چکا ہوں۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس خبر کا ایک ایک حرف سچا ثابت کیا جا سکتا ہے۔"

حسینہ کے دل میں اس جملہ کے آخری حصہ نے ایک چٹکی لی، اُسکے دماغ نے چاہا کہ انتقام کے لیے نازک زبان کو آلۂ تیز بنا دیا جائے، مگر۔ مگر۔ پھر کوئی ایسا زبردست خیال تھا جو دل و دماغ دونوں پر غالب آگیا، تمام جذباتِ اندرونی گھُٹ گھُٹا کر اُسکے چہرۂ نازک پر "زہر خند" کی تصویر بنا سکے اور بس!

"حسینہ! تم اس سے منکر نہیں ہوتیں؟ خدا کے واسطے پیاری حسینہ کہو کہ یہ سب لغو ہے!"

معلوم ہوتا تھا کہ کہنے والا اپنی تمام عمر کی تلخ ترین ساعتوں کو سخت بے چینی کے ساتھ میدان واہمہ کی راہ نوردی میں گذار رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ طوفان باد و باراں۔ یعنی ایک بالائی اور اچانک مصیبت اُسے راہِ راست سے بھٹکا نہ دے، اُسکی آواز سے محبت ہی نہیں آزار کا بھی پتہ چلتا تھا!

"میں کیوں کہوں کہ لغو ہے" حسینہ نے گردن جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "جب کہ تمہارا معتبر راوی" اس آخری لفظ پر اُسکے چشم و ابرو نے ناقابلِ بیان نفرت کا اظہار کیا "ایک ایک حرف کو

سچا ثابت کر سکتا ہے ؟"

اُس نے حسینہ کو دیکھا۔ دیکھا نہیں گھورا! اُس کا دم گھٹنے لگا، کلیجہ منہ کو آیا، یارائے ضبط رخصت، طاقتِ خودداری سلب: آزارِ اندرونی الفاظ کی صورت میں نوکِ زبان سے یہ نکلا۔
"حسینہ!" اُس سے بغیر کہے نہ رہا گیا۔" پیاری صورت والی حسینہ۔ جس پر میں نے جان چھڑکی، جس کے دلکش حسن کی میں نے پرستش کی، جس کو فرشتہ صفت ہی نہیں عصمتِ مجسم سمجھا۔ وہ اور یہ ذلیل واقعہ! خدایا رحم!! میرے ٹوٹ جانے والے دل اور تڑپنے والی حسرتوں پہ رحم!!" اُس نے کہنیاں رانوں پر ٹکائے ہوئے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ بلکہ دونوں بے حِس ہاتھوں میں اپنے جیتے جاگتے چہرہ کو دفن کر دیا!

"مگر اس قسم کی افواہ میرے، تمہارے تعلقات میں کیا فرق پیدا کر سکتی ہے!" حسینہ نے اپنی معمولی خاموشی کے رنگ میں کہا۔ بظاہر اس پر مطلق اثر نہ تھا، بباطن ممکن ہے کہ اسکے دل و دماغ میں جذبات کا غضب و نفرت، بُری طرح، کوششِ خودداری سے دست و گریباں ہوں۔

"فرق؟" مغموم نوجوان نے چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر حسینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:"آسمان و زمین کا فرق! کیا تم امید کر سکتی ہو کہ ایسے واقعہ کے علم پر بھی میری نظروں میں تمہاری وہی وقعت باقی رہے گی جو ہمیشہ سے تھی؟ میں اب بھی تم کو باعصمت سمجھوں گا؟ اب بھی راستبازیِ مجسم تصور کرونگا؟ اب بھی چاہوں گا کہ اپنے دل کی مالک، اپنے آرام کی شریک، اپنی عزت کی ذمہ دار بناؤں؟..."
وہ کہہ رہا تھا اور اُسکی آنکھیں درشتی و نفرت کے رنگ میں رنگتی جاتی تھیں!

"گویا۔ گویا۔ تم اب مجھ سے .... ؟" حسینہ جملہ پورا نہ کر سکی، کسی نظر نہ آنے والی چیز نے اُسکا گلا دبا دیا۔ اُسکا سانس رُکنے لگا، دم گھٹنے لگا!

"ہاں! بیشک میں اب تم سے شادی نہیں کر سکتا۔" نوجوان نے حسینہ کے ناتمام جملہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:"کوئی وجہ نہیں کہ میں تمہاری داغ آلود پوشاک پر بُرقہ عیب پوش بنوں، تمہاری ہدفِ غلط رَوی عصمت کو طوقِ ملامت کی طرح اپنے گلے میں پہن لوں؟ کیا تمھیں اب بھی شرم نہیں آتی؟"
"شرم؟۔ البتہ مجھے نہیں آتی۔" حسینہ اب بے چین تھی، وہ اپنی جگہ پر کسمسا رہی تھی، خدا جانے کیا چیز تھی جو اندر ہی اندر اُسکو بے آپے کیے دیتی تھی؛ اُسکی خاموشی رخصت ہو چکی تھی اور

نفرت و انتقام رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ کسی قدر اونچی آواز سے اُس نے کہا" گرجیل۔ کیا تم کو شرم آتی ہے؟ تم کیا۔ تمھاری جنس کے کسی فرد کو بُری سے بُری حرکات کے ارتکاب پر عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی شرم آتی ہے؟ عورت۔ کمزور جنس۔ خصوصًا مشرقی عورت، بے زبان ہستی، سچ تو یہ ہے کہ بڑی بدقسمت چیز ہے: ہمیشہ مرد کی تحریک سے، مرد کی بے ایمانی سے، مرد کے اغوا سے اُسکی عزیز زندگی تباہ و برباد ہوتی ہے اور ہمیشہ نشانۂ ملامت بھی اُسی کو بنایا جاتا ہے! مرد آزاد سے آزاد طریقۂ زندگی اختیار کرتا ہے، پنج عیوب شرعی کے علاوہ جہاں تک اُسکے امکاں میں ہے کسی چھٹے یا ساتویں عیب کے ارتکاب میں بھی اُسے تامل نہیں ہوتا، وہ شباب سے ایسا بدمست ہوتا ہے کہ ارتکاب گناہ کے لیے تمام پردہ و احتیاط کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے، بیشمار جھوٹے وعدے، لاتعداد جھوٹی قسمیں، گندم نمائی و جَو فروشی، خصوصًا صنفِ نازک کو فریب دینا، بھولی صورتوں کو غلط راہ پر لگانا، ناواقف و نافہم ہستیوں کو جو غنچۂ ناشگفتہ کی طرح اثرِ نسیم سے بھی ہنوز بے بہرہ ہوتی ہیں، اپنی خبیث عادات کا تختۂ مشق بنانا، یہ سب وہ اپنا زیورِ طبع سمجھتا ہے اور جب قدرت کا نظر نہ آنے والا ہاتھ اس بدمستی پیدا کرنے والے زمانہ کو آہستہ آہستہ اُسکے دسترس سے نکال لیتا ہے تو مجبورًا۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو۔ کے اتباع میں اُسے ایک مونسِ زندگی کی تلاش ہوتی ہے اور اب وہ کسی ایک ہستی کا ہو کر رہنا چاہتا ہے: لیکن یہ ہستی اُسکے نقطۂ نگاہ سے حُسنِ مجسم ہونے کے علاوہ عصمت کی دیوی ہو، عفت کی زندہ تمثال ہو، کوئی بے بنیاد سے بے بنیاد الزام بھی اُسکے متعلق کبھی زمانۂ جاہلیت کے اوراقِ پریشاں میں بھی نہ پایا جائے، اور وہ اپنے شوہر کو دنیا بھر کے مردوں میں سب سے افضل و اعلیٰ سمجھتی ہو اور تا دمِ مرگ سمجھتی رہے! اگر ایسی نہیں ہے تو ناکارہ ہے، ذلیل ہے، اور اُس مرد کی بھی مونسِ زندگی و شریکِ عزت بننے کے لایق نہیں جو فی الحقیقت داستانِ ماضی کے دُہرائے جانے پر زندگی و عزت دونوں کو پہلے ہی سے کلیتًا ختم کر چکا ہو! کیا یہی انصاف ہے؟ کیا اسی کو انسانیت کہتے ہیں؟ ننانوے فی صدی ایک عورت سے شادی ہو جانے کے بعد بھی مرد حتی الامکان اور حتی المقدور سچا نہیں رہتا۔ اسکے علاوہ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد اپنی شخصیت پر کیوں نہیں غور کرتے، اس معاہدۂ معاشرت میں کھوٹی جنس دینے پر کھری جنس لینے کا دعوٰے کہاں تک انصاف کہا جا سکتا ہے؟ ......"

"حسینہ!" جمیل نے کچھ دل ہی دل میں قائل ہو کر کہا: "میں اس واقعہ کی بھی پروا نہ کرتا اگر تم مجھ سے سچائی کے ساتھ اسکا اظہار کر دیتیں۔ لیکن تم نے اب تک مجھ سے جھوٹ بولا اور مجھے غلط یقین دلایا۔"

"اگر اس واقعہ کو سچا مان لیا جائے تو" حسینہ نے اُسی رنگ میں جواب دیا: "مجھے سوائے جھوٹ بولنے کے چارہ نہ تھا۔ میں اگر شروع ہی میں ایسا اظہار کرتی تو یقیناً تم کو کھو دیتی۔ تم پھر کبھی مجھے اپنی مونس زندگی بنانے کا خیال بھی نہ کرتے۔ اور میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں کسی وجہ سے بھی تم سے علیحدہ رہکر زندہ رہنے کے لیے تیار نہیں: "دروغِ مصلحت آمیز" کو تم فریب سے تعبیر کرتے ہو تو کرو گر ایک عورت محض محبت کے بدولت زندگی تک نثار کر دیتی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ تم بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرتے ہو جیسی میں کرتی ہوں۔ مگر در اصل میرا خیال محض خیال ہی نکلا"۔ . . . .

"حسینہ! پیاری حسینہ! خدا کے لیے یہ الزام نہ لگاؤ۔ میں تم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میں تمھاری پرستش کرتا تھا۔ میں تمھاری صورت میں خدا جانے اپنی زندگی کی کیسی خوبصورت جھلک دیکھتا تھا۔ اور میں تم سے سچی محبت رکھتا تھا"۔

"کیا اُسی زائل ہو جانے والی خواہشِ نفسانی کو تم محبت کہتے ہو؟ کیا اسی ایک معمولی سے ہوا کے جھونکے سے ٹھنڈا ہو جانے والے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو تم شعلۂ محبت بتلاتے ہو؟ غلط! بالکل غلط!! محبت وہ درد ہے جو کسی دوا سے بھی زائل نہیں ہو سکتا۔ محبت وہ کشش ہے جو عامل تک کو قوتِ کشش میں جذب کر دیتی ہے۔ یہ وہ حقیقی جذبہ ہے جو ہر دماغی و جسمانی قوت کو سلب کرنے کے ساتھ حبیب کو محبوب اور محبوب کو حبیب بنا کر بھی کم نہیں ہوتا! اپنے زوال پذیر خواہش اور چشم زدن میں معدوم ہو جانے والے جوش کو محبت نہ کہو۔ یہ محبت سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا"۔

"حسینہ! پیاری حسینہ!" جمیل کی آنکھوں میں پھر سرورِ محبت کے ڈورے دوڑ گئے، وہ عجیب نظروں سے حسینہ کو دیکھ رہا تھا اور مخاطب تھا: "تم میرے دل کا اندازہ کرنے میں غلطی کر رہی ہو۔ تم کو میری حالتِ اندرونی کا مطلق احساس نہیں۔ میں نے جس وقت سے اس واقعہ کو سُنا ہے میری طبیعت رہ رہ کر گھٹی جاتی ہے، ٹھہر ٹھہر کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے! آہ! پیاری نازنین! میرا دل تمھاری محبت سے اب بھی سرشار ہے۔ میں اب بھی یہی دیکھتا ہوں کہ تمھارے بغیر جمیل زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر "چار با بزیستن ناچار باید زیستن" کے قانونِ قدرت کے سامنے اُسے گردن جھکانی پڑی تو اُسکی تمام

زندگی محض زندہ درگور ہو جانے کے برابر ہوگی۔ پیاری حسینہ سے جدا ہوکر جمیل کا مستقبل ایک اندھیری اور بھیانک رات بنجاتا ہے!" اُس نے ایک آہ کے ساتھ گردن جھکالی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا!

"پیارے جمیل!" حسینہ نے بھی نفرت و غصہ کا لہجہ چھوڑتے ہوئے کہا:" تو کیا اس واقعہ کی بنا پر تم اپنی اور اپنے ساتھ میری۔ زندگی ہمیشہ کے لیے برباد کرنا پسند کروگے؟ کیا تم ایسے کس وناکس کی مترض زبان سے دو زندگیوں کی قطع و برید کو روا رکھوگے؟"

"مگر حسینہ!" جمیل نے گردن جھکائے ہوئے کہا:" یہ افواہ چھپ نہیں سکتی۔ میرے تمام خاندان کو اِسکا علم ایک نہ ایک دن ہو جائیگا۔ میرے والدین، میرے بھائی، یہ سب تمیں اور مجھے کن نظروں سے دیکھیں گے؟ میں اور تم کس قدر ذلیل سمجھے جائیں گے؟ نہیں۔ تم نے اسپر غور نہیں کیا؟"

"اچھا۔ ذلت کا خیال ہے؟" حسینہ نے کہا:" غرور، فرضی و نمائشی شخصیت کی بنا پر پیدا ہونے والا غرور مانع ہے! کیا یہ ذلت نہیں کہ تم محبت میں ثابت قدم نہ رہو؟ کیا یہ ذلت نہیں کہ تم ایک شریف لڑکی کو تباہ کردو؟ کیا یہ ذلت نہیں کہ تم کو مرد ہوکر اپنے الفاظ اور قول و قسم کا پاس نہ ہو؟ یہ یاد رکھو کہ حسینہ سوائے تمھارے اگر کسی دوسرے کے آغوش میں جا سکتی ہے تو وہ آغوش گور ہوگی۔ تم زندہ رہنے کے لیے قدرت کے ہاتھ سے مجبور ہو سکتے ہو لیکن حسینہ کو قدرت بھی نہیں روک سکتی۔ کیا یہ ذلت نہیں کہ یہ خون ناحق تمھاری گردن پر ہوگا؟"

جمیل گردن جھکائے ہوئے تھا، الفاظ کانوں کے ذریعہ سے دماغ تک پہونچ رہے تھے، معانی دل و دماغ کے اُس کمزور حصہ کو جو ابھی جذبۂ دیرینہ سے متاثر تھا کچھ کے دے رہے تھے۔ مگر وہ خاموش تھا۔ اور جذباتِ متضاد کی کش کش میں محو تھا!

"جمیل!" حسینہ نے تھوڑی دیر تک جواب کا انتظار کر چکنے کے بعد آخری مرتبہ پھر التجا کی۔ "تم کہتے ہو کہ بغیر میرے تمھاری زندگی سے تمام مسرت غائب ہو جائیگی۔ اور میں کہتی ہوں کہ بلا تمھارے میری زندگی ہی غائب ہو جائے گی۔ ایسی محبت کے درمیان ہونے میں بھی تم کو آئے گئے کی زبان کا خیال ہے؟ کیا تمھاری تمام عمر کی مسرت اُن چند بے معنی الفاظ سے بھی کم وقعت رکھتی ہے جنکا تمھیں اس درجہ خوف ہے؟ کیا تم محبت کا معاوضہ محبت پاکر مردانہ وار ایسے رکیک حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟ کیا ہم دونوں

ایک دوسرے کی مسرت و اطمینان پر قانع ہو کر لاا بالی افواہوں کو تحقیر کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے؟ مجھ سے پوچھا جائے تو میں صرف تمھاری ذات کے معاوضہ پر ہر قسم کی بدنامی، رسوائی، تکلیف اور ذلت برداشت کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہوں۔ مجھے تمھاری ذات کے مل جانے پر جو مسرت لازوال حاصل ہوگی اُسکے مقابلہ میں کوئی بیرونی بدنامی و رسوائی کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ میں سچے دل سے محض تمھاری ذات پر قانع ہونے کو تیار ہوں کیا تم مرد ہو کر اتنی بھی پامردی و ہمت نہیں رکھتے؟ بولو؟"

جمیل (گردن جھکائے ہوئے) "نہیں۔ پیاری حسینہ . . . ." وہ کہتے کہتے پھر رُکا اور حسینہ جملہ نا تمام کے سُننے کے لیے ہمہ تن گوش بن گئی۔ مستقبل خوفناک کی تصویر جمیل کی قوتِ واہمہ طرح طرح کے لباس میں پیش کر رہی تھی۔ حسینہ کو جدا کرنے کے لیے اُسکا دل تیار نہ تھا، مگر اس افواہ سے پیدا ہونے والی رسوائی بھی کچھ کم حقارت انگیز نہ تھی۔ کیا وہ اپنے احباب کی نگاہ میں بُری طرح ذلیل نہ ہو جائیگا؟ کیا اُسکی تمام عمر کی شریکِ رنج و راحت بیوی ہر کنبہ والے کی نشانۂ طعن و تمسخر نہ بنے گی؟ کیا اس شادی سے پیدا ہونے والی اولاد بلا کسی ذاتی قصور کے روزِ پیدائش ہی سے ہمسروں میں تذلیل کے ساتھ نہ دیکھی جائے گی؟ وہ خود تو درکنار اُسکی بے قصور اولاد تک کو اس غلطی کا ناگزیر نتیجہ بھگتنا پڑیگا اور ضرور پڑیگا! ظلم۔ آفت۔ مصیبت۔ ناقابلِ برداشت مصیبت!! جمیل کا سانس گُھٹا، طبیعت گھبرائی، دل گڑا اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے کہا "میں نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا۔ میں بُری طرح مجبور ہوں! خدایا رحم!"

"نہیں کر سکتے!" حسینہ نے دُہرایا وہ اپنی کُرسی پر سے اُٹھی۔ کونے میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی میز تک گئی۔ اُسکا کھینچنے والا خانہ۔ یا "دراز" کھینچی۔ خطوط کے بنڈل میں سے ایک خط نکالا اور پھر جمیل کی طرف مُڑی جو برابر اپنے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چُھپائے خاموش تھا! حسینہ کے چہرہ پر اب بلا کا طیش، قیامت کا غصہ، اور آفت کا خون، نمودار تھے: اسکا سانس اپنی معمولی رفتار سے دو چند سُرعت کے ساتھ آ رہا تھا۔ اُسکے جسم پر ایک خفیف سا رعشہ قابض تھا! خط کو جمیل کے آگے پھینکتے ہوئے اُس نے کہا "کیا میری اس آخری استدعا کو آپ پورا کر سکتے ہیں کہ اس خط کو بچشم خود لاحظہ فرمالیں! اس سے میرا مطلب کبھی ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے فیصلۂ آخری کو تبدیل کریں۔ میری اور آپ کی شادی نہیں ہو سکتی اور یہ فیصلہ قطعی طور پر آپ خود کر چکے!"

"جمیل نے چہرہ پر سے ہاتھ ہٹائے، خط کو زمین سے اُٹھایا، اور گردن جھکائے ہوئے پڑھنا شروع کیا! لکھا تھا:—

"میری پیاری بہن حسینہ بیگم!"

"میری شادی پر جو مبارک باد کا خط تم نے بھیجا ہے اُسکا شکریہ میں نا چیز ادا نہیں کر سکتی! میری شادی اور اُس سے پیدا ہونے والی تمام مسرت و عزت یہ سب کچھ محض تمھاری غریب نوازی کا صدقہ ہے! تمام دُنیا اسکو نہ جانے مگر میرا دل جانتا ہے اور خدا ئے دانا و بینا جانتا ہے۔ تمھارا احسان محض احسان نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ میں تمام عمر اسکو بھول نہیں سکتی۔ خدائے پاک عالم ہے کہ میری اولاد بھی اس بارِ احسان سے سبکدوش نہ ہوگی! تم نے اپنے نام کے استعمال کی اجازت دینے سے مجھ روسیاہ کے جُرم کا بار اپنے سر لیا اور محض اسلیے کہ میں اپنے حصولِ مقصد میں ہر قسم کی بدنامی سے بچ سکوں! بہن حسینہ مجھے شرم آتی ہے اگر میں لکھوں کہ میں اسکے معاوضہ میں۔ اب جبکہ میں ریاست کے نظم و نسق میں کچھ آواز رکھتی ہوں۔ ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ تم جس طرح چاہو میں ہر قسم کی امداد کے لیے حاضر ہوں: مگر میں جانتی ہوں کہ تمھاری غیور طبیعت کو یہ اظہار بھی ناگوار ہوگا۔ اسلیے میں معافی مانگتی ہوں! مجھے پورا احساس ہے کہ اُس واقعۂ بد کی افواہ اگر میرے شوہر کو ہوجاتی اور یہ علم ہوجاتا کہ "حسینہ" کا فرضی نام میں نے اختیار کیا تھا تو یقینی آج نہ میں اُنکی بیوی ہوتی اور نہ وہ میرے شوہر! اس سے جو نا قابلِ تلافی نقصان ہوتا وہ تم خود سمجھ سکتی ہو! پیاری حسینہ اگر تمھاری عزت پر اس شرافت شعاری سے کسی طرح کے دھبہ کا خوف ہو تو تم میری اس تحریر کو اپنے دعوے پاک سرشتی کے ثبوت میں بلا تامل استعمال کر سکتی ہو۔ میں اپنی گذشتہ غلط روی کی معافی شاید بارگاہِ الٰہی سے حاصل کر سکوں مگر اسکی وجہ سے اگر تمھاری زندگی تلخ ہوئی تو پھر یہ ایسا گناہ ہوگا جسکو خدائے منصف کسی منت وسماجت پر بھی معاف نہ کریگا!

میں پھر کہتی ہوں کہ تم مجھ سے کسی خدمت کے لیے اشارہ کرو۔ تمھاری

امداد یا خدمت میری دلی مسرت و افتخار کا باعث ہوگا! میری دلی دعا ہے کہ خدا تمکو ہر طرح کامیاب اور ہر دلعزیز بنائے!

تمہاری حلقہ بگوش بہنت

سارہ ۔ بیگم ولیعہد ۔۔۔۔“

”ولیعہد ریاست ۔۔۔۔ کی بیوی اور یہ واقعہ“ جمیل کے منہ سے بیساختہ نکلا

”ہاں! وہ اور یہ واقعہ!“ حسینہ نے اُسی غیظ و غضب کے ساتھ کہا ”میرے والد اُس زمانہ میں وہاں جلیل القدر عہدہ پر تھے ۔ محلات سے اور والدہ صاحبہ سے ربط ضبط تھا ۔ میں نسوی قیمت سے اور ہمسنی کی وجہ سے سارہ سے نہایت مانوس اور بے تکلف تھی ۔ جو کچھ قصہ تم نے سنا قطعی صحیح ہے لیکن صرف اس تغیر کے ساتھ کہ وہ فعل سارہ کا تھا بد نصیب حسینہ کا نہ تھا: سارہ نے اپنے جوشِ غلط روی میں اپنی عزت بچانے کے لیے میرا نام اختیار کیا تھا اور فریق ثانی پر کبھی نہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ کون تھی اور حسینہ کون ہے! یہ سب کچھ اُس نے میری اجازت سے کیا تھا اور مجھ ناعاقبت اندیش نے احسان سمجھ کر اسکو روا رکھا تھا ۔۔۔۔“

”بس بس! میں سمجھ گیا ۔ اچھی طرح سمجھ گیا“ بات کاٹ کر جمیل نے کہا ”میری پیاری حسینہ! میری بدگمانی کو معاف کرو ۔ میری غلط فہمی سے درگزرو ۔ تم میری زندگی کی مالک ۔۔۔۔“

”قطعی نہیں! تم فیصلہ کر چکے اور یہ فیصلہ ہو چکا ۔ میری تمہاری شادی اب نہیں ہو سکتی ۔ میں اُسوقت بار بار استدعا کرتی رہی ۔ محض اس خیال سے کرتی رہی کہ کسی کا راز جو میرے سینہ میں امانت ہے اسکو افشا نہ کروں اور حتی الامکان ایک شریف عورت کو تمہاری نگاہ میں ذلیل نہ کروں مگر تم نہ مانے اور تم نے آخری فیصلہ خود کر دیا!“

”پیاری حسینہ!“ جمیل نہایت عاجزی کے ساتھ حسینہ کو دیکھ رہا تھا اور اُسکا ہر ایک نگاہ معافی نامہ کا برقی پیغام بنا ہوا حسینہ کی آنکھوں میں سے دل تک اُتر جانے کا راستہ ڈھونڈھ رہا تھا ”معاف کرو! برائے خدا معاف کرو! اپنے حُسن کے صدقہ میں معاف کرو ۔ کاش مجھے اصلی واقعہ کا علم ہوتا ۔۔۔۔“

”جمیل بس! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ۔ میں نے ایسے موقعہ پر تمہاری محبت کو آزمایا مگر افسوس ہے کہ

پہلے ہی تاؤ میں اُسکا رنگ اُڑ گیا! اُسوقت تم نے میری استدعا کو نہ مانا کوئی وجہ نہیں کہ اب تمہاری استدعا کو میں مانوں۔ خصوصًا اس وقت جبکہ تمہاری محبت ایسے خفیف سے صدمہ سے پاش پاش ہو جانے والی چیز ہے!" حسینہ کہتی ہوئی کمرہ سے باہر چلی گئی اور جمیل نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھدیا!

سکوت! وہ سکوت جو کبھی آدھی رات کو آنکھ کھل جانے پر آپ اپنے گرد و پیش محسوس کرتے ہوں: سناٹا! وہ سناٹا جو کبھی اندھیری گھڑیوں لق و دق جنگل میں ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ جسم کو متاثر کرتا ہو! یہ کیفیت اور جمیل کا دل۔ دل اور حسرتوں کا ہجوم، تمناؤں کا حملہ؛ دماغی قوتیں جو خودداری وغرور کے بل پر اکڑ رہی تھیں پسپا ہو چکی تھیں اور اس کشمکش دماغی کا نتیجہ انفعال تھا!

تھوڑے عرصہ میں پیر کی آہٹ کے ساتھ کوئی جمیل کے قریب کھڑا تھا: نظر اُٹھانے پر "وہ کوئی" حسینہ کی پیاری صورت میں تبدیل ہو گیا: جو کہہ رہی تھی: —

"جمیل! پیارے جمیل!! حسینہ واپس آگئی، ہمیشہ کے لیے واپس آگئی: اس وجہ سے نہیں کہ تمہاری استدعا نے اُسپر کچھ اثر کیا۔ نہیں قطعی نہیں! بلکہ محض اس وجہ سے کہ اُسکا دل مجبور کر رہا ہے اُسکی اپنی محبت اُسے تجھ سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور اُسی محبت نے کشاں کشاں اُسے کھینچ بلایا! اُسکی محبت زائل ہونے والی شے نہیں، وہ زندگی کے آخری سانس کے ساتھ ساتھ باہر نکلے تو نکلے! وہ تم سے معافی مانگتی ہے اور اسلیے مانگتی ہے کہ شعارِ محبت کے خلاف چند لمحوں کے لیے بھی اس سے غصہ کا ارتکاب کیوں ہوا! خدا اسکے لیے معاف کرو!"

"حسینہ! پیاری حسینہ!!" وہ اُٹھ کھڑا ہوا! دو دل ہم آغوشی کی دستگیری سے ایک ہوگئے۔ ایک، بالکل ایک! اور اُن دونوں کے ایک ہو جانے پر بوسۂ مشترک نے مہرِ محبت لگا دی!! ایک ناقابلِ بیان کیفیت نے دونوں دماغوں کو کچھ عرصہ کے لیے دنیا و مافیہا سے کیف لخت کوسوں دُور کر دیا۔ ایک نشۂ لازوال نے سینہ کے اندر دھڑکنے والی چیز کو مبہوتِ محبت بنا دیا!!

انچہ با بادہ کشاں ساغر صہبا می کرد

دورِ چشمِ تو بہ مخمور دلِ ما می کرد

"سلطان حیدر جوش"

فلسفۂ خودداری

ہوئی جب دستِ قدرت سے یہ ساری عالم آرائی
دکھائی صانعِ فطرت نے اپنی شانِ یکتائی

دیا ترتیب قانونِ تمدن اپنے ہاتھوں سے
تو پھر جذبات نے اپنے مدارج پر جگہ پائی

کیا محسوس جب حفظِ مراتب کی ضرورت کو
تو خودداری و عزتِ نفس کی تعلیم فرمائی

یہی انساں کو بتلاتی ہے فرقِ عزت و ذلت
اسی نے وضعداری کی ہمیں تدبیر سکھلائی

کیا ہمکو اسی نے عزت و ناموس سے واقف
کیا ہمکو اسی نے آشنائے خوفِ رسوائی

اگر انساں میں باقی نہ ہو احساسِ خودداری
اگر جاتی رہے دنیا سے اسکی کارفرمائی

تو فرق آ جائے موجودہ قوانینِ تمدن میں
عجب نظارہ دیکھے ہر طرف چشمِ تماشائی

تمیزِ حق و باطل صاف اُٹھ جائے زمانے سے
کوئی شوکت کا خواہاں ہو نہ عظمت کا تمنائی

کہیں عصمت فروشی ہو کہیں ملت فروشی ہو
کریں ہر آستاں پر خوش خوشی جا کر جبیں سائی

نہ پھر صبر و تحمل ہی رہے عاشق مزاجوں میں
حسینوں میں نہ پھر باقی رہے ذوقِ خودآرائی

اگر جاتا رہے انسان سے احساسِ خودداری
تو پھر ہو جائے بے معنی جہاں میں لفظِ رسوائی

نہ کچھ باقی رہے پھر فرق انساں اور حیواں میں
نظر میں پھر ایک ہی سے ہیں عاقل اور سودائی

یہی جذبہ ہے جس نے جانِ انساں کی بچا لی
عدو کے سامنے لیکن کبھی گردن نہ جھکوائی

ہوئی ہے یہ ہجومِ آرزو میں سدِّ رہ اکثر
اسی نے یاس کے عالم میں کی آخر مسیحائی

یہی مُہرِ سکوت اکثر لگاتی ہے زبانوں پر
یہی دیتی ہے اکثر بزدلوں کو تابِ گویائی

کہیں یہ بن گئی ہے ہمتِ مردانہ انساں میں
کہیں غیرت کی صورت میں ہے اسکی جلوہ آرائی

کہیں وضعِ شرافت ہے کہیں طرزِ وجاہت ہے
کہیں شانِ حمیت ہے کہیں یہ شانِ دانائی

کہیں شرم و حیا سے سب اسے تعبیر کرتے ہیں
کہیں کہتے ہیں اس جذبہ کو سب طرزِ شکیبائی

کہیں یہ شوقِ شہرت ہے کہیں یہ پاسِ عزت ہے
بڑھاتی ہے کہیں یہ آرزو سے قدر افزائی

اسی نے اک گدا کو سطوتِ شاہی عنایت کی
اسی نے ایک بیکس کو پنہایا تاجِ دارائی

اسی سے اشرفیت کا ہمارے سر بندھا سہرا
اسی نے "احسن التقویم" کی تفسیر تبلائی
اسی نے ذوق بخشا ہے دلوں کو فتح و نصرت کا
کیا پیدا اسی نے دل میں ارمانِ صف آرائی
یہی اعزاز کا باعث ہوئی صاحب کمالوں کو
اسی نے بے کمالوں میں حسد کی آگ بھڑکائی
یہی ہے فرق کا باعث شریفوں اور رذیلوں میں
اسی سے ہم سمجھتے ہیں بھلائی اور اچھائی
یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو انساں بناتا ہے
شرافت کی اسی نے کی جہاں میں عزت افزائی
وہ بے حس ہیں جو سمجھے خود نمائی و صفداری کو
نہیں کہتے جو اپنی آپ عزت وہ ہیں سودائی
وہ کیا انسان ہیں رکھتے نہیں جو آن بان اپنی
وہ حیواں ہیں نہیں ہوتے جو خودداری کے شیدائی
غرض فہمی نظامِ عالمِ امکاں اسی پر ہے
وہ دیوانے ہیں خودداری کو کہتے ہیں جو خود رائی

سید محمود اعظم فہمی (از بھوپال)

نہ سرگذشت سنو عشق کے زمانے کی
کہ خونِ دل سے ہے سرخی مرے فسانے کی
نفس میں پھر وہ کہاں شان آنے جانے کی
جب اعتدال سے گذری ہوا زمانے کی
چمک میں برق کی پنہاں تھا ماجرائے ستم
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی
زمینِ کوئے وفا دل سا بیقرارِ ازل
ارے ہوس ہی ہوس ہے قدم جمانے کی
بلند و پستِ جہاں سے بنا ہے جادۂ شوق
لکھیں نصیب میں تھیں ٹھوکریں زمانے کی
وہ حال پوچھیں غضب ہے میں یہ بھی کہہ نہ سکوں
کہ سلب ہوگئی طاقت زباں ہلانے کی
نہ اعتبار چمن کا نہ اپنی ہستی کا
بنا ہے شاخِ شکستہ پہ آشیانے کی
نہ دیکھو شکل وہ تم جس سے روح ہے بیزار
ضرورت اب نہیں چادر کے بھی ہٹانے کی
ہے کس بساط پہ اے مشتِ خاک امیدِ ثبات
ہوا بدلتی ہے ہر سانس میں زمانے کی
تلاشِ حدِ وفا پردۂ تغافل میں
جو کی کبھی تو اسی صبر آزمانے کی
مآلِ شوق نہ سنیے زبانِ نشتر سے
لہو رلائے گی رنگینی اس فسانے کی

نشتر (سندیلوی)

نظرے خوش گذرے

گذشتہ نمبر ابھی شایع نہیں ہوا تھا کہ اخبارات سے یہ خبر ملی کہ ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نے اُس خطاب کو تشکریہ کے ساتھ قبول کر لیا ہے جو لکھنؤ کی ایک صحبت میں مولوی صاحبان کے زیر اہتمام تجویز ہوا تھا اور جسکے متعلق گذشتہ نمبر میں تفصیل لکھا جا چکا ہے - ہم نے جس توقع کا آخر مضمون میں اظہار کیا تھا وہ پوری نہیں ہوئی - اب اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی بارگاہ میں بخلوص دل دعا ہے کہ مسلمانوں کو اس تحریک کے نتائج بد سے محفوظ رکھیں - آمین -

---

جنگ کی آگ بالآخر سرد ہو گئی - اور دنیا متوقع ہے کہ اب عرصے تک انسانی ہتیا، بہمیت اور خوں ریزی کے ان دردناک نظاروں سے دل تنگ نہ ہوں گی - آبشار کا پانی جس قدر بلندی سے گرتا ہے اوسی قدر تیزی اور روانی اُس میں ہوتی ہے - اور جس قدر اُسکے پانی کا حجم زیادہ ہوتا ہے اُسی اندازہ سے اُسکی آواز بلند اور دور رس ہوتی ہے - بعینہ اسی طرح نوع آدم کا بیدریغ خون بہانے اور خلقت انسانی کو طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا کرنے میں اس جنگ کو تاریخ عالم کی تمام سابقہ لڑائیوں کے مقابلہ میں جو امتیاز حاصل رہا ہے اُسکے نتائج و عواقب کی وسعت و اہمیت بھی اُسی مرتبہ کی ہے - اگرچہ انکے متعلق صحیح طور پر اُسوقت تک کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک مجلس صلح منعقد ہو کر اُسکی منظور کردہ تمام تجاویز پر دول متحاربہ دستخط نہ کر دیں - لیکن یہ تو کم سے کم دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ صلح ہونے سے پیشتر ہی دنیا کے تین با جبروت و عظمت صاحبان افسر و دیہیم اپنے تخت و تاج سے دست بردار ہو چکے - روس، آسٹریا، اور جرمنی کے شہنشاہوں کا جو حشر ہوا، پُر غرور و نخوت انسان کے لیے اس سے زیادہ عبرت انگیز سامان فراہم ہونا دشوار ہے - لاریب کہ کبر و پندار کی سزاوار وہی ایک ذات واحد ہے جس نے جمیع مخلوقات عالم کو بود و نمود عطا فرمائی ہے - لیکن جس طرح عہد ماضیہ کے کل واقعات آج ہمارے لیے ایک افسانہ سے زیادہ نہیں، یقین رکھنا چاہیے کہ اس جنگ نے جو تماشائے عبرت دکھایا ہے اُسے بھی امتداد زمانہ نسیاً منسیا کر دے گا - اور جو امیدیں دائمی صلح کی آج ہم نہایت پختہ یقین کے ساتھ

باندھ رہے ہیں کل یہ بھی حرفِ غلط نجائیں گی : کہ یہی درحقیقت تقاضائے فطرت ہے۔
امریکہ اور یورپ کے وہ مہذب اربابِ بنیش جو ایک عالمگیر اور مستقل صلح کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں یقیناً تمام نوع انسانی کے شکریہ کے مستحق ہیں، لیکن اُنکے ساعی اور ہمارے شکریے دونوں رائیگاں جائیں گے۔ اسلیے کہ خالق عالم نے جس نہج پر انسان کی تخلیق کی ہے اور جو مختلف النوع جذبات افراد و اقوام کے دلوں میں ودیعت کیے ہیں اُنکو دیکھتے ہوے اس سب جد و جہد کی کائنات ایک خواب سے زیادہ نہیں ہے۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

برایں ہمہ یہ توقع شاید بیجا نہ ہو کہ کم سے کم اہل یورپ تو آیندہ نصف صدی تک امن و عافیت سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ کیونکہ مجلس اقوام کی بنیاد جن اصولوں پر مدبرینِ امریکہ ڈالنا چاہتے ہیں اُن سے مستفیض ہونے کا حق وہیں کے مہذب باشندوں کو ہو سکتا ہے۔ افریقہ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کی نیم مہذب اقوام کے لیے "ہنوز دلی دور است"۔

بہرحال جنگ یورپ کا خاتمہ جس طریقہ پر ہوا ہے اُس سے صاف عیاں ہے کہ بالآخر جمہوریت کو فتح نصیب ہوئی۔ اور اگرچہ اب بھی یورپ کے چھوٹے چھوٹے رقبوں پر بہت سے تاجدار حکمراں ہیں مگر لیکن یہ یقین رکھنا چاہیے کہ مجلس اقوام کا قیام اُنکے شاہانہ اقتدار کو ابھی سردست محدود اور آیندہ چل کر قطعاً مفقود کر دے گا۔ مگر علمبردارانِ جمہوریت کے لیے ابھی اسکا وقت نہیں آیا ہے کہ پورے اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ اسلیے کہ چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کے سوا ابھی دنیا میں بڑے بڑے بُت سر پر آرائے حکومت نظر آرہے ہیں۔ اور جب تک اُنکا ذاتی اقتدار اقوام کے تعبد و پرستش کا مرکز رہے گا اُس وقت تک جمہوریت کو کامل فتح نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی بنا پر اندیشۂ قوی ہے کہ جلد یا بدیر دنیا کا امن پھر معرض خطر میں پڑے گا اور اس سے زیادہ ہولناک جنگ نوع انسانی کو برباد کرنے کے لیے نمودار ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے موجودہ جنگ یورپ کی شر انگیزیاں اور تباہ کاریاں دیکھی ہیں وہ تو یہی خواہش رکھتے ہیں کہ اب عالم انسانیت دوبارہ اس درندگی اور بہیمیت کے مناظر نہ پیش کرے باقی رہا ہوتا ہے وہی جو خدا چاہے۔

ہندوستان نے اس جنگ میں جو حصہ لیا ہے اُسکا اعتراف اُن لوگوں کی طرف سے تو

بڑے شدومد کے ساتھ ہوتا رہا ہے جن کو اس اثنا میں ہندوستان کے نظم ونسق سے براہ راست سروکار رہا ہے اور جو یہاں سے ہر قسم کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بااثر اور موقر جماعت ایسی بھی ہے جو دن کو رات قرار دے سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم الشان خدمات کے عملی اعتراف کا جب وقت آتا ہے تو اُس وقت بخشش و اکرام کی قدرت کس کو ہوتی ہے۔

عالم اسلامی پر اس جنگ کے اثرات بھی کچھ کم غور طلب نہیں۔ ترکوں کی ترکی تمام ہوگئی۔ عرب صدیوں کے بعد پھر تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ وسطِ ایشیا کی مسلمان قومیں ایک جدید جمہوریہ کی بنیاد ڈال رہی ہیں۔ ایران میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش ہو رہی ہے۔ روس کے مسلمان جدید آئینی حکومت میں ایک ممتاز قلیل التعداد جماعت کی حیثیت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ اور اگر پان تورانی خطرہ کی صدا بلند کرنے والوں کی ریشہ دوانیاں ترکستان اور روس کے مسلمانوں کے لیے بلائے جاں نہ بننے پائیں تو بیداری و ترقی کا جو موقع ہاتھ آگیا ہے اُس سے بہت کچھ توقعات قائم کی جا سکتی ہیں۔ مسلمانان ہند جو عام اخوت اسلامی کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے شریک غم و مسرت ہیں گہری دلچسپی اور دلی تعلق کے ساتھ صلح کانفرنس کی تجویزات سننے کے لیے بے چین رہیں گے۔ گو اس بات کا اُنھیں افسوس ہونا چاہیے کہ ہندی مسلمانوں کی کثیر آبادی کو اس کانفرنس میں حق نیابت نہیں دیا گیا۔

موت کا بازار یورپ میں ابھی سرد نہ ہوا تھا کہ جنگی بخار نے کم و بیش تمام حصص عالم پر تسلط کر لیا یوں تو اس عام ہنگامہ کی وجہ سے ہر گھر میں کچھ دنوں کے لیے رونق رہی مگر مسلمانان ہند کے قومی خادموں کی جماعت کو نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب آنریری سکرٹری علیگڈھ کالج اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی وفات سے جو نقصان پہونچا ہے وہ خاص طور پر قابل تذکرہ ہے۔ نواب صاحب مرحوم کی ذات اس آخری عہد میں غنیمت سے تھی۔ اور ڈاکٹر عبدالرحمن تو اسقدر توقعات کے مرکز تھے کہ قوم میں شاید ہی ایک دو نفوس اس مرتبہ کے نکلیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ذہنی قابلیتوں کے لحاظ سے فلک قومی کے درخشندہ تارے تھے بلکہ اعلےٰ علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ دردِ قومی، ایثار اور آزادی رائے کی بنا پر بھی وہ جدید طبقہ میں اپنی آپ نظیر تھے۔ راجہ غلام حسین اور شیخ ولایت علی قدوائی کے انتقال کے بعد طبقۂ احرار کے لیے یہ ایک ایسا کاری زخم ہے کہ بہت عرصہ تک مندمل نہ ہو سکے گا۔ ارحم الراحمین مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائیں اور جو چند نفوس باقی رہ گئے ہیں اُنھیں اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل جاری خدمتگزاری کے لیے تا ابد پائندہ و سلامت رکھیں۔ آمین۔

صبح اُمید

اُردو کا بہترین ماہواری رسالہ جسمین اُردو علم وادب کے نامور اہل قلم اور مشاہیر ملک کے ادبی۔ تاریخی۔ سیاسی اور معاشرتی مضامین ماہ بماہ شائع ہوا کرینگے

اڈیٹر

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی

رسالہ کا حجم تقریباً ۵۰ صفحہ ہوگا۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت عمدہ ہوگی

قیمت صرف للعہ سالانہ

منجملہ اور اصحاب کے جناب سید اکبر حسین صاحب اکبر۔ منشی احمد علی صاحب شوق۔ ڈاکٹر پروفیسر اقبال۔ مولانا حسرت موہانی۔ آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ نواب ذوالقدر جنگ۔ سید سجاد حیدر۔ پروفیسر سید عبداللہ۔ پنڈت ہردے ناتھ صاحب کنزرو اور لالہ سری رام صاحب نے قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔

درخواست خریداری

بنام

منیجر ہندوستانی پریس امین الدولہ پارک لکھنو

آنی چاہیے

نمونہ کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جا سکتا ہے

مولوی سید محفوظ علی بی اے

جو اُردو زبان کے مشہور ادیب ہین کہتے ہین

جو صنفی خوبیان اور جنسی برائیان عورتون مین۔ اُن کے دل مین اُن کے دماغ مین مضمر ہین اُن کا صحیح اندازہ اور ٹھیک پتہ ایک عورت ہی لگا سکتی ہے اور وہی دوسری عورت کو اپنے ناقابل ادراک اور ناقابل تقلید طریقے سے سمجھا سکتی ہے۔

اسی معیار پر جناب بیگم صاحبہ مسٹر صفدر علی اگزیکٹیو انجنیر کی قابل قدر تصنیف عورتوں کی انشا کو جانچیے تو معلوم ہوگا کہ یہ لاجواب کتاب عورتون اور لڑکیون کو خط کتابت سکھانے اور اُن مین اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور روشن خیالی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتی ہے۔ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان مین آج ایسی ادبی قابلیت رکھنے والی کوئی دوسری مسلمان خاتون موجود نہین۔ اسلیئے ہر شریف گھرانے مین اس کتاب کی ایک ایک جلد رہنا ضروری ہے۔ قیمت عہ

ازواج الانبیا

انبیائے کرام علیہم السلام کی ازواج مطہرات کے آداب اخلاق اونکی خانگی طرز معاشرت اور ان کے سوانحی حالات سے عورتون اور مردون کو یکسان طور پر سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ایسا جامع تذکرہ اردو کیا معنی فارسی عربی تک مین نہ تھا۔ قیمت عہ

صرف فقہا ہی اُسکو پسند کرتے تھے اسلیے کہ قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ پُرجوش عیسائیوں نے دینِ محمدی پر جو توہین کی بوچھاریں کی تھیں اُن کا پورا انتقام یہ لیگا۔ گرجے مسمار کر دیے گئے اور ایسی سخت مذہبی تعذیب قائم کی گئی کہ اگرچہ بہت سے عیسائی اُسی وقت مسلمان ہوگئے تھے جس وقت بشپوں نے باضابطہ طور پر خودکشی کی شہادتوں کو ناجائز ٹھہرایا تھا تاہم اب اور بھی بہتیروں نے اُنکی مثال کی پیروی کی اور حقیقت میں بقول یولوجی اس۔ اور البورو کے بڑا گروہ اپنے قول سے پھر گیا۔ عبدالرحمن اور اُسکے وزرا کا یہ حال تھا کہ جب عیسائی بوالفضولی سے اپنی جانوں پر کھیلنے کو مستعد ہو جاتے تھے تو وہ اغماض کر جاتے تھے۔ اس عاقلانہ و مترحمانہ حکمتِ عملی کی جگہ بھی اب بے رحمانہ دباؤ کی حکمت عملی قائم ہوئی اور اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بطور قاعدہ کے منافقت کا رواج ہوگیا۔ اسپر بھی فدائیان مذہب کے چھوٹے سے گروہ کا رسوخ قوی تھا اور اسکا اثر قرطبہ کی سرحدوں سے بہت دُور آگے تک پہونچ گیا تھا۔ طلیطلہ والوں نے یولوجی اس کو اپنے یہاں کا بشپ بنایا۔ اور جب سلطان نے اپنی منظوری دینے سے انکار کیا تو وہ جگہ اُس وقت تک خالی رہنے دی گئی جب تک کہ اُس فدائی کو اجازت نہ ملے۔ دو فرانسیسی رہبان اسلیے قرطبہ آئے تھے کہ اُن مقدس شہیدوں کے کچھ تبرکات حاصل کریں اور ایک تھیلے میں اُنکی ہڈیاں بھر کر سینٹ جرمین۔ ڈی۔ پرے۔ کو واپس گئے اور وہاں جا کر یہ ہڈیاں پیرس کے دینداروں کو دکھلائی گئیں۔ لیکن عنقریب فدائیانِ مذہب کو اک سخت صدمہ پہونچنے والا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ایک اور لڑکی نے یولوجی اس کی اقتدا کرنے کے لیے اپنے والدین کو چھوڑ دیا۔ اس دفعہ وہ مقتدی اور اُسکا امام دونوں قاضی کے پاس لائے گئے۔ یولوجی اس صرف مذہب تبدیل کرانے کا مجرم تھا اس سبب سے اُسکی شرعی سزا صرف تازیانے مارنا ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ پادری اس قماش کا آدمی ہی نہ تھا کہ تازیانہ کو برداشت کر سکے۔ گو وہ اپنے خدا کے سامنے منکسر اور زمانے تک تکلیفیں اُٹھاتا رہا تھا اور ایمان کے خاطر اپنے جسم پر ہر قسم کا عذاب لینے کو موجود تھا لیکن وہ اسپر رضامند نہیں ہو سکتا تھا

کہ کافر (مسلمان) کے تازیانے کھائے۔ وہ آواز بلند کہنے لگا کہ "قاضی صاحب! اپنی تلوار کو تیز کیجیے۔ میری روح کو میرے خالق سے ملنے کے لیے بھیج دیجیے۔ لیکن اسکا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیے کہ میں اپنے جسم کو تازیانوں سے زخمی ہونے دونگا" یہ کہکر اُس نے محمدؐ اور اُنکے دین کو بُرا کہنا شروع کر دیا۔

قاضی اپنی ذات پر یولوجی اس کے ایسے نامی مقتدا کی سزائے موت کا حکم دینے کی جرأت ہی نہیں لے سکتا تھا۔ اسلیے وہ پادری شاہی مجلس شوریٰ کے روبرو حاضر کیا گیا۔ اس جماعت کے ایک شخص نے اُسکو سمجھانا شروع کیا اور کہا کہ تم عاقل و عالم آدمی ہو کر اپنی خوشی سے کیوں سر پر کھیلتے ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسا تو حمقا و مجانین کیا کرتے ہیں۔ مگر تم تو اور ہی قسم کے آدمی ہو۔ مگر سمجھنے سمجھانے کا وقت گذر چکا تھا۔ یولوجی اس اگرچہ خود اپنے آپ کو نمونہ بنانے سے اسکو بہتر سمجھتا تھا کہ لوگوں کو شہید ہونے کی تعلیم دیا کرے۔ لیکن اگر وہ خود زد پر پہونچکر پسپا ہو جاتا تو اسکی عزت و وقعت کو داغ لگجاتا۔ اُسکو ضرور تھا کہ بغیر منہ پھیرے ہوئے اخیر تک چلا جائے گو ناگوار کیوں نہ لگے۔ بالجملہ اُس نے اپنے قول سے باز آنے سے انکار کیا اور فوراً مقتل کو پہونچایا گیا۔ اور ۱۱ مارچ ۸۵۹ء کو دلیری و حُسنِ عقیدت کے ساتھ اُسکی روح تن سے جدا ہوئی۔

نصرانی شہیدوں کا جب مقتدا اُٹھ گیا تو سب کے دل چھوٹ گئے۔ اور پھر ہمارے کانوں میں اُنکی مجنونانہ جاں نثاری کی آوازیں نہیں آئیں۔

باب چھٹا

الخلیفۃ الاعظم

میرے ناظرین شاید مایوس ہوگئے ہوں کہ ابھی تک میں نے صرف گنتی ہی کی بڑی لڑائیاں اور نام آوری کی کارروائیاں قلمبند کی ہیں اور بجائے اسکے کہ شخصی کارنامے بتاؤں

میں نے خاص کر اقوام و مذاہب کے بڑے ہنگاموں سے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کی ابتدا طارق اور اُسکے بربریوں کے سخت جنبش ڈالنے والے حملہ اور عظیم الشان فتوحات سے کی گئی ہے جو قصہ کہانیاں نہیں بلکہ ویسی ہی یقینی امور ہیں جس طرح اُنیسویں صدی کی تواریخ تورس کی اہم و فیصلہ کرنے والی جنگ تو بیان ہوئی مگر اُسکی تفصیلیں نہیں ملیں جو سب سے زیادہ دلچسپ و دلکش ثابت ہوتیں۔ اور فرنگیوں سے دوسری لڑائیوں اور ان کے ملیس کی تباہیوں کے جو حالات ہیں اُن میں افراط کی خرابی ہے۔ کیونکہ یہ واقعات وہمی و خیالی باتوں کے ابرسے بالکل گھرے ہوئے ہیں۔ اُس روز سے اس وقت تک سو برس کا زمانہ گذر گیا اور ہم اُس زمانے میں پہونچے جبکہ یولوجی اس مارا گیا اور اس وجہ سے عیسائی شہیدوں کا زوال ہوا۔ اور اس ساری صدی میں اُن مختلف قوموں اور مذہبوں کے جھگڑوں کے سوا جن سے جزیرہ نمائے ہسپانیہ کی آبادی مرکب تھی۔ ہم کچھ نہیں پاتے۔ لیکن یا انہیہ عظیم الشان کارنامے شاذ و نادر ہوتے ہی ہیں اور اکثر تو یہ شعرا کی طبیعت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو لڑائی کے اصلی معمولی واقعات کو خیالی شجاعت و بہادری کے لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ اور ایک قوم کا دوسری قوم سے اور ایک مذہب کا دوسرے مذہب سے باہم جھگڑنا تو ایسا امر ہے کہ جب سے حضرت انسان پیدا ہوئے ہیں برابر مادرِ گیتی یہی دیکھتی رہی ہے۔ ہمکو نہیں چاہیے کہ اپنے دلوں میں یہ خیال آنے دیں کہ اِن بڑے بڑے ہنگاموں کی تواریخ اس لیے غیر دلچسپ ہے کہ اس میں منفرد اشخاص کی بہادریوں کے کارنامے نہیں ہیں۔ قرطبہ والی شہادت کے قابل افسوس زمانے میں جوشیلے مردوں اور عورتوں نے حسنِ عقیدت سے اس طور پر جانیں گنوائیں کہ کوئی خبر بھی نہ ہوئی۔ ان میں شاید اُس سے زیادہ اصلی شجاعت و بہادری پائی جاتی ہے جو اکثر سپاہی میدانِ جنگ میں ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فوری جوش میں بہادر و دلیر ہو جانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ آدمی زمانۂ دراز تک قید کی سختیاں و مصیبتیں جھیلے اور غیر مغلوب جرأت کے ساتھ قتل کے دن کی راہیں دیکھتا رہے اور اس ساری مدت میں قوی دل رہے۔ یہ عیسائی شہدا غلط کار

تھے بے وجہ اپنی جانیں معرضِ تلف میں ڈالتے تھے لیکن جسقدر انکی عقل قابلِ افسوس ہے اُسیقدر انکی جرأت قابلِ ستایش ہے۔ فلورا اس حالت میں بھی ویسی ہی اصلی بہادر تھی جیسی کسی پسندیدہ امر کیلیے جان فدا کر دینے پہ ہوتی۔ یولوجی اس باوجود اپنے سارے تعصبات کے سچے نام آوروں کے کینڈے کا تھا۔ اور ان سارے قومی یا مذہبی بڑے جھگڑوں میں جان نثاری و استقلال کے ایسے بیشمار افعال ہیں کہ گو وہ مورخ کی نظر سے بچ جائیں لیکن اُنکے لیے بھی اُسی قدر استقلال و تحمل کی ضرورت ہوئی ہوگی جس قدر سپاہیونکی نہایت ہی چمکتی دمکتی بہادریوں کے لیے۔ اکثر بہادری کے چھوٹے ہی کاموں میں بنی نوع انسان کے سخت سے سخت فرائض پائے جاتے ہیں اور جب انسان کی بڑی جماعتوں کے درمیان نزاعیں ہوتی ہیں تو بے انتہا موقعے اُنکے کام میں لانے کے پیدا ہوتے ہیں۔

کسی ایک شخص کی بہادرانہ وضع کا پتہ لگانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ پوری قوم بلکہ ایک شہر کے بھی سب لوگوں کا حال دریافت کیا جائے۔ اور اب ہم ایک ایسے شخص کے اوضاع و اطوار کے قریب آرہے ہیں جو بادشاہی عظمت کے اُس اعلیٰ تصور کے قریب پہونچا تھا جس تک معدودے چند ہی بادشاہ کبھی پہونچے ہوں گے۔ اک بڑا بادشاہ اک بڑی ضرورت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ جب قوم حد درجہ پریشان حال ہو جاتی ہے، جب زمانے کے ہر خط و خال سے خرابی کے آثار ٹپکنے لگتے ہیں اور افق پہ بربادی کے پُرنحوست آثار دکھائی دیتے ہیں، تب اک بڑا بادشاہ اس لیے آتا ہے کہ اپنی قوم کو ہلاکت سے بچائے۔ امن و خوشحالی پھیلائے اور اک ایسے ملک پہ حکمرانی کرے جو اُسکی کوششوں سے دوبارہ خوش و خرم و خوشحال بنگیا ہو۔ دسویں صدی کے آغاز میں اُندلس کے لیے ایسے حکمراں کی سخت ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ قرطبہ کے عیسائیوں کی مجنونانہ حرکت کے بعد اضلاع کی بغاوت کا ظہور ہوا جو اُس سے بھی زیادہ خطرناک اور دُور دُور پھیلی ہوئی تھی۔ تخت نااہل بادشاہوں کے قبضے میں تھا۔ کیونکہ منذر سنہ ۸۸۶ء میں اپنے باپ محمد کی جگہ میں بیٹھا اور مستعدانہ حکمتِ عملی سے کام لینے لگا لیکن

۸۸۸ء میں اُسکو قتل کر کے یہ حکمت عملی روک دی گئی اور اُسکا بھائی عبداللہ جس نے اس قتل کی ترغیب دی تھی اس قابل نہ تھا کہ جس خطرے میں سلطنت پھنسی ہوئی تھی اُسکے چند چیدہ اسباب کو دلیری کے ساتھ دفع کرے۔ اسکی حکمت عملی ٹلے بالے بتانے اور دنیا سازی کرنے کی تھی۔ یہ علیٰ سبیل البدلیۃ جنگ و صلح کے آثاروں کو آزماتا تھا جسکا معمولی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ دونوں تدبیریں ناکارہ ہوجاتی تھیں۔ اور وہ بذاتِ خود ایسا دنی الطبع، بے رحم، اور ذلیل تھا کہ اُسکی مملکت کے کُل فرقے اُس سے نفرت کرنے اور اُسکی حکومت کو بالائے طاق رکھدینے پر یکدل و یکزباں معلوم ہوتے تھے۔ اسکو سلطنت کرتے ہوے تین سال بھی نہیں ہوے تھے کہ اُندلس کا بہت بڑا حصہ خود بخود خود مختار ہوگیا۔ سلطنت کے کُل مختلف فرقے اب پھر صدرِ حکومت کی مخالفت میں مستعدو سرگرم ہوگئے۔ ہر ایک امیر یا سردار چاہے وہ عرب ہو یا بربری یا اسپینی، اک بُرے و کمزور سلطان اور عام طوائف الملوکی کے موقع کو غنیمت جان کر آراضی کے ایک حصہ کو خاص اپنے انتفاع کے لیے دبا بیٹھنے اور اپنی بلند فصیلوں کے پیچھے سے سلطان کو نیچا دکھانے لگا۔ پُرانے عربی اُمرا اُن عربوں کی اولاد جنھوں نے ہسپانیہ کی فتح کو مکمل کیا تھا معدودے چند اور دوسری قوموں سے تعداد میں کم تھے لیکن اگرچہ لازم تو یہ تھا کہ انکا ضعف انھیں قرطبہ کی عربی سلطنت کا وفادار رکھتا مگر وہ بھی اُس سے پھر گئے اور انھوں نے بھی اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں خصوصاً اشبیلیہ میں جو قرطبہ کا ہولناک رقیب ہوگیا۔ دوسرے شہروں میں اگرچہ عرب اس قدر زورآور نہ تھے کہ کھُلے بندوں سلطان کی مخالفت کرسکیں لیکن وہ بھی صرف برائے نام اطاعت کا دم بھرتے تھے اور طورقا و سرقسطہ کے حاکم حقیقۃً اپنے ضعیف بادشاہ سے بالکل الگ ہوگئے۔ قرطبہ میں تو سلطان کے کرایہ والے سپاہی لوگوں کو اک طرح کی ظاہری اطاعت پر مجبور کرتے تھے مگر اُس سے باہر کسی مقام میں عربوں پر بنی اُمیہ کی قوت کے استحفاظ کا بھروسا نہیں ہوسکتا تھا۔

بربری تعداد میں عربوں سے زیادہ اور ناراضی میں بدرجہ اتم آشنا ہم پلہ تھے۔ ان

لوگوں نے حکومتِ سلطان کی اطاعت کا دعا بھی بالکل چھوڑ دیا اور اپنا پرانا طریقہ جرگہ کی حکومت کا اختیار کر لیا تھا۔ ہسپانیہ کے مغربی اضلاع مثل ایسٹریمیڈورا کے اور پرتگال کے دکھن۔ اب بربریوں کے خود مختارانہ قبضے میں تھے۔ اور وہ خود اندلس میں مختلف اہم عہدوں پر بھی مامور تھے۔ بربریوں کا وہ خاندان جسکا نام ذوالنون تھا اور جو اک بڑے بدمعاش اور قابل نفرت چوٹے" باپ موسیٰ اور اُسکے تین بیٹوں سے جو اپنی جسمانی قوت اور عدیم النظیر حیوانیت میں اپنے باپ کے مثنیٰ تھے مرکب تھا۔ سارے ملک میں قتل و غارت مچائے ہوئے تھا جہاں ان چاروں غولان بیابانی کا غول جاتا تھا آتشزنی، لوٹ، قتل و غارت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

سلمان اسپینی جنھوں نے اپنے نئے دین کے ساتھ کسی قدر عربی شائستگی سے بھی اپنی زیب و زینت کر لی تھی کسی طرح بربریوں کے ایسے وحشی نہ تھے مگر صدر حکومت کی عداوت میں یہ بھی اُن سے کم نہ تھے اور اُندلس کے اندرہیت سے خود مختار شہر و اضلاع پر یہ بھی قابض تھے واقع میں کُل نہایت ہی کار آمد شہر خفیہ یا علانیہ باغی تھے۔ عربی حُکام، بربری سردار، اسپینی نومسلم، سب عبداللہ کی شاہی حکومت کو اُٹھا دینے یا خاطر میں نہ لانے پر متفق تھے۔ اور سب سے بڑا صاحبِ قوت ابن حفصون نصرانی جس نے غرناطہ کے علاقے کے کوہیوں کو اُبھارا تھا اپنے پہاڑی علاقے میں نہایت ہی بے کھٹکے حکومت کرتا اور آس پاس کے علاقوں میں قانون جاری کرتا تھا۔ سلطان نے بار بار اُسپر حملے کیے اور ہر مرتبہ شکست کھائی۔ تب وہ اپنی صلح والی بدنام حکمت عملی پر مائل ہوا۔ ابن حفصون نے بھی صرف اُسے فریب دینے کے لیے فوراً قبول کر لیا۔ مرشیا یعنی "تھوڑے میر کی جگہ" ایک نرم دل و تعلیمیافتہ نومسلم رئیس کی کی ماتحتی میں خود مختار ہوگئی۔ یہ اپنی رعایا پر عاقلانہ حکومت کرتا تھا اور رعایا اس سے محبت کرتی تھی۔ شاعری پر دلدادہ تو تھا لیکن اک بڑی فوج رکھنے سے بھی غافل نہ تھا۔ جس میں پانچ ہزار فقط سوار تھے۔ طلیطلہ حسب معمول باغی ہو رہا تھا اور صرف شمال کے عیسائیوں کے حسد

اور پھوٹ نے مدت کے ہاتھ سے گئے ہوئے علاقہ کو پھر فتح کر لینے سے باز رکھا۔ اندلس پر اگر کوئی اولوالعزم حملہ آور چڑھائی کرتا تو ٹھیک طور سے اُسکی مزاحمت نہیں ہوسکتی تھی۔ اسلئے کہ وہ ایسی بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا جو کسی ایسی سلطنت کے اجزا نہیں معلوم ہوتی تھیں جو کبھی زوروں تھی بلکہ زمینداریاں اور فیوڈل بیرنوں کے تعلقے معلوم ہوتی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ اِن ساری طوائف الملوکیوں کے درمیان کچھ روشنی کی جھلک بھی تھی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مرسیا کے علاقے پر ایک روشن دماغ ونکو کا رئیس حکمراں تھا۔ کازولا کا رئیس بھی شعرا و فنون کی قدردانی میں ممتاز تھا۔ اُسکے بڑے کمرے سنگِ مرمر کے ستونوں پر استادہ تھے اور دیواریں سنگِ مرمر و سونے کی پچے کاریوں سے مزین تھیں اور جتنی چیزیں کہ زندگی کو با مزہ بنا سکتی تھیں سب اُسکی محلسرا میں موجود تھیں۔ ابن الحجاج اشبیلیہ کا عربی بادشاہ بھی اس لیے کہ وہ کسی طرح بادشاہ سے کم نہ تھا، جس نے سلطان کو اپنے ساتھ صلح کرنے اور دوستی قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اپنے غیر محدود اقتدار کو نہایت ہی شریفانہ طور پر کام میں لاتا تھا۔ اُسکے شہر پر قابلِ مدح حکومت ہوتی تھی۔ امن و امان کا بے خلش دَور دورہ تھا اور بدکرداروں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں مگر انصاف کے ساتھ۔ وہ اپنی ریاست کو شہنشاہ کی طرح رکھتا تھا۔ پانچ سو سوار اُسکے جلو میں چلتے تھے۔ اور اُسکی قبائے شاہی زربفت کی ہوتی تھی جس پر اُسکا نام و خطاب سونے کے کلابتون سے منقش رہتا تھا۔ سمندر پار کے سلاطین اُسکے پاس تحائف بھیجتے تھے۔ مصر سے ریشمی کپڑے، مدینہ سے شرع کے علما اور بغداد سے بے مثل گویّے اُسکے پاس آتے تھے۔ خوبصورت خانون قمر جو حُسنِ صورت، بلاغت کلام، اور دلسوز نظم میں شہرۂ آفاق تھی اُسکی تعریف میں یوں زمزمہ سنج ہے:

نیستؔ در مغرب کریمے کز وے داری جنبہا جز ابراہیم کو ہم عہد باشد با سخا
نزد او در منزلِ نعمت فرود گشتہ ام غیر آں ہر منزلے زشت است دیر از عیبہا

خود قرطبہ کے شعرا اُسکے زرق برق دربار کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ جہاں کی نسبت انھیں

* بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ۔

یقین تھا کہ رئیا نہ خیر مقدم کیا جائیگا۔ صرف ایک مرتبہ حجاج کا بیٹا ابراہیم ایک شاعر کے ساتھ کسی قدر کج خلقی سے پیش آیا تھا۔ یہ شاعر اُن لوگوں میں سے تھا جو سمجھتے تھے کہ یہ رئیس اُمرائے قرطبہ کی ہجو سے خوش ہوگا۔ اسلئے کہ اشبیلیہ کے حکمرانوں کے خیالات اُنکی نسبت اچھے نہ تھے۔ ابن حجاج نے کہا کہ "اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ مجھ جیسے کسی آدمی کو ان پاجیانہ ہجاؤں کے سُننے سے خوشی حاصل ہوگی تو تم بر سر غلط ہو"

باایں ہمہ تہذیب و شائستگی کی یہ شعاعیں جو کبھی کبھی جھلک اُٹھتی تھیں اُس طوائف الملوکی کی عام تاریکی کی تلافی نہیں کرسکتی تھیں جس میں اُندلس صدر حکومت کے ضعیف ہوجانے اور بیشمار چھوٹے چھوٹے حکمرانوں ورئیسوں کے شاہی علاقوں کو دبا بیٹھنے سے۔ گھرا ہوا تھا۔ ملک افسوسناک حالت میں تھا اور خود قرطبہ پر جسکو اس وقت ابن حفصون اور اُسکے جری کوہیوں کے ہاتھوں سے مفتوح ہوجانے کا ڈر لگا تھا غم انگیز اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ عربی مورخین کہتے ہیں کہ "بغیر اسکے کہ اُسکا واقعی محاصرہ کیا جائے۔ وہ شہر خود ہی محاصرہ کی ساری تکلیفیں جھیل رہا تھا۔ قرطبہ کی حالت سرحدی شہر کی سی ہوگئی تھی کہ دشمنوں کے سارے حملوں کا نشانہ بنا ہوا تھا" دریا کے اُس پار سے مصیبت زدہ و پریشان کاشتکار جب ڈاکوؤں کی تلواریں اپنے گلے پر چلتی دیکھکر روتے اور چلاتے تھے تو بارہا قرطبہ کے باشندے آدھی آدھی راتوں کو اپنی میٹھی نیندوں سے چونک چونک اُٹھتے تھے۔ اُسی زمانے کے ایک چشمدید گواہ نے لکھا تھا کہ "اس سلطنت کے کامل تباہی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ لگاتار مصیبت پر مصیبت چلی آتی ہے۔ چوری، رہزنی، زوروں پر ہے۔ ہماری بیبیاں اور بچے زبردستی پکڑکر لونڈیاں اور غلام بنائے جاتے ہیں"

سلطان کی کاہلی، اسکی کمزوری اور اُسکی دنائت سے سارا زمانہ نالاں تھا۔ سپاہی الگ

عـہ حاشیہ - نفح الطیب جلد ثانی صفحہ ۱۱۱ میں اصل اشعار یہ ہیں :-

ما فی المغارب من کریم یرتجی   الا علیم الجود ابراہیم
انی حللت لدیہ منزل نعمۃ   کل المنازل ما عداہ ذمیم

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات ۔ عہ ۱۲ر
- دربار اکبری ۔ للعہ
- سخندان فارس ۔ ے ر
- نیرنگ خیال ۔ ۱۰ر
- نظم آزاد ۔ ۱۲ر
- قند پارسی ۔ ۱۰ر
- قصص ہند ۔ ۸ر
- نصیحت کا کرنپھول ۔ ۸ر
- سپاک و تناک ۔ ۱۰ر

مولانا راشد الخیری مرحوم
- حیات انیس ۔ عار
- ایشیائی شاعری ۔ عہر
- ادیب ۔ ۸ر
- نور جہاں ۔ ۸ر
- ٹیپو سلطان ۔ ۸ر
- حیدر علی سلطان ۔ ۱۲ر
- اردو کی ڈالی ۔ ۲ر
- قومی نظم ۔ ۴ر
- مکالمہ مرد و عورت ۔ ۳ر
- پورنا ہوار ۔ ۸ر
- صفات الخواتین ۔ عار
- مرقع تاجپوشی ۔ عہر

مولوی عبدالحق بی اے
- قواعد اردو ۔ عا
- انتخاب کلام میر ۔ عہر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۔ ۸ر
- حاجی بغلول ۔ ۱۰ر
- پیاری دنیا ۔ ۱۰ر
- طلسمی فانوس ۔ عار
- طرحدار لونڈی ۔ عہر
- میٹھی چھری ۔ ۶ر
- کایا پلٹ ۔ ۱۲ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو ۔ ۶ر
- بچھڑی دولھن ۔ ۸ر
- کرم دھم ۔ ۴ر
- پی کہاں ۔ ۵ر
- کامنی ۔ تہر
- خدائی فوجدار ۔ عار
- فسانۂ آزاد ۔ عـہ
- الف لیلہ دنیا زاد ۔ تہر
- سیر کہسار ۔ صہر
- جام سرشار ۔ عہر

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا لنی ۔ ۱۰ر
- مار آستین ۔ ۱۰ر
- بنگالی دولھن ۔ ۱۲ر
- پرتاپ ۔ ۴ر
- معشوقۂ فرنگ ۔ ۶ر
- بروگ ۔ ۵ر

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی ۔ عہ
- ابوبکر شبلی ۔ عہر
- خواجہ معین الدین ۔ ۲ر
- عصر قدیم ۔ عہر
- دولت اسپانیہ عرب ۲ جلد ۔ عا ۱۲ر
- حروب صلیبیہ ۔ عار
- تاریخ سندھ ۔ عا ۱۲ر
- قرۃ العین ۔ ۱۲ر
- سیاح درسیت ۔ ۸ر
- تاریخ بغداد ۔ ۴ر
- ملکہ زنوبیہ ۔ ۳ر
- الحکم الرفاعیہ ۔ ۴ر
- آغائی صاحب ۔ عہر
- سکینہ بنت حسین ۔ ۶ر
- محدرات ۔ عہر
- تذکرۂ مشاہیر عالم ۔ تہر
- درگیش نندنی ۔ ۱۰ر
- حسن بن صباح ۔ ۶ر
- افسانۂ قیس ۔ ۳ر
- مقدس نازنین ۔ عہر
- قیس و لبنیٰ ۔ تہر
- ایام عرب ۔ عا ۸ر
- حسن انجلینا ۔ عہر
- میوۂ تلخ ۔ ۶ر
- شہید وفا ۔ ۸ر
- دلکش ۔ ۱۲ر
- دلچسپ ۔ عہر

شوقین ملکہ ۔ عہر
- زوال بغداد ۔ عہر
- ملک العزیز ورجنا ۔ عہر ۱۲ر
- یوسف و نجمہ ۔ عہر
- رومتہ الکبریٰ ۔ تہر
- فلورا فلورنڈا ۔ عار
- فردوس بریں ۔ عہر
- آغا صادق کی شادی ۔ ۱۰ر
- بدر النساء کی مصیبت ۔ ۴ر
- حسن کا ڈاکو ۔ عہر
- دربار حرام پور ۔ ۱۰ر
- خوفناک محبت ۔ تہر
- الفانسو ۔ ۱۲ر
- فلپانا ۔ عہر
- فاتح مفتوح ۔ عہر ۱۲ر
- زمانہ اور اسلام ۔ ۴ر
- جویائے حق ۔ تہر
- بابک خرمی ۔ عہر
- ہندوستان کی سوشل ۔ ۴ر
- سرسید کی دینی برکتیں ۔ ۲ر

حکیم محمد علی خاں
- عبرت (کامل) ۔ عہر
- حسن سرور ۔ عہر
- دیول دیوی ۔ عا ۸ر
- گورا ۔ للعہ
- نیل کا سانپ ۔ عا ۸ر
- صفرو عباسہ ۔ عا
- خزہ حسینہ (کامل) ۔ للعہ

جلال مرحوم
- مفید نہا دکش ۔ عہر
- نظر نگاریں ۔ صہ
- افادۂ تاریخ ۔ ۸ر
- رسالۂ تذکیر و تانیث ۔ ۸ر
- قواعد المنتخب ۔ ۴ر

منشی احمد علی شوق قدوائی
- ترانۂ شوق ۔ عہر
- عالم خیال ۔ ۱۲ر
- قاسم و زہرہ ۔ ۱۱ر
- مسدس لیل و نہار ۔ ۶ر
- میکفرن دلہن ۔ ۲ر

علامہ سید احمد
- حایت الاسلام دہلی ۔ عہر
- ، حصہ دوم ۔ ۱۲ر
- فن ہیئت ۔ ۸ر
- فن کیمسٹری ۔ ۸ر
- التناسخ ۔ ۴ر

خواجہ عشرت
- زبان دانی ۔ ۴ر
- اصلاح زبان اردو ۔ ۴ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۔ ۸ر
- تذکرۂ آب بقا ۔ تہر
- گلدستۂ ظرافت ۔ ۲ر
- ہجو لی ۔ ۷ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق ۔ عا
- کتاب الشفعہ ۔ عا
- ہجر ۔ ۸ر
- شرح قانون شہادت ۔ ے ر

حاجی اسمٰعیل خاں
- فلاح دارین ۔ ۸ر
- حالات زمین ۔ ۸ر
- تربیت الدجاج ۔ ۸ر
- غذا و صفا ۔ تہر
- نظم نعت ۔ ۴ر
- اصحاب ائمہ کرام ۔ ۴ر
- چند از چند ہنود ۔ ۳ر

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف ۔ عہر
- اسلامی اخلاق ۔ ۸ر
- ذکر الحبیب ۔ ۲ر
- ذکر جمیل ۔ ۵ر
- ابنیا علما ۔ ۴ر

منشی سید احمد مارہروی
- آثار اکبری ۔ عار
- حیات خسرو ۔ للعہ
- حیات صالح ۔ ۴ر
- امرائے ہنود ۔ عا
- نساء السلمین ۔ ۱۲ر

مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا — عہ
- لیلیٰ مجنوں
- [illegible]
- شرح [illegible] — ۲ر

مولوی [illegible] مرحوم

- خیالات [illegible]
- وکرم [illegible]

مسٹر ظفر علی خاں بی اے

- معرکۂ مذہب و سائنس
- جنگل میں منگل — ۱۲ر
- سیر ظلمات — ۱۲ر
- ڈرامہ چنگیز [illegible] — ۱ر
- فلسفۂ ابن سینا — ۲ر
- معاشرت — ۸ر
- اپیل نول — ۲ر
- نئی روشنی — ۴ر
- ایڈیٹر کا حشر — ۱ر

مسٹر عبدالماجد بی اے

- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد — ست
- فلسفۂ جذبات مجلد — عہ
- فلسفۂ اجتماع مجلد — عہ
- تمدن انسانی — ۲ر
- فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
- زود پشیمان (ڈرامہ) — ۸ر

ڈاکٹر اقبال

- حکمت [illegible] — ۱۴ر
- شمع و شاعر — ۴ر
- بلال — ۲ر
- شکوہ — ۱ر
- جواب شکوہ — ۲ر
- [illegible] ترانہ — ۲ر
- [illegible] — عہ
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] — ۲ر
- تصویر درد — ۲ر
- [illegible] — ۲ر

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ ہمدان ۲ جلد — ۱۲ر
- شباب لکھنؤ — عہ
- [illegible] رودھ — ۸ر
- حرمان نصیب — ۱۴ر

مسٹر ظفر عمر بی اے

- مستقبل اسلام — ے
- پولیسین — ۸ر
- نیلی چھتری — عہ

سید ہاشمی فرید آبادی

- مشاہیر یونان و روم — ۱۲ر
- تاریخ یونان قدیم — ۱ر

مولوی عبداللہ عمادی

- کتاب المعارف — عہ
- نگارشات — ۱۴ر
- تاریخ عرب قدیم — ۸ر
- علم الحدیث — ۸ر
- صناعۃ العرب — ۲ر
- فلسفۂ القرآن — ۲ر
- فلسفۂ ابن عربی — ۲ر
- کتاب الزکوٰۃ — ۲ر
- محرم کی [illegible] — ۲ر

مولانا سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن ۲ جلد — ۱۲ر
- حیات امام مالک — ۱۲ر
- [illegible] — عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد — ہے
- اہل السنۃ والجماعۃ — ...
- سلمان [illegible] — عہ
- نوحۂ استاد — ۱ر

شیخ عبدالرحمن امرتسری

- سفرنامہ بلاد اسلامیہ — ۱۴ر
- الصدیق — عہ
- المرتضیٰ — عہ
- سیاحت ہند مجلد — ۱۲ر
- عربی بول چال ۱ حصہ — عہ
- کتاب الصرف — ۱۰ر
- کتاب النحو — ۸ر

خواجہ حسن نظامی

- سیپارۂ دل — عہ
- روزنامہ با تصویر — ے
- " بلا تصویر — عہ
- روزنامچہ — ۸ر
- تسخیر مہر و قمر — ۸ر
- دل کی سیدی — ۲ر
- محرم نامہ — ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی — ۱۰ر
- یزید نامہ — ۱۴ر
- اسلام کا انجام — ۶ر
- بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
- انتخاب توحید — عہ
- میلاد نامہ — عہ
- کرشن بیتی — ۱۲ر
- اردو دعائیں — ۶ر
- محفل نامہ — ۸ر
- غدر دہلی کے افسانے — ۲ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں — ۱۰ر
- گپ بیتی — ۲ر
- بچوں کی کہانیاں — ۲ر
- اسرار — ۴ر
- کم تو موت — عہ
- سیر دہلی — عہ
- قرآن [illegible] — ۱ر
- [illegible] غیبی نوشتے — ۸ر
- فلسفۂ شہادت — ۱ر
- [illegible] (دو حصے) — ۸ر

مولانا راشد الخیری

- منازل السائرہ — ۱ے
- صبح زندگی — ۱۴ر
- شام زندگی — عہ
- طوفان حیات — عہ
- سراب مغرب — ۸ر
- [illegible]ات روحوں کے [illegible] — ۶ر
- الزہرا — ۱۲ر
- لڑکیوں کی انشا — ۱ر
- بنت الوقت — ۸ر

نیاز فتح پوری

- ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
- عائشہ صدیقہ — ۱۲ر
- جذبات بھاشا — ۱۲ر
- مغربی سیاح کی ڈائری — ۶ر
- کیوپڈ اینڈ سائکی — ۸ر
- لیلیان جلی

سیماب اکبرآبادی

- خدیجۃ الکبریٰ — ۱۴ر
- بنت الرسول — ۵ر
- سیرۃ الحسین — ۱۲ر
- زیب النساء بیگم — ۱۴ر
- نورجہاں بیگم — ۸ر
- جام کوثر — ۵ر
- بہشتی جھومر — ۱۲ر
- ترجمۂ خطب — ۱۲ر

خلیفہ محمد حسین

- اعجاز التنزیل — ست
- سفرنامہ [illegible] ۲ جلد — سے

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ — عہ
- حیات جامی — ۸ر
- علوم عرب — ۱۴ر
- خواتین — عہ

مولوی رشید احمد انصاری

- تحریر المرأۃ — ۱۴ر
- المدنیۃ والاسلام — عہ
- مجلس جمعیۃ ام القریٰ — ۱۰ر

مولوی حامد علی صدیقی

- تاریخ اندلس — عہ
- انتصار عرب — عہ
- افسانۂ [illegible] — ۸ر

منشی محمد حسن خاں

- ماجرہ — ۱۲ر
- ترکوں کی معاشرت — ۱۲ر

مولوی افتخار عالم

- حیات النذیر — ے
- وکیل نسواں — ۸ر
- تاریخ مدرسۃ العلوم علیگڑھ — ۱۲ر

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۱۱ | یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء | جلد ۱۹

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر: - اسحاق علی علوی

مرزا غالب مرحوم

- اردوے معلی — ۱۲ر
- عود ہندی — ۱۲ر
- دیوان غالب قسم اعلیٰ — ے
- ,, معہ شرح حسرت موہانی — عہ
- کلیات فارسی — ۸ر

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب — ۱۲ر
- حیات سعدی — ۸ر
- مجموعہ نظم حالی — ۱۲ر
- مسدس حالی ۴ ۸ر
- شکوہ ہند — ۲ر
- مثنوی حقوق اولاد — ۳ر
- رباعیات حالی — ۴ر
- مرثیہ مرزا غالب — ار
- بیوہ کی مناجات — ۲ر
- الدین یسر — ۳ر
- تحفۃ الاخوان — ۵ر
- مناظرہ رحم و انصاف — ار
- جیب کی داد — ار
- نمک خدمت — ار
- چپو اور ایکے کا مناظرہ — ار
- حب وطن — ار
- تعصب و انصاف — ار
- تدبیر — ار
- مضامین حالی — ۸ر
- نعمات حالی — ۸ر

سرسید احمد خاں مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — ۸ر
- تفسیر القرآن ۶ جلد — عہ
- تبیین الکلام ۲ جلد — ے
- آثار الصنادید — ۸ر
- خطبات احمدیہ — ۱۲ر
- مکمل مجموعہ لکچر — ۸ر
- سیرۃ فریدیہ — ۱۰ر
- اسباب بغاوت ہند — ۶ر
- مقالات سرسید — عہ
- آخری مضامین سرسید — ۸ر
- ابطال غلامی — عہ
- النظر فی بعض مسائل — ۱۲ر
- تحریر فی اصول التفسیر — ۸ر
- احکام طعام اہل الکتاب — ۶ر
- ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف — ۶ر
- ازالۃ الغین — ۵ر
- تفسیر السموات — ۸ر
- جواب امہات المومنین — ۴ر
- الدعاء والاستجابۃ — ۳ر
- کاشنشش — ار
- ایک دل خدا پرست — ار
- انشاء اللہ — ار
- خلق الانسان — ۲ر
- الجن والجان — ۵ر
- مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی — ۲ر
- تنزل علوم دینیہ — ار
- مہدی آخر الزماں — ۲ر

مولوی نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن کلاں مجلد — عہ
- ,, متوسط ,, — للعہ
- ترجمہ حمائل شریف ,, — للعہ
- ادعیۃ القرآن — ۶ر
- دہ سورہ — ۶ر
- مطالب القرآن — عہ
- الحقوق والفرائض ۳ جلد — عہ
- اجتہاد — عہ
- امہات الامہ — ۱۲ر
- مرآۃ العروس — ۱۰ر
- بنات النعش — ۹ر
- توبۃ النصوح — ۹ر
- مجموعہ نظم بے نظیر — عہ
- چند پند — ۶ر
- منتخب الحکایات — ۶
- مبادی الحکمۃ — ۱۰ر
- موعظہ حسنہ — ۱۲ر
- رویاے صادقہ — عہ
- ابن الوقت — عہ
- ایامیٰ — ۱۴ر
- فسانۂ مبتلا — ۶
- لکچروں کا مجموعہ — عہ
- لکچر نمبر ۲۳ و ۲۴ — ۳ر
- لکچر نمبر ۲۶ مع فرزند سرسید — ۳ر
- لکچر تنبیہ — ۴ر
- لکچر تعلیم — ۲ر
- نصاب المسلمین — ۴ر
- آزادی نسواں — ۲ر
- تسمیم خط — ۲ر
- اتمام حجۃ — ار

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی صلعم ۲ جلد — ے
- الفاروق — ۸ر
- الغزالی — ۱۲ر
- المامون — ۸ر
- سیرۃ النعمان — ۸ر
- سوانح عمری مولانا روم — ۸ر
- بیان خسرو — ۱۰ر
- علم الکلام — ۸ر
- الکلام — ۸ر
- سفرنامہ روم و شام و مصر — ۸ر
- رسائل شبلی — عہ
- مقالات شبلی — ۸ر
- مضامین عالمگیر — ۱۰ر
- شعر العجم جلد اول — ے
- ,, جلد دوم — ۱۲ر
- ,, جلد سوم — ۱۲ر
- ,, جلد چہارم — ۱۲ر
- مثنوی صبح امید — ۳ر
- آغاز اسلام — ۱۲ر
- اسلامی حکومت — ۲ر
- زیب النساء — ار
- جہانگیر — ۲ر
- مجموعہ کلام شبلی (اردو) — ۱۲ر
- دیوان شبلی فارسی — ۸ر
- بوے گل فارسی — ۸ر
- دستۂ گل ,, — ۳ر
- برگ گل ,, — ۳ر
- قصیدۂ امرتسر — ۲ر
- الانتقاد (عربی) — ۸ر
- ترجمہ اسحاق فارسی — ار

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد — عہ
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ — عہ
- آئین قیصری — عہ
- کرزن نامہ — ۱۲ر
- فلسفۂ امثال — ۱۲ر
- صحیفۂ فطرت — ۱۲ر
- تقویم اللسان — ۶ر
- تعلیم الانتظام — ۸ر
- جغرافیہ ریاضیہ — ۱۲ر
- جغرافیہ طبعی — ۸ر
- معادن الحساب — ۱۲ر
- رسالہ علم مساحت — ۱۲ر
- محاربات عظیم — ۸ر
- رسالہ علم تناسب — ۲ر

مولوی سید علی بلگرامی

- تمدن ہند — للعہ
- میڈیکل جورس پروڈنس — ے
- عربوں کا فن تعمیر — ۳ر
- سفرنامہ موسیو تھیونو — عہ
- جنگ ٹرنسوال — عہ

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — ے
- تقلید و عمل بالحدیث — ۸
- مکاتبات الخلان — ۱۲ر
- مسلمانوں کی تہذیب — ۴
- مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب
- کتاب المحبت والشوق — ۸
- نظرت و قانون فطرت — ۳
- اسلام — ۶ر
- آیات بینات ۳ جلد — ے
- مجموعہ لکچر — ے

مولوی چراغ علی مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد — ۸ر
- اعظم الکلام ۲ جلد — ے
- مجموعہ رسائل — ے
- اسلام کی دنیوی برکتیں — ۶ر
- حضرت سلیمان — ۴ر
- حضرت ہاجرہ — ۲ر
- حقیقۃ السحر — ۲ر
- حضرت عیسیٰ و صلیب — ار
- یورپ و قرآن — ۳ر
- احسان عام — ار

مولوی عبد الرزاق

- نظام الملک طوسی مجلد — عہ
- البرامکہ — ے

مطبوعات جدیدہ

بیگماتِ بھوپال

اس کتاب میں اُن دس خواتین کے حالات لکھے گئے ہیں جنھوں نے ابتدائے قیام ریاست سے آج تک بھوپال میں فرمانروائی کی ہے۔ موجودہ فرمانروائے بھوپال علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دام اقبالہا کے حالات زیادہ بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ بھوپال کی تقریباً ۲۳۶ سال کی مسلسل تاریخ اس طور پر مرتب ہو گئی ہے۔ کتاب کا حجم ۱۸ جزو۔ کاغذ وغیرہ نہایت عمدہ قسم کا اور علاوہ ۸ عکسی تصاویر اور نواب سکندر بیگم، نواب شاہجہان بیگم اور موجودہ فرمانروائے بھوپال کے خطوط کے عکس کے جلد نہایت خوشنما بنائی گئی ہے۔ قیمت فی جلد ے۔

ارض القرآن حصہ دوم

سرزمین عرب کا جغرافیہ اور قرآن پاک میں جن اقوام اور قبائل کا ذکر ہے اُنکی محقق تاریخ اور یونانی تاریخ، جدید اثری تحقیقات، توراۃ کے بیانات اور قرآن مجید کے اشارات کی باہمی تطبیق قیمت عہ

بزمِ آخر

یعنی دہلی کے دو آخری بادشاہوں کا طریق معاشرت۔ یہ کتاب تیس برس سے زائد عرصہ گذرا جب پہلی دفعہ چھپی تھی اب دوسرا ایڈیشن چھاپا گیا ہے۔ دربارِ دہلی کے متعلق ایسے دلچسپ حالات اس کتاب میں ملیں گے کہ اُنکا لطف بیان سے باہر ہے۔ اُسپر زبان کی شستگی، لطافت اور صفائی قیامت ہے۔ قیمت عمر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رسالہ معلومات

جو مسٹر عبد الوالی بی اے کی ایڈیٹری میں چند مہینے نکلکر بعض اسباب کی بنا پر بند ہو گیا تھا جنوری ۱۹۱۹ء سے انشاء اللہ تعالی پھر جاری ہوگا۔

ارباب ذوق نے 'معلومات' کی تھوڑی سی زندگی میں جس عنایت و قدردانی کا ثبوت دیا تھا اُسکے بھروسے پر توقع کیجاتی ہے کہ معلومات کو دوبارہ جاری کرنے کا خیال پسند کیا جائے گا۔

'معلومات' کی خصوصیات جو دورِ قدیم میں تھیں جدید زندگی میں بھی حتی الامکان اُنکو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

'بُت شکن' کے نام سے جو فسانۂ آخر زمانے میں شروع کیا گیا تھا وہ اب پھر مکمل کر دیا جائے گا۔ اور جدید خریداروں کی آسانی کے لحاظ سے ابتدائی اوراق ازسرِنو چھاپ دیے جائیں گے۔

'معلومات' کی قیمت بدستور عمہ سالانہ لی جائے گی۔ جملہ قدردانِ قدیم اور نیز وہ اصحاب ذوق جو 'معلومات' جیسے رسالہ کے خواہاں ہوں ۱۹۱۹ء کیلیے اپنا اپنا سالانہ چندہ ارسال فرماکر ممنون بنائیں۔

جو صاحب نمونے کا پرچہ ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ ۸ کے ٹکٹ بھیجدیں۔

المعلن

منیجر رسالۂ معلومات لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۱۲ جلد ۱۹ یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء

مسائل سائنس

(۱)

بوسہ

کون ہے جو اسکے اثر جاں بخش سے آگاہ نہیں؟ عشاق سے پوچھو جو اسکے تصور ہی میں بیخود ہوے جاتے ہیں۔ اور اُن چند لمحوں کی یاد جبکہ اسکی لذت نصیب ہوئی تھی اُنکے جسم میں سنسنی، دماغ میں سرور اور روح میں تازگی پیدا کیے بغیر نہیں رہتی۔ شعراء سے پوچھو جو کبھی "لبِ لعلِ شکر خا" کو ترستے ہیں کبھی آبِ حیواں یا مئے ہوش ربا سے تشبیہ دیکر یوں نغمہ سرائی کرتے ہیں:

کبھی کے بادہ پرست ہم نہیں یہ کیفِ شراب ہے
لب یار چومے تھے خواب میں وہی جوشِ مستیٔ ناب ہے
(عاصی)

صوفیانِ باصفا سے پوچھو جو سنگِ آستانۂ قدس کے صرف ایک بوسہ میں اپنی تمام روحانی ترقیوں کا معراج کمال دیکھتے ہیں۔ ماں باپ کے دل سے پوچھو جو اپنے پیارے بچے کو چومتے وقت خوشی و مسرت سے پھولے نہیں سماتے۔ آرزومندانِ دولت و ثروت سے پوچھو جو اپنے مولیٰ کے لباس، قدم یا ہاتھ کو کس ظاہری خلوص و ادب کے ساتھ ہونٹوں سے لگاتے ہیں۔ ان سب سے پوچھو لیکن ماہرانِ علوم جدیدہ سے

نہ پوچھو۔ کیونکہ انکے دل سرد ہیں اور انکے انکار رہتے کی علتِ غائی اور کُنہ کے دریافت کرنے کے اس قدر درپے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہیں حد کی بھی تشریح و تنقید کرکے اُسکے دلفریب طلسم کو ہماری نظروں سے غائب نہ کردیں۔ یہ حضرات صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک ظالم و سخت دل حاکم کی طرح بوسہ کے خلاف فیصلہ سنا کر ڈراتے ہیں کہ اس میں بڑے خطرات ہیں۔ اس سے مختلف امراض کے موذی جراثیم ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں۔ خصوصاً تپ دق یا سل کا مرض سرایت پذیر ہو سکتا ہے اور یہ عادت اس قدر خراب ہے کہ قانونِ صحت کے خلاف جان کر اسکو بالکل مسدود و ممنوع کر دینا چاہیے۔ ولے بر حال ما! ہماری زبان سے اسکے جواب میں بے ساختہ نکل جاتا ہے:

دور ہو اے دلِ ناآل اندیش — کھو دیا عمر کا مزا تو نے (حالی)

اور یہ صوتِ تنبیہی دنیا کے نقارخانے میں آوازِ طوطی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ زمانۂ حال میں یہ عادت ہر ملک و قوم میں اس کثرت کے ساتھ رائج ہے کہ اسکے مقبولِ عام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ بعضوں میں طریقے اسکے مختلف ہیں۔ مثلاً نیوزیلینڈ کی ماوری اقوام۔ اسکمو و دیگر باشندگانِ قطب شمالی، بعض چینی، ملائی، اور یورپ کی لیپ لینڈر لب و رخسار کے بجائے ناک کو ناک پر رگڑتے ہیں جسے "ساس بینی" کہنا چاہیے۔ باقی ماندہ دنیا کے لوگ "ساس لب" کو ترجیح دیتے ہیں اور پرانے زمانہ کی یونانی و عبرانی اقوام بھی اسی طریقے کو برتتی تھیں۔ روس و ممالک ترکستان میں مرد دوست ایک دوسرے سے ملاقی ہو کر رخسار کا بوسہ لیتے ہیں۔ یورپ اور ہندوستان میں بھی یہ رسم کسی زمانے میں تھی مگر اب قریباً متروک ہو گئی ہے۔

علتِ بوسہ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکی ابتدا ارتقاءِ انسانی کے ساتھ ساتھ اس وقت سے شروع ہوئی ہوگی جب دوست و دشمن، عزیز و اجنبی کو پہچانتے۔ تمیز کرنے یا معلوم کرنے کے لیے قدرت نے اُسکو ایک خاص حس سے کام لینا سکھایا ہوگا۔ یہ حسِ شامہ ہے۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ کس طرح آجکل بھی بعض اقوام میں "ساس بینی" مروج ہے۔ اور "ساس لب" کو بھی دیکھا جائے تو بظاہر گو درحقیقت یہ مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ اندر سانس لینے سے جس سے شامہ کا فعل ظہور میں آتا ہے۔ اسلیے حقیقت میں دونوں طریقے ایک ہی حس کے اتباع سے نکلے ہیں مگر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے عادت و رسم پڑ جانے نے منشاءِ اصلی کو ہمارے علم، خیال و ارادہ سے دور کر دیا ہے۔

۔۔ علیٰ ہذا ہمارے سامنے دیگر حیوانات کی بھی بکثرت مثالیں موجود ہیں جن کے نہ صرف طبقہ اعلیٰ بلکہ ادنیٰ یعنی کیڑے کوڑوں تک میں قوت شامہ ہم سے کہیں زیادہ تیز دیکھی گئی ہے۔ کیونکہ انکے بقائے زندگی کا بہت کچھ انحصار وداروہے۔ اور دوسرے انکا لیکہ سامعہ، باصرہ و لامسہ اشیائے گرد و پیش کی خبر دینے کے لیے اشد ضروری ہیں۔ شامہ مختلف بوؤں کو محسوس کرکے جو فرداً یا نسلاً انکے حق میں مفید یا مضر ثابت ہو سکیں خبردار کرتی رہتی ہے۔

بو خیز مادے جنکی تعداد بکثرت ہے باستثنائے چند گیسوں کے عموماً حیوانی یا نباتی ہوتے ہیں اور باوجودیکہ ہماری شامہ نہایت محدود ہے تاہم ان میں سے بہت سوں کو ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض جانور مثلاً کتے بلی اور ممیلیا mammalia (گرم خون والے بالدار اور تھندار چوپائے) ہم سے کہیں زیادہ اس احساس کی قدرت رکھتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان مادوں سے چھوٹے چھوٹے ذرات خارج ہو کر ہوا میں حرکت کرتے ہوئے اعصاب شامہ تک پہونچتے ہیں جو اپنے اثر کو دماغ کے ایک خاص حصہ تک پہونچاتے اور اسکو اپنے محسوسات پیدا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہ ذرات بخلاف ذرات ذائقہ پانی میں تحلیل نہیں ہو سکتے۔ اسلیے باوجودیکہ آخر الذکر کی چار قسمیں۔ میٹھا، کھٹا، کڑوا اور کھاری پہچانی جا سکتی ہیں۔ شامہ ایسی تمیز کرنے سے قاصر ہے اور بسا اوقات ہم کو دھوکے میں ڈالدیتی ہے یعنی جس شے کو ہم اسکی بو سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں اسکا ذائقہ ہوتی ہے اور برعکس ازیں جس ذائقہ کو چار مذکورہ بالا کے علاوہ اکل و شرب میں محسوس کرتے ہیں وہ دراصل اسکی بو ہے جو اعصاب بینی پر اثر کرتی ہے نہ کہ زبان کے اعصاب ذائقہ پر۔ وہ حصہ دماغ جس سے اعصاب شامہ خارج ہوتے ہیں اکثر ادنیٰ درجہ کی ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں بہت بڑا دیکھا گیا ہے۔ مچھلی کے دماغ کا تو ایک پانچواں حصہ اسی کے لیے مخصوص ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ انکی زندگی کے لیے وہ کس قدر ضروری ہے۔ ممیلیا mammalia میں بھی اسکا حجم کچھ کم نہیں۔ لیکن انسان کو جو اور احساسات سے بھی کام لے سکتا ہے صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دماغ کے ایک گوشہ میں علحدہ ہوا ہے جہاں سے یہ اعصاب برقی تاروں کی طرح نکل کر شاخ در شاخ دونوں نتھنوں کے اندر جال کے مانند پھیلے ہوئے ہیں۔

۔۔ شاذونادر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض آدمیوں اور پالو جانوروں (کتا۔ بلی) میں حس شامہ قدرتی طور سے مفقود ہوتی ہے جس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دماغ کا وہ حصہ ہی شاید ناقص واقع ہوا ہو۔ ان لوگوں کو عطر، پھول، کھانے وغیرہ کی بوؤں کا احساس ہوتا ہے نہ گندی موریوں اور سڑی ہوئی اشیا ہی کو سونگھنے سے کبیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ جس سے اگر کچھ ڈر ہے تو یہ کہ بعض بیماری پیدا کرنے والے

اسباب سے بےخبر رہ جاتے ہیں۔ اسکے برعکس دیکھیے تو بعض لوگوں کی قوت شامہ حد درجہ تیز ہوتی ہے۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ کسی خالی کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً بتا دیتا تھا کہ وہاں اُسکا کوئی جان پہچان والا تھوڑی دیر ہوئی موجود تھا کہ نہیں۔ اس میں ملبوسات کی مصنوعی خوشبو کو کچھ دخل نہیں بلکہ انکی اپنی جسمانی قدرتی بوئیں اُسکے حس لطیف کو متحرک کرکے ادراک و تمیز کو فوراً خبر دے دیتی تھیں۔ جب اس مسئلہ پر زیادہ غور کیا جاتا ہے تو حد درجہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف حیوانات اور نباتات کے مختلف انواع و اقسام کے لیے ایک خاص بو مخصوص ہے بلکہ اُنکا ہر ہر فرد۔ گو معمولی آدمی کی حس اُسکو تمیز کرنے سے قاصر رہے۔ اپنی اپنی جدا ایک بو رکھتا ہے یہ چند مثالوں سے پوری طور پر واضح ہوجائیگا۔ کتے کی ایک خاص نسل ہے جسے بلڈ ہاؤنڈ *Blood hound* کہتے ہیں اُن میں یہ صفت ہے کہ کسی جنگل یا مکان میں کوئی مفرور شدہ آدمی چھپا ہوا ہو اور وہاں چھوڑ دیا جائے تو وہ سونگھتا سونگھتا اُسکو ڈھونڈھ نکالے گا۔ اس طرح بہت سے مجرم یورپ میں پکڑے گئے ہیں۔ موجودہ جنگ میں بھی یہ کتے زخمیوں کی تلاش و تفتیش میں نہایت مفید ثابت ہوے ہیں۔ فاکس ٹیریر *Fox terrier* ایک دوسری نسل ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہر شخص اسکا تجربہ کرسکتا ہے کہ ڈھیلوں کے انبار میں سے ایک کنکری اُٹھا کر دور سے اُسی جگہ پھینکے اور اس کتے کو شکار دے۔ وہ سیکڑوں ہم شکل ڈھیلوں میں سے فوراً اُسی کو اپنے منہ میں دبا کر لے آئیگا۔ وجہ یہ ہے کہ کنکری میں پھینکنے والے کے ہاتھ کی ایک خاص بو سرایت کرجاتی ہے جسے کتا اچھی طرح پہچانتا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ بو خیز اشیاء کے جزو لایتجزیٰ کو ایک نہایت چھوٹا ذرہ سمجھنا چاہیے جو حرکت پذیر ہوکر اعصاب شامہ پر اثر کرتا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ صرف ایک گمان ہی گمان ہے کیونکہ ابھی تک ہم اسکے حجم کو دریافت نہیں کرسکے ہیں اور کمال درجہ دقیق ہونے کی وجہ سے اسکی اصلیت کا بھی پتہ نہیں لگا سکے ہیں۔ مثلاً مشک کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو کسی جگہ رکھ دو تو کچھ دور تک اُسکی خوشبو پھیل جاتی ہے یعنی بقول دلیل ذرات اسکے کچھ اجزا ہماری ناک تک پہونچتے ہیں لہذا اسکا وزن بھی کسی قدر گھٹ جانا چاہیے۔ لیکن حیرت ہے کہ آج تک کوئی باریک سے باریک میزان بھی اس امر کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اسلیے بعض علما کا خیال ایک دوسری طرف گیا ہے۔ وہ ذرات کی حرکت کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ اُن اشیاء سے ایک خاص قسم کی غائب از نظر شعاعیں پیدا ہوتی ہیں جن کا اثر

اعصاب شامہ تک پہونچتا ہے اور مثال کے طور پر ریڈیم سے مقابلہ کرتے ہیں کہ اُس سے بھی تو شعاعیں برسہا برس تک خارج ہوتی رہتی ہیں لیکن وزن میں کچھ فرق نہیں آتا - یہ سب کچھ سہی لیکن آخر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انتشار بو کا مسئلہ ابھی تک بہت کچھ محتاج ثبوت ہے -

اب دیکھنا چاہیے کہ حیوانات اپنی حس شامہ سے کس کس طرح فائدہ حاصل کرتے ہیں - اوّلاً وہ اسکے ذریعہ اپنے دشمنوں اور ضرر رساں چیزوں سے باخبر ہو کر اُن سے احتراز کرتے ہیں- ثانیاً وہ اُنکی تلاش حصول غذا کے موقعوں پر رہنمائی کرتی ہے - ثالثاً وہ اُنکی ہم نسل اور ایک ہی خاندان کے افراد کے پہچاننے میں مدد دیتی ہے اور نیز اُنکے بچوں، گھونسلوں یا بلوں کا آسانی سے پتہ لگا دیتی ہے - رابعاً تناسل کی غرض سے صنف مخالف کی باہمی کشش و مواصلت کا باعث ہوتی ہے - اس آخری غرض کی انجام دہی میں قوت شامہ سے چند عجیب کرشمے ظہور میں آتے ہیں جنکا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا -

سب کو معلوم ہے کہ تتلیاں اور بہت سی دوسری قسم کے چھوٹے بڑے کیڑے خوشرنگ و خوشبودار پھولوں سے کس قدر مانوس نظر آتے ہیں بلکہ حقیقت یوں سمجھنا چاہیے کہ قدرت نے ان پودوں کو یہ صفات اسلیے بخشی ہیں کہ کیڑوں کو اپنی طرف راغب کر سکیں - اور اس میں ایک بہت بڑی مصلحت مضمر ہے - وہ یہ کہ جب کوئی کیڑا پھول کی خوشبو سے مست ہو کر اُسپر بیٹھتا ہے تو اُسکے پیر اور بازو اُسکے بیج دار دانوں اور انڈوں سے مخلوط و آلودہ ہو جاتے ہیں - جب وہاں سے اُڑ کر کسی دوسرے پودے پر جا بیٹھتا ہے تو یہی دانے اُسکو بار آور کرکے تناسل و توالد کے سلسلہ کو قائم رکھتے ہیں - اس بڑی خدمت کا صلہ پھول اس طرح ادا کرتا ہے کہ کیڑے کے بازووں کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتا ہے جسکا اثر مادہ یا نر کے اعصاب پر پڑتے ہی اُنکو کشاں کشاں ایک دوسرے کی طرف راغب کر دیتا ہے - تتلیوں میں نر کے پر مادہ سے زیادہ خوشبودار ہوتے ہیں - اُن سے چنبیلی، مولسری یا گلاب کی شمیم انگیز لپٹیں جب اُڑ کر کہیں دور مادہ کے شام تک پہونچتی ہیں تو وہ خبردار ہو جاتی ہے اور فریفتہ و گرویدہ ہو کر فوراً نر کی تلاش میں نکلتی ہے - مگر اسکو قاعدہ کلیہ نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ بعض کیڑوں خصوصاً گبرلیوں سے نہایت سخت بو آتی ہے تاکہ وہ پرندوں یا چھپکلیوں کے حملوں سے جو اُنکے دشمن جانی ہیں محفوظ رہ سکیں -

بلحاظ اپنی کشش اور خوشبو کے ایک دوسری قسم کا کیڑا بھی قابل ذکر ہے - کیونکہ اُسکی مادہ کے جسم سے ایسی تیز مہک نکلتی ہے کہ ایک باریک کپڑے کی تھیلی کے اندر بھی بند کرکے کسی جگہ رکھ دی جائے تو

تھوڑی ہی دیر میں وہ وہ دو دو سینکڑوں گز کے فاصلہ سے کثرت سے وہاں آکر جمع ہو جائیں گے اور اُن کی فریفتگی کا یہ عالم ہوگا کہ اگر کہیں علیحدہ بھی کر دی جائے تو بھی وہ خالی تھیلی کے گرد گھومتے اور چکر لگاتے رہیں گے۔ تشریح سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ ان بوؤں کے ماخذ وہ روغنی مادے ہیں جو حیوانات کے تحت الجلد غدود میں پیدا ہو کر خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ممیلیا Mammalia میں بھی اُنکی کمی نہیں۔ مثلاً مشک جو نافۂ آہو سے نکلتا ہے اسی قسم سے سمجھا جاتا ہے۔ انسان بھی مستثنیٰ نہیں کہا جا سکتا لیکن یا تو یہ مادے اسکے جسم میں خلقی طور سے کم پیدا ہوتے ہیں یا اُسکی حس شامہ اس قدر کُند ہو گئی ہے کہ نباتات یا پھولوں سے مدد کا خواستگار ہوتا ہے اور اُنکی خوشبوؤں سے اپنے ملبوسات کو جنس مخالف کی کشش کے لیے معطر کرتا ہے۔

اس ضمن میں جسمانی مخصوص بوؤں کے متعلق چند عجیب باتیں زیر مشاہدہ آتی ہیں۔ مثلاً کسی خاص موقعہ اور وقت پر جو بو پہلے اچھی معلوم ہوتی تھی وہی بعد ناگوار محسوس ہوتی ہے اور کسی بو کے عادی ہو جانے سے اُسکا احساس جاتا رہتا ہے اسلیے مختلف اقوام جس بو کو ایک دوسرے میں محسوس کرتی ہیں اسکا خود انکو احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً چینی کہتے ہیں کہ یورپ والوں کے بدن میں بھیڑ کی سی بو آتی ہے۔ اور یوروپین کہتے ہیں کہ حبشیوں کے جسم سے ایک ایسی ناگوار بو نکلتی ہے جس سے سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ ہر قسم کے دماغی محسوسات دو قسم کے عمل رکھتے ہیں۔ ایک ظاہری جس سے ہم باخبر رہتے ہیں، دوسرا باطنی جو برابر اپنا اثر کرتا رہتا ہے لیکن ہم اس سے بیخبر رہتے ہیں۔ یہ وہ یا تو صدہا سال کے ارتقا کا نتیجہ ہے یا ودیعت آبائی و نسلی ہے یا اپنے گذشتہ تجارب پر مبنی ہے اور خزانۂ دماغ کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا ہر وقت بلا ارادہ صادر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً جب ہم زمین پر چلتے پھرتے ہیں تو اعصاب حسی یعنی باصرہ، لامسہ وسامعہ فوراً مصادر دماغی کو خبر کر دیتے ہیں جہاں سے اعصاب محرکہ عضلات پر عمل کر کے انہیں حرکت پیدا کرتے ہیں۔ غرضکہ اسی طرح تمام حرکات و سکنات انہیں محسوسات کے تابع ہیں لیکن ہمکو خبر نہیں ہوتی اور نہ ہم ایسے موقعوں پر اپنے ارادے کو کام میں لاتے ہیں۔ یہی حال قوتِ شامہ کا ہے کہ اسکا بھی ایک عمل باطنی ہے جس سے گو ہم بیخبر رہتے ہیں لیکن اسکا اثر برابر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً شاید اکثر لوگوں نے اسپر غور نہیں کیا کہ کیوں بعض اجنبیوں کو دیکھتے ہی یا اُنکے قریب جاتے ہی ہمکو بلا وجہ بے خبر ایک طرح کی نفرت یا اُنسیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس معمے کا حل صرف یوں ہو سکتا ہے کہ اُنکے جسم سے کچھ اس قسم کی بو نکلتی ہے جسے ہماری قوتِ شامۂ باطنی محسوس کر کے یہ کیفیت غریب پیدا کرتی ہے۔ بوسہ کی ماہیت و اصلیت بھی اسی حس پر مبنی کرنے سے

بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ ہمیں یاد ہے کہ ابتدا وہ حیوان کے لیے شامہ کا خاص فعل اسکو ترجیح و انتخاب جنسی اور نیک و بد یا خویش و غیر میں تمیز کرنے کے قابل بناتا تھا۔ اور گو اب متداد زمانہ اور ارتقائی انقلابات نے اس احساس سے ہمارے دماغ کو بے خبر کر دیا ہے، تاہم اسکے وجود میں کوئی کلام نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جب ہم کسی کا بوسہ لیتے ہیں تو ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر اُسے سونگھنے کا ارادہ نہیں کرتے لیکن اُسکا نامعلوم اثر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور اکثر بے خبری کبھی باخبری ہمارے مشامِ جاں میں کچھ ایسی ناقابل بیان خوشبوئیں آتی رہتی ہیں جو ذاتِ محبوب کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہماری گرویدگی، کشش، مسرت و انبساط کا باعث ہوتی ہیں۔

مسائل سائنس کو عام فہم، ہر دلعزیز بنانے کی غرض سے ہمارا ارادہ ہے کہ پندرہ بیس اور مضامین اسی قسم کے لکھے جائیں جسکا پہلا نمونہ ناظرین کے سامنے حاضر ہے۔ دوسرا جسکو عشقبازی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بشرط فرصت جلد پیشکش کیا جائے گا۔ یہ مضامین یورپ کے ایک مشہور و معروف سائنس دان کی تصانیف سے ماخوذ کیے گئے ہیں۔ اردو میں انکو خاص طور سے جامہ زیب بنانے بہت سی غیر ضروری اور فضول باتوں کو خارج کرنے اور بعض لایعنی کے لیے کئی جگہ واضح طور سے لکھنے میں راقم الحروف کو اس قدر کاٹ چھانٹ کرنا پڑی ہے کہ اسکو ترجمہ کہنا مناسب و موزوں نہ ہوگا۔ — مانی

غزل جناب مولانا آزاد سبحانی

شہرہ ہے کہ دنیا سے نرالے ہیں ادا میں — کہلواتے ہیں وہ آپ بقا جامِ فنا میں
مرجانا کسی پر ہو تو جینے سے سوا ہے — مستور نہ گیان رکھتی ہیں بس ایک ادا میں
آگاہ کہ اک حرف پہ ہے مایۂ ہستی — باقی ہے جو رہتے ہیں فنا میں بقا میں
ہوتا ہے نہ ہونے کے برابر جو نہ ہو یہ — میں گم ہوا گر وہ میں تو وہ گم ہوا تا میں
بے منکرِ الٰہی ہیں کسی بت کی ہوس بھی — ہے کفر کا رشتہ بھی ہر اک تارِ عبا میں
گلگشت جو اس غیرتِ گل کی ہے گلوں میں — غنچے بھی لپٹ جاتے ہیں دامانِ صبا میں
محمودِ مئے عشق مگر ہر جنون سے — غنچے کا تو ہے ہر اک بدہوا میں
آزاد کو گرفتار کا کچھ حال نہ پوچھو — دل دوست کے کس بری طرح پھنسا ہے وہ بلا میں

تمدن کا پھول

مصوّری

فن مصوری کی ابتدا زمانۂ قدیم میں شاعری کے تین سو برس بعد ہوئی، مگر زمانہ نے اسکی ترقی یورپ کی قسمت میں لکھی تھی جب تمدن کا دامن شاعری سے پُر ہوا تو اُسکو مصوری کی بھی سخت ضرورت ہوئی۔ چونکہ قوتِ باصرہ بہ نسبت قوت سامعہ کے زیادہ نازک و ذکی الحس ہوتی ہے اسلیے اس فن لطیف کو پندرھویں صدی عیسوی کے قریب ترقی کرنے کا موقعہ ملا اور صرف چار سو برس میں یورپ نے جسقدر ترقی کی قابلِ حیرت ہے۔ نادر تصویروں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس فن میں علمی تصانیف کرنے والوں کی بھی ملک نے بہت قدر کی۔ اطالیہ وہ مقدس زمین ہے جہاں فن مصوری کا آفتاب بلند ہوا اور اسی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُسکی خاک سے اس فن کے پیغمبر پیدا ہوے جن میں سے رفیل میکائیل، انجیلو، جولیو رومینو اور کریجیو خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان ہی کے سر اس کی ترقی کا سہرا بندھا۔ تمام یورپ ان ہی لوگوں کی بدولت منور ہوگیا۔ مصنفین میں سے لیونارڈو ونسی کی کتاب "فن مصوری" قابل دید ہے جسکی تعریف خود اس فن کے اساتذہ فخر و مباہات سے کرتے ہیں۔

مصوری اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو کام شاعر کرتا ہے وہی مصور کرتا ہے۔ مصور پنسل یا برُش سے کام لیتا ہے تو شاعر زبان سے۔ شاعر کانوں کے ذریعہ روح کو مسرت پہونچاتا ہے تو مصور آنکھوں کے ذریعہ سے۔ قوتِ باصرہ کے زیادہ ذکی الحس ہونے کی وجہ سے جو بات مصور ایک نشان یا ایک خط سے ادا کرے گا وہ شاعر صدہا اشعار سے نہ ادا کر سکے گا۔ بمقابلہ شاعر کے مصور اپنی تصویر میں اچھی طرح خیالات ظاہر کر سکتا ہے۔ شاعر آنکھ، ناک، ابرو، ہاتھ، انگلیوں کے اشاروں سے اپنے کلام کو پُر لطف بنا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لطف چند منٹ ہی قائم رہ سکتا ہے۔ مصور تصویر میں وہ کمال پیدا کر دیتا ہے کہ جس وقت اور جو شخص دیکھے وہی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اور فنون کی طرح مصوری بھی کمال کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی مگر آج کل اُس زمانہ کی تصویریں نہیں ملتیں۔

شاذونادر اگر کہیں کوئی تصویر دیکھنے میں آتی ہے تو مصور کے نام اور تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔

سنگ تراشی بھی فنون لطیفہ میں داخل ہے۔ غارہائے ایلورا و اجنٹا (ریاست حیدرآباد دکن) و انڈھاری (علاقہ بمبئی) و ایلیفنٹا وغیرہ کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ قبل از مسیح ہندوستان میں بھی اس فن کو وہ درجہ حاصل تھا کہ جسکی موجودہ حالت بھی اس قابل ہے کہ اساتذہ قدیم کے قدم بوسہ گاہ بنائے جائیں۔ انکی جادو طرازیاں انکے کمال مصوری کی داد دیتی ہیں اور ہزاروں اہل یورپ دانتوں میں اُنگلی دباتے ہیں اور سخت تعجب کرتے ہیں کہ کیسے باکمال مصور تھے جنکی یاد اب تک تازہ و زندہ موجود ہے۔ اور اسوقت اُس زمانہ کے تمدن کا پتہ ان ہی تصاویر سے ملتا ہے۔

یہ عام خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کشی کو حرام کر دیا اسلیے مسلمان اس فن میں کچھ ترقی نہ کر سکے بلکہ مسلمانوں کے عہد میں یہ لطیف فن برباد ہو گیا۔ ہمکو مذہبی مسئلہ سے بحث نہیں لیکن تاریخی واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس فن میں کچھ کم ترقی نہیں کی۔ اور سلاطین ہند اور اکثر امرائے اسلام اس فن کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔

دور[1] اکبری یا اسکے مابعد کی تصاویر سے قلمی فن مصوری کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ گو وہ زمانہ ہندوستان کے عروج کا نہ تھا تاہم اُس وقت کی تصویریں بہت ہی نادر ہیں۔ بے شبہہ شبیہ نگاری میں انھیں کمال حاصل تھا اُس زمانہ کے مصور تصویر کے نیچے اپنا نام نہیں لکھتے تھے۔ جسکی وجہ سے معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے اس فن لطیف میں کہاں تک ترقی کی تھی۔ ہمکو تاریخ سے بہت کم مصوروں کا پتہ ملتا ہے مگر بعض بعض کا نام بہت مشکل سے معلوم ہوا ہے۔

جہانگیر کے دربار میں ایک مشہور مصور "ابوالحسن" نامی تھا جسکو جہانگیر نے سنہ جلوس میں "نادرالزمانی" کا خطاب دیا تھا۔ خطاب دینے کی تقریب میں لکھتا ہے:۔

کارش بہ عیار کامل رسیدہ و تصویر او از کارنامہائے روزگار است، در عصر نظیر و عدیل خود ندارد، اگر درین روزگار استاد عبدالحی و بہزاد در صفحہ روزگاری بودند انصاف کار رو می دادند الحق در زمان خود بودہ و ہمچنین استاد منصور نقاش کہ بخطاب نادرالعصری ممتاز است در فن نقاشی یگانہ عصر خود است (۲۲۵)

[1] اسکے قبل کی کوئی قلمی تصویر ہماری دیکھنے میں نہیں آئی جس پر کسی مسلمان مصور کا نام ہو۔

جہانگیر نے نہایت نادر تصویریں اور مرقعے تیار کرائے تھے۔ ۱۲ سنہ جلوس میں خان عالم کو جب عراق بھیجا ہے تو کشن داس کو ساتھ بھیجا کہ شاہ عباس صفوی اور اُسکے ارکان سلطنت کی تصویر کھینچکر لائے۔ چنانچہ خود لکھتا ہے :۔

وقتیکہ خان عالم را بعراق نزد شاہ می فرستادم بشن داس نام مصور را کہ در شبیہ کشی از یکتایان روزگار است ہمراہ دادہ بودم کہ شبیہ شاہ و عمدہ ہاے دولت ایشاں را کشیدہ بیارد شبیہ اکثرے کشیدہ بود منظر درآورد خصوصاً شبیہ شاہ برادرم (یعنی عباس صفوی) را بسیار خوب کشیدہ بود چنانچہ ہر کس از بندہ ہاے ایشاں نمودم عرض کردند کہ بسیار خوب کشیدہ ۔ (۱۸۵)

جہانگیر خود بھی اس فن سے واقفیت رکھتا تھا اُسکو اس قدر شوق تھا کہ فن مصوری میں خاص طور پر کمال حاصل تھا۔ اسکا کمال اس درجے کو پہونچا تھا کہ اگر ایک تصویر مختلف مصوروں کے ہاتھ کی ہوتی تھی تو وہ بتا دیتا تھا کہ کہاں تک کس کے ہاتھ کا کام ہے۔ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :۔

اگر در یک صورت، چشم و ابرو را دیگرے کشیدہ باشد دراں صورت می فہم کہ اصل چہرہ کار کیست؟ و چشم و ابرو را کہ ساختہ؟

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فن مصوری کے علاوہ سنگتراشی کا بھی رواج تھا اور بادشاہ وقت بھی قدر کرتے تھے۔ جہانگیر نے اپنے زمانہ کے نامور آدمیوں کے بُت تیار کرائے تھے اور تعجب ہے کہ ان میں ہندو راجاؤں کے بت بھی تھے۔ مہارانا اودے پور اور اُسکے ولیعہد کرن کا جو بت تیار کرایا تھا اُسکے متعلق ۱۰ سنہ جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے :۔

صورت رانا و کرن پسرا و را بسنگ تراشان تیز چنگ فرمودہ بودم کہ از سنگ مرمر بقد و ترکیبے کہ دارند تراشند۔ دریں تاریخ صورت اتمام یافت و نظر در آمد فرمودم کہ بہ آگرہ بردہ در باغ جھروکہ درشن نصب کنند۔ (۱۹۲ و ۱۴۳)

جہانگیر مصوروں کی قدر بھی بہت کرتا تھا۔ ایک مصور نے جہانگیر کے دربار میں ایک تصویر پیش کی جس میں ایک عورت کی تصویر اس حالت میں کھینچی تھی کہ اُسکی کنیز تھا دیے پاؤں مل رہی ہے۔ جہانگیر نے مصور کو پانچ ہزار روپے دیکر تصویر خریدلی۔ اسپر اہل دربار کو تعجب ہوا اور عرض کی حضور اس میں کیا بات ہے جو اس قدر قیمت دی گئی؟ جہانگیر نے کہا جب تلوے سہلائے جاتے ہیں تو خفیف سی

گدگدی پیدا ہوتی ہے اور اُسکا اثر چہرے پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ خوبی اس تصویر میں موجود ہے۔

جہانگیر خود بھی اعلیٰ درجہ کا مصور تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ لطیف فن برباد ہو سکتا تھا۔ جہانگیر بادشاہ ہونے پر بھی قدرتی طور سے فن مصوری کا شایق تھا۔ یہ تو بادشاہ تھا، شاعروں میں عرفی شیرازی کا نام سب سے اول پیش کرنے کے قابل ہے کہ وہ شاعر بھی تھا اور مصور بھی تھا۔ جسکی نسبت شاہ نواز خان (مصنف ماثر الامراء) نے تذکرۂ بہارستانِ سخن میں لکھا ہے کہ عرفی شیرازی نے علاوہ علوم کے فنِ مصوری اور فن نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں بھی اس فن کا مذاق سلیم تھا۔

اٹلی صرف شبیہ نگاری پر قانع نہیں ہوئی بلکہ اس نے فن مصوری کے ہر صنف میں رتبۂ کمال حاصل کیا۔ مناظر فطرت، روایاتِ دینی، مضامین شاعرانہ وغیرہ میں درجۂ کمال کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ اسی نے پالا پوسا اور معراجِ کمال کو پہونچایا۔ اساتذۂ اٹلی کی اکثر تصویریں ایسی مقبول عام ہوئیں کہ دنیا کا کوئی کونا اُن سے خالی نہیں۔ رفیلؔ[1] کی بے نظیر تصویر "ابن مریم" ہندوستان کے ہر شہر میں، اور انگریزوں کے کمروں میں، اور سوداگروں کی دوکان پر یکساں زیب دیتی ہے۔ اُسکے رنگ کی سادگی اور خیالات کی پاکیزگی ایسی پُرلطف ہے کہ بدمذاق شخص بھی اُسے دیکھ کر کچھ نہ کچھ مزہ اُٹھاتا ہے۔

رفیل کہا کرتا تھا کہ یہ تصویریں جن اُستادوں کی بنائی ہوئی ہیں وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے تھے۔ اٹلی میں دستور ہے کہ کسی ملک کے مصور کو اُستاد نہیں مانتے تاوقتیکہ وہ دو چار بار اٹلی کے تصویر خانوں کا باقاعدہ مشاہدہ نہ کرلے۔ بالخصوص روم کا "نگارخانۂ ویٹکین" تو ہمیشہ شاہدان فن کا زیارتگاہ رہا ہے۔ یورپ میں کتنے ہی ایسے قدردان پڑے ہوے ہیں کہ ان نگارخانوں میں کی ایک ایک تصویر کے لیے دس دس لاکھ پونڈ تک دینے کو تیار ہیں۔

مصوری سے ہماری مراد فوٹوگرافی نہیں ہے۔ فوٹوگرافی چند یوم کا کام، اور مصوری برسوں کا۔ نقادانِ فن فوٹوگرافی کو اُسکی ارزانی کی وجہ سے مقابلہ مصوری کے بہت حقیر قرار دیتے ہیں۔ بلکہ وہ فن فوٹوگرافی کو فن کے زمرہ میں شمار نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ فوٹوگرافر بہت تھوڑے سے وقت میں اصل شے کی نقل اُتار لیتا ہے مگر یہ نقل بے جان، مردہ اور بے رنگ ہوتی ہے۔ فطرت کی

---

[1] رفیل اٹلی کا ایک مشہور مصور تھا سنہ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۰ء میں انتقال کیا۔

بوقلمونی اور نیرنگی اظہرمن الشمس ہے ایسی کوئی قدرتی شے نہیں جو کوئی نہ کوئی رنگ نہ رکھتی ہو۔ فوٹو گرافر اس نکتہ کو بالکل نظرانداز کرجاتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی کوہستانی منظر کی تصویر اُتاریگا تو پہاڑ کے دامن اُسکی چوٹی، اُس پر ہرے بھرے درخت، اُسکے درے اور غار اور اُسکے مقابل کا وسیع اور دلکش منظر سب ایک ہی رنگ کے ہوں گے۔ آسمان بجائے نیلگوں کے زردی مائل ہوگا۔ اور اگر اس پہاڑ میں کوئی آبشار رہوگا تو فوٹو میں ایک سفید لکیر نظر آئیگی۔ حرکت، تیزی اور رکھ نام کو نہ ہوگا۔ اسکو دیکھکر ہم نہ پہچان سکیں گے کہ یہ کس منظر کی تصویر ہے۔ خواہ وہ نظارہ ہماری نظروں میں کیسا ہی مانوس کیوں نہ ہو۔ برعکس اسکے مصور اگر اس منظر کا سماں صبح کے وقت دکھائے گا تو پہاڑ کی چوٹیوں پر دُھندلی سنہری کرنیں ہونگی، دامن بالائی حصہ سے کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہوگا، درخت ہرے بھرے اور زرنگار، آسمان پر شفق پھولی ہوئی، آبشار کا پانی حرکت کرتا اور لہراتا ہوا، پہاڑ کے مقابل کا میدان زردی مائل سبز رنگ کا نظر آتے گا۔ اگر ہم نے کبھی اس منظر کو دیکھا ہے تو تصویر کے دیکھتے ہی فوراً پہچان جائیں گے۔

بے شک فوٹوگرافر واقفیت میں مصور سے بڑھا رہتا ہے گر فن وہی قابل تعریف ہے جو فطرت کی خوبصورتیوں میں اضافہ کرے، حسین کو حسین تر بنائے نہ کہ حُسن فطری کو گھٹائے اور اُسے قدرتی زیوروں سے معرا کرکے ہمارے سامنے پیش کرے۔ مصور اگر کوئی منظر دکھاتا ہے تو محض واقفیت پر قانع نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی جدت اور قوت تمیز سے کام لیتا ہے۔ اگر کوئی بھدی چیز سامنے آگئی ہو تو وہ اُسے نظرانداز کرجاتا ہے اور کسی دوسرے منظر کی خوبصورت چیزیں ایسی خوش مذاقی سے لاکر ملا دیتا ہے کہ تصویر کی خوبی دوبالا ہوجاتی غرض وہ فطرت کی نقل نہیں کرتا بلکہ فطرت کو سنوارتا ہے۔ اور بیچارہ فوٹوگرافر اپنے فن کی قیود سے مجبور ہے۔ وہ نقل بھی کرتا ہے اور نقل بھی ایسی جسے اصل سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

شاعری کی طرح مصوری میں بھی آمد ہوا کرتی ہے گر شاعر تو ہوش سنبھالتے ہی موزونی طبع دکھانے لگتا ہے اور بیچارہ مصور ایک مدت تک مناظر فطرت، خصائل انسانی و عادات حیوانی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اُسکے لیے بہ نسبت شاعر کے ان نکات کو بنظر غور دیکھنے کی بدرجہا زائد ضرورت ہے۔ مصوری وہ فن ہے جسکے لیے بہت وقت، بہت فرصت، بڑی تیز نگاہ، بڑا وسیع اور روشن تخیل، بڑا درد مند و نازک دل ہونا چاہیے۔ ان خوبیوں پر بھی انسان شب و روز مشق کرنے، رنگوں کے اسرار و نکات

سمجھنے اور اساتذۂ فن کی تصاویر کو دیکھنے اور اُسکے محاسن کو سمجھنے کے بغیر اس فن میں مہارت کامل حاصل نہیں کر سکتا۔ اسکی ایک ایک صنف بلکہ ایک ایک شاخ میں کمال حاصل کرنے کے لیے ایک زندگی درکار ہے۔

کوئی مصور پھولوں کا عاشق ہوتا ہے اور ان ہی کے محاسن دکھانے میں اپنی زندگی صرف کر دیتا ہے۔ کوئی زندگی بھر کتوں ہی کی تصویریں کھینچتا ہے۔ کسی نے بچوں کی تصویریں کھینچنا اپنی زندگی کا شغلہ قرار دے لیا ہے۔

ہندوستان میں فن مصوری کے قدردان بہت کم ہیں اسی وجہ سے اس فن لطیف کو ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ سر رابندرناتھ ٹیگور قدیم طرز پر تصویریں تیار کرتے ہیں۔ اہل یورپ ہند کی قدیم معاشرت کو دیکھ کو بہت خوش ہوتے ہیں اور مسٹر ٹیگور کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں، مسٹر فیض الرحمن آرٹسٹ[1] نے اہل یورپ کو پیرس کی نمائش میں محو حیرت محض ہند کی قدیم معاشرت کی وجہ سے کر دیا تھا اور جدید معاشرت بو اہر کا اچھا خاصا نمونہ پیش کیا تھا۔ آپ کی اہلیہ عطیہ فیضی علم موسیقی میں کمال رکھتی ہیں اور دونوں اپنے اپنے فن کے اُستادِ کامل ہیں۔

زمانۂ قدیم کی تصویریں بہت ہی نادر ہیں۔ بے شبہ اساتذۂ قدیم کو شبیہ نگاری میں بہت کمال حاصل تھا، فنِ مصوری میں انھیں بہت کم دسترس تھی۔ وہ مسافتِ مینی کے قواعد سے بھی مانوس نہ تھے۔ آئینِ اکبری کی تصاویر میں اگرچہ چلتی پھرتی تصویریں، زندہ دلی و تناسب سب کچھ موجود ہے مگر مسافتِ مینی کا بالکل لحاظ نہیں کیا گیا۔ دروازے کے مقابل جس قد و قامت کی تصویر نظر آتی ہے اتنی ہی بڑی محل کے اندرونی حصہ میں نظر آتی ہے اور یہ خامی موجودہ فن تصویر کے لحاظ سے بہت بڑا نقص ہے۔ علاوہ بریں دھوپ، چھاؤں کے لحاظ سے بھی ان تصاویر میں اکثر نقائص نظر آتے ہیں۔ صحن اور دالان میں ایک ہی طرز کی روشنی پائی جاتی ہے۔

ان نقائص کے پیدا ہونے کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ۔۔ ان میں فن مصوری معماری کی طرح پیشہ ور دو ل

[1] مسٹر فیض الرحمن نومسلم ہیں۔ پہلے یہودی تھے اور اسکول آف آرٹ بمبئی سے تکمیل کورس کے بعد یورپ گئے یورپ سے واپسی کے بعد آپ مسلمان ہوئے اور بدرالدین طیب جی (بمبئی) کے خاندان میں عطیہ فیضی سے آپ کی شادی ہوئی۔ بعد شادی کے فیض الرحمن و عطیہ فیضی کر یورپ گئے تھے اور آجکل علاقہ گجرات میں ہیں۔

سے کے ہاتھوں میں ہوگا اور وہ علمی تحقیقات سے نابلد ہونے کے باعث اس فن کی تکمیل میں علوم نظری کی امداد نہیں لے سکتے تھے۔ اسلیے جہاں تک ہاتھ کی صفائی کا تعلق ہے ان تصویروں میں کوئی عیب نہیں مگر سائنس کے لحاظ سے ان میں بشیتر نقائص موجود ہیں۔ مصوری میں سائنس کی واقفیت ضروری ہے اگر علمی واقفیت نہ ہو تو عملی ہی سہی۔ زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہے کہ اہل چین کی تصویریں بے ڈول اور بے ڈھنگم کیوں ہوتی ہیں؟ اسکی وجہ یہی ہے کہ مصور صورتوں کے قوانین کا لحاظ بالکل نہیں رکھتے۔ تصویر اُتارتے وقت مختلف چیزوں کے فاصلوں اور اُنکی چھوٹائی بڑائی کا خیال واجبی طور پر نہیں رکھتے اور اور تصویر کے روشن اور تاریک حصہ کو باقاعدہ رنگ و روغن لگانے کے اصول سے ناواقف ہوتے ہیں بچے کی بنائی ہوئی تصویر میں اور کیا عیب ہوتا ہے سوا اسکے کہ اُسی طرح ان میں بھی اصلیت نہیں ہوتی تصویر میں اصلیت کا موجود نہ ہونا زیادہ تر اس قاعدہ کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ مختلف چیزوں کی صورتیں مختلف صورتوں میں مختلف ہوتی ہیں۔

ہر ایک مصور اس بات کو تسلیم کرے گا کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ خاص خاص حالتوں میں کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہیے۔ اُس وقت تک ان صورتوں میں اکثر تمیز نہیں ہوسکتی اور اس امر کو معلوم کرنا کہ کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہیے۔ بجائے خود صورتوں کے سائنس یا علم الصور سے واقفیت پیدا کرنا ہے۔ مسٹر جے ونس اگرچہ ہوشیار مصور تھا مگر سائنس کی ناواقفیت کی وجہ سے تصویر بناتے وقت جالی دار کھڑکی کے سائے کو سامنے کی دیوار پر صاف طور پر نمایاں لکیروں میں ظاہر کرتا تھا۔ اگر اُسکو سائے کے قانون سے واقفیت ہوتی کہ سایہ روشنی کے ساتھ نامعلوم طور پر کس طرح مل جاتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتا۔

یہی بات نہیں کہ ہر ایک صاحب فن اپنا کام اُس وقت تک صحیح طور پر نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اُن چیزوں کے قوانین کو نہ سمجھ لے جنکو وہ بناتا ہے۔ بلکہ اُسکو یہ بھی سمجھ لینا لازم ہے کہ اُسکی صنعت کی مختلف خصوصیتوں کا اثر ناظرین کے دلوں پر کیا پڑے گا؟ اور یہ سوال علم النفس سے تعلق رکھتا ہے کسی صنعت کا اثر جو دلپذیر ہوتا ہے وہ صریحاً ان لوگوں کی روحانی فطرت پر منحصر ہے جنکے سامنے اس صنعت کو پیش کیا جاتا ہے۔ سائنس ان اصول کو پوری طرح اُسوقت تک نہیں سمجھ سکتا اور نہ انکو استعمال کرسکتا ہے جب تک کہ اس بات کو نہ سمجھ لے کہ وہ اصول قوانین نفس ناطقہ سے کس طرح منضبط ہوتے ہیں۔ یہ سوال کرنا

کہ آیا فلاں تصویر کی بناوٹ عمدہ ہے یا نہیں؟ اصل میں اس بات کا سوال کرنا ہے کہ ناظرین کے ادراکات وتاثرات پر اُس تصویر کا کیا اثر پڑتا ہے۔

ابھی ہندوستان اس فن لطیفہ کی ترقی سے کوسوں دُور ہے۔ نہ ہم لوگوں کو تصویر کے اچھے ہونے کا کچھ احساس ہوتا ہے اور نہ خراب ہونے پر کچھ رنج۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم میں ابھی وہ بات ہی پیدا نہیں ہوئی کہ تمیز کر سکیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملکی بھائی اس فن میں کب درجۂ کمال پر پہونچتے ہیں اور حقیقی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

اس فن کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے تمدن کا ایک عضو معطل ہو گیا ہے کیونکہ کُل فنون تمدن کے پھول ہیں۔ اگر ایک بھی ان میں بیکار ہو تو تمدن کی راہِ ترقی ممکن نہیں۔

محمد عبدالحمید (آرٹسٹ) ڈرائنگ ماسٹر ضلع بٹیر (دکن)

غزل

من اگر از کار رستم این بمن آزار نیست — گر بحق کارے نداری با تو از من کار نیست
خود فروشاں را چو خواہی کار با رنداں مدار — کاندریں رہ خود فروشی طرۂ دستار نیست
زعم خود بینی اگر با تو حجابِ اکبر است — سر بجیبِ انفعال آوردنم درکار نیست
طوق لعنت خندہ زد بر حق نیوشیہاے من — گر ازیں لعنت نالم لعنتِ پندار نیست
کردگارا ہر کارے کافریدستی مرا — کارِ من با من سپار و غیر از انم کار نیست
سبکہ خامم پختگی بخش و شکیبائی بدہ — آنچہ دشوار است با ما مر ترا دشوار نیست
رائیگاں عمر عزیزم رفت و ہیہم می رود — تو سرِ کارم بگیر در کس بمن سر کار نیست
محو کردارم ولے کردار من شد رائیگاں — آنچہ میخواہند از من نا ہم آں کردار نیست

غم مخور آزاد از جور و درنگیہاے خلق
کارِ کرنگاں بیک گی شدن بیکار نیست

آزاد - ادبی نقاد "پیام اُمید"

قبائے رنگین

(سلسلۂ الناظر بابت ماہ نومبر ۱۹۱۶ء)

اس مضمون کا پہلا نمبر نومبر ۱۹۱۵ء میں اور دوسرا نمبر اسکے پورے ایک سال بعد نومبر ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا - اور اب تیسرا نمبر ایک مہینہ اوپر ایک سال کے بعد نذر ناظرین کیا جاتا ہے ۔ اس تعویق و تاخیر کی ذمہ دار پہلی بار تو ایڈیٹر الناظر کی علالت ہوئی تھی مگر اس دفعہ خود لائق مضمون نگار کی بعض ذاتی مجبوریاں سبب قرار دی جا سکتی ہیں - بہرحال چونکہ مولوی جواد علی خاں صاحب کے طرز تحریر میں ایک خاص دلکشی ہے اور قصہ بھی نہایت ہی پُرلطف ہے اسلیے یقین ہے کہ اسکے اجزا کا جستہ جستہ اتنے فصل سے شایع ہونا چنداں ناگوار نہ معلوم ہوگا - اسکے بعد کا نمبر چونکہ دفتر میں آچکا ہے اسلیے جلد شایع کیا جائیگا - اور ہمیں امید ہے کہ آیندہ اجزا بھی اس قدر دیر میں نہ وصول ہوں گے - ایڈیٹر

(۲۵)

محمد ابن حنفیہ کا خیمہ گاہ

گجا وہ کسا گیا - اور دونوں وہاں سے روانہ ہوے - آبادی بائیں جانب چھوٹ گئی - تھوڑی دُور چل کر ایک ٹیکرا پڑا جسپر یہ دونوں چڑھے - جب اُسکی چوٹی پر پہونچے تو ایک سمت آگ کی روشنی نظر آئی - بلال نے جوں ہی روشنی دیکھی خوش ہوکر کہا "لیجیے ہم پہونچ گئے - جہاں روشنی آپ دیکھ رہے ہیں وہی ابن حنفیہ کا خیمہ گاہ ہے - ہاں! اب یہ فرمایئے کہ اسوقت دارالاضیافت (مہمان خانہ) میں ٹھہریں یا امیر کے یہاں چلیں - اور اُنکو اطلاع کردیں؟"

حسن - میرے خیال میں اسوقت دارالاضیافت میں چل کر ٹھہرنا مناسب ہوگا - صبح کو اُنکے یہاں چلیں گے"

بلال - جیسی رائے ہو! بہتر ہے - اسوقت مہمان خانے میں ٹھہر جایئے آپ فراغت سے آرام کیجیے گا اور میں گھوم پھر کر کوئی بندوبست صبح کیلیے کر رکھوں گا"

حسن نے اسکے اس اطاعت مندانہ جواب و حسن عمل پر آفریں کہی - اتنے میں دونوں خیمہ گاہ کے قریب پہونچ گئے - جہاں کثیر التعداد خیمے اور چھولداریاں بلا کسی نظام و ترتیب کے نصب تھیں -

اور بیچوں بیچ میں ایک بڑا خیمہ استادہ تھا جسکی رفعت کہہ رہی تھی کہ امیر کی فرودگاہ یہی ہے۔ چونکہ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اسلیے ایک مقام پر کھڑے ہوکر بلال نے چار جانب نظر تجسس خیمۂ مہماناں کے لیے ڈالی۔ اور ایک خیمہ کو سب سے علٰحدہ نصب دیکھکر اُس نے خیال کیا کہ ہونہو یہی دار الاضیاف ہے جہاں سے شعلہاے آتش بلند ہوکر مہمانوں کو دعوت قیام و طعام بھی دیتے تھے اور پھر مشعلِ راہ بنکر اُنکو اس کنار امن و آسایش میں لے آتے تھے۔ اس نشان پر یہ دونوں اُسی سمت چلے اور جب قریب اُس خیمے کے پہونچے تو کچھ آوازیں انکے کان میں آئیں جس سے یہ سمجھے کہ لوگ ابھی جاگ رہے ہیں۔ جب یہ اور قریب گئے تو انکی آہٹ پاکر ایک خادم نکلا اور اُس نے استفسار حال کیا۔ بعد ازاں خیمۂ مہماناں کے ایک حصہ میں انھیں لیجا کر ٹھہرایا۔

حسن کو ٹھہرا کر بلال باہر نکلا اور اونٹوں کے باندھنے کی فکر میں تھا کہ ایک اور خادم نے اُنکی اونٹوں کے تھان تک رہبری کی جہاں چارہ بھی اکھٹا تھا۔ اس انتظام کے بعد بلال واپس آیا تو یہاں کے خدام کھانا وغیرہ لا چکے تھے۔ دونوں نے فراغت سے کھانا کھایا پھر بلال نے حسن کے لیے بستر بچھا دیا اور کہا "آپ آرام کریں، میں تھوڑی دیر ادھر اُدھر کا چکر لگاؤں گا اور واپس آکر در خیمہ پر سو رہوں گا۔ اثناً کوئی ضرورت لاحق ہو تو مجکو آواز دیجیے گا میں حاضر ہو جاؤنگا۔"

بوجہ کسل راہ کے دل فکرمند تھا حسن کو لیٹنے ہی کی دیر تھی کہ وہ غافل تھا۔ مگر چونکہ گرد و پیش کے حالات سے دل فکرمند تھا اسلیے عالم رؤیا میں بھی اُسی قسم کے خیالات اُسکے سامنے آئے۔ اُسکو خواب میں نظر آیا کہ وہ مکہ میں جب اپنی سفارت کی تکمیل کے لیے گیا اُسکے بعد ہی حجاج کا فاتحانہ داخلہ مکہ میں ہوا اور لشکریوں کے ہاتھ وہ خود بھی اسیران جنگ میں گرفتار ہوا اور پا بہ زنجیر کرکے حجاج کے سامنے لایا گیا۔ وہاں ایک شور و غل اور چیخ پکار قیدیوں کی ہے۔" اسی گھبراہٹ میں یکایک اُسکی آنکھ کھل گئی۔ بیتاب ہوکر اُس نے لاحول پڑھی۔ دماغ میں خواب و خیال کی تاویل بھی آئی مگر واہمہ نے بدفالی بھی لی۔ اب اسکے بعد جو نیند اُچٹتی ہے تو ہزار ہزار کروٹیں بدلتا ہے مگر کوسوں نیند کا پتہ نہیں۔ خیالات ہیں کہ صورت معاملہ کے صدہا پہلو اچھے برے لاکر دکھاتے ہیں اور پھر پلٹ جاتے ہیں آخر اس سے اُکتا کر وہ اٹھ بیٹھا اور بلال کو آواز دی

۱۵ اہل عرب کا دستور تھا کہ رات کو اپنے مسکنوں میں آگ روشن کردیا کرتے تھے جو دہکتی رہتی تھی اور اُسکے شعلے بلند ہوکر دور دور کے راہ روں کو آبادی و اقامت قبیلہ کی خبر دیتے تھے جس سے بھولے بھٹکے ہوؤں کو مسکن انسانی کا پتہ لگتا تھا۔

گر کچھ جواب نہ ملا۔ اُٹھا اور اُٹھکر دیکھا۔ دروازے پر بلال نہ تھا۔ تاروں پر نظر ڈالی تو دو پہر کے قریب رات گذر چکی تھی۔ بلال کا نہ ہونا موجبِ تشویش تھا۔ چادر کو سردی کے بچاؤ کے لیے سر سے لپیٹا اور خیمہ کے آس پاس دیکھنے لگا کہ شاید کہیں اور لیٹ رہا ہو۔

(۲۶)

مشتبہ الحال نووارد

ہنوز یہ تلاش سے فارغ نہ ہوا تھا کہ کسی طرف کچھ آہٹ معلوم ہوئی غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو اونٹ اسی طرف آ رہے ہیں۔ جن میں سے ایک پر کوئی سوار ہے اور دوسرے پر محمل کی وضع کی کوئی شے رکھی ہوئی ہے۔ اور اسکی مہار ایک شخص کے ہاتھ میں ہے جو آگے آگے آ رہا ہے۔ چونکہ شبِ تاریک تھی اسلیے اُس نے ان نوواردوں کے متعلق اپنے دل میں یہ رائے قائم کی کہ مسافر ہیں شب گذاری کی غرض سے منزل کرنے آتے ہوں گے۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ مکہ کے اطراف میں اسوقت جو تلاطم برپا ہے اُسے دیکھتے ہوے ان لوگوں نے بڑی جسارت کی کہ مکہ کی دیواروں کے نیچے بلا خوف وخطر مع اہل وعیال کے چلے آئے۔ اپنے دل سے یہی باتیں کرتا ہوا خیمے میں واپس آیا۔ ہنوز نوواردوں کی بابت اُسکا سلسلہ خیال منقطع نہ ہوا تھا کہ قناتِ خیمہ کی دراز سے اُس نے دیکھا، دار الاضیاف کے قریب اونٹ آکر ٹھہرے، شتر سوار اُترا گو اُسکے چہرے پر شملہ بطورِ سربند کے لپٹا ہوا تھا۔ اور عبا سر سے پاؤں تک جسم پر لفافہ تھی۔ اونٹ سے اُتر کر وہ کوتاہ قامت ملفوف انسان جب خیام الاضیاف کی طرف چلا تو اُسکے خادم نے بڑھ کے اُس سے سوال کیا "میں ٹھہرا رہوں یا ہمراہ چلوں؟" دھیمی آواز میں اُسے جواب ملا "نہیں تم یہیں ٹھہرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ "شئے محمول" مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے لہذا اسکی حفاظت مقدم ہے"

خادم ۔ "خیر یہاں تک چلکر صرف اتنا تو معلوم کروں کہ آپ کس خیمہ میں اقامت فرماتے ہیں"

مولیٰ "میں اقامت نہ کروں گا بلکہ ابھی اُلٹے پیروں واپس آتا ہوں تم ٹھہرو۔ مگر شاید بوجہ کسل کے تم پر غنودگی طاری ہو تو غفلت میں نہ آ جانا" یہ کہکر وہ چلا گیا۔

حسن روزنِ قنات سے یہ سب دیکھتا اور سنتا رہا۔ مگر غلاف پوش شئے محمولہ جو وضع سے محمل معلوم ہوتی تھی اور قیاس ہوتا تھا کہ اس میں کوئی پردہ نشین خاتون ہوگی۔ اُسکا راز ابتک نہ کھلا تھا کیونکہ وجود انسانی حس وحرکت واحتیاجات سے خالی نہیں ہوسکتا۔ مگر یہاں آثارِ حیات میں سے

کسی اثر کا پتہ نہیں چلتا تھا - اور مزید تاکید حفاظت اہتمام امر کا پتہ دیتی تھی - اسی وجہ سے حسن کی توجہ بھی اس حقیقت امر کے معلوم کرنے کی طرف جتنا عرصہ گذرتا جاتا تھا مائل ہوتی جاتی تھی - نووارد خادم اپنے آقا کے جاتے ہی محمل والے اونٹ کی ٹیک دیکر بیٹھ گیا - بیٹھتے ہی غافل تھا - اور اس زور شور سے خراٹے لینے لگا گویا دو وحشی جانور باہم لڑ رہے ہیں -

تفحص احوال کی بابت حسن نے خیال کیا کہ جگنے پر اسی خادم سے استفسار کیا جائے - مگر بلال تو تو کچھ ہم جنسی کی وجہ سے اور اپنی ذکاوت سے نہایت خوبی کے ساتھ پتہ لگا لیتا - اس خیال سے بلال کی ٹوہ میں وہ پھر خیمے سے نکل کر چہل قدمی کرنے لگا - مگر جب کہیں اُسکا سراغ نہ ملا تو پھر اپنے بستر پر واپس آیا اور گوناگوں افکار و توہمات کا ابر غلیظ اُسکی دماغی فضا پر چھا گیا -

(۴۷)

معمہ حل ہوگیا

ان افکار سے ابھی اُسکا دماغ خالی نہ ہوا تھا کہ دروازے پر کسی کی آنے کی آہٹ معلوم ہوئی - فوراً بلال کا خیال آیا - مگر آواز اس وجہ سے نہ دی کہ شاید کوئی اور ہو - بلکہ اپنی جگہ سے اُٹھکر دروازہ پر آیا اور دیکھا تو دروازے پر بلال لیٹا ہوا تھا - جو حسن کی چاپ پر اُٹھ بیٹھا اور پوچھنے لگا "آپ کیوں جاگ پڑے؟ ابھی تو رات باقی ہے"-

حسن (پشت خیمہ کی طرف اشارہ کرکے ایک سونے والے کے خیال سے آہستہ بولنے کی ہدایت کرکے) مجھے جگے ہوے عرصہ ہوا - تمکو دیکھا تم بھی نہ ملے - اسلیے فکر سی ہوگئی تھی - ابھی دو شتر سوار آکر اس خیمہ کی پشت پر ٹھہرے ہیں - اُن میں سے ایک جو بلحاظ حالت آقا معلوم ہوتا ہے، از سرتا پا ملفوف اور نہایت گوش بر آواز (چوکنا) ہے وہ اُترتے ہی کسی طرف چلا گیا ہے - اور دوسرا جو اُسکا خادم ہے پڑا سو رہا ہے - میرے خیال میں ضرور انکا تعلق کچھ پیچیدہ اغراض سے معلوم ہوتا ہے - اس معمے کو تمہارے سوا کون ہوگا جو حل کریگا"-

بلال - بالراس والعین (بسرو چشم) مگر یہ تو فرمائیے اُنکی کون سی بات مشتبہ و مشکوک ہے"؟

حسن نے اُسکا ہاتھ پکڑا اور خیمے کے اندر لیجا کر اُسے اُونٹ - غلاف پوش محمل وغیرہ دکھایا - ملفوف انسان کے اُترتے ہی چلے جانے کا حال کہا اور اُسکے انداز و اطوار میں جو وجوہ اشتباہ و

تشکیک کے تھے وہ بیان کیے۔ پھر اپنا خواب کا حال بیان کیا اور کہا کہ اسکی کوئی معقول تعبیر ذہن میں نہیں آتی۔ نہ جگنے کے بعد ہی ان لوگوں کے آنے سے کوئی تعلق وسلسلہ ظاہر ہوتا ہے"۔

بلال "یہ معمولی بات ہے۔ کوئی تردد کا مقام نہیں" یہ کہکر وہ باہر نکلا۔ اور پیرو بانے ہوے اونٹوں کے پاس پہونچا۔ حسن نے روزنِ قنات سے دیکھا کہ بلال خادمِ خفتہ کے چہرے کو گھور رہا ہے۔ گھورنے کے بعد وہ فوراً پچھلے پیروں پلٹ پڑا۔ خیمہ میں آیا تو حسن نے اُس سے پوچھا "تم نے جگا کر اُس سے کچھ پوچھا نہیں؟"

بلال - کیا ضرورت تھی۔ حضور میں اُس سے اور اُسکے تمام حالات سے صورت دیکھتے ہی واقف ہوگیا

حسن - یہ کیسے؟

بلال - اب ذرا دم لے لوں تو عرض کروں۔ اپنی اسوقت تک کی سرگذشت جب بیان کروں گا اُسی سلسلے میں یہ اسرار بھی منکشف ہو جائیں گے"۔

(چندے توقف کرکے اُس نے یوں بیان کرنا شروع کیا) "جب آپ سے اجازت لیکر میں خیمے سے نکلا تو آتے ہی سو رہا۔ تھوڑی دیر میں سوتے سے آنکھ کھلی تو صبح کی بابت فکر دامنگیر ہوئی کہ امیر کے یہاں اگر کوئی انتظام راہداری کا نہ ہوا تو داخلۂ شہر کی کوئی صورت نہ نکل سکے گی اور کل کا روز بیکار جائے گا۔ اسکے ساتھ ہی یہ خیال تھا کہ اگر اپنے آنے کی اصلی غرض و غایت کا اظہار پایا گیا تو بھی اچھا نتیجہ نکلنے کی امید نہیں۔ بس اسی رات میں اُن تدابیر پر حاوی ہو جانا چاہیے جن سے جلد سے جلد مقصد برآری ہو سکے۔ اس خیال کے بعد میں اُٹھا کہ امیر کے ایک ندیم خاص سے چل کر ملوں جنھیں میں زمانۂ قیام مدینہ میں جانتا تھا۔ اور میرے ساتھ وہ لطف و عنایات فرماتے تھے۔ خیر! میں اطلاع کراکے اُنکی خدمت میں حاضر ہوا اُن کا خیمہ امیر کے خیمہ سے ملا ہوا تھا اور دونوں خیموں میں ایک خاص درمیانی دروازہ بھی تھا۔ میرے جانے پر اُنھوں نے اظہارِ خوشنودی فرمایا اور محبت سے پیش آئے۔ قیام و طعام اور آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک ضرورت ہے اندرون شہر جانے کے لیے راہداری درکار ہے۔ اور اُسکے انصرام کے لیے امیر کے حضور تک ذریعہ کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر اُنھوں نے اطمینان دلایا۔ اور مجھے بٹھاکر پچھلے حالات اور جو خاص خاص واقعات تھے پوچھنے لگے۔ اس قصہ میں بڑا وقت گذر گیا۔ میں نے اجازت چاہی مگر اصرار سے بٹھایا۔

دفعۃً کوئی نووارد خیمے کی طرف آتا ہوا معلوم ہوا اُنھوں نے خود اُٹھکر دیکھا اور اک نئے آدمی کو موجود دیکھکر پوچھا "کون ہے؟" نووارد نے کہا "میں عرفجہ" - میں اسکے نام سے نا آشنا نہ تھا -

معاً اسم کے مسمّیٰ کی طرف جو دارالامارۃ میں اکثر نظر آیا کرتا تھا اُسکے اور عامل مدینہ کے بیں دتعلقات کی طرف میرا ذہن منتقل ہوگیا اس انتقال ذہنی کی تحقیق کے لیے میں خیمہ سے نکل آیا وہاں جو پیکر انسانی موجود تھا اُسکا چہرہ ڈھاٹے سے اور جسم عبا سے چھپا ہوا تھا مگر قد و قامت اور لب و لہجہ سے یہ تحقیق ہوگیا کہ بے شک وہی ہے -

یہ سن کر حسن نے بھی نووارد اور نیز غور مسافر کے طرز کلام، انداز و طریق پر غور جو کیا تو یہ بات یقین کے درجے پر پہونچ گئی کہ ضرور عرفجہ ہی ہے جو پس پشت آکر اُترا ہے - اسکے بعد تخیلات کا ورود اس کے دماغ پر شروع ہوا -

"کیا ایسی ضرورت عرفجہ کو لاحق ہوئی جو میرے نقش قدم پر میرا پیچھا کیے ہوے پہونچ گیا - کہیں ایسا تو نہیں کہ ابن حنفیہ سے میری وسیلہ طلبی کا حال اُسکو معلوم ہوا ہو اور وہ رخنہ اندازی کے لیے آیا ہو - مگر اوّل تو میرے صحیح و سالم ہونے اور روانگی کا حال بجز سلیمان، اُنکے والد اور اُنکے خادم بلال کے جو میرے ہمراہ ہے کسی کو معلوم ہی نہیں تھا - دوسرے امیر کے وسیلہ کا خیال یہاں آکر ہوا ہے - اسکی خبر پہلے سے اُسکے فرشتوں کو بھی نہیں ہوسکتی تھی - نہیں! میرا خیال و وہم غلط ہے - میری ذات سے اُسکے آنے کی غرض و غایت کا کوئی علاقہ نہیں"

اسکے بعد اُسکا ذہن محمل کی طرف رجوع ہوا "اگر اس محمل میں کوئی پردہ نشیں خاتون ہے تو عرفجہ کے گھر میں بجز سمیّہ کے اور کوئی عورت تو ہے نہیں - پھر کیا اس محمل میں سمیّہ ہے؟ یہ خیال کرتے ہی اُسکے دل و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی - شرائین میں گردشِ خون تیز ہوگئی - اور چہرہ عنوانِ ضمیر بن گیا -

دلے می باید و صبرے کہ آرد تابِ دیدارش   **فغانی** گر دلے داری تو باش اینجا کہ من رفتم

بلال منتظر تھا کہ اتنا رہ پلٹنے تو سلسلۂ کلام کو پورا کرے آخر حسن نے اُس سے سوال کیا "تم کو بھی کچھ معلوم ہوا کہ کس غرض سے یہ حضرت تشریف لائے ہیں؟"

بلال - بالکل اسکا پتہ نہیں چلا - جب میں خیمہ سے باہر نکلا تو اُس سے اور صاحبِ خیمہ سے کچھ سرگوشی ہورہی

تھی - مجھے نکلتا ہوا دیکھ کر اُنھوں نے خود ہی فرمایا " اچھا اب رات زیادہ آگئی ہے اب انشاءاللہ صبح کو ملاقات ہوگی "۔ اسکے بعد میں وہیں سے سلام کرکے چلا آیا۔ صبح کی طلب سے مجھے کار متعلقہ کی بابت پورا اطمینان ہوگیا کہ اب نہ فراموشی کی امید ہے نہ میری حاضری تقاضائے زشت کا موجب ہوگی

حسن - اچھا یہ مرد خفتہ کون ہے؟

بلال - یہ قنبر، عرفجہ کا غلام ہے - جو مدینے میں اپنی بد اطواری اور چھچھورے پن میں شہرت عام رکھتا ہے۔

حسن - اچھا - یہ محمل نما شے کیا ہے؟

بلال - حضور میرے نزدیک تو یہ محمل نہیں ہے بلکہ اسی شکل کا کوئی غلاف پوش کٹہرا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکے اندر کوئی عورت ہو۔ گر عرفجہ کے گھر میں اور کون عورت ہوگی بجز اُسکی بیٹی سمیہ کے -

(۴۸)

سمیہ کا نام حسن کے جذبات شوق کے لیے ایک تازیانہ تھا۔ مگر چونکہ بلال اُسکے واردات قلبی پر اطلاع نہیں رکھتا تھا لہذا اپنی طبیعت کو قابو میں رکھکر اُس نے پوچھا۔ کیا ایسے نازک وقت میں اُس سے اُسکی امید ہوسکتی ہے کہ اپنی بیٹی کو یہاں ساتھ لایا ہو "

بلال - ہرگز نہیں یہ خیال ہو سکتا - اور بفرض محال لاتا تو اُسکو یوں تنہا چھوڑ کے غائب نہ ہوجاتا علاوہ اسکے اگر کوئی ذی روح شے اس میں ہوتی تو اُسے دم سادھ کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی- کچھ تو حس و حرکت ہوتی؟ یہ بھی گمان نہیں ہو سکتا کہ شخص موجود سو رہا ہو۔ کیونکہ اس میں اتنی گنجایش کہاں کہ آدمی کس کسکر بیٹھنے کے سوا ہاتھ پیر بھی ہلا سکے "۔

بہرحال حسن کی یہ عمیق فکر گو نہ دفع ہوگئی کہ اُسکی پری جمال معشوقہ اُسکی قابل توجہ حالت سے بالکل غیر ملتفت یہاں موجود ہے - مگر پھر کیا ہے؟ اسکی کھٹک دل میں باقی تھی کہ خود بخود بلال ایک گہری فکر سے چونک کر تبسم کے ساتھ کہنے لگا " حضور! نہ یہ گہوارہ ہے نہ محمل، بلکہ یقیناً یہ وہی سر مکنون ہے جو عرفجہ نے اہتمام اخفا کے ساتھ اپنے گھر کے ایک خلوت خانہ میں تصنیف کرکے رکھ چھوڑا تھا جسکی گھر والوں تک کو اطلاع نہ تھی نہ وہ لوگ مارے ڈر کے پتہ لگا سکتے ہوں گے - البتہ بعض شوخ طبع نوجوانان مدینہ اسکی ٹوہ میں رہا کرتے تھے کہ اس طلسم سے آگاہ ہوں لیکن اصل راز پر اطلاع حاصل کر سکتے۔ کیا قدرت تھی - عرفجہ کی فرتوتیت پھر کہاں رہتی -

یہ واقعہ سنکر حسن کے دل میں بھی ولولۂ آگاہی پیدا ہوا - مگر عرفجہ کے سبب درد کی تشویش ایسی تھی جس نے کسی طرف اُسکو متوجہ نہ ہونے دیا - قدرے سکوت کے بعد اُسنے بلال سے رائے پوچھی "امیر کے یہاں کس وقت چلنا مناسب ہوگا ؟" اُس نے کہا " بعد الفجر" اسکے بعد وہ خیمہ میں آکر لیٹ رہا اور صبح تک کروٹیں لیا کیا - بعد طلوع آفتاب دونوں خیمے سے نکل کر امیر کے یہاں چلے تو حسن نے پہلے پشت خیمہ کی طرف جا کر دیکھا - وہاں میدان صاف تھا - خیال کیا شاید روانہ ہوگئے -

بوجہ بلندی مقام یہاں سے پورے کیمپ اور وادی کا نقشہ پیش نظر تھا - ایک خوشنما شہر کے نمونے کی چھوٹی سی آبادی تھی - خیموں کی قطاروں سے الگ خالی میدانوں میں کہیں اونٹ بندھے تھے کسی مقام پر گھوڑوں کی قطاریں تھیں - لوگ اُنکی مالش وصفائی کر رہے تھے اور لشکری اپنی اپنی فرودگاہوں میں مصروف تھے - یہ سب سیر وتماشے دیکھتے ہوئے یہ دونوں امیر کی بارگاہ تک پہونچے - یہاں متعدد حاجب و بواب پہروں پر تھے - خیمہ کے دروازہ پر چلمن اور اُسکے اوپر پردہ تھا - جس سے امیر کی مصروفیت اور کار خاص میں ہونے کا اشارہ پایا جاتا تھا - یہ دونوں ادھر سے گذرتے ہوئے اپنے معزز میزبان کے خیمے میں چلے گئے - جس نے نہایت خندہ روئی کے ساتھ اُنکی پذیرائی کی - بٹھایا اور آہستہ سے مزاج پرسی کرکے سکوت کی استدعا کی امیر کا خیمہ چونکہ اس سے ملا ہوا تھا اسلیے دونوں سے یہاں بیٹھے بیٹھے اُسکے اندر کے حالات معلوم ہوسکتے تھے چونکہ حسن بھی قنات سے بالکل متصل بیٹھا تھا - اس نے دیکھا کہ مسند پر امیر جلوہ فرما ہیں اُنکے سامنے ایک شخص اور بیٹھا ہے جسکو حسن نے دیکھکر پہچانا کہ عرفجہ ہے - اور پہچانتے ہی پھر اُسکے افکار تازہ ہوگئے - اُس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ وقت فرصت ہے، تفکرات لاحقہ کا ایک حد تک علاج یہاں ہوسکتا ہے" مگر ساتھ ہی تہذیب ومتانت نے اُسکا دامن تھاما اور یہ خیال کرکے کہ عرفجہ و امیر کی گفتگو کی سماعت شاید صاحب خیمہ کے مزاج کے خلاف ہو - لہذا آہستگی کے ساتھ اُس نے کسی دوسرے مناسب وقت میں حاضری کا اظہار کرکے اُٹھنے کا قصد کیا مگر صاحب خیمہ نے بٹھایا اور کہنے لگا "آپ تشریف رکھیں - چونکہ مجھے اس شخص کی رازدارانہ گفتگو سننے کا اشتیاق ہے لہذا چند لمحوں کے لیے مجھے معاف کریں - کیونکہ اس نے ظاہر کیا ہے کہ امیر سے ایک ایسے اہم مسئلے میں گفتگو کرنی ہے، اور چونکہ یہ ایک بڑا فتین شخص ہے اسلیے اسکی سرگوشیوں کو سننا اخلاقاً معیوب بھی نہیں ہے"

یہ الفاظ حسن کی آرزو کے عین مطابق تھے - اب اُس نے بباطن امیر اور عرفجہ کے مکالمہ پر جو کان لگائے تو عرفجہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا

" یا حضرت! بعد حسنین علیہما السلام کے امامت آپکا منصب ہے کیا بلحاظ عظمتِ نسب کے اور کیا بلحاظ اجتماع فضائل و محاسن و قبولیت عامہ کے - وہ کون ہے جسے آپ پر تفوق حاصل ہو - بنی امیہ غاصب و ناحق کوش ہیں "

امیر محمد بن حنفیہ بجائے اسکے کہ کچھ فرماتے بالکل خاموش تھے - اس خاموشی کو عرفجہ رضا سمجھکر پھر یوں گویا ہوا " امام وقت اس امر کے ماہر و عالم ہیں کہ مختار نے آغاز کار میں حضرت ہی کی امامت علی الحق کی دعوت و تبلیغ شروع کی مگر بعد ازاں اس جادۂ حق سے اُنھوں نے انحراف کیا - اِدھر خود غرضی کے ردّے قائم شدہ تعمیر پر رکھے جانے لگے اُدھر اُسکا انہدام شروع ہو گیا - حتیٰ کہ بیخ و بُن سے اُسکی بنیاد اُکھڑ رہی - مگر جس ذریعہ سے اُنھوں نے دعوتِ حق کا کام شروع کیا تھا وہ ایک نہایت بہتر ذریعہ تھا بشرطیکہ اُسکے لیے ایک ایسے ہی شخص کا انتخاب بھی کیا جاتا - جو اُسکا اہل ہوتا - اور جس کے حُسن تلقین سے خلق اللہ کو حسناتِ دنیا و آخرت حاصل ہوتیں "

(۴۹)

امیر اب تک خاموش تھے - مسند کے نقش و نگار پر اُنکی نظر گڑی ہوئی تھی جو کسی اہم معاملہ میں خوض کا پتہ دیتی تھی - عرفجہ نے بلا طلبِ التفات مزید اپنے سلسلہ سخن کو پھر یوں شروع کیا " آپ پر مخفی نہیں کہ بنی امیہ، عبداللہ ابن زبیر سے دست و گریباں ہیں - اُنکی تمام فوجیں حصار مکہ پر جمی ہیں - عراق خالی ہے - ایک مبلغ جا کر وہاں کے عامہ خلائق کو آپ کی نسبت سے ارشاد و تبلیغ کر کے مطیع و منقاد بنا سکتا ہے "

امیر نے سر اُٹھا کر تیز لہجہ میں فرمایا " ایں! عراق! جسکی بیوفائی کے نقوش ہمارے لوحِ دل پر کندہ ہیں - کیا باپ اور بھائی کی مظلومانہ قربانیاں دیکھ کر بھی مجھ ایسا شخص اس واقعیت کو فراموش کر سکتا ہے؟"

عجزِ لاجوابی کی انفعالی زردی عرفجہ کے چہرہ پر چھا گئی مگر بلا ارتجال اُس حاضر جواب نے پہلو بدلکر عرض کیا " اُن بدکرداریوں کے جو اسباب و موجبات تھے اُنکا مطلق خطرہ موجودہ حالت میں

نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان معاملات پر بہت غور کر لیا ہے۔ واللہ صورت حال پکار پکار کر کہ رہی ہے کہ ظہور حق کا وقت آگیا ہے، کسر ہے تو صرف تحریف و تبلیغ کی (فیضی)

بادہ در جوش است و یاراں منتظر ساقیا خذ ما صفا دع ما کدر

امیر۔ اچھا تمھاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس کارِ تبلیغ کو خالص و مخلص ہو کر حال و صدق مقال کے ساتھ ادا کر سکے؟"

عرفجہ۔ اُس شخصِ مناسب کا انتخاب حضور خود فرمائیں گے۔ مرحلۂ اُولیٰ یہ ہے کہ حضرت ا نشأ مبارک کا اظہار عقیدتمندوں پر فرمائیں"۔

امیر۔ تم بھی تو کسی ایک ایسے شخص کا نام لو۔ میری دانست میں تو جو لوگ اسکے اہل ہیں وہ قریب نہ آئیں گے اور جو کرنا چاہتے ہیں وہ اہل نہیں ہیں"۔

اب عرفجہ اس چکر میں تھا کہ اگر صاف صاف کہتا ہے تو بات بگڑ جائے گی، خود غرضی ٹھہر گی۔ گر ذہن بلیغ نے فوراً مذہبی رنگ کا جواب تراش کر اُسکو دیا اور اُس نے کہا "یہ ایک منصبِ آئی ہے۔ لہذا اسکا علم حضرت کو بواسطۂ الہام والقاء کے ہوگا"۔

امیر۔ بالفرض تلقین الٰہی نے انحلال نہ فرمایا؟"

اسکے جواب میں پھر اُسے گونہ پیچ و تاب لاحق ہوا۔ اور آخر جب کوئی جواب نہ بن آیا تو اُسے کہنا پڑا کہ "انتخابِ مبلغ کی بابت القاے آسمانی نہ ہونے کی صورت میں آپ صاحبؔ کسی کو مقرر فرما سکتے ہیں"۔

امیر (استعجاب کے لہجہ میں) کرسی کیسی؟

بجاے جواب دینے کے عرفجہ اُٹھا اور خیمہ کے دروازہ سے سر نکال کر قنبر کو آواز دی اور پھر واپس آکر خود نمائی کے انداز سے بیٹھا ہی تھا کہ قنبر اُسی محل نماشئے کو (جسکی بابت حسن کا تنکی مزاج اسوقت تک مطمئن نہ ہوا تھا) لیے ہوے خیمہ میں داخل ہوا اور عرفجہ کے آگے رکھکر واپس گیا۔

بن حنفیہ نے اس ماجراے عجیب کو حیرت سے دیکھکر فرمایا "یہ کیا ہے؟"

عرفجہ۔ "یہ تابوتِ عہد و میثاق ہے"۔ یہ کہتے ہوے اُس نے جیب سے کُنجی نکالی اُسکا پردہ ہٹایا۔ اور کُھٹکا کُنجی سے کھولا اور کٹھرے کے اندر سے منڈھی ہوئی ایک شئے برآمد کی جو

حریر و دیبائے منقش کے غلافوں سے چھپا رہی تھی۔ ان غلافوں کو اُتارا تو اندر سے ایک کرسی نکلی جسکی لکڑی مثل آئینہ کے چمکتی تھی اور آبنوس کی طرح سیاہی مارتی تھی۔ اُسے اُٹھا کر عرفجہ نے ابن حنفیہ کے آگے رکھدیا اور کہا "یا حضرت کیا یہ جناب اسد اللہ الغالب امیر علیہ الصلوۃ والسلام کی کرسی نہیں ہے جسکے وسیلہ سے مختار نے دعوت الی حجۃ اللہ کا کام شروع کیا تھا"۔

حسن وغیرہ اس کرشمہ کے دیکھنے اور اسکی شان نزول سُننے سے ششدر و حیران ہو رہے تھے حسن کو بلال کے قول کی بھی تصدیق ہوئی جو مختار کی کرسی کی شان میں اُس نے بیان کیا تھا۔

امیر نے متبسم ہو کر فرمایا "لیکن بعد میں مختار کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا"۔

عرفجہ۔ "یہ اسلیے کہ اُس نے خلوصِ نیت کھو دیا تھا"۔

امیر۔ کیا تم بعد انتخاب خلوصِ نیت قائم رکھ سکو گے؟

اب عرفجہ کے چہرہ پر جادو سے تسخیر کارگر ہو جانے کی سرخی دوڑ گئی۔ اور اُس نے کہا "کیونکر میں اخلاص ترک کر سکتا ہوں درآنحالیکہ میں اُس خدمتِ حقہ پر مامور رہوں گا جو میرے لیے معراجِ کمال کا باعث ہوگی اور اُس وجودِ مقدس و مطہر کا میں نادی و نقیب ہوں گا جو احق بالامامت ہے۔ کیا وہ نورانیت کبرائے میرے قلب کو منور کرنے کے بجائے تاریک کر سکتی ہے۔

(۵۰)

حسن کو نہایت استعجاب تھا کہ امیر ابن حنفیہ باوجود اس کرسی اور خود اس شخص کی بابت علم واقعی رکھنے کے اسکی فریب کاریوں کا اثر قبول کر رہے ہیں۔ کہ پھر امیر کو کہتے ہوئے سُنا۔

"مگر عراق والوں کو دعوت دینے کے لیے تو صرف زر کی بھی حاجت ہے۔ کیونکہ بنی اُمیہ کے زیر اثر رہنے سے اُنکے دماغ جاہ پسندی و زر طلبی کے ازحد خوگر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اول بار بھی بمقابلہ حاملان بار امامت کے اُنکی (بنی امیہ کی) کامیابی کا یہی راز تھا کہ وہاں جاہ بخشی اور زرپاشی ہو رہی تھی اور یہاں تزکیہ نفس و اصلاحِ اعمال کا وعظ تھا۔ پس اُنکے شوق کی چیز اُن کے سامنے رکھو، اور جو چاہو اُن سے کرا لو"۔

اس موقعہ پر نہ حسن کا تحیر و استعجاب امیر کے تاثر پہ بجا تھا، کیونکہ وہ ابن حنفیہ کے تورّع اور زہد کا شہرہ سن چکا تھا، مگر اس صحبتِ تخلیہ میں اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ دُور ازگمان و دہم تھا۔

اور نہ عرفجہ کی یہ طلسم بندی ہی غیر متوقع تھی کیونکہ اُسکا مقصدِ زندگی کسب زر تھا جس حیلہ سے بھی ہو۔ وہ اپنی فرخندہ خصال بیٹی کی حجاج سے معاملتِ بیع و شریٰ کرکے ابھی فارغ ہوا تھا کہ اُسکے بعد ہی محمد بن حنفیہ، حجاج کے حریف کے یہاں کسب معیشت کا یہ شعبدہ تصنیف کرکے آموجود ہوا۔ مگر جو امر عجیب اور حیرت افزا تھا وہ یہ تھا کہ امیر سا محتاط اور روشن ضمیر زرگ قریب ہے کہ اس خادع کا ہمخیال بن جائے۔ (عرفی)

آنکہ می کرد مرا منع ز پرستیدنِ بُت   در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

مگر امر واقعہ بالکل اسکے خلاف ہے۔

محمد بن حنفیہ کی روش عرب کا مطلع حکومت غبار آلود ہونے کی وجہ سے اسوقت سکوت اور خاموشی کی تھی۔ حجاج نے بیعت عبدالملک اور عبداللہ ابن زبیر نے اپنی بیعت کی طرف انکو رجوع کرنا چاہا مگر انھوں نے بلطائف اسکو ٹال دیا۔ محاصرۂ مکہ کے فیصلہ پر انکی نظر جمی تھی کہ جب بیعت ضروری اور لابدی ٹھیرے گی تو مصلحتِ وقت پر عمل کیا جائیگا۔ پچھلی ناکامی کی وجہ سے اُنکا خود خیال تبلیغ کے لیے آوازہ بلند کرنے کا ہرگز نہ تھا۔ یہاں عرفجہ کی باتوں پر جو کچھ التفات تھا وہ بزاحًا تھا کہ ایک پیر فرتوت نے اُنکو کس قدر سادہ لوح سمجھ رکھا ہے۔ مگر کرسی کا کرشمہ دیکھتے ہی اُن کا چہرہ کچھ نہ کچھ متغیر ہو گیا تھا جسکو عرفجہ خودغرضی کی بے بصیری کی وجہ سے نہیں محسوس کرسکا۔ پس یکایک خشمگیں انداز سے اس گستاخ کو اُنھوں نے ان تہدیدی الفاظ میں مخاطب کیا۔

"کیوں؟ تم اس کرسی کو مقدس بناکے میرے سامنے لائے ہو اور مجھے اپنی شیطنت کا شکار بنانا چاہتے ہو؟ حالانکہ یہ کرسی روغن فروشوں کی ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ مختار کو میں نے اپنی طرف سے تبلیغ پر مامور کیا تھا اور اسی خیال نے غالبًا تمکو اسکی جرات دلائی ہوگی کہ تم اُس سے زیادہ موزوں اور اہل ثابت کرکے اُسی سلسلۂ مکر و زور قائم کرنے کی مجھسے اجازت لو۔ یاد رکھو! کہ یہ تمھارا خیال ناممکن الحصول ہے۔ کسب زر کے صدہا دروازے ہیں۔ لہذا اپنا طمع و آز کا تنور پاٹنے کے لیے کوئی اور دروازہ کھٹکھٹاؤ۔"

دَوران تقریر میں ابن حنفیہ کا چہرہ خشونت اور غیظ سے تمتما کر انگارہ بنگیا تھا۔ عرفجہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور وہ ہکا بکا ہو کے رہ گیا۔ وہ متحیر تھا کہ یہ راز کیونکر افشا ہوا۔ براہیم

اپنے سلسلۂ کوشش پر جب اُسکی نظر جاتی تھی تو اصلاحِ خیال کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا تھا۔ اِدھر ان بزرگوار کا غیظ و غضب رشتۂ امید کو بالکل منقطع کر رہا تھا۔ اور اس سوء ظن کے سلب و جذب کی کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ خیال کرتا تھا کہ میں نے اسکی تزئین و آرایش میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی جو زیارت کرنے والے سے اپنی عظمت منوا سکے نہ رہے۔ اور محمد بن حنفیہ ایسا شخص اُسے رد کرے، یہ مقدر ہے۔ نیز اسکی اصلیت کے افشا ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں اکثر اہالیانِ مدینہ اس فکر میں سر دُھنتے تھے کہ میرے اس راز سے آگاہ ہوں مگر کسی کے فرشتوں کو اسکی خبر نہ ہوئی۔ کیا اسکو میں بائع کی بدعہدی سمجھوں کہ اُس نے باوجود اقرارِ اخفا میرے راز کو طشت از بام کر دیا۔ مگر اُسے کیا پڑی تھی؟

اسکے بعد اُسکی مایوسی کی کوئی حد نہ تھی جب اُس نے خیال کیا کہ جس قدر رقم مجھے حجاج سے سمیّہ کے معاملہ میں ملی ہے اُسکی صدگونہ رقم حاصل ہو جانا اس معاملہ کے ادنیٰ فتوحات تھے مگر افسوس! وہ کشتِ امید خاکستر ہو رہی ہے، بنا بنایا کھیل بگڑ رہا ہے اور کوئی راہ نہیں نظر آتی اس خیال سے اُسکے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ آخر وہ اپنا دل مضبوط کر کے اپنی صفائی کے متعلق عرض معروض کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ دلگرفتہ بن اور تحیر کا لہجہ بنا کر کہنے لگا۔ گو اُسکی یہ حالت تھی۔

چناں بوقتِ شکایت از نگاہش مضطرب گشتم که مضمونِ سخن صد بار از دل تا زباں گم شد

"آقائے من! حکم لگانے میں آپ نے تعجیل کو کام فرمایا ورنہ میں نے جو معروضات پیش کیے وہ خیر خواہی کے خیال سے پیش کیے۔ کسی ذاتی غرض کا اُس میں مطلق لوث نہیں نہ کسی صلہ و جائزہ کی خواہش"۔

محمد بن حنفیہ نے نہایت خشن آواز میں اُسکا قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا جس سے عرفجہ کا دل کانپ گیا۔ "مردود! تیرا خیال ہے کہ میں تیرے کید آفریں کرتوت اور فتنہ پردازیوں سے ناواقف ہوں۔ حالانکہ خدع و مکاری کے مضموں کو ہر شخص تیری گردشِ چشم سے تاڑ سکتا ہے۔ خیریت یہ ہے کہ تو میری فرودگاہ میں آیا ہے ورنہ تو بھی مختار اور دیگر بنی ثقیف کے پاس پہونچا دیا جاتا۔ بس اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں"۔ اسکے بعد آواز دی "سعید!

آواز سنتے ہی صاحب خیمہ خوشی سے بیتاب ہو کر ایک ہی جست میں امیر کے روبرو تھا۔ (سعید صاحب خیمہ کا نام تھا) اور حسن اور بلال کی حیرت زا مسرت کی انتہا نہ تھی۔

(۵۱)

سعید کی طرف خطاب کر کے امیر نے فرمایا "اس کرسی کو لیجا کر فوراً جلا دو۔ اور اس تقفی کو میرے سامنے سے دفان کرو۔ ہاں اگر زاد و راحلہ (خورونوش اور سواری) طلب کرے تو دلوادو"

اس تعزیری فرمان کے سنتے ہی عرفجہ خود خیمہ سے باہر نکل آیا اور اپنے غلام قنبر کا نسبت ہی متلاشی ہوا سعید نے جو اسکے ساتھ ہی خیمہ سے نکلا تھا اُس سے دریافت کیا "کیا چاہتے ہو؟" عرفجہ نے تاسفانہ لہجہ میں کہا "کچھ نہیں چاہیے۔ قصد کر رہا ہوں کہ یثرب کو روانہ ہو جاؤں اسلیے کہ ٹھہرنے کا کوئی حاصل نہیں۔ افسوس! امیر نے میرے مقاصد اور عزائم پر مطلق توجہ نہ فرمائی اور میری خیر خواہی پر قطعاً نظر نہ کی"

سعید سے جس طرز پر اُس نے گفتگو کی وہ نہایت عاجزانہ لہجہ میں تھی۔ عجز و الحاح کی بنا علاوہ انفعال و ندامت کے یہ بھی تھی کہ اُسکی خائن و غدار طبیعت اس خطرے میں مبتلا تھی کہ کہیں امیر نے اسکے قتل کا فتوےٰ نہ دیدیا ہو۔ اس موقعہ پر سعید نے اُسکے گذشتہ اور موجودہ لب و لہجہ اور طرز کلام کا مقابلہ کیا تو اُس میں ایک بین فرق نظر آیا کہ کل گویا وہ ایک بڑا آدمی تھا کہ سعید ایسے معمولی اشخاص سے گفتگو کرنی تضیع اوقات اور اسکے لیے موجب اہانت تھا مگر آج وہی بڑا آدمی نہایت بزدلی اور دنائیت کا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ کہ اُسکی زبان سے ایک ایک لفظ عجز و الحاح کی تصویر بنکر نکلتا تھا۔ مگر اس سے بجائے اسکے کہ سعید کے دل میں جوش انتقام پیدا ہوتا اُس کا قلب اسکی لجاجت لانہایت سے متاثر ہوا۔ اور اُس نے شب میں قیام دار الاضیاف کے لیے کہا مگر عرفجہ نے واپسی کے مصالح کو بطور معذرت پیش کیا۔ اور اسکے بعد قنبر کو آواز دی۔ جواب نہ ملا۔ تو سعید سے رخصت ہو کر قیام گاہ کو آیا وہاں قنبر موجود تھا دونوں اونٹوں پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے اور اس خیمہ گاہ سے نکلکر لشکر حجاج کی سمت رُخ کر دیا۔

راستہ میں امیر کا تذکرہ سخت تحقیر آمیز طریقے سے اُس نے قنبر سے کیا اور کہا "سخت احمق و نادان آدمی ہیں۔ مصالح و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ قابلیت نہیں رکھتے۔ میں اگر ایسا سمجھتا تو ہرگز انکی طرف رخ نہ کرتا"

اس گفتگو سے اُسکا مقصد یہ بھی تھا کہ سبب ناکامی کے باب میں تنبیر کا خیال پیش آمدہ ذلت وتحقیر کی طرف نہ جائے بلکہ صرف امیر کی نافہمی وحمق کے سر یہ سارا بار رہ جائے۔ بہرحال اسکو اسی خودسرائی دہرزہ گوئی میں رہنے دیجیے اور وہاں کا حال سُنیے۔

جب عرفجہ جا لیا تو سعید خیمہ میں آیا اور کرسی لیکر اُسے نذر آتش کیا۔ پھر اپنے خیمہ میں گیا اور سارا حال عرفجہ کی روانگی اور کرسی کے نذر آتش کرنے کا اپنے رفقاء کو کہہ سنایا۔ حسن جو اس تمام روئداد کو دیکھکر سراپا مسرت ہو رہا تھا اس سین کے ختم ہونے پر داخلۂ مکہ کے باب میں اس سے مستفسر ہوا۔ سعید نے کہا "میں نے امیر سے اسکا ذکر کر دیا تھا جسکے جواب میں مجھ سے ارشاد ہوا تھا کہ میں خود آپ کی معیت میں چلا جاؤں کیونکہ ناکہ اور مورچوں پر جو فوجی دستے متعین ہیں اُنکے روسا جیش سے بوجہ کثرتِ آمدو رفت مجھ سے تعارف ہے۔ بس اطلاع کردوں اور آپ کے ساتھ چلوں"

یہ کہکر سعید اجازت طلبی کے لیے گیا اور بحصولِ اجازت فوراً واپس آیا اور حسن و بلال سے کہدیا یہ دونوں دارالاضیاف کو درستی سامان سفر کے لیے روانہ ہوے اور وہاں پہونچکر یہ طیار ہی ہوے تھے کہ سعید ایک سبزہ عربی النسل گھوڑے پر سوار انکی مشایعت کے لیے پہونچ گیا۔ اور اسکے پہونچتے ہی وہ دونوں بھی اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ہوے اور سعید کی رہبری میں مکہ روانہ ہوے۔

(۵۲)

تینوں سواروں کا رُخ مکہ کی سمت تھا اور ہمارے دوست حسن کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ عبداللہ ابن زبیر سے معاملۂ متعلقہ میں زبانی پیام کہنے کی کیا شکل اختیار کی جائے۔ خالد کے خط کا تو وہ حشر ہوا فقۃ عرض افق سمتِ مدینہ پر گرد و غبار لبند ہوتا ہوا نظر آیا یہاں تک کہ سینۂ تتقِ غبار چاک ہوا تو کچھ فوجی سواروں کے گھوڑے اور اُنکے پیچھے شتر سوار نظر آئے۔ حتیٰ کہ جب قریب آئے تو معلوم ہوا کہ حجاج کے انصار و معاون ہیں۔ معاً حسن کو وہ ڈاک کے سوار یاد آگئے جو عین اُسکی روانگی کے روز مدینہ میں داخل ہوے تھے اور اسے یقین ہوگیا کہ طلب پر یہ کمک و رامدادی فوج مدینہ سے بھیجی گئی ہے۔ بلکہ اس تعجیل سے اُس کے خیال کو اور بھی زیادہ قوت پہونچتی تھی۔ جسکے ساتھ ان لوگوں نے تمام ضروریات سے آراستہ ولوازمات سے مسلح ہوکر اپنے کو یہاں پہونچایا ہے جو عموماً کمک و رامدادی مواقع کے لیے ضروری اور اعلیٰ ترین قابلیت کی بات ہے اور حوالی وجوارِ مدینہ کے عرب قبائل میں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

غرض شاہراہ سے قریب پہونچکر حسن اور اُسکے دونوں رفیق بالقصد ایک ایسی جگہ ٹھٹک رہے جہاں سے انھیں لشکریوں کا ایک ایک فرد نظر آتا تھا - البتہ یہ سب کی نظروں سے پوشیدہ تھے - بہرحال فوجی اصول سے جائزہ دیتے ہوے پہلے ان کے سامنے سے سوار گذرے جنکے برچھوں کی انیاں اپنی برق نما چمک سے سید اُبصارت یعنی چشم تماشاہیں کو خیرہ کرتی تھیں - اسکے بعد وہ لوگ جو نشان رکھتے تھے - پھر پیدل اسکے بعد رسد اور باربرداری کی جمعیت - اور سب کے پیچھے ایک محمل جسکے اونٹ کی مُہار ایک غلام کے ہاتھ میں تھی اور دو غلام اُسکے پیچھے تھے -

لشکریوں کے ساتھ محمل کو دیکھکر حسن کو استعجاب کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ عرب عموماً اسکے عادی تھے کہ لڑائیوں میں اپنی حرم وخواتین کو ساتھ لیجاتے تھے جو اوائل اسلام تک اسکے پابند رہے - اسکے بعد جیسے جیسے بدویت دور ہوکر شہریت کا رنگ آتا گیا یہ عادت ترک ہوتی گئی - البتہ استعجاب کا یہ محل ضرور تھا کہ پورے لشکر میں محض ایک محمل تھا - اور اُسکے گرد سواروں کا ایک محافظ دستہ تھا جس سے یہ پایا جاتا تھا کہ کسی امیر یا سردار کا حرم ہے -

ناظرین کسی گذشتہ باب میں ہمیّہ کی روانگی کا حال پڑھ چکے ہیں وہ اس قافلہ کو دیکھکر ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ وہی جفا پیشہ اور استبدادی گروہ ہے جو ایک حسن و عشق کی دیوی کو اُسکے عزائم الفت کی مزاحمت بیجا کرکے محبوس کرلایا ہے کہ حجاج ایسے سیہ کار وسنگدل امیر کے شوق ہوسبازی کو پورا کرے اور باوجود عقائد اسلام کے قلبی ولسانی تصدیق کی ادعا کے انھیں اس بات کا ذرا پاس نہیں کہ ایک عاقلہ اور بالغہ عورت جس مرد کے ساتھ ازدواج سے سخت متنفر ہے اُسکی رضا اور جواز عمل کے لیے کونسا حیلۂ شرعی اختراع کریں گے جسکا ازروے شرع اسلام فواحش اور کبائر میں شمار ہے - اگرچہ اس حبس ومزاحمت سے براہ راست انھیں تعلق نہیں مگر ذریعہ وواسطہ ضرور ہیں جو اسلامی وقار اور غیرت کے منافی ہے -

بہرحال یہ قافلہ آگے جاکر شاہراہ سے جبل ابوقبیس کی سمت مڑا - جہاں دامن کوہ میں حجاج خیمہ زن تھا -

بعض طبیعتیں یہاں مستفسر ہوں گی کہ حسن کے حیات قلبی میں ہمیّہ کا محمل دیکھکر کچھ بھی تحریک نہ ہوئی حالانکہ وہ عادۃً تنگی تھا جسے عشق کی بیتابیاں اور دوبالا کردیتی ہیں - ہم بھی کہتے ہیں کہ شعرا عاشقانہ جذبات

کی قوت اور اُسکی کہربائی طاقت کو یوں بیان کرتے ہیں "- نگاہ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں" مگر ہمارے دوست حسن پر یہ مثال صادق نہیں آتی کہ باوجود محبوب سے اس قدر محاذات و اتصال کے اُسکی شعاع وجدانی نے کیفیت درونِ پردۂ محمل پر روشنی نہ ڈالی - پس یا حسن کو عاشق صادق کا درجہ حاصل نہیں یا عشق میں یہ کشش ہی نہیں - امر اوّل کے متعلق تو ہم اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرسکتے ہیں جس سے غالباً ہمارے ناظرین بھی اتفاق رائے کریں گے کہ حسن عاشقانہ جذب و انہماک میں مجنونِ عامری، اور جمیل عذری سے کسی طرح کم نہیں - ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ شاعرانہ تخیل کی بخشیدہ شوریدہ سری اور ترجمانیِ عشق میں آشوب حسنِ بیان نے اُن دونوں کو انگشت نما کر رکھا تھا، برخلاف اسکے حسن کا سودائے عشق مشتہر کرنے والی آشفتہ مزاجی اور ہرکس وناکس کو فوید توجہ دینے والی ہنگامہ پسندی اور سراسیمگی سے بری تھا - البتہ عشق کی جلبہ معصوم اور متین ادائیں اُس میں اکٹھا تھیں - سکوت آفریں و خموشی پسند تخیل سے اُسکو کام تھا لیکہ اُسکے مشربِ عشق کی تعبیر کے لیے کسی اُردو شاعر کا یہ شعر نہایت ہی موزوں ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

امر دوم کا مختصر یہ جواب ہے کہ جب اسباب طبیعی کو یہ قوت حاصل ہے کہ ہر حائل ہونے والی شے کو دفع کرسکتی ہیں چنانچہ آگ پردہ کو جلا سکتی ہے، پانی کسی چیز کی دیوار ہو لوہے یا پتھر کی اُسکو اُکھاڑ سکتا اور اُسمیں رخنہ ڈال سکتا ہے تو وہ قوت جو دل ایسے پہاڑ کو تو مسخر کرسکتی ہے کیا اس کے دفع پر اُسے قدرت نہ ہوگی -

(عرفی شیرازی)

گو کہ کشتہ سرایان عشق خاموش اند کہ حرف نازک و اصحاب پنبہ درگوش اند

(۵۳)

تخریبِ کعبہ اور تعذیب زائرین

قافلہ گذر گیا تو یہ لوگ بھی روانہ ہوئے - سعید کا گھوڑا رہبری کی شان سے چھلاوہ کی طرح آگے آگے جا رہا تھا - اونٹ بھی منزل کے چڑھے ہوئے تھے، لہذا اُسکے قدم پر قدم رکھتے تھے یہاں تک کہ ناکہ بندی کی چوکی آگئی - سعید وہاں پہونچکر اُتر پڑا - اُسے دیکھکر عرب سپاہی بڑھے - اُس نے اپنا مدعا یہ بیان کیا کہ محمد ابن حنفیہ کی ضرورتِ خاص سے مکہ جانا چاہتے ہیں - اجازت ملی - اور پھر

سوار ہوکر روانہ ہوئے ۔ حسن راستہ میں حجاج کے لشکر گاہ کا منظر دیکھتا آتا تھا ۔ جہاں دور تک سپاہیوں کے خیموں کی قطاریں تھیں اور اُنکے آس پاس سپاہی بوجہ دوری کے متحرک پتلوں کی شکل میں نظر آتے تھے۔

اب یہ آبادیِ مکہ کے قریب پہونچ گئے ۔ جہاں راستہ ایک بلندی پر ہوکے گذرتا تھا ۔ اس بلندی پر پہونچتے ہی مکہ کی آبادی کا پورا نقشہ پیش نظر ہوگیا ۔ مسجد حرام اور کعبہ پر جو حسن کی نظر پڑی تو اُسے عمارتِ کعبہ اُس سے وسیع نظر آئی جتنی کہ اُس نے گذشتہ موقع پر زیارت کے وقت دیکھی تھی ۔ اُسکے علاوہ اُسکے گرد و پیش کچھ اور سامان بھی نظر آیا ۔ اور وہ بغور دیکھنے کے لیے ذرا رُک گیا سعید بھی اُسکی خاطر سے رُکا ۔ اسکے بعد اس نے سعید سے پوچھا " کعبہ کی عمارت مجھے پہلے سے کچھ وسیع معلوم ہوتی ہے یہ کیا قصہ ہے ؟ اور کچھ اُسکے ارد گرد قناتیں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں یہ کیا سامان ہیں ؟"

سعید نے کہا " تمھارا خیال صحیح ہے ۔ محاصرۂ یزید ابن معاویہ میں جب عمارتِ کعبہ جل بھی اُسکے بعد ابن زبیر نے اسکی تعمیر کے وقت اُس پورے رقبہ کو عمارت میں شامل کرلیا جو پہلے چھوٹ گیا تھا ۔ اور اُس سے پہلے عہد قریش کی تعمیر میں شامل تھا ۔ اور یہ جو آپ سامان نظر آتا ہے اسکی غایت و بنا یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے سال کی لکڑی کے ستون دیواروں کے گرد نصب کرکے اُنپر کپڑا چڑھا دیا گیا ہے اور سقفِ کعبہ پر ستونوں سے مخروطی شکل کا سائبان بنا کر خرمہ کی چھڑیوں سے چھا دیا گیا ہے تاکہ منجنیق سے جو پتھر آئیں اُنکی زد سے دیواریں اور بامِ کعبہ محفوظ رہے اور پتھر ڈھل جایا کریں ۔"

حسن ۔ " یہ منجنیق کیسی ؟"

سعید ۔ " منجنیق حجاج کے حکم سے جبل قبیس پر نصب کی گئی ہے جہاں سے حرم اور کعبے پر سنگباری کی جاتی ہے کہ عبد اللہ ابن زبیرؓ اور اُنکے متبعین تنگ اور مصیبت زدہ ہوکر خروج پر مجبور ہوں ۔"

حسن ۔ نعوذ باللہ ! خدا کی مار اُن سفاک ظالموں پر جو حرم کعبہ پر سنگباری روا رکھتے ہیں ۔ اسکے بعد کوئی مقولہ یا حدیث پڑھی جسکو مضمون شعر بقابلہ ترجمہ واضح صورت میں ادا کر رہا ہے ۔ (فیضی)

کجا رتبۂ کعبہ یا بد سفیہے ۔۔۔ کہ فردا بہ قعر جہنم نشیند

سعید ۔ تمھارا قطع کلام ، گذشتہ حج کے موقع پر میں نے یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ حجاج مصروف طواف ہیں اور پتھر آسمان سے برس رہے ہیں جس سے اُنکے سینے اور سر زخمی ہو رہے ہیں ۔ امام محمد بن حنفیہ اور عبد اللہ ابن عمرؓ بھی شریک حج تھے ۔ یہ حالت دیکھکر ابن عمرؓ نے حجاج کے پاس

پیام بھیجا، " خدا کے غضب اور قہر سے ڈرو۔ یہ مہینہ اَشہُرِ حُرُم میں سے ہے اور یہ مقام بلدالحرام ہے جہاں اقطاعِ ارض سے صعوباتِ سفر برداشت کرکے خدا کے مقبول بندے اُسکے فریضۂ حج کی بجاآوری کے لیے اُسکے بلائے ہوئے آداب و لباس میں حاضر ہوئے ہیں مگر تمھاری سنگباری نے ادائگی فرض کی راہیں اُنپر بند کر رکھی ہیں۔ پس انکی غربت اور سفر فی سبیل اللہ پر رحم کھاکر سنگباری بند کرو یہاں تک کہ یہ لوگ مراجعت کریں۔" بارے اس پیام کا یہ اثر ہوا کہ سنگباری موقوف ہوئی۔ حالت یہ ہے کہ اپنے شیطانی ارادوں کے سامنے حجاج کو نہ دین و مذہب کا پاس باقی رہا ہے نہ حرمتِ کعبہ و توقیرِ حرم کا خیال ہے۔ بہرحال جب تک لوگ عرفات سے واپس آکر سعیِ بین الصفا والمروہ اور طوافِ زیارۃ سے فارغ نہ ہولیے یہ سلسلہ موقوف رہا اور بعد ختم شعائرِ حج حجاج کے منادی نے آکر ندا دی کہ اب وقتِ فرصت گذر گیا حجاج واپس جائیں ابن زبیر ... پر پھر سنگباری شروع کی جاتی ہے۔"

بعض لوگ اسکے بھی راوی ہیں کہ جس وقت پہلا پتھر خانۂ کعبہ پر گرا ہے آسمان سے ایسی گرج اور تڑپ محسوس ہوئی کہ دوبارہ پتھر پھینکنے کی سنگ اندازوں کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ شدہ شدہ حجاج کو اسکی اطلاع ہوئی وہ خود وہاں آکر اپنے ہاتھ سے پتھر ڈھالنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اُسی رات میں قہرِ خدا نے برق کی شکل میں اُس کے بارہ آدمیوں کو جلاکر خاک سیاہ کرڈالا۔ مگر یہ خرافات ضعیف عقیدہ والے گڑھ لیا کرتے ہیں جن پر سمجھدار لوگ کان نہیں دیتے۔ اور اس روایت میں یہ بھی مستزاد کیا جاتا ہے کہ جب بارہ آدمیوں کے جلنے کی خبر لشکر میں مشتہر ہوئی اور لوگوں میں انتشار پھیلنے لگا تو اُس نے سب کو جمع کرکے ان الفاظ میں اُنکی تشفی کی۔

"اے اہل شام! کیا تم اس سے لاعلم ہو کہ تم امیر شام جو خلیفۂ برحق ہیں اُنکی حمایت کے لیے جمع ہوئے ہو۔ اور ابن زبیر اُن سے خلاف اور غیر حق پر ہے۔ پس میرے ابن تہامہ ہونے کا اگر تم یقین رکھتے ہو تو اس بات کو سچ مانو کہ یہ حملۂ برق تنبیہی اور امتحانی تھا۔ اور انشاءاللہ عنقریب تم دیکھ لوگے کہ اصحاب ابن زبیر خلاف اور عدول عن الحق کی وجہ سے کس تعداد میں اس برق بلا کا شکار ہوں گے۔"

جواد علی خاں عالی

برکلے اُردو لباس میں

قوم کے علمی طبقہ کے سامنے اگر اسوقت یہ سوال پیش کیا جائے کہ سالِ رواں کی فہرست مطبوعات اُردو میں سرعنوان کس کتاب کو قرار دینا چاہیے؟ تو مختلف سمتوں سے مختلف جوابات ملیں گے۔ تاریخ وادب کے ذوق شناس سیرت نبوی کا نام لیں گے، مذاقِ سخن کے دلدادہ ممکن ہے کہ کلام حسرت واقبال کو پیش کریں، وقس علی ہذا۔ لیکن اگر اس سوال کو محدود کرکے دائرہ انتخاب صرف عقلیات تک رکھا جائے تو اسکا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، یعنی پروفیسر عبدالباری ندوی کی "مبادیِ علم انسانی"۔

مبادی کوئی تصنیف نہیں، تالیف نہیں، محض ترجمہ ہے۔ لیکن ایسا ترجمہ جسکا دامن کسی بلند پایہ تصنیف سے بھی دبتا نظر نہیں آتا۔

اُردو میں مغربی فلسفہ کو منتقل کرنے کی یہ پہلی کوشش نہیں۔ یہ کام ایک مدت سے انجام پا رہا ہے۔ لیکن اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ قابل لحاظ سرمایہ فراہم ہوا، اُسکی حیثیت یا تو محض نصابی تھی، یعنی طلبہ کے نصاب درس کے لیے کتابیں لکھائی گئی تھیں، مثلاً پنجاب یونیورسٹی کی کتابیں۔ اور یا اُنکا مقصد محض عام شائقین (جنرل ریڈرز) کی تسکین ذوق رہا ہے، مثلاً انجمن ترقی اُردو کی شایع کردہ کتابیں۔ ان دونوں مقاصد کے بجائے خود مفید و ضروری ہونے میں کلام نہیں، اور انجمن ترقی اُردو کی بعض مطبوعات تو خصوصیت کے ساتھ اُردو خواں پبلک کی سطح دماغی بلند کرنے اور ملک میں علمی مذاق پھیلانے میں معین ہوئی ہیں۔

لیکن انکے علاوہ ایک تیسری اہم ضرورت یہ بھی تھی، کہ اُن لوگوں کے لیے جو کسی مخصوص شعبۂ علم میں ماہرانہ کمال پیدا کرنا چاہتے ہیں، یا کسی مخصوص فن کو اپنے غائر مطالعہ کا مرکز بنانا چاہتے ہیں ان علوم وفنون سے متعلق محققانہ و مجتہدانہ لٹریچر کا معقول و منضبط سرمایہ موجود ہو، جسکے مطالعہ سے محض عام استعداد علمی ہی نہیں، بلکہ غور و فکر و اجتہاد کی قوتوں کا بھی نشو ونما ہو۔ اس مقصد کے لیے یہ کافی نہیں، کہ ارسطو کے خیالات و نظریات کا ایک سرسری خلاصہ ترتیب دے دیا جائے، بلکہ اصل ضرورت یہ تھی کہ خود ارسطو کی "تصنیف" بجنسہ اُردو میں منتقل ہو جائے، اور وہ بھی متفرق طور پر نہیں، بلکہ اُسکا سلسلۂ تصانیف ایک، با بعنوان، باقاعدگی، و انضباط کے ساتھ۔

شبنم کتنی ہی قدر کیوں نہ میں گرے، پھر بھی شبنم ہی ہے - بارش کا کام تو نہیں دے سکتی۔ اس نکتہ پر سب سے پہلے دار المصنفین کی نظر پڑی (اس سے پہلے جو چند مثالیں ملتی ہیں وہ مستثنیات کے حکم میں داخل ہیں) اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ حکماے مغرب کا فلسفہ پوری جامعیت و انضباط کے ساتھ اُردو میں منتقل ہو جائے - قرعہ انتخاب ایسے شخص پر پڑا جس سے بڑھ کر اسوقت اس خدمت کی اہلیت شاید کسی میں بھی نہیں۔

برکلے، حکماے یورپ میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے - وہ ایک خاص اسکول (مذہب فلسفہ) کا بانی ہے۔ اسکے مسائل تمامتر مجتہدانہ ہیں (جن معنی میں کہ دنیا کا کوئی مسئلہ مجتہدانہ ہو سکتا ہے) تاریخ فلسفۂ مغرب پر اسنے ایک مستقل اثر چھوڑا ہے، یہاں تک کہ اگر اسکے فلسفہ کو حذف کردیا جائے، تو زنجیر کے درمیان سے ایک خاص کڑی نکل جائیگی، اور تاریخ فلسفہ کی مرتب و مسلسل داستان میں ایک چیستاں کی شان پیدا ہو جائیگی۔ تحریر اسکی صفائی بیان و سلاست دوسرے فلسفیوں کے لیے قابل رشک ہے۔ اغلاق و ژولیدگی، جو فلسفیانہ تحریروں کی ایک لازمی خصوصیت سمجھ لی گئی ہے، اس سے اسکا دامن بالکل پاک ہے۔

فلسفہ میں اسکی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم اُسکی "پرنسپلز آف ہیومن نالج" ہے اسی کا اُردو ترجمہ مبادیِ علم انسانی کے نام سے مولوی عبد الباری ندوی نے کیا ہے۔ روح میں اگر مرنے کے بعد اس دنیا کے احساسات باقی رہ جاتے ہیں، تو اسوقت برکلے کی رُوح یقیناً مترجم کو دعاے خیر سے یاد کر رہی ہوگی۔ اسلیے کہ اس میں مطلق شبہ نہیں، کہ جس پایہ کی کتاب تھی اُسی پایہ کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔

مبادی کے نفس مضمون پر کسی طرح کے اظہار خیال کا یہ موقع نہیں، کہ اس صورت میں تنقید خود برکلے پر ہو جائے گی۔ حالانکہ یہاں صرف "اُردو برکلے" پر نظر کرنا ہے۔ ترجمہ کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) ترجمہ غایت درجہ احتیاط و دیانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مصنف کے نفس مطالب ہی کو ادا کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ کوشش کی گئی ہے، کہ اُسکے طرز ادا کو بھی حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اور اس میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا ہے، کہ برکلے کی طرز تحریر کے جو معائب ہیں، انھیں بھی بجنسہ قائم رہنے دیا گیا ہے۔

(۲) لیکن باایں ہمہ سلاست و روانی اس ترجمہ کے خاص جوہر ہیں۔ جو لوگ فلسفہ کا کچھ بھی مذاق رکھتے ہیں اور کتاب کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، انھیں ساری کتاب میں غالباً ایک جگہ بھی ابہام و ژولیدگی کے سبب سے نہ رُکنا پڑے۔ ترجمہ کی پابندیوں کے ساتھ زبان میں اسقدر شگفتگی باقی رکھنا

آسان نہ تھا۔

(۳) مصطلحات کے انتخاب میں خوش مذاقی خاص طور پر نمایاں ہے۔ ہر جدید اصطلاح ظاہر ہے کہ کانوں کو لامحالہ اجنبی معلوم ہوگی، لیکن اس ناگزیر مجبوری کے حدود سے نکل کر مترجم نے ہر جگہ اپنے حسن انتخاب و قدرت زبان کا ثبوت دیا ہے۔ نامانوس و غریب الفاظ سے پرہیز کیا ہے، اور انکے بجائے حتی الامکان قریب الفہم الفاظ رکھے ہیں۔

(۴) لیکن اسی کے ساتھ اس امر کی پوری احتیاط رکھی ہے، کہ صحت و تحقیق کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ انگریزی کی تقریباً مرادف اصطلاحات کے درمیان جو باریک فروق مفاہیم (Shades of meaning) پائے جاتے ہیں انھیں جہاں تک ہوسکا، اُردو میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔

ذیل میں ہم کتاب کے دو ایک اقتباسات درج کرتے ہیں، جن میں ناظرین خود، خصوصیات بالا کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ایک جگہ برکلے اپنے مخالفین سے کہتا ہے کہ تم جو وجود مادہ کی تعریف بیان کرتے ہو وہ اسکے عدم کی مرادف ہے۔ اسے یوں ادا کیا ہے:۔

"مادہ کی یہاں جو تعریف و تفسیر کی گئی ہے، آؤ، ذرا اسکی جانچ اور تنقیح کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے نہ کوئی فعل صادر ہوتا ہے، نہ یہ کسی قسم کا احساس رکھتا ہے، اور نہ کسی اور کو اسکا احساس ہوتا ہے، کیونکہ اس کو بے حرکت بے حس، اور نامعلوم جوہر کہنے کے معنی یہی ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسی تعریف ہے جس میں بجز محلیت کے اضافی خیال کے باقی تمام اجزاء سلبی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ یا وصف محل ہونے کے کوئی شے اسکے ساتھ قائم نہیں۔ اب تم خود سوچو، کہ یہ تعریف عدمیت کی تفسیر سے کسقدر قریب ہے گر تم کہو گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے، ہم تو صرف اتنا کہتے ہیں، کہ ایک نامعلوم سبب کی حیثیت رکھتا ہے، جسکی موجودگی میں خدا ہمارے اندر تصورات کو پیدا کرتا ہے۔ اب اگر یہ معلوم ہوجاتا تو مجھکو بڑی خوشی ہوتی کہ ہمارے لیے کسی ایسی شے کی موجودگی کے کیا معنی ہیں، جو نہ حس سے قابل ادراک ہے نہ عقل سے۔ نہ ہمارے ذہن میں کوئی تصور پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے، اور نہ ذی استعداد ہے، نہ کوئی صورت رکھتی ہے، اور نہ کسی مکان میں پائی جاتی ہے"۔ (صفحہ ۲، و ۷۳)

برکلے، نظریہ تجرید کی تشریح کرتا ہے:۔

" آئندہ مباحث کو آسان و قریب الفہم بنانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ تمہیداً کچھ زبان کی

اہمیت اور اسکے سوء استعمال کی نسبت بیان کردیا جائے، لیکن اسکی توضیح میں اپنے اصل بحث کو کسی قدر پیچھے ہٹا دینا پڑتا ہے، اور ہم پہلے اس قصے کا ذکر کرتے ہیں جو علی العموم نظر و فکر کی پیچیدگی و تشویش کا ایک خاص اور بڑا سبب رہی ہے، وہ یہ اعتقاد ہے، کہ ذہن کو ایک ایسی قوت حاصل ہے جسکے ذریعہ سے وہ اپنے اندر اشیاء کا تصور مجرد قائم کرسکتا ہے۔ جو شخص فلاسفہ کے نوشتہ جات و منازعات سے ناواقف محض نہیں ہے، وہ قطعاً اعتراف کریگا، کہ انکا ایک بڑا حصہ انہی تصورات مجردہ سے متعلق ہوتا ہے۔ زیادہ خصوصیت کے ساتھ یہ ان علوم کا موضوع بحث خیال کیے جاتے ہیں، جنکو ہم منطق، مابعد الطبیعات، یا علم عالی سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں بمشکل کوئی ایسا مسئلہ بھی مل سکے گا، جو تصورات مجردہ کے وجود ذہنی کے فرض و تسلیم پر مبنی نہ ہو" (صفحہ ۶)

برکلے اس اعتراض کے جواب میں، کہ اشیاء کی انکی تکمیل سے قبل بربادی، خدا کی حکمت کاملہ کے منافی ہے، تقریر کرتا ہے:-

"لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ہمکو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ فطرت کے خود یہ نقائص و عیوب بھی بے سود نہیں کیونکہ یہ ایک طرح کے خوشگوار تنوع اور جدت کا کام دیتے ہیں، اور بقیہ اجزائے آفرینش کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے تصویر میں سیاہی یا تیرگی اسکے روشن اور منور حصوں کو اور زیادہ اُجاگر کردیتی ہے۔ اسی طرح یہ جانچ لینا بھی بہتر ہوگا کہ نطفہ و جنین کی اضاعت اور حیوانات و نباتات کی اپنی پوری عمر تک پہونچنے سے پہلے اتفاقی بربادی سے خالق فطرت پر بے بصیرتی کا الزام دھرنا کہیں ہماری اس عصبیت کا نتیجہ تو نہیں جو ناتوان و کفایت شعار انسان کے طریق کار کے ذہن نشین ہو جانے سے پیدا ہوگئی ہے" (صفحہ ۱۳۳)

ان اقتباسات سے جو کتاب کے ابتدائی، آخری، اور درمیانی حصوں سے لیے گئے ہیں، کتاب کی نوعیت کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے۔

کوئی انسانی کوشش، خواہ کتنے ہی اہتمام و قابلیت سے کی جائے، نقائص اور خامیوں سے بالکل پاک نہیں ہوسکتی۔ پیش نظر کتاب میں بھی ابھی متعدد اصلاحات کی گنجایش ہے۔ لیکن "انّ الحسنات یذھبن السیئات" کے اصول کے مطابق کتاب کے فضائل و محاسن کا پلہ اسقدر بھاری ہے، کہ اس کے روشن پہلوؤں کے مقابلہ میں اسکے اصلاح طلب پہلوؤں کا تذکرہ چھیڑنا، فاضل مترجم کے کمال فن محنت، کاوش و اہلیت کی ناقدری بلکہ تحقیر کرنا ہے۔

شروع میں مترجم کا ایک دلچسپ دیباچہ بھی شامل ہے، اور آخر میں فرہنگ مصطلحات نہایت مفید ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب کا مطالعہ ہر اُس شخص پر واجب ہے، جو فلسفہ یا الہیات کے مباحث سے کچھ بھی ذوق رکھتا ہے، یا یہ دیکھنا چاہتا ہے، کہ یورپ ابطال مادیت و تائید مذہب میں کیا کیا دلائل استعمال کرتا ہے۔

البتہ ایک الزام ہے، جس سے ہم مترجم، نیز ادارہ المصنفین کو کسی طرح بری نہیں کر سکتے، اور جسکا اظہار نہ کرنا حق پوشی کا مرتکب ہونا ہے۔ اور وہ کتابت کی نہایت کثیر التعداد غلطیاں ہیں۔ کتاب کا کوئی صفحہ مشکل سے ملیگا، جس میں دو ایک غلطیاں موجود نہ ہوں۔ جس قدر توجہ و احتیاط کتاب کے ترجمہ میں صرف کی گئی ہے، اس سب کی تلافی، طباعۃ کی بے توجہی و بد احتیاطی نے کردی ہے۔ ابتدا میں فہرست مضامین ہونا بھی ضروری تھی۔ دیباچہ مترجم، و دیباچہ مصنف کی تصریح نہ ہونے سے بھی پہلی نظر میں دہوکا ہوتا ہے۔

فاضل مترجم کسی انگریزی کالج کے گریجویٹ نہیں، ملکہ تمامتر ندوہ کے تعلیم یافتہ، اور شبلی کی بزم تربیت کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ کس قدر حسرت کا مقام ہے، کہ جب چمن میں برگ و بار آنے کا وقت آیا، تو چمن لگانے والا باغبان موجود نہیں۔ گلشن کے تماشائی لاکھ لطف اُٹھائیں مگر وہ مسرت قلب تو نہیں بہرحال نہیں ہوسکتی، جو باغبانِ اول کو ہوتی۔

اس سلسلہ کی ایک اور کڑی، یعنی مترجم موصوف کی دوسری کتاب، جس میں برکلے کے حالات زندگی کے ساتھ اُسکے فلسفہ پر مفصل تبصرہ و تنقید ہے، عنقریب پریس سے باہر آیا چاہتی ہے۔

عبد الماجد

غزل مسلسل

پھر ہوں خیالِ جلوۂ جاناں لیے ہوے
جذباتِ اشتیاقِ فراواں لیے ہوے

پھر ہے اُسی زمانۂ عشرت کی جستجو
جسکو گئی ہے گردشِ دوراں لیے ہوے

پھر چاہتا ہوں میں اُسی لیل و نہار کو
نیرنگیِ خزان و بہاراں لیے ہوے

نظروں میں پھر ہیں شام کی وہ دلفریبیاں
لطفِ شبِ نشاط کا عنواں لیے ہوے

پیشِ نگاہ پھر ہے وہی رونقِ سحر
رنگینیِ بہارِ گلستاں لیے ہوے

پھر التفاتِ یار نے سب غم بھلا دیے
پھر دل ہے عیشِ رفتہ کا ارماں لیے ہوے

ارشد ہوں پھر رہینِ تمناے وصلِ دوست
صد آرزوے لذتِ پنہاں لیے ہوے

ارشد (تھانوی)

بصرہ

آجکل شہر بصرہ کا سفر نہایت دلچسپ ہو رہا ہے۔ اس خیال سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اُسکے قابلِ زیارت مقامات کی کیفیت لکھیں تاکہ جانے والوں کو ان مقامات متبرکہ کی زیارت باعث تسکین و مسرت ہو اور ہمارے واسطے بھی دعاے خیر کریں۔

پہلا دَور

سنہ ۱۴ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ ہے۔ بصرہ فتح ہو کر ممالک اسلامیہ میں داخل ہوا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس شہر کو بسایا۔ اُس زمانہ میں ایک لاکھ سترہ یا ستر ہزار مسجدیں یہاں تھیں آدمیوں کی کچھ گنتی نہیں۔ ایک لاکھ ساٹھ یا ستر ہزار یہاں مسکین رہتے تھے۔ پچاس فرسخ تک کھجور کے درخت تھے۔ ایک لاکھ بیس ہزار نہریں پانی کی تھیں جن میں کشتیاں چلتی تھیں۔ موتی بصرہ سے آتا ہے۔ عطر گلاب یہاں کا نہایت مشہور ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقود جاہلیت پر زکوٰۃ قائم کی تھی اسلام نے اسکو مقرر رکھا اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت باہرہ میں یہی کارروائی کی کچھ ادل بدل نہ کیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوے، شام و عراق فتح ہوا وہی اگلا قاعدہ رکھا۔ سنہ ۱۸ ہجری میں بصرے والے آئے۔ احنف بن قیس نے اُن سے دربارہ مصالح بصرہ گفتگو کی۔ معقل بن یسار کو بھیجا کہ بصرے میں نہر بنا دیں۔ اُسی نہر کے حق میں یہ مثل ہے "اذا جاء نہر اللہ بطل نہر المعقل"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایما سے جناب عتبہ رضی اللہ عنہ نے شہر بصرہ کی بنا ڈال کر تین سال میں ختم کی۔ نہر کے پانی کا دو درہم ماہوار محصول تھا جو نقود جاہلیت سے چھوٹا تھا۔ ع
قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ یہ زمانہ یادگار تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بعد خلافت کے اول بصرہ میں ۳۶ھ میں آئے۔ وہاں واقعہ جمل ہوا۔ ۳۷ھ میں کوفہ میں تشریف لائے، یہاں جنگِ صفین ہوئی۔ ۴۰ھ میں ابن ملجم کے ہاتھ سے شہید ہوے دار الامارۃ کوفہ میں رات کو دفن ہوے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرا دور

متوکل علی اللہ، معتصم کا بیٹا ہے۔ سنہ ۲۳۲ھ میں خلیفہ ہوا۔ اسی سال ایسی سخت لو چلی کہ ساری زراعت بصرہ کی جل گئی۔ مسافر مر گئے۔ پچاس دن تک ہوا چلا کی۔ ہمدان، بغداد و کوفہ تک پہونچی۔ وحشی جل بھن گئے۔ بازار بند ہو گئیں۔ راستے مسدود ہو گئے۔

تیسرا دور

معتمد علی اللہ ابن متوکل، یہ تیسرا بیٹا متوکل کا ہے۔ انکی ماں روم کی تھیں۔ فتیان نام۔ انکو قید سے نکال کر خلیفہ بنایا۔ یہ بزرگوار دولت پاکر آپے سے گذر گئے عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ رعیت سے غافل ہو گئے۔ انتظام ملک اوروں کے ہاتھ میں رہا۔ لوگ ناخوش ہوئے۔ غنیم چڑھ دوڑے۔ زنج نے "بصرہ" لے لیا۔ علاقہ کو ویران کر دیا۔

پھر ایسی وبا آئی کہ عراق میں ہزاروں کا وارا نیارا ہو گیا۔ پھر زلزلوں اور مہیب آوازوں کا زور شور ہوا۔ ہزاروں دب کر مر گئے۔ بہبود زنجی سنہ ۲۵۵ھ میں مدعی رسالت اور غیب دانی کا تھا۔ انھیں کے عہد میں قتل ہوا۔ اس ملعون نے ڈیڑھ کرور مسلمان قتل کیے تھے۔ بصرہ میں ایک دن میں تین لاکھ آدمی مارے گئے۔ ایک ایک زنجی کے پاس دس دس سیدانیاں تھیں دو دو تین تین پیسے کو فروخت کرتا تھا۔ جب اسکا سر نیزے پر رکھکر بغداد میں آیا تو بڑی خوشی ہوئی۔

چوتھا دور

معتضد باللہ بن موفق بن متوکل۔ انکی ماں کا نام صواب، یا حرز، یا ضرار تھا۔ ام ولد تھے۔ معتمد نے اپنے بیٹے مفوض سے ولیعہدی واپس لے کر انکو ولیعہد کیا تھا۔ اسکا حکم تھا کہ منجم اور قصہ گو بر سر راہ نہ بیٹھیں۔ کتب فلسفہ و جدل نہ بکیں۔ عقلمند اور بہادر آدمی تھا۔ سنہ ۲۸۵ھ میں زرد آندھی بصرہ میں آئی پھر سبز ہو گئی، پھر سیاہ۔ یہاں تک کہ دور دراز شہروں میں پہونچی۔ پھر اولے پڑا ہر اولہ برابر ڈیڑھ سو درہم کے تھا۔ درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ ایک گانوں پر سیاہ و سفید پتھر پڑے۔ سنہ ۲۸۶ھ میں ابو سعید قرمطی کا غلبہ بصرہ وغیرہ پر ہو گیا۔ آخر کو مر گیا۔

پانچواں دور

پانچویں دور میں ایک اور مصیبت بصرہ پر آئی کہ مکتفی باللہ بن معتضد باللہ اسکی ماں ترکی تھی جیک نام

نہایت حسین مہ جبین بہ باپ کے مرض موت میں خلیفہ ہوا۔ باپ کے تعمیر کو مساجد بنایا۔ باغ اور دوکان جو محلسرا کے لیے باپ نے چھین لیے تھے رعایا کو واپس کردیے سب لوگ دعائیں دیتے تھے۔ اسی سال بغداد میں ایک سخت زلزلہ آیا۔ بصرے میں آندھی چلی۔ درخت جڑ سے اُکھڑ گئے ایسی آندھی پہلے نہیں سنی گئی تھی۔ خلفاے عباسیہ کی کمزوری کے ساتھ ساتھ شہر بھی ویران ہوتے گئے۔ اب یہاں تک نوبت پہونچی کہ ہمارا اسلامی سیاح "بصرہ" میں پہونچا۔ وہ دور دورہ بصرہ کا نہ رہا جو دور اوّل میں تھا۔ مگر

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ آثار پدید است صنا دید عجم را

ابن بطوطہ بصرہ کی تفصیل وار حالت اپنی چشم دید لکھتا ہے جو نذر ناظرین ہے

۲

چھٹا دور ابن بطوطہ کی زبانی

ہمارا اسلامی سیاح ابن بطوطہ بیان کرتا ہے کہ "بصرے میں ہم لوگ مالک بن دینار کے رباط میں اترے۔ جس وقت میں بصرہ میں تھا تو دیکھا کہ تخمیناً دو میل کے فاصلے پر ایک ایسی عمارت ہے جو مثل قلعہ کے قائم ہے۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے انھوں نے بیان کیا کہ یہ جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مسجد ہے۔ اگلے زمانہ میں "بصرہ" اسقدر وسیع تھا کہ یہ مسجد ناف شہر تھی اور اب یہ حالت ہے کہ آبادی سے دو میل کے فاصلہ پر ہو گئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس شہر پناہ کی دیوار مسجد کے اُس پار تھی اب یہ حال ہے کہ اس مسجد سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت ایک زمانہ میں وہ مسجد بیچ شہر میں ہوگی۔ الحاصل شہر بصرہ عراق کے امہات بلاد سے ہے جسکا شہرہ تمام جہان میں ہے۔ اس شہر کے اطراف کی بہت بڑی وسعت ہے اور سواد اسکا بہت ہی دلچسپ اور مصفا ہے۔ باغات اس میں بہت کثرت سے ہیں اور فواکہات کی پیداوار یہاں بہت ہوتی ہے۔ تازگی اور پیداواری سے مالامال ہے۔ دریاے شور اور دریاے شیریں دونوں کا یہاں مجمع ہے۔ خداے عزوجل کا یہ نمونہ قدرت ہے

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل سلماے حدوث تو و لیلاے قدم را

اس شہر سے بڑھکر دنیا میں کہیں ایسا نخلستان نہیں ہے۔ یہاں بازار میں کھجوریں ایک درہم کی چودہ عراقی رطل ملتی ہیں۔ درہم بھی یہاں کا بہت چھوٹا ہے بقدر ایک ثلث نقرہ کے ہوتا ہے یہاں کے قاضی حجۃ الدین نے ایک بوجھ کھجور کا اتنا بڑا کہ ایک آدمی سے بدقت تمام چل سکے میرے پاس بھیجا

بہت زیادہ تھا۔ میں نے چاہا کہ اسکو فروخت کرڈالوں۔ چنانچہ تہائی حصہ اس میں سے مزدور سنے بازار لے جانے کی مزدوری لے لی باقی سب نو درہم کو فروخت ہوئیں۔ اس کھجور سے یہاں ایک قسم کا شہد تیار ہوتا ہے جو نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے۔

بصرہ تین محلوں پر منقسم ہے۔ ایک کا نام ہذیل ہے۔ یہاں کا رئیس یعنی امیر محلہ شیخ فاضل علاء الدین ابن الاثیر ہے یہ منجملہ کرام فضلاء سے ہے۔ اس شیخ نے میری دعوت کی تھی اور مجکو بہت کپڑے اور درہم دیئے تھے۔ دوسرے محلہ کا نام بنی حرام ہے۔ اس محلہ میں سب سے بڑھکر عالی مرتبہ سید شریف مجد الدین موسیٰ حسینی بہت بڑے صاحب مکارم و اخلاق ہیں۔ اُنکے فضائل حد بیان سے باہر ہیں ان بزرگوار نے بھی میری دعوت کی تھی اور مجکو بہت سی کھجوریں اور شالی کپڑے اور درہم دیے تھے۔ تیسرے محلہ کا نام محلہ العجم ہے۔ اس محلہ کا سب سے بڑا اور بزرگ شخص جمال الدین ابن اللو ہے۔ اہل بصرہ سب کے سب بڑے کریم اور خلیق لوگ ہیں پردیسی مسافروں کی بڑی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ اور بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ حق مسافر نوازی کا پورا ادا کرتے ہیں۔ مسافر وہاں ذرا بھی نہیں گھبراتا ہے۔

وہاں کے لوگ جمعہ کی نماز مسجد جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ میں ادا کرتے ہیں جسکا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ نماز جمعہ کے بعد وہ مسجد بند کردی جاتی ہے۔ پھر سوائے جمعہ کے اس میں کوئی نہیں آتا ہے۔ یہ مسجد سب مسجدوں سے عمدہ اور بہت وسیع ہے اسکا فرش سرخ اُن کنکریوں سے بنا یا ہے جو وادی سباع سے آتی ہیں۔ اس مسجد میں وہ قرآن شریف بھی ہے جسکو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پڑھتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ خون کا دھبہ جو اس قرآن میں ہے وہ اُسی ورق میں ہے جس میں یہ آیت ہے "فسیکفیکہم اللہ وہو السمیع العلیم"۔

جناب عثمان بن عفان رضی نے اپنے زمانہ میں اس قرآن مجید کو مسجد طبریہ میں رکھوایا تھا۔ المنصور طفتگین جب طبریہ سے نکلا اپنے ساتھ لیکر آیا۔ اور اسکو جامع اموی دمشق میں رکھا۔ اب ہمارا اسلامی سیاح ابن بطوطہ "بصرہ" میں بتا رہا ہے۔

بڑی عبرتناک یہ حکایت ہے " ایک مرتبہ میں جمعہ کی نماز پڑھنے آیا۔ جمعہ کی نماز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مسجد میں ہوتی ہے۔ خطیب جب خطبہ پڑھنے ممبر پر کھڑا ہوا تو اُسکے پڑھنے کا عجب لحن تھا۔ یعنی ایسے بھونڈے پن سے بلحن جلی پڑھتا تھا کہ جیسے کوئی جاہل لفظوں کو توڑ توڑ کے پڑھتا ہے

پڑھتا ہے اور عجب طریقہ سے وہ اُسے مخرج کرتا تھا۔ مجھکو سنکر کمال تعجب ہوا۔ چنانچہ میں نے اس امر کو قاضی محبّ الدین سے بیان کیا قاضی نے کہا کہ اب اس شہر میں کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا جو کچھ اس علم سے واقف ہو۔ اگر غور کیا جائے تو بڑی عبرت کا مقام ہے اور کیسا انقلاب ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ یہ وہی بصرہ ہے کہ علمِ نحو کی یہاں بادشاہت تھی۔ اسی مقام سے نشوونما پاکر یہ درخت علم کا بارآور ہوا۔ یہیں کے لوگوں پر امامت اور سبقت نحو کی مسلم تھی۔ کیسے کیسے جید نحوی اور ادیب اس سرزمین میں آرام کر رہے ہیں۔ اصمعی[۵۱]، ابو العباس بن فرح معروف بہ ریاشی[۵۲]۔ حسن بصری[۵۳] رحمۃ اللہ علیہ، اور دیگر کبائر علمائے نحو و ادب کا اسی سرزمین سے اوج و عروج ہوا۔ یا اب یہ حال ہے کہ پیش امام جمعہ کا خطبہ ٹھیک طور پر پڑھ نہیں سکتا۔ گویا اسی شہر میں اس علم کا

---

۵۱ ابو سعید عبد الملک معروف بہ اصمعی بن قریب علم کتاب و سنت و لغات میں یکتائے دہر تھے۔ سولہ ہزار ارجوزہ انکو یاد تھے۔ اور تفسیر قرآن مجید میں احتیاط بہت کرتے تھے۔ اگر کوئی معنی کسی آیت کے پوچھتا تو کہتے کہ "حسب قواعدِ عربیت یہ معنی ہیں اور میں نہیں جانتا کہ مراد آیت کیا ہے۔" ۲۱۶ھ ہجری میں بصرہ میں مدفون ہوئے۔

۵۲ ریاشی۔ ابو الفضل عباس بن فرح۔ بزمانۂ علوئین زنجیوں کے ہاتھ سے ۲۵۷ھ میں بصرہ کے قتل عام میں مقتول ہوئے۔

۵۳ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ آپ نے کئی صحابیوں سے روایت حدیث فرمائی۔ دو برس خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باقی تھے کہ جناب رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک روز انکی ماں کچھ کام کو گئیں۔ حضرت ام سلمان نے آپ کو دودھ اپنا دیا۔ یہ سب برکات انھیں کے ہیں۔ بصرہ میں وفات ہوئی۔ جناب علی کرم اللہ وجہہ کے مرید اور شاگرد تھے۔ سلسلۂ چشتیہ انھیں بزرگوار سے جناب امیر المومنین کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے۔ اور شیخ حبیب عجمی آپ کے ہمعصر ہیں۔ اور دیگر کمالات آپ کے مبسوط تاریخوں میں درج ہیں علاوہ ان بزرگوار کے بصرہ کے اور اکابر علما ہیں۔ چنانچہ ۱۶۵ھ میں سب سے پہلا شخص اسلام میں ابو الحفص ربیع بصری ہے۔ جس نے تصنیف کی بنیاد ڈالی لیکن صاحب کشف الظنون امام عبد الملک بن عبد العزیز بصری کا نام لیتے ہیں جو ۱۵۰ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ مولانا ابو الحفص کی وفات ۱۶۰ھ میں سندھ میں ہوئی جو ہندوستان میں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ یہ بصرہ کے نہیں ہیں واللہ اعلم غرضکہ یہ دونوں حضرات ابتدائی مصنف ہیں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلی تصنیف کس کی شائع ہوئی جس راوی کی نظر سے پہلی تصنیف جسکی گذری اُس نے اُسکا نام مشہور کر دیا۔

مشہد مقدس تیار ہو گیا جس پر آج کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نظر نہیں آتا ۔

اس مسجد میں سات منارے ہیں ۔ ایک منارہ وہ ہے جسکی بابت لوگوں کا بیان ہے کہ جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کا نام نامی لینے سے منارہ جنبش میں آجاتا ہے ۔ میں بمعیت اہل بصرہ اس منارہ پر مسجد کی چھت پر سے ہو کر گیا ۔ میں نے دیکھا کہ اُسکے کھمبے میں ایک ہتہ لکڑی کا لوہے کی کیلوں سے اس خوبصورتی اور صفائی سے لگا یا تھا کہ اُسکا جوڑ نامعلوم تھا ۔ نہایت کاریگری سے چھپایا گیا تھا کہ ہاتھ لگانے سے اُسکے جوڑ میں بالکل کھڑکھڑاہٹ نہ تھی ۔ جو شخص میرے ساتھ تھا اُسکے پاس گیا اُسنے اپنے ہاتھ کو اُس ہتہ میں ڈالکر کہا " امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر کی طفیل میں جنبش کر " یہ کہکر اپنا ہاتھ اُس ہتہ میں ڈالکر ہلایا تو تمام مکان اُس حرکت سے جنبش میں آگیا ۔ اُسکو دیکھکر میں نے یہ حرکت کی کہ ہتہ میں ہاتھ ڈالکر میں نے کہا کہ " میں کہتا ہوں کہ بحق سر ابی بکر خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو جنبش کر " اور میں نے اُس ہتہ کو ہلایا ۔ وہ منارہ پھر جنبش میں آگیا ۔ اُن لوگوں کو اس بات سے بڑا تعجب ہوا ۔ کُل اہل بصرہ سنی المذہب ہیں اس وجہ سے اس حرکت میں کوئی خدشہ مجھے معلوم نہ ہوا ۔ اگر ایسی حرکت کسی سے مشہدِ حضرت علی یا مشہدِ حضرت حسین رضی اللہ عنہما میں ، یا حلہ ، یا بحرین ، یا قم ، یا قاشان ، یا ساوا ، یا آوہ ، یا طوس میں سرزد ہوتی تو وہ ضرور مار ڈالا جاتا اسلیے کہ وہاں کے لوگ بہت متعصب ہیں ۔

ابن جزی کہتے ہیں کہ میں نے شہر برشانہ میں جو وادیِ منصورہ مضافات اندلس سے ہے ایک منارہ دیکھا ہے کہ وہ بغیر کسی خلیفہ اور کسی دوسرے کا نام لیے ہوے ہلجاتا ہے ۔ وہ مسجدِ برشانہ کی بڑی مسجد کا منارہ ہے ۔ یہ مسجد بہت وسیع ہے ۔ عمارت بھی کوئی قدیم نہیں لیکن خوبصورتی اُس کی عمارت کی بہت بے نظیر ہے ۔ اور وہ منارہ کسی دوسری عمدہ عمارت سے کچھ کم نہیں ۔ اور جتنی عمدہ سے عمدہ عمارتیں اور منارے دیکھے گئے ہوں گے ویسا ہی اچھا اور عمدہ یہ بھی منارہ ہے ۔ عمارت کی موزونیت سے منظر اسکا نہایت خوبصورت نظر آتا ہے ۔ طول وعرض وارتفاع میں نہایت موزوں اور ایک متوسط حالت کی عمارت ہے ۔ ہر پہلو سے دیکھنے میں خوبصورت نظر آتی ہے اور اس شہر میں یہی بڑی مسجد کہلاتی ہے ۔ ایک مرتبہ میں اُسکے منارے پر چڑھا میرے ساتھ اور بہت لوگ تھے ۔ میرے ساتھیوں نے اُسکے پتھر کے کونے کو ہلایا تو تمام مکان ہلنے لگا یہاں تک کہ میں نے اُن کو

منع کیا کہ بہت نہ ہلاؤ۔ میرے کہنے سے وہ لوگ رُک گئے۔

بصرہ کے مشاہد متبرکہ کا ذکر

قبر جناب طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منجملہ عشرۂ مبشرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ یہ مشہد شہر کے اندر ہے۔ اس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے اور ایک مسجد اور ایک خانقاہ بھی وہاں ہے۔ اس خانقاہ میں ہر ایک وارد و صادر کو کھانا دیا جاتا ہے۔ اہل بصرہ اس مشہد کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور درحقیقت وہ ہے بھی اسی لائق۔

مشہد حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ حواری رسول اللہ علیہ وسلم ہیں اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ یہ مشہد بصرہ کے باہر ہے۔ نہ اس پر کوئی قبہ ہے اور نہ یہاں کوئی مسجد ہے صرف ایک خانقاہ ہے جس میں مسافروں کو کھانا دیا جاتا ہے۔

مشہد حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ جناب دائی حلیمہ والدۂ رضاعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ اس قبر کے پہلو میں جناب حلیمہ کے بیٹے آنحضرتؐ کے رضاعی بھائی کی بھی قبر ہے۔

قبر حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ۔ یہ حضرت ابی بکر صحابی ہیں، خلفاے راشدین میں سے نہیں جن سے مراد جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابن بطوطہ نے جناب امیرالمومنین کا ذکر مدینۂ منورہ میں کیا ہے۔ ناظرین کرام اس نام سے دھوکا نہ کھائیں اس لحاظ سے ہم جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی لکھے دیتے ہیں جو ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں موجود ہے:۔

مدینہ طیبہ کے ذکر میں ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "اُسی دن شام کو حرم شریف میں داخل ہوئے اور مسجد کریم تک پہونچے اور صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے شام کو حرم شریف میں وقوف دارالسلام سے سعادت حاصل کی اور روضۂ مبارک میں درمیان قبر شریف اور ممبر کریم کے نماز پڑھی اور اُس شاخ درخت پر جس نے فراقِ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں نالہ و بکا کیا تھا بوسہ دینے سے شرف سعادت حاصل کیا۔ یہ شاخ درخت کا ٹکڑا جو اب باقی ہے وہ اُس ستون کے داہنی جانب ہے۔ رخ بقبلۂ مصحف ہے جو مابین قبر شریف اور ممبر کے قائم ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر فاتحہ وسلام پڑھا۔ اور نیز آنحضرتؐ کے ہر دو یارانِ ہم پہلو یعنی جناب ابوبکر صدیق خلیفۂ اول اور ابو حفص عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر حق سلام ادا کرکے دولت سعادت حاصل کی اور اپنے قیام گاہ پر واپس آئے۔ اس نعمت عظمیٰ کے حاصل ہونے اور اس

نعمت کبریٰ کی کامیابی سے بہت مسرور ہوئے اور خداوند کریم کا بڑا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ اُسنے اپنے رسول کریم کے اکثر متبرکہ مخصوصہ اور مشاہد عظمیٰ بلند مرتبت کے شرف زیارت سے مشرف کیا اور اس بات کی دعا درگاہ خداوندی میں کرتے ہوئے کہ خدایا دوبارہ پھر ان زیاراتِ عالیہ سے سربلندی نصیب ہو اور ہماری یہ زیارت قبول ہو اور ہمارا سفر راہ خدا میں لکھا جائے ہزار شکر بھیجا"

قبر حضرت ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ۔ بصرہ سے چھ میل کے فاصلہ پر وادی سباع کے قریب حضرت انس بن مالک خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے۔ چونکہ اس مقام میں آبادی نہیں ہے اور درندے وہاں کثرت سے رہتے ہیں وہاں بغیر مجمع کثیر کے زیارت کی کوئی راہ نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی قبر۔ سید التابعین جناب حسن بصریؒ، محمد بن سیرینؒ اور محمد بن واسع رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قبریں ہیں۔ ان جملہ مقامات کے اوپر ایک ایک تعویذ بنا ہوا ہے جس میں صاف صاف صاحب قبر کا نام اور تاریخ وفات لکھی ہے اور یہ مشاہد متبرکہ شہر پناہ کے اندر تھے مگر اب شہر سے اور اُن سے تین میل کا فاصلہ ہے۔ علاوہ انکے ایک جم غفیر صحابہ اور تابعین شہدائے یوم جمل کی قبور مقدسہ بھی وہاں موجود ہیں۔

میں جس زمانہ میں بصرہ گیا تھا تو اُس وقت امیر بصرہ رکن الدین عجمی توزیری تھا۔ اُس نے میری ضیافت کی اور میرے ساتھ سلوک پیش آیا۔

بصرہ، فرات اور دجلہ کے ساحل پر واقع ہے۔ جس طرح سے سلانڈی میں مدوجزر ہوتا ہے اسی طرح اس میں بھی مدوجزر ہوتا ہے۔ وہ آب شور خلیج جو کہ نہر فارس سے نکلی ہے یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب مد ہوتا ہے تو کھاری پانی خلیج کا شیریں پانی پر غالب ہوتا ہے اور جب جزر ہوتا ہے تو شیریں پانی شور پر غالب ہو جاتا ہے۔ بہرحال اہل بصرہ کے گھروں میں پانی سے سیرابی رہتی ہے اسی واسطے یہ مثل مشہور ہے "ان ما رہم زعاق" یعنے اُنکا پانی جوش زن ہے۔

خاتمہ

اب ہم کو اس قدر اور بتانا ہے کہ جس زمانے میں ہمارا اسلامی سیاح بصرے پہونچا ہے اُسوقت بغداد کی کیا حالت تھی اور خلیفہ کس کشاکش میں تھا۔ لہذا ہم بغیر کسی تبصرہ کے ان حالات کو نذر ناظرین کرتے ہیں۔

مستنصر باللہ ابن ظاہر باللہ انکی ماں جاریہ تھیں۔ قوم ترک سے۔ ۶۲۳ھ میں خلیفہ ہوئے۔ رعایا میں

عدل وانصاف کیا۔ اہل علم ودین کو اپنا مقرب بنایا۔ مساجد ومدارس وغیرہ بنائے۔ نشر سنین کیا۔ لوگوں
کو سنت پر قائم کیا۔ لشکر جمع کیے۔ قلعے فتح کیے۔ حفظ سرحد کیا۔ کسی طرح کا کوئی عیب نہ تھا۔ تتار نے
قصد حرب کیا تو اُنکے لشکر نے تتار کو شکست فاش دی۔ اُنکا بھائی خفاجی (لقب) کہتا تھا کہ اگر میں والی
ہوتا تو جیحوں اُتر کر سارا ملک تتار چھین لیتا۔ جڑ سے اُکھاڑ دیتا۔ لیکن اسی درمیان میں مستنصر قید ہو گیا۔ لوگوں
نے ابو احمد پسر مستنصر کو بٹھا دیا۔ احمد نرم دل اور ضعیف العقل تھا، بہت مسلمان ہلاک ہو گئے۔ تتار کو
غلبہ ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسکے بعد المعتصم باللہ خلیفہ ہوئے۔ اُنکا وزیر ابن علقمی ہوا۔ وہ کمبخت لامذہب بد باطن ظاہر میں
خلیفہ کے ساتھ تھا اور باطن میں تتار سے ملا ہوا تھا۔ اُس نے پھر تتار کو طمع دی کہ عراق اور بغداد لے لو
جو خطوط اور خبریں تتار کی آتیں اُنکو مخفی رکھتا اور خلیفہ کی خبریں تتار کو پہونچاتا

اب وزیر علقمی نے یہ حرکت کی کہ لشکر جو بیشمار تھا اُس میں تخفیف کر دی۔ ابھی تک
تتار اور طرف لڑ رہے تھے اور کامیاب ہوتے جاتے تھے جسکی خبر خلیفہ کو کچھ نہ تھی۔ دوسری چال یہ چلی کہ
خلیفہ کو صلح کی بہلے دی۔ تتار سے وعدہ کیا کہ جب بغداد مل جائے تو ہمکو اپنا نائب کرنا۔ بالآخر اہلِ
تتار لڑتے بھڑتے، مارتے پیٹتے، دنیا کو برباد کرتے ۶۵۶ھ میں بغداد میں پہونچے۔ دو لاکھ فوج تھی۔
ہلاکو اُنکا افسر تھا۔ خلیفہ کا لشکر باہر نکلا شکست ہوئی۔ عاشورہ کے دن بغداد کے اندر گھس گئے۔ وزیر
علقمی نے خلیفہ سے صلح کرنے کو کہا۔ چکمہ دیا کہ تم صرف چلے چلو صلح کی تقریر میں کروں گا۔ وہ بیچارہ غریب
اسکے دھوکے میں آگئے اور اُسکی بات پہ بھروسہ کیا اور یہ بھی لالچ دیا کہ وہ اپنی بیٹی تمھارے بیٹے سے بیاہ
دے گا اور تمکو خلیفہ بنائے رکھے گا۔ "(آہ سلطنت کی تمنا بری ہوتی ہے)"۔ اُسکا صرف یہ مطلب ہے کہ تم سے اطاعت
لیلے۔ اور ان سب کاموں کے بعد وہ اپنا لشکر لیکر چلا جائیگا۔ غرضکہ وہ سب اعیان واکابر کو لیکر چلے۔ ایک خیمہ
میں اُترے۔ وزیر علقمی نے فقہا اور اماثل کو بلایا کہ وقت عہد کے حاضر ہوں۔ وہ سب بغداد سے باہر گئے
سب کی گردنیں ماری گئیں۔ ایک ایک گروہ علیحدہ علیحدہ آتا تھا اور اُنکی گردنیں ماری جاتی تھیں۔ یہاں
تک کہ سارے علما فضلا، امرا و رؤسا، حجاب و اکابر مارے گئے اور پھر بغداد پر تلوار چلی۔ چالیس دن
تک قتل عام ہوتا رہا۔ ایک کرور آدمی ہلاک ہوئے کوئی نہ بچا سوائے ایک دو کے جو کنوئیں میں چھپ رہے
تھے۔ خلیفہ بھی مارے گئے۔ نوبت دفن کی نہ آئی۔ وزیر نے جو منصب مانگا تھا وہ بھی نہ ملا۔ بہت ذلیل ہوا،

۶۵۸ھ تک دنیا بلا خلیفہ رہی

تاتار کی آمد مصر کی جانب

صاحب مصر، منصور نام، ایک بچہ تھا۔ اُسکے وزیر سیف الدین معزی نے سب اعیان کو جمع کیا۔ شیخ الاسلام عزالدین سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سارے عالم کو چاہیے کہ دشمن سے لڑیں بیت المال میں جب کچھ نہ رہے رعایا سے مانگیں۔ اُن سے سامان لیں۔ ایک ایک گھوڑا مع ہتھیار سب کے پاس ہو۔ سیف الدین ملقب بہ "ملک المظفر" مخاطب ہوئے ۶۵۸ھ میں بھی کوئی خلیفہ نہ تھا۔ اس سنہ میں تاتار فرات اُتر کر حلب میں پہونچے۔ وہاں کی خلق کو تہ تیغ کرکے دمشق آئے۔ اہل مصر شام کی طرف متوجہ ہوئے۔ تاتار سے لڑنے کو چشمۂ جالوت پر صف آرا ہوئے۔ روز جمعہ ۱۵ رمضان کو تاتار نے سخت شکست کھائی مسلمانوں نے فتح پائی والحمدللہ

بیبرس نے تعاقب تاتار کا کرکے اُنکو نکال دیا۔ سلطان مظفر نے بیبرس سے وعدہ حلب دینے کا کیا تھا پھر اس سے رجوع کیا۔ بیبرس نے مخالفت اختیار کی۔ جب مظفر مصر کی جانب آنے لگا راہ میں بیبرس نے قتل کیا خود ملقب بہ ملک قاہر ہوا۔ مصر میں آیا۔ جو مظالم مظفر نے مصر میں جاری کیے تھے دُور کر دیے۔ پھر وزیر کے کہنے سے لقب قاہر کا بدل کر ظاہر اختیار کیا۔ ۶۵۹ھ میں بھی دنیا خلیفہ سے خالی رہی۔ یہاں تک کہ مصر میں خلافت قائم ہوکر مستنصر سے بیعت لی گئی۔ ساڑھے تین برس تک کوئی خلیفہ نہ رہا۔

مستنصر باللہ ابن ظاہر باللہ۔ بغداد میں قید تھے جب تاتار نے بغداد لے لیا مستنصر باللہ کو رہا کر دیا۔ یہ بھاگ کر غرب عراق کو چلے گئے۔ جب بیبرس کو سلطنت مصر حاصل ہوئی دس آدمیوں کے ہمراہ مستنصر مصر میں آئے۔ بیبرس نے مع قضات اور امرائے دولت استقبال کیا۔ قاضی القضات تاج الدین کے روبرو مستنصر نے اپنا نسب ثابت کیا اُس وقت سب نے اُن سے بیعت کی۔ پھر قاضی القضاۃ نے پھر شیخ عزالدین ابن عبدالسلام نے پھر سب اکابر نے۔ مستنصر کے نام کا سکہ جاری کیا گیا۔ خطبہ پڑھا گیا لوگ خوش ہوئے۔ جمعہ کے دن سیاہ لباس پہن کر جامع قلعہ میں نماز جمعہ پڑھی۔ ممبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھا اُس میں ذکر شرف بنی عباس کیا سلطان اور اہل اسلام کے واسطے دعائے خیر کی پھر سلطان کو خلعت دیا حکومت کا فرمان بخشا عہد حکومت لکھ دیا۔

سلطان نے خلیفہ کے واسطے گھر بار، اخشام ضروری، مصارف لابدی مقرر کیے۔ سو گھوڑے، دس خچر، دس قطار اونٹ، بہت سے غلام، ایک اتابک ایک خزانچی ایک منشی اور غلہ خلہ وغیرہ وغیرہ دیے۔

پھر مستنصر نے ارادہ عراق کا کیا - سلطان نے مشایعت کی بہت ساسامان دیا - جب سلطان روانہ ہوے بہت سے ملوک اُنکے ہمراہ تھے - صاحب موصل، صاحب سنجر، صاحب جزیرہ - راہ میں حاکم حلب اُس نے اطاعت کی - حدیثہ اور ہیت کو فتح کیا - راستہ میں لشکر تتار سے مقابلہ ہوا - بہت سے مسلمان لے گئے - خلیفہ کھوگئے ظاہر یہ ہے کہ شہید ہوگئے یا بچکر روپوش ہوگئے - یہ واقعہ سنہ ۶۶۰ھ کا ہے - الحاکم بامر اللہ کے بعد المستکفی باللہ سنہ ۷۰۱ھ میں خلیفہ ہوے - بلادِ مصریہ وشامیہ میں انکا خطبہ پڑھا گیا سارے اقطاعِ ممالک اسلامیہ میں اسکی خوشخبری پہونچی - سنہ ۷۰۲ھ میں تتار نے شام پر چڑھائی کی - خلیفہ سے لڑائی مسلمان جیتے تتار ہارے - بہت سے مارے گئے باقی بھاگ گئے - اسی سال مصر میں ایک زلزلۂ عظیم آ جس میں بہت لوگ گھروں میں دبکر مرگئے - سنہ ۷۰۴ھ میں امیر بیبرس نے سعدالدین حارثی کو مدرسہ میں شیخ الحدیث اور ابوحیان کو شیخ النحو مقرر کیا - سنہ ۷۰۸ھ میں ملک ناظر بن قلادن کو معزول کر دیا - اُنکی جگہ پر بیبرس جاشنگیر سلطان ہوے خلیفہ نے انکو خلعتِ سیاہ دیا اور عمامہ بخشا حاکم شام کر دیا - سنہ ۷۳۶ھ میں درمیان خلیفہ اور سلطان کچھ چشمک ہوگئی - سلطان نے خلیفہ کو مع اہل وعیال قید کرکے قوص بھیجدیا قریب سو شخص ہمراہ تھے، کچھ وظیفہ مقرر کر دیا - یہاں تک کہ سنہ ۷۴۰ھ میں وہ مقام قوص میں مرگئے - کچھ اوپر پچاس کی عمر ہوئی - اِنّا للہ - لیکن حالتِ حبس میں بھی خطبہ انھیں کے نام کا پڑھا جاتا تھا مستکفی کے مرتے ہی منابر سے اسم خلافت اُڑ گیا - اب خلیفہ کا نام خطبہ میں نہ پڑھا جاتا تھا -

یہی زمانہ تھا کہ ہمارا اسلامی سیاح ابن بطوطہ سفر کر رہا تھا - اب تصور کرنا چاہیے کہ کیسی کیسی آفتیں "بصرہ" پر آئیں اور کیا کیا قیامت لوگوں پر گذری - ہمارے اسلامی سیاح نے جو کچھ حالت بصرہ لکھی ہے پھر بھی غنیمت ہے، اب خدا جانے کیا حالت ہوگی - ہمارے بہادر مسافر جو اسوقت وہاں عجیب وغریب سینریوں سے دلچسپی اُٹھا رہے ہیں اُن سے اسوقت کے حالات بخوبی معلوم ہوں -

اب ہم کو اس قدر اور لکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اپنے اسلامی سیاح ابن بطوطہ کا اسلامی پبلک سے تعارف کرادیں: اس فاضل سیاح کا نام ابو عبداللہ بن محمد بن ابراہیم، عرف ابن بطوطہ ہے - بلادِ شرقیہ میں اسکا نام شمس الدین مشہور ہے - شہر طنجہ جو بلادِ مغرب میں ہے اسکا مولد ہے - دوشنبہ رجب سنہ ۷۰۳ھ میں ولادت ہوئی - اُسکا ایک معاصر اُسکے حق میں لکھتا ہے " فقیہٌ ثقةٌ صدوقٌ " یعنی یہ شخص بڑا سچا ہے - پایۂ تخت دہلی میں سلطان محمد شاہ ابن تغلق کے دربار میں عہدۂ قضاءِ مالکیہ سے ممتاز تھا - یہ شرفا

تمام دنیا میں پھرا ہے اور بنظر غور و تجربہ ہر شہر میں اسکا گذر ہوا ہے اور تمام عرب و عجم میں بغرض دریافت حقیقت حال اس نے سیر کی ہے - بیس برس سیاحت کرنے کے بعد سلطان ابو عنان ملک افریقیہ کے دربار میں جو بنی مرین کا بڑا جلیل القدر بادشاہ تھا، داخل ہوا - سلطان نے اُسکے حال پر بہت التفات فرمائی اور احسانات سے مالامال کر دیا - اور یہیں پر اسکا سفرنامہ مرتب ہوا - ۷۲۵ھ سے اسکا سفر شروع ہوا بیس برس سیاحت کی - ابن بطوطہ خود لکھتا ہے کہ اُسوقت میں ابو سعید ابن مولانا امیر المومنین - سے امام مقدس ابو یوسف عبد الحق کا عہد حکومت تھا - انکے فضائل و مکارم صحیح طور سے کتب سیر میں مشہور ہیں - علامہ ابن جزی نے سلطان ابو عنان کے حکم سے اس سفرنامہ کو مرتب کیا -

سید برکات احمد لکھنوی

نوحہ پُر درد ہے یہ بلبلِ ناشاد کا
یا ہے افسانہ مشیرِ کشتۂ بیداد کا

زور میرے بازووں میں ہے ابھی اے ہمصفیر
دیکھ لیگا پارہ پارہ دام تو صیاد کا

دم نہیں مجھ میں مگر اللہ رے شوقِ ستم
امتحاں جاری ہے ابتک اُس ستم ایجاد کا

آستانے پر ترے کچھ تو پڑا ہے لال لال
اشکِ خوں آلودہ ہو یا دل کسی ناشاد کا

سخت جانی نے وہ ہمت کی کہ عاجز کر دیا
میری جانب سے مڑا مُنہ خنجرِ فولاد کا

ڈھونڈھ لیگی اک نہ اک دن اسکو برقِ انتقام
خاک میں مل جائیگا اک روز گھر صیاد کا

اُنکے آنے کی خوشی ہے ساتھ ہی جانے کا ڈر
دل میں یہ مجمع ہو گیا ہے اس طرح اضداد کا

حاضر و غائب ہے یکساں والہ و شیدائے گل
یہ کھلا جوہر قفس میں بلبلِ ناشاد کا

چند تنکے جو پڑے ہیں ایک سوکھی شاخ پر
بس نشیمن تھا وہیں اس خانماں برباد کا

دور پھینکا ہے چمن سے فصلِ گل میں چرخ نے
حال کسکو اب سنائے بلبل اس افتاد کا

وہ امید و بیم کی حالت ہے طاری اندنوں
دل نمونہ ہے چراغِ رہگذارِ باد کا

چونک اُٹھینگے ذرا تو خوابِ شیریں سے حضور
کیا نہ اتنا بھی اثر ہوگا مری فریاد کا

شعر گوئی سے مجھے مقصود ہے تفریحِ دل
میں نہ جویا ہوں ستائش کا نہ طالب داد کا

چیخ اُٹھتا ہے وطن کی یاد سے بیکس مشیر
جب کوئی آتا ہے جھونکا صرصرِ بیداد کا

بے ثباتیِ جہاں کا پھر گیا نقشہ مشیر
خاک پر گرتا جو دیکھا اک گلِ برباد کا

(مشیر حسین قدوائی)

بھوپال

تاریخی حالات تو مورخوں کے سر۔ شہری حالات باشندگان کے ذمہ۔ انتظامی کیفیت فرمانروا کے ساتھ ——— میں ——— حضور والا ——— آپ کی توجہ جس طرف لینا چاہتا ہوں وہ یہاں کے مناظر قدرت ہیں۔ شام کا جادو بھرا وقت۔ تاور درختوں کے ایک گنجان جھنڈ میں جو سارے درختوں سے علحدہ تھا، میں شام کے دھندلکے میں پتھریلی چٹان پر بیٹھا ہُوا سامنے بہنے والے چشموں۔ مواج تالاب اور پیڑوں کے سایہ کے متواتر تغیر و تبدل کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دھوپ کے چہرہ پر اُداسی چھا رہی تھی ——— یوں سمجھیے کہ آفتاب کا زوال آفتاب کے ستارۂ اقبال کو چمکار رہا تھا۔

کٹورے نما چکنے اور سبز پتوں سے اوپر نکلا ہوا کنول کا پھول سبک پرواز اور مختلف اللون بے مہریوں کا نشانۂ الفت تھا۔

دلفریب فضا میں ہلکی اُڑان والی تتلیاں مستی سے چکر لگا رہی تھیں۔ دھوکا ہوتا تھا کہ شاید شاداب پھلواری کے خوشنما پھول ہیں کہ جن میں جوششِ بہار نے طاقت پرواز بھر دی ہے یا آسمانی تابدار ستارے ہیں کہ اس جنت ارضی کی طرف ٹوٹ ٹوٹ کر جھک پڑے ہیں۔

تڑپ تو ماہیِ بے آب کی مشہور ہے ——— مگر یہاں اُلٹا تماشا تھا، چھوٹی بڑی سبھی قسم کی مچھلیاں سطحِ آب پر اُچھل رہی تھیں ——— خدا جانے اُنکی یہ اُچھال، یہ تڑپ کیوں تھی کیا اُنکا دل آبی دنیا میں رہتے رہتے گھبرا گیا تھا ——— یا نکلنے والے ماہتاب کی رخ بوسی کا ولولہ ساری اچھل کود کا باعث تھا۔

زوال پذیر آفتاب دریچۂ مغرب میں پہونچکر شکست مان چکا تھا ——— اُسکی اس ہار پر ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ——— تاریکی نے اُجالے پر حقارت سے پُر زور قہقہہ لگایا۔ چاند چونکہ اتنا تنگ ظرف نہ تھا ——— صرف اپنے حسن دکمل سے خاموش پانی پر، اونچے درختوں پر، بلند پہاڑیوں پر تیزی سے چمکنا شروع کیا ——— گویا لبِ خاموش سے اپنی فتحمندی کی، جو ایسے

جلیل القدر بادشاہ یا اسکو حاصل ہوئی تھی" دادیا ہی -

ہوا کے نرم نرم تھپیڑوں نے ہلکی ہلکی لہروں سے نورانی پانی کے چمکدار خزانے کو منتشر کرنا اور فیاضی سے لٹانا شروع کیا ــــــ چاندنی موجوں سے ہم آغوش ہوئی اور موجوں نے اس ٹھنڈے ٹھنڈے نور کو جوش سے چوم چوم لیا ــــــ کنول کے نیم وا پھول خوشی سے کھل گئے۔ مچھلیوں کی جست و خیز بند ہو گئی اور پانی ساکن ہو گیا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ساری شورا شوری یہ ہنگامہ صرف ماہتاب کی آمد آمد کا تھا۔ جسکی عالم آرائی نے سب کو سکون بخش دیا اور ساری کائنات محو نظارہ و تماشا ہو گئی۔ میں وقف تمنا اپنے زخم ناکامی کے اندمال اور جراحت دردن کی فکر میں ڈوبا ہوا ایک غم آلود نغمہ، ایک بیچین سرور سے یہ شعر پڑھ رہا تھا:-

حالِ عبرت زا ہوں اور ناکام چشم اعتبار آہِ درد آلود ہوں اور نارسائے گوش ہوں

تم اگر ہو بے نیازِ شکوۂ بیداد و ناز میں بھی ضبط درد کا اک پیکر خاموش ہوں

یاد ماضیہ سے دل تڑپ رہا تھا اور حالت موجودہ کی یاس انگیزی و پژمردہ ہی تپش زا تھی۔ دائیں پہلو پر کچھ سے دور ایک سر بفلک قصر جسکی عمارت کو خوبی زمانہ نے بہت کم ثابت چھوڑا تھا پہاڑی ٹیلے پر خیال رفتگاں میں گم صم کھڑی تھی۔ ایک سنگین زینہ اُس عمارت سے پانی کے کنارہ تک آنے کے لیئے کسی کی پابوسی کی حسرت میں سینہ برہنہ لب آب بنی ہوئی سہ دری میں آکر ختم ہو گیا تھا۔

آہ ــــــ آہ ــــــ نظری دھوکا کہوں ــــــ یا واقعہ سمجھوں ــــــ میں نے دیکھا کہ یکایک چاندنی ماند پڑ گئی، اور ماہتاب کا دل اس صدمہ سے داغدار ہو گیا، ستارے خجل ہو گئے ــــــ پہاڑ کا ذرہ ذرہ پانی کا قطرہ قطرہ منور ہو گیا۔ میری آنکھوں کی روشنی اُس نور میں مدغم ہو گئی ــــــ میں نے دیکھا ایک ــــــ سراپا حُسن ــــــ اپنے عارض جمال افروز سے سحر رونق دہ عالم ہے۔

وہ محل تو ــــــ رانی ــــــ کملاپتی کا تھا ــــــ لیکن وہ شعلۂ عریاں ــــــ وہ بحر نور ــــــ اور قوت ایزدی کا انتہائی کرشمہ ــــــ آپ تھے ــــــ !

عبد الحی "الک دھنکرشی"

نظرے خوش گذرے

جنگ یورپ کا اگرچہ خاتمہ ہوچکا ہے لیکن کاروبار کو اپنی اصلی حالت پر آنے کے لیے ابھی بہت دن درکار ہوں گے - کاغذ کی گرانی اور کمیابی بھی علیٰ حالہ قائم ہے - توقع تھی کہ جنوری ۱۹۱۹ء سے ہم پھر سفید کاغذ استعمال کرنے کے لائق ہوجائیں گے، لیکن حالات موجودہ کے لحاظ سے نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ابھی احباب کو تقریباً چھ مہینے اور انتظار کرنا پڑے گا -

---

اکتوبر کے الناظر میں "بازار قوم فروشی" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا تھا اُسکے متعلق قومی اخبارات میں اب تک جو خیالات ظاہر کیے گئے وہ خالی از دلچسپی نہیں - اڈیٹر صاحبان اخبار خطیب و اخبار قوم دہلی نے مناسب الفاظ میں اس مضمون پر اظہار پسندیدگی کیا ہے تو وکیل، مشرق، علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور ذوالقرنین کے اڈیٹر صاحبان اس درجہ ناراض ہیں کہ اُنکو اپنے قلم اور دل و دماغ پر قابو رکھنا ناممکن ہوگیا ہے -

اخبارات کے علاوہ بعض ممتاز اہل قلم نے بھی اپنے خانگی خطوط میں اس مضمون پر اظہار رائے کیا ہے اور عام طور پر ہمارے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے الناظر کی اس خدمت کا اعتراف کیا ہے - الناظر کے اوراق میں اس بحث پر مزید بحث کی غالباً ضرورت نہیں تاہم حسب موقع مخالفین کی رایوں سے ناظرین کرام کو مطلع کرنے کی گنجایش نکالیں گے - اس اثناء میں اگر ناظرین الناظر میں سے کسی صاحب نے مسئلہ خطاب بخشی پر کافی غور فرمایا ہو تو اپنی قیمتی رائے سے ہمیں مطلع فرما سکتے ہیں - تاکہ آیندہ اگر کچھ لکھا جائے تو اُنکے خیالات بھی ہمارے پیش نظر ہوں -

---

جنگ یورپ کے متعلق اس قدر تحریرات یورپ و ایشیا کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں کہ انکا احاطہ مشکل ہے - اور اب جو جنگ کا خاتمہ ہوچکا ہے تو یقیناً تمام زبانوں میں اسکی تفصیلی تاریخیں بھی مرتب ہوں گی اور اُردو زبان کے خدمت گزاروں کا یہ فرض ہوگا کہ ان میں سے کم سے کم چند مستند کتابوں کو

اُردو کا لباس پہنا کر اہل ہندوستان کو اس عظیم الشان جنگ کے اصلی اور واقعی حالات سے مطلع ہونے کا موقع دیں۔ کیونکہ دورانِ جنگ میں جنگی ضروریات کے باعث واقعات وحالات کی جو تفصیلات شایع ہوتی رہی ہیں اُن پر کافی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

فرانس کے مشہور فلسفی مصنف موسیولی بان نے، جسکی دو لاجواب کتابیں تمدن عرب اور تمدن ہند فرانسیسی زبان سے براہ راست اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں ۱۹۱۶ء میں ایک کتاب موجودہ جنگ کے متعلق لکھی تھی جس میں علم النفس کے اصولوں پر جنگ کے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ محمد حسن صاحب قدوائی رئیس گجگوونے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مقدمۂ کتاب کا ترجمہ انشاء اللہ الناظر کی آیندہ اشاعت میں شایع کیا جا سکے گا۔ اور امید ہے کہ یہ کتاب جلد طبع ہو کر شایقین تک پہونچ سکے گی۔

ماہ رواں کا آخری ہفتہ قریب آگیا ہے جبکہ مختلف قومی مجالس کے سالانہ جلسے منعقد ہونگے اس دفعہ چونکہ کانگریس اور اسکی متعلقہ مجالس کے اور آل انڈیا مُسلم لیگ اور اُردو کانفرنس کے اجلاس دہلی میں ہوں گے اس لیے ہندوستان کے تمام بہترین دل و دماغ وہیں مصروفِ کار نظر آئیں گے۔ لیکن دہلی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانان ہند کی دلچسپی ایک اور مقام سے بھی وابستہ رہے گی جو اگرچہ دہلی سے بہت دُور واقع ہے لیکن ہندوستان ہی کا ایک جزو اور اسلامی آبادی کا ایک قدیم مرکز ہے۔ سُورت، جہاں کہ امسال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نتیسواں اجلاس منعقد ہونے والا ہے ایک قدیم تاریخی شہر ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے ابتدائی وردوِ ہندوستان کا سب سے بڑا اور قدیم مرکز بھی رہا ہے جسکی بناپر اُسے باب المکہ کا لقب حاصل تھا۔ کانفرنس کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کا جلسۂ شبانہ بھی سورت ہی میں منعقد ہوگا۔ اور اگرچہ اندیشہ ہے کہ مُسلم لیگ کے دہلی میں منعقد ہونے کی وجہ سے ہم سورت کی حاضری سے محروم رہیں گے تاہم دعا ہے کہ ان قومی مجالس کو اپنے مقاصد میں پوری کامیابی ہو اور سورت اور اُسکے نواح میں جو مسلمان آباد ہیں اُنکے دلوں میں ہمارے تعلیمی مبلغین کی مساعیِ جمیلہ سے سچی ہمدردی پیدا ہو جائے

۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے ایک ماہوار علمی رسالہ 'معلومات' جاری ہوا تھا جسکے ایڈیٹر ہمارے عزیز دوست

مسٹر عبدالوالی بی اے تھے ۔ معلومات اگرچہ زیادہ دنوں جاری نہیں رہا لیکن جتنے دنوں نکلا نہایت آب و تاب سے نکلا ۔ اور مقامِ مسرت ہے کہ جنوری سے اُسکے دوبارہ اجرا کی توقع ہوئی ہے ۔

'صبحِ امید' کے نام سے ایک ادبی اور سیاسی رسالہ انجمن خدامِ ہند کے زیر نگرانی اکتوبر ۱۹۱۸ء سے جاری ہوا ہے ۔ اسکے ایڈیٹر ہمارے شہر کے مشہور انشاپرداز اور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست بی اے اور مہتمم پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر 'ہندوستانی' ہیں ۔ صبحِ امید کے متعلق ابھی کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی ۔ کیونکہ ابتدائی پرچے تو ہر رسالہ کے خاص اہتمام سے نکالے جاتے ہیں ۔ لیکن جن اربابِ ہمت کے ہاتھوں میں یہ رسالہ ہے اُن کی ذات سے پوری توقع اس بات کی کی جا سکتی ہے کہ وہ رسالہ کو ہر طرح کامیاب بنا سکیں گے ۔

ایک بات پھر بھی ہم اپنے لائق دوستوں سے ضرور کہنا چاہتے ہیں ۔ اور وہ یہ ہے کہ اُردو علمِ ادب میں نئے محاورات اور جدید اسلوبِ بیان کا اضافہ کرنے اور ہر قسم کی اصلاحات کو رواج دینے کی اگرچہ شدید ضرورت ہے لیکن یہ امر کچھ پسندیدہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ شوقِ جدت آفرینی میں اچھے بُرے کی تمیز قائم نہ رکھی جائے ۔

چکبست صاحب نے مختلف مواقع پر محبِ وطن کے بجائے " حبیبِ وطن " لکھا ہے ۔ حبیب کے معنے ہماری زبان میں محبوب و معشوق کے ہیں ۔ عاشق و شیدائی کے معنی میں کوئی نہیں لکھتا ۔ اور انگریزی لفظ (patriot) جس کا ترجمہ حبیبِ وطن کیا گیا ہے جہاں تک ہمیں علم ہے اُس کا استعمال بھی اسی مفہوم پر محدود ہے جو محبِ وطن یا شیدائی وطن سے پیدا ہوتا ہے ۔

ہمیں یقین ہے کہ ایڈیٹر صاحب صبحِ امید اس دوستانہ مشورہ پر از راہِ کرم توجہ فرمائیں گے اور کوشش کریں گے کہ اُنکی تحریریں اس قسم کی لغزشوں سے پاک رہیں ۔

لاہور سے مولوی سید ممتاز علی صاحب کے زیر اہتمام 'کہکشاں' بھی خوب نکل رہا ہے ۔ اور اگر اُسکی موجودہ ادبی شان قائم رہی تو 'مخزن' کے دورِ سابق کی پوری تلافی ہو جائے گی ۔ مولوی ممتاز علی صاحب کی جو منزلت اردو ادب دانوں میں ہے اُسکی وجہ سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ کہکشاں کی موجودہ رفتار آیندہ بھی قائم رہے گی ۔

بڑبڑاتے تھے اس لیے کہ اُنھیں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اضلاع سے محاصل کا آنا جدا بند ہوگیا تھا اس سبب سے خزانہ خالی پڑا تھا۔ جو کچھ روپیہ سلطان کو قرض کے ذریعہ مل سکا تھا اُسکو اُس نے معدودے چند عربوں کو رشوت دینے میں صرف کر ڈالا تھا جو ابھی تک جھوٹوں یہ ظاہر کرتے تھے کہ اضلاع میں ہم سلطان کی تائید کرتے ہیں۔ اُجڑے ہوے بازار صاف کہ رہے تھے کہ تجارت خاک میں مل گئی۔ روٹی کی قیمت اس قدر گراں ہوگئی تھی کہ عقل میں نہ آئے۔ کسی شخص کو آیندہ پر اعتماد نہ تھا۔ سب دلوں پر گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ متعصبین جو کل عمومی کمبختیوں کو عذاب الٰہی سمجھتے اور ابن حفصون کو قہر الٰہی کا تازیانہ کہتے تھے منحوس پیشینگوئیوں سے شہر پر اور بھی قہر ڈھاتے تھے۔ وہ چلا چلا کر کہتے تھے کہ " دریغا اے قرطبہ دریغا! او قرطبہ تجھپر دریغ ہے۔ تو ناپاکی دتباہی کا بیرا لودہ مصیبت و تکلیف کا منبع۔ تو جسکا کوئی دوست ہے نہ آشنا۔ جب وہ امیر لشکر بڑی ناک اور قبیح چہرے والا جسکے آگے مسلمان محافظت کرتے ہیں اور پیچھے بت پرست۔ یعنی ابن حفصون تیرے پھاٹکوں کے سامنے آموجود ہوگا۔ اُس وقت تیری منحوس تقدیر کا فیصلہ ہو جائیگا! " •

جس وقت اس خلافت کی نزع کی حالت شروع ہوئی تو اس نے سنبھالا لیا اور دار الخلافۃ کے رہنے والوں کو اُمید کے بجھتے ہوے چراغ میں جھلملاہٹ سی معلوم ہوئی۔ عبداللہ نے جو ویسا ہی نا امید ہو رہا تھا جیسی اُسکی رعایا۔ دل توڑ کر ایک جرأت کی حکمت عملی امتحاناً اختیار کی اور باوجود اسکے کہ اُسکے پیرووں نے اُسکو بددل بھی کیا اور جو دشمن کہ ہر طرف سے اُسے گھیرے ہوے تھے اُنکی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اُس نے چند باتیں مفید کرہی چھوڑیں۔ اور پھر جہاں تک اُسکے امکان میں تھا ملک کی بھلائی کی کوشش کی۔ اور ۱۵ اکتوبر سنہ ۹۱۲ء کو اڑسٹھ برس کی عمر میں چوبیس سال کی ناخوش و بے مزہ سلطنت کے بعد تمام قصوں و جھگڑوں سے پاک ہوگیا۔ لیکن اُسکے جانشین کے ایام حکومت میں دفعۃً پہلی ضائع شدہ قوت کا تکمیل کے ساتھ واپس آنا مقدر تھا۔

یہ نیا سلطان عبد الرحمٰن ثالث عبداللہ کا پوتا تھا۔ اسکی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ جب یہ مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ اور اُسکے بہت سے چچا اور رشتہ دار ایسے تھے جن سے یہ امید ہوسکتی تھی

کہ ایسے مصیبت کے زمانے میں اک ُمس نوجوان شخص کی تخت نشینی کی ضرور مخالفت کریں گے - گر کسی شخص نے چون وچرا نہ کی - بلکہ برعکس اسکے اسکی مسند نشینی پر چاروں طرف سے اطمینان کے ساتھ صدائے مبارک باد بلند ہوئی - یہ نوجوان شہزادہ پہلے ہی عوام الناس وارکان دولت کے دلوں پر قبضہ کرچکا تھا ، اسکی دلکش ادا اور شاہانہ اکڑ تکڑ نے جسکے ساتھ نادرالوجود خوش خلقی اور سلمہ دماغی قوتیں ملی ہوئی تھیں اُسکو عام طور پر نیکنام بنا دیا اور قرطبہ والے کہ اُسکی رعایا میں گویا صرف یہی رہ گئے تھے پھر نئی امیدوں کے ساتھ اس نئے سلطان کی پہلی کارروائیوں کو دیدے گڑو کر دیکھنے لگے - عبدالرحمن نے اپنے ارادوں پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی - اسنے ایکدم سے ہمیشہ کے لیے اپنے دادا کی حکمت عملی کو خیرباد کہا جس نے کبھی تو ضعف اور کبھی بیرحمی کی وجہ سے سلطنت کو ایسا کچھ ضرر پہونچایا تھا اور اُسکی جگہ میں اُس نے اعلان کردیا کہ میں اسکو جائز نہیں رکھوں گا کہ اس ساری مملکت کے اندر کسی قسم کی نافرمانی بنی امیہ کی کی جائے - اسنے ناراض امرا اور روسا کو طلب کیا کہ میری حکومت کی اطاعت قبول کرو - اور اُس نے واضح طور پر لوگوں کو سمجھنے دیا کہ وہ اپنی سلطنت کا کوئی جزو باغیوں کے اختیار و اقتدار میں نہ رہنے دے گا - یہ تدبیر اس قدر دلیرانہ تھی کہ جو لوگ سب سے زیادہ امیدوں سے بھرے ہوئے تھے اونکے دل بھی دھڑکنے لگے - بلکہ ہر طرح سے گمان غالب یہی تھا کہ اس سے تو کُل حصوں کے سارے باغی باہم مل کر اک بڑا جتھا قائم کرکے اس نڈر نوجوان شہزادے کو پیس ڈالیں گے - لیکن عبدالرحمن تو اپنے ملک والوں سے واقف تھا اور اُسکی دلیری عمدہ بنیاد پر قائم تھی - تقریبًا ایک نسل گذر چکی تھی جب سے ابن حفصون اور دوسرے باغیوں نے علم سرکشی بلند کر رکھا تھا اور ہر شخص حس کرنے لگا تھا کہ بغاوت و سرکشی جتنی ہوسکتی تھی وہ ہوچکی - وہ ابتدائی جوش جس نے اسپینی ، مسلمان ، اور عیسائی کو یکساں طور پر اُبھار کر قومی آزادی کے لیے لڑنے پر آمادہ کیا تھا اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا - اس لیے کہ ایسے جوش کبھی دیرپا نہیں ہوتے ہیں ، تاوقتیکہ پہلے ہی جوش کی فوری گرمی میں مکمل کامیابی حاصل نہ کرلی جائے - جو سرغنا تھے وہ یا تو مرچکے تھے

یا بوڑھے ہو گئے تھے اور اُنکے پیروں پر اطمینان وامان کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں خود بخود یہ سوال پیدا ہونے لگا تھا کہ ہاتھ اس واقعہ سے کیا آیا؟ یہ سب انقلابات جو ہوئے اُن سے کون سی خوبیاں پیدا ہوئیں جو اِن لوگوں نے اندلس کو "کافروں" سے چھڑایا نہیں بلکہ کافروں کی جماعت کے بدترین لوگوں کے پنجوں میں یعنی ڈاکو سرداروں اور نہایت ہی بدمعاش اُٹھائی گیروں کے ہاتھوں میں پھنسا دیا۔ ملک کو اس سرے سے لیکر اُس سرے تک رہزنوں کے غولوں نے غارت غول کر دیا تھا۔ جنھوں نے جُتے ہوئے کھیتوں اور ہرے بھرے تاکستانوں کو ویران کر دیا۔ اور زمین کو سنسان بیابان بنا دیا۔ لوٹ کی زبردستی سے ہر شے بہتر معلوم ہوتی تھی۔ سلطان قرطبہ معاملات کو اس سے اور کیا بدتر بنا سکتا تھا۔ اور عام میلان یہی تھا کہ دیکھیں سلطان ان خرابیوں کو رفع کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عبدالرحمن نے باغی علاقوں پر فوج کشیاں شروع کیں تو باغیوں کو اطاعت قبول کرنے پر آدھے سے زیادہ رضامند پایا۔ اُسکے سپاہی اپنے بہادر نوجوان بادشاہ کو اپنے سروں پر دیکھکر پھولے نہیں سماتے تھے اور جوشوں میں بھرے ہوئے تھے۔ اسلیے کہ بہت برسوں سے عبداللہ کے ہاتھوں اُنھیں یہ دولت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ باغیوں نے جو اپنی طوائف الملوکی کی حالت سے تنگ ہو گئے تھے، صرف ایک دکھاوے کی مزاحمت کے بعد دروازے کھول دیے سکے بعد دیگرے اندلس کے بڑے شہروں نے سلطان کو اپنی دیواروں کے اندر بلا لیا۔ سب سے پہلے اُس علاقہ نے اطاعت قبول کی جو قرطبہ کے جنوب میں ہے۔ پھر اشبلیہ نے اپنے دروازے کھول دیے۔ پچھم کے بربری سرکیے گئے اور الغرب کا رئیس خود خراج دینے کو دوڑا آیا۔ اسکے بعد سلطان ضلع ریگیو کے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ یہاں تیس سال سے پہاڑی مورچے ابن حفصون کی نذر رعایا کو بچائے ہوئے تھے اور جسکی نسبت عبدالرحمن سے بہتر کسی کو علم نہ تھا کہ جلدی فتح نہیں ہونے کی۔ اسپر بھی درجہ بدرجہ یہ علاقہ بھی زیر ہوا۔ سلطان کی

ایسی محتاطانہ انصاف پسندی وخودداری دکھیکر کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں بھی اپنے عہدناموں پر کامل ایمان کے ساتھ قائم رہتا ہے اور جو لوگ اسکی اطاعت قبول کرلیتے ہیں اُنپر حد درجے کا رحم ظاہر کرتا ہے ایک قلعہ کے بعد دوسرا برابر تابع فرمان ہوتا چلا گیا۔ ابن حفصون بذاتِ خود اپنے پہاڑی مامن میں ہمیشہ کی طرح غیرمفتوح وسرکش ہی رہا۔ لیکن بوڑھا ہوگیا تھا۔ موت نے جلد اُسکو وہاں سے ہٹالیا۔ اسکے بعد سلطان کے سپاہیوں کا خود بوباسترو کے اندر بھی گھس جانے کے لیے صرف تھوڑی سی مہلت درکار تھی اور کچھ بھی نہیں۔ اور جب آخر کو سلطان اس ہیبت ناک قلعہ کی فصیلوں پر چڑھا اور اُسنے دماغ کو چکر لانے والی بلندی سے پہاڑ کے اُن ٹیلے اور ٹیکروں پر نظر ڈالی جو اس قلعہ کو جسے مرکز بغاوت کہنا چاہیے دائرہ کی طرح ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے تو اُسکا دل بھر آیا۔ اور اس عظیم الشان فتح پر خدائے قادر کا شکر بجا لانے کو سجدے میں گر پڑا۔ اسکے بعد وہ مہربانی ومعافی کے کاموں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور جب تک اس قلعہ میں رہا خلوص سے خدا کے لیے روزے رکھتا رہا۔ مرشیہ نے بھی اس وقت آکر سلطان کی اطاعت قبول کرلی اور صرف طلیطلہ غیر مغلوب باقی رہگیا۔ ٹیگس پر کے اس مغرور شہر نے گستاخی کے ساتھ اُس معافی نامہ کو نامنظور کیا اور بھروسے کے ساتھ محاصرہ کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن اب اُسکو اور طرح کے حملہ آور سے سابقہ پڑا تھا یہ اُن کمزوردل کے سپہ سالاروں کا سا نہ تھا جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس شاہانہ شہر کی دیواروں کے نیچے ذلتیں اُٹھائی تھیں۔ اس شہر کے محافظوں پر یہ امر ثابت کرنے کیلیے کہ میرا محاصرہ کوئی عارضی دھمکی نہیں ہے۔ سلطان نے عجلت کے ساتھ ایک چھوٹا سا شہر سامنے والے پہاڑ پر تعمیر کر ڈالا۔ جسکا نام اُس نے مدینۃ الفتح رکھا۔ اور وہاں اُس نے اطمینان وتسکین کے ساتھ نتیجے کے انتظار میں بود وباش اختیار کی۔ آخر کال سے مجبور ہوکر اس شہر نے اطاعت قبول کرلی۔ اور عبدالرحمٰن ثالث اُس مملکت کے اخیر باد وملجائے بغاوت کے اندر داخل ہوا جو اُسے وراثۃً اپنے ہمنام عبدالرحمٰن اول سے ملی تھی اور جواب ایک

مرتبہ پھر (۹۳۰ء میں) اپنی پوری وسعت کو پہونچ گئی۔

سلطنت کے جتنے حصے اسکے اسلاف نے کھوئے تھے اُنکے پھر حاصل کرنے میں اٹھارہ برس صرف ہوئے لیکن یہ کام پورا ہوا اور شاہی اقتدار مضبوطی کے ساتھ عربوں۔ بربریوں اسپینیوں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں پر یکساں قائم ہوگیا۔ اسکے بعد سے عبدالرحمٰن نے کسی فریق کو خاص فوقیت حاصل کرنے نہ دی۔ اس نے پُرانے عربی امرا کو سخت دبائو میں رکھا اور اسپینی جنکو یہ لوگ ہمیشہ ذلیل وخوار سمجھتے تھے اپنے دبانے والوں کو دبتے ہوئے دیکھکر خوش ہوئے۔ اب سے ممالک محروسہ کے اندر صرف سلطان ہی کی حکومت رہی۔ لیکن اُسکی حکومت منصفانہ، مہذبانہ، اور غیر متعصبانہ تھی۔ اتنے برسوں کی بدعملی وطوائف الملوکی کے بعد لوگوں نے اس نئی جبریہ حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کرلیا۔ اب اُن راہزنوں کا نشان بھی نہ تھا جو زراعتوں اور تاکستانوں کو برباد کیا کرتے تھے۔ اور اگر سلطان کے اقتدار غیر محدود تھے بھی تو بدرجہ اقل وہ اُنھیں بُری طرح کام میں بھی نہیں لاتا تھا۔ دیہات کے لوگ پھر امن وبہتات کی راہوں پر لگ گئے اور بالکل آزاد ہوگئے کہ جس طرح چاہیں مال جمع کریں اور خوشیاں منائیں۔

ساتواں باب

جہاد

عبدالرحمٰن ثالث کا اصول حکمرانی یہ تھا کہ شاہی اقتدار تمامہ خود اُسکے ہاتھ میں رہے۔ اور مملکت کا انتظام ایسے عہدہ داروں کے ذریعے سے کرائے جنکا عروج تمام وکمال اُسی کی عنایت کا ثمرہ ہو۔ سب سے بڑھ کر اُسنے اُسکی احتیاط کی تھی کہ قدیم امرائے عرب کے ہاتھوں میں جنھوں نے اگلے بادشاہوں کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا تھا کچھ اقتدار باقی نہ رہے۔

جن لوگوں کو اس نے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا تھا وہ نودولت اور رذیل النسب تھے جو اس سبب سے اور بھی اپنے آقا کے جاں نثار تھے کہ اگر وہ نہ ہو تو قدیم عرب کے خاندان انھیں پامال ہی کر چھوڑیں۔ صدر حکومت کو قائم رکھنے کے لیے اس نے اک بڑی جرار فوج تیار رکھی تھی جسکے افسر اُسکے منتخب باڈی گارڈ کے غلام یعنی زرخرید غیر ملکی تھے۔ یہ غلام اصل میں تو اسلیو و نین[عہ] تھے لیکن رفتہ رفتہ ان میں فرنیک[عہ] جلیقیہ والے لومبارڈو[عہ] اور سب قسم کے لوگ شامل ہوتے گئے جنکو یونان و وینس کے تجار اندلس لے آتے اور کسنی ہی میں سلطان کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ اور جنکی تعلیم و تربیت مسلمانوں کی طرح ہوتی تھی۔ ان میں سے بہتیرے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور فطرتی طور پر اپنے آقا کے جاں نثار تھے۔ یہ بہت سی باتوں میں مملوکوں کے اُن سالوں کے مشابہ تھے جن کو صلاح الدین کے جانشینوں نے مصر میں باڈی گارڈ بنایا اور جو بعد کو ایسے نامور ہوئے کہ مصر و شام کے سلطان ہو گئے۔ اسی زرخرید ترکی و سرکیشین غلاموں کی جماعت کی طرح خود انکے پاس بھی اپنے غلام تھے اور انھیں بھی سلطان کی طرف سے جاگیریں ملتی تھیں۔ اور اک قسم کے فیوڈل زمیندار تھے اور خود اپنے ماتحتوں کے سرگروہ بنکر اپنے بادشاہ کا حکم بجا لانے کو مستعد رہتے تھے۔ جب کبھی اُنکی طرف سے طلبی ہوتی تھی۔ اور مصری ہی مملوکوں کی طرح تھوڑے عرصے کے بعد یہ بھی اسقدر سرچڑھ گئے کہ جب عبدالرحمن ثالث اور اُسکے جانشین کی وفات کے بعد صدر حکومت میں زوال آیا تو ان لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر خود اپنے خود مختار خاندان قائم کرلیے اور اسپین سے اسلامی سلطنت کو قطعی طور پر اُکھاڑ پھینکنے میں گویا شریک ہوئے۔

عہ اِسلووینیا یعنی پولینڈ کے قرب باشندے ۱۲۔

عہ ترک اور دوسرے مشرقی لوگ انگریز، فرانسیسی و اطالیہ والوں کو کہتے ہیں۔ اور فرنیک اُن قدیم جرمنز کو بھی کہتے ہیں جنھوں نے فرانس کو فتح کیا اور وہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ اور فرانسیسی کو بھی کہتے ہیں۔ ۱۲۔

عہ لومبارڈی واقع اطالیہ کے رہنے والے ۱۲۔

اپنے غلاموں کی مدد سے سلطان نے نہ صرف یہی کیا کہ اسپین سے غارت و بغاوت کو رفع دفع کیا بلکہ شمال کے عیسائیوں سے نمایاں کامیابی کے ساتھ لڑائیاں بھی لڑیں۔ یہ اسلامی سلطنت اندرونی طوائف الملوکی کے علاوہ اور خطروں میں بھی مبتلا تھی۔ یہ دو دھمکانے والی اور جنگجو سلطنتوں کے بیچ میں تھی۔ جن میں سے ہر ایک کو بیدار مغزی کے ساتھ روکنے کی ضرورت تھی۔ جنوب کی طرف خلفائے فاطمین کی سلطنت تھی۔ جو نئی نئی شمالی افریقہ میں قائم ہوئی اور ہمیشہ آنکھیں دکھایا کرتی تھی۔ یہ امر فطرتی تھا کہ ساحلِ بربر کے حکمرانوں کو یہ بات یاد آتی ہو گی کہ ہم سے پہلے عربوں نے افریقہ ہی کو اسپین پہونچنے کا زینہ بنایا تھا۔ افریقہ کے حکمرانوں کی قدیم سے یہ حکمت عملی چلی آتی تھی کہ اگر ممکن ہو تو اندلس کے خوبصورت اضلاع الحاق کر لیے جائیں۔ سلطان نے صرف مذہبی تفرقہ کو جس نے افریقہ کے بربریوں کے آپس میں پھوٹ ڈال دیا تھا اور اسکی وجہ سے جو ہنگامے برپا ہوئے اُسکو اپنی کارروائی کی بنیاد قرار دیکر فاطمیوں کو دُور باش کہا اور پاس پھٹکنے نہ دیا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کامیابی حاصل کی کہ ایک زمانے میں ساحل بربر کے ایک بڑے حصہ نے اُندلس کے حکمراں کی اطاعت قبول کر لی اور سبتہ کا مستحکم بالشان قلعہ بھی اُسی کے قبضہ میں آ گیا۔ اندلس کی آمدنی کا بڑا حصہ جہازوں کے ایک شاندار بیڑے کی تیاری میں صرف ہوا کیا۔ عبد الرحمٰن اس بیڑے کے ذریعہ سے بحر الروم کی حکومت کے لیے فاطمیوں سے مقابلہ کرتا تھا۔

اُسکے مقابل جانب شمال کی طرف اسلامی سلطنت کو اُس سے بھی زیادہ مخوف دشمن سے سابقہ تھا۔ استوریاز کے عیسائی ابتدا میں نوبت ہی تھوڑے سے تھے لیکن اب تو اُنکی تعداد میں روز افزوں ترقی تھی اور یہ برانگیختہ کرنے والا خیال اُنکے لیے مہمیز کا کام کرتا تھا کہ ہم خود اپنے ملک کو پھر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جب پہلے پہل اُنکو اسلامی حملے کا صدمہ پہونچا تھا تو اُنکی تباہی و بربادی تکمیل کو پہونچ گئی تھی۔ یہ سب استوریاز کے پہاڑوں میں بھاگ گئے تھے جہاں اُنکی تعداد کی قلت اور اُنکے ماویٰ و مسکن میں پہونچنے کی سخت دقت نے اُنکو مسلمانوں

کے حملہ سے محفوظ رکھا - پیلےجی اس کے ساتھ جسکا نام آملے میں "بوڑھا پیلے او" ہے - صرف تیس[۳۰] مرد اور دس[۱۰] عورتیں کوَوے ڈونگا کے غار میں جو عیسائیان قوط کا مامن بنگیا گئی تھیں - اور عربوں نے اُس وقت مناسب نہیں سمجھا کہ مفرو دوں کے اِن معدودے چند پسماندوں کا پیچھا کریں - یہاں اس غار کی کوٹھریوں میں سے جسکی راہ اک طویل و تنگ کوہی درے میں ہو کر تھی اور جسکے اندر نوے[۹۰] درجے کی سیڑھی پر چڑھ کر جانا پڑتا تھا - تھوڑے سے آدمی اک فوج کو دھتا بتا سکتے ہیں -

عرب[عه] مورخ اس عیسائی سلطنت کی ابتدا کو اس طرح حقارت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

"عنبسہ (ابن سحیم الکلبی) کے زمانے میں ایک خبیث وحشی نے جسکا نام بلائی (پلیو) تھا ارضِ جلیقیہ (گلیشیا) میں سر اُٹھایا اور اپنے ہم وطنوں کو اُنکی شرمناک اطاعت اور اُنکے بزدلانہ فرار کی وجہ سے ملامت کرکے اُنھیں بھڑکانا شروع کیا کہ اپنی گذشتہ مضرتوں کا بدلہ لیں اور اپنے آبا و اجداد کی زمین سے مسلمانوں کو نکال دیں - اُسی وقت سے اُندلس کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے حملوں کی مزاحمت شروع کی جو ایسے اضلاع پر ہوا کرتے تھے جو اُنکے قبضہ میں رہ گئے تھے اور اپنی بیبیوں و بیٹیوں کی حفاظت کرنے لگے - اس بغاوت کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جلیقیہ (گلیشیا) میں کوئی شہر، قصبہ، یا گانوں ایسا نہ رہا جو مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو باستثنائے اک دشوار گزار پہاڑ کے جہاں اس پلیو نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ پناہ لی - یہاں اسکے ساتھی بھوکوں مرنے لگے یہاں تک کہ کُل تیس[۳۰] مرد اور دس عورتیں باقی رہ گئیں اسلیے کہ وہاں اُنکی زندگی کا سہارا شہد کے سوا کچھ نہ تھا جسکو وہ چٹانوں کے تنگافوں میں سے ڈھونڈھ کر جمع کرتے تھے اور خود اُن چٹانوں کے نیچے مکھیوں کی طرح سلتے تھے - لیکن رفتہ رفتہ پلیو او۔ اُسکے آدمی اُس پہاڑ کے دروں میں قلعہ بند ہوتے چلے گئے - یہاں تک کہ مسلمانوں کو اُنکی تیاریوں کا حال معلوم ہوا - لیکن یہ دیکھکر کہ اُنکی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے مسلمان اُس

عه ابن حیان - جسکو مقری نے جلد ۲ صفحہ ۲۱ مطبوعہ مصر میں نقل کیا ہے -

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات — ۲ء؍۴ر
- دربار اکبری — ؏ہ
- سخندان فارس — ے ر
- نیرنگ خیال — ۱۰ر
- نظم آزاد — ۱۲ر
- قند پارسی — ۱۰ر
- قصص ہند — ۸ر
- نصیحت کا کرن پھول — ۸ر
- سپاک و نمک — ۱۰ر

مولانا اثری مرحوم

- حیات انیس — ۲ء ر
- ایشیائی شاعری — عہ ر
- ادیب — ۸ر
- نور جہاں — ۸ر
- ٹیپو سلطان — ۸ر
- حیدر علی سلطان — ۱۲ر
- اردو کی ڈالی — ۳ر
- قومی نظم — ۴ر
- مکالمہ مرد و عورت — ۳ر
- در شاہوار — ۹ر
- لغات الخواتین — ۲ء ر
- مرقع تاجپوشی — عہ ر

مولوی عبدالحق بی اے

- قواعد اردو — ۲ء
- انتخاب کلام میر — ؏ہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین — ۸ر
- حاجی بغلول — ۱۰ر
- پیاری دنیا — ۱۰ر
- طلسمی فانوس — ۲ء ر
- طرحدار لونڈی — عہ ر
- میٹھی چھری — ۶ر
- کایا پلٹ — ۱۲ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو — ۶ر
- بچھڑی دولھن — ۸ر
- کڑم دھم — ۴ر
- پی کہاں — ۵ر
- کامنی — ۴ء ر
- خدائی فوجدار — ۲ء ر
- فسانۂ آزاد — ؏ہ
- الف لیلہ و نیازہ — ۴ر
- سیر کہسار — ؏ہ ر
- جام سرشار — عہ ر

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی — ۱۰ر
- مار آستین — ۱۰ر
- بنگالی دولھن — ۱۲ر
- پرتاب — ۸ر
- معشوقۂ فرنگ — ۶ر
- بردگ — ۵ر

مولانا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی — سہ
- ابوبکر شبلی — عہ ر
- خواجہ معین الدین — ۶ر
- عصر قدیم — ۸ء ر
- دولت ہسپانیہ عرب ۲ جلد — ۲ء ۴ر
- حروب صلیبیہ — ۲ء ر
- تاریخ سندھ — ۲ء ۱۲ر
- قرۃ العین — ۶ر
- سیاح و مسیحیت — ۸ء ر
- تاریخ بغداد — ۴ر
- ملکۂ زنوبیہ — ۳ر
- الحکم الرفاعیہ — ۳ر
- آغا صادق صاحب — عہ ر
- سلمیٰ بنت حسین — ۶ر
- مخدرات — ۸ء ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم — ۴ء ر
- درگیش نندنی — ۱۰ر
- حسن بن صباح — ۶ر
- افسانۂ قیس — ۳ر
- مقدس نازنین — ۸ء ر
- قیس و لبنیٰ — ۴ء ر
- ایام عرب — ۲ء ۸ر
- حسن انجلینا — ۸ء ر
- سیوۂ تلخ — ۶ر
- شہید وفا — ۸ر
- دلکش — ۱۲ر
- دلچسپ — عہ ر
- شوقین ملکہ — ۸ء ر
- زوال بغداد — ۸ء ر
- ملک العزیز ورجنا — ۸ء ۴ر
- یوسف و نجمہ — ۸ء ر
- رومتہ الکبریٰ — ۴ء ر
- فلورا فلورنڈا — ۲ء ر
- فردوس بریں — عہ ر
- آغا صادق کی شادی — ۱ر
- بدر النساء کی مصیبت — ۴ر
- حسن کا ڈاکو — ؏ہ
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- خوفناک محبت — ۴ء ر
- الفانسو — ۱۲ر
- فلپانا — ۸ء ر
- فاتح مفتوح — ۴ء ر
- زمانہ اور اسلام — ۳ر
- جویائے حق — ۴ء ر
- بابک خرمی — ۸ء ر
- ہندوستان کی موسیقی — ۴ر
- سرسید کی دینی برکتیں — ۲ر

حکیم محمد علی خاں

- عبرت (کامل) — صہ
- حسن سرور — صہ
- دیول دیوی — ۲ء ۴ر
- گورا — لعہ
- نیل کا سانپ — ۲ء ۸ر
- ہفر و عباسہ — ۲ء ر
- افروز جسینہ (کامل) — لعہ

جلال مرحوم

- مفید الشعرا دلکش — عہ ر
- نظم نگار — عہ
- افادۂ تاریخ — ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث — ۸ر
- قواعد المنتخب — ۴ر

منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق — ۸ر
- عالم خیال — ۱۲ر
- قاسم و زہرہ — ۱۲ر
- مسدس ابیل و نہار — ۶ر
- سیکنڈن ریڈر — ۲ر

علامہ سید احمد

- حمایت الاسلام حصہ اول — عہ ر
- ” حصہ دوم — ۱۲ر
- فن ہیئت — ۸ر
- فن کیمسٹری — ۶ر
- التناسخ — ۴ر

خواجہ عشرت

- زبان دانی — ۴ر
- اصلاح زبان اردو — ۴ر
- شاعری کی پہلی کتاب — ۸ر
- تذکرۂ آب بقا — ۴ء ر
- گلدستۂ ظرافت — ۲ر
- ہجولی — ۸ر

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق — ۲ء
- کتاب الشفعہ — ۲ء
- لکچر — ۸ر
- شرح قانون شہادت — ے ر

حاجی اسمٰعیل خاں

- فلاح دارین — صہ
- حالات زمین — ۹ر
- تربیت الدجاج — ۸ر
- خذا صفا — ۴ء ر
- نظم نعت — ۴ر
- صحابۂ کرام — ۴ر
- چند از چند ہلوہ — ۳ر

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- علمائے سلف — سہ ر
- اسلامی اخلاق — ۸ر
- ذکر الحبیب — ۲ر
- ذکر جمیل — ۵ر
- نابینا علما — ۴ر

منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری — ۲ء ر
- حیات خسرو — ۱۲ر
- حیات صالح — ۴ر
- امرائے ہنود — ۲ء ر
- نساء المسلمین — ۱۲ر

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مرزا محمد ہادی رسوا

امراؤ جان ادا — عہ
ذات شریف — ۸ر
زہرا — ۲ر
مثنوی [illegible] — [illegible]

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز — عمر
وکرم اروسی — عہ

مسٹر ظفر علیخان بی اے

معرکہ مذہب و سائنس مجلد — عمر
جنگل میں منگل — ۲ر
سیر ظلمات — عار
ڈراما جنگ روس و جاپان — عہ
فلسفۂ ابن سینا — ۴ر
معاشرت — ۸ر
ایمل زول — ۶ر
نئی روشنی — ۴ر
ایڈیٹر کا حشر — ۱۰ر

مسٹر عبدالماجد بی اے

تاریخ اخلاق یورپ مجلد — سے
فلسفۂ جذبات مجلد — عمر
فلسفۂ اجتماع مجلد — عہ
فلسفے انسانی — ۸ر
فلسفہ کی تعلیم — ۲ر
برفیلیاں (ڈراما) — ۸ر

ڈاکٹر اقبال

علم الاقتصاد — ۴ر
شمع و شاعر — ۴ر
ہلال — ۲ر
[illegible] — ار
جواب شکوہ — ۲ر
ملی ترانہ — ۲ر
رموز بیخودی — عمر
اسرار خودی — عہ
نالۂ یتیم — ۲ر
فریاد امت — ۴ر
تصویر درد — ۴ر
اکبری اقبال — ۲ر

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ۲ جلد — عار
شباب لکھنؤ — عہ
مرقع اودھ — ۸ر
حرمان نصیب — عہ

مسٹر ظفر عمر بی اے

مستقبل اسلام — سے
نیلی چھتری — عہ
[illegible] — ۸ر

سید ہاشمی فرید آبادی

اثنا عشریوں کا درد — عار
تاریخ یونان قدیم — عہ

مولوی عبداللہ عمادی

کتاب المعارف — عمر
تکملات — عہ
تاریخ عرب قدیم — ۸ر
علم الحدیث — ۸ر
صناعۃ العرب — ۳ر
فلسفۃ القرآن — ۲ر
فلسفۂ ابن عربی — ۲ر
کتاب الزکوٰۃ — ار
حرم کی برکتیں — ۲ر

مولانا سید سلیمان ندوی

ارض القرآن ۲ جلد — [illegible]
حیات امام مالک — ۱۲ر
لغات جدیدہ — عہ
مکاتیب شبلی ۲ جلد — ہے
اہل السنۃ والجماعۃ — ۳ر
سلمان عورتوں کی بہادری — ار
نوحۂ استاذ — ار

حافظ عبدالرحمن امرتسری

سفرنامہ بلاد اسلامیہ — عہ
الصدیق — عمر
المرتضیٰ — عہ
سیاحت ہند مجلد — عار
عربی بول چال ۲ حصہ — عہ
کتاب المعرفت — ۱۰ر
کتاب النحو — ۸ر

خواجہ حسن نظامی

سیپارۂ دل — عہ
روزنامہ با تصویر — ہے
" بلا تصویر — عہ
روزنامچہ — ۸ر
تسخیر مہر و قہر — ۸ر
رسول کی عیدی — ۲ر
محرم نامہ — عہ
اتالیق خطوط نویسی — ۱۰ر
یزید نامہ — عہ
اسلام کا انجام — ۲ر
بیوی کی تعلیم — ۱۲ر
انتخاب توحید — عہ
میلاد نامہ — عہ
کرشن بیتی — عار
اردو دعائیں — ۲ر
محفل نامہ — ۸ر
غدر دہلی کے افسانے — ۲ر
چٹکیاں اور گدگدیاں — ۱۰ر
جگ بیتی — ۲ر
بچوں کی کہانیاں — ۲ر
اسرار — ۴ر
کمر توڑ موت — عہ
سیر دہلی — عہ
فرام تبلہ و شملہ — ار
نبیوں کے غیبی فرشتے — ۸ر
فلسفۂ شہادت — ار
ہارمونیم (باجا) — ۴ر

مولانا راشد الخیری

شام زندگی — عہ
صبح زندگی — عہ
شام زندگی — عہ
طوفان حیات — عہ
سراب مغرب — ۸ر
سات روحوں کے اعمالنامے — ۲ر
الزہرا — ۱۲ر
لڑکیوں کی انشا — ار
بنت الوقت — ۸ر

نیاز فتحپوری

ایک شاعر کا انجام — ۱۲ر
عائشہ صدیقہ — ۱۲ر
جذبات بھاشا — ۱۲ر
فرنگی سیاح کی ڈائری — ۲ر
کیوپڈ اینڈ سائیکس — ۸ر
نیشان جلی — [illegible]

سیماب اکبرآبادی

خدیجۃ الکبریٰ — عہ
بنت الرسول — ۵ر
سیرۃ الحسین — عار
زیب النسا بیگم — ۴ر
نورجہاں بیگم — ۸ر
جام کوثر — ۵ر
بہشتی جھومر — ۱۲ر
ترجمۂ خطب — ۱۲ر

خلیفہ محمد حسین

اعجاز التنزیل — —
سفرنامہ برنیر ۲ جلد — سے

مولانا اسلم جیراجپوری

حیات حافظ — عہ
حیات جامی — ۸ر
علوم عرب — عہ
خواتین — [illegible]

مولوی رشید احمد انصاری

تحریر المراۃ — ۴ر
المدنیۃ والاسلام — عہ
تجلی جمعیۃ ام القری — ۱۰ر

مولوی حامد علی صدیقی

تاریخ اندلس — عہ
انتصار عرب — عہ
افسانۂ نجیم — ۸ر

منشی محمد حسن خاں

ہاجرہ — عار
ترکوں کی معاشرت — عار

مولوی افتخار عالم

حیات النذیر — سے
وکیل نسواں — ۸ر
تاریخ مدرسۃ العلوم علیگڈھ — عہ